جادۂ حق

(مجموعۂ کتب و مضامین)

مولانا عبد العلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ الاقصیٰ

سعید آباد، حیدر آباد

امام برحق ابوشہید مجاہد مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ (۱۹۳۴ء-۲۰۲۲ء) برصغیر کی مشہور درسگاہ مدرسۃ الاصلاح کے فارغ التحصیل، نظریہ ساز عالم دین، ہندوستان میں فقہ مزاحمت کے بانی و مبلغ، فکرِ اسلامی کے مرابط ومحافظ، اسلام پسند نوجوانوں کے رہبر ورہنما اور استاذ الاساتذہ تھے۔ آپ کو علومِ قرآن، تدبرِ قرآن واحادیثِ نبویہ، اسرار شریعت وفقہ پر یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کا نصب العین اقامتِ دین اوراعلائے کلمۃ اللہ تھا جس کے حصول کے لیے آپ تقریباً ستر سال تدریس، تحریک اور تصنیف میں مشغول رہے۔

- ## تدریس

- (۱۹۴۵-۱۹۵۳ء) مدرسۃ الاصلاح سے فراغت
- (۱۹۵۳-۱۹۵۴ء) بورڈنگ ہاؤس مدرسۃ الاصلاح کے نگران
- (۱۹۵۴-۱۹۵۶ء) دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں مصروفِ مطالعہ وتحقیق
- (۱۹۵۶-۱۹۷۰ء) مدرس وصدر مدرس مظہر العلوم، بنارس
- (۱۹۷۰-۱۹۷۳ء) صدر مدرس ومدرس مدرسۃ الاصلاح
- (۱۹۷۳-۱۹۹۰ء) مدرس ونگران جامعہ دارالہدیٰ کریم نگر وحیدر آباد
- (۱۹۸۸-۲۰۱۲ء) بانی وناظم جامعۃ البنات حیدر آباد
- (۲۰۱۲-۲۰۲۲ء) بانی وناظم جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدر آباد

- ## تحریک

مولانا مرحوم کا شمار تحریکِ اسلامی کے ہراول دستہ میں ہوتا ہے۔ آپ دورانِ طالبِ علمی ہی جماعتِ اسلامی ہند سے منسلک ہوگئے تھے۔ آپ نے سرگرم رکن کے علاوہ تقریباً ۱۵ برس امیر مقامی بنارس اور ۳ سال امیر مقامی سرائے میر کی حیثیت سے تحریکی خدمات انجام دیں۔ آپ ساری زندگی تحریکِ اسلامی کی بنیادی سوچ اور نصب العین کے علمبردار اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے سرگرم عمل رہے۔ جماعتِ اسلامی ہند کے فکری ونظریاتی انحراف، اس کی بدلتی پالیسیوں، مسئلہ الیکشن، جمہوریت بچاؤ فورم اور ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کی ہر سطح پر مخالفت کی۔ ۱۹۹۱ء کے فسادات کے بعد ''ملت کے دفاع کا مسئلہ'' تحریر کرنے کے جرم میں پہلی مرتبہ جماعت سے معطل کیا گیا، پھر ۲۰۰۱ء میں بابری مسجد پر اپنے سخت موقف اور تحریک تحفظ شعائرِ اسلام کی سرپرستی قبول کرنے کی پاداش میں اخراج عمل میں آیا۔ بعد ازاں آپ ''وحدتِ اسلامی ہند'' سے منسلک ہوگئے۔

- ## تصنیف

اسلام مخالف نظریات، مسلم مخالف تحریکوں، ریشہ دوانیوں، مسلمانوں کے گرد تنگ ہوتے دائرے اور شریعت وشعائر کو لاحق خطرات پر آپ کی گہری نظر تھی، آپ کی بیشتر تصانیف کا محرک یہی صورتحال تھی۔ فکری انحرافات سے بچنے اور ملّت کے مختلف مسائل میں صحیح موقف اختیار کرنے کے سلسلہ میں آپ کی تحریریں قطب نما کے مثل ہیں۔ مسئلہ جہاد، مسئلہ بابری مسجد اور مسئلہ الیکشن پر آپ کا موقف بے لچک، دوٹوک، شرعی اور جرأت مندانہ تھا۔ فکرِ جہاد پر تیشہ چلانے والے علماء و دانشوران کی آراء اور نظریات کا نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں محاکمہ کیا، نیز جماعتِ اسلامی کے ذمہ داران کے الیکشن پالیسی کی حمایت میں لکھے گئے مضامین کا قرآن وسنّت کی روشنی میں بھرپور تجزیہ کیا۔

پیشِ نظر کتاب ''**جادۂ حق**'' مولانا مرحوم کی تمام کتابوں اور بعض اہم مضامین کا مجموعہ ہے، ان شاء اللہ اس کے مطالعہ کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کو درپیش سیاسی ودینی مسائل کے ادراک اور ان کے حل میں فکری رہنمائی ملے گی اور جادۂ حق پر گامزن ہونے والوں کے لیے یہ کتاب بہترین زادِ سفر بنے گی۔
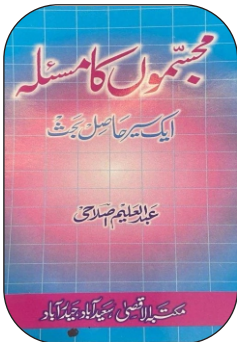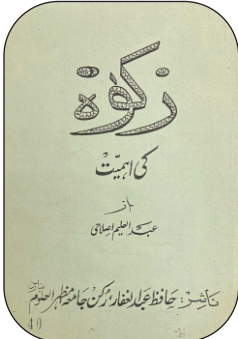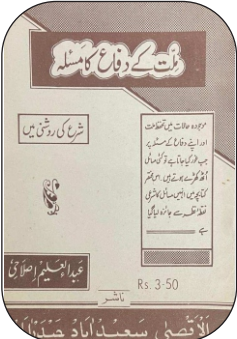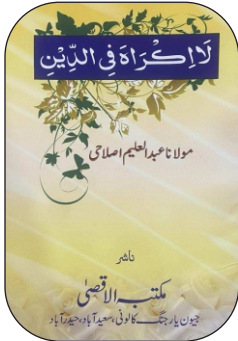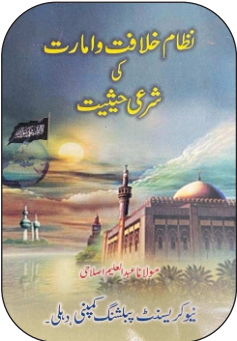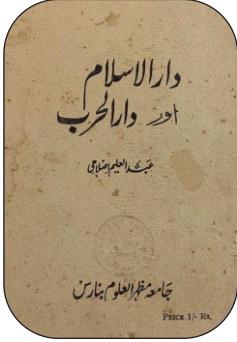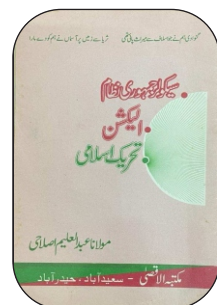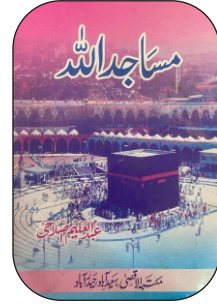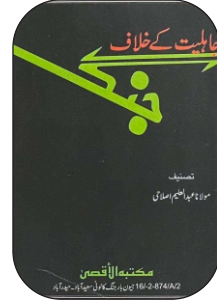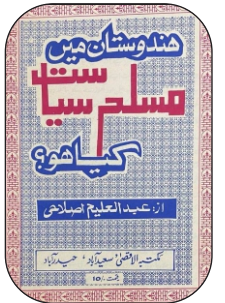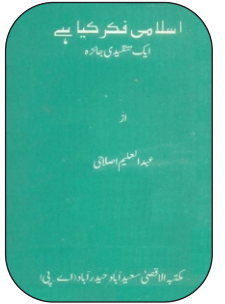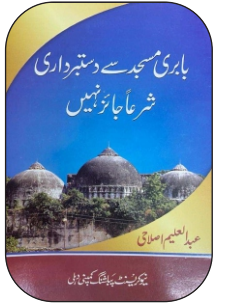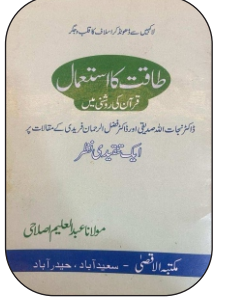
فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلٰلُ (یونس:۳۲)

''جادۂ حق کو چھوڑ دینے کے بعد گمراہی اور جہالت کے سوا اور کیا رہ جاتا ہے''

(مجموعۂ کتب ومضامین)

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبۃ الاقصیٰ

سعید آباد، حیدرآباد

تفصیلاتِ کتاب

نام کتاب : **جادۂ حق** (مجموعۂ کتب ومضامین)

مرتب : مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

ناشر : **مکتبۃ الاقصیٰ**، سعید آباد، حیدرآباد

اشاعتِ اول : ۲۰۲۳ء

صفحات : 692

قیمت : Rs. **500/-**

بسم الله الرحمن الرحیم

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

علّامہ اِقبالؒ

اِنتسَاب

قافلۂ فکرِ اسلامی کے

ان حوصلہ مند رہ نوردانِ شوق کے نام!

جنھوں نے

مصلحت کوشیوں اور مداہنت پرستیوں کے پُرفریب جالوں

اور

غیر اسلامی افکار و نظریات کے گمراہ کن فسوں خیزیوں کو

اپنے قول و عمل سے توڑنے کی جسارت کی اور عزیمت

اور استقامت کے ساتھ **جادۂ حق** پر گامزن ہو گئے۔

پھر بالآخر یا تو شہادتوں کو گلے لگا کر

"**فَمِنۡهُم مَّن قَضَىٰ نَحۡبَهُۥ**" — اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

یا اَجنبی راہوں اور تاریک زندانوں میں

"**وَمِنۡهُم مَّن يَنتَظِرُ**"

اپنی باری کے منتظر ہیں۔

فہرستِ کتب

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَاِمَامِ الْمُتَّقِیْنِ وَالْمُجَاهِدِیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا۔

تمام شکر و سپاس اس ذات بے ہمتا کے لیے سزاوار ہے جس کی شان "اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" ہے جو تمام جہانوں کا رب اور کائنات کا تنہا حاکم ہے۔ درود و سلام ہو ہمارے پیارے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو سید الانبیاء، نبی الملحمہ و نبی آخر الزماں، خاتم النّبیین و رحمۃ للعالمین اور قائد الجہاد و امام المجاہدین ہیں، جنھوں نے "وَلَوْ کَرِهَ الْکٰفِرُوْنَ"، "وَلَوْ کَرِهَ الْمُشْرِکُوْنَ" کے باوجود دین حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر کے اپنے فرضِ منصبی کا حق ادا کر دیا اور "الجهاد ماض إلى يوم القيامة" کا فرمان جاری کر کے قیامت تک کے لیے یہ فریضہ امتِ مسلمہ کے حوالے کر کے جہاد و شہادت کے سلسلہ کو جاری و ساری کر دیا۔

جس طرح ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری اور عالمگیر نبی ہیں اسی طرح دینِ اسلام بھی آخری اور عالمگیر دین، اور یہ امت بھی آخری اور عالمگیر امت ہے۔ دینِ اسلام ایک زندہ، کامل اور مکمل دین کی حیثیت سے قیامت تک ہر دور میں دنیا کی رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ قیامت تک اس دین کو برقرار رکھنے کے لیے، حالات کا مقابلہ کرنے اور زمان و مکان کی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو انتظامات فرمائے ہیں ان میں ایک انتظام تو یہ ہے کہ اس نے خود اسلام کے اندر یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر تبدیلی اور کشمکش کا بآسانی مقابلہ کر سکتا ہے اور ہر زمانے کے مسائل و مشکلات کو حل کر سکتا ہے اور دوسرا یہ کہ اس نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ "اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ" اس نے اس کی حفاظت کا طریقہ یہ متعین فرمایا ہے کہ اس

دین کو ہر دور میں وہ ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا رہے گا جو اس دین کی روشن تعلیمات کو زندگیوں میں منتقل کرتے رہیں گے اور اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے۔

یہی وہ سنت ہے جس کی خبر نبی صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں دی ہے جو ابوداؤد میں ابو ہریرہؓ سے مروی ہے:

إن اللّٰه يبعث لهذه الأمة على رأس كل مأة سنة من يجدد لها دينها۔

ترجمہ: بے شک اللہ ہر سو سال کے سرے پر اس امت کے لیے ایسے لوگ اٹھاتا رہے گا جو اس کے لیے اس کے دین کو تازہ کریں گے۔

اس تناظر میں تاریخ اسلام پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں دینِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف عسکری اور نظریاتی حملے ہوتے رہے ہیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت و نفس پرستی، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا ہے۔ قدریت، اعتزال، خلق قرآن، وحدت الوجود اور اکبر کے دینِ الٰہی جیسے بڑے بڑے باطل عقائد اور نظریات، دعوتیں اور تحریکیں بھی اٹھی ہیں ان میں سے بعض کی پشت پناہ تو بڑی بڑی سلطنتیں اور شخصیات بھی رہی ہیں، باطنیت کا فتنہ بھی ایک منہ زور آندھی کی طرح اٹھا، صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کے غیض وغضب کا طوفان بھی آیا۔ کبھی کبھی اندیشہ بھی لاحق ہوا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لا سکے اور ان کے آگے سپر ڈال دے۔ لیکن دینِ اسلام اور امتِ مسلمہ نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی اور حقیقت اسلام کی روح نے کبھی شکست تسلیم نہیں کی۔ نہ صرف اس نے اپنی بالادستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات بھی حاصل کیں۔

یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ سنتِ الٰہی اور انتظام خداوندی ہے۔

عصرِ حاضر میں بھی عقائد و نظریات اور ادیان کی یہ کشمکش جاری ہے بلکہ گزشتہ ادوار کے مقابلہ میں یہ جنگ ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوگئی ہے۔ انیسویں صدی سے جاری یہ جنگ بیسویں صدی کو پار کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں داخل ہوگئی ہے بلکہ اکیسویں صدی تو اس جنگ کا نقطۂ عروج ثابت ہو رہی ہے۔ یہ دور عالم اسلام اور مسلمانوں کے لیے بہت ہی مشکل اور پُرمصائب بن گیا ہے۔ تجزیہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ عسکری جنگ کے مقابلہ میں نظریاتی اور فکری جنگ کا دائرہ اور رفتار اول دن سے ہی کافی وسیع ہے اور عسکری محاذ کے مقابلہ میں نظریاتی اور فکری محاذ پر باطل اقوام بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آ رہے ہیں، اس لیے کہ خلافتِ اسلامیہ کے سقوط کے بعد سے ہی امتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی اپنے فرض منصبی سے سبکدوش ہو کر چند ظاہری افعال و اعمال پر قناعت کر کے بیٹھ گئی ہے۔ آج اس نظریاتی جنگ کا ہدف اولین ''اسلام کا سیاسی نظریہ یعنی نظامِ خلافتِ اسلامیہ''،

اس نظام کو غالب کرنے کے عزائم اور اس کو غالب کرنے کے طریقۂ نبوی ﷺ یعنی ''جہاد فی سبیل اللہ'' کو جڑوں سے ختم کرنا ہے۔

عالم اسلام میں اس فکری ونظریاتی جنگ میں شدت گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد آئی اور کھلم کھلا مغرب کی جانب سے اظہار کیا جانے لگا کہ ہم ایسا اسلام چاہتے ہیں جو ہمارے لیے خطرہ نہ ہو اور جو مغربی تہذیب واقدار کے ساتھ مطابقت رکھتا ہو بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جو تہذیب واقدار میں، سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظریات میں مکمل طور پر مغرب کا ہی پیرو ہو۔

اس حوالے سے ایک اہم تحقیقاتی رپورٹ ''رینڈ کارپوریشن'' جو امریکی حکومت کی امداد سے چلنے والا ایک تھنک ٹینک ادارہ ہے کی طرف سے 2004ء میں ''مہذب جمہوری اسلام، رفقاء، وسائل، حکمت عملیاں'' کے نام سے نشر ہوئی، جو کہ اس نظریاتی جنگ میں شاید ایک کلیدی نظریات رکھتی ہے اس رپورٹ سے ان کے مقاصد، آلۂ کار، طریقۂ کار اور لائحہ عمل بے نقاب ہوکر سامنے آگئے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس سازش کے نتیجہ میں مغربی مفکرین اور ان کے حاشیہ بردار مسلم ممالک کی حکومتیں ان مقاصد کی تکمیل پر متفق ہوگئی ہیں لہٰذا دنیا بھر میں خصوصاً عالمِ اسلام میں ایسے طبقوں کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جو ان کے منشاء کے مطابق اسلام کی زیادہ معتدل، جمہوری، پرامن اور رواداری والی تشریح کرتے ہیں اور ایسے طبقوں کی سرکوبی کی جارہی ہے جو اسلام کے سیاسی نظام کی بات کرتے ہیں، جو باطل نظریات خصوصاً سیکولرزم، جمہوریت اور نیشنلزم کی شدید مخالفت کرتے ہیں اور اشرفیوں کے توڑے اور کوڑے کو خاطر میں نہیں لاتے۔ لہٰذا ایسے علمائے حق اور مفکرینِ اسلام کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نشانہ بنایا جارہا ہے، ان کی کردارکشی کی جارہی ہے، قید وبند کی صعوبتوں سے انھیں گزارا جارہا ہے اور بالآخر انھیں قتل کردیا جارہا ہے۔ دنیا بھر میں علمائے حق کے خلاف یہ مہم تیزی سے جاری ہے۔ اور دوسری طرف ایسے علماء ودانشور تلاش کئے جارہے ہیں جو ان کے اہداف میں کارآمد بن سکیں اور انھیں مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لیے مختلف حربے استعمال کئے جارہے ہیں، چنانچہ عالمِ اسلام میں انھیں ایسے کئی ''متجددین'' کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں جو اجتہاد کے نام پر اسلام کو زیادہ لبرل اور رواداری والے مذہب کی شکل میں پیش کررہے ہیں اور عقیدہ البراء والولاء، عقیدۂ حاکمیت اور اسلام کی حقیقی روح اور شکل کو مسخ کررہے ہیں۔

عالمِ اسلام میں تو یہ نظریاتی کشمکش گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد سے زور پکڑی ہے لیکن ہمارے ملک ہندوستان میں یہ کشمکش شہادت بابری مسجد کے بعد سے شدت اختیار کرگئی ہے۔ عالمی اثرات اور ملک کے

اندرونی حالات کے دباؤ کا شکار ہوکر یہاں کے علماء و دانشوران بھی نظامِ کفر سے مصالحت اور مداہنت کو ہی اپنی نجات کا ذریعہ سمجھ رہے ہیں۔ تقسیم ہند سے پہلے ہی سے یہ نظارے دیکھنے میں آرہے تھے کہ تحریک خلافت کے علمبردار تک گاندھی اور نہرو کی آغوش میں پناہ لینے کو باعثِ نجات سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ آج نوبت بہ ایں جارسید کہ علماء و دانشوروں کا ایک بڑا طبقہ اسلام کے سیاسی نظریہ یعنی نظامِ خلافت و اقامت دین کے بجائے سیکولر جمہوری نظام کی تائید میں کھل کر سامنے آگیا ہے اور صدیوں سے چلی آرہی اسلامی تعلیمات کو رد کرکے نئی تشریحات کے ذریعہ ایک بالکل نیا اسلام پیش کررہا ہے۔ رواداری کے نام پر دین کی بالکل نئی تاویلات پیش کی جارہی ہیں اور مسلمانوں کے اندر باطل نظریات، سیکولرزم، ڈیموکریسی اور نیشنلزم کو مقبول بنانے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

ان سب حالات کے باوجود بھارت سمیت پوری دنیا میں جاری اس عسکری اور نظریاتی جنگ کے دوران ماضی قریب اور حال میں عالمِ اسلام اور بھارت میں سنت الٰہی کے مطابق ایسے علمائے حق، رجالِ عظیم، ابطال کریم اور دل آویز شخصیات نمودار ہوئیں اور ہورہی ہیں جو جاہلیت، ضلالت، تحریفات و تاویلات، مادیت پرستی و نفس پرستی، مغربی افکار و نظریات، تہذیب و ثقافت، نظام ہائے طاغوت سیکولرزم، نیشنلزم اور جمہوریت کی ہر نئی ظلمت کے لیے اپنے پاس ''یدِ بیضا'' رکھتے ہیں جس سے وہ ہر تاریکی کا پردہ چاک کرنے اور حق کو روشن کرنے کا عزم رکھتے ہیں اور ''بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی'' کے مانند عصر حاضر کے تمام فتنوں کے خلاف عسکری اور نظریاتی محاذ پر سرگرم عمل ہیں جو بغیر کسی مداہنت اور مصالحت کے پوری قوت اور استقامت کے ساتھ مزاحمت کررہے ہیں۔

ان علمائے حق اور برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک والد محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ بھی ہیں جو برصغیر کی عظیم اسلامی درسگاہ ''مدرسۃ الاصلاح'' کے نمایاں عالم دین اور تحریکِ اسلامی ہند کے ہراول دستہ کے سپاہی تھے، آپ تحریکِ اسلامی کی بنیادی فکر کے امین، محافظ اور علمبردار تھے اور ایک عظیم مفکر، مزکی، معلم، مجتہد اور مجاہد تھے۔ آپ نے اپنی پوری زندگی قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس، صحیح اسلامی فکر کی تشریح و تفہیم، غلبۂ دین کی جدوجہد اور مسلمانانِ ہند کی فکری اور نظریاتی رہنمائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں گزاری۔ آپ زبان و قلم کے ساتھ کردار کے بھی غازی تھے۔ آپ نے اپنی زبان و قلم اور عملی جدوجہد کے ذریعے امت میں صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے اور دینِ اسلام کی حقیقی بنیادوں سے ان کا رشتہ جوڑنے کی کوشش کی۔ جو فکری، اعتقادی اور نظریاتی انحرافات ان میں پیدا ہوگئے تھے ان کی نشاندہی کرتے ہوئے اصلاح کی کوشش کی۔ سیکولرزم، نیشنلزم اور ڈیموکریسی کی فریب کاریوں کو طشت از بام کیا۔ جب نظام کفر کی قباحتیں امت کو ارتداد کے صحرا میں بھٹکا کر توحید

کے چشمہ صافی سے دور کررہی تھیں۔ والد محترم نے انھیں قرآن وسنت کے چشمہ ہدایت سے سیراب کرنے میں اپنی توانائیاں صرف کردیں اور قرآن وسنت کی روح اور اصالت کو ان کے سامنے پیش کردیا اور صریح طور پر انھیں بتادیا کہ کتاب وسنت اور فہم اسلاف کو تھامے رکھنے میں ہی ان کی نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات اٹل اور روشن ہیں، اس سے ہٹ کر لائحۂ عمل طے کرنا اجتماعی خودکشی کے مترادف ہے، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

"وَلَنۡ تَجِدَ مِنۡ دُوۡنِهٖ مُلۡتَحَدًا"

ترجمہ: اسے چھوڑ کر ہرگز تمہیں کوئی پناہ کی جگہ نہیں مل سکتی۔

ان کے اندر شعائر اور شریعت کے تحفظ کا داعیہ پیدا کیا، کئی دہائیوں پر مشتمل دورِ غلامی کی لعنتوں نے ان کے اندر جو ''وھن'' پیدا کردیا تھا اس ''وھن'' کو دور کرنے کی کوشش کی اور انھیں مزاحمت اور استقامت کا درس دیا اور اپنے یقین، روحانیت، بے غرضی، ایثار وقربانی سے امت کے تن مردہ میں زندگی کی روح پھونک کر نیا جوش و ولولہ، اعتماد اور قوتِ عمل پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تحریکِ اسلامی کی نئی نسل کی فکری واخلاقی تربیت میں بھی آپ کا نہایت اہم رول رہا ہے۔ آپ کی شخصیت اسلام پسند نوجوانوں کے لئے حوصلہ اور امید کا باعث تھی۔

والدِ محترم مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ نے حالات کے تقاضوں کے مطابق کئی کتابیں تحریر کیں جو نہ صرف مسلمانانِ ہند کی فکری، نظری اور عملی ہر سطح پر رہنمائی کرتی ہیں بلکہ موجودہ دینی، ملی اور سیاسی مسائل کا ادراک اور ان کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں پیش کرتی ہیں۔ اسلام مخالف نظریات، مسلم مخالف تحریکوں، ریشہ دوانیوں، مسلمانوں کے گرد تنگ ہوتے دائرے اور شریعت وشعائر کو لاحق خطرات پر آپ کی گہری نظر تھی۔

آپ کی بیشتر تصانیف کا محرک یہی صورتحال ہے کسی نے ان کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بالکل صحیح کہا ہے کہ ''فکری انحرافات سے بچنے اور ملت کے مختلف مسائل میں صحیح موقف اختیار کرنے کے سلسلہ میں آپ کی تحریریں 'قطب نما' کے مثل ہیں۔'' ان کتابوں کا مختصر تعارف یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

①۔ دارالاسلام اور دارالحرب:

مسئلہ دارالاسلام اور دارالحرب پر یہ ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ اصل مآخذ کی روشنی میں ان دونوں اصطلاحوں کی مکمل تحقیق وتشریح کی گئی ہے۔ مولانا محترم اس کتاب کے طبع سوم ۲۰۰۵ء میں لکھتے ہیں:

''تقریباً چالیس برس قبل کتابچہ دارالاسلام اور دارالحرب جامعہ مظہر العلوم بنارس سے شائع ہوا تھا۔ حضرت مولانا عبدالماجد دریا آبادی علیہ الرحمۃ ایڈیٹر ''صدق جدید'' لکھنؤ اور مولانا محمد عامر عثمانیؒ مدیر ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند نے اس کتاب پر تبصرہ فرمایا تھا بطور تعارف ہم انھیں دونوں تبصروں کو من وعن پیش کررہے ہیں

اور آخر میں ماضی قریب کی بعض اہم شخصیات کی تحریروں کا اضافہ بھی کیا جا رہا ہے جس سے توقع ہے کہ اصل مسئلہ کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔''

۲۔ زکوٰۃ کی اہمیت:

اس رسالہ میں زکوٰۃ کی اہمیت اور اس کی فرضیت کو قرآن وسنت، اسوۂ صحابہ اور اسلامی قانون کی روشنی میں اجاگر کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں جو بشارتیں اور وعیدیں وارد ہوئی ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے زکوٰۃ کی بروقت ادائیگی کی ترغیب دی گئی ہے۔ رسالہ کے آخر میں مصارف زکوٰۃ، نصابِ زکوٰۃ اور مقاصدِ زکوٰۃ کو بیان کیا گیا ہے اور ''ایک قابل توجہ بات'' کے تحت دین کے فرائض کی ادائیگی میں تنظیم اور اجتماعیت کی ضرورت واہمیت کا احساس کروایا گیا ہے۔

۳۔ ملّت کے دفاع کا مسئلہ شریعت کی روشنی میں:

یہ کتابچہ ۱۹۹۱ء کے فسادات کے دوران تحریر کیا گیا تھا۔ تقسیمِ ہند کے بعد سے ہی لاتعداد فسادات کی وجہ سے مسلمانانِ ہند اپنی جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ کے سلسلہ میں پریشان ہیں اور کسی ایک نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر ہیں۔ مولانا محترم اس کتابچہ کی بابت مختصراً یوں بیان کرتے ہیں:

''موجودہ حالات میں تحفظ ملت اور اپنے دفاع کے مسئلہ پر جب غور کیا جاتا ہے تو کئی مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس مختصر کتابچہ میں انھیں مسائل کا شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا ہے۔''

۴۔ نظام خلافت وامارت کی شرعی حیثیت:

یہ ایک مختصر لیکن جامع کتابچہ ہے جس میں ہندوستان میں امارت کے قیام کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے نظامِ خلافت کی شرعی حیثیت پر نہایت عالمانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ:

''عقل کا تقاضہ، شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء اور خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔''

۵۔ بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں:

۱۹۹۳ء میں یہ رسالہ منظر عام پر آیا۔ اس رسالہ میں ''سہ نکاتی فارمولہ'' کی تائید میں مولانا وحیدالدین خان صاحب کے پیش کردہ دلائل کا نقلی وعقلی دلائل کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔ اور پھر مولانا محترم نے ثابت کیا ہے کہ بابری مسجد سے دستبرداری شرعاً جائز نہیں ہے۔ مولانا محترم کا یہ موقف بے لچک، دوٹوک، شرعی، جرأت مندانہ اور عاقلانہ تھا جو اس رسالہ میں واضح نظر آتا ہے۔

⑥۔اسلامی فکر کیا ہے؟:

مولانا وحیدالدین خان کی کتاب ''فکر اسلامی'' کے جواب میں لکھی گئی یہ تحریر ہے۔اس میں مولانا وحیدالدین خان نے تحریکِ اسلامی کے افکار کو خاص طور پر نشانہ بنایا تھا۔اور ساتھ ہی دیگر مباحث بھی زیر بحث لائے تھے۔ مولانا محترم نے ۔''اسلامی فکر کیا ہے؟''۔کے عنوان سے ان کے غیر اسلامی افکار اور پروپیگنڈوں کا دلائل شرعیہ کی روشنی میں محاکمہ کیا ہے اور ان کا مدلل اور مسکت جواب دے کر نئی نسل کو بہت سی فکری گمراہیوں سے بچا لیا ہے۔

⑦۔جاہلیت کے خلاف جنگ:

جہاد کے موضوع پر یہ ایک وقیع کتاب ہے اس میں جہاد کے موضوع کے تمام اہم مضامین کا احاطہ کیا گیا ہے۔سب سے پہلے تو جاہلیت کیا ہے؟ اس کو بیان کرتے ہوئے جہاد کے لغوی اور شرعی مفہوم کو طے کیا گیا ہے۔ فضائل جہاد، حکم جہاد، اقسام جہاد اور مقاصد جہاد کو قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔مکی اور مدنی دور کے فرق کو بتاتے ہوئے فرضیت جہاد کی علتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر میں اشاعتِ دین میں جہاد کے اثر کو ثابت کرتے ہوئے اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''اسلام دلیل اور اخلاق سے پھیلا یا تلوار سے''۔

⑧۔سیکولر جمہوری نظام، الیکشن، تحریکِ اسلامی:

جماعت اسلامی ہند کے تین ذمہ داران نے جماعت اسلامی کے الیکشنی سیاست میں حصہ لینے کی پالیسی کو دلیل فراہم کرنے اور جواز کی راہیں تلاش کر کے اپنے انحراف کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں مضامین لکھے جو ''زندگیٔ نو'' میں شائع ہوئے۔مولانا محترم نے اپنی اس کتاب میں ان مضامین کا تجزیہ کر کے قرآنی استدلالات کے ذریعہ ان کے بودے اور غیر شرعی دلائل کے پرخچے اڑائے۔مولانا محترم کے نزدیک الیکشن کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک اعتقادی مسئلہ ہے، اسی لئے مولانا جمہوری نظام میں الیکشن میں حصہ لینے کو عقیدۂ توحید کے سراسر منافی سمجھتے تھے۔آپ نے اس کتاب میں ووٹ کی شرعی حیثیت پر اپنے موقف کی پوری مضبوطی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔اس کتاب کے پیش لفظ میں اس کتاب کا تعارف اس طرح پیش کیا گیا ہے:

> ''زیر نظر کتابچہ میں پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب بھٹکل، ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب علی گڑھ اور ریاض احمد صاحب ممبئی کے مقالات ''زندگیٔ نو'' کا قرآنی آیات کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ انقلاب امامت کا صحیح طریقہ، عقیدۂ توحید کا صحیح تقاضہ اور تحریک اسلامی کا مرکزی نقطہ واضح کیا گیا ہے فکری اور عملی انحراف کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے تحریک اسلامی کے چہرے پر پڑے ہوئے گرد وغبار صاف ہو جائیں گے اور تحریک اقامت دین کے اطراف چھائے ہوئے شکوک وشبہات کے بادل چھٹ جائیں گے اور تحریک اسلامی کے کارکنوں کے لیے صحیح سمت متعین کرنے میں مدد ملے گی۔''

(۹)۔ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟:

اس رسالہ میں مولانا محترم نے تقسیم ہند کے بعد سے مسلمانوں کی جانب سے اختیار کیے جانے والے سیاسی فارمولوں کو غیر اسلامی، بے نتیجہ اور بے فیض بتایا ہے اور مسلمانانِ ہند کی سیاسی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے انھیں کفار و مشرکین، مذہب بیزار اور مادہ پرست لیڈروں اور سیاست دانوں کے افکار و نظریات کے گورکھ دھندوں سے چھٹکارہ حاصل کرتے ہوئے کتاب الٰہی اور اسوۂ نبویؐ کی روشنی میں سیاسی لائحۂ عمل متعین کرنے کی دعوت دی ہے۔ نیز انھیں اپنے مقام و مرتبہ سے واقف کراتے ہوئے اپنی حیثیت کو پہچاننے اور اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لیے کمر بستہ ہو جانے کی تلقین کی ہے۔ مولانا محترم نے مسلمانوں کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> ''مسلمانوں کی ساری سرگرمیوں کا محور حقوق طلبی اور دستور ہند کے چوکھٹے میں رہ کر ترقیوں کی منزلیں طے کرنا ہے..... ہم میدان سیاست میں اگر اترے تو دوسروں کے دست نگر محتاج بن کر، غیروں کے آگے ہاتھ پھیلائے ہوئے، سائل اور ایسے بھکاریوں کے روپ میں جن کو ہر در سے نامراد واپس کیا گیا ہے۔''

(۱۰)۔مساجد اللہ:

اس کتاب کی تمہید میں اختصار کے ساتھ بابری مسجد کے قضیے اور اس قضیہ کے ہندوستانی سیاست، مسلمانوں اور ان کی قیادت پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مسلم امت خاص کر مسلم جماعتوں اور علماء کی جانب سے اس مسئلہ سے گریز کو جائز قرار دینے کے لیے جو حیلے بہانے اور نقطۂ ہائے نظر پیش کئے جا رہے تھے ان کا شرعی اصولوں کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان کا یہ رویہ سراسر بزدلی، مصالحت اور غیر شرعی اصولوں پر مبنی ہے۔ اس رسالہ کی تالیف کا مقصد پسپائی قبول کرنے والوں کے دل و دماغ سے ذہنی اور فکری پسپائی کو نکالنا بتایا گیا ہے۔ مولانا محترم نے بابری مسجد کے مسئلہ کو ہندوستان میں ملّت اسلامیہ کا سب سے بڑا مسئلہ قرار دیا ہے اور واضح طور پر فرمایا کہ:

> ''مسلمانوں کے ان گنت مسائل اگر حل ہوں گے تو اسی مسئلہ کے حل ہونے کی صورت میں حل ہوں گے اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا تو آئندہ بھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

پھر مولانا نے مختلف بشارتوں کا ذکر کرتے ہوئے مسلم امت کو بابری مسجد کی بازیابی اور تعمیر نو کے لیے ہر مشکل سے گزر جانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تمہید کے بعد دین میں مساجد کی اہمیت، شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کے تحفظ، مساجد کی پامالی کی شرعی سزائیں وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے نصوص شرعیہ کی روشنی میں

ایک بہت اہم نکتہ بیان کیا ہے وہ یہ کہ مساجد کی حفاظت بھی قتال کی مشروعیت کا ایک سبب ہے۔ کتاب کے آخر میں مختلف نوعیت کے فتاویٰ نقل کئے گئے ہیں تاکہ مساجد کے تعلق سے مسائل کو اچھی طرح سمجھا جا سکے۔ آخر میں انتباہ دیا گیا ہے کہ بابری مسجد کی شہادت ایک ایسا قومی جرم اور اجتماعی ظلم ہے جسے قدرت نظر انداز نہیں کرسکتی۔

(۱۱)۔مجسموں کا مسئلہ:

۲۰۰۱ء میں افغانستان میں طالبان کے مجسموں کو توڑنے پر ساری دنیا میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ ہندوستان کے لوگ بھی چیخ و پکار میں کسی سے پیچھے نہ تھے یہاں تک کہ اہلِ دین و دانش بھی مجسموں کے انہدام اور طالبان کے اقدام کی مذمت کرنے لگے اور شرعی دلائل دینے کے انداز میں مختلف چیزیں پیش کرنے لگے ایسا لگ رہا تھا کہ دین میں کوئی بھی چیز متفق علیہ نہیں رہ گئی ہے حتیٰ کہ بتوں سے متعلق اسلامی نظریہ اور عقیدہ بھی کوئی معلوم اور متعین چیز نہیں ہے۔ مولانا نے ایسے تمام دلائل کا شریعت کی روشنی میں پوسٹ مارٹم کیا جن کی بنیاد پر طالبان کے عمل کو غیر اسلامی بتایا جا رہا تھا اور نہ صرف مجسموں کے انہدام کو جائز برحق اور درست قرار دیا بلکہ اس اقدام کی ستائش بھی کی۔

(۱۲)۔طاقت کا استعمال:

گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد اسلام میں طاقت کے استعمال پر شدید تنقیدیں ہوئیں جس کی وجہ سے اچھے خاصے علماء اور دانشورانِ اسلام دفاعی پوزیشن پر چلے گئے اور طاقت کے استعمال کا انکار شروع کر دیا۔ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب کے مقالات جماعت اسلامی کے ترجمان ''زندگیٔ نو'' میں شائع ہوئے۔ مولانا محترم نے ان دونوں مقالات کا قرآن وسنت کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا ہے اور تمام پروپیگنڈوں کا جواب دیا ہے۔

(۱۳)۔لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّین:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ ایسی شاہکار کتاب ہے جس میں قرآن مجید کی چند آیات پر حالات کے تناظر میں علمی انداز میں گفتگو کی گئی ہے جس سے کئی قرآنی حقائق واشگاف ہو رہے ہیں اور دورِ حاضر کی کئی فکری گمراہیوں کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔

(۱۴)۔نظریۂ جہاد: ایک تنقیدی جائزہ:

یہ کل پانچ مضامین ہیں جن میں مولانا یحییٰ نعمانی صاحب، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مولانا عنایت اللہ سبحانی کے پیش کردہ نظریۂ جہاد کا نصوص شرعیہ کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور

فکر جہاد پر تیشہ چلانے کی کوششوں کو نا کام کیا گیا ہے۔

مولانا محترم کی یہ کتابیں اگر چہ حجم کے لحاظ سے رسالوں کی شکل میں ہیں لیکن موضوعات میں گہرائی اور گیرائی اور کتاب وسنت کے صحیح منہج سے وابستگی ان کتابوں کی قدر و قیمت میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ ان سب کتابوں کو ایک جلد میں جمع کر دیا جائے چنانچہ والدمحترم کے حکم پر ان کی حیات میں ہی یہ کام شروع کر دیا گیا تھا اور مجموعہ کی پہلی پروف ریڈنگ بھی والدمحترم کی نگرانی میں آپ کے انتقال سے پانچ روز قبل یعنی ۲۳/ستمبر ۲۰۲۲ء بروز جمعہ مکمل ہوگئی تھی۔ اس مجموعہ میں ذکر کردہ کل (۱۳) کتابیں، ''نظریۂ جہاد ایک تنقیدی جائزہ'' کے تحت پانچ مضامین اور مختلف اہم موضوعات پر مبنی دیگر گیارہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ ہر کتاب کی طبع اوّل کے سن کے ساتھ ساتھ تمام مضامین کے سن بھی درج کر دیئے گئے ہیں تاکہ قاری جان سکے کہ یہ تحریریں کس دور میں لکھی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ ''جادۂ حق'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے۔

انتساب اور پیش لفظ کے متعلق والدمحترم نے چند نکات نوٹ کروادیئے تھے ان نکات اور والدمحترم کی منشاء کو مدنظر رکھتے ہوئے انھیں قلمبند کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ اُمّت کی امانت تھا جس کا ان تک پہنچانا نہایت خوشگوار فریضہ ہے۔ رب تعالیٰ کا یہ بے پناہ احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس فریضہ کی ادائیگی کی سعادت وتوفیق بخشی۔

ان شاء اللہ یہ مجموعہ اسلام کے متعلق مختلف پہلوؤں سے جو غلط فہمیاں اور الجھنیں لوگوں کے ذہنوں میں پیدا کی جارہی ہیں، ان کو دور کرنے، مسلمانوں کو فکری ونظریاتی گمراہیوں، انحرافات سے بچانے، مسائلِ دینیہ کے فہم وتعمیر کا ایک ہموار و درست راستہ پیش کرنے کا ذریعہ ثابت ہوگا اور جادۂ حق پر عزیمت واستقامت کے ساتھ گامزن ہونے والوں کے لیے بہترین زادِراہ بنے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ والدمحترم کی اس مساعیٔ جلیلہ کو قبول فرما کر ان کے لیے اسے صدقۂ جاریہ بنادے اور اُمّتِ مسلمہ کے لیے باعثِ نفع، باعثِ حوصلہ اور باعثِ قوت بنادے۔ آمین!

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى حَبِيْبِنَا النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

ڈاکٹر ظل ھما

بنت مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

حیدرآباد

۱۹/جون ۲۰۲۳ء

دارالاسلام اور دارالحرب

(۱۹۶۷ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

فہرستِ مضامین

تعارف

تقریباً 40 سال قبل کتابچہ ''دارالاسلام اور دارالحرب'' جامعہ مظہر العلوم بنارس سے شائع ہوا تھا۔

حضرت مولانا **عبدالماجد دریابادی** رحمۃ اللہ علیہ ایڈیٹر ''صدق جدید'' لکھنؤ اور مولانا **محمد عامر عثمانی** رحمۃ اللہ علیہ، مدیر ماہنامہ ''تجلی'' دیوبند نے اس کتابچہ پر تبصرہ فرمایا تھا۔

بطورِ تعارف ہم انھیں دونوں تبصروں کو من وعن پیش کررہے ہیں اور آخر میں ماضی قریب کی بعض اہم شخصیات کی تحریروں کا اضافہ بھی کیا جارہا ہے جس سے توقع ہے کہ اصل مسئلہ کو سمجھنے میں مزید مدد ملے گی۔

ناشر
طبعِ سوم
نومبر ۲۰۰۵ء

مولانا عبدالماجد دریابادی

''صدق جدید'' - ۹/فروری ۱۹۶۸ء

''دارالاسلام اوردارالحرب'' از مولوی عبدالعلیم اصلاحی ۲۷/صفحہ، قیمت ایک روپیہ، پتہ: ایم بی مظہری صاحب جامعہ مظہرالعلوم بنارس، دارالحرب ہونے اور اس مسئلہ کے متعلقات پر مفصل بحث ہر پہلو سے، انداز بیان مناظرانہ نہیں بلکہ تحقیقی، سنجیدہ اور سلجھا ہوا ہے جس کی توقع ہر اصلاحی اور ہر ندوی سے کی جاسکتی ہے۔ یہ مدلل رسالہ موافق ومخالف ہر فریق کے ہاتھ میں جانے کے قابل اور سنجیدگی سے غور وفکر کا مستحق ہے۔

مولانا محمد عامر عثمانی

''تجلی''۔ جولائی واگست ۱۹۶۸ء

دارالاسلام اور دارالحرب

تالیف : جناب عبدالعلیم اصلاحی

شائع کردہ : ایم بی مظہری صاحب، جامعہ مظہر العلوم بنارس

لکھائی چھپائی : غیر معیاری

صفحات : ۷۲

قیمت : ۱/روپیہ

گزشتہ ربع صدی میں چند سال بھی ایسے نہ ملیں گے جن میں کسی نہ کسی اللہ کے بندے نے یہ بحث نہ اٹھائی ہو کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالاسلام یا کچھ اور۔ خود ہم کئی بار اس پر خامہ فرسائی کے مرتکب ہوئے ہیں مگر حق یہ ہے کہ پیش نظر کتابچہ میں فاضل مؤلف نے جس بے لاگ اور محققانہ انداز سے داد تحقیق دی ہے وہ اب تک کی کسی تحریر میں نظر نہ آیا۔ دلائل مضبوط، اُسلوب متین، لہجہ باوقار، دروبست گٹھا ہوا بظاہر محرک خصوصی۔ اس کتابچہ کی تالیف کا مولانا سعید احمد اکبری آبادی مدیر برہان کا وہ طویل مضمون معلوم ہوتا ہے جو اسی موضوع پر ٦٦ء میں زینت برہان ہوا تھا۔ فاضل مؤلف نے کہیں کہیں اس پر اشارے کئے ہیں اور ایک جگہ تو لمبی عبارت نقل کر کے قدح کی ہے۔

کوئی بھی صاحب علم وفہم خالی الذہن ہو کر اس کتابچہ کا مطالعہ کرے گا تو اسے ماننا پڑے گا کہ صحیح بات وہی ہے جو اس کے مؤلف کہتے ہیں اور جن لوگوں نے اپنی مصلحتوں یا مجبوریوں یا پھر غلط اندیشیوں کی بناء پر اس کے خلاف ثابت کرنا چاہا ہے۔ ان کا موقف علمی وتحقیقی اعتبار سے مضبوط نہیں۔

آخر میں اختصار کے ساتھ موجودہ ہندوستان کی حیثیت بھی واضح کی گئی ہے یہ اختصار اتنا کافی شافی ہے کہ طول کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہمیں بہت خوشی اس پہلو کا احساس کر کے ہوئی کہ ہمارے ملک میں بفضلہٖ تعالیٰ آج بھی ایسے اہل علم وقلم موجود ہیں جو مسائل شرعیہ کے میدان میں سر سے کفن باندھ کر حق گوئی و باضمیری کی لاج رکھ سکتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ کَثِّرْ اَمْثَالَھُمْ

تمہید

دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریف اور ان دونوں داروں سے متعلق احکام سے اعتناء اگر قدیم فقہاء کرام نے کتاب المبسوط، ہدایہ اور عالمگیری میں فرمایا ہے، جب کہ مسلمان حکمران تھے تو مسلمانوں کے زمانہ سقوط میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے لے کر موجودہ دور کے علماء نے بھی اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ مثلاً سود اور انشورنس جیسے بہت سارے مسائل پر آج گفتگو کرتے ہوئے دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث سے پہلو تہی نہیں کی جاسکتی۔ نیز تقسیم ہند کے بعد قومی اور جمہوری نظام حکومت میں ملت اسلامیہ کی شرعاً کیا پوزیشن ہے؟ اس سوال کے جواب میں کوئی ٹھوس بات کہنے کے لئے بھی دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث چھیڑنی ہی پڑتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں خامہ فرسائیوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان وجوہ سے ضرورت ہے کہ پہلے شریعت اسلامی کے اصل ماخذوں کی روشنی میں اس مسئلہ کو حل کیا جائے اور پھر موجودہ حالات پر غور ہو۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ مختصر سا کتابچہ تیار کیا گیا ہے اور استدلال کی تمام تر بنیاد اصل ماخذ پر رکھی گئی ہے۔ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کی حیثیت فتویٰ کی ہرگز نہیں ہے، بلکہ حقیقت تک پہنچنے کی ایک کوشش ہے۔ ہمیں پورا وثوق ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ زیرنظر صفحات سے اس مسئلہ کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ اگر ایسا ہوسکا تو ہمارا مقصود حاصل ہے۔

کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا ازبس ضروری ہے کہ کس کی نسبت سے مسئلہ کی وضاحت کرنی ہے، نماز کے احکام بیان کرنے ہیں تو سامعین کے سامنے اس بات کی وضاحت ہونی چاہئے کہ تندرست کے لیے مسائل بیان ہورہے ہیں یا مریض کیلئے۔ یہ احکام منفرد اور امام پر لاگو ہوں گے یا مقتدی پر۔ اس کی وضاحت نہ ہونے کی صورت میں عین ممکن ہے کہ سامع کو غلط فہمی ہو جائے اور وہ سمجھ بیٹھے کہ تندرست شخص کے

لیے بھی فرض نماز میں قیام فرض نہیں ہے اور کوئی حنفی المسلک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ منفرد اور امام کو بھی سورۂ فاتحہ نہ پڑھنی چاہئے۔اس لئے کوئی بھی حکم بتانے کے ساتھ ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ کس حیثیت اور کس صفت کے فرد پر یہ حکم لاگو ہوگا۔

ہمارے موضوع کے لحاظ سے مسلمانوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ایک وہ جو کسی اسلامی اسٹیٹ میں شرعی امیر کے تحت زندگی گزار رہے ہوں،ان کا حاکم اللہ،دستور کتاب وسنت اور قانون شریعت ہو، دوسرے وہ جو کسی ایسے غیر اسلامی اسٹیٹ کے باشندے ہوں جس میں شرعی امیر نہ ہو، حاکم جمہور ہوں یا کوئی ڈکٹیٹر اور دستور اور قانون انسانی عقل کے مرتب کردہ ہوں قطع نظر اس کے کہ مسلمان وہاں شریک حکومت ہوں یا نہ ہوں، ان کو دوسروں کے برابر حقوق مل رہے ہوں یا نہ مل رہے ہوں۔

شریعت میں مسلمانوں کی ان دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے احکام میں کافی فرق ہوجاتا ہے۔ چنانچہ پہلی حیثیت کے مسلمانوں پر جہاد بالسیف فرض ہے اور اس کی ادائیگی بھی فرض ہے زانی کو رجم کرنا، چور کا ہاتھ کاٹنا اور خدا اور رسول کے عائد کئے ہوئے تمام حدود اور تعزیرات کا جاری کرنا ان کے لئے ضروری ہے۔لیکن دوسری حیثیت کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہونے کے باوجود عام حالات میں اس کی ادائیگی صحیح نہ ہوگی۔ اِلاّ یہ کہ کوئی مخصوص اور نئی صورت حال پیدا ہوجائے یا پھر دفاعی جہاد کی ضرورت پیش آجائے اسی طرح حدود وتعزیرات جاری کرنے کی بھی گنجائش شاذ ونادر ہی صورت میں نکل سکتی ہے۔

دارالاسلام اور دارالحرب سے متعلق خاص احکام بھی بڑی حد تک (جیسا کہ آئندہ ہم مدلل طریقہ سے بتائیں گے) پہلی حیثیت کے مسلمانوں سے متعلق ہیں اور دوسری حیثیت کے مسلمانوں پر لاگو نہ ہوں گے،مثلاً جس حیثیت میں ہندوستان کے مسلمان اس وقت ہیں اس میں جس طرح ان پر شریعت کے اجتماعی احکام حدود اور تعزیرات وغیرہ لاگو نہیں ہوتے اسی طرح دارالحرب کے احکام بھی ان پر لاگو نہ ہوں گے۔خواہ ہندوستان کو دارالحرب مان لیا جائے اس لئے کہ دارالحرب کے خاص احکام لاگو ہونے کے لئے کسی ملک کا محض دارالحرب ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی ان شرائط کا ہونا ضروری ہے جو اجتماعی احکام کے لاگو ہونے کے لئے ضروری ہیں اس لئے آئندہ صفحات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پوری طرح ملحوظ رہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی تعریف اور خصوصیت اور ان دونوں داروں سے متعلق بعض احکام کی جو وضاحت ہم کریں گے اس کا تعلق زیادہ تر پہلی حیثیت کے مسلمانوں سے ہوگا اور دوسری حیثیت میں رہنے والے مسلمانوں کی بات ایک مستقل عنوان کے ساتھ آخر میں مختصراً پیش کی جائے گی۔

دارالکفر یا دارالحرب

اس ضروری تمہید کے بعد اب آیئے ہم اصل مسئلہ پر غور کریں ۔ اس سلسلہ میں پہلا سوال جو ذہن میں اُبھرتا ہے وہ یہ ہے کہ دارالاسلام کے مقابلہ میں تو دارالکفر کی اصطلاح بولنی چاہیے لیکن عام طور سے دارالحرب کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ دارالکفر اور دارالحرب میں مفہوم کے لحاظ سے بایں وجوہ کوئی فرق نہیں ہے۔

① ایک ہی مسئلہ میں صاحب بدائع الصنائع دارالکفر اور صاحب مبسوط دارالحرب کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔

② فقہاء کرام جہاد بالسیف کی فرضیت پر اس طرح کی آیات سے استدلال کرتے ہیں:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (التوبۃ:۵)

ترجمہ: پس مشرکین کو قتل کرو جہاں انھیں پاؤ۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے ہوکر رہے۔

کفّار کی اصلی حیثیت محارب کی ہے

ان آیات سے فرضیت جہاد بالسیف پر دلیل لانے کا مطلب یہ ہوا کہ کفار اور مشرکین کے حق میں قتل اور قتال کا حکم کسی ہنگامی صورت حال سے متعلق نہیں ہے اور ان کی اصل حیثیت مسالم کی نہیں بلکہ محارب کی ہے ورنہ فقہاء کے استدلال پر یہ اعتراض وارد ہوگا کہ ایک خاص موقع کی آیت سے مستقل جہاد کی فرضیت پر کیونکر دلیل لائی جاسکتی ہے۔

③ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

قِتَالُ الْكُفَّارِ وَاجِبٌ وَاِنْ لَّمْ يَبْدَؤُنَا ''کفار سے جنگ واجب ہے چاہے وہ شروع نہ کریں۔''

اس عبارت میں یہ بتانا ہرگز مقصود نہیں ہے کفار کے ساتھ جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ''**واجب**'' کے بجائے جائز کا لفظ استعمال ہوتا، لفظ ''**واجب**'' پہل اور اقدام کو جائز ہی نہیں بلکہ واجب بتاتا ہے، اس طرح مستقل طور سے کفار کی حیثیت محارب کی قرار پاتی ہے۔ عالمگیری میں ہے:

قتال الكفار الذين لم يسلموا وهم من مشركي العرب أولم يسلموا ولم يعطوا الجزية من غيرهم واجب وان لم يبدونا. (كذافي فتح القدير)

ترجمہ: ''ان کفار سے جو ایمان نہ لائیں اور وہ مشرکین عرب میں سے ہوں یا غیر عرب میں سے جو ایمان نہ لائیں اور جزیہ نہ دیں جنگ واجب ہے چاہے وہ ہم سے پہل نہ کریں۔''

یہاں یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ وجوب قتال کی علت مشرکین عرب کے حق میں ان کا کفر وشرک ہے اور غیر عربی مشرکین کے حق میں کفر وشرک اور جزیہ دے کر زیر نگیں رہنے کے بجائے آمادۂ جنگ ہونا ہے۔ نفس وجوب قتال کے لئے اس کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے۔ ہاں عملاً قتال کرنے کے لئے مسلمانوں میں قوت اور امیر کا ہونا بھی شرط ہے دوسرے لفظوں میں یہ دونوں چیزیں ادائے واجب کے لئے شرط ہیں نہ کہ واجب کے واجب ہونے کے لئے علت، واجب تو بہر صورت واجب ہے خواہ اداء واجب کی شرطیں موجود ہوں یا نہ ہوں، جیسے نماز بہر حال فرض ہے چاہے وضو کے لئے آپ کے پاس سامان مہیا ہو یا نہ ہو۔

ایک اور پہلو سے غور کیجئے

قتال واجب ہے اور صلح محض جائز ہے اور اس کا جواز بھی مشروط ہے کفار سے صلح کے متعلق یہ دو آیتیں فقہاء کے سامنے ہیں۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (سورۂ محمد: ۳۵)

ترجمہ: ''پس تم سست نہ ہو اور نہ صلح کی طرف بلاؤ اور تم ہی غالب رہو گے۔''

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال: ۶۱)

ترجمہ: ''وہ اگر مائل بہ صلح ہوں تو تم صلح کر لو۔''

ان دونوں آیات کے پیش نظر یہ مسئلہ مستنبط ہوا:

واذا رای الامام ان یصالح اهل الحرب او فریقا منهم و کان في ذلك مصلحة للمسلمین فلا باس به۔ (الهداية)

ترجمہ: ''اور جب امام اہل الحرب یا ان میں سے کسی گروہ سے صلح کرنا مناسب سمجھے اور اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہو تو صلح میں کوئی حرج نہیں۔''

کفار کے حق میں قتال کے واجب ہونے اور صلح کے محض جائز ہونے کی اس کے علاوہ کیا بنیاد ہو سکتی ہے کہ کفار کی اصل حیثیت محارب کی ہے۔ جب کفار محارب ہیں تو لازماً ہر دار الکفر دار الحرب ہوگا ہی۔

مشرکین کے ساتھ تعلقات کی بنیاد

ہماری اس گفتگو سے جہاں دار الکفر اور دار الحرب کا مترادف ہونا ثابت ہوا وہیں یہ حقیقت بھی واضح ہو کر

سامنے آ گئی کہ کفار اور مشرکین اور مسلمانوں کے مابین معاملات کی نوعیت کیا ہے اور ان کے درمیان معاملات اور تعلقات قائم کرنے میں بنیاد اور اصل الاصول کیا ہے لیکن بات چونکہ نہایت ہی اہم ہے اس لئے مزید وضاحت کیلئے علامہ سرخسی کی ایک تقریر ہم یہاں پیش کرتے ہیں علامہ موصوف اپنی کتاب ''کتاب المبسوط'' میں کتاب السیر کی ابتداء کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''جان لو کہ سِیَرْ، سیرت کی جمع ہے۔ اس کے ذریعہ اس کتاب کا نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ مشرکین کے ساتھ خواہ وہ اہل الحرب ہوں یا اہل العہد مستامن اور ذمی، نیز مرتدین اور اہل البغی کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ کیا ہوگا؟ اقرار کرنے کے بعد انکار کی بناء پر مرتدین کی خباثت کفار سے بڑھی ہوئی ہے اور اہل بغی کا جرم مشرکین سے کم ہے۔ وہ جاہل ہیں لیکن تاویلاً دین کا ابطال کرنے والے ہیں۔''

مشرکین کو دین کی طرف دعوت دینا اور ان میں سے جو دعوت قبول نہ کریں ان سے قتال کرنا واجب ہے، کیونکہ آسمانی کتابوں میں اِس اُمت کی صفت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بتائی گئی ہے اور اسی صفت کی وجہ سے اسے خیر اُمت کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.

(آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ: ''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کیلئے پیدا کی گئی ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔''

سب سے بڑا معروف ایمان باللہ ہے، پس ہر مومن کے لئے اس کا امر کرنا اور اس کی جانب دعوت دینا لازم ہے اور سب سے بڑا منکر شرک ہے کیوں کہ بغیر کسی تاویل کے انکار حق کی بناء پر جہل اور عناد کی وہ انتہا ہے پس ہر مومن کے لئے اپنی وسعت اور قدرت کے مطابق شرک سے روکنا ضروری ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آغازِ دعوت میں مشرکین سے چشم پوشی اور اعراض کا حکم تھا، قال الله تعالىٰ: فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (اچھی طرح درگذر کرو) وقال الله تعالىٰ: وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (یعنی مشرکین سے اعراض کرو)۔

پھر (دوسرے مرحلہ میں) وعظ اور بطریق احسن مجادلہ کے ساتھ دعوت الی الدین کا حکم ہوا۔

قال الله تعالىٰ: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. (النحل:۱۲۵)

ترجمہ: ''اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان سے بطریق احسن مجادلہ کرو۔''

پھر (تیسرے مرحلہ میں) قتال کا حکم دیا گیا اس شرط کے ساتھ کہ ابتداء مشرکین کی جانب سے ہو۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا (الحج:۳۹)

ترجمہ: ''اجازت دی گئی ان کو جن سے جنگ کی جاتی ہے اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں۔''

فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ (البقرۃ:۱۹۱)

ترجمہ: ''پس اگر وہ تم سے جنگ کریں تو تم ان سے جنگ کرو۔''

وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (الانفال:۶۱)

ترجمہ: ''اگر وہ صلح کی جانب مائل ہوں تو تم بھی صلح کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔''

پھر (چوتھے مرحلہ میں) قتال کا خود آغاز کرنے کے لئے کہا گیا۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (التوبۃ:۵)

ترجمہ: پس مشرکین کو قتل کرو جہاں بھی پاؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الا اله الا اللّٰه فاذا قالوها فقد عصموا منی دماءهم واموالهم الا بحقها وحسابهم علی اللّٰه (رواہ مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا اله الا الله کا اقرار کرلیں پس جب وہ اقرار کرلیں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے اِلاّ یہ کہ ان پر کوئی حق ہو اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

پس معاملہ مشرکین کے ساتھ جہاد کی فرضیت پر مستقل ہو گیا اور جہاد تا قیام قیامت فرض ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

الجهاد ماض مذ بعثني اللّٰه تعالی الی ان یقاتل اخر عصابة من امتی الدجال.

ترجمہ: جہاد میری بعثت سے جاری رہے گا تا آنکہ میری امت میں سے آخری گروہ دجال سے جنگ کرے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے قریب میں تلوار کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں اور میری روزی میرے نیزے کے سائے میں بنائی گئی۔ میرے مخالفین کے لئے رسوائی اور ذلت کا فیصلہ کر دیا گیا ہے اور جو کسی قوم سے تشابہ

اختیار کرے گا وہ انھیں میں شمار ہوگا۔'' (مسند احمد)

اس کی تفسیر سفیان بن عیینہ نے یوں کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ کو چار تلواروں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک تلوار جس کے ذریعہ بذات خود حضور ﷺ نے اصنام پرستوں سے جنگ فرمائی اور ایک تلوار جس کے ذریعہ حضرت صدیقؓ نے اہل ارتداد سے جنگ کی تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ (تم ان سے جنگ کرو گے یا وہ اسلام قبول کریں) ایک تلوار جس کے ذریعہ حضرت فاروقؓ نے مجوس اور اہل کتاب سے جنگ کی۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ الخ (ان سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے) ایک تلوار جس کے ذریعہ حضرت علیؓ نے مارقین، ناکثین اور قاسطین سے جنگ کی۔ اسی طرح ایک روایت ہے کہ مجھے مارقین، ناکثین اور قاسطین سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد باری ہے:

فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ (الحجرات:۹)

ترجمہ: پس اس گروہ سے جنگ کرو جو زیادتی کر رہا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔

پھر فریضۂ جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ فرض عین جو ہر با استطاعت شخص پر وسعت کے مطابق فرض ہوتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب جہاد کے لئے عام اعلان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا (التوبۃ:۴۱)

ترجمہ: جہاد کے لئے نکلو ہلکے ہو خواہ بوجھل۔

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (التوبۃ:۳۸)

ترجمہ: تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلو تو تم دبک جاتے ہو۔

دوسری قسم فرض کفایہ ہے جب کچھ لوگوں کے جہاد کرنے سے باقی لوگوں سے فریضہ اصل مقصود حاصل ہونے کی بناء پر ساقط ہو جائے یعنی کچھ ہی لوگوں کے ذریعہ شوکت کفار پامال اور دین حق کو عزت اور تمکنت حاصل ہو جائے۔ یہ اس لئے کہ اگر ہر وقت اور ہر شخص پر فرض کر دیا جائے تو فریضہ جہاد کا یہ مقصود ختم ہو جائے گا کہ مسلمان امن سے رہیں اور اپنے دین اور دنیا دونوں کی مصلحتوں کو پورا کرنے کی انھیں پوری قدرت حاصل ہو لیکن جب سب کے سب جہاد میں مشغول ہو جائیں گے تو مصالح دنیا کے لئے فرصت نہ ملے گی اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ فریضہ کو ادا کر رہے ہوں تو بقیہ لوگوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ نبی ﷺ کبھی خود جہاد میں

تشریف لے جاتے اور کبھی کسی دوسرے کو بھیجتے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری خواہش ہے کہ ہر سریہ اور جیش کے ساتھ میں خود جاؤں۔لیکن میں لوگوں کیلئے سواری نہیں پاتا اور لوگ مجھ سے پیچھے رہ جانے میں خوشی نہیں محسوس کرتے۔میری تمنا ہے کہ میں اللہ کے راستہ میں جنگ کروں اور قتل کر دیا جاؤں۔پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کر دیا جاؤں۔(کتاب المبسوط الجزء العاشر)

علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت سے دو حقیقتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

① یہ کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان باہم معاملہ کے لحاظ سے مشرکین کی پانچ قسمیں ہو سکتی ہیں۔

①-اہل الحرب۔ ②-مستامن۔ ③-اہل العہد۔ ④-ذمّی۔ ⑤-مرتد۔

اب یہ مسئلہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے کہ جس وقت اور جس جگہ بھی یہ سوال پیدا ہو کہ ہم غیر مسلمین کے ساتھ کس طرح معاملہ کریں تو ہمیں لامحالہ ان کی حیثیت متعین کرنی پڑے گی وہ حربی ہیں، مستامن ہیں، ذمّی ہیں، اہل العہد ہیں، مرتد ہیں، کیا ہیں؟ اس کے بغیر جو فیصلہ بھی کیا جائے گا وہ صحیح نہ ہوگا اور غیر شرعی ہوگا اور لوگ بڑی بھول میں ہیں جو اس حقیقت کو فراموش کر کے کہتے ہیں کہ اس دور میں وطنیت اور قومیت کے نئے نئے تصورات پیدا ہوئے ہیں اور انھیں کے مطابق ملکی اور بین الاقوامی معاملات طے پاتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو انھیں تصورات کی روشنی میں غیر قوموں کے ساتھ تعلقات استوار کرنا چاہئے۔ہم کہتے ہیں اسلامی نظریات اور اقدار کے علاوہ نت نئے بہت سارے نظریات اور تصورات پیدا ہوئے اور نہ معلوم ابھی کتنے اور پیدا ہوں گے لیکن بہرصورت وہ کفر وشرک کے بطن سے پیدا ہوں گے محض ان کا نیا ہونا ان کو اسلام سے قریب نہیں کر سکتا اور اسلامی اقدار بدلے ہیں اور نہ بدلے جا سکتے ہیں۔

② یہ کہ مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے معاملہ کی بس ایک نوعیت ہے اور وہ ہے جہاد۔جس کے خلاف قرآن وسنت، فقہی اُصول اور جزئیات کہیں سے بھی کوئی دلیل نہیں لائی جا سکتی، ہاں یہ تو ممکن ہے کہ اُمت مسلمہ کے کچھ افراد کسی مجبوری یا مصلحت کی بناء پر عارضی اور وقتی طور پر جہادی نسبت کے علاوہ کوئی دوسری نسبت قائم کر لیں اور اس کو صحیح بھی قرار دے دیا جائے۔مگر بحیثیت اُمت کوئی مستقل نسبت اور رویہ جہاد کے علاوہ قائم کر لیں اور اس پر قرآن وسنت سے مہر تصدیق بھی کرالی جائے ناممکن اور محال ہے۔یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جو مسلمان جہاد کے شعبۂ قتال کی پوزیشن میں نہ ہوں ان کو جہاد کے شعبۂ دعوت پر ہی لازماً اکتفا کرنا ہوگا۔

ازالۂ شبہات

یہاں چند شبہات ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔

① جب کفار سے ہماری محض جہاد کی نسبت ہے تو دعوت الی الدین کا مقام کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جہاد سے مراد صرف قتال نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں بلکہ قتال جہاد کا محض ایک مرحلہ ہے یا یوں کہا جائے کہ وہ جہاد کی ایک صورت ہے اور قتال کی طرح دعوت الی الدین بھی جہاد کی ایک شکل ہے گویا جہاد میں دعوتی جدو جہد اور قتال دونوں کا مفہوم شامل ہے۔

هو الجهاد لغة مصدر جاهد في سبيل الله و شرعا الدعاء الى الدين الحق قتال من لم يقبله. (شمسی بحواله الدر المختار، ص:٣٣٨)

ترجمہ: جہاد باعتبار لغت جاہد فی سبیل اللہ کا مصدر ہے اور باعتبار شرع دین کی طرف دعوت دینا اور دین قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔

فالجهاد هو الدعاء الى الدين الحق والقتال مع من امتنع وتمرد عن القبول اما بالنفس او المال. (کتاب السیر عالمگیری)

ترجمہ: پس جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا اور ان کے ساتھ جان و مال کے ساتھ جنگ کرنا ہے جو کنارہ کشی اختیار کریں اور قبول حق کے مقابلہ میں سرکشی کریں۔

② جب مشرکین سے محض جہاد کرنا ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ ان سے صلح اور معاہدہ کو جائز رکھا گیا ہے؟ اس شبہ کا ازالہ صاحب ہدایہ کے ان الفاظ کے ذریعہ پوری طرح ہو جاتا ہے، جواز صلح کے نقلی دلائل پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

ولان الموادعة جهاد معنى اذا كان خيرًا للمسلمين لان المقصود وهو دفع الشر حاصل به ولا يقتصر الحكم على المدة المروية لتعدى المعنى الى ما زاد عليها بخلاف ما اذا لم تكن خيرًا الا انه ترك الجهاد صورة و معنى.

(جلد اول صفحہ:٥٤٣٠)

ترجمہ: اور اس لئے بھی کہ صلح معنوی اعتبار سے جہاد ہے جبکہ مسلمانوں کے لئے اس میں بھلائی ہو۔ کیوں کہ مقصود یعنی شر کا دفع کرنا، اس کے ذریعہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ حکم روایت میں مذکور مدت پر موقوف نہ ہوگا کہ علت اس سے زیادہ ہونے کے بعد بھی پائی جاسکتی ہے برخلاف اس حالت کے جب صلح میں بھلائی نہ ہو ''یعنی جائز نہ ہوگی'' اس لئے کہ یہ صورت اور معنی دونوں اعتبار سے ترک جہاد کے ہم معنی ہوگا۔

③ ایسا کیوں ہے کہ اسلامی فوج کسی ملک پر چڑھائی کرے تو پہلے ان کے سامنے اسلام پیش کرے اگر قبول کر لیں تو فبہا ورنہ جزیہ کا مطالبہ کرے جزیہ دینا منظور کر لیں تو ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّ ھُمۡ صٰغِرُوۡنَ.

اس شبہ کے ازالہ کے لئے فقہاء اور مفسرین نے جو کچھ کہا ہے اس کا ماحصل جاننے کے لئے صاحب روح المعانی کی تقریر ہم اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

> ''کفار سے جزیہ وصول کرنے میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ چند درہم لے کر کفر پر ان کے باقی رہنے کو کیوں کر گوارا کیا جاتا ہے۔ قطب نے اس کا جواب دیا ہے کہ جزیہ لینے کا مقصد کفر پر ان کو قائم رکھنا نہیں ہے بلکہ ایک مدت تک انھیں مہلت دینے کے ہم معنی ہے ممکن ہے اسلام کے محاسن اور دلائل سے انھیں واقفیت ہو جائے اور اسلام قبول کر لیں۔

اتقانی نے کہا جزیہ کفر پر باقی رکھنے کا عوض نہیں ہے ہاں عوض ہے قتل اور استرقاق کا جن کے وہ کفر کی بناء پر سزاوار تھے بالکل ایسے ہی جیسے قصاص کا عوض مال بن جاتا ہے یا یہ کہا جائے کہ جزیہ بھی ایک سزا ہے جو کفّار کو دی جاتی ہے۔

> ایک جواب یہ دیا گیا ہے کہ دارالاسلام کی حمایت اور دفاع جس طرح مسلمانوں کے لئے ضروری ہے اسی طرح وہاں رہنے والے کفار کے لئے بھی، لیکن چونکہ ان کا میلان کفر کی جانب ہے اس لئے ان کی حمایت اور نصرت کے بدلے مال وصول کیا جاتا ہے۔'' (جزعاشر،صفحہ:۷۲)

④ چوتھے شبہے کی بنیاد آیت لَآ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ کے صحیح مفہوم سے ناآشنائی ہے کہ جب دین میں زبردستی نہیں ہے تو پھر مومنین اور مشرکین کے مابین تعلقات کی بنیاد جہاد پر کیوں کر ہوگی جب کہ جہاد میں قتال کا مفہوم شامل ہے۔

اس سوال میں ایک طرف آیت کو بے محل استعمال کیا گیا ہے دوسری طرف جہاد کے مقصد کو نہیں سمجھا گیا ہے حقیقت یہ ہے کہ جہاد کا مقصد لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں ہے بلکہ انہیں ظلم وسرکشی اور فتنہ وفساد سے روک کر قانون عدل کا تابع بنا دینا اور اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور آیت کو اس کے سیاق وسباق کے ساتھ دیکھئے تو اس کے معنی یہ سامنے آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل ایسے شافی اور قاطع طریقہ سے بیان کر دیئے کہ عذر کی گنجائش نہ رہی تو اس نے فرمایا کہ ان دلائل کی توضیح کے بعد کسی کافر کے لئے کفر پر قائم رہنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ اور اب اگر وہ ایمان نہ لائے تو اس کو قائل کرنے کی صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ اسے بزور شمشیر اس پر مجبور کیا جائے مگر یہ اس دنیا میں کہ ابتلاء وآزمائش کا گھر ہے جائز نہیں، کیوں کہ قہر واکراہ سے دین پر مجبور کرنا،

ابتلاء و امتحان کے مقصد کو باطل کر دیتا ہے تقریباً یہی مضمون ان آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ (الکہف:۲۹)

ترجمہ: جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر پر قائم رہے۔

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيۡعًا ‌ؕ اَفَاَنۡتَ تُكۡرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِيۡنَ (یونس:۹۹)

ترجمہ: اور اگر تیرا رب چاہے تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان لے آئیں، کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے کہ وہ مومن ہو جائیں۔

الغرض آیت لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ اور اس جیسی دوسری آیات پیش کر کے مشرکین کے ساتھ تعلقات میں جہاد کے اصل الاصول ہونے کی تردید نہیں کی جاسکتی اور ہاں لوگ اس طرح کی آیات پیش کر کے اسلام کو اس قدر روادار ثابت کرتے ہیں کہ اس کا رشتہ نظریہ وحدت ادیان سے ملا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ دراصل دنیا کو دھوکا دے رہے ہیں اور اسلام کی غلط تعبیر اور ترجمانی کرتے ہیں۔ اسلام اس معنی میں ضرور روادار ہے کہ اپنے اقتدار کے باوجود کفر و شرک کے وجود کو گوارا کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حق باطل دونوں اس کے نزدیک یکساں زندہ رہنے کے مستحق ہیں برتری اور بالادستی تو دور کی بات ہے اسلام باطل کی برابری اور ہمسری کا بھی روادار نہیں ہے بلکہ اس کی رواداری کی بنیاد یہ ہے کہ حق ہو یا باطل کسی بھی چیز کے قبول کرنے کا تعلق قلب سے ہے اور قلب میں کوئی چیز زبردستی ٹھونسی نہیں جاسکتی اور جو زبردستی ٹھونس دی جائے خدا کے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اس لئے وہ باطل کو بادل ناخواستہ برداشت کرتا ہے۔

⑤ ایک شبہ یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی ملک غیر جانب دار بھی تو ہوسکتا ہے اس سلسلے میں ہم کہیں گے کہ غیر جانب داری کوئی مستقل چیز نہیں ہے بلکہ غیر جانب داری کا رویہ اختیار کرنا بھی ایک قسم کا معاہدہ ہے مثلاً کوئی ملک کسی دوسرے ملک سے کہتا ہے کہ فلاں معاملہ میں ہم نہ تمہاری حمایت یا مخالفت کریں گے اور نہ تمہارے فریق کی۔ سوچئے کہ غیر جانب داری اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز ہے اور پھر کیا یہ ایک قسم کا معاہدہ نہیں ہے۔

دارالاسلام

پچھلی بحث سے یہ بات محقق ہو چکی کہ مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں جہاد ہی بنیاد اور اصل الاصول ہے اب اس کے بعد ہمارے لئے بالکل ممکن ہے کہ قرآن میں بیان شدہ احکام جہاد کی روشنی میں دونوں داروں کی تعریف اور خصوصیت ہم متعین کر سکیں۔

عام طور پر اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کتب فقہ کی چند عبارتوں کے گرد ساری بحث مرکوز رہتی ہے اور ہر شخص ان کا ایک مفہوم نکال کر دارالاسلام اور دارالحرب کی ایک تصویر پیش کر دیتا ہے جو بسا اوقات موجودہ حالات کے دباؤ کی عکاسی کرتی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت بھی ہوتا ہے کہ مسئلہ کا اصل سرا ابھی ہاتھ نہیں آیا ہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ یہ دونوں اصطلاحیں دور رسالتؐ، دورِ صحابہؓ کے بعد کی ہیں۔لیکن ان سے متعلق احکام تو نئے نہیں ہیں اور فی الحقیقت انھیں احکام کو مرتب کرتے وقت یہ اصطلاحیں وجود میں آئی ہیں، اس لئے ان احکام کے مطابق دونوں اصطلاحوں کی حقیقی تصویر پیش کی جاسکتی ہے جو کتب فقہ کی عبارتوں کا مفہوم متعین کرنے میں معین و مددگار بھی ثابت ہوگی اور مختلف عبارتوں کے حق میں ردوقبول کے لئے معیار اور کسوٹی کا کام بھی دے گی چنانچہ اس مقصد کے لئے جب ہم قرآن کی جانب رجوع کرتے ہیں تو ہمارے سامنے دارالاسلام کی دو صورتیں صاف طور پر آتی ہیں کہ انھیں دو صورتوں میں کوئی غیر مسلم ملک نا قابل جنگ ہوگا۔

① وہ ملک جہاں شرک سرے سے نابود ہو اور اسلام ہی پوری زندگی کا دین ہو، فرد اور سماج پر دین کی حکمرانی، اخلاق، معاشرت، حکومت، سیاست ہر ایک کو اللہ کے دین کے مطابق استوار کیا گیا ہو اور شرک کے لئے سانس لینا بھی جائز نہ ہو اس دارالاسلام کی مثال ملک حجاز ہے کہ وہاں کسی مشرک کے لیے گنجائش نہیں ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اُن سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوکر رہے۔

شرک کو فتنہ اس لئے کہا گیا ہے کہ پورا دین اللہ کے لئے ہونے میں شرک مزاحم اور باعث ابتلاء ہوتا ہے۔

② وہ ملک جہاں شرک کے وجود کو گوارا کیا جائے لیکن بالادستی دین حق کو حاصل ہو، حلت وحرمت اور جائز وناجائز قرار دینے کے سارے اختیارات کفر کے ہاتھوں سے چھین لئے جائیں۔کفر واہل کفر مغلوب اور مقہور اور ماتحت ہوکر رہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ ورسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں کرتے اور دین حق کی پیروی نہیں کرتے، ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی یہاں تک کہ وہ ذلت کے ساتھ جزیہ ادا کریں۔

حنفیہ کے نزدیک اہل کتاب خواہ عربی ہوں یا عجمی سب سے جزیہ لیا جاسکتا ہے اور عجم کے تمام مشرکین انھیں اہل کتاب کے حکم میں ہیں۔ امام شافعی صاحبؒ کے نزدیک عجمی مشرکین کیلئے بھی بس دو چیزیں ہیں اسلام یا تلوار۔

دیکھئے دارالاسلام کی مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں اسلام کی بالادستی اور حکمرانی اور کفر کا نیست و نابود ہونا یا کم از کم ماتحت اور زیر سایہ اسلام ہونا اور فتنہ نہ بننے کی پوزیشن میں ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔

اب آیئے دیکھیں فقہاء اسلام کی تصریحات سے ہمیں کیا روشنی ملتی ہے۔ ہمارے علم کی حد تک فقہاء حنفیہ کے درمیان اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

لاخلاف بین اصحابنا فی ان دارالکفر تصیر دارالاسلام بظھور احکام الاسلام فیھا (بدائع الصنائع، جز سابع، ص:۱۳۰)

ترجمہ: یعنی ہمارے اصحاب کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دارالکفر میں اسلامی احکام غالب ہونے سے وہ دارالاسلام بن جاتا ہے۔

اعلم ان دار الحرب تصیر دار الاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا. (عالمگیری، جلد ۳، ص:۱۴۶)

ترجمہ: یعنی جان لو کہ دارالحرب محض ایک شرط سے دارالاسلام بنتا ہے اور وہ ہے اسلامی حکم قانون کا غلبہ اور نفاذ۔

اذا کانت دار من دور اھل الحرب قد وادع المسلمون اھلھا علی ان یؤدوا الی المسلمین شیئا معلوما فی کل سنۃ علی ان لا یجری علیھم المسلمون احکامھم فھذہ دار الحرب لان الدار انما تصیر دار الاسلام باجراء حکم المسلمین فیھا و حکم المسلمین فیھا غیر جار فکانت ھذہ دار الحرب.
(شرح السیر الکبیر، جلد۴، ص:۳۰۲)

ترجمہ: اور جب اہل حرب کے داروں میں سے کسی دار کے باشندوں سے مسلمانوں نے اس شرط کے ساتھ صلح کرلی کہ وہ ہر سال مسلمانوں کو ایک متعین شئی اس شرط پر دیں گے کہ مسلمان اپنے قوانین ان پر جاری نہ کریں گے تو یہ دارالحرب ہوگا کیوں کہ کوئی دار دارالاسلام اس وقت بنتا ہے جب کہ اس میں مسلمانوں کا قانون جاری کیا جائے اور مسلمانوں کا قانون جاری نہیں ہے اس لئے یہ دار دارالحرب ہے۔

ان المراد بدار الاسلام بلاد یجری فیھا حکم امام المسلمین و تکون تحت قھرہ "کافی".

ترجمہ: یعنی بلاشبہ دارالاسلام سے مراد ایسے شہر ہیں جن میں مسلمانوں کے امام کا حکم جاری ہو اور وہ شہر اس کے زیر اقتدار ہوں۔

اظہار احکام کا مفہوم

ان فقہی تصریحات سے معلوم ہوا کہ دارالاسلام کی اصل خصوصیت اسلامی احکام کا اظہار اور اجراء ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے کوئی بھی دار دارالاسلام بن جاتا ہے اس مقام پر پہنچ کر یہ بھی جان لینے کی ضرورت ہے کہ احکام کے اظہار اور اجراء کا مفہوم کیا ہے یہ دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ بعض لوگ اظہار احکام کا مفہوم مذہبی آزادی لیتے ہیں جو متعدد وجوہ سے غلط اور گمراہ کن ہے۔

① عربی سے تھوڑی بہت شد بد رکھنے والا شخص بھی اچھی طرح جان سکتا ہے کہ اظہار میں غلبہ کا مفہوم پایا جاتا ہے اور احکام کے لئے لفظ اظہار کا استعمال دراصل "لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ" جیسی آیاتِ قرآنی سے ماخوذ ہے اس طرح لغت اور استعمال دونوں لحاظ سے اظہار احکام میں غلبہ کا مفہوم شامل ہے۔

② اظہار احکام کو اگر مذہبی آزادی کے ہم معنی قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ "قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ" آیات وغیرہ کی منشاء پوری نہ ہوگی۔ یعنی قرآن کی روشنی میں ہم نے دارالاسلام کی یہ جو خصوصیت بتائی ہے کہ یا تو شرک کا وہاں وجود ہی نہ ہوگا یا پھر اسلام کے ماتحت فتنہ نہ بن سکنے کی پوزیشن میں ہوگا، وہ وجود میں نہ آسکے گی۔ اس لئے کہ غیر اسلام کے ہاتھ میں اقتدار اعلیٰ ہوتے ہوئے خواہ کتنی ہی مذہبی آزادی ہو بہر صورت یہ ماننا پڑے گا کہ پورا کا پورا دین اللہ کے لئے ہونے کی راہ میں شرک فتنہ بننے کی پوزیشن میں موجود ہوگا پس اظہار احکام اسلامی کا لازماً یہ مفہوم ہوگا کہ اسلام کو بالا دستی اور رتبہ حکمرانی حاصل ہو اور کفر یا تو نیست و نابود ہو یا کم از کم اس طرح ماتحت اور زیر سایہ اسلام ہو کہ فتنہ نہ بن سکے۔

③ یہ معلوم اور مسلم ہے کہ دارالاسلام میں ذمی کو پرائیوٹ طور پر مذہبی آزادی ہوتی ہے پس اگر اظہار احکام اور مذہبی آزادی دونوں ایک ہی چیز ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دارالاسلام میں بیک وقت اسلام اور کفر دونوں کے احکام جاری ہوتے ہیں۔

④ کچھ مذہبی آزادی اور دینی شعائر کیلئے اجازت ہی دارالاسلام ہونے کیلئے کافی ہو تو روئے زمین پر دارالحرب کا وجود تقریباً محال ہوتا اور تاریخ عالم میں حق اور باطل کی کشمکش کی داستان کہاں ہوتی! اور پھر فقہاء اسلام کو اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ وہ بحث کریں کہ دارالحرب میں ایک مسلمان سے کون سے احکام ساقط ہو جاتے ہیں اور کن کی پابندی لازم ہے اور یہاں ہدایہ کے اس جزئیہ کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔

ولا باس برميهم وان كان فيهم اسيراً وتاجراوان تترسوا بصبيان المسلمين وبالاسارىٰ لم يكفوا عن رميهم ويقصدون بالرمي الكفار (ہدایہ اولین، ص:۵۴۱)

ترجمہ: اوران پر تیر چلانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر چہ ان کے اندر کوئی قیدی اور کوئی تاجر مسلمان ہو اور اگر وہ مسلمانوں کے بچوں اور قیدیوں کو مقابل میں کردیں تو بھی مسلمان ان کو مارنے سے رکیں نہیں اور مارتے وقت نیت کفار کو مارنے کی رکھیں گے۔

الغرض اسلامی احکام کے اجراء اور اظہار کا مفہوم یہ ہے کہ اقتدار اعلیٰ اسلام کو حاصل ہو قانون سازی اس کے اصولوں کے مطابق ہو۔ فوجداری اور دیوانی کے مقدمات اسلامی تعلیمات کی روشنی میں طے پاتے ہوں۔ حدود اور تعزیرات اسلام کے نافذ ہوں، سرحدوں کی حفاظت اسلامی مصالح کے مطابق اسلامی طریق پر ہو۔

اس حقیقت نفس الامری کے ظاہر ہونے کے بعد ہم بلا کسی دغدغہ اور خدشہ کے کہہ سکتے ہیں کہ:

① وہ ملک جس میں مسلمان شریک حکومت ہیں لیکن اس کے دستور اور قانون کی بنیاد کتاب وسنت نہیں ہے۔

② وہ ملک جہاں مسلمان شریک حکومت نہیں ہیں اور دستور اور قانون کی بنیاد کتاب وسنت بھی نہیں ہے البتہ انھیں کچھ مذہبی آزادی حاصل ہے۔

یہ دونوں قسمیں قطعاً دارالاسلام نہیں ہوسکتیں کیوں کہ جیسا کہ اوپر ہم نے بتایا ہے کسی ملک کے دارالاسلام ہونے کے لئے محض مسلمانوں کا شریک حکومت ہونا یا زیر سایہ کفر مطلق تھوڑی مذہبی آزادی کا حاصل ہونا کسی طرح کافی نہیں ہے۔ آج جو لوگ اس طرح کے ممالک کو دارالاسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو جان بوجھ کر اپنی خاص حیثیات کو محفوظ رکھنے کے لئے ایک حقیقت کو چھپا رہے ہیں یا وہ اُمت مسلمہ کو دوسری قوموں کے مثل نری ایک قوم اور اسلام کو اس کا ایک قومی مذہب سمجھتے ہیں اور پھر انھیں کتب فقہ میں غلبۂ مسلمین اور استیلاء کے الفاظ سے دھوکا ہو رہا ہے حالانکہ مسلمانوں کا نرا غلبہ اسلام کی نظر میں انتہائی قبیح اور عظیم منکر ہے واقعہ یہ ہے کہ ائمہ اور فقہاء کے دور میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ مسلمان کہیں غالب ہوں اور وہاں مبنی بر کفر وشرک احکام جاری ہوں اور اسلامی احکام اپنے وجود اور بقاء کے لئے کفر کی اجازت کے محتاج ہوں۔

دو شدید غلط فہمیاں

① تعجب ہے کہ جو حکومتیں لادینی بنیادوں پر مبنی ہیں اور اپنے کو اسلامی تو کجا، مذہبی کہنا تک گوارا نہیں کرتیں بلکہ مذہبی ہونے کی بات ہی ان کے متعلق کوئی کہہ دے تو یہ سب سے بڑی تہمت سمجھتی ہیں ان کو کچھ لوگ دارالاسلام کہنے پر مصر ہیں کہ وہاں جمعہ اور عیدین کی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور دلیل میں اس قسم کی فقہی عبارتیں پیش کرتے ہیں جو انتہائی ناقص مطالعہ کی دلیل ہے۔

ودار الحرب تصیر دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیها کجمعة وعیدین
وان بقی فیها کافر اصلی وان لم تتصل بدار الاسلام. (درمختار، جلد۳، ص:۳۷۷)

ترجمہ: دارالحرب میں اسلامی احکام مثلاً ''جمعہ وعیدین'' جاری کرنے سے دارالحرب دارالاسلام بن جاتا ہے اگر چہ اس میں کوئی اصلی کافر باقی ہو اور اگر چہ دارالاسلام سے متصل نہ ہو۔

اس عبارت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ پس منظر جان لینا ضروری ہے کہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں کے لئے ایک اہم شرط سلطان یا نائب سلطان کا ہونا بھی ہے، دارالحرب میں سلطان کے وجود کا سوال ہی کیا ہے اس لئے دار الحرب میں جمعہ وعیدین کی نمازیں نہیں قائم کی جاتیں، پس اس عبارت میں بتایا جارہا ہے کہ جب کسی دارالحرب پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے اور سلطان المسلمین احکام اسلام جاری کرے مثلاً جمعہ اور عیدین کی نمازیں قائم کرے تو وہ دارالحرب دارالاسلام بن جائے گا۔

واضح رہنا چاہئے کہ ''جمعہ وعیدین'' شرح کے الفاظ ہیں، جن کے ذریعہ اجراء احکام کی مثال دی گئی ہے یہ دونوں نمازیں اجراء احکام کی مثال اس لئے بن جاتی ہیں کہ ان کے قیام کے لئے جیسا کہ اوپر کہا گیا سلطان کا ہونا شرط ہے اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد یہ بخوبی سمجھا جاسکتا ہے کہ محض جمعہ اور عیدین کا قیام دارالاسلام کی علامت نہیں ہے، بلکہ اجراء احکام جن کا ایک جزء جمعہ وعیدین بھی ہے دارالاسلام کی علامت ہے، اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ لادینی حکومتوں میں جمعہ اور عیدین کے قیام کی نوعیت یہ ہے کہ سلطان نہ ہونے کے باوجود بس تاویلاً علماء نے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ایسی صورت میں جمعہ اور عیدین کو اجراء احکام کی علامت قرار دے دینا کیونکر درست ہوسکتا ہے، لہٰذا اس کو دارالاسلام کی علامت بنا دینا صریح غلطی ہوگی۔

(۲) لان الموضع الذی لایا من فیه المسلمون جملة دار الحرب فان دار الاسلام اسم للموضع الذی یکون تحت ید المسلمین وعلامة ذلك ان یامن فیه المسلمون. (شرح السیر الکبیر، جلد۳، ص:۸۱)

ترجمہ: کیونکہ وہ جگہ جہاں مسلمان مامون نہ ہوں دارالحرب کے علاقہ سے ہوتی ہے اس لئے کہ دارالاسلام اس جگہ کا نام ہے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ مسلمان وہاں مامون ہوں۔

اس طرح کی عبارتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ دارالاسلام کی ایک علامت مسلمانوں کا مامون ہونا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو کسی علاقہ کے دارالاسلام ہونے کا لازمی نتیجہ ہے لیکن اس کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جہاں مسلمان مامون ہوں وہ لازماً دارالاسلام بن جائے آخر دارالحرب میں بھی تو مسلمان بحیثیت مستامن جاتا ہے اور وہ مامون ہوتا ہے مگر اس قسم کی عبارتوں کا سہارا

لے کر لادینی حکومتوں کے کاسہ لیس کبھی کبھی یہ دعویٰ کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں جگہ مسلمان امن وامان سے ہیں اس لئے وہ ملک دارالاسلام ہے حالانکہ کتب فقہ میں ان مقامات پر کسی خاص صورت حال کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے دارالاسلام اور دارالحرب کی بعض علامتوں کا ذکر ہوتا ہے جس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ یہ چیز جہاں پائی جائے گی وہ لازماً دارالاسلام ہوگا۔ یہ استدلال بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ فلاں شخص مسلمان ہے کیونکہ سچ بولتا ہے لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ہر سچ بولنے والا مسلمان ہو، ایک مشرک بھی تو سچ بول سکتا ہے ؟!

مسئلہ یہ ہے کہ زمانہ جنگ میں اسلامی لشکر ایک ایسی جگہ پہنچا جہاں اگر چہ اب کفّار کا تسلط نہیں ہے لیکن مسلمان بھی وہاں اپنی پوزیشن پوری طرح مضبوط نہیں کر پائے ہیں اور انھیں بھی ہر وقت اندیشہ ہے کہ دشمن کب نہ حملہ آور ہو جائے۔ بتایا گیا کہ اس مقام سے اسلامی لشکر جو کچھ لائے گا غنیمت ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ مقام ابھی دارالاسلام کا علاقہ نہ قرار پایا ہے اور کیوں قرار نہ پایا ہے اس کی وجہ مذکورہ عبارت میں بتائی گئی ہے کہ دارالاسلام کی ایک لازمی صفت یعنی مسلمانوں کا مامون ہونا ناپید ہے۔ واضح رہے کہ دارالاسلام کے لئے امن لازم ہے مگر امن کے لئے دارالاسلام کا ہونا لازم نہیں ہے۔

علی الاطلاق امان کی بحث

کسی غیر مسلم اسٹیٹ ''جو کبھی دارالاسلام رہ چکا ہے'' میں اگر مسلمان امن سے ہیں تو وہ غیر مسلم اسٹیٹ بھی دارالاسلام ہے یا دارالاسلام کے حکم میں ہے؟ اس کے ثبوت میں بدائع الصنائع کی اس عبارت کو پیش کیا جاتا ہے۔

ان الامان ان كان للمسلمين فيها على الاطلاق والخوف للكفرة على الاطلاق فهى دارالاسلام وان كان الامان فيها للكفرة على الاطلاق والخوف للمسلمين على الاطلاق فهى دار الكفر . (الجزء السابع، صفحہ:۱۳۱)

ترجمہ: بلاشبہ اگر امان اس میں علی الاطلاق مسلمانوں کے لئے ہے اور خوف علی الاطلاق کفار کے لئے ہے تو یہ دارالاسلام ہے۔

اور اگر امان علی الاطلاق کفار کے لیے اور خوف مسلمانوں کے لیے ہے تو یہ دارالکفر ہے۔

صاحب بدائع نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کی توجیہ کرتے ہوئے یہ احتمال دکھایا ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کی ترکیب اضافی میں اسلام اور کفر سے مراد عین اسلام اور عین کفر نہ ہو بلکہ ان دونوں کے نتائج یعنی امان اور خوف مراد ہوں۔ پھر اسی احتمال کی بنیاد پر مذکورہ بالا بات کہی ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی زبردست غلطی یہ کی جارہی ہے کہ کچھ لوگوں کے خیال میں یہ بات کسی غیر مسلم اسٹیٹ

کے بارے میں کہی جارہی ہے مگر یہ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے اگر کسی علاقہ پر اہل کفر کا اقتدار پوری طرح جم گیا ہے تو پھر یہ بحث ہی کیا رہ جاتی ہے کہ وہ دارالاسلام ہے یا دارالکفر، ہاں یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی علاقہ پر ہر دو فریق میں سے کسی کا بھی اقتدار اور قبضہ مکمل نہ کہا جاسکتا ہو۔

دوسری غلطی علی الاطلاق امان اور خوف کے مفہوم کو متعین کرنے میں کی جاتی ہے۔صاحب بدائع کے اگلے ہی الفاظ سے ان کا مفہوم متعین کیا جاسکتا ہے۔

فما تقع الحاجة للمسلمین الی الاستیمان بقی الامن الثابت فیها علی الاطلاق فلاتصیر دار الکفر.

ترجمہ: پس جب تک مسلمانوں کے لئے (ان سے نئے سرے سے) امن لینے کی ضرورت نہ پڑے اس میں ثابت شدہ امن علی الاطلاق باقی رہے گا اور وہ دارالکفر نہ ہوگا۔

اس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ اس علاقہ پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہو اور کوئی دوسرا اقتدار نہ آیا ہو کہ اس سے نئے سرے سے امن حاصل کرنے کی ضرورت پڑے۔ نئے سرے سے امان حاصل کرنے کی ضرورت پڑتی ہی اس وقت ہے جب کہ ایک اقتدار ختم ہو کر دوسرا اقتدار آتا ہے اور شہریت کے لیے نئی بنیادیں اور نئے اصول قائم کئے جاتے ہیں۔

پھر آگے کہتے ہیں دارالاسلام میں مسلمانوں کو جو امن حاصل ہوتا ہے وہ علی الاطلاق ہے اور کفّار کو حاصل شدہ امان علی الاطلاق نہیں بلکہ عقد ذمہ اور استیمان کی بناء ہوتا ہے۔

وهو ثبوت الامن فیها علی الاطلاق للمسلمین وانما یثبت للکفرة بعارض الذمة والاستیمان.

حاصل گفتگو یہ ہے کہ کسی کے لئے امان علی الاطلاق ہونے کے معنی ہیں کہ اس کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے اور اقتدار اعلیٰ کے بغیر جو امان ملتا ہے وہ امان علی الاطلاق نہیں ہے۔

دارالحرب کی تعریف

دارالاسلام کی تعریف اور خصوصیت معلوم کرنے کے بعد دارالحرب کا ایک ہلکا تصور اور خاکہ آپ کے ذہن میں آ گیا ہوگا اب اسی خاکہ میں ہم رنگ بھرنا چاہتے ہیں۔

دارالحرب وہ ملک ہے جہاں شرک فتنہ بننے کی پوزیشن میں موجود ہو۔ اور دین کل کا کل اللہ کے لئے نہ ہو۔ کفر وشرک کی عملداری اور حکمرانی ہو اور حلت اور حرمت کے اختیارات اہل کفر کو حاصل ہوں۔ اس لئے کہ غیر

مسلمین کے زیر اقتدار کسی ملک کے مستقل بالذات قابل جنگ ہونے کے یہی اسباب قرآن میں بتائے گئے ہیں۔ان آیات پر دوبارہ غور فرمایئے تو یہ حقیقت منکشف ہوگی۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ:ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنۂ شرک ختم ہوجائے اور دین کل کا کل اللہ کے لئے ہوکر رہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں سے ان لوگوں سے جنگ کرو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور رسول کی حرام ٹھہرائی ہوئی چیز کو حرام نہیں کرتے اور دین حق کی پیروی نہیں کرتے۔

قرآن کی روشنی میں دارالحرب کی جو تعریف ہم نے اوپر بیان کی ہے اس میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جہاں دارالحرب کا ایک رُخ کفر وشرک کی عملداری اور حکمرانی ہے وہیں اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اسلام کو بالادستی حاصل نہ ہو اور اسلامی احکام جاری اور نافذ نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ معاہد ملک جس سے مسلمان اس شرط کے ساتھ جزیہ لے رہے ہوں کہ وہاں اسلامی احکام جاری نہ کئے جائیں گے اس کو بھی دارالحرب قرار دیا گیا ہے۔اس کے ثبوت کے لئے چند سطور پہلے نقل کردہ شرح السیر الکبیر کی یہ عبارت ملاحظہ فرمایئے:

''اور جب اہل حرب کے داروں میں سے کسی دار کے باشندوں سے مسلمانوں نے اس شرط کے ساتھ صلح کرلی کہ وہ ہر سال مسلمانوں کو ایک متعین شئ اس شرط پر دیں گے کہ مسلمان اپنے قوانین ان پر جاری نہ کریں گے تو یہ دارالحرب ہوگا کیونکہ کوئی دار، دارالاسلام اس وقت بنتا ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کا قانون جاری کیا جائے اور مسلمانوں کا قانون جاری نہیں ہے اس لئے یہ دارالحرب ہوگا۔''

علاوہ ازیں دارالاسلام کی تعریف اور خصوصیت سے بھی دارالحرب کی وہی تصویر ذہن میں آتی ہے جو اوپر ہم نے پیش کی ہے۔اسی بات کی طرف عالمگیری نے صاحبین اور امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اختلاف بیان کرتے ہوئے صاحبین کی رائے ذکر کرنے کے بعد ''**وھو القیاس**'' یہی قیاس کا تقاضا ہے کے الفاظ کے ذریعہ اشارہ کیا ہے جس طرح دارالاسلام کے لئے بالاتفاق ایک ہی شرط ہے اور وہ یہ کہ احکام کفر کا اظہار اور اجراء ہو اور امام صاحب کے نزدیک اس شرط کے ساتھ دو اور بھی شرطیں ہیں۔اس اختلاف کی صحیح نوعیت سمجھنے ہی پر حقیقت کا سمجھنا بڑی حد تک منحصر ہے۔اس لئے اس پر ہم ذرا تفصیلی گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

پہلے اختلاف کو اصلی لفظوں میں دیکھئے:

قال محمد في الزيادات انما تصير دار الاسلام دار الحرب عند ابي حنيفة بشرائط ثلاث احدها اجراء احكام الكفار على سبيل الاشتهار وان لا يحكم فيها بحكم الاسلام والثاني ان تكون متصلة بدار الحرب لا يتخلل بينهما بلدة من بلاد الاسلام والثالث لا يبقى فيها مومن ولا ذمي امنا بامانه الأول الذي كان ثابتا قبل استيلاء الكفار للمسلم باسلامه وللذمي بعقد الذمة وصورة المسئلة على ثلاثة اوجه اما ان يغلب اهل الحرب على دار من دورنا وارتد اهل مصر وغلبوا واجروا احكام الكفر وانقض اهل الذمة العهد وتغلبوا على دارهم ففي كل من هذه الصورة لا تصير دار الحرب الا بثلاث شرائط وقال ابو يوسف ومحمد بشرط واحد لا غير وهو اظهار احكام الكفر وهو القياس. (عالمگیری جلد۳، ص:۱۴۶)

ترجمہ: امام محمدؒ نے زیادات میں کہا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دارالاسلام تین شرطوں سے دارالحرب بنتا ہے۔

اول یہ کہ احکام کفار علی الاعلان جاری ہوں اور اسلامی حکم کے مطابق فیصلہ نہ کیا جائے۔

دوم یہ کہ وہ دارالحرب سے ملا ہوا ہو، علاقہ دارالاسلام کا کوئی شہر بیچ میں نہ ہو۔

سوم یہ کہ اس میں کوئی مؤمن اور ذمی اس پہلی امان سے مامون نہ ہو جو غلبہ کفار سے پہلے مسلمان کو اس کے اسلام کی وجہ سے اور ذمی کو عقد ذمہ کی بناء پر حاصل تھی اور مسئلہ کی تین صورتیں ہوں گی:

① اہل الحرب ہمارے کسی دار پر غالب ہوجائیں۔

② کسی شہر کے باشندے مرتد ہوجائیں اور غالب ہوکر احکام کفر جاری کریں۔

③ ذمی عہد کو توڑ دیں اور اپنے ملک پر تسلط پاجائیں۔

پس ان تینوں صورتوں میں دارالاسلام دارالحرب نہ بنے گا۔ مگر تین شرطوں کے ساتھ اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا صرف ایک شرط سے، اور وہ ہے احکام کفر کا غلبہ، اور یہی قیاس کا تقاضا ہے۔

واختلفوا فى دار الاسلام انها بماذا تصير دار الكفر قال ابو حنيفة انها لا تصير دار الكفر الا بثلاث شرائط احدها ظهور احكام الكفر فيها والثاني ان تكون متاخمة لدار الكفر والثالث ان لا يبقى فيها مسلم ولا ذمى امناً بالامان الأول وهو امان المسلمين وقال ابويوسف و محمد رحمهما الله انها تصير دار الكفر بظهور احكام الكفر فيها. (بدائع الصنائع الجزء السابع، صفحہ: ۱۳۷)

ترجمہ: اورانھوں نے دارالاسلام کے بارے میں اختلاف کیا ہے کہ کس چیز سے وہ دارالکفر بن جائے گا امام ابوحنیفہ نے کہا دارالاسلام دارالکفر تین شرطوں سے بنتا ہے۔

اول یہ کہ اس میں احکام کفــر کا غلبہ ہو۔

دوم یہ کہ دارالکفر سے ملا ہو۔

اورسوم یہ کہ اس میں کوئی مسلمان اورذمی سابق امان کے ساتھ مامون نہ ہو اور وہ سابق امان مسلمانوں کی امان ہے۔

امام ابو یوسف وامام محمد رحمہا اللہ نے کہا کہ دارالاسلام احکام کفر کے غلبہ سے دارالکفر بن جاتا ہے۔

نوٹ: امام اعظمؒ کے نزدیک کسی دارالاسلام کے دارالحرب بن جانے کیلئے تیسری شرط امان سابق کے ساتھ مسلم اورذمی کا مامون نہ ہونا ہے۔ حال میں اس موضوع پر بعض لکھنے والوں نے کہا ہے کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جس طرح پہلے ان کی جان و مال محفوظ تھا اب محفوظ نہ ہو اور پھر کہتے ہیں کہ دیکھو ہمارے ملک میں مسلمانوں کی جان و مال دستوری اور قانونی طور سے بھی محفوظ ہے اور عملی طور سے بھی۔ اس لئے یہ دارالحرب نہیں ہوسکتا۔ لیکن درحقیقت امان سابق کے نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان کو بحیثیت مسلمان اور ذمی کو بحیثیت ذمی جو امان حاصل تھا وہ ختم ہوجائے۔ دوسرے لفظوں میں اہل اسلام کا اقتدار ختم ہو چکا ہو اس کے لئے عالمگیری اور بدائع الصنائع دونوں کے خط کشیدہ الفاظ کھلا ہوا قرینہ ہیں۔ کیوں کہ مسلمان کو اس کے اسلام اور ذمّی کو عقد ذمہ کی بناء پر امان ملنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کا اقتدار ابھی موجود ہے بدائع الصنائع کے یہ الفاظ تو اس مفہوم کو بالکل قطعی بنادیتے ہیں۔

لکن لا تظهر احكام الكفر الا عند وجود هذين الشرطين اعنى المتاخمة وزوال الامان الاول لانها لا تظهر الا بالمنعة ولا منعة الا بهما والله سبحانه تعالى اعلم.

ترجمہ: لیکن احکام کفر کا ظہور ان دوشرطوں یعنی دارالکفر سے اتصال اور امان اول کے زوال کے بغیر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ان کا ظہور نہیں ہوگا مگر قوت سے، اور قوت نہیں ہوگی مگر ان دونوں شرطوں کے ساتھ۔

امان اول کے ساتھ مسلمان اور ذمی کے باقی نہ رہنے کی تشریح جامع الفصولین، صفحہ:۱۱، میں اس طرح ملتی ہے: ای لا یبقی اٗمنا الا بامان المشرکین.

ایک عجیب وغریب استدلال

آگے بڑھنے سے پہلے امام صاحب اور صاحبین کے اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ایک عجیب وغریب

استدلال بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

''لیکن اگر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ اختلاف حقیقی نہیں بلکہ صرف نزاع لفظی ہے کیوں کہ صاحبین محض اظہار احکام شرک کو دارالحرب ہونے کی بنیاد قرار دیتے ہیں تو یہ مطلق نہیں ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر شخص کو مذہب کی آزادی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان میں بھی تھی اور اس حد تک تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسے متقشف اور متصلب فی الدین فرمانروا کے خزانہ شاہی سے مندروں کے لئے باقاعدہ گھی اور تیل مہیا کیا جاتا تھا۔ اور مندروں کے لئے پجاریوں اور پنڈتوں کے ماہانہ وظیفے اور روزینے مقرر تھے چند سال ہوئے صرف ایک شہر اجین سے عالمگیر کے ایسے چالیس فرمان دستیاب ہوئے تھے جن میں وہاں کے مہنت اور پنڈتوں کو جاگیریں عطا کی گئی تھیں پس احکام شرک کا ظہور اسلامی حکومت کے ماتحت دارالاسلام میں بھی ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے تو احکام شرک کا مطلقاً اظہار دارالحرب ہونے کی بنیاد کیونکر قرار پاسکتا ہے اس بناء پر لامحالہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ اظہار احکام شرک سے صاحبین کی مراد اہل شرک کا قہر وغلبہ اور ایسا استیلاء اور استبداد ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شعائر پر قائم رہنے اور مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی آزادی نہ رہے اور وہ اس معاملہ میں مقہور ومغلوب ہوجائیں۔ امام صاحبؒ نے اظہار احکام شرک جو ان میں اور صاحبین میں مشترک شرط ہے اس کے علاوہ باقی جو دو شرطیں اور مقرر کی ہیں وہ درحقیقت اسی استیلاء یا قہر وغلبہ اہل شرک کی علامتیں ہیں نہ کہ مستقل کوئی دو جُداگانہ چیزیں۔ اس تجزیہ کے بعد یہ بات بالکل عیاں ہوجاتی ہے کہ امام صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ دراصل اسی ایک چیز کی توضیح اور تشریح ہے جسے صاحبین نے ایک جملہ میں بیان کردیا ہے۔''

(برہان، اگست ۲۲، صفحہ:۷۶)

① اس استدلال میں ایک زبردست خامی یہ ہے کہ ایک مسلمان بادشاہ کے ایک غیر شرعی فعل کو شرعی بنیاد کی حیثیت میں پیش کرکے نتیجہ نکالا گیا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ مندروں کے لئے گھی اور تیل مہیا کرنے کو کس نے جائز قرار دیا ہے؟ اس میں کوئی نص وارد ہوئی ہے؟ کسی شرعی اصول کا اقتضاء ہے؟ یا اسلاف میں سے کسی مفتی نے اس کا فتویٰ دیا ہے؟ اور کسی نے جواز کا فتوی دیا بھی ہو تو بھی صاحبین کی ایک واضح اور غیر مبہم رائے میں تاویل کرنے کی گنجائش کہاں سے نکلتی ہے ؟؟

دوسری غلطی احکام شرک کے اظہار کے مفہوم کو سمجھنے میں کی گئی ہے۔ اظہار کا مطلب حکم پر عمل کرنا ہو تو ہر دارالاسلام کو دارالحرب کہا جاسکتا ہے کیوں کہ دارالاسلام میں ذمیوں کو نجی دائرہ میں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ جیسے کہ آگے آرہا ہے۔ فی الواقع مذہب پر عمل کی اجازت کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ دارالاسلام

میں احکام شرک کا ظہور ہوتا ہے۔ نجی دائرہ کے علاوہ شرکیات کی مطلق اجازت نہیں ہوتی۔ چنانچہ معاملات، حدود اور تعزیرات میں مسلم اور ذمی دونوں یکساں اسلامی احکام کے پابند ہوتے ہیں اور یہ تو ایک بدیہی بات ہے کہ ایک ملک میں بیک وقت دو متضاد قسم کے احکام کا ظہور نہیں ہوسکتا ہے۔

لان الذمی ملتزم احکام الاسلام فیما یرجع الی المعاملات فانه من اهل دارنا فیقام علیه الحدود کلها الا حد الخمر فانه لا یعتقد حرمة شربه الخ.

(شرح السیر الکبیر، جلد ۱، صفحہ: ۲۰۷)

ترجمہ: کیوں کہ ذمی اسلامی احکام کا ان چیزوں میں پابند ہے جن کا تعلق معاملات سے ہے اس لئے کہ وہ ہمارے دار کا باشندہ ہے پس اس پر تمام حدود قائم کئے جائیں گے باستثناء حد خمر، کہ وہ اس کی حرمت کا اعتقاد نہیں رکھتا۔

اختلاف کی صحیح نوعیت

امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف درحقیقت دارالحرب کی تعریف اور خصوصیت میں نہیں ہے کیوں کہ یہ ایک ایسی مسلم اور بدیہی بات ہے جس میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ جہاں اسلام کی عملداری اور حکمرانی ہو وہ دارالاسلام ہے اور جہاں کفر وشرک کی عملداری اور حکمرانی ہو وہ دارالحرب ہے۔ یہ چیز اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ یہاں دو سوال بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک سوال تو یہ کہ دارالحرب کی تعریف اور خصوصیت کیا ہے؟ اور دوسرا سوال یہ کہ دارالاسلام کے کسی علاقہ پر دارالحرب کا حکم کب لگایا جائے گا؟ مثلاً کسی دارالاسلام پر مشرکین نے حملہ کیا اور دارالاسلام کے کسی حصہ پر قبضہ کر لیا اس وقت یہ سوال اٹھتا ہے کہ اس حصہ کو دارالحرب قرار دیا جائے یا سابق حکم دارالاسلام کا لگایا جائے گا۔ اس لئے کہ اسی فیصلہ پر بہت سارے فیصلوں کی بنیاد ہے۔

اس بات کو ٹھیک طور سے نہ سمجھنے کا یہ نتیجہ ہے کہ جو ملک زمان تاریخ میں کبھی بھی دارالاسلام رہ چکے ہیں بعض لوگ ان کا ایک مستقل حکم بتاتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ایسے ملک میں جب تک مسلمانوں کی جان مال محفوظ ہے وہ دارالحرب نہیں ہوسکتا، کوئی کہتا ہے کہ جب تک مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے اس وقت تک وہ ملک دارالحرب نہیں ہوگا۔ حالانکہ کسی ملک پر ایک مرتبہ اہل اسلام کے اقتدار کا ہوجانا کوئی ایسی شرعی بنیاد نہیں ہے جس کا لحاظ قیامت تک رکھنا ضروری ہو۔ اہل اسلام ہوں یا اہل کفر پرانے اقتدار کے مکمل طریقہ سے خاتمہ کے بعد جس کا بھی مکمل قبضہ ہوجائے اعتبار اسی کا ہوگا۔ مسلمان کا مال کفّار نے چھین لیا اور دارالحرب میں اٹھالے گئے اب مسلمان کی ملکیت کا اعتبار بالکل ختم ہوگیا ہاں دارالحرب میں پہونچنے سے پہلے ان کی ملکیت نہیں مانی جائے گی کہ ابھی ان کا قبضہ مکمل نہیں ہوا ہے۔

امام صاحب اور صاحبین کا اختلاف دوسرے سوال کے جواب میں ہے نفس دارالحرب کی خصوصیت اور تعریف میں نہیں ۔ عالمگیری کی جو عبارت ہم نے نقل کی ہے اس میں دیکھو کس طرح ان تین ہی صورتوں میں اختلاف کو محصور کر دیا ہے:

① اہل الحرب ہمارے کسی دار پر غالب ہو جائیں۔

② کسی شہر کے باشندے مرتد ہو جائیں اور غالب ہو کر احکام کفر جاری کریں۔

③ ذمی عہد کو توڑ دیں اور اپنے ملک پر تسلط حاصل کرلیں۔

دوسری کتب فقہ میں بھی اس اختلاف کو جن موقعوں پر ذکر کیا گیا ہے ان کو دیکھنے سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے اور صاحب بدائع الصنائع نے تو اس کی صراحت کر دی ہے:

وقياس هذا الاختلاف فى ارض لاهل الاسلام ظهر عليه المشركون و اظهروا فيها احكام الكفر او كان اهلها اهل ذمة فنقضوا الذمة واظهروا احكام الشرك هل تصير دار الحرب فهو على ماذكرنا من الاختلاف.

ترجمہ: اس اختلاف کا قیاس اہل اسلام کی ایک ایسی زمین کے بارے میں ہے جس پر مشرکین غالب ہو گئے ہوں اور اس میں احکام کفر نافذ کر دیا ہو یا اس زمین کے باشندے ذمی تھے پس ذمہ کو انھوں نے توڑ دیا اور احکام شرک نافذ کر دیا ہو۔ کیا وہ زمین دارالحرب ہوگی؟ پس یہ مسئلہ ہمارے ذکر کردہ اختلاف کے مطابق ہے۔

گویا صاحبین دونوں سوالوں کے جواب میں ایک ہی بات کہتے ہیں اور امام صاحب نے دوسرے سوال کے جواب میں دو مزید شرطوں کا اضافہ کر دیا ہے اب یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر امام صاحبؒ نے قیاس کے خلاف دو شرطوں کا اضافہ کیوں کیا اور یہ شرطیں آیا دارالحرب کی ماہیت اور خصوصیت میں داخل ہیں یا کچھ دوسرے اسباب کی بناء پر ہیں؟

اس سلسلے میں ہم کہیں گے کہ جس صورت حال سے متعلق یہ اختلاف ہے اس میں حالات بدلتے رہتے ہیں اور کسی حالت کو قرار نہیں ہوتا، اگر ایک علاقہ پر صبح کو مسلمانوں کا قبضہ ہے تو عین ممکن ہے کہ شام کو فریق ثانی کا تسلط ہو جائے۔ فوجیں ہٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ امام صاحبؒ کی شرطوں کی غرض یہ ہے کہ ایسی غیر اطمینانی حالت میں ہر علاقہ پر اس کا سابق ہی حکم لگے گا وقتی اور عارضی قبضہ اور تسلط کا اعتبار نہ کیا جائے گا۔ علامہ سرخسیؒ نے امام صاحبؒ کی دو مزید شرطوں کی جو وضاحت کی ہے اس کا ماحصل ہم پیش کرتے ہیں۔

امام صاحبؒ نے پوری قوت اور غلبہ ① کا اعتبار کیا ہے اور یہ چیز ان تین شرطوں سے حاصل ہوگی کیوں کہ وہ علاقہ اگر کسی دارالحرب سے متصل نہیں ہے تو گویا وہ ہر جانب سے مسلمانوں کے احاطہ قدرت میں ہے، اسی

طرح اگر کسی مسلمان اور ذمی کو سابقہ بنیاد اور علت پر امن حاصل ہے تو یہ کفار کے عدم قہر پر دلیل ہوگی۔ علاوہ ازیں امام صاحبؒ کا یہ ایک اصول ہے کہ جب کسی علت پر کوئی حکم لگایا جاتا ہے تو اس علت کا ادنی اثر بھی جب تک باقی رہتا ہے وہ حکم مرتفع نہ ہوگا مثلاً کسی آبادی کو اول اول آباد کرنے والوں میں سے جب تک ایک شخص بھی وہاں ہوگا وہ آبادی انھیں کی جانب منسوب ہوگی۔ دوسرے باشندوں اور خریدنے والوں کا اعتبار نہ ہوگا کھجور وغیرہ کا رس اپنی اصلی حالت سے بدل جانے کے بعد جب تک جھاگ نہ پھینک دے اس وقت تک اس پر خمر ہونے کا حکم نہ لگایا جائے گا اسی طرح جو ملک چاروں طرف سے دارالاسلام سے گھرا ہوا ہو اس پر دارالحرب ہونے کا حکم بالکل ویسے ہی نہ لگائیں گے جس طرح احکام شرک کے عدم اظہار اور اجراء میں دارالحرب کا حکم نہیں لگتا کہ ان کا غلبہ وقتی اور عارضی متصور ہوگا۔ (کتاب المبسوط، جزعاشر، صفحہ: ۱۱۴)

بعض کتب فقہ میں یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ امام صاحب کی شرائط میں اس اصول کا بھی لحاظ ہے کہ الاسلام یعلو ولا یعلی ''اسلام غالب ہو کر رہتا ہے مغلوب نہیں'' اور یہ بالکل صحیح ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعینہ ایک جیسے حالات میں دارالاسلام کے لئے صرف ایک شرط اور دارالحرب کے لئے تین شرطیں۔

''دارالاسلام ان تین شرطوں کے بغیر دارالحرب نہیں بنتا:

(۱) اہل شرک کے احکام کا اجراء۔

(۲) دارالحرب سے اتصال۔

(۳) پہلی امان کے ساتھ کسی مسلم اور ذمی کا باقی نہ رہنا۔

اور دارالحرب ایک شرط سے دارالاسلام بن جائے گا اور وہ ہے اہل اسلام کے احکام کا اجراء، اگرچہ وہاں کوئی اصلی کافر باقی ہو اور وہ دارالاسلام سے متصل نہ ہو۔'' (متن درمختار، صفحہ: ۲۷۷)

دارالاسلام دارالحرب کب ہوگا؟

اس گفتگو سے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصل تعریف میں کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ جس طرح دارالاسلام کے لئے بس ایک شرط ہے احکام اسلامی کا اجراء۔ جس میں غلبہ مسلمین لازماً آ ہی جاتا ہے اسی طرح دارالحرب کے لئے بھی محض ایک شرط احکام کفر کا اجراء ہے جس میں غلبہ کفار لازماً شامل ہے اور امام صاحبؒ اور صاحبین کا اختلاف ایک خاص حالت سے متعلق ہے اور وہ اختلاف بھی کوئی بنیادی نہیں۔

اس حقیقی واقعہ کے ظاہر ہونے سے ان لوگوں کے استدلال کی کمزوری بالکل سامنے آجاتی ہے جو لوگ اس خاص حالت سے متعلق امام صاحبؒ کی شرطوں اور کتب فقہ میں ان کی تشریحات کو پیش کر کے یہ ثابت کرتے ہیں

کہ جب تک کسی ملک میں نماز، روزہ اور اسی طرح کی کچھ اور مذہبی آزادی حاصل ہے دارالحرب نہیں ہوسکتا، مگر ایک خاص حالت میں تو یہ بات صحیح ہے لیکن ہر حالت میں نہیں۔ اس لئے کہ جیسا کہ معلوم ہوا کہ دارالحرب کی اصل خصوصیت احکام کفر کا اجراء ہے اور دارالاسلام کے بعض آثار کا موجود ہونا کسی دار کے دارالحرب بن جانے میں مانع ہے تو صرف اس لئے کہ ان آثار کا موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کفار کا غلبہ اور اقتدار ابھی پوری طرح مستحکم اور اٹل نہیں ہوا ہے اور اس کے لئے ابھی کشمکش جاری ہے۔

الغرض جب تک ان کے اقتدار کے مستقل اور مستحکم نہ ہونے کے آثار موجود ہیں اس وقت تک دارالحرب ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے گا اور اس پر سابق حکم دار الاسلام ہونے ہی کا لگایا جائے گا اور یہ اصول جس طرح دارالاسلام کے کسی علاقہ کو دارالحرب بننے نہیں دیتا، اسی طرح دارالحرب کے کسی علاقہ کو دارالاسلام بنانے میں بھی مانع ہے، چنانچہ کوئی مقام جو دارالحرب کا علاقہ رہا ہے لیکن اب اس میں کفار اور مسلمانوں دونوں کی یکساں پوزیشن ہوگئی اور کسی کو بھی کامل تسلط حاصل نہیں اور اس کمزور پوزیشن کی بناء پر دونوں کو یکساں اندیشہ لاحق ہو تو وہ مقام دارالاسلام نہ قرار دیا جائے گا اور مسلمان وہاں سے جو کچھ بھی حاصل کریں گے، وہ غنیمت میں شمار ہوگا۔

ولكن هذه البقاع كانت في يد اهل الحرب فلا تصير دار الاسلام الا بانقطاع يد اهل الحرب عنها من كل وجه وهذا لان ما كان ثابتا فانه يبقى ببقاء بعض اثاره. ولا يرتفع الا باعتراض معنى هو مثله او فوقه. (السیر الکبیر، جلد۳، ص:۸۱)

ترجمہ: اور لیکن یہ زمینیں اہل حرب کے قبضہ میں تھیں پس دارالاسلام نہ بنیں گی اِلاّ یہ کہ پورے طور سے اہلِ حرب کا قبضہ ختم ہوجائے اور یہ اس لئے کہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اپنے بعض آثار کے باقی رہنے سے باقی رہتی ہے اور اس کا حکم مرتفع نہیں ہوتا الا یہ کہ کوئی ایسی چیز آجائے جو اس کے برابر ہو یا اس سے اونچی۔

اس پس منظر میں فقہ کی ان عبارتوں کو سمجھئے۔

ان دار الاسلام لا تصير دار الحرب اذا بقي شي من احكام الاسلام وان زالت غلبة اهل الاسلام

ترجمہ: یعنی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک اس میں اسلامی احکام میں سے کچھ بھی باقی ہو اگرچہ اہل اسلام کا غلبہ زائل ہوگیا ہو۔

ان دار الاسلام لا تصير دار الحرب مالم يبطل جميع ما به صارت دار الاسلام

ترجمہ: یعنی دارالاسلام اس وقت تک دارالحرب نہیں ہوسکتا جب تک وہ سب چیزیں فنا نہ ہوجائیں جن کے باعث وہ ملک دارالاسلام بنا تھا۔

اس قسم کی عبارتوں کو موقع ومحل اور پس منظر سے جدا کر کے یہ ثابت کرنے کے لئے دلیل میں پیش کرنا کہ مذہبی آزادی جس ملک میں ہو وہ دارالحرب نہیں ہوسکتا بہت بڑی ڈھٹائی ہے حالانکہ ان عبارتوں میں اسی صورت حال کا حکم بتایا گیا ہے جس میں امام صاحبؒ نے تین شرطیں لگائی ہیں۔ اس لئے مذہبی آزادی مانع دارالحرب صرف اس وقت ہوگی جبکہ وہ کفار کے استیلاء اور اقتدار کے نامکمل اور غیر مستحکم ہونے کی دلیل ہو۔ اسی طرح کسی ملک میں مسلمانوں کا مطلق مامون ہونا بھی اس کے دارالحرب بننے کی راہ میں حائل نہیں ہے، بلکہ سابق بنیاد پر ملا ہوا ایسا امن وامان مانع دارالحرب ہے جو کفار کے قہر وغلبہ کے غیر مستحکم اور عارضی ہونے کی علامت بن سکے، چنانچہ عالمگیری اور بدائع الصنائع کی پیچھے نقل کردہ عبارتوں میں "بامانه الاول" "بالامان الاول" کے الفاظ سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

ظاہر ہے جب کسی ملک میں ایک مسلمان کی جان ومال اس بناء پر محفوظ ہے کہ وہ ایک مسلمان ہے اور ایک ذمی اس لئے محفوظ ہے کہ وہ ذمی ہے تو یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ کفار کے نئے اقتدار نے پرانے مسلم اقتدار کو ختم نہیں کیا ہے ورنہ کسی کافر کے ذمی ہونے کا سوال ہی کیا ہوتا۔ اسلامی اقتدار ختم ہونے کے بعد عقد ذمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے اور ایک مسلمان کو دوسری بہت ساری حیثیات سے بہت کچھ مل سکتا ہے لیکن مسلمان ہونے کی بناء پر کچھ نہیں ملتا۔ واضح رہنا چاہئے کہ دارالاسلام میں ایک مسلم کی ہر چیز محفوظ اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہے اور مسلمان کی جان ومال، عزت، آبرو کو اسلام نے محترم ٹھہرایا ہے اور اگر کسی غیر اسلامی اسٹیٹ میں ایک مسلمان کو امان ملتی ہے تو اس بنیاد پر کہ اس کے ساتھ ایک عہد ہے یا وہ ملک کا ایک شہری ہے۔

اب یہ سمجھنا کچھ دشوار نہیں کہ کوئی ملک کسی زمانہ میں دارالاسلام رہا ہے لیکن پھر اس پر کفّار غالب ہو گئے اور سالہا سال انھوں نے حکومت کی، جس طرح چاہا اپنے اقتدار کو مستحکم بنالیا، جو چاہتے ہیں قانون بناتے ہیں جس کو چاہا جائز قرار دیا اور جس کو چاہا ممنوع ٹھہرایا اور دوسری طرف دارالاسلام یا تو بالکل ختم ہو گیا یا اس کی قوت ٹوٹ چکی ہے۔ ایسی حالت میں اہل ملک اپنے مصالح کے تحت مسلمان باشندوں کو بھی کچھ عبادات اور پرسنل لاء میں آزادی دے رہے ہیں تو وہاں یہ آزادی کیونکر دارالحرب ہونے میں مانع ہوگی۔ چنانچہ آگے ہم بتائیں گے کہ کسی بھی دارالحرب میں کوئی مسلمان مستامن بن کر جا سکتا ہے اور فقہاء اس کے لئے مستقل باب قائم کرتے ہیں اور مستامن سے متعلق احکام بیان فرماتے ہیں کہ اس کے لئے کیا جائز ہے اور کیا ناجائز۔

مشترکہ حکومت مانع دارالحرب نہیں

اگرچہ اوپر کی گفتگو سے مشترکہ حکومت کی حیثیت کھل کر سامنے آگئی ہے لیکن خاص طور سے اس مسئلہ پر

تھوڑا غور کر لیجئے۔

مشترکہ حکومت کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً مسلمانوں کو آبادی کے لحاظ سے حکومت میں نمائندگی دی جائے، ایسی شکل میں اگر مسلمان اقلیت میں ہوں تو ان کے غلبہ کا کوئی سوال نہیں اور اگر اکثریت میں ہیں اور پھر بھی غیر اسلامی بنیادوں پر حکومت بنائی گئی ہے تو یقیناً وہ نام اور تعداد کے اعتبار سے غالب ہوں گے۔

اسی طرح اگر جداگانہ انتخاب کا سسٹم نہیں ہے بلکہ مشترکہ ووٹنگ سے حکومت بنائی گئی ہے تو اس صورت میں مسلمان نام اور تعداد کے اعتبار سے غالب ہو سکتے ہیں اور مغلوب بھی لیکن ان تمام صورتوں میں مسلمان حقیقت کے اعتبار سے مغلوب قرار دیئے جائیں گے اس لئے کہ غیر دین کا غلبہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مغلوب ہیں اگر وہ غالب ہوتے تو ضرور دین کو بھی غلبہ حاصل ہوتا۔ ہاں اگر یہاں یہ کہا جائے کہ مسلمان غالب تو ہیں لیکن وہ غیر دینی نظام ہی کو مناسب اور بہتر سمجھتے ہیں اس لئے انھوں نے خود اس کو پسند کیا ہے اور اسے نافذ کیا ہے تو ہم کہیں گے کہ اس شکل کو مشترکہ حکومت میں شامل نہ کیجئے۔ یہ مسئلہ اس سوال کے تحت آتا ہے کہ جہاں مسلمانوں نے خود مختار ہونے کے باوجود غیر الٰہی نظام حکومت کو پسند کیا ہے اور اپنے ہاتھوں سے بت خانہ تعمیر کیا ہے اس ملک کی کیا حیثیت ہے۔ اس لئے اس مسئلہ کو ملتوی رکھئے۔

غرض یہ کہ مشترکہ حکومت کی جو ہیئت بھی بنے گی وہ لامحالہ دارالحرب ہی ہوگی کیوں کہ بہرصورت اس میں غیر اسلامی احکام نافذ ہوں گے اور اسلامی احکام کے ماسوا جو قوانین اور احکام بھی ہوں گے وہ احکام کفر ہی قرار پائیں گے۔ خواہ ان کے نام کچھ ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ نے ایک خاص حالت میں دارالحرب کے لئے تین شرطیں لگائیں جن پر پہلے ہم بحث کر چکے ہیں۔ ان میں ایک شرط "احکام شرک کے اجراء" کی تشریح عالمگیری کے لفظوں میں کرنے کے بعد صاحبِ ردالمحتار نے اپنے ان لفظوں میں ایک نتیجہ نکالا ہے:

و ظاهره انه لو اجريت احكام المسلمين و احكام اهل الشرک لا تكون دار الحرب۔ (جلد۳، صفحہ:۳۷۷)

ترجمہ: اس کا ظاہر یہ ہے کہ اگر مسلمانوں اور اہل شرک دونوں کے احکام جاری ہیں تو وہ دارالحرب نہ ہوگا۔

ردالمحتار کے ان الفاظ میں دراصل اس علاقہ کا حکم بتایا گیا ہے جس پر قابض اور حکمران ہونے کا ہر دو فریق دعویٰ کر رہا ہو۔ اور مکمل اقتدار کسی کا نہ ہو لیکن ان الفاظ سے اس دور کے ایک ممتاز عالم نے مشترکہ حکومت کے دارالحرب نہ ہونے پر استدلال کیا ہے جس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ قطع نظر اس کے کہ ان الفاظ کی

مراد کیا ہے اور ان کا محل کیا ہے؟ ہم دریافت کرتے ہیں کہ مشترکہ حکومت کا مطلب آگ اور پانی کو ایک ظرف میں جمع کرنے کے علاوہ بھی کچھ ہوسکتا ہے؟! ایک ہی اسٹیٹ میں ایک طرف خدا کی حاکمیت کا تصور کارفرما ہو اور ساتھ ہی حاکمیت جمہور کا نظریہ بھی، کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ کو دستور و قانون کا ماخذ تسلیم کیا جائے اور جمہور کی مرضیات کو بھی۔

کیا ایسا ممکن ہے؟ کسی زانی کے لئے سنگسار کی سزا تجویز کی جائے اور کسی کے لئے زنا بالرضا کو جائز قرار دیا جائے۔ ایک چور کا ہاتھ کاٹ لیا جائے اور دوسرے کو چھ ماہ جیل میں مہمان رکھا جائے۔ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا اس کی کوئی نظیر پیش کی جاسکتی ہے۔؟!

حقیقت یہ ہے کہ سرے سے مشترکہ حکومت کا وجود ہی ایک امر محال ہے۔ آج جن حکومتوں کو مشترکہ حکومتیں کہا جاتا ہے وہ صحیح معنی میں کسی خاص نظریہ کے حاملین کی حکومتیں ہوتی ہیں۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان میں مختلف طبقوں، گروہوں اور قوموں کے افراد شامل ہوتے ہیں۔ لیکن مشترکہ حکومت کے نام پر عوام الناس کو بے وقوف بنایا جاتا ہے جن ملکوں میں مختلف قوموں کے چند افراد نے کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرزم جیسے نظریات پر حکومتوں کی بنیاد رکھی ہے کیا یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ان نظریات کو سب لوگوں نے قبول کرلیا ہے اور مثلاً وہاں کے تمام مسلمانوں نے اسلامی نظریات کے مقابلہ میں ان مادہ پرستانہ نظریات کو ترجیح دی ہے۔

دارالحرب سے جنگ

دارالحرب سے جنگ ضروری اور واجب ہے یہ وجوب کا حکم صرف تین صورتوں میں مرتفع ہوتا ہے:

① اسلام قبول کرلیں۔

② جزیہ دے کر اسلام کے زیرنگیں رہنا منظور کرلیں اور بحیثیت ذمی دارالاسلام کے شہری بن جائیں۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

③ مسلمانوں سے باقاعدہ ناجنگ معاہدہ ہوجائے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال:۶۱)

ترجمہ: یعنی اور اگر وہ مائل بہ صلح ہوں تو صلح کرلو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

ان باتوں کو عالمگیری کے ایک جملہ میں بیان کردیا گیا ہے:

قتال الكفار الذين لم يسلموا وهم من مشركي العرب أولم يسلموا ولم يعطو الجزية من غيرهم واجب وان لم يبدونا كذافي فتح القدير. (جلد۳،صفحہ:۱۱۹)

ترجمہ: ان کفار سے قتال کرنا واجب ہے جو ایمان نہ لائیں اور مشرکین عرب میں سے ہوں یا غیر عربی ہوں اور ایمان نہ لائیں اور جزیہ نہ دیں چاہے وہ ہم سے جنگ میں پہل نہ کریں۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے۔

دارالعہد

اسلام قبول کرنے والے مسلمان ہو گئے اور جزیہ دینے والے دارالاسلام کے شہری بن گئے۔ اب سوال صرف معاہد لوگوں کا رہ گیا ہے کہ ان پر اور ان کے علاقہ پر کیا حکم لگایا جائے تو ایسے دارالحرب کو جس کے باشندوں کے ساتھ دارالاسلام کے سربراہ نے کوئی معاہدہ کرلیا ہو دارالعہد کہتے ہیں، معاہدہ کی وجہ سے ان کے ساتھ مدت معاہدہ میں جنگ نہیں کی جاسکتی اور نہ مسلمانوں کی جانب سے کوئی ایسی کارروائی ہوسکتی ہے جو غدر اور بے وفائی کے ہم معنی ہو، اس کے علاوہ دارالعہد کے سلسلہ میں سارے احکام وہی ہیں جو دارالحرب کے بارے میں ہیں اس لحاظ سے دارالعہد کوئی مستقل بالذات دار نہیں ہے بلکہ یہ بھی دارالحرب ہی ہے چنانچہ جس طرح دارالحرب میں سودی معاملہ جائز ہے اسی طرح دارالعہد میں بھی جائز ہے مثلاً کوئی مسلمان دارالعہد میں جا کر کفّار سے دو درہم کے بدلے ایک درہم بیچے تو کوئی حرج نہیں ہے اس کی علت شرح السیر الکبیر میں یہ بتائی گئی ہے۔

لان بالموادعة لم تصر دارهم دار الاسلام وانما يحرم على المسلمين اخذما لهم بغير طيب انفسهم لما فيه من غدر الموادعة فاذا استرضاهم بهذه المعاملة فقد انعدم معنى الغدر۔ (جلد۳، صفحہ:۲۸۸)

ترجمہ: کیوں کہ معاہدہ سے ان کا دار دارالاسلام نہیں بن گیا ان کا مال ان کی مرضی کے بغیر مسلمانوں کے لیے لینا صرف اس لئے حرام ہے کہ اس میں معاہدہ کی خلاف ورزی ہو جائے گی پس جب اس نے ان کو اس معاملہ میں راضی کرلیا تو غدر کا شائبہ ختم ہو گیا۔

کوئی مسلمان دارالعہد یا دارالحرب میں امان کے ساتھ جائے اور کفّار سے کسی شئی کی بیع ایک متعین مدت کے ساتھ کرے پھر اس کے بعد اس بات پر صلح ہو جائے کہ کفار ادائیگی جلدی کر دیں وہ قیمت میں کچھ چھوڑ دے گا تو جائز ہے اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے۔

لان حرمة هذا التصرف فى دار الاسلام لمعنى الربوا من حيث ان فيه مبادلة وقد بينا ان الربوا يجوز بين المسلم والحربي في دار الحرب فيجوز هذه المعاملة. (ایضًا، جلد۳، ص:۳۲۹)

ترجمہ: کیوں کہ اس تصرف کی حرمت دارالاسلام میں ربوا کی وجہ سے ہے بنابریں کہ اس میں مبادلہ پایا جاتا ہے اور ہم واضح کر چکے ہیں کہ مسلم اور حربی کے درمیان دارالحرب میں ربوا جائز ہے پس یہ معاملہ جائز ہوگا۔

علاوہ ازیں غور کرنے کی بات ہے کہ دارالحرب کی جو تعریف اور خصوصیت ہم بتا چکے ہیں اس میں صرف معاہدہ سے فرق ہی کیا آجاتا ہے اور اگر بالفرض تسلیم کرلیا جائے کہ دارالعہد ایک مستقل بالذات دار ہے تو بھی نتائج اور احکام کے لحاظ سے تو بہرصورت وہ دارالحرب ہی ہے صلح حدیبیہ کے بعد مکہ اور اہل مکہ کی حیثیت میں فرق کیا ہوگیا تھا۔ بجز اس کے کہ دوران معاہدہ جنگ روانہیں تھی۔

واضح رہنا چاہئے کہ دارالحرب دارالعہد جس معاہدہ کے بعد بنتا ہے وہ دارالاسلام کے سربراہ کی جانب سے ہوتا ہے اور انفرادی معاہدہ سے کوئی ملک دارالعہد نہیں بنتا اس لئے اصطلاحی دارالعہد کے لئے دارالاسلام اور شرعی سربراہ کا ہونا ضروری ہے۔

دارالامن

دارالحرب کے کفار جس مسلمان سے یہ کہہ دیں کہ تم ہمارے یہاں رہ سکتے ہو ہم تم سے چھیڑ چھاڑ نہ کریں گے اس کے لئے وہ دارالحرب دارالامن بن جائے گا اور یہ عین ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ملک کچھ مسلمانوں کے لئے دارالامن ہو اور بقیہ سارے مسلمانوں کے لئے اسی ملک سے حرب وقتال کرنا جائز ہو۔ اس طرح جو مسلمان دارالحرب میں جاتا ہے اس کو اصطلاح میں مستامن کہتے ہیں۔ اور اس کو لازم ہے کہ کوئی حرکت عہد کے خلاف نہ کرے گویا مستامن بھی معاہد ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہ معاہدہ انفرادی ہوتا ہے جس کا تعلق صرف مستامن سے ہوتا ہے اور دارالعہد جس معاہدہ سے بنتا ہے وہ چونکہ دارالاسلام کے سربراہ کی جانب سے ہوتا ہے اس لئے اس کی پابندی تمام مسلمانوں پر لازم ہوتی ہے۔

مستامن دارالاسلام کا شہری ہوتا ہے اور دارالحرب میں کسی خاص غرض سے عارضی طور پر جاتا ہے اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اصطلاحی دارالامن اور مستامن کے لئے دارالاسلام کا ہونا شرط ہے۔

مستامن کو پاس عہد لازم

ولو کان اهل الحرب قالوا لمسلم انت اٰمن فادخل الینا فدخل لم یحل له ان یتعرض بشیٔ من اموالهم.

ترجمہ: اور اگر اہل الحرب کسی مسلمان سے کہیں تم مامون ہو ہمارے یہاں آؤ اور وہ چلا گیا تو اس کے لئے ان کے اموال میں سے کسی چیز سے بھی تعرض کرنا جائز نہیں ہے۔

صرف یہی نہیں کہ خود اس کے لئے دارالحرب کی کسی چیز پر دست درازی کرنا روانہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کو دست درازی اور تعرض کرنے کا حکم اور مشورہ دینا بھی اس کے لئے جرم ہے، اور ایسا کرے تو شریعت کے

نزدیک مجرم قرار پائے گا۔

كما لا يجوز للمستامن ان يقتلهم او ياخذ مالهم بغير رضاهم لا يجوز له ان يامر الاسير بذالك.

ترجمہ: جس طرح مستامن کے لئے ان کوقتل کرنا یاان کا مال لیناان کی رضا کے بغیر جائز نہیں ہے اسی طرح اس کا قیدی کوحکم دینا بھی جائز نہیں۔

دارالحرب میں امان کے ساتھ جانے کو معاہدہ قرار دیا گیا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کسی حال میں جائز نہیں، اس دنیا کی کوئی آنکھ دیکھنے والی ہو یا نہ ہو، کوئی پکڑنے والا ہاتھ موجود رہے یا نہ رہے۔ یہ کمال وفاداری اور کمال پاس عہد فقہ کے اس جزئیہ میں دیکھئے کس طرح نمایاں ہے:

''جب کوئی مسلمان دارالحرب میں مستامن ہواور دارالحرب کے کسی گاؤں میں مقیم ہو، اس وقت مسلمانوں کا کوئی بااختیار لشکر وہاں سے گزرے اور بستی کے مردوں کوقتل اور بقیہ عورتوں بچوں کو قید کرلے اور مستامن سے تعرض نہ کرے تو اس کے بعد بھی وہ مستامن ہی رہے گا اور خود اس کے لئے بستی والوں کی کسی شئی پر ہاتھ ڈالنا جائز نہ ہوگا، کیوں کہ ابھی وہ کفار کے امان میں ہے اور وہ بستی دارالاسلام نہیں ہے اور اگر لشکر بستی کے قریب جا کر پڑاؤ ڈالے اور وہ مستامن بستی سے نکل کر لشکر میں چلا جائے تو اب وہ مستامن نہ رہا۔''

(شرح السیر الکبیر، جلد۳، صفحہ:۱۰۶)

خرید وفروخت میں بھی ان کو فریب دینا مستامن کے لئے روانہیں۔ اور اگر وہ کوئی چیز غلط طریقہ سے دارالاسلام میں لے کر چلا آیا تو وہ ایک ناجائز چیز ہوگی جسے اس کو صدقہ کر دینا چاہیے۔

دارالحرب میں اسلحہ لے جانا درست نہیں

''پاس عہد، ایمانداری اور دیانت داری کا جہاں یہ تقاضا ہے کہ مشرکین کے ساتھ کوئی ایسی حرکت مستامن نہ کرے جو غدر اور بے وفائی کے ہم معنی ہو وہیں اسے رشتہ اسلام کے تقاضوں کو فراموش کرنا بھی کسی حال میں روانہیں ہے، اس لئے وہ کوئی ایسا رویہ شرعاً اختیار نہیں کرسکتا جس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کو تقویت حاصل ہو، چنانچہ دارالاسلام سے دارالحرب میں ایسی کوئی چیز لے جانا درست نہیں ہے جو جنگ میں کام آتی ہو، مثلاً لوہے کے بنے ہوئے سامان حتی کہ سوئی اور بطور سواری استعمال ہونے والی چیزیں وغیرہ ذالک''۔

(شرح السیر الکبیر، جلد۳، صفحہ:۲۷۳)

امان کب ختم ہوگا؟

دارالحرب میں کفار مستامن سے اپنی امان واپس لے لیں یا عملاً ان کے کسی رویہ سے یہ ظاہر ہو جائے کہ ان کا برسر اقتدار طبقہ امان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے کترا رہا ہے تو وہ امان کالعدم ہو جائے گا۔

والغدر حرام الا اذا غدر بهم ملكهم فاخذ اموالهم او حبسهم او فعل غيره يعلم الملك ولم يمنعه لانهم هم الذين نقضوا العهد۔ (ہدایہ اولین، صفحہ:۴۶۴)

ترجمہ: بے وفائی حرام ہے مگر جب ان کے ساتھ کفار کا بادشاہ بے وفائی کرے پس ان کا مال چھین لے یا ان کو قید کر لے یا بادشاہ کے علم میں بادشاہ کے علاوہ کوئی ایسا کرے اور بادشاہ اس کو نہ روکے (تو امان ٹوٹ جائے گا) کیوں کہ عہد توڑنے والے وہی ہیں۔

دارالحرب میں قیدی

کفار کسی مسلمان کو گرفتار کر کے دارالحرب میں لے جائیں تو اس کی حیثیت قیدی کی ہوگی وہاں کی ہر چیز سوائے عورت اس کے لئے مباح ہوگی کیوں کہ وہ کسی معاہدہ کے تحت نہیں گیا ہے جس کا پاس اور لحاظ ضروری ہے، وہ دغا، فریب، چوری، سودی معاملہ اور کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے، ہاں کسی مسلمان کو دارالحرب میں بھی قتل کرنا خدا کے نزدیک گناہ ہوگا۔ کیوں کہ مسلمان کی جان ہر جگہ محترم قرار دی گئی ہے۔

دارالحرب پر دوسرے مشرکین کا حملہ

دارالحرب میں مسلمان جس حیثیت سے بھی ہو بہر صورت اس کو اپنے وقار، خودداری اور غیرت اسلامی کا کماحقہ خیال رکھنا ضروری ہے اس لحاظ سے ایک مومن کے طرز فکر کا اندازہ کرنے کے لئے شرح السیر الکبیر کے چند اقتباسات ہم پیش کرتے ہیں۔

دارالحرب پر کوئی دوسرا مشرک حملہ کرے، اس وقت وہاں پر رہنے والے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہئے:

''مسلمانوں کیلئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مشرکین کے ساتھ ہو کر دوسرے مشرکین سے جنگ کریں اسلئے کہ دونوں فریق حزب الشیطن ہیں اور حزب الشیطن بہرصورت خائب وخاسر ہونے والے ہیں، پس مسلمانوں کیلئے مناسب نہیں کہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی کے ساتھ ضم ہو کر اس کی تعداد میں اضافہ کریں اور ان کی جانب سے مدافعت کریں اور یہ اسلئے کہ جنگ کے نتیجہ میں مشرک ہی کا حکم غالب ہوگا اور مسلمان صرف اہل حق کی نصرت اور غلبہ کیلئے جنگ کرتا ہے نہ کہ حکم شرک کو غالب کرنے کیلئے''۔ (جلد۳، صفحہ:۲۴۱)

''اہل الحرب اگر اپنے مسلمان قیدیوں سے کہیں کہ ہمارے دشمنوں سے ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کرو اور دشمن بھی مشرک ہوں انکار کرنے کی صورت میں اگر جان کا خطرہ نہ ہو تو جنگ میں شریک ہونا مناسب نہیں کیوں کہ اس جنگ میں مشرک کو غلبہ حاصل ہوگا اور جنگ میں شریک ہونے والے کو اپنی جان خطرہ میں ڈالنا پڑے گا جس کی اجازت صرف دو صورت میں ہے دین کو غالب کرنے کے لئے یا پھر اپنی جان کی مدافعت کے لئے''۔ (ایضاً)

''جب مقابل کے مشرکین سے مسلمانوں کو خطرہ ہوتو جنگ میں شرکت کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ اس وقت وہ گویا اپنے سے قتل کو دور کر رہے ہوں گے۔'' (ایضاً،صفحہ:۲۴۲)

''اوراگروہ کہیں کہ چلو ہمارے دشمنوں سے جنگ کرو ورنہ ہم تم کوقتل کردیں گےتواپنی جان بچانے کے لئے جنگ کی شرکت میں کوئی حرج نہیں اور بسا اوقات جنگ میں شرکت ضروری ہے، جیسے حالت اضطرار میں مردار کھانا واجب ہے''۔ (ایضاً)

دارالحرب میں مسلمانوں سے جنگ

''اہل الحرب اگر مسلمان قیدی کوحکم دیں کہ چلو ہمارے ساتھ ہوکر مسلمانوں سے لڑو ورنہ ہم تم کوقتل کردیں گےتواس کے لئے مسلمانوں سے جنگ کرنے کی گنجائش نہیں۔ کیوں کہ یہ بالکل حرام ہےقتل کی دھمکی سن کر اس پر اقدام کرنا جائزنہیں۔ کیوں کہ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کسی مسلمان سے کہے کہ اس مسلمان کوقتل کر دو ورنہ میں تم کوقتل کردوں گا''۔(ایضاً،ص:۲۴۲)

''اوراگرمسلمانوں کا کوئی قلعہ کفار گھیرلیں اوراپنے قبضہ کے کسی مسلمان قیدی سے کہیں کہ ہمیں وہ جگہ بتاؤ جہاں سے قلعہ میں داخل ہوا جاسکتا ہے یا پانی کی وہ جگہ بتاؤ جس سے وہ پانی پیتے ہیں ورنہ ہم تم کوقتل کردیں گے اوراس قیدی کو معلوم ہو کہ اگر وہ بتادے گا تو وہ قلعہ کو فتح کرلیں گے اوراس کے اندر کے لوگوں کوقتل کر دیں گے یااس سے اس کا ظن غالب ہوتواس کے لئے بتانا صحیح نہیں ہے''۔ (جلد۳،صفحہ:۲۳۶)

دارالحرب میں تمام احکام مرتفع نہیں ہوتے

مسلمان پر خدااور رسول کی اطاعت وفرمانبرداری لازم ہے جہاں بھی ہواور جس حال میں بھی ہو۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ. (الاحزاب:۳۶)

ترجمہ: نہ مومن مرد کے لئے اور نہ مومن عورت کے لئے اپنے معاملہ میں کوئی اختیار ہے جب کہ خدااور رسول نے کسی بات کا فیصلہ کردیا ہو

المسلم ملتزم بحكم الاسلام حيث ما يكون. (شرح السیر الکبیر، جلد۳، ص:۱۲۸)

یعنی مسلمان اسلام کے حکم کا پابند ہے جہاں بھی ہو۔

بایں ہمہ کچھ احکام ہر جگہ اور ہر حالت میں لاگو ہوتے ہیں اور کچھ بعض حالات میں ساقط ہوجاتے ہیں مثلاً نماز فرض ہونے کے باوجود عورت پر حالت حیض میں فرض نہیں ہے نماز میں قیام فرض ہے لیکن مریض پر فرض نہیں، وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی لیکن مریض یا تندرست بے آب وگیاہ چٹیل میدان میں اس حکم سے مستثنیٰ ہیں

اور تیمم سے ان کی نماز ہو جائے گی، اسی طرح دارالحرب میں بھی مختلف افراد سے مختلف حالات میں کچھ احکام ساقط ہو جاتے ہیں اور ان کی پابندی ضروری نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہے کہ دارالحرب میں مسلمان بالکل نامسلمان بن کر رہے گا۔ پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ بہت سی چیزیں محض جواز کی حد تک ہوتی ہیں اور ان کے جائز ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ان کو عملاً کرنا بھی ضروری ہے۔

ہم یہاں چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ کچھ اندازہ ہو سکے کہ کس طرح کچھ احکام ساقط ہو جاتے ہیں اور کچھ کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔

ایک شادی شدہ مسلمان بحیثیت مستامن دارالحرب میں مقیم ہے وہاں زنا کر گزرتا ہے، اب اس پر نہ وہاں رجم کی حد جاری ہوگی اور نہ دارالاسلام میں آنے کے بعد۔ دارالحرب میں تو اس لئے نہیں کہ وہاں شرعی امیر نہیں، اور حد جاری کرنے کے لئے امیر کا ہونا شرط ہے اور دارالاسلام میں امیر تو موجود ہے لیکن جس وقت فعل زنا کا صدور ہوا ہے اس وقت وہ علاقہ امیر کے باہر تھا لیکن حد جاری نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اللہ کے حکم "لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً"۔ یعنی زنا کے قریب نہ جاؤ زنا فحش ہے۔ کا وہ پابند نہ تھا بلکہ یقیناً وہ پابند تھا اور اس نے فعل حرام کا ارتکاب کیا ہے جس کی گرفت اور پرشش خدا کے نزدیک ہوگی کیوں کہ عورت کے حلال ہونے کی صرف دو صورتیں ہیں نکاح اور ملک رقبہ، مذکورہ صورت میں نکاح کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، رہی ملک رقبہ تو یہ اس وقت ثابت ہوتی ہے جب باقاعدہ امیر المومنین کی اجازت سے دارالحرب پر چڑھائی کی جائے اور دیگر اموال غنیمت کے ساتھ کچھ مرد اور عورتیں بھی قید کی گئیں اور وہ سب دارالاسلام میں لائے گئے اور امیر کی اجازت سے مجاہدین میں تقسیم کر دیئے گئے یا کسی نے خرید لیا، الغرض دارالاسلام میں ان کا لانا ضروری ہے اس کے بغیر نہ ملک رقبہ ثابت ہوگی اور نہ عورت حلال ہوگی۔

دارالحرب میں ایک مستامن مسلمان کسی کافر سے سودی معاملہ کرتا ہے شریعت اس کو جائز قرار دیتی ہے اور اسی کافر کا مال اگر چوری کے ذریعہ حاصل کرتا ہے تو جائز نہ ہوگا، وہی مستامن کسی مسلمان کے ساتھ سودی معاملہ یا چوری کے ذریعہ مال حاصل کرے تو ناجائز ہے اور دیکھو کوئی مسلمان قیدی کسی کافر کا مال جس طرح بھی حاصل کرے جائز ہے۔ سودی کاروبار کرے یا چوری کرے یا زبردستی چھین لے اس کے لئے سب روا ہے۔ اب ہر ایک حکم کی علت معلوم کرو مسلمانوں کے لئے کافر کی جان اور مال حلال اور مباح ہے۔ اس لئے جس طرح بھی اس کا مال حاصل کر لیا جائے صحیح ہوگا چاہے خرید و فروخت کی جائے یا سودی معاملہ اور چوری۔ لیکن مستامن مسلمان کے لئے چوری اس لئے جائز نہیں کہ اس کا ایک معاہدہ کفار کے ساتھ ہو چکا ہے جس کی خلاف ورزی کسی

طرح صحیح نہیں اور چونکہ مسلمان کی جان اور مال مطلق حرام ہے اس لئے دارالحرب میں بھی غلط طریقہ سے اس کا مال حاصل کرنا غلط ہی ہوگا پس اس کے ساتھ سودی معاملہ بھی جائز نہیں، قیدی مسلمان سے کفار کا کوئی معاہدہ نہیں ہوا ہے جس کی پابندی اس کے لئے ضروری ہو اور ساتھ ہی کفار کا مال حلال اور مباح ہے اس لئے خرید و فروخت، سودی معاملہ، چوری، زبردستی ہر طریقہ سے ان کا مال حاصل کر لینا اس کے لئے روا ہے۔

احکام کے مرتفع ہونے کی علت

دارالحرب میں بعض احکام کے ساقط ہونے کی یہ چند مثالیں ہیں جن سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دار الحرب میں احکام کے ساقط ہونے کی وہی نوعیت ہے جو دارالاسلام میں بعض اسباب کے تحت بعض احکام کے ساقط ہونے کی نوعیت ہے اسباب اور شرائط جب اور جہاں پائے جائیں گے احکام کی پابندی لازم ہوگی ورنہ نہیں۔ یہی عام اصول دارالحرب اور دارالاسلام دونوں مقامات کے لئے ہے۔

دارالحرب سے متعلق خاص احکام جن اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں ان میں سے کچھ اہم اصول ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔

① قبولِ اسلام اور ادائیگی جزیہ سے انکار کرنے کے بعد کفار کی جان اور مال مباح ہو جاتا ہے، اسی بنیاد پر حربی کافر کے ساتھ سودی معاملہ اور تمام عقود فاسدہ دارالحرب میں ایک مستامن مسلمان کر سکتا ہے چنانچہ جواز سود کی علت ہدایہ اخیرین میں یہ بتائی گئی ہے۔

ولان مالهم مباح في دارهم فباي طريق اخذه المسلم اخذ مالاً مباحاًاذا لم يكن فيه غدر. (صفحہ:۷۰)

ترجمہ: اور اس لئے کہ کفار کا مال ان کے دار میں مباح ہے پس جس طریقہ سے بھی مسلمان اس کو حاصل کرے مال مباح حاصل کرے گا۔ جب کہ اس میں غدر نہ ہو۔

② شئی مباح پر استیلاء سے ملکیت ثابت ہو جاتی ہے اسی اصول کی بناء پر کفار کے مال پر مسلمان جب پوری طرح قبضہ اور استیلاء حاصل کرتے ہیں تو وہ مالک ہو جاتے ہیں اور اسلامی لشکر کفار سے جو مال اور سامان چھین کر لائے یا مردوں اور عورتوں کو گرفتار کرے سب مسلمانوں کی ملکیت میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان گنت مسائل اسی اُصول پر متفرع ہوتے ہیں۔

③ مسلمان کی جان اور مال اصلاً معصوم اور محترم ہے۔

④ معاہدہ کی خلاف ورزی حرام ہے۔

⑤ ”وقتال الکفار واجب وان لم یبدونا “۔ اور کفّار سے قتال واجب ہے چاہے وہ ہم سے پہل نہ کریں۔

بلاتنظیم اور بلا امیر مسلمان

اب تک کی ساری بحث ان مسلمانوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے جو اسلامی اسٹیٹ میں شرعی امیر کے تحت زندگی گزار رہے ہوں ان کا حاکم اللہ اور دستور اور قانون کی بنیاد کتاب وسنت ہو۔ اور اس بحث میں ہم یہ ثابت کر آئے ہیں کہ اہل الحرب، معاہد، مستامن، دار الحرب، دار العہد اور دار الامن وغیرہ کی اصطلاحیں اور ان سے متعلق تمام احکام کی بنیاد کفار سے مکمل جہادی نسبت قائم ہونے پر ہے۔

اب مسلمان جہاں جہاد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ان کے پاس قوت ہے اور نہ با اختیار امام کے تحت وہ زندگی گزار رہے ہیں بلکہ ان پر انتشار کی کیفیت پوری طرح مسلط ہے کسی ڈکٹیٹر یا کسی لادینی جمہوری حکومت کے ماتحت نیم اسلامی طریقہ سے زندگی کے ایام کاٹ رہے ہیں، کاروبار اور معاملات غیر اسلامی اصولوں کے مطابق ہو رہے ہیں، تنازعات کے فیصلے قرآن وسنت کی روشنی میں ہونے کے بجائے طاغوتی اور کافرانہ قوانین کی رو سے ہوتے ہیں، حدود اور تعزیرات قائم نہیں ہو رہے ہیں، بین الاقوامی تعلقات قومیت اور وطنیت کے نئے نئے تصورات کی بنیاد پر طے پا رہے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے جہاد اپنے جملہ شعبوں کے ساتھ جائز ہے اور نہ ممکن ہے۔ اس لئے جس طرح کسی دار الاسلام کے مسلمان کفار سے مکمل جہاد کی بنیاد پر تعلقات استوار کرتے ہیں اس طرح ان بلاتنظیم اور بلا امیر مسلمانوں کے لئے مکمل جہاد کو بنیاد بنا کر کفار کے ساتھ اپنا رویہ متعین کرنا کیسے صحیح ہوگا جب کہ ان کے اندر مکمل جہاد کے جواز کی شرطیں معدوم ہیں ان کے لئے بس جہاد کے شعبۂ تبلیغ ودعوت اور دفاع کی بنیاد پر اپنے تعلقات قائم کرنے کی صورت باقی رہتی ہے اِلاّ یہ کہ ایسی کوئی شکل پیدا کر لی جائے جس میں مکمل جہاد کے جواز کی شرطیں موجود ہوں۔

یہاں یہ سوال کوئی کر سکتا ہے کہ چاہے مسلمان جہاد کرنے کی صلاحیت نہ رکھیں اور جہاد کی شرائط موجود نہ ہوں لیکن کفار تو حربی ہونے کے لائق ہیں اور ان کے ملک میں دار الحرب کی ساری خصوصیات تو موجود ہیں اس لئے ان کے ساتھ رویہ میں تبدیلی کیوں ہوگی اس کا جواب یہ ہے کہ دار الحرب سے متعلق خاص احکام کا زیادہ تر انحصار جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں اس بات پر ہے کہ کفار کی جان اور مال مباح ہو جاتے ہیں اور ان سے قتال واجب ہو جاتا ہے مگر جان ومال کے مباح ہونے کا حکم اس وقت لاگو ہوتا ہے جب ان کے سامنے امام المسلمین کی جانب سے دعوت حق پیش کی جائے اور وہ انکار کر دیں اور پھر جزیہ کا مطالبہ کیا جائے اور وہ جزیہ دینا بھی منظور

نہ کریں اور قتال کے لئے ایک شرط کوئی معاہدہ نہ ہونے کی بھی ہے، ان باتوں کے بغیر نہ ان کا جان و مال مباح ہوگا اور نہ جنگ روا ہوگی بایں وجوہ بلا تنظیم اور بلا امیر مسلمانوں کے حق میں دارالحرب سے متعلق اکثر احکام ویسے ہی کالعدم قرار پائیں گے جس طرح ان کے اندر حدود و تعزیرات قائم نہیں کی جائیں گی اور جس طرح ان کے لئے جہاد اپنے جملہ شعبوں کے ساتھ کرنا جائز نہ ہوگا۔

اس لئے ان بلا تنظیم اور بلا امیر مسلمانوں کو دارالاسلام اور دارالحرب میں کیا جائز ہے اور کیا ناجائز کی بحثوں سے قطع نظر اپنی تمام آرزوؤں اور تمناؤں کا مرکز، تمام جدو جہد کا محور اور پوری زندگی کا نصب العین اپنے کو مکمل جہادی پوزیشن میں لانے کو بنانا چاہیے اور جہاد کے جن جن شعبوں اور طریقوں کی شرائط موجود ہیں اِن اِن شعبوں میں ان ان طریقوں سے جہادی عمل اپنانے میں دریغ نہ کرنا چاہئے اسی طور پر وہ اپنے اس فرض کو پورا کرسکیں گے جو اُن کے اوپر غلبۂ اسلام، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کے ناموں کے ساتھ عائد ہوتا ہے اور اس سلسلے میں انھیں اپنے پیش نظر خاص طور سے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کو رکھنا ہوگا، اپنی اصلاح کریں، منظم ہوں معروف کو قائم کریں، منکرات سے احتراز کے ساتھ ساتھ ان کو مٹانے کی کوشش کریں، اسلام کی حقانیت دلائل کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کریں اور پرانے اور نئے ہر طرح کے کافرانہ اور مادہ پرستانہ نظریات کے خلاف برسر پیکار ہو جائیں اور اسی راہ میں ساری متاع زندگی لگا دیں یہاں تک کہ **جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ** کا منظر نصیب ہو یا پھر اپنے رب سے جا ملیں اس کے علاوہ مسلمانوں کے لئے کوئی صحیح راہ نہیں ہے۔

دارالحرب سے ہجرت

مکہ سے ہجرت کا حکم ہو جانے کے بعد بھی جو لوگ مکہ میں رہ گئے تھے ان کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا.

(النساء: ۹۸،۹۷)

ترجمہ: بے شک ان لوگوں کی جان جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، جب فرشتے قبض کرتے ہیں، تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے؟ وہ بولیں گے کہ ہم اس ملک میں بے بس تھے فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بُری جگہ ہے۔ بجز ان لوگوں کے جو مردوں اور عورتوں بچوں میں سے کمزور ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ کوئی راہ پاتے ہوں۔

ان آیات میں جو حکم آیا ہے وہ ایک خاص وقت اور خاص حالات میں آیا ہے اب اس حکم کو دوسرے مواقع پر لاگو کرنے کے لئے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس حکم میں علت کیا ہے اس لئے کہ کوئی حکم دوسرے محل پر علت کی بنیاد پر ہی لگایا جاتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے جب ہم غور کرتے ہیں تو اس حکم کے اندر یہ علت معلوم ہوتی ہے کہ مکہ میں اسلام کے خلاف عداوت اور دشمنی حد سے گزر چکی تھی یہاں تک کہ اصل داعی اللہ کے رسول ﷺ کو ہی ختم کر دینے کا منصوبہ بنالیا گیا۔ اس طرح مکہ میں رہ کر دعوت حق کا پروان چڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ دوسرے مدینہ میں کچھ مومن پیدا ہو گئے تھے اور وہاں دعوت کے برگ و بار لانے کی توقع ہو چکی تھی۔ یہ تھا وہ پس منظر جس میں ہجرت کا حکم ہوا، ہجرت نبویہ کی اس روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی ملک سے ہجرت کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔

اوّل اس ملک میں دعوت حق کے نشو ونما پانے کیلئے علماء اسلام کے نزدیک سارے امکانات ختم ہو چکے ہوں۔

دوّم کسی دوسرے ملک میں دعوت حق کے پروان چڑھنے کی توقع قائم ہو چکی ہو۔

ان دو علّتوں کے بغیر کسی ملک سے اہلِ اسلام کا ہجرت کرنا فرض ناشناسی اور خلق خدا کو دین حق سے محروم کر دینے کے ہم معنی ہے جس پر عنداللہ سخت گرفت کا اندیشہ ہے۔

موجودہ ہندوستان

پچھلے مباحث پر ایک نظر ڈالنے کے بعد موجودہ ہندوستان کی حیثیت بھی صاف ظاہر ہو جاتی ہے تاہم تھوڑی صراحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

موجودہ ہندوستان میں احکام کفر جاری ہیں اقتدار اعلیٰ خدا کے بجائے جمہور کو حاصل ہے دستور اور قانون کی بنیاد کتاب اللہ اور سنت نبویہ کے بجائے انسانی عقل کے پیدا کردہ قدیم و جدید نظریات ہیں۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں منشاء جمہور کے مطابق قانون سازی ہوتی ہے کسی بات کے لئے کتاب وسنت کا حوالہ کوئی حجت اور سند ہونے کے بجائے فرقہ وارانہ ذہنیت، رجعت پسندی اور دقیانوسیت کی علامت قرار پائے گی۔

چنانچہ ۲۰ سالہ دور جمہوریت میں کوئی ایک مثال نہیں ملتی کہ کسی موقع پر کتاب وسنت کا نام بھی لیا گیا ہو۔ عرصہ ہوا ایک دفعہ کسی ممبر پارلیمنٹ نے پارلیمانی اجلاس میں خدا کا نام لیا تو اس کو جواب ملا پارلیمنٹ میں خدا کا نام کیونکر لیا جا سکتا ہے جبکہ خدا پارلیمنٹ کا ایک ممبر بھی نہیں ہے۔

جہاں تک دستور ہند میں دی ہوئی مذہبی آزادی اور بنیادی حقوق کی حفاظت کی صراحت کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ چیزیں کسی ملک کو دارالاسلام یا دارالحرب بنانے میں شمہ برابر بھی مؤثر نہیں

ہیں۔ دار الاسلام میں ذمیوں کو مذہبی آزادی اور جان و مال کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور دارالحرب میں مستامن مسلمان کو بھی اسی طرح کی مراعات کفار دیتے ہیں۔

قطع نظر اس کے موجودہ ہندوستان میں مذہبی آزادی پر پرسنل لاء میں یکسانیت کی دودھاری تلوار لٹک رہی ہے، جس کے گرنے کا ہر وقت اندیشہ ہے اور جان و مال کی حفاظت کو فرقہ وارانہ فسادات اور پھر اس سلسلہ میں پولیس اور فوج کی جانبداری نے بے معنی بنا دیا ہے۔ ان وجوہ سے ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا مگر جیسا کہ اس کے قبل ہم بتا چکے ہیں، دارالحرب کے احکام لاگو ہونے کے لئے مسلمانوں کا مکمل جہادی پوزیشن میں ہونا بھی شرط ہے اور یہ شرط یہاں مفقود ہے، اس لئے موجودہ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمانوں کی نسبت سے دارالحرب کے اکثر احکام لاگو نہ ہوں گے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا فتویٰ

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتوی دیا تھا۔ اس فتویٰ کا مندرجہ ذیل اقتباس بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اصل عبارت فارسی کا ترجمہ درج ذیل ہے:

> ''اس شہر میں امام المسلمین کا حکم قطعاً نہیں چلتا اور رؤساء نصاری کا حکم بے دغدغہ جاری ہے اور احکام کفر کے اجراء سے مراد یہ ہے کہ ملک داری، رعایا کے انتظامات، محصول وخراج کی وصولی، اموال تجارت پر ٹیکس، چوروں ڈاکوؤں کی سزا دہی، مقدمات کے فیصلوں اور جرائم کی سزا میں کفار بطور خود حاکم ہوں، اگر اسلام کے بعض احکام مثلاً جمعہ وعیدین اور اذان اور گائے کے ذبیحے سے تعرض نہ کریں تو کیا ہوا۔
>
> ان چیزوں کی اصل الاصول تو اُن کے نزدیک محض بے حیثیت ہے کیونکہ مساجد کو بے تکلف گرا دیتے ہیں، اور کسی مسلمان یا ذمی کی مجال نہیں ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر اس شہر یا اس کے اطراف میں آسکے، وہ اپنی منفعت کے واسطے آنے والوں اور مسافر و تاجر کی مخالفت نہیں کرتے۔
>
> دوسرے اکابر مثلاً شجاع الملک اور ولایتی بیگم ان کے حکم کے بغیر ان شہروں میں قدم نہیں رکھ سکتے، اس شہر (دہلی) سے کلکتہ تک نصاری کی عملداری ہے ہاں دائیں بائیں مثلاً حیدرآباد، لکھنؤ، رامپور میں اپنے احکام کو اسلئے جاری نہیں کیا کہ وہاں کے والیان نے ان سے صلح اور ان کی اطاعت کر رکھی ہے۔'' (فتاویٰ عزیزی)

علّامہ رشید احمد گنگوہیؒ تحریر فرماتے ہیں

مسئلہ ثالثہ دارالحرب وہ ہے کہ حاکم متصرف اس کا کافر ہو جیسا تمام کفّار کے ملک میں ہوتا ہے اور بعض ممالک میں اسی واسطے خلاف ہو رہا ہے کہ بعد دارالاسلام ہونے کے مغلوب کفار کا ہوا ہے پس صاحبان کا اور امام صاحبؒ کا اس میں اتفاق ہے کہ دارالاسلام جب مغلوب کفار کا ہو جائے گا دارالحرب ہو جائے گا مگر خلاف اس میں ہے کہ مغلوب ہونے کو کس قدر قبضہ کفار کافی ہے صاحبین نے فرمایا کہ کفار اپنا حکم علی الاشتہار جاری کر دے ویں کوئی خدشہ ان کو اور کوئی بند کر دینے والا نہ رہے تو مغلوب ہو گیا اور قیاس بھی اس کو ہی چاہتا ہے کہ غلبہ اس کا ہی نام ہے کہ اپنا حکم جاری کر دے ویں تو کوئی مانع نہ رہے مگر امام صاحب نے دو قید زائد کی ہیں احتیاطاً کہ غلبہ تمام ہونا ان پر موقوف جانا۔

ایک یہ کہ امن وقت اسلام کا باقی نہ رہے بلکہ کفار اپنا عہد و امن جدید جاری کر دے ویں پہلے استیمان اسلام کا کوئی اثر نہ رہے تو یہ امر بھی بعض ممالک میں بوجہ اتم موجود ہے بولو کہ عہد و ذمہ اسلام کہاں ہے کوئی ان کا اثر و نشان کہیں ہے، بلکہ کفار کا ہر روز عہد ہونا اور اپنا قاعدہ جاری کرنا آفتاب کے مانند ہو رہا ہے، دوسرے یہ کہ اتصال اس کو دارالاسلام سے نہ رہے کیونکہ اگر باوجود، اجراء احکام اور امن جدید کے اتصال باقی رہے گا تو مسلمان حاکم کو فی الجملہ لینے کی قوت اور سہولت رہے گی کہ ایک ہی حملہ میں کفار کو دفع کر کے قابض ہو جاوے گا البتہ اگر وہ قریہ اسلام سے جدا ہو گیا اس طرح کہ درمیان اس مغلوب موضع کی اور دارالاسلام کے کوئی دار کفر کا موضع حائل ہو گیا ہے تو اب اس کا چھڑانا دشوار ہے اب غلبہ تمام ہو گیا دار کفر بن گیا پس اتصال وانفصال اقلیم واحد کی صورت میں ہے تعجب کرتا ہوں فقہائے وقت سے کہ اس شرط پر کس طرح غلطی کرتے ہیں پورا مطلب نہیں سمجھتے کہ کیا ہے۔

بہر حال حسب رائے امام صاحب کے بھی وہ ملک مغلوب بوجہ اتم ہو کر دار کفر ہو گیا اور صاحبین کے مذہب پر تو کوئی امر ہی باقی نہیں رہا یہ کہ بعد دار حرب ہونے کے مسلمانوں کو اپنے احکام جاری کرنے پر جو حکام دار و گیر نہیں کرتے وہ دوسرا امر ہے تنوع عبارات فقہاء دیکھ کر اور اصل مطلب کو نہ سمجھ کر شبہ ہوتا ہے اور بعد فہم مطلب اہل مذہب کے امر واضح ہے۔ واللّٰہُ تَعَالٰی أَعْلَمُ۔ (ضمیمہ: تحذیر الاخوان عن الربو)

دارالاسلام اور دارالحرب کے متعلق علّامہ کشمیریؒ کی تحقیق

احکام اسلام کے اجراء وغیر اجراء اور بہت سی مہماتِ اسلامی کا تعلق ہر دو دار کے اصولی فرق سے وابستہ ہے، اس لئے اس کی بھی یہاں بقدر ضرورت شرح وایضاح مناسب ہے۔ اس کے ضمن میں یہ بات بھی آجائے گی کہ ہمارا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟

محقق عصر حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے اس سلسلہ میں ایک نہایت عمدہ تحقیق بہت مدت ہوئی اپنے خطبہ صدارت آل انڈیا جمعیۃ علماء (منعقد پشاور) میں لکھی تھی جو شائع شدہ ہے۔ اس کے بعد ایک مستقل تحریر اسی موضوع پر تحریر فرمائی جو اَب تک قلمی یادداشت کی شکل میں کتب خانہ رحمانی مونگیر میں محفوظ تھی جس کو چند ماہ قبل محترم ومخدوم جناب مولانا منت اللہ صاحب رحمانی، فاضل دیوبند ورکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند، امیر شریعت بہار واڑیسہ نے نہایت عمدہ آرٹ پیپر پر فوٹو آفسٹ سے طبع کرا کر شائع کر دیا ہے۔ درحقیقت اس کی اشاعت سے مولانا موصوف نے علمی دنیا پر بہت بڑی منت فرمائی ہے۔ **ولله الاجر والمنة**

حضرت شاہ صاحبؒ کی تحریر فارسی زبان میں ہے، نہایت مفید ہوتا اگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی شائع ہو جاتا، بہرحال اس تحریر کا ضروری خلاصہ پیش ہے:

> ''کسی شہر یا ملک کے دارالاسلام یا دارالحرب ہونے کا مدار محض غلبہ وشوکت پر ہے، اگر وہاں مسلمانوں کا غلبہ ہے تو وہ دارالاسلام ہے، اور کفار ومشرکین کا غلبہ ہے تو دارالحرب۔ ''جامع الرموز'' میں ہے کہ دارالاسلام وہ ہے، جس میں امام المسلمین کا حکم جاری ہو اور مسلمان وہاں مامون ہوں اور دارالحرب وہ ہے جس میں مسلمان کافروں سے خوفزدہ ہوں۔
>
> اگر کسی جگہ دونوں کے احکام جاری ہوں اور بعض وجوہ سے اہل اسلام کا بھی غلبہ ہو تو اس کو بھی بحکم الاسلام **یعلو ولا یعلی** دارالاسلام کہہ سکتے ہیں، مگر صرف اس وجہ سے کہ کسی جگہ مسلمان بھی رہتے ہوں (بغیر کسی غالبانہ حیثیت کے) اس کو دارالاسلام نہیں کہہ سکتے۔ ورنہ جرمنی، فرانس، روس وچین وغیرہ کو بھی دارالاسلام کہا جائے گا۔
>
> اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے ایک طویل محققانہ بحث اس امر پر کی ہے کہ ایک دارالاسلام کن صورتوں میں دارالحرب بن جاتا ہے، اور امام صاحب وصاحبین کے نظریات کی تنقیح وتوضیح فرمائی ہے، جو اہل علم کے لئے بہت قیمتی ہے، پھر فرمایا کہ اجراء احکام اسلام کا مطلب بطور غلبہ اظہار حکم اسلام ہے محض اداء جماعت و جمعہ مراد نہیں ہے کیونکہ فقہاء نے تصریح کی ہے اور بتلایا ہے کہ اجراء احکام کفر اشتہاراً اسے مراد یہ ہے کہ حاکم کفار کے حکم جاری کرے اور وہ لوگ قضاۃ مسلمین کی طرف رجوع نہ کریں، یعنی قضاۃ مسلمین کی کوئی شوکت

وقعت نہ ہو، اور جن بلاد میں کفار قابض ہو جائیں اور ان کے احکام نافذ نہ ہوں بلکہ قضاۃ مسلمین ہی کے احکام چلیں تو اس وقت تک ان کو بھی دارالاسلام کہیں گے، غرض فقہاء نے سارا مدار نفاذ احکام پر رکھا ہے، اس پر نہیں رکھا کہ اس شہر یا ملک کے لوگ آزادی سے باجماعت نمازیں ادا کرتے ہیں یا نہیں اور نماز جمعہ پڑھ سکتے ہیں یا نہیں وغیرہ، کیونکہ ان اُمور یا دوسرے شعائر اسلام کی ادائیگی دارالحرب میں بھی کفار کی اجازت سے ہوتی ہے جس طرح دارالاسلام میں اہل ذمہ کفار اپنی تمام مذہبی رسوم آزادی سے ادا کرتے ہیں، مگر ان کی وجہ سے اس کو دارالحرب نہیں کہہ سکتے۔ آخر بحث میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اہل فقہ میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ اگر ملک کفار میں ان کی اجازت سے مسلمان شعائر اسلام ادا کرتے ہیں تو وہ ملک دارالاسلام بن جاتا ہے۔ حاشا وکلاً ۔ یہ بات تفقہ سے بہت دور ہے اور جب یہ بات منقح ہوگئی تو ہندوستان کے بارے میں خود ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے ظاہر ہے کہ یہاں کفار نصاریٰ کے اجراء احکام کا اس درجہ غلبہ ہے کہ اگر ایک ادنی حاکم ضلع بھی حکم جاری کردے کہ مساجد میں نماز جماعت ادا نہ کی جائے تو کسی غریب یا امیر مسلمان کی طاقت وقوت نہیں ہے کہ مسجد میں جاکر نماز ادا کرسکے۔

اسی طرح یہاں جو جمعہ وعیدین کی ادائیگی ہوتی ہے یا عدالت میں بھی بعض قوانین فقہ پر عمل ہوتا ہے وہ بھی محض کفار کے اس حکم کے تحت ہے کہ جس سے ہر شخص کو اپنے دین کے موافق عمل کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ (یعنی جب چاہیں وہ اس حکم کو منسوخ بھی کرسکتے ہیں) رہی یہ دلیل کہ ہم لوگ ابھی تک اسی سابق امن سلاطین اسلام کے تحت امان میں ہیں، یہ بھی غلط ہے، کون عاقل کہہ سکتا ہے کہ جو امن شاہ عالم نے عطا کیا تھا، ہم اسی کی وجہ سے اس وقت مامون بیٹھے ہوئے ہیں، بلکہ ظاہر ہے کفار نصاریٰ کے جدید امن سے ہمیں موجودہ امان ملا ہوا ہے، رہی دارالحرب کی یہ شرط کہ وہ کسی طرف سے کسی دارالاسلام کے حصہ سے ملحق ومتصل نہ ہو، وہ شرط بلاد وقریٰ کے اندر ہے، ممالک واقالیم میں نہیں ہے، کیونکہ ایک شہر وقریہ کے لوگ اپنے قریبی شہر وقریہ والوں کی مدد کرسکتے ہیں، مگر ممالک میں یہ بات دشوار ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ افغانستان ہندوستان سے ملحق ہے تو اس کے لوگ یہاں آکر کفار کو ملک سے نکال سکتے ہیں۔ حاشا وکلا۔ بلکہ ان کا نکالنا نہایت دشوار ہے۔ بہر حال ہندوستان پر کفار کا تسلط اس درجہ ہے کہ کسی وقت بھی اس سے زیادہ مستحکم تسلط وغلبہ کفار کو کسی دار الحرب میں نہیں ہوا، اور مسلمانوں کی مراسم اسلام کی ادائیگی محض ان کی اجازت پر ہے، مسلمانوں سے زیادہ عاجز ترین رعایا کوئی نہیں ہے، ہنود کو بھی اس سے زیادہ رسوخ حاصل ہے، البتہ رام پور، ٹونک، بھوپال وغیرہ (اسلامی ریاستوں) میں باوجود کفار کے ماتحت ہونے کے چونکہ مسلمان نواب کی طرف سے احکام اسلام جاری ہیں ان کو ''دارالاسلام'' کہہ سکتے ہیں جیسا کہ ردالمحتار کی روایات سے مستفاد ہوتا ہے۔''

(انوار الباری جلد اول، صفحہ ۱۹۹۔ ۲۰۰)

مولانا اعجاز احمدؒ کی رائے

اسلامک فقہ اکیڈیمی کے دوسرے سمینار منعقدہ دہلی ۸ ؍تا ۱۱ ؍دسمبر ۱۹۸۹ء میں ایک موضوع پر تقریباً ڈیڑھ درجن علماء نے اظہار خیال فرمایا تھا۔ ان میں سے مولانا اعجاز احمد کے مقالہ کا ایک اقتباس ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اکثر علماء کے مقالات دیکھنے سے علّامہ گنگوہیؒ کے ارشاد کی صداقت ظاہر ہوتی ہے کہ مسئلہ میں الجھاؤ کی اصل وجہ کتب فقہ کی عبارتوں کو نہ سمجھنا ہے۔

''جو صورت حال انگریزی دور حکومت میں تھی اگر اس وقت ہندوستان دارالحرب تھا، تو اب ظاہر ہے کہ اس میں کوئی ایسی تبدیلی نہیں آئی ہے، جس کی بنیاد پر اسے دارالاسلام قرار دیا جاسکے، پہلے انگریزوں کو غلبہ حاصل تھا۔ اب اکثریت کو قوت حاصل ہے، اقلیت کا کام صرف اس قدر ہے کہ کسی پلڑے میں اپنا وزن ڈال کر اسے ذرا وزنی بنادے، اور اس کے عوض میں کچھ دستوری حقوق سے مستفید ہوئے، مسلمان جو کچھ اسلامی احکام پر عمل کر لیتے ہیں وہ بر بنائے غلبہ وقوت نہیں ہے، بلکہ ملک کا دستور سیکولر ہے اس میں ہر اقلیت کو تحفظ دیا گیا ہے، اسی تحفظ سے اہل اسلام استفادہ کرتے ہیں۔ یہی وہ تحفظ ہے جسے فقہاء امان سے تعبیر کرتے ہیں ایسا تحفظ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو بھی ملتا ہے، اس صورت حال میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا متعین ہے۔

پھر دارالحرب یا دارالکفر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو بالفعل اہل اسلام سے برسر پیکار ہو یا آمادہ جنگ ہو، دوسرے وہ جس کی مسلمانوں سے صلح ہو اور مسلمان وہاں ان کے امان کے تحت رہتے آئے ہوں اس دوسری قسم کو ''دارالموادعۃ'' کہہ سکتے ہیں لیکن ہے وہ بھی دارالحرب ہی''۔

علّامہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اگر کسی دارالحرب والوں نے اہل اسلام سے مصالحت کر لی پھر وہاں کوئی مسلمان گیا اور ان سے ایک درہم کے عوض دو درہم کی بیع کی تو اس میں کوئی حرج نہیں کیونکہ مصالحت سے دارالحرب دارالاسلام نہیں بن جاتا''۔
(صفحہ نمبر: ۱۴۹۲، جلد ۴)

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوستان مسلمانوں کے حق میں دارالحرب کی دوسری قسم بنتا ہے۔ یہاں کے غیر مسلموں سے غدر، خیانت اور سرقہ تو جائز نہیں لیکن ان کی رضامندی سے ان کے اموال کو عقود فاسدہ (جن میں سودی معاملات بھی داخل ہیں) کے تحت حاصل کرنا امام صاحب اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہے۔''

از: مجلہ فقہ اسلامی
مرتبہ: مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ
مطبوعہ: قاضی پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹرس
وَنیٹج بلڈنگ، حضرت نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۔۱۳

زکوٰۃ کی اہمیت

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

زکوٰۃ کی اہمیت

زکوٰۃ دراصل اس بات کی علامت ہے کہ آدمی کے دل میں خدا کے علاوہ کسی چیز کی محبت نہیں اور وہ اپنے دل کو مال و دولت جیسی پر کشش چیزوں سے بھی پاک کر چکا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبۃ: ۱۰۳)

ترجمہ: ان کے مالوں سے صدقہ لو، جس کے ذریعہ انھیں پاک کروگے اور ان کا تزکیہ کروگے۔

زکوٰۃ بندے کی جانب سے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے معاملہ کی تصدیق ہے۔ اللہ نے بندوں سے یہ ایک اہم معاملہ کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ: ۱۱۱)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ نے مومنین سے اس عوض میں کہ ان کے لیے جنت ہے ان کی جان اور مال خرید لیا ہے۔

اس عہد اور معاملہ کو بھول جانا اور مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہو جانا تمام برائیوں کی جڑ اور تمام ہلاکتوں کا پیش خیمہ ہے۔

حب الدُّنْيَا رَاسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق)

ترجمہ: دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔

فِتْنَةُ أُمَّتِى الْمَالُ۔ (الترمذی)

ترجمہ: میری امت کا فتنہ مال ہے۔

لیکن زکوٰۃ ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسلمان مال کے فتنہ سے محفوظ ہے اور اب وہ مال باعث فتنہ ہونے کے بجائے ذریعۂ خیر و برکت ہوگا۔

زکوٰۃ کی اہمیت

زکوٰۃ فرض ہے اور ایک اہم فرض ہے، فرائض میں نماز کے بعد دوسرا نمبر زکوٰۃ کا ہے اور پچھلی امتوں پر بھی زکوٰۃ فرض تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اس طرح پہچان کرائی ہے:

وَاَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا (مریم:۳۱)

ترجمہ: اور خدا نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کی ہے جب تک میں زندہ رہوں

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَکَانَ یَاۡمُرُ اَہۡلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ (مریم:۵۵)

ترجمہ: اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔

حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب، حضرت لوط، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے ذکر کے بعد اللہ نے فرمایا:

وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَاِیۡتَآءَ الزَّکٰوۃِ وَکَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ (الانبیاء:۷۳)

ترجمہ: اور ہم نے انھیں وحی کے ذریعہ ہدایت کی کہ نیک کام کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور وہ سب ہماری ہی بندگی کرنے والے تھے۔

زکوٰۃ قرآن میں

قرآن میں نماز کے ساتھ اکتیس[۳۱] مقامات پر لفظ "زکوٰۃ" کا ذکر ہے، اس کے علاوہ انفاق اور صدقہ وغیرہ الفاظ کے ساتھ ان گنت جگہوں پر زکوٰۃ کا حکم اور یاددہانی موجود ہے۔

وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَمَا تُقَدِّمُوۡا لِاَنۡفُسِکُمۡ مِّنۡ خَیۡرٍ تَجِدُوۡہُ عِنۡدَ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ (البقرۃ:۱۱۰)

ترجمہ: نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور جو خیر بھی تم اپنے لئے آگے بھیجو گے اس کو اللہ کے پاس پاؤ گے، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ وَالۡکٰفِرُوۡنَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (البقرۃ:۲۵۴)

ترجمہ: اے ایمان والو! ہمارے دیئے ہوئے میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ کوئی بیع ہوگی اور نہ کوئی دوستی اور سفارش کام آئے گی، اور انکار کرنے والے ہی ظالم ہیں۔

زکوٰۃ حدیث میں

- حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں اور جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز قبول نہیں۔ (طبرانی)
- حضرت ابودرداءؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ زکوٰۃ اسلام کا پل ہے (طبرانی)
- حضرت بزاز نے حضرت علقمہؓ سے روایت کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اسلام کا پورا ہونا یہ ہے کہ اپنے اموال کی زکوٰۃ ادا کرو۔

اسوۂ صحابہ میں

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا اور آپ نے فرمایا کہ جو کوئی نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کرے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی زکوٰۃ میں سے روکے گا تو میں اس کے خلاف جہاد کروں گا۔

حضرت عمرؓ نے کہا: آپ ان سے جہاد کیسے کر سکتے ہیں جب کہ یہ کلمہ توحید کے قائل ہیں؟

آپؓ نے ارشاد فرمایا: یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کلمہ توحید کا اقرار کرنے والوں سے لڑنے کو منع فرمایا ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک کہ یہ کلمہ توحید کا حق ادا کرتے رہیں۔ زکوٰۃ براہِ راست کلمہ توحید کا حق ہے، جو اس کا انکار کرے گا میں اس سے جہاد کروں گا اور تمام صحابہؓ یہ سن کر مطمئن ہو گئے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زکوٰۃ سے غفلت اور لاپرواہی کیا معنی رکھتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معاملہ بڑا نازک اور سنگین ہے، جس کے خلاف تمام صحابہؓ نے تلوار اٹھالی۔ خدا اور رسولؐ کے نزدیک اس کے راندۂ درگاہ ہونے میں کیا شک ہے۔

زکوٰۃ اِسلامی قانون میں

زکوٰۃ فرض ہے، اس کا منکر کافر ہے اور نہ دینے والا فاسق اور قتل کئے جانے کا مستحق ہے اور ادا کرنے میں تاخیر کرنے والا گنہگار اور مردود الشہادۃ ہے۔ (عالمگیری)

زکوٰۃ ٹیکس نہیں ہے

زکوٰۃ کا عمل عبد اور معبود، غلام اور آقا کے مابین ایک تعلق ہے گویا بندہ خدا کی رضا جوئی کے واسطے اپنی

پاک کمائی کا ایک حصہ خدا کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے، زکوٰۃ دے کر وہ یہ نہیں محسوس کرتا کہ میں نے کسی پر احسان کیا ہے بلکہ اس کا دل اس تصور سے باغ باغ اور چہرہ پر مسرت اور خوشی کی لہر دوڑتی ہے کہ غلام نے آقا کی طلب پر اپنی ایک حقیر شئی پیش کی ہے، ''زہے قسمت گر قبول افتد'' خوش قسمتی ہے اگر قبول کر لی جائے۔ اس کے اندر شکر کا جذبہ ابھرتا ہے، اس کے قلب میں تواضع، انکسار اور گداز پیدا ہوتا ہے کہ اسی مولائے نعمت کی توفیق بخشی سے مجھے یہ شرف نصیب ہوا ہے اور اس کی عنایتوں اور نوازشوں کی بدولت میں اس قابل ہو سکا ہوں۔

اس کے برخلاف ٹیکس مجبوری اور بے دلی کی کیفیت کے ساتھ دیا جاتا ہے ٹیکس گراں گزرتا ہے اور زکوٰۃ شرف محسوس ہوتی ہے، ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اور زکوٰۃ پیش کی جاتی ہے ٹیکس جرمانہ اور تاوان خیال کیا جاتا ہے اور زکوٰۃ محبوب کے لئے بطور نذرانہ عقیدت ہوتی ہے۔

زکوٰۃ حق کی ادائیگی ہے

انسان کو ملی ہوئی ساری جائیداد اور دولت خداوند تعالیٰ کی دین ہے، اس لئے اسی کے حکم کے مطابق ہی اس میں تصرف کو درست کہا جا سکتا ہے، جس طرح کسی وارث کے لئے اللہ کا مقرر کیا ہوا حق صاحب حق کو حوالہ کرنا ضروری ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی اللہ کی جانب سے مساکین کا مقرر کردہ حق ہے، جس کا ادا کرنا ایک انتہائی ضروری امر ہے۔ ورنہ قیامت کے دن فقراء اور مساکین دامن تھام لیں گے۔

''طبرانی'' میں حضرت انس ؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مالداروں کے لئے محتاجوں کے ہاتھوں سے خرابی ہوگی۔ محتاج عرض کریں گے، خداوندا ہمارے حقوق جو تُو نے ان پر فرض کئے تھے انھوں نے ظلماً ادا نہیں کئے۔ اللہ عزوجل فرمائے گا میری عزت اور جلال کی قسم میں تمھیں اپنا قرب عطا کروں گا اور انھیں دور رکھوں گا۔

قرآن مجید میں متقیوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

وَفِيٓ أَمۡوَٰلِهِمۡ حَقّٞ لِّلسَّآئِلِ وَٱلۡمَحۡرُومِ (الذاریات:۱۹)

ترجمہ: ان کے مالوں میں ہاتھ پھیلانے والے محتاج اور محروم کا حق ہوتا ہے۔

زکوٰۃ شکریہ ہے

ہر نعمت پر شکر واجب ہے اور ہر نعمت کے شکر کا الگ الگ طریقہ ہے۔ نماز، روزہ اگر بدنی شکرانہ ہیں تو زکوٰۃ مالی شکرانہ اور عبادت ہے۔ یہ حقیقت اس آیت کریمہ سے بخوبی سمجھی جا سکتی ہے:

وَهُوَ ٱلَّذِيٓ أَنشَأَ جَنَّٰتٖ مَّعۡرُوشَٰتٖ وَغَيۡرَ مَعۡرُوشَٰتٖ وَٱلنَّخۡلَ وَٱلزَّرۡعَ مُخۡتَلِفًا

أُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ (الانعام:۱۴۱)

ترجمہ: وہی ہے جس نے ٹٹیوں پر چڑھائے جانے والے اور نہ چڑھائے جانیوالے باغات پیدا کئے اور کھجور کے درخت پیدا کئے، جن کے پھل مختلف طرح کے ہوتے ہیں اور زیتون اور انار پیدا کیے جو ایک دوسرے سے مشابہ ہوتے اور مشابہ نہیں بھی ہوتے، ان سب کی پیداوار کھاؤ اور اس کے کٹنے کے وقت اس کا حق ادا کرو اور اسراف نہ کرو بلاشبہ وہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

زکوٰۃ نہ دینا ناشکری اور حق ماری ہے

جب زکوٰۃ بندوں کا حق بھی ہے اور اللہ کا حق بھی، تو اس سے غفلت اگر ایک طرف بندوں کی حق ماری ہے تو دوسری طرف خدا کی ناشکری بھی۔ گویا زکوٰۃ نہ دینا دوہرا گناہ ہے۔ اب غور کرو اس شخص کی بدبختی کا کیا حال ہوگا جو قیامت کے دن خدا اور بندوں دونوں کا حق مار کر خدا کے حضور حاضر ہوگا حقیقت یہ ہے کہ اس کی حسرت اور بے بسی کا اندازہ لگانا اس دنیا میں تو تقریباً ناممکن ہے۔

حسرت کا ایک موقع

یہ حدیث قدسی کا ایک ٹکڑا ہے جس میں روز قیامت کا ایک منظر پیش کیا گیا ہے:

يَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي قَالَ يَارَبِ كَيْفَ أطعمك وَانْتَ رَبُّ العٰلَمِينَ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ انَّهُ اِسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فَلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْه أَمَا عَلِمْتَ انَّكَ لَوَاطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذٰلِكَ عِنْدِی. (المسلم)

ترجمہ: اے آدم کے بیٹے میں نے تجھ سے کھانا مانگا مگر تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا بھلا میں آپ کو کیسے کھلاتا، آپ تو رب العالمین ہیں، خدا فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا اور تو نے انکار کر دیا اگر تو اسے کھلاتا تو وہ چیز تو میرے پاس پاتا۔

زکوٰۃ میں خسارہ نہیں ہے

زکوٰۃ دینے سے مال میں کمی نہیں ہوتی بلکہ اضافہ ہوتا ہے اور صرف اضافہ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ دینا گویا مال کو بہت ہی محفوظ بنک میں جمع کرنا ہے جس کے فیل اور دیوالیہ ہونے کا کوئی امکان نہیں اور اس بنک سے واپسی بے انداز انعامات کے ساتھ اور وہ بھی ایسے مشکل وقت میں ہوگی جبکہ انسان نہایت محتاج ہوگا۔ اور اس کے سارے لوگ باگ کوئی مدد نہ کر سکیں گے اور اس کی تمام جائیداد اور دولت اس کے ہاتھ سے نکل چکی ہوگی۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ (سورۂ سبا:۳۹)

ترجمہ: اور جو چیز بھی تم خرچ کرو گے اللہ اس کا عوض دے گا اور وہ بہترین روزی رساں ہے۔

وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَاْ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (الروم:۳۹)

ترجمہ: اور جو چیز تم اس لئے دو گے کہ وہ لوگوں کے مال میں پہنچ کر بڑھ جائے تو وہ اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتی اور جو زکوٰۃ اللہ کی رضا کے لئے دو گے تو ایسے ہی لوگ اللہ کے پاس بڑھانے والے ہیں۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (البقرۃ:۲۷۶)

ترجمہ: اللہ سود کا مٹھ مار دیتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے بدعمل کو پسند نہیں کرتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ''صدقہ مال کو کم نہیں کرتا، اور کسی خطاوار کو معاف کرنا معاف کرنے والے کی عزت کو بڑھاتا ہے اور جو شخص رضائے الٰہی کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت عطا فرماتا ہے''۔ (مسلم)

زکوٰۃ سے مال میں اضافہ ہونا اپنی جگہ ایک حقیقت ہے لیکن اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ایک سچّے اور پکّے مومن کا دل اور دنیا پرستی کی آلائشوں سے پاک وصاف ذہن چاہئے۔ بیمار دل، بیمار نگاہ اور بیمار ذہن ودماغ میں زکوٰۃ کی حقیقت نہیں سما سکتی۔ اس طرح زکوٰۃ مومن اور منافق کے درمیان فیصلہ کرنے والی کسوٹی بن جاتی ہے، دیکھئے ہر سال کتنے لوگ اس کسوٹی پر کھرے ثابت ہوتے ہیں اور کتنے لوگ کھوٹے۔

زکوٰۃ قرض ہے

پروردگارِ عالم کی شان رزاقی اور شان کریمانہ دیکھو، ہر چیز کا مالک وہ ہے ساری چیزیں دینے والا وہ ہے، لیکن اعلان فرماتا ہے کہ جو چیز میرے نام پر خرچ کرو گے وہ گویا مجھے قرض دو گے جس طرح قرض کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے اسی طرح لازمی طور سے تمھیں واپسی ہوگی۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (التغابن:۱۷)

ترجمہ: تم اگر اللہ کو قرض حسن دو گے تو وہ اسے تمہارے لئے چند گنا بڑھا دے گا اور تمھیں معافی دے گا اور اللہ شکر قبول کرنے والا اور حلیم ہے۔

قرض حسن سے مراد ایسا قرض ہے جو خالص نیکی کے جذبہ سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے، اس طرح جو مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے اور وعدہ فرماتا ہے کہ میں نہ صرف اصل

ادا کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا البتہ شرط یہ ہے کہ وہ قرض حسن ہو یعنی محض اللہ کی رضا کیلئے خرچ کیا جائے، اس کے ساتھ کوئی دوسری غرض شامل نہ ہو۔

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ (الحدید:۱۱)

ترجمہ: کون ایسا ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے پس وہ اس کے لئے دوگنا کر دے اور اس کے لئے عمدہ اجر ہے۔

قرضِ حسن میں تین لطیف اشارے ہیں: **اول** یہ کہ صدقہ میں طیب اور طاہر مال دیا جائے۔ **دوم**، صدقہ دیتے وقت طبیعت میں کدورت اور ناپسندیدگی کے بجائے مکمل طیب خاطر اور خلوص نیت پایا جائے۔ **سوم**، احسان نہ جتایا جائے اور نہ صدقہ کے زیر اثر اذیت آمیز رویہ اختیار کیا جائے۔

زکوٰۃ حصولِ جنت اور مغفرت کا ذریعہ ہے

خدا کی راہ میں خرچ مغفرت اور حصول جنت کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ قرآن میں اس کو صاف صاف الفاظ میں بار بار بیان کیا گیا:

وَلَا یَاۡتَلِ اُولُوا الۡفَضۡلِ مِنۡکُمۡ وَالسَّعَۃِ اَنۡ یُّؤۡتُوۡۤا اُولِی الۡقُرۡبٰی وَالۡمَسٰکِیۡنَ وَالۡمُہٰجِرِیۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَکُمۡ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (النور:۲۲)

ترجمہ: اور تم میں فضل اور وسعت والے لوگ قرابت داروں مساکین اور فی سبیل اللہ ہجرت کرنے والوں کو دینے میں کوتاہی نہ کریں اور چاہیے کہ وہ معاف اور درگزر کریں۔ کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری مغفرت کرے، اللہ مغفرت کرنے والا اور رحیم ہے۔

وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَۃٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّۃٍ عَرۡضُہَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ. (آل عمران:۱۳۴،۱۳۳)

ترجمہ: اور دوڑو اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ وہ ان پرہیزگاروں کے لئے تیار کی گئی ہے، جو تنگی اور فراغت دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ حَقًّا لَہُمۡ دَرَجٰتٌ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَمَغۡفِرَۃٌ وَّرِزۡقٌ کَرِیۡمٌ (الانفال:۴،۳)

ترجمہ: جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے میں سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں حقیقت

میں یہی سچے مومن ہیں، ان کے مرتبے ان کے رب کے نزدیک اونچے ہیں، ان کو مغفرت نصیب ہوگی اور عزت کی روزی پائیں گے۔

جو لوگ مغفرت کے طالب اور جنت کے آرزومند ہوں ۔ انھیں شیطان کے جھانسے میں نہ آنا چاہیے، فی سبیل اللہ خرچ کے موقعہ پر شیطان اور شیطان نما انسان دلوں میں وسوسہ ڈالتے ہیں اور خیر خواہ بن کر اونچ نیچ سمجھاتے ہیں کہ تم بے وقوف ہو جو اتنا خرچ کرو گے۔ خود اپنے ہاتھوں اپنی جھولی خالی کرنا کہاں کی عقل مندی ہے، لیکن شیطان کی اس عیاری کا پردہ چاک کر دیا گیا اور کہا گیا کہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں شیطان کے کہے پر نہ چلو اگر تمھیں اللہ کی مغفرت اور فضل مطلوب ہے۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۶۸)

ترجمہ: شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے مگر اللہ تمھیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔

مخلص بندوں کا حال

مغفرت اور جنت کے طلبگاروں کا حال سنو، اللہ تعالیٰ سورۃ الدھر میں فرماتا ہے:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ○ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (الدھر:۸،۹)

ترجمہ: اور یہ لوگ محتاجوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں دراں حالیکہ وہ خود اُنہیں محبوب ہوتا ہے اور کہتے ہیں، ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا کے لئے کھلاتے ہیں تم سے کسی بدلے اور شکر گزاری کے خواہش مند نہیں ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (المومنون:۶۰)

ترجمہ: اور یہ اللہ کی راہ میں جو کچھ دیتے ہیں اس حال میں دیتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے ہوتے ہیں اس خیال سے کہ انھیں اپنے رب کے پاس جانا ہے۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ (البقرۃ:۱۷۷)

ترجمہ: اور وہ اپنا مال باوجود محبوب ہونے کے قرابت داروں کو، یتیموں کو، ناداروں کو، مسافروں کو اور سائلوں کو دیتا ہے اور گردنیں چھڑانے میں صرف کرتا ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَإِقَامِ الصَّلٰوةِ وَإِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ (النور:۳۷)

ترجمہ: جن کو اللہ کے ذکر سے اور اداء نماز اور اداء زکوٰۃ سے نہ خرید وفروخت غافل کرتی ہے اور نہ تجارت وہ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں جس میں بہت سے دل اور آنکھیں الٹ جائیں گی۔

اللہ زکوٰۃ دینے والوں کے ساتھ ہے

جن کا طرز فکر وخیال اتنا صالح اور پاکیزہ اور روش وعمل اتنے نیک ہوں بھلا وہ اللہ کی نصرت اور معیت سے کیوں محروم رہیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کو صاف صاف بتادیا تھا کہ انھیں اللہ کی مدد اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اور چیزوں کے ساتھ ساتھ نماز اور زکوۃ کی پابندی کرتے رہیں گے۔

وَقَالَ اللهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (المائدۃ:۱۲)

ترجمہ: اور اللہ نے فرمایا اے بنی اسرائیل! میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور میرے رسولوں پر ایمان لاؤ، اور جو رسول آئیں ان کی مدد کرو اور اللہ کو اچھا قرض دو، تو میں تمہاری برائیاں تم سے دور کردوں گا۔

دیکھو جن شرطوں پر اللہ کی نصرت موقوف ہے، ان میں سے ایک زکوٰۃ بھی ہے، آج جس طرح اور صفات سے ہم کورے ہو چکے ہیں اسی طرح صفت زکوٰۃ سے بھی ہم تہی دامن ہو رہے ہیں، کیا تعجب ہے جو آج کی ساری مصیبتوں کا سبب ہمارا یہی طرز عمل ہو!

نیکی کی کنجی

یہ اچھی طرح یقین کر لینا چاہیے کہ جس طرح تمام برائیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اسی طرح تمام نیکیوں کی کنجی دل سے مال ودولت کی محبت نکالنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللهَ بِهٖ عَلِيْمٌ. (ال عمران:۹۲)

ترجمہ: تم نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک مفسر لکھتے ہیں:

''بالعموم یہودیوں کے بڑے بڑے دیندار لوگ تنگ دلی، حرص، بخل، حق پوشی اور حق فروشی کے عیوب چھپائے ہوئے تھے اور رائے عام انھیں نیک سمجھتی تھی۔ اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے انھیں بتایا جارہا ہے کہ نیک انسان ہونے کا مقام ان چیزوں سے بالاتر ہے جن کو تم نے مدار خیر وصلاح سمجھ رکھا ہے۔ نیکی کی اصل روح خدا کی محبت ہے، ایسی محبت کہ رضائے الٰہی کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز عزیز تر نہ ہو، جس چیز کی محبت بھی آدمی کے دل پر اتنی غالب آجائے کہ وہ اسے خدا کی محبت پر قربان نہ کرسکتا ہو بس وہی بت ہے اور جب تک اس بت کو آدمی توڑ نہ دے نیکی کے دروازے اس پر بند ہیں، اسی روح سے خالی ہونے کے بعد ظاہری تشرع کی حیثیت محض اس چمکدار روغن کی سی ہے جو گھن کھائی ہوئی لکڑی پر پھیر دیا گیا ہو، انسان ایسے روغنوں سے دھوکہ کھا سکتا ہے مگر خدا نہیں کھا سکتا۔''

اللہ کی راہ میں خرچ کئے ہوئے مال کا پھلنا پھولنا

پھر دیکھو جس قیمت سے نیکیوں کی کنجی ''زکوٰۃ'' حاصل کی جاتی ہے، وہ قیمت بھی ہمیں واپس کر دی جاتی ہے، اور کس انداز سے واپس کی جاتی ہے اس کا اندازہ قرآن کی اس مثال سے کرو:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ.

(البقرۃ:۲۶۱)

ترجمہ: جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے لئے چاہتا ہے چند گنا کرتا ہے، اللہ تعالی فراخ دست اور دانا ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ. (البقرۃ:۲۶۵)

ترجمہ: جو لوگ اپنے مال اللہ کی رضا جوئی کے لئے اور دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی اونچی جگہ پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی سی پھوار ہی اس کے لئے کافی ہو جائے۔ اور تم جو کچھ خرچ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: جوشخص کھجور کے برابر حلال کمائی سے صدقہ کرے (اور اللہ حلال ہی کو قبول کرتا ہے) تو اسے اللہ دست راست سے قبول فرماتا ہے پھر اس کے لئے پرورش کرتا ہے جیسے تم میں کا کوئی اپنے بچھڑے کی تربیت کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کے برابر ہوجاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

زکوٰۃ میں بہتر مال دو

بطور زکوٰۃ دی ہوئی چیز کی واپسی کا یہ حال ہے تو ہوشیاری کا تقاضا ہے کہ زکوٰۃ میں بہتر مال دیا جائے کیونکہ جتنا اچھا بیج ہوگا پھل بھی اتنا ہی اچھا ہوگا۔

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ (البقرۃ:۲۶۷)

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لئے نکالا ہے اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے خراب چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمھیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے الا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔

صدقہ اور زکوٰۃ میں ردی مال وہی شخص دے گا جس کے دل کی گہرائیوں میں اللہ کی نوازشوں اور لطف و کرم کا احساس نہ ہوگا اور خرچ مولیٰ کی رضا جوئی کے لئے نہیں بلکہ کسی دوسری وجہ سے کر رہا ہوگا۔ بھلا جس کے سامنے خدا کی جلالت شان، اس کی بے نیازی اور بندوں کے ساتھ اس کی بخشش اور عنایت ہوگی وہ کیسے اس کے نام پر ردی مال پیش کرے گا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے خدا کے حضور پیشی یاد آئے گی اور وہ لرز اٹھے گا کہ میں اس کے سامنے کس منہ سے جاؤں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے:

يَاأَيُّهَاالنَّاسُ إِنَّ اللّٰه طيب لا يقبل إلا طيبا. (مسلم)

ترجمہ: اے لوگو! اللہ پاک ہے اور وہ صرف پاک مال ہی کا صدقہ قبول کرتا ہے۔

اپنے کئے کو اکارت نہ کرو

شیطان اور شیطان کے ایجنٹوں کی برابر کوشش رہتی ہے کہ ایک مومن نیکیوں سے دور رہے چنانچہ بہت سے لوگ شیطان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور نفس اور خواہشات کا شکار ہو کر بھلائی کے کاموں سے رک

جاتے ہیں لیکن جولوگ شیطانی طاقتوں کے مقابلہ میں سخت ثابت ہوتے ہیں اور رکاوٹوں کے باوجود نیکی کے کام کرگزرتے ہیں شیطان کی اب یہ کوشش ہوتی ہے کہ ان کا یہ عمل برباد ہوجائے۔

غور کرو! آدمی اچھے کام کرے اور وہ اکارت جائیں، بھلائیاں اختیار کرے اور بدلے میں کچھ نہ پائے، خدا کی راہ میں اپنی جان اور مال کھپائے لیکن خالی ہاتھ رہے یہ کتنی بڑی بدقسمتی اور محرومی ہے، اس محرومی سے بچنے کے لئے خدا اور رسول کی ان ہدایات کو یاد رکھو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (البقرۃ:۲۶۴)

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! اپنے صدقے احسان جتا کر اور دل آزاریاں کر کے ضائع نہ کردیا کرو اس شخص کی طرح جو اپنا مال لوگوں کو دکھانے کے لئے خرچ کرتا ہے، اور اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن تین آدمی سب سے پہلے جہنم میں جائیں گے ان میں سے ایک وہ ہے جو دنیا میں اس لیے صدقہ اور خیرات کرتا ہے کہ لوگ اسے بڑا داتا اور غریب پرور کہیں، ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

مَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ. (مشکوٰۃ)

ترجمہ: جس نے دکھاوے کے لئے صدقہ دیا اس نے شرک کیا۔

زکوٰۃ سے مصیبت دور ہوتی ہے

زکوٰۃ ادا کرنے سے اس دنیا کی بہت ساری بلاؤں سے بھی انسان محفوظ رہتا ہے۔ طبرانی اور بیہقی میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

زکوٰۃ دے کر اپنے مالوں کو مضبوط قلعوں میں کرلو اور اپنے بیماروں کا علاج صدقہ سے کرو اور بلا نازل ہونے پر دعا اور تضرع کے ساتھ استعانت کرو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کردی بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے اس سے شر دور فرمایا''۔

زکوٰۃ نہ دینا خسارہ ہے

جو آدمی زکوٰۃ نہ دے وہ شیطان کے چکر میں آگیا اور اس کے اللہ سے غافل ہونے میں کوئی کسر نہ رہ گئی دیکھو اللہ سے غافل ہونے والوں کے حق میں قرآن کیا کہتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ (المنافقون:۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کے ذکر سے غافل نہ کردیں اور جو ایسا کریں گے وہی خسارہ میں ہیں۔

زکوٰۃ، نفع بخش تجارت

اس کے برخلاف قرآن زکوٰۃ کو ایک ایسی نفع بخش تجارت قرار دیتا ہے جو کبھی ماندنہ پڑے گی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَتۡلُوۡنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنۡفَقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰهُمۡ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرۡجُوۡنَ تِجَارَةً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۙ لِيُوَفِّيَهُمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ. (فاطر:۲۹،۳۰)

ترجمہ: جو لوگ خدا کی کتاب پڑھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور خدا کے دیئے ہوئے مال میں سے غریبوں کو دیتے ہیں، پوشیدہ طور پر اور علانیہ، وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جو کبھی ماندنہ پڑے گی تاکہ اللہ تعالیٰ انھیں ان کا پورا بدلہ دے اور ان کے لئے اپنے فضل میں سے زیادہ کرے بلاشبہ وہ بخشنے والا اور بڑا قدردان ہے۔

مال کی ہلاکت

زکوٰۃ کا نہ دینا اس دنیا میں بھی زحمت اور مصیبت کا سبب ہے، حضرت بُریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

''جو قوم زکوٰۃ نہ دے گی اللہ تعالیٰ اسے قحط میں مبتلا فرمائے گا''۔ (طبرانی)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''خشکی وتری میں جو مال تلف ہوتا ہے وہ زکوٰۃ نہ دینے سے تلف ہوتا ہے''۔ (طبرانی)

دردناک عذاب

جہاں زکوٰۃ کی ادائیگی پر بے انداز اور بے شمار انعامات قیامت کے دن ملیں گے وہیں زکوٰۃ نہ ادا کرنے پر دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍۙ يَّوۡمَ يُحۡمٰى عَلَيۡهَا فِىۡ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكۡوٰى بِهَا

جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ. (التوبۃ:۳۵)

ترجمہ: اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو جس دن کہ اسی سونے اور چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ (اور یہ کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ پس اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔

مومن کی علامت

اس دردناک عذاب سے بچنے کے لئے جن چیزوں کو شرط بتایا گیا ہے ان میں سے ایک زکوٰۃ بھی ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ (التوبۃ:۱۱)

ترجمہ: پس اگر وہ اپنی روش سے باز آجائیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو یہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

مشرک کی علامت

زکوٰۃ دینا اگر مومن کی علامت ہے تو زکوٰۃ نہ دینا مشرک کی علامت اور پہچان بتائی گئی ہے۔

وَيْلٌ لِلْمُشْرِكِيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كَافِرُوْنَ (فصلت:۷)

ترجمہ: خرابی ہے ان مشرکین کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کے منکر ہیں۔

قیامت کا ایک منظر

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ ۝ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (الحاقۃ:۲۵ تا ۳۴)

ترجمہ: اور وہ شخص جس کے بائیں ہاتھ میں اس کا اعمال نامہ دیا جائے گا۔ کہے گا کاش مجھے میرا نامۂ اعمال نہ دیا جاتا۔ کاش میں اپنے حساب کتاب سے ناواقف رہتا۔ کاش دنیا ہی میں سب فیصلہ ہو گیا ہوتا۔ میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میرا زور و اقتدار ختم ہو گیا۔ خدا فرمائے گا۔ پکڑو اسے اس کے گلے میں طوق پہناؤ،

پھر ڈھکیل دو اسے جہنم میں ۔ اور جکڑ دو اسے ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں، یہ خدائے بزرگ و برتر پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اور مسکینوں کو کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا تھا۔

گلے کا طوق

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (آل عمران:۱۸۰)

ترجمہ: اور جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے، نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے، جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

مال کا سانپ

ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھئے اور کانپ جایئے:

''جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا اور اس نے اس کی زکوٰۃ نہیں دی تو اس کا وہ مال قیامت کے روز نہایت زہریلے سانپ کی شکل اختیار کرے گا جس کے سر پر دو کالے نقطے ہوں گے اور وہ سانپ اس کے گلے میں لپٹ جائے گا، پھر یہ سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا، میں تیرا مال ہوں، میں تیرا جمع کیا ہوا خزانہ ہوں''۔ (بخاری)

آگ کا کنگن

حضرت عمرو بن شعیبؓ سے مروی ہے کہ ایک خاتون اپنی ایک لڑکی کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس لڑکی کے ہاتھوں میں سونے کے موٹے اور بھاری کنگن تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ تم ان کنگنوں کی زکوٰۃ ادا کرتی ہو؟ اس نے عرض کیا کہ میں ان کی زکوٰۃ تو نہیں دیتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، تو کیا تمہارے لئے یہ بات خوشی کی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کنگنوں کی (زکوٰۃ نہ دینے کی وجہ سے) قیامت کے دن آگ کے کنگن پہنائے۔ اللہ کی اس بندی نے وہ دونوں کنگن ہاتھوں سے اتار کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ڈال دیئے اور عرض کیا کہ اب یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہیں۔ (ابوداؤد، ترمذی)

مصارف زکوٰۃ

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے شخص ! اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورہ توبہ کی اس آیت میں تمام مصارف بتا دیئے ہیں :

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ

صدقات ''یعنی مال زکوٰۃ'' صرف ۔

① لِلْفُقَرَآءِ　　فقیروں کے لئے

② وَالْمَسٰکِیْنِ　　اور مسکینوں کے لئے

③ وَالْعٰمِلِیْنَ عَلَیْهَا　اور ان کارندوں کے لئے جو ''محکمہ زکوٰۃ'' میں کام کرتے ہیں ۔

④ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ　اور ان کے لئے جن کے دلوں کو موہنا مقصود ہو

⑤ وَفِی الرِّقَابِ　　اور گردنیں چھڑانے کے لئے

⑥ وَالْغٰرِمِیْنَ　　اور قرضداروں کے لئے

⑦ وَفِیْ سَبِیْلِ اللهِ　　اور اللہ کے راستہ میں استعمال کرنے کے لئے

⑧ وَابْنِ السَّبِیْلِ　　اور مسافروں کے لئے

فَرِیْضَةً مِّنَ اللهِ وَاللهُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ

یہ اللہ کی جانب سے فرض ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے ۔ (التوبۃ:٦٠)

اب ہم نمبر وار ہر ایک مد سے متعلق تھوڑی سی تشریح کرتے ہیں :

① فقیر ایسے شخص کو کہتے ہیں جو صاحب نصاب نہ ہو یعنی جس کے پاس مال تو ہو لیکن اتنا نہ ہو کہ زکوٰۃ کا نصاب پورا ہو سکے یا نصاب کے برابر ہے مگر وہ سب مال حقیقی ضروریات مثلاً مکان، کپڑے وغیرہ میں پھنسا ہوا ہے یا اس پر اتنا قرض ہو کہ قرض ادا کرنے کے بعد نصاب پورا نہ ہوتا ہو تو ایسا شخص زکوٰۃ لے سکتا ہے مگر اس کے لئے خود سوال کرنا بغیر شدید ضرورت کے جائز نہیں ۔

② مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو یہاں تک کہ کھانے اور بدن چھپانے کے لئے دوسروں کا محتاج ہو، ایسے شخص کے لئے سوال کرنا جائز ہے ۔

③ عامل سے مراد وہ تمام کارکن ہیں جو محکمہ زکوٰۃ میں کام کرتے ہیں خواہ وہ کارکن مالدار ہوں یا فقیر اور مسکین ۔

④ دل موہنے کا مطلب یہ ہے کہ نئے نئے مسلمانوں کو اسلام پر قائم رکھنے کے لئے یا کفار کو ان کی دشمنی اور عناد کو ختم کرنے کے لئے مدز کوٰۃ سے دیا جائے تو جائز ہے لیکن اب اسلام کو غلبہ واقتدار حاصل ہو جانے کے باعث حنفیہ کے نزدیک اس سلسلہ میں زکوٰۃ کا مال نہیں خرچ کیا جا سکتا، بعض فقہاء کے نزدیک یہ مدّاَب بھی باقی ہے اگر اس کی ضرورت ہو۔

⑤ گردن چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ مدز کوٰۃ کی رقم سے کسی غلام کے آزاد کرانے کا بندوبست کیا جائے۔ جیل خانوں میں زرضمانت وغیرہ نہ جمع کر سکنے کی بنا پر جو قیدی پڑے ہوتے ہیں ان کی رہائی کی کوششوں میں بھی زکوٰۃ لگائی جاسکتی ہے ایک قیدی کی رہائی سے پورے کنبہ کو راحت ملے گی۔

⑥ کوئی مسلمان مقروض ہے اگر وہ سید نہیں ہے تو اس کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، البتہ اگر اس کے پاس اتنا مال ہے کہ قرض ادا کرنے کے بعد بھی نصاب کے برابر اس کے پاس بچ رہے تو ایسے مقروض کو زکوٰۃ نہیں دی جاسکتی۔

⑦ فی سبیل اللہ۔ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں مثلاً کسی مجاہد کے لیے آلات حرب، سواری اور زادراہ مہیا کیا جائے کسی کو حج کرنے کے لئے دیا جائے۔ ہاں حج کے لئے کسی سے دست سوال پھیلانا صحیح نہیں ہے۔ کسی ایسے طالب علم کو دیا جائے جو تعلیم کے لئے بالکل وقف ہے، اس کے علاوہ ہر نیک کام میں زکوٰۃ کا مال خرچ کرنا فی سبیل اللہ ہوگا۔ بس حنفیہ کے ہاں شرط یہ ہے کہ تملیک کرادی جائے۔ اسی لئے مسجد، میت کے کفن، پل، سرائے، نہر اور کنواں وغیرہ اگر زکوٰۃ کے مال سے بنوادیا جائے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

⑧ مسافر کو جس کے پاس مال نہ رہا ہو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے چاہے اس کے گھر پر مال موجود ہو۔

زکوٰۃ کی یہ آٹھ مدیں جو بتائی گئی ہیں ان کے سلسلہ میں ضروری نہیں ہے کہ تمام ہی مدوں میں زکوٰۃ ضرور صرف کی جائے بلکہ جس وقت جیسی ضرورت اور حالت ہو اس کے مطابق خرچ کرنا چاہئے۔ چوتھی مد کے علاوہ بقیہ سب مدوں میں صرف مسلمانوں پر ہی زکوٰۃ صرف کی جاسکتی ہے۔ غیر مسلمین کو زکوٰۃ دینا جائز نہیں۔ غیر مسلم کی مدد کرنی ہو اور ضرورت پر ضرور کرنی چاہئے تو نفل صدقوں سے کرنی چاہئے۔

چند ضروری مسائل

سونے اور چاندی کا نصاب

سونے کا نصاب ساڑھے سات تولے (۸ بھر) اور چاندی کا نصاب ساڑھے باون تولے (۵۲ بھر) کی مقدار ہے، جب اتنی مقدار میں سونا یا چاندی کسی عاقل و بالغ مسلمان مرد یا عورت کے پاس ہو اور وہ ایک سال تک موجود رہے تو اس کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ سونے اور چاندی کی زکوٰۃ سونا اور چاندی دے کر بھی ادا کی جاسکتی ہے اور جو مقدار واجب ہوتی ہے اس کی قیمت دے کر بھی ادا کی جاسکتی ہے۔

روپئے کی زکوٰۃ

سونا اور چاندی کے علاوہ دوسرے سکوں کی زکوٰۃ اس مقدار میں فرض ہوگی جتنے مقدار کے ذریعہ ساڑھے باون تولے چاندی خریدی جاسکے۔ اور ہر سو روپئے میں ڈھائی روپئے زکوٰۃ دینی ہوگی۔

مال تجارت کی زکوٰۃ

ہر قسم کے مال تجارت پر شریعت نے زکوٰۃ واجب کی ہے خواہ کسی قسم کا مال ہو، سونا، چاندی، موتی، جواہرات، تیل، نمک اور کتابیں ہوں یا اور کوئی چیز ہو۔ مال تجارت کا نصاب وہی ہے جو چاندی اور سونے کا نصاب ہے، یعنی اگر کسی کے پاس اتنا مال تجارت ہے جس کی قیمت چاندی کے ایک نصاب کی قیمت کے برابر یا اس سے زیادہ ہے تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ سال گزرنے کے بعد موجودہ مال کا حساب کرے، اگر نصاب پورا ہو جائے تو ڈھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر مال تجارت نصاب سے کم ہو مگر خزانے میں نقد روپئے یا زیورات وغیرہ بھی موجود ہوں تو دونوں کو ملا کر حساب کرنا چاہئے واضح رہنا چاہئے کہ زکوٰۃ کے واجب ہونے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ مال مالک کے پاس ہی موجود ہو

بلکہ کسی وجہ سے کسی غیر کے قبضہ میں ہوتو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی بشرطیکہ مالک تصرف کرنے کا مجاز ہو، اسی اصول کے تحت بینک میں جمع شدہ رقم کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

غلہ کا نصاب

مسلمانوں کے پاس جو زمینیں ہیں ان کی پیداوار میں عشر یا نصف عشر اللہ کی راہ میں دینا واجب ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کھیت یا باغ کو سینچنا نہ پڑے بلکہ فقط بارش کے پانی سے پیداوار ہوگئی یا ندی یا دریا کے کنارے ترائی میں کوئی چیز بوئی اور بغیر سینچے پیدا ہوگئی تو ایسے کھیت میں جتنا پیدا ہوا ہے، اس کا دسواں حصہ اللہ کی راہ میں دینا ہوگا اور جس پیداوار کے لئے قیمت دے کر سینچائی کرنی پڑتی ہے اس میں بیسواں حصہ دینا ہوگا۔

زکوٰۃ کے مقاصد

مصارف زکوٰۃ پر اور ان کے علاوہ اس سلسلہ میں خدا اور رسول کی دوسری ہدایات پر غور کرنے سے زکوٰۃ کے تین مقاصد کھل کر سامنے آتے ہیں:

① زکوٰۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص اور طمع سے پاک ہو جائے اور پاک ہو کر نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لئے تیار ہو جائے چنانچہ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لئے ہی کہا جاتا ہے کہ ایک مسلمان اپنی کمائی کا ایک حصہ ضرورت مندوں کو محض رضائے الٰہی کی خاطر دے کر اپنے قلب میں نیکی اور تقویٰ کی تخم ریزی کرتا ہے۔

② زکوٰۃ سے ملت کے نادار افراد کی مدد مقصود ہے تاکہ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں اور اپنے فرائض پورا کرنے کے قابل بن جائیں۔

③ تیسرا مقصد دین کی حفاظت اور نصرت ہے چنانچہ اس کے لئے ایک خاص مد رکھی گئی ہے اور اسی لئے قرآن میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کے معنی اپنے آپ کو ہلاکت اور بربادی کے حوالے کرنا ہے۔

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ:۱۹۲)

ترجمہ: اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

زکوٰۃ کے یہ مقاصد مختصراً ہم نے اس لئے بیان کئے ہیں تاکہ زکوٰۃ دینے والے لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے پیسے سے شریعت کا اصل مقصد حاصل ہوگا یا نہیں؟ اس لئے اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہم زکوٰۃ کہاں دے رہے ہیں اور کس کو دے رہے ہیں۔

ایک قابل توجہ بات

آپ دیکھتے ہیں دین کے فرائض کی ادائیگی میں تنظیم اور اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے، نماز الگ الگ پڑھنے کے مقابلہ میں جماعت کے ساتھ پڑھنے کا ثواب ستائیس گنا زیادہ ہے، روزہ ایک ساتھ ایک مہینہ میں سب پر فرض کیا گیا ہے۔ فریضہ حج چند مخصوص دنوں میں سب لوگ ایک ساتھ ادا کرتے ہیں، بالکل اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کا معاملہ اصل میں ایک اجتماعی معاملہ ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم فرمایا کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کیجئے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (التوبۃ:۱۰۳)

ترجمہ: ان کے مالوں سے صدقہ لو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین نے زکوٰۃ کی وصولی کا نظم اجتماعی رکھا۔ اور حکومت کی طرف سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور حکومت ہی کی طرف سے ٹھیک ٹھیک طور پر خرچ کی جاتی تھی۔ حتی کہ عباسی خلفاء کے زمانہ تک یہی نظم قائم رہا۔ لیکن ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاریوں نے نظام خلافت درہم برہم کر دیا تو سوال پیدا ہوا کہ اب کیا کرنا چاہئے، کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہی تھی کہ زکوٰۃ غیر مسلم حاکموں کو نہیں دی جاسکتی۔ اس موقع پر کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کی رقم اپنے طور پر خرچ کر ڈالنے کو بھی جائز کر دیا لیکن فقہاء نے اس بات پر زور دیا کہ جہاں ایسی صورت پیدا ہو جائے وہاں مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں اور زکوٰۃ کا نظم ٹوٹنے نہ دیں۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کو آہستہ آہستہ مسلمان اس نظام کی اہمیت سے غافل ہوتے چلے گئے۔ اور اب تو یہ حالت ہوگئی ہے کہ لوگوں کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ زکوٰۃ کا معاملہ محض ایک نجی اور انفرادی معاملہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ایک اجتماعی نظم بھی ضروری ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ اگر اعلیٰ پیمانہ پر اس کا نظم ممکن نہیں ہے تو جس قدر بھی اس کام میں نظم اور اجتماعیت پیدا ہو سکے اس کو غنیمت سمجھنا چاہئے اور مزید کے لئے فکر مند اور کوشاں رہنے کی ضرورت ہے اور خدا سے دعا کرنی چاہئے کہ خلفائے راشدین کے دور والا نظم واجتماعیت پھر پیدا فرمادے۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

أُمِرْتُ أَنْ اٰخُذَ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْنِيَائِكُمْ وَأَرُدَّهَا فِي فقراءكم. (بخاری ومسلم)

ترجمہ: ''یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کروں اور تمہارے فقراء میں تقسیم کر دوں''۔

اسی طریقے پر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کا عمل بھی تھا۔ تمام زکوٰۃ حکومت اسلامی کے کارکن جمع کرتے تھے اور مرکز کی طرف سے اس کو تقسیم کیا جاتا تھا۔ آج اگر اسلامی حکومت نہیں ہے اور زکوٰۃ جمع کر کے باضابطہ تقسیم کرنے کا انتظام بھی نہیں ہے تو آپ علیحدہ علیحدہ اپنی زکوٰۃ نکال کر شرعی مصارف میں خرچ کر سکتے ہیں، مگر تمام مسلمانوں پر لازم ہے کہ زکوٰۃ جمع کرنے اور تقسیم کرنے کے لیے ایک اجتماعی نظام بنانے کی فکر کریں کیوں کہ اس کے بغیر زکوٰۃ کی فرضیت کے فوائد ادھورے رہ جاتے ہیں۔

زکوٰۃ آپ دے چکے!

زکوٰۃ دینے کے بعد یہ سمجھنا کہ اب ہم تمام خیر خیرات کرنے سے چھوٹ گئے صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان پر اس کے نفس کا حق ہے، اس کے والدین کا حق ہے، رشتہ داروں کا حق ہے، بیوی بچوں کا حق ہے۔ پڑوسی کا حق ہے۔ دوسرے تمام انسانوں کا حق ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اپنی وسعت اور مقدور کے مطابق وہ ان تمام حقوق کو ادا کرے، ان حقوق کے ادا کرنے پر ہی دنیا اور آخرت میں وہ سعادتیں مل سکتی ہیں جن کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے یہ تمام ذمہ داریاں ادا نہیں ہو سکتیں اگر کوئی شخص اپنی جیب سے صرف زکوٰۃ کی مقررہ مقدار نکال دینے کو ہی کافی سمجھ لے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر صرف کرنے کے لئے اس کا دل بھی کھلا ہوا ہو اور اس کی جیب بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقات پر بھی بہت زور دیا ہے۔ یعنی دینی تقاضے جہاں اور جس وقت مال خرچ کرنے کے ہوں، آدمی حسب استطاعت خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یہی وہ اسپرٹ اور جذبہ ہے جو فریضۂ زکوٰۃ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم اور آپ تمام ہی مسلمانوں کو اس جذبہ سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

مِلّت کے دفاع کا مسئلہ

شریعت کی روشنی میں

(۱۹۹۱ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

موجودہ صورتِ حال

ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات انگریزی دورِ حکومت میں بھی ہوتے تھے لیکن آزادی ہند کے بعد فسادات کے عنوانات میں اضافہ ہوا، نوعیت اور شدت میں اضافہ ہوا اور تعداد میں بے انتہا اضافہ ہوا۔ ایک عام سروے کے مطابق تقسیم ملک کے بعد تقریباً دس ہزار فساد ہو چکے ہیں باوجود اس کے کہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کی کوششیں برابر ہوتی رہی ہیں۔ اب صورت حال انتہائی سنگین ہوگئی ہے۔ مسلم دشمنی کی اِنتہاء کا یہ عالم ہے کہ راجیو گاندھی حکومت اور وی پی سنگھ کو زوال کا منہ صرف اس لئے دیکھنا پڑا کہ مسلم دشمن طبقہ کے خیال میں یہ دونوں حکومتیں مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اپنائے ہوئے تھیں جبکہ راجیو گاندھی کی حکومت میں عدالتی حکم کے ذریعہ بابری مسجد پوجا پاٹ کے لئے کھول دی گئی اور مسجد کے بازو میں موقوفہ زمین پر مندر کی بنیاد رکھی گئی اور وی پی سنگھ کی حکومت میں پولیس اور نیم فوجی کمپنیوں کی موجودگی میں بابری مسجد کو نقصان پہنچایا گیا اور مسجد کے مینار پر بھگوا جھنڈا لہرایا گیا۔ اور ساتھ ہی اس حکومت نے بھی مسجد میں نماز ادا کرنے کے لئے کوئی گنجائش نہیں پیدا کی۔ اس کے بعد تیسری حکومت چندر شیکھر حکومت کو کھلے طور پر دھمکی دی جارہی ہے کہ اگر تم نے مسلمانوں کو خوش کرنے کی روش اختیار کی تو تمہاری موت بھی یقینی ہے۔

بی جے پی لیڈر مسٹر اے نریندر سابق ایم ایل اے نے شاد نگر میں ایک جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے مرکزی حکومت پر الزام عائد کیا کہ اقلیتوں کی خوشنودی کی خاطر مسئلہ بابری مسجد رام جنم بھومی کو فرقہ وارانہ رنگ دے رہی ہے۔

راجیو گاندھی اور وی پی سنگھ حکومتوں کے خاتمہ کے اسباب بتلاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان حکومتوں نے اقلیتوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی انہوں نے مرکزی حکومت کو انتباہ دیا کہ وہ اقلیتوں کو خوش کرنے کی پالیسی ترک کردے ورنہ اس کا وہی حشر ہوگا...... جو ماضی کی حکومتوں کا ہو چکا ہے۔ (روزنامہ منصف)

اس دھمکی کے ساتھ ایک دوسرا دھمکی آمیز دعویٰ سنئے۔ ایک لیڈر صاحب کہتے ہیں ''اقلیتوں کی حفاظت حکومت نہیں کرسکتی، ان کی حفاظت صرف اکثریت کرسکتی ہے''۔ گویا اقلیتوں کو انتباہ دیا جارہا ہے کہ حکومت پر بھروسہ کرنا چھوڑ دیں اگر انہیں محفوظ رہنا ہے تو اکثریت کی منشاء کو سمجھیں اور اس کا لحاظ کریں۔

فساد نہیں دو قومی جنگ

اس صورت حال پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اپنے آپ کو یہ کہنے پر مجبور پاتے ہیں کہ اب ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے فرقہ وارانہ فساد کہنا اور سمجھنا ایک بہت بڑی نادانی ہوگی اور اگر دوسرے لوگ اس کو فرقہ وارانہ فساد کہتے ہیں تو ان کی طرف سے ایک کھلی حقیقت کو جھٹلانے اور مسلمانوں کو دھوکہ میں رکھنے کے ہم معنی ہے۔ فرقہ وارانہ فساد کا اطلاق کسی وقتی اور جذباتی واقعہ کی وجہ سے پیدا ہونے والی گڑبڑ پر ہوتا ہے جس کے پیچھے نہ کوئی سیاست ہوتی ہے اور نہ کوئی سازش بلکہ جیسے دو پڑوسیوں میں کسی بات پر ہاتھا پائی صبح کو ہوئی اور شام تک معاملہ ٹھنڈا ہوگیا اور بات آئی گئی ہوگئی، لیکن اس کے برخلاف اس وقت آل انڈیا پیمانہ پر منظم کی گئی تنظیموں کے بنائے ہوئے منصوبوں کے تحت ایک خاص مقصد کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر اقدامات کئے جارہے ہیں۔ اس مقصد کو ایک جملہ میں یوں ادا کیا جاتا ہے۔

''مسلمان کے لئے دو ہی استھان پاکستان یا قبرستان''

یعنی مسلمانوں کو یا تو ہندوستان سے نکال دیا جائے یا پھر انہیں زندہ دفن کردیا جائے۔ مسلمان بن کر یا اپنے جملہ تشخصات کے ساتھ انہیں ہندوستان میں رہنے نہیں دیا جائے گا۔ یہ نعرہ کسی ایک بستی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے کونے کونے میں لگایا جارہا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ منصوبہ ایک ہمہ گیر منصوبہ ہے۔ اس نعرہ کو سن کر نہ کسی انتظامیہ کو حرکت میں آتے دیکھا گیا اور نہ کسی عدلیہ کے کان پر جوں رینگی۔

ان وجوہ کی بناء پر اس صورتحال کو فرقہ وارانہ فساد کے بجائے مسلمانوں کی نسل کشی کی مہم اور ایک قوم کے اوپر دوسری قوم کی مسلط کی ہوئی جنگ قرار دینا زیادہ صحیح ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اس جنگ میں اکثریتی طبقہ کا ایک بہت ہی چھوٹا طبقہ شریک ہے مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کیونکہ ۷۵ کروڑ میں سے ایک کروڑ بھی اس مہم پر لگا ہوا ہے تو وہ کافی ہے ما باقی ۷۴ کروڑ پشت پناہ بنا ہوا ہے یا خاموش ہے۔ اس جنگجو دل اور سینا کے خلاف انگلیوں پر گننے کے لائق تعداد بھی نہیں ہوگی جو کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہی صورت حال تاریخ کے ہر دور میں ہونے والی جنگوں میں آپ کو نظر آئے گی۔ اس لئے کہ کبھی بھی کسی جنگ کے لئے پوری قوم میدان میں نہیں اترتی۔ اکثریت پیچھے سے تائید کرتی ہے یا تماشائی ہوتی ہے۔

اس لئے اس موقع پر یہ کہہ کر معاملہ کو ہلکا نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فتنہ اٹھانے والے مٹھی بھر ہیں اور اکثریت خیر پسند ہے۔

حکومت کا رول

کہنے کے لئے ہندوستان کا ایک دستور ہے اور اس کی روشنی میں تفصیلی قوانین ہیں جن کے مطابق ملک کا سارا کاروبار چلایا جاتا ہے اور حکومت سیکولر ہے جو کسی ذات پات اور مذہب کے ساتھ جانبداری اور تعصب سے کام نہیں لیتی اور ہر ایک کو مذہبی آزادی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہماری سیکولر حکومت اس جنگ میں کیا رول ادا کررہی ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ، ان کی زبانوں کے ساتھ، ان کے بڑے بڑے اداروں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ کیا برتاؤ کیا گیا۔ عام سیول اور فوجی شعبہ جات میں مسلمانوں کے تعلق سے کیا رویہ اختیار کیا گیا؟؟ ۔۹ ہزار سے زیادہ فسادات میں ہزاروں بچے یتیم ہوئے، ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں ہزاروں ماں باپ نے اپنے بچوں کو خون میں لت پت اور آگ میں جھلسا ہوا دیکھا لیکن اس سیکولر حکومت نے دو چار مجرمین کو بھی سزائے موت دے کر انہیں ان کے کیفر کردار تک نہیں پہنچایا بلکہ اس کے برعکس یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ان جنگجوؤں کی صرف پشت پناہی نہیں بلکہ ان کی معاونت سرکاری مشنری نے کی ہے، اور مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصانات اسی وقت ہوئے ہیں جب پولیس اور نیم فوجی کمپنیوں نے بحالی امن وامان کے لئے کارروائی کی ہے۔ آزادی کے بعد سے سینکڑوں مسجدیں غیر مسلموں کے زیر تصرف ہیں جن کو چالیس سال کے اندر سیکولر حکومت آزاد نہ کراسکی۔ بابری مسجد میں بتوں کی پوجا عدالتی فیصلہ کے تحت ہورہی ہے اور عدالتی فیصلہ کی رو سے کوئی مسلمان نہ اس میں داخل ہوسکتا ہے اور نہ نماز پڑھ سکتا ہے، ان وجوہ کی بناء پر حکومت کا وجود موجودہ حالت کو دوقومی جنگ قرار دینے کے لئے مانع نہیں ہوسکتا۔

اس دوقومی جنگ کا ایک بڑا عنوان اور بڑی علامت ''بابری مسجد'' بن گئی ہے۔ وشوا ہندو پریشد، بجرنگ دل، بی جے پی اور شیوسینا ایک طرف اور دوسری طرف مسلمان قوم ہے۔ جنگ کی صورت یہ بنتی ہے کہ ایک طرف سے ایک مجمع اٹھتا ہے، لوٹتا ہے، آگ لگاتا ہے اور قتل کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ دوسری طرف سے ہوتا ہے۔ لیکن بہت کم اس کی نوبت آتی ہے۔

دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ دونوں طرف سے ڈھکے چھپے گلیوں میں اور سڑک کے نکڑوں پر چاقو زنی ہوتی ہے۔ اس جنگ میں عام مسلمانوں یا مسلمانوں کی کوئی تنظیم دفاع نہیں کرتی بلکہ مسلمانوں میں سے ایک ایسا طبقہ اس میدان میں دفاع کررہا ہے جو اپنی تعلیم، ذہنی سطح اور مذہبیت کے لحاظ سے انتہائی کم درجہ رکھتا ہے۔ بقیہ اونچے اور اوسط درجہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک طرف کا ایک آدمی شہر کے مغربی کنارہ پر مارا گیا تو

دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والے کسی فرد کو شہر کے مشرقی کنارہ پر چاقو مارنا گناہ اور شرع کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ بے قصور ہے۔

مگر ۳۰/اکتوبر ۹۰ء کے بعد کے حالات اور واقعات نے مسلمانوں کے سنجیدہ لوگوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے اور ان کے سامنے یہ سوال لا کھڑا کیا ہے۔

چند سوالات

کہ مسلمان کیا کریں؟ اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

① ایک جگہ مسلمانوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچایا جائے تو اس کے جواب میں کیا دوسری جگہ پر دوسرے فریق کو نقصان پہنچایا جا سکتا ہے؟

② ایک مسلمان کو مار دیا جائے تو کیا دوسرے فریق کے کسی فرد کو مارا جا سکتا ہے؟

③ کیا موجودہ آئین اور قانون کی خلاف ورزی کرنے کی گنجائش شرعاً پائی جاتی ہے؟

④ کیا کوئی خفیہ کارروائی کی جا سکتی ہے؟

⑤ کیا اس جنگ کو جہاد کہا جا سکتا ہے؟

ان سوالوں کے دو جواب ہیں دو نقطۂ نظر سے۔

پہلا نقطۂ نظر

ایک نقطۂ نظر سے جواب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی از روئے شرع جائز نہیں ہے اس لئے کہ اسلامی شریعت میں ہر جان کو محترم ٹھہرایا گیا ہے اور ہر کسی کا مال بھی محترم ہے جس کو ناجائز طریقہ سے ہاتھ لگانا حرام ہے اور مسلمان جس حکومت میں بھی ہو اس کے قانون کی پابندی کرنا شرعاً ضروری ہے اور کسی کے خلاف کوئی خفیہ کارروائی تو دور کی بات ہے کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے سرگوشی کرنا بھی منع ہے۔ کسی بے گناہ پر ہاتھ اٹھانا گناہ عظیم ہے۔ شرعی اعتبار سے بدلہ لیا جا سکتا ہے لیکن اسی سے جس نے قصور کیا ہو اور اتنا ہی جتنا اس نے نقصان کیا ہو۔ ایک کا دوسرے سے اور ایک تھپڑ کی جگہ دو تھپڑ مارنے کی اجازت نہیں ہے اور جہاد کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ جہاد کے لئے ایک ضروری شرط امیر المومنین کی اجازت ہے۔ جب ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی امیر ہی نہیں ہے تو اس کی اجازت کا کیا سوال۔ اس لئے ہندوستان میں جہاد نہیں ہو سکتا۔ اور حالات اس قدر سنگین نہیں ہیں کہ اس قسم کے سوالات اٹھائے جائیں اور ان پر شرعی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔

دوسرا نقطۂ نظر

دوسرے نقطۂ نظر کی ترجمانی یوں کی جاتی ہے کہ حالات اس سے بھی زیادہ سنگین اور نازک ہیں جتنا کہ لفظوں میں ہم بیان کرتے ہیں۔ بلراج مدھوک سے لے کراڈوانی اور اشوک سنگھل کے بیانات پر غور کیجئے، آر ایس ایس اور شیوسینا کے ساتھ وشواہندو پریشد اور بجرنگ دل کے دس لاکھ والنٹیرس کی بھرتی پر نظر کیجئے۔ جبل پور کے واقعات کا سلسلہ حالیہ کرنل گنج، گونڈا اور بجنور کے المناک حادثات سے جوڑ کر دیکھئے اور پھر کمپیوٹر کی مدد سے نتیجہ نکالئے اور اس کے بعد بھیونڈی کے انصاری باغ والوں کی رائیں معلوم کیجئے، مرادآباد کے ان والدین سے پوچھئے جنہوں نے اپنے بچوں کو عید کے نئے جوڑے پہنا کر عیدگاہ روانہ کیا تھا اور چند ہی لمحوں بعد پی ایس سی کے جوانوں نے خاک وخون میں انہیں تڑپا دیا۔ میرٹھ کے ان بیواؤں کا تأثر معلوم کیجئے جن کے جوان شوہروں کو ٹرک میں بھر کر پولیس لے گئی اور ایک ندی کے کنارے انہیں گولیوں سے بھون ڈالا۔ پھر بھاگلپور کرنل گنج کے دیہاتیوں سے سنگینیٔ حالات معلوم کیجئے جن کے بچوں کی لاشیں کئی کئی دن تک کھیتوں میں پڑی رہیں اور انہیں کوئی اٹھانے والا نہیں تھا اور ساتھ ہی حیدرآباد کے اطراف ان درجنوں مسجدوں کو دیکھئے جن کو ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں منہدم کرنے کی کوشش کی گئی۔ جائے نمازوں کو جلایا گیا اور قرآنی نسخوں کی بے حرمتی کی گئی۔ کیا ہم حالات کی سنگینی اور نزاکت اس وقت محسوس کریں گے جبکہ ملک میں پوری مسلم آبادی کو بھاگلپور اور کرنل گنج بنادیا جائے گا اور کیا شرعی نقطۂ نظر سے حالات کا جائزہ اس وقت لیں گے جب کہ وقت نکل چکا ہوگا؟!

حالت جنگ کا مفہوم

حالت جنگ کا مفہوم اور معنی کیوں ایک لگا بندھا ذہنوں میں اٹکائے ہوئے ہیں۔ ذرا غور کیجئے ایک حالت جنگ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی مشرکین مکہ کی نسبت سے تھی اور ایک منافقین اور مدینہ کے یہود سے تھی۔ خلفاء راشدین کے دور میں بھی مختلف ملکوں سے مختلف قسم کی حالت جنگ تھی۔ پوری اسلامی تاریخ میں کہیں یکسانیت نہیں ملے گی۔ اپنے ملک میں دیکھئے ایک صدی کے اندر کیسے کیسے حالات بدلے ہیں۔ اور علماء نے کس طرح مسائل پر سوچا ہے اور نتائج اخذ کئے ہیں اور اس کے مطابق حکمت عملی اپنائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز، مولانا اسمٰعیل شہید، سید احمد بریلوی، مولانا محمود الحسن، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہم اللہ وغیرہم نے اپنے کو حالت جنگ میں سمجھ کر اقدامات کئے ہیں۔ آج فلسطین اور افغانستان میں علماء اہل حق جو کچھ کر رہے ہیں اپنے کو حالت جنگ میں سمجھ کر کر رہے ہیں۔ جن کی جرأت اور پامردی کی آج ہم اپنی آرام گاہوں میں بیٹھ کر داد دیتے ہیں۔ اس کے پیش نظر ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہم جس حالت جنگ میں گھرے ہوئے ہیں وہ اپنی ایک خاص

نوعیت رکھتی ہے۔ہم کو اسی کو بنیاد بنا کر سوچنا ہے۔

اس سلسلہ میں دو باتوں کا ذکر کرنا ہے۔ ہم نے انگریزوں کے بالکل آخری دور میں ہوش سنبھالا ہے۔ اس وقت ہمیں بتایا جاتا تھا کہ انگریزوں کو ہر طرح نقصان پہنچانا جائز ہے، حتی کہ بغیر ٹکٹ ٹرین میں سفر کرنا جائز کہا جاتا تھا۔ دوسری بات ریشمی رومال کی تحریک ہے جو ایک خفیہ کارروائی تھی جو برٹش گورنمنٹ کے خلاف کی گئی تھی۔ علماء نے یہ طرز فکر صرف اس لئے نہیں اختیار کیا تھا کہ وہ غیر ملکی ہیں بلکہ اس لئے کیا تھا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں، جن کے خلاف جنگ کرنا مسلمان کا فریضہ ہے۔

حالت جنگ کی خصوصیت

حالت جنگ میں کسی کی جان اور مال محترم نہیں رہتے اور نہ یہ اصول باقی رہتا ہے کہ جس نے میرے بھائی کو مارا ہے اسی کو میں ماروں اور جس نے میرا مال لیا ہے اسی سے میں بدلہ لوں، بلکہ دشمن قوم کا ہر فرد دشمن ہے بالخصوص وہ فرد جو جنگجو ہو۔ اس وجہ سے ہندوستان میں جو لوگ تین ہزار مساجد کو اپنے نشانہ میں رکھتے ہیں اور جو لوگ مسلمانوں کو پاکستان بھیج دینا چاہتے ہیں یا پھر ختم کر دینا چاہتے ہیں ان کے مجموعہ کو ہم دشمن کیوں نہ قرار دیں۔ یہ کہنا کہ یہ حکم دینی جنگ میں ہوتا ہے قومی جنگ میں نہیں۔ اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ قومی اور دینی کا کوئی سوال نہیں ہے جب ایک گروہ کا مقابلہ دوسرے گروہ سے ہوگا یہی حکم لاگو ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ دینی جنگ کیوں نہیں ہے کہ اگر مسلمان اپنی مسلمانیت کی شناخت ختم کر دیں تو یہ جنگ ختم ہو جائے گی۔ ساری لڑائی اسلام اور مسلمانیت کی شناخت سے وابستگی کی بناء پر ہے۔ غور کیجئے ایک گروہ سے نہ ہمارا زمین جائیداد کا جھگڑا ہے نہ لین دین کا، لیکن ہماری آبادی پر حملہ آور ہوتا ہے یا انفرادی طور پر ہمارے افراد پر حملہ کیا جاتا ہے ہماری مسجد کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے کونے کونے سے لاکھوں کی تعداد میں جمع ہو کر ایک مسجد کو منہدم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامت اور دلیل ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں جنگ میں مصروف ہے۔

ایک اہم سوال کے تین جواب

اس مقام پر یہ سوال خود بخود ہمارے سامنے آتا ہے کہ ان حالات میں ہماری کیا حکمت عملی ہونی چاہئے؟ اس کے جواب میں ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ مسلمان کچھ نہ کریں، حکومت اور اکثریتی طبقہ پر بھروسہ کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا کرتے ہیں، اس لئے کہ سب کے خون سفید نہیں ہو گئے ہیں۔ ہمارے کچھ اقدام کرنے سے حالات مزید ابتر ہو جائیں گے اور پھر نقصان ہمارا ہی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس حکمت عملی کے کچھ مفید نتائج نکلیں

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ یہ حکمت عملی اپنائیں گے انہیں نہ اللہ تعالیٰ معاف کریں گے اور نہ تاریخ معاف کرے گی اور نہ ہماری آئندہ نسلیں بخشیں گی، کیونکہ اس کے معنی ہوں گے کہ گزشتہ چالیس سال کے واقعات اور حادثات سے گویا کوئی عبرت نہیں حاصل کی گئی اور ایک بل سے بار بار ڈسوانے کے لئے اپنے آپ کو پیش کر رہے ہیں۔

ایک دوسری رائے یہ ہوسکتی ہے اور کچھ لوگ پیش بھی کرتے ہیں کہ سب کچھ برداشت کرلیا جائے لیکن تصادم کی راہ نہ اپنائی جائے، اس غرض کے لئے کہ دعوت وتبلیغ کی راہ کھلی رہے۔

قابل غور تین پہلو

لیکن یہ بھی کوئی محفوظ اور اپنی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ہونے کی راہ نہیں ہے۔ اگر دفاع کی راہ نکالنے کی کوشش نہیں کی گئی تو مستقبل قریب میں اس کا سخت اندیشہ ہے کہ دعوت وتبلیغ کی راہیں بالکل بند کردی جائیں اور قولی اور تحریری ہر طرح کی دعوتی سرگرمیوں پر پابندی لگادی جائے اور آپ کو ایسا بے بس کردیا جائے کہ آپ مطلق ہاتھ پیر مارنے کے قابل نہ رہیں اس لئے کہ جب تک پہلے سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے ذہن تیار نہ ہوں، اور عملی میدان میں بھی کچھ تیاریاں نہ ہوں اس وقت تک مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ بالخصوص جبکہ ہوا کا رخ یہ بتارہا ہے کہ آئندہ الیکشنی سیاست بھی زیادہ موثر نہ رہ جائے گی اور اگر رہے گی تو بیلٹ بلٹ کے زیر سایہ رہے گا۔ آسام، کشمیر اور پنجاب اور آندھرا پردیش کے بعض علاقوں سے آنے والی ہواؤں کا یہ کھلا اشارہ ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ واقعی دعوت یعنی دعوت توحید دی جائے تو کیا تصادم کی فضاء مزید تیزی اور شدت کے ساتھ نہیں بنے گی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت کی راہ میں تصادم سے نہیں بچ سکے تو آج کے دور میں دعوت وتبلیغ کا وہ کونسا طریقہ اپنایا جاسکتا ہے جس سے صرف محبت اور بھائی چارہ ہی کی فضاء پیدا ہوگی، اور دار ورسن اور ہجرت اور جہاد کے مراحل سے گریز کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں وہ کیا دلائل ہیں کہ آپ مدافعت کی استطاعت رکھتے ہوئے بھی مدافعت نہ کریں تو اللہ کی باز پرس سے بچ جائیں گے۔ ایک ایسا جوان جو قوت وطاقت اپنے جسم میں رکھتا ہے اپنے مال کی اپنی جان اور آبرو کی حفاظت کے لئے حرکت نہ کرے تو شریعت سے پوچھئے کہ اللہ اور رسول کے پاس اس کی کیا حیثیت قرار پاتی ہے؟ اس کے مسلم پڑوسی کی جان اور آبرو پر حملہ کیا جارہا ہو اور وہ جنبش نہ کرے، تو کیا اس کے ایمان کو خطرہ لاحق نہ ہوگا؟ محلہ کی مسجد کو کچھ لوگ منہدم کرنا چاہیں اور نمازیوں کو نماز سے روکیں اور ایک توانا مسلم نوجوان کے کان پر جوں تک نہ رینگے تو کیا اس کی مسلمانیت میں شک نہیں کیا جاسکتا؟

الغرض اقدام اور دفاع کے لئے قرآن وسنت میں جہاد کے نام سے جو ہدایات اور تعلیمات موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کوئی دلیل نہیں لائی جاسکتی کہ دعوتی مقاصد کی خاطر اپنی حفاظت اور مدافعت کی بات نہ سوچی جائے اور نہ عملاً کچھ کیا جائے، اور اگر کوئی کھینچ تان کر بات بنانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کھینچ تان کر ایسے بے شمار دلائل بھی اکٹھا کئے جاسکتے ہیں کہ دعوت وتبلیغ کی اب ضرورت ہی نہیں ہے حق کھل کر آچکا ہے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ لہٰذا یہ دوسرا طرز فکر بھی نہ قرین عقل ودانش ہے نہ مطابق دین وشریعت۔

صحیح جواب

اس کے بعد صرف ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ حفاظت اور دفاع کی راہ اپنائی جائے اور اس کا حق ادا کیا جائے۔ اور "اَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ" کا تقاضا پورا کیا جائے اور ان دو چیزوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا: "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" کے زمرہ میں داخل ہوگا۔ اور "لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کی ہدایت کے خلاف ہوگا۔

دعوت اور دفاع دونوں کا ہماری حکمت عملی میں شامل ہونا ایک پہلو سے اور بھی ضروری اور اہم ہے کہ جس طرح کہ ۲۳ رسال کے عرصہ میں نزول وحی اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں دین اسلام مکمل ہوا ہے اسی طرح دین وملّت کی خدمت، بقاء، حفاظت اور دفاع کے لئے جو طریقہ اور حکمت عملی شرعی طور سے متعین کی گئی ہے اس کا نام جہاد ہے اور جہاد کے دو شعبے ہیں یا یہ کہا جائے کہ دو جز ہیں، ایک ''دعوت'' اور دوسرا ''دفاع اور قتال''۔

فقہ کی مشہور کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' میں ہے:

> فالجهاد هو الدعاء الى الدين الحق والقتال مع من امتنع وتمرد، عن القبول اما بالنفس او بالمال. (کتاب السیر)
>
> ترجمہ: پس جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا اور ان کے ساتھ جان یا مال کے ساتھ جنگ کرنا ہے جو کنارہ کشی اختیار کریں اور قبول حق کے مقابلہ میں سرکشی کریں۔

''جہاد باعتبار لغت جَاهِدْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ کا مصدر ہے اور باعتبار شرع دین حق کی طرف دعوت دینا اور دین حق قبول نہ کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنا ہے۔'' (شمسی بحوالہ الدر المختار)

جس طرح حسب استطاعت پورے دین کو ماننا اور اپنانا ضروری ہے اسی طرح شرعی طور سے متعین کردہ حکمت عملی ''جہاد'' کو بھی استطاعت کے مطابق ضروری شرائط کی موجودگی میں اپنانا ضروری اور تقاضائے

دین وایمان ہے لیکن جہاد کا موضوع آتے ہی غور وفکر کا دائرہ محدود ہی نہیں تقریباً بند ہوجاتا ہے۔ اس لئے کہ جہاد کے لئے امیر کی اجازت ضروری شرط ہے۔ اور جب ہندوستان میں ہمارا کوئی امیر نہیں تو جہاد کا کیا سوال؟

مگر اس مسئلہ کی گہرائی میں جانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل حقیقت وہ نہیں ہے جو عام طور پر عوام تو عوام اچھے خاصے لوگ سمجھتے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ علماء ہند کو اس مسئلہ پر زیادہ سے زیادہ سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ چنانچہ ہندوستان میں جتنی فقہی کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان میں جہاد کا باب عام طور سے ہوتا ہی نہیں جبکہ سلطنت مغلیہ کے زوال سے پہلے کی کتابوں میں جہاد کا باب کتب فقہ میں برابر ملے گا۔ البتہ موجودہ دور میں جن علاقوں کے مسلمان دشمنان دین سے کشمکش کر رہے ہیں ان کے یہاں جہاد موضوع گفتگو بنا ہے اور ان کی نظر اس عنوان پر زیادہ گہری پڑی ہے۔

درحقیقت جہاد کی فرضیت کے لئے امیر کا ہونا ضروری نہیں ہے جس طرح فرضیت نماز کے لئے امام کا ہونا شرط نہیں ہے البتہ استثنائی حالات کے علاوہ جس طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ فرض نماز کسی امام کی امامت میں ادا کی جاتی ہے اسی طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاد کسی امیر المومنین کے تحت ہونا چاہئے اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب بھی جہاد ہوا ہے مسلمانوں کے دور عروج میں ہوا ہے جبکہ مسلمان کسی امیر المسلمین کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہوتے تھے ایسی صورت میں امیر المومنین کے حکم اور اجازت کے بغیر جہاد کا ہونا کیسے متصور ہوسکتا تھا۔

دو جواب طلب سوال

اس مقام پر دو سوال جواب طلب ہیں۔

① امیر المومنین کے ہوتے ہوئے اگر کچھ لوگ بغیر اجازت جہاد کریں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

② دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اور جہاں امیر المومنین نہ ہوں وہاں کیا جہاد کی کوئی صورت ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم فقہ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں:

> ''اگر دار الحرب میں ایسی جماعت داخل ہوتی ہے جسے قوت دفاع حاصل تھی یعنی طاقتور جماعت تھی تو ان سے بیت المال کے لئے خمس لیا جائے گا اگرچہ یہ جماعت بادشاہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوئی ہو۔''
>
> (فتاویٰ عالمگیری)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اس جماعت کا دھاوا بولنا صحیح تسلیم کیا گیا اور اس کو جہاد قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف اگر ایک دو آدمی دار الحرب میں جائیں تو ان سے خمس نہیں لیا جائے گا اس لئے کہ وہ مال غنیمت کی تعریف میں نہیں آئے گا۔ اور ان کا دھاوا بولنا جہاد متصور نہ ہوگا۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ فقہی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کا عمل جہاد کی تعریف میں نہیں آتا اور ان کا دھاوا بولنا جہاد

متصور نہ ہوگا لیکن ان کا چھین جھپٹ کر لایا ہوا مال ان کے لئے حلال ہوگا حرام نہ ہوگا۔

بہر حال اوپر مذکورہ دونوں فقہی جزئیوں پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ امیر المومنین کے ہوتے ہوئے بھی اس کی اجازت کے بغیر جہاد ہوسکتا ہے، اور دوسری بات یہ کہ جہاد کے صحیح ہونے اور نہ ہونے میں قوت طاقت اور قوت دفاع کی موجودگی بھی ایک معیار ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر جلد سابع میں ہے کہ ''شریعت میں وہ زور اور جبر معتبر ہے جو سلطان کی طرف سے ہو کیونکہ سلطان کو قوت دفاع اور قوت منعہ حاصل ہے اور جس کے پاس قوت دفاع نہ ہو اس کی جانب سے زور اور طاقت کے استعمال کو شریعت نے معتبر نہیں قرار دیا ہے۔''

سلطان کی تعریف شامی جلد ۵ میں پڑھئے......

> ''شریعت نے سلطان کے بغیر کسی کا زور اور جبر معتبر نہیں مانا ہے، کیونکہ زور اور جبر کی طاقت قوت دفاع کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور جس کے پاس قوت دفاع ہو وہ سلطان ہے۔''

قوت دفاع کا معیار کیا ہے، یعنی کب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب قوت دفاع حاصل ہوگئی، اس مسئلہ پر کتب فقہ کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے روشنی پڑتی ہے:

> ''تین آدمیوں کا حکم بھی ایک کا ہے البتہ چار ہوں تو خمس لیا جائے گا۔ محیط میں ابو یوسف سے منقول ہے کہ سات آدمیوں کی جماعت از روئے شریعت وہ جماعت نہیں ہے جس کو قوتِ دفاع حاصل ہو۔ دس آدمیوں کی جماعت ایسی جماعت ہے جس کو قوت دفاع حاصل ہوگی۔'' (فتح القدیر)

عنایہ میں قوت منعہ کی تفسیر سریہ سے کیا ہے، اس تفسیر کو علامہ ناطقی نے ابن شجاع کی کتاب الخراج سے نقل کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

> ''اگر کوئی ایک آدمی اکیلا دار الحرب میں داخل ہوا اس حال میں کہ دار الحرب میں کہیں قریب اسلامی فوج نہ تھی پھر اس آدمی کو کچھ مال ہاتھ آیا تو اس میں بیت المال کا پانچواں حصہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ مسلمان حملہ آوروں کی تعداد ۹ تک پہنچ جائے، جب نو تک تعداد پہنچ جائے تو یہ سریہ ہے لہٰذا اس میں خمس ہوگا۔''

جہاد کے لئے ضروری تعداد

معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلہ میں (۹-۱۰) افراد پر مشتمل کوئی جتھا یا ٹولی ہو تو شرعاً اسے باعتبار قوت، قوت دفاع کا حامل کہا جاسکتا ہے اور وہ جو بھی اقدام کریں گے اس کو جہاد کہا جاسکتا ہے اور اس کے سربراہ کو امیر یا سلطان کہا جاسکتا ہے اور اس کی سرکردگی میں جہاد کیا جاسکتا ہے اور جہاں تک قوت دفاع کے لئے اسلحہ اور دیگر تیاریوں کا سوال ہے۔ اس کا جواب قرآن کے الفاظ "مَا اسْتَطَعْتُمْ" میں مل جاتا ہے پھر تینوں سوالوں

کا جواب یعنی تعداد اسلحہ وغیرہ کی مقدار کیا ہو، اور حدود اقتدار کیا ہو، ابو جندل اور ابوالبصیر رضی اللہ عنہما کے واقعہ میں ملتا ہے۔

حضرت ابوالبصیرؓ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے، صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آئے ان کے پیچھے ہی مکہ سے ازہر بن عبدعوف اور اخنس بن شرفی کا ایک مکتوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مدینہ دو آدمی لائے کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی رو سے ابوالبصیر کو واپس کر دیا جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوالبصیرؓ کو بلایا اور فرمایا: ''ابوالبصیر ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے دین میں عہد شکنی نہیں ہے، تم مکہ چلے جاؤ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا۔''

ابوالبصیرؓ نے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! کیا آپ مجھے مشرکوں کی طرف واپس کر رہے ہیں جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا ''مکہ چلے جاؤ۔ اللہ کوئی راہ نکالے گا۔'' حضرت ابوالبصیرؓ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں انہوں نے مقام ذوالحلیفہ میں اپنے دونوں پہرہ داروں میں سے ایک کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا۔ دوسرا پہرہ دار ڈر کر مدینہ چلا گیا اور وہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ابوالبصیرؓ کی شکایت کی۔ اس کے بعد ساتھ ہی ابوالبصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔

اس کے بعد ابوالبصیرؓ مدینہ سے مقام عیص چلے گئے۔ عیص اس راستہ پر ہے جس سے ہو کر وہ شام جاتے تھے، سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے۔ مکہ میں جو مسلمان رو کے ہوئے تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہو چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہا تھا اس کو جان چکے تھے اس لئے وہ عیص میں ابوالبصیرؓ سے آ کر مل گئے۔ اس طرح تقریباً ستر آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے قریشیوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ وہ جس قریشی کو پاتے اسے قتل کئے بغیر نہ چھوڑتے اور جو قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس پر چھاپہ مارتے۔

جس وقت حضرت ابوالبصیرؓ اپنی کارروائی کر رہے تھے اس وقت مدینۃ الرسولؐ، دارالاسلام کا صدر مقام تھا جس کے سربراہ بذاتِ خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔ ابوالبصیرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کچھ کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت اور حکم سے نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے طور پر کر رہے تھے ورنہ مشرکین ضرور اعتراض کرتے کہ حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی ہے۔ پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سب کچھ معلوم تھا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی نکیر نہیں فرمائی، جبکہ یہ ناممکن ہے کہ خلافِ شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور آپ خاموش رہیں۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی یعنی تقریر کو شریعت میں ایک مضبوط دلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی حضرت ابوالبصیرؓ کی ساری کارروائیوں کے صحیح ہونے کی دلیل ہے، جو بہت ساری قیل وقال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے کوئی حکمت عملی متعین کرنے کیلئے یہ ایک واقعہ کافی ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ابوالبصیرؓ کا نمونہ

آج ابوالبصیرؓ کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ یا کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنان دین و ملت کو نشانہ بنائے تو کیونکر غلط ہوسکتا ہے؟! اور اگر کہا جائے کہ حضورؐ کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعہ دارالاسلام مدینہ کے باہر ہو رہا تھا اس لئے آپ ﷺ نے اس سے تعرض نہیں فرمایا۔ تو یہ توجیہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آپ کی رسالت اور نبوت ساری دنیا کے لئے تھی۔ دنیا میں جہاں کوئی مسلمان ہوگا آپ ﷺ کے حکم کے تابع ہوگا۔ حضرت ابوالبصیرؓ آپؐ کے حدودِ رسالت واِطاعت کے باہر نہ تھے۔ اور اگر اس توجیہ کو صحیح مان لیا جائے تو ہمارے مدعا کو مزید ثبوت اور قوت حاصل ہوگی اور یہ ثابت ہوگا کہ کہیں بھی چند مسلمان اکٹھا ہوکر دین وملّت کے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کر سکتے ہیں اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر شرعی حکومت قائم ہو اور وسیع علاقہ پر امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کا سکہ جاری ہو۔

دوسرے سوال کا جواب

اب آیئے ہم دوسرے سوال پر غور کریں۔ یعنی جہاں کوئی امیر المومنین نہ ہو وہاں جہاد کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں شامل ہے جس کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے۔ ہم زیادہ نظری بحث نہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ انعقاد جمعہ ونماز عیدین کے لئے بھی امام یا قاضی کی ضرورت ہے اور نکاح وطلاق کے نزاعی معاملات میں مسلم قاضی کا فیصلہ درکار رہتا ہے۔ لیکن ہمارے جیسے ملک میں جہاں امیر نہیں ہے وہاں قاضی کہاں سے آئے گا اور معاملات اور حادثات تو بہرصورت پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے۔ اس مسئلہ کا حل علماء نے یہ نکالا کہ عام مسلمانوں کی جماعت کے فیصلہ کو قضاء قاضی کے برابر قرار دیا جائے۔ اسی بنیاد پر پورے ملک میں جمعہ وعیدین کی نمازیں قائم کی جاتی ہیں۔ اور اسی بنیاد پر ملک کے کئی علاقوں میں شرعی پنچایتیں کام کر رہی ہیں۔

پھر اسی بنیاد پر شریعت میں امام اور امیر المؤمنین کی جو تعریف ہے اس کو محدود کرتے ہوئے پرسنل لاء کی حد تک ایک امیر بنالیا جائے اور وہ قاضی کا تقرر کرے اور وہ قاضی فیصل مقدمات کرے تو وہ فیصلہ شرعی فیصلہ تسلیم کرلیا جائے۔ امارت شرعیہ بہار اور امارت ملت اسلامیہ آندھرا پردیش اسی بنیاد پر قائم ہیں۔

ایک فقہی نقطہ

اس کی نظیر شریعت کے بہت سے احکام میں ہمیں مل سکتی ہے کہ فرض اپنی جگہ قائم رہتا ہے۔ اس کی ادائیگی کے شرط نہ ہونے کی صورت میں فرض ساقط نہیں ہوتا مثلاً نماز کی ادائیگی کے لئے ستر پوشی ضروری شرط ہے لیکن

ستر پوشی کا سامان نہ ملے تو وہ فرض ساقط نہ ہوگا بلکہ فرض ادا کیا جائے گا، کیسے ادا کیا جائے گا کسی مفتی سے دریافت کیجئے۔ وضوادائیگی نماز کے لئے شرط ہے، لیکن پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم سے کام لیا جائے گا اور اگر کوئی ایسی صورت فرض کی جائے کہ تیمم کرنا بھی ممکن نہ ہو تو نماز کیسے ادا کی جائے کسی مفتی صاحب سے پوچھئے۔ بہر صورت نماز ادا کرنی ہوگی۔ فرض ساقط نہ ہوگا، البتہ بعض شکلوں میں فرض کی شکل بدل سکتی ہے۔

جماعت سازی کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے جھگڑے طے کرنے کے لئے ایک ملک میں بحیثیت تیمّم امارت قائم کی جاسکتی ہے تو فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لئے کوئی امارت کیوں نہیں قائم کی جاسکتی جو اصل امارت اور اِسلامی حکومت کی نسبت سے ویسی ہی ہو جیسے ادائیگی نماز کے اصل وضو کی جگہ تیمّم ہوتا ہے۔ اِسلامی حکومت نہیں ہے، کوئی ہمارا اَمیر نہیں ہے تو اس بنیاد پر قیامت تک جاری رہنے والے فرض جہاد کو اپنی ڈکشنری سے نکال دینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اور اس کو کسی شکل میں اور کسی درجہ میں باقی نہ رکھنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اگر فریضۂ دعوت وتبلیغ کی ادائیگی کیلئے انجمنیں، تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کل ہند پیمانہ پر امیر اور مامور کی اصطلاح میں بات کرسکتی ہیں اور اپنے دائرہ میں امیر کی اطاعت کو دینی فریضہ سمجھتی ہیں اور ان کا سمجھنا بجا ہے تو فریضۂ جہاد کو ادا کرنے کے لئے کوئی امارت کیوں نہیں بنائی جاسکتی اور اگر ایک ملک میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے لئے کئی کئی تنظیمیں بنانا روا ہے تو فریضۂ جہاد جیسے مہتم بالشان فریضہ کی ادائیگی کے لئے کوئی نظم کیوں نہیں قائم کیا جاسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کے لئے کسی شرعی بنیاد کی نفی جن مزعومات کے تحت کی جاتی ہے ان کو صحیح مان لیا جائے تو کسی کام کے لئے کوئی انجمن اور جماعت بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ساری انجمنیں اور جماعتیں اپنے اپنے کاموں کی اہمیت بتانے کے لئے اور اپنے کارکنوں میں جوش عمل پیدا کرنے کے لئے انہیں آیات اور احادیث اور انہیں مسلمات کو پیش کرتی ہیں جو صریح طور سے جہاد کے لئے قرآن وحدیث میں ہمیں ملتی ہیں۔ مگر جب جہاد کا نام لیا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے گنجائش نہیں ہے۔

اقدام اور دفاع میں فرق

ایک پہلو مزید سوچنے کا یہ ہے کہ احکام اور شرائط کے اعتبار سے اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد میں آپ کو فرق ملے گا۔ اقدامی جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے، لیکن دفاعی جہاد فرض عین ہوجاتا ہے۔ اقدامی جہاد میں تعداد کا، جنگی سامان اور وسائل کا لحاظ اور اعتبار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقدامی جہاد میں کئی اور لوگوں سے اجازت لینی ہوتی ہے

مثلاً غلام کو اپنے آقا کی اجازت درکار ہوگی، لیکن دفاع کے موقع پر نہ تعداد کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وسائل جنگ کی کمی بیشی دیکھی جاتی ہے اور نہ کسی کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ہر ایک کو ہر حالت میں حسب استطاعت دفاعی جہاد میں شرکت کرنی ضروری ہوتی ہے۔اسی بناء پر غزوہ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں کو شریک جہاد نہ ہونے کی وجہ سے کیسی عبرتناک سزا دی گئی کہ پچاس دن تک ان سے نہ کوئی سلام و کلام کرتا نہ سلام کا جواب دیتا اور ان کے لئے زمین تنگ ہو کر رہ گئی۔

قرآن میں دفاع کا ذکر

قرآن میں دفاع کا حکم صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔لیکن ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔مکی سورتوں میں حکم دفاع کے ساتھ دو باتوں کی صراحت کی گئی ہے، ایک ظلم سے بڑھ کر بدلہ نہ لیا جائے اور دوسرے یہ کہ صبر کرو تو بہتر ہوگا۔

مدنی سورتوں میں بغیر کسی قید و شرط کے حکم دفاع ہے بلکہ اقدام اور پہل کرنے کا حکم ہے۔

مکی سورتوں میں:

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ. (الشوریٰ:۴۰)

ترجمہ: برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ. (النحل:۱۲۶)

ترجمہ: اگر تم بدلہ لے لو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو لیکن اگر تم صبر کرو تو یقینا یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

مدنی سورتوں میں:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا. (البقرہ:۱۹۰)

ترجمہ: اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔مگر زیادتی نہ کرو۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرہ:۱۹۴)

ترجمہ: جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح دست درازی کرو۔البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (الحج:۳۹)

ترجمہ: ''اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقینا اللہ ان کی مدد پر قادر ہے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ''ہمارا رب اللہ ہے۔''

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا. (النساء:۷۵)

ترجمہ: آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبائے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کردے۔

دفاع حدیث میں

① ابوداؤد اور نسائی شریف میں حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو دعا کرتے، اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَجْعَلُكَ فِيْ نُحُوْرِهِمْ وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ (یعنی اے اللہ ہم ان کے مقابلہ میں تجھ کو کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں)۔

② بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
لا تتمنوا لقاء العدو واسالوا اللّٰہ العافية فإذا لَقِيتموهم فاصبروا.
دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اللہ سے عافیت مانگو لیکن مڈبھیڑ ہوجائے تو ڈٹ جاؤ۔

③ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: من قتل دون ماله فهو شهيد ''جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔''

④ ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث میں حضرت ابوالاعور سعیدؓ نے کہا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا ہے:
من قتل دون ماله فهو شهيد ومن قتل دون دمه فهو شهيد ومن قتل دون دينه فهو شهيد ومن قتل دون اهله فهو شهيد

''جو مارا گیا اپنے مال کی حفاظت میں وہ شہید ہے، جو مارا گیا اپنی جان کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے دین کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے اہل وعیال کی حفاظت میں وہ شہید ہے۔

⑤ مسلم شریف کی حدیث ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسولﷺ! آپ کا کیا خیال ہے اگر ایک آدمی آئے میرا مال چھیننے کے لئے۔
آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کو اپنا مال نہ دے۔ سائل نے عرض کیا اگر وہ مجھ سے جنگ کرے، فرمایا تو اس سے جنگ کر۔ سائل نے دریافت کیا اگر وہ مجھ کو قتل کر دے تو آپ نے فرمایا تو شہید ہوگا۔ پھر سائل بولا اگر میں اس کو قتل کر دوں تو آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔

⑥ مسلم شریف کی حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
من علم الرمی ثم ترکه فلیس منا او فقد عصی
''جس نے تیر اندازی سیکھی پھر اس نے تیر اندازی چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے نافرمانی کی۔

⑦ ایک روایت میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:
''اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعہ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ بنانے والا جو اس کے بنانے میں حصول خیر کی نیت رکھتا ہو تیر کو پھینکنے والا اور تیر کو اٹھانے والا۔ تیر چلاؤ اور سواری کرو اور تیر چلانا سواری کرنے سے بہتر ہے اور جس نے سیکھنے کے بعد بے رغبتی کی وجہ سے تیر اندازی چھوڑ دی تو اس نے ایک خاص نعمت کو ضائع کر دیا۔'' (ابوداؤد)

⑧ بخاری و مسلم کی حدیث ہے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:
''آپ نے فرمایا: الحرب خدعة (جنگ دھوکہ ہے)۔''

دفاع کی اہمیت

''الجہاد فی الاسلام'' میں دفاع کی اہمیت بتاتے ہوئے مصنفؒ لکھتے ہیں:
''قرآن اپنے پیروؤں میں حمایت حق کی ایسی ناقابل تسخیر روح پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظت حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائے...... قرآن جو درحقیقت صحیفۂ فطرت ہے، فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ رکھتا ہے، اسی بناء پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں یا موت یا شرف۔ زندگیٔ بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ چاہے اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہو...... قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے حملہ کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سواء دوسرا نظام

مسلط کرنے کے لئے کیا جائے۔ اسلام نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے، تم پر ظلم و ستم ڈھائے، تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے، تم سے ایمان وضمیر کی آزادی سلب کرے، تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے اور اس وجہ سے تمہارے در پۓ آزار ہو کہ تم اسلام کے پیرو ہو تو اس کے مقابلہ میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کرو۔

دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور اپنے قومی اور دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں اس کے لئے اسلام نے اپنے پیروؤں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ تاکید کی ہے اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت اوپر بیان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کر کے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن واطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرہ میں مبتلا کیا جا سکتا ہے......

اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں ایک غائر نظر ڈالئے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی وشرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے خواہ اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور خرخشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی قومی وسیاسی طاقت کا محفوظ رہنا ہے، اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی و بیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت ومسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا۔ تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں، جو ان کی بربادی کا موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالمگیر اصلاح کے کام میں سد راہ بننے کے قابل نہ رہیں پھر اس کے لئے صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جب کہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کردے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمربستہ ومستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے...... تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہو سکے اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر مر جائے۔''

ظالموں اور قاتلوں سے چشم پوشی کرنے والے حکمران

جو ظالموں اور قاتلوں کو سزا نہ دے اور ان سے چشم پوشی کرے ایسے حکمران کے مسئلہ پر فتاوی عالمگیری کی مندرجہ ذیل عبارت سے روشنی پڑتی ہے۔

''اگر کوئی مسلمان تاجر امان لے کر دار الحرب میں داخل ہو تو اس پر حرام ہے کہ حربیوں کی جانوں یا مالوں سے تعرض کرے، لیکن اگر ان تاجروں کے ساتھ حربیوں کے بادشاہ نے جان بوجھ کر غدر کیا اس طور پر کہ ان کے مال لے لئے یا قید کیا یا اور کسی نے ظلم کیا اور بادشاہ نے جان بوجھ کر منع نہ کیا تو ایسی حالت میں ان تاجروں کو ان کی جانوں و مالوں سے تعرض کرنا منع نہیں ہے۔ مانند اس شخص کے جس کو اہل حرب قید کر کے لے گئے یا بطور چوروں کے وہ ان کے ملک میں پوشیدہ داخل ہوا کہ اس کو یہ امور مباح ہوتے ہیں، پس اسی طرح ایسے تاجروں کو بھی روا ہے کہ ان کا مال لے لے اور ان کو قتل کرے۔'' (فتاویٰ عالمگیری)

غیر جانبداروں کا مسئلہ

ہم جن حالات میں گھرے ہوئے ہیں ان میں اسلام اور مسلم دشمن تنظیموں، سیناؤں اور دلوں کا معاملہ بالکل صاف ہے کہ انہوں نے اسلام اور مسلم دشمنی کو اپنا مقصد زندگی بنا رکھا ہے اور جو یقیناً تھوڑے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اکثریت کو کس زمرہ میں شامل کیا جائے اور ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے اس کے جواب میں صاحب ''الجہاد فی الاسلام'' لکھتے ہیں:

''اس سلسلہ کی سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ محاربین کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ایک اہل قتال، دوسرے غیر اہل قتال۔ اہل قتال وہ ہیں جو عملاً جنگ میں حصہ لیتے ہیں یا عقلاً و عرفاً حصہ لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ جوان مرد اور غیر اہل قتال وہ ہیں جو عقلاً و عرفاً جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے یا عموماً نہیں لیا کرتے مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، زخمی، اندھے، مفلوج الاعضاء، مجنون، سیاح، خانقاہ نشین، زاہد، معبدوں اور مندروں کے مجاور اور ایسے ہی دوسرے بے ضرر لوگ۔ اسلام نے طبقہ اول کے لوگوں کو قتل کرنے کی اجازت دی ہے اور طبقہ دوم کے لوگوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا ہے......

اس باب میں اسلامی قانون کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص جو اہل قتال سے ہے اس کا قتل جائز ہے خواہ بالفعل لڑے یا نہ لڑے اور ہر وہ شخص جو اہل قتال سے نہیں ہے اس کا قتل ناجائز ہے سوائے اس صورت کے کہ وہ حقیقتاً لڑائی میں شامل ہو یا مقاتلین کے سے کام کرنے لگے۔''

قصوروار اور بے قصور

''الجہاد فی الاسلام'' سے نقل کردہ اوپر کے اقتباسات سے معلوم ہوا کہ اجتماعی ٹکراؤ اور حالت جنگ میں

قصوروار اور بے قصور کی بنیاد پر تفریق نہیں کی جاتی، بلکہ جو آج نہیں کل، صبح نہیں شام، اس وقت نہیں اس وقت مقابل میں کھڑا ہوسکتا ہے ان سب کو نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ اسلامی شریعت کا یہ اصول عقل عام کے عین مطابق ہے جو گروہ قصوروار اور بے قصور کی کسوٹی اپنے ہاتھ میں رکھے گا وہ ہمیشہ مار کھائے گا اور کبھی بھی اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ جس کو بے قصور سمجھا جاتا ہے وہ بے قصور نہیں ہے، کیونکہ وہ اگر چاقو مارتا نہیں ہے تو چاقو مارنے والے کو پالتا ہے اور اس کے سپورٹ اور پشت پناہی میں رہتا ہے۔ اس طرح وہ قصور میں برابر کا شریک ہے۔

صورت واقعہ کو ایک مثال سے سمجھئے، دس ڈاکو کسی بستی پر دھاوا بولتے ہیں، ان میں سے دو کے پاس بندوق ہے وہ فائر کرتے ہیں کئی لاشیں گر پڑتی ہیں، پھر اگر اس ٹولی کے کچھ افراد بستی والوں کی زد میں آجاتے ہیں تو کیا ان کے لئے ضروری ہوگا کہ کوئی اقدام کرنے سے پہلے یہ تحقیق کریں کہ آیا فائرنگ کرنے والے یہی لوگ ہیں؟ ظاہر ہے یہ تحقیق کبھی بھی نہ ہوسکے گی اور بالآخر روزانہ ان کے حصہ میں ڈاکہ زنی آئے گی۔ ہاں یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہر حالت میں قصوروار اور بے قصور کی تفریق کئے بغیر نشانہ بنانا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے بلکہ محض جائز ہے، بشرطیکہ اپنے تحفظ اور دفاع کا تقاضا ہو اور اس کا دارومدار اقدام کرنے والے کی اختیار تمیزی پر ہوگا۔

واللہ اعلم بالصواب!

نظامِ خلافت وامارت

کی شرعی حیثیت

(۱۹۹۳ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	عناوین	صفحہ نمبر
1	تمہید	121
2	تین مسلمات	123
3	اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے	123
4	اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے	124
5	توضیح میں مزید وضاحت	125
6	اصولِ شریعت	126
7	دین کی ہمہ گیری کا تقاضہ	126
8	اسلامی خلافت	128
9	اقامت خلافت کی دینی حیثیت	129
10	ایک غلط فہمی کا ازالہ	135
11	مسئلہ خلافت وامارت ہندوستان میں	138

تمہید

نظام خلافت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اس موضوع پر گفتگو کیلئے بطور تمہید موجودہ عالمِ اِسلام کے ایک مستند عالمِ باعمل کے الفاظ مستعار لیتا ہوں۔

''اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں ہے چند مختلف لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں اسی طرح اسلام عیسائیت کی طرح چند عقائد ورسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے وہ زمانہ کی فضا، طبیعت بشری کا مذاق اور سوادِ اعظم کا رنگ بدلنا چاہتا ہے اور عقائد کے ساتھ ساتھ اخلاق ومعاشرت، زندگی کے مقصد ومعیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ اس کو مادی وسیاسی اقتدار حاصل ہو۔ صرف اسی کو قانون سازی اور تنفیذ کا حق حاصل ہو۔ اسی کے صحیح نمائندے دنیا کے لئے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق واعمال کی اشاعت ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ. (الحج:۴۱)

ترجمہ: یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے زمین میں انہیں صاحب اقتدار کر دیا ''یعنی ان کا حکم چلنے لگا تو'' وہ نماز قائم کریں گے ادائے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے۔ برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ شرعی حکومت کے بغیر شریعت پر پورا عمل بھی نہیں ہوسکتا۔ اسلام کے نظامِ عمل کا ایک مستقل حصہ ایسا ہے جو حکومت پر موقوف ہے۔ حکومت کے بغیر قرآن مجید کا ایک پورا حصہ ناقابل عمل رہ جاتا ہے۔ خود اسلام کی حفاظت بھی قوت کے بغیر ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر اسلام کا پورا نظام مالی ودیوانی فوجداری

معطل ہوجاتا ہے اسی لئے قرآن غلبہ وعزت کے حصول پر زور دیتا ہے اور اسی لئے خلافت اسلامی بہت اہم اور مقدس چیز سمجھی گئی اور اس کو اکابر صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی تجہیز وتکفین پر مقدم رکھا۔ جسے بہت سے کوتاہ نظر نہیں سمجھتے اور اسی کی حفاظت کے لئے حضرت حسینؓ نے اپنی قربانی پیش کی تاکہ اس کا مقصد ضائع نہ ہو اور نااہل ہاتھوں میں نہ جانے پائے۔'' (سیرت احمد شہیدؒ حصہ اول از: مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، صفحہ: ۵۱۵)

''اسلام کے پیش نظر جو عظیم مقاصد ہیں۔ ان میں عبد ومعبود کے تعلق کی اصلاح وتعظیم پھر اس کی ترویج وتوسیع، انسانی زندگی کو اس کے قالب میں ڈھالنے کی سعی، افراد جماعت کے باہمی تعلقات کی استواری اور خوشگواری بھی ہے۔ ایک ایسی شائستہ، خوش اسلوب، پرسکون اور پرُامن زندگی کے لئے فضا ہموار کرنا بھی ہے جس میں خالق کے فرائض مخلوق کے حقوق دونوں کے ادا کرنے کا پورا موقع اور ان کمالات اور ارتقائی منازل تک پہنچنے کا پورا امکان پایا جائے۔ جس کی صلاحیت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ اس کی قوت عمل اور ذہانت ان خطرات کا مقابلہ کرنے، ان نقصانات سے بچنے اور ان مفاسد کے دور کرنے میں ضائع نہ ہو جو کبھی غیر منظم زندگی سے پیدا ہوتے ہیں کبھی خود ساختہ قوانین کبھی مطلق العنانی اور جاہ واقتدار کی ہوس سے۔ اس کے لئے ایک منزل من اللہ قانون آسمانی شریعت اور خدا کی الوہیت وحاکمیت کے عقیدہ پر ایک نظام خلافت وامارت ضروری ہے۔''

(تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ پنجم، ص: ۲۵۹، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ)

تین مسلمات

① اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے

یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر ہے یا کسی شعبۂ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے۔ نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدۃ:۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت دین پسند کرلیا۔

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔ اونے پونے کی سودابازی ناقابل قبول اور باعث ہلاکت ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ. (البقرۃ:۸۵)

ترجمہ: تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو پس یہ تم میں سے جو بھی کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت شدید ترین عذاب میں ڈھکیلے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علمائے اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے۔ اس کا آپ مطالعہ کریں اور دیکھیں انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصول قانون اور قانونی نظائر موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیمؒ نے امور دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظام زندگی سمجھا گیا ہے:

جان لو اُمورِ دین: اعتقادات، عبادات، معاملات، حدود وتعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔ اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں:

① ایمان باللہ۔ ② ایمان بالملائکہ۔ ③ ایمان بالرسل۔ ④ ایمان بالکتب۔ ⑤ ایمان بالیوم الآخر۔

عبادات بھی پانچ ہیں: ① نماز۔ ② زکوٰۃ۔ ③ روزہ۔ ④ حج۔ ⑤ جہاد۔

معاملات بھی پانچ ہیں: ① مالی معاوضات۔ ② مناکحات۔ ③ مخاصمات۔ ④ امانات۔ ⑤ ترکہ ومیراث۔

حدود وتعزیرات بھی اصلاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں:

① قتل نفس۔ ② سلب مال۔ ③ ہتک ستر۔ ④ ہتک عزت۔ ⑤ قطع نسل۔

آداب چار ہیں: ① اخلاق۔ ② شمائل حسنہ۔ ③ سیاسیات۔ ④ معاشرتی مسائل۔

(البحر الرائق کتاب الطہارۃ)

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں: "لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع"۔ یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بتایا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کیلئے شریعت کی اجازت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت کوئی فعل کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہوسکتا۔

ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں۔ عزیمت اور رخصت۔ عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بناء پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کے اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہوسکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہوسکتی ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے بہت سارے شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث۔ ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوس پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد۔

② اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے

شریعت اسلامی جب ہر شعبہ زندگی کے لئے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں ہے

تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہوسکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الٰہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام۔ قانون کی ہمہ گیری سے قانون سازی کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ "حکم صرف اللہ کیلئے ہے"۔

فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ "حکم اللہ ہی کیلئے ہے جو بالا دست اور بڑا ہے"۔

لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے"۔

فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے:

والذی یعلم من التوضیح فی ضبطھا ان الحکم مفتقر فی الحاکم والمحکوم علیه والمحکوم به فالحاکم هواللّٰه تعالیٰ والمحکوم علیه هو المکلف والمحکوم به فعل المکلف۔ (نور الانوار، ص:۲۶۶)

ترجمہ: قواعد کے ضبط میں توضیح سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکم محتاج ہے حاکم، محکوم علیہ اور محکوم بہ کا پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکلف اور محکوم بہ مکلف کا فعل ہے۔

توضیح میں مزید وضاحت

القسم الثانی من الکتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وهو اللّٰه تعالٰی لا العقل علی مامر فی باب الامر۔ (ص:۶۰۷)

ترجمہ: کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ عقل۔ جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا۔

لاحکم الامن اللّٰه تعالٰی باجماع الائمة لا کمافی کتب بعض المشائخ ان هذا عندنا وعندالمعتزلة الحاکم العقل فان هذا مما لا یجتری علیه احد من یدعی الاسلام۔ (شرح مسلم الثبوت، ص:۱۳۰)

ترجمہ: حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا بعض مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی جرأت کوئی مدعی اسلام نہیں کرسکتا۔

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص، کوئی خاندان، کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم کرنے کی مجاز نہیں ہے

اسی طرح مجرد عقل اور تجربہ کی بنیاد پر بھی کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہہ کر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل و تجربہ سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لئے فقہ کو اس کی ضرورت پڑی کہ صریح لفظوں میں عقل کی حاکمیت کا انکار کر دیا جائے لیکن قابل رنج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبرداران اسلام کے مقابل میں ہے۔

③ اصول شریعت

حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کے لئے صرف چار ذرائع ہیں۔ کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ کتاب تو اس لئے کہ وہ صریح طور پر حاکم اعلیٰ کا کلام ہے اور سنت اس لئے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم کا نام سنت ہے اور اجماع اس لئے کہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ ہے۔ رہا قیاس اور اس کی دوسری شاخیں استحسان، استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب وسنت کے مخفی احکام معلوم کرنے کے ذریعے بنتے ہیں بجائے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو بھی حکم معلوم ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا اور ان طریقوں کو چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریعی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے۔ خواہ وہ قانون اور ضابطہ کوئی ایک فرد بنائے یا کوئی قوم یا کسی ملک کے جمہور۔

دین کی ہمہ گیری کا تقاضا

مذکورہ تینوں مسلمات: ① اسلام کا ہمہ گیر ہونا۔ ② اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور ③ شریعت کے اصول اربعہ، کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان کا سراپا دین میں گم ہو جائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کر سکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعیت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام نظام خلافت اور ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو؟ کس دلیل کی بناء پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے؟ کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے؟ یہ زمین اس کی، آسمان اس کا، ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے؟ کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کر دیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لئے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء اور خلفائے راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔ ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور پر چور کے بارے میں حکم ہے۔

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا. (المائدۃ:۳۸)

چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔

یہ ایک کھلا ہوا حکم ہے۔ جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بتایا گیا بلکہ تمام مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کر سکتا اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس کا صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جسد واحد بن جائے اس کا ایک قائد اور سربراہ ہو اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو جس کے ذریعہ اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے۔ امت میں انتشار اور انارکی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی بناء پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا. (آل عمران:۱۰۳)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ و مَن شَذَّ شُذَّ الی النَّار. (الترمذی)

ترجمہ: ''اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے جو جماعت سے الگ ہو وہ آگ میں گیا۔''

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَاِنَّمَا يَاكُلُ الذِّئبُ مِنَ الْغَنَمِ القَاصِية. (ابوداؤد)

ترجمہ: تم پر جماعت لازم ہے اس لئے کہ بھیڑیا انہی بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں۔

عہد رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت کی راہبر اور ذمہ دار تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھوں انجام پاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرامؓ نے ایک خلیفہ کے انتخاب کے ذریعہ اس ذمہ داری کو کما حقہ ادا کیا اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت انتشار کا شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت وامارت سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی خلافت کو ہم

اسلامی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمانوں کا مطمحِ نظر اور ان کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے اور ان کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ ساتھ دنیا سے شر وفساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے۔

اسلامی خلافت

اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت اور خلافت کی تعریف خود متعین ہو جاتی ہے لیکن مزید توضیح کے لئے میں یہاں ابن خلدونؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعریفیں نقل کرتا ہوں۔ ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے:

''خلافت کے لغوی معنی جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آنحضرت ﷺ کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دینی اور دنیاوی امور میں فرمانروائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی و دنیاوی معاملات میں فرمانروائی کی حامل تھی۔ یہ فرمانروائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویہ نگاہ سے حکومت کے نظم ونسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا۔''

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے:

هى الرياسة العامة فى التصدى لاقامة الدين باحياء العلوم الدينية، و اقامة اركان الاسلام، والقيام بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب الجيوش والفروض للمقاتلة، واعطاء هم من الفيىء والقيام بالقضاء واقامة الحدود، ورفع المظالم، والامر بالمعروف والنهى عن المنكر نيابة عن النبى ﷺ.

(ازالة الخفا، مقدمة، ص:١٦٦)

''نبی ﷺ کی نیابت میں علوم دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو ترتیب دینے مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت کو تقسیم کرنے اور عہدۂ قضاء کے فرائض انجام دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔''

یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف متعین کرنے کے لئے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرہ کار کو غیر مبہم الفاظ میں یہاں واضح کر دیا گیا ہے۔ اب جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اور خاکہ نہیں ہے۔ تو ان سے پوچھا جائے کہ اگر یہ خاص تصور نہیں تو کیا ہے؟ کسی ہیئت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد، دائرہ کار، آئیڈیالوجی کا متعین نہ ہونا دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری، عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے۔ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اس کا نام اسلامی حکومت ہے۔ لیکن حقائق کو جھٹلانے پر اگر کوئی تل جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے؟

اقامت خلافت کی دینی حیثیت

اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے فوراً بعد یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے؟ فرض ہے، نفل ہے، مباح ہے۔ آخر کیا ہے؟

شریعتِ اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی بھی طرح وضو کی فرضیت کو ساقط نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس پر کنویں سے پانی نکالنا یا کسی سے طلب کرنا ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لئے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بناء پر کسی مسافر کے لئے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائز نہیں کہ وضو کے بجائے تیمم کر لے۔ بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو۔

> الاتریٰ ان تحصیل اسباب الواجب واجب وتحصیل اسباب الحرام حرام بالاجماع. (مسلم الثبوت، ص:۳۸)
>
> ترجمہ: کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع کا حاصل کرنا واجب اور حرام کے ذرائع کا حاصل کرنا حرام ہے بالاجماع۔

''جس واجب کے اسباب اور شروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے اصول فقہ نے دو قیدیں لگائی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو، شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو۔ دوسری یہ کہ وہ سبب شرط مکلف کے مقدور میں ہو ان دو قیدوں میں سے کوئی ایک قید بھی اگر غائب ہو جائے تو پھر سبب و شرط کی تحصیل واجب نہ ہوگی۔ پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے اور شرط ''حولان حول'' ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب نصاب بنے اور

نہ کسی صاحب نصاب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں ہے بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہو اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح کے مقید حکم وطلب میں کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب وشرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ جب سبب اور شرط پائے جائیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے۔ دوسری قید کی مثال نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل کسی پر واجب نہیں۔ اس لئے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو۔ لیکن اس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا کسی شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے۔ مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلف کرے کہ اپنا غلام آزاد کر تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ "اعتقت" کا نطق، یعنی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ "میں نے اس غلام کو آزاد کیا" اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہوسکتا، لہٰذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی یا شارع نے کسی کو مکلف گردانا کہ "علم حاصل کر" ظاہر ہے کہ اس واجب کا حصول چند اسباب پر موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی اس لئے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحت ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کی ہے۔ یعنی بات یہ نہیں کہ جب تمہیں وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہٰذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحت ادائے صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے۔ جس کو سمجھ لینا چاہئے۔ اسباب وشروط کی تحصیل کے وجوب وعدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔ اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ مثال کے طور پر چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمانوں کو دی گئی ہے اس کا وجوب یا صحت ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہوگی۔ بالفرض کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ قطع ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہئے۔

علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی یہ بات نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان

پرعمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جوتم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے لہٰذا ان احکام پر عمل کرنے کے لئے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔(ماخوذ)

اس اصول کو جان لینے کے بعد آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام پر ایک نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دارومدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد، قطع ید، حدِ قذف، حدزنا، حدخمر اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایات کے مطابق فیصلہ کرنا یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے۔ ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے۔ مدرسوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنّفین ان کی باریکیاں بیان کرتے ہیں، ان کے فوائد اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے والے سر دھنتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں آتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرط موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تا کہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہو سکے۔ ہدایہ کے محشی لکھتے ہیں۔

واما وصف القضاء ففرض کفایة فلو امتَنَعَ الکل اثموا وقد امر اللّٰه تعالیٰ نبیه ﷺ بقول "وان احکم بینهم بما انزل اللّٰه الیک" وبعث النبی ﷺ علیا قاضیًاالی الیمن ومعاذاو علیه اجماع المسلمین.

ترجمہ: رہا قضاء کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو سب گنہگار ہوں گے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو اور نبی ﷺ نے حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

کتاب المبسوط میں کتاب القاضی کی ابتداء ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

اعلم بان القضاء بالحق من اقوی الفرائض بعد الایمان بالله تعالٰی وهو من اشرف العبادات لاجله اثبت اللّٰه تعالٰی لادم علیه السلام اسم الخلافة فقال جل جلاله انی جاعل فی الارض خلیفة واثبت ذالک لداؤد علیه السلام فقال عزوجل "یا داؤد انا جعلنک خلیفة فی الارض" وبه امر کل نبی مرسل حتّٰی

خاتم الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام۔ قال اللّٰہ تعالٰی "اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَّحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ" وقال تعالٰی "وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ".(۵۹)

ترجمہ: جان لوحق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کے لئے خلیفہ کا نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں اسی چیز کو داؤد علیہ السلام کے لئے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات کا ہر نبی حتی کہ خاتم الانبیاء کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں نیز ارشاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اس کے بعد صاحب **مبسوط** نے حضرت ابوموسیٰ اشعری ؓ کے نام حضرت **عمر** ؓ کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے: اما بعد فان القضاء فریضة محکمة و سنة متبعة یعنی قضاء ایک محکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے۔(سنة متبعة ای طریقة مسلوکة فی الدین یجب اتباعها علی کل حال) یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے۔ یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہم السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شدومد کے ساتھ۔ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے:

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. (المائدۃ:۴۴)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ کافر ہے۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. (المائدۃ:۴۵)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ ظالم ہے۔

مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ. (المائدۃ:۴۷)

ترجمہ: جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا وہ فاسق ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمایئے اور بتایئے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہوسکتی ہے ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ قاضی کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے اور دوسری شرط یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو۔ یہاں

یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف نکاح، طلاق اور میراث کے ہی معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بلکہ بلا استثنیٰ سارے معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط و قیود کے ساتھ مقید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر کے دی ہیں یا دے سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبکدوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بااختیار امام اور خلیفہ کا مقرر کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں صاحب کتاب لکھتے ہیں:

ثم الاجماع علی ان نصب الامام واجب والمذهب انه یجب علی الخلق سمعا لقوله ﷺ من مات ولم یعرف امام زمانه فقد مات میتة جاهلیة ولان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفاة النبی صلی اللّٰه علیه وسلم نصب الامام حتی قدموه علی الدفن وکذا بعد موت کل امام ولان کثیرا من الواجبات الشرعیة یتوقف علیه کما اشار الیه بقوله والمسلمون لا بدلهم من امام یقوم بتنفیذ احکامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهیز جیوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطریق واقامة الجمع والاعیاد وقطع المنازعات الواقعة بین العباد وقبول الشهادات القائمة علی الحقوق و تزویج الصغار والصغائر الذین لا أولیاء لهم وقسمة الغنائم۔ (۱۰۹)

ترجمہ: ''پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی ﷺ کے اس قول کی بناء پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا اور اس لئے کہ نبی ﷺ کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعین کو قرار دیا یہاں تک کہ دفن پر مقدم رکھا اور ایسا ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لئے بھی کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ انھوں نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسا امام ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور ان کے صدقات کو لینے اور باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ وعیدین کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لاوارث بچوں اور بچیوں کی شادی اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔''

علامہ ابن حزمؒ لکھتے ہیں:

اتفق جمیع اھل السنة و جمیع المرجیة و جمیع الشیعة و جمیع الخوارج علی وجوب الامامة وان الامة واجب علیھا الانقیاد لامام عادل یقیم فیھم احکام اللّٰہ ویسوسھم باحکام الشریعة التی اتی بھا رسول اللّٰہ ﷺ حاشا النجدات من الخوارج۔ (الملل والنحل:۴/۳۷)

ترجمہ: ''تمام اہل سنت، مرجیہ، شیعہ باستثناء نجدات تمام خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں۔ اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسول (ﷺ) لائے ہیں۔''

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں:

''واجب بالکفایہ امت بر مسلمین الیٰ یوم القیامۃ نصب الخلیفہ متجمع شروط بچند وجہ یکے آنکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم بہ نصب خلیفہ وتعین وپیش از دفن آں حضرت ﷺ متوجہ شدند پس اگر از شرع وجوب نصب خلیفہ ادراک نمی کردند بریں امر خطیر مقدم نمی ساختند وایں وجہ اثبات دلیل شرعی از آن حضرت ﷺ نماید بروجہ اجمال''۔

ترجمہ: ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چند وجوہ کی بناء پر۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خلیفہ کے نصب اور تعین کو نبی ﷺ کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انہوں نے خلیفہ کے تعین کے وجوب کو شریعت سے ادراک نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے یہ صورت اجمالی طور پر آنحضرت ﷺ کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص یا کسی خاص مقام کے ساتھ مقید نہیں ہے اس لئے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک ومقامات اور موہوم خطرات کی بناء پر اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔ ایک مومن کے لئے صحیح روش یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کے لئے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کے لئے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کے لئے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے پر آمادہ ہیں انہیں خدا سے

ڈرنا چاہئے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کر سکتے ہیں لیکن خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم کرنے کے لئے تحریک اقامت دین کی تائید نہیں کر سکتے بلکہ اس کے مقابلہ کے لئے محاذ بنا سکتے ہیں اور کوشش کرنے والوں کو غیر مسلموں کے سامنے مطعون کر سکتے ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

؏ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جا سکتا لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل رد اور قابل اجتناب قرار دینے کے لئے مقصود اور نامقصود کی بحث کیوں چھیڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کے لئے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انہیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا نامقصود کے بجائے حرام، مکروہ، ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سیدھا طریقہ چھوڑنے کی وجہ یا تو لفظ غیر مقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش، فقہ کی اصطلاح میں کسی شئے کے غیر مقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیر اہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیر مقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصود ہے اور وضو، ستر عورت، استقبال قبلہ، اذان غیر مقصودہ ہیں لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت، استقبال قبلہ نماز کے لئے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کردے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لئے نعوذ باللہ غیر اہم اور نا قابل اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگائیں گے۔

فقہاء نے امورِ دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے، اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب، حدود اور تعزیرات۔ اس تقسیم کی بناء پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم ۳/۵ حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا، کوڑے لگانا، سنگسار کرنا بھی اصلاً خود مقصود نہیں ہیں، لیکن ان کی اہمیت ووجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا مجرمین کی پاسداری اور رعایت بھی جرم عظیم ہے۔

لَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ.

(النور:۲)

ترجمہ: ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے۔

چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں **مقصود الفعل** اور **مطلوب التحصیل لغیرہ** ہیں یعنی جن کا کرنا مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شئے کے لئے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز، روزہ۔ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کے لئے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تعمیل وادائیگی کے لحاظ سے عبادات مقصودہ پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الٰہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مومن کا مقصد وجود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم اقامت دین اور قیام خلافت کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں۔ عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے تو کیا نعوذ باللہ ہم ان کے مکلف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح جی چاہے رضائے الٰہی حاصل کریں۔ اسلامی حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام ٹھیک اس طرح ادا کئے جائیں جس طرح اللہ ورسول نے ہمیں سکھائے ہیں۔

اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے مومن کا مقصد اصلی رضائے الٰہی ہے لَا رَیۡبَ فِیۡهِ مگر جو اس کے ذرائع وشرائط ہیں انہیں اگر نامقصود کہہ کر الگ کردیا جائے تو شریعت کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف مالایطاق جائز نہیں لیکن اس طریقہ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کے حدود وتعزیرات کی تنفیذ اور کتاب وسنت کے مطابق مقدمات مخاصمات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اور ان کی شرط ووسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مت کرو کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کی تحصیل کا مکلف بنانا تکلیف مالایطاق کے سواء کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لئے جو اسباب وذرائع اور شروط ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے اگر وہ کوشش کرتا ہے اور بالفرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے تو وہ کامیاب ہے گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مرجاتا ہے تو پھر رضائے الٰہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے۔

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجئے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندہ کے لحاظ سے تھی کہ بندہ کا مقصودِ حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے اور انبیاء ورسل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوند عالم کا کیا مقصد ہے وہ تو بے نیاز ہے اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ وہ نہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں۔ اس لئے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہوسکتا ہے کہ بندے بلا کسی تفریق واستثناء اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا وآخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ. (الذاریات:۵۷،۵۶)

ترجمہ: میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔

اس سلسلہ میں علامہ شاطبیؒ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ......

''شریعت وضع کرنے سے شارع کا مقصد یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اس لئے کہ شریعت بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لئے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادات کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشاء پوری کرکے دنیا وآخرت دونوں جہاں میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لئے بھی کہ شارع کا مقصد شریعت سے ضروریات، یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شریعت کے ان مصالح کو بروئے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔

اسی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته.'' (بخاری)

ترجمہ: تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن میں آیا ہے:

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ. (الحدید:۷)

ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔

اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً. (البقرۃ:۳۰)

ترجمہ: میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. (الاعراف:۱۲۹)

ترجمہ: اور وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تا کہ دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔

جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰـكُمْ. (الانعام:۱۶۵)

ترجمہ: اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تا کہ تمہیں آزمائے دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے کہ ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لے کر ایک امیر، ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے۔

جیسا کہ حدیث میں تفسیر کر دی گئی ہے:

الامیر راع والرجل راع علیٰ اھل بیته والإمراۃ راعیة علی بیت زوجها وولده فکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیته. (متفق علیه)

ترجمہ: امیر نگران ہے اور مرد نگران ہے اپنے گھر والوں پر اور عورت نگران ہے اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد پر۔ پس تم میں کا ہر ایک نگران ہے اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق۔

جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورے کرے''۔ (موافقات، جلد:۲، ص:۲۳۰)

علامہ شاطبیؒ نے جو پہلو یہاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو نامقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے۔ اگر بندے کا مطلوب رضائے الٰہی ہے تو اللہ کو اس کی اطاعت وعبادت اور خلافت مطلوب ہے اسی لئے مومن جب تک نیابت الٰہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ منشائے الٰہی کی تعمیل سے قاصر رہ جاتا ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

مسئلہ خلافت وامارت ہندوستان میں

ہماری اوپر کی گفتگو بڑی حد تک منقح ہوگئی ہے کہ مسلمانوں کے لئے کسی امیر یا امام کی اطاعت سے آزاد ہو کر زندگی گزارنا شرعاً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے ہندوستان میں مسلم اقتدار کے ختم ہونے کے بعد شرعی نظام قائم کرنے کے لئے انگریزی اقتدار سے کسی نہ کسی انداز میں علماء ٹکراتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز، سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا محمود الحسن رحمہم اللہ وغیرہ کے حالات زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ہمیں یہ حقیقت واقعہ سمجھ میں آسکتی ہے۔

۱۹۱۴ء سے مولانا آزاد کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں نظم جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا جائے اور مولانا محمود الحسن کو امیر الہند بنا دیا جائے لیکن بعض وجوہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ مولانا آزاد کو جب اس طرف سے مایوسی ہوئی کہ پورے ملک کے لئے کوئی متفقہ متحدہ نظم قائم ہو تو پھر انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ اصلاً صوبے وار تنظیم کا کام شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ جب صوبہ بہار میں امیر شریعت کا انتخاب ہوا تو مولانا نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''میں نہیں جانتا کہ کن لفظوں میں حضرات علمائے بہار کو مبارک باد دوں کہ انہوں نے سبقت بالخیرات کا مقام حاصل کیا۔ جمعیۃ العلمائے بہار کے جلسہ میں تین سو کے مجمع علماء نے بالاتفاق اپنا امیر شریعت منتخب کرلیا۔''
> (خطبات آزاد،ص: ۱۳۷)

اس طرح ہمارے ملک ہندوستان میں امیر الہند اور امیر شریعت کے انتخاب اور دار القضاء کے قیام وغیرہ کا تصور اور کوشش کا ایک تسلسل ہے جو ملّتِ اسلامیہ ہند کی تاریخ میں پایا جاتا ہے۔ یقیناً جن ہستیوں نے جتنا بھی خون پسینہ اس راہ میں بہایا ہے اور بہار رہے ہیں وہ ان کے لئے عند اللہ بلندی درجات کا سبب ہوگا اور اس لحاظ سے خصوصاً امارت شرعیہ بہار ۱۹۲۱ء کی کارکردگی تمام مسلمانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔ اے کاش ہندوستان کے بقیہ سارے علاقوں میں اسی طرح کوشش کی گئی ہوتی۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم کو اس حقیقت کا شعور ہونا چاہیئے کہ مسلمانوں پر نصب امام خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کا جو فریضہ شرعاً عائد ہوتا ہے وہ علیٰ حالہٖ باقی رہتا ہے اور نظام کفر کے تحت امارت شرعیہ اور دار القضاء کے قیام سے وہ اصل فریضہ ادا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کی ساری کوشش تیمم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن پر اکتفاء اور قناعت کرنا صحیح نہیں ہوگا تیمم ایک عارضی اور مجبوری کی چیز ہوتی ہے۔ لہٰذا اصل کے لئے کوشش کرنا لازمی فریضہ ہوگا۔

موجودہ حالات ہجر میں جو دار القضاء بھی قائم کیا جائے گا اس کی کارکردگی کا دائرہ محدود اور نظام کفر کے تحت دی ہوئی گنجائشوں کے اندر ہوگا۔ مثلاً نکاح، طلاق اور تقسیم وراثت جیسے چند مسائل سے متعلق کوئی قاضی فیصلہ کرسکتا ہے اور اس کو بھی ملک کی عدالتوں میں چیلنج کر کے بے اثر بنایا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ اس دار القضاء کو حکومت کی سند جواز حاصل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف جن نصوص قرآنیہ اور دلائل شرعیہ کی بناء پر ہم دار القضاء کے قیام کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان کا تقاضا ہے کہ شادی بیاہ، طلاق اور تقسیم وراثت ہی نہیں بلکہ زندگی کے جملہ معاملات اور نزاعات کا فیصلہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق ہو ورنہ ہم ان آیات کے مصداق قرار پائیں گے۔

وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ. (المائدہ:۴۴)

ترجمہ: اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ يَزۡعُمُوۡنَ اَنَّهُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِكَ يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَى الطَّاغُوۡتِ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ يَّكۡفُرُوۡا بِهٖ. (المائدۃ:۶۰)

ترجمہ: اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں۔ حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت کا کفر کریں۔

کسی غیر شرعی اور غیر اسلامی نظام کے تحت جو دارالقضاء بھی قائم ہوسکتا ہے اس سے وہ مقصد ہرگز پورا نہیں ہوسکتا جو دین میں مطلوب ہے اور جس کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ البتہ بہ حالت مجبوری عبوری دور کے لئے وہ کرنے کا ایک کام ہے جو کرنا چاہئے۔ شائد اللہ تعالیٰ کے نزدیک بوجہ ہماری مجبوری اور عدم استطاعت بھی مقبول ہوجائے لیکن اس کے ساتھ ہمیں خلافت اسلامیہ اور امارت اسلامیہ کے قیام کی تمنا اور حتی الوسع کوشش سے ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن عام طور پر دیکھا جارہا ہے کہ جو لوگ اس عبوری دور کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہیں اسی پر قانع ہوکر رہ گئے ہیں اور اس کے آگے نہ سوچتے ہیں اور نہ عملاً کچھ کرنے کے لئے تیار ہیں جو انتہائی افسوسناک واقعہ ہے۔ اس کے لئے عوام تو خدا کے پاس باز پرس سے شاید بچ جائیں لیکن خواص اور علماء جن کی نگاہ میں قرآن، حدیث وفقہ کے اصول وفروع تمام موجود ہیں وہ کس طرح بچیں گے۔

اس طرح جو لوگ خلافت اسلامیہ اور نظام اسلامی کے قیام کی بات کرتے ہیں وہ عبوری دور کے اس فریضہ کی اہمیت کو بڑی حد تک محسوس نہیں کرتے ان سے اللہ کے حضور پوچھ ہوسکتی ہے کہ تم نظام کفر وشرک کو ہٹا کر نظام شرع اگر قائم نہیں کرسکتے تھے تو محدود پیمانے پر ہی سہی تم نے اپنی استطاعت کی حد تک حکم ''بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ'' کرنے کا نظام کیوں نہیں قائم کیا۔

بہر حال دونوں کام کرنے کے ہیں ہر کام کا دین میں ایک مقام اور اہمیت ہے جس کو ہمیں سمجھنا چاہئے۔ مولانا آزاد کی ایک تحریر سے اس بات کو بڑی اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے:

''حضرات!

اب آپ مجھے اجازت دیں کہ میں مختصراً اس مسئلہ کی نسبت بھی کچھ عرض کردوں، جس کو میں علیٰ وجہ البصیرت آج تمام اعمال اصلاحیہ کے لئے بہ منزلہ اصل واساس کے یقین کرتا ہوں اور کامل بارہ سال کے مسلسل غور وفکر کے بعد اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ بغیر اس کے کبھی عقدہ کا رحل نہیں ہوسکتا۔ میرا اشارہ مسئلۂ نظام وجماعت

اور قیام امارت شرعیہ کی جانب ہے۔

مسئلہ نظام جماعت سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح حال اور ادائے فرض شرعیہ کی استطاعت کبھی ظہور پذیر نہیں ہوسکتی جب تک وہ اپنی موجودہ حیات انفرادی کو ترک کر کے حیات اجتماعی و شرعی اختیار نہ کرلیں۔ یعنی احکام نظام شرع کے مطابق سب ایک امیر و قائد شرع کی اطاعت پر مجتمع نہ ہوجائیں اور بکھرے ہوئے متفرق قومی مرکزوں کی جگہ ایک ہی مرکز قومی پیدا نہ ہوجائے۔ یہی اصل اساس کار ہے اور تمام مقاصد اصلاح اور مصالح انقلاب کا نفاذ وظہور اسی کے قیام و وجود پر موقوف ہے۔

حضرات!

اسلام کے نظام اجتماعی کی شرح وتفصیل کی ضرورت نہیں علی الخصوص ایک ایسے مجمع میں جیسا کہ فضل وتوفیق الٰہی سے اس وقت میرے گرد وپیش موجود ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کے تمام حیات کے لئے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں فرادیٰ، متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع۔ موتلف، متحد اور نفس واحدہ ہوکر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جابجا اجتماع و وحدت پر زور دیا گیا اور کفر وشرک کے بعد کسی بدعملی سے بھی اس قدر اصرار وتاکید کے ساتھ نہیں روکا جیسا کہ تفرقہ وتشتت سے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے تمام احکام واعمال میں یہ حقیقت اجتماعیہ بہ منزلہ محور ومرکز کے قرار پائی اور تمام دائرہ عمل اسی کے گرد قائم کئے گئے عقیدہ توحید سے لے کر تمام عبادات واعمال تک یہ حقیقت مرکزیہ جلوہ طرازی کر رہی ہے۔ اور اسی بناء پر بار بار نظام جماعت پر زور دیا گیا۔

علیکم بالجماعة والسمع والطاعة (الترمذی)

اور علیکم بالجماعة فان الشیطان مع الفذ وھو من الاثنین بعد (البیھقی)

اور اذا کان ثلاثة فی سفر فلیؤم واحد کم (اصحاب السنین)

اور اسی لئے نظم وقوام ملت کی منصب خلافت کو اطاعت قرار دیا گیا کہ تمام متفرق کڑیاں ایک زنجیر میں منسلک ہوجائیں۔ شرح اس مقام کی بہت طولانی ہے اور معارف کتاب وسنت اس بارے میں بے شمار اور حد احصاء واستقصاء سے باہر ہیں۔ رسالہ خلافت پر میں بحث کر چکا ہوں، اور زیادہ شرح وتفصیل تفسیر قرآن میں ملے گی۔

میں اس بارے میں کچھ عرض نہیں کروں گا کیونکہ گزشتہ آخری صدیوں میں مسلمانوں کا شیرازۂ اجتماع پراگندہ ہوا اور تقریباً پانچویں صدی ہجری کے بعد سے اس پراگندگی کے اسباب یکے بعد دیگرے ظہور میں آتے رہے۔ مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بایں ہمہ تفریق و پراگندگی ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم تھی اور جب تک وہ قائم رہی نظام جماعت بھی قائم رہا لیکن اسلامی حکومت کے انقراض کے بعد مسلمانان ہند کا نظم جماعت درہم برہم ہوگیا اور سرتاسر جاہلیت کی سی بے نظمی و بے قیدی ہم پر چھا گئی۔ بلاشبہ مرکزی خلافت

آلِ عثمان کی موجودتھی اور مسلمانانِ ہند کے لئے بھی تمام مسلمانانِ عالم کی طرح وہی خلیفہ ومطاع تھے لیکن مسلمانانِ ہند کا فرض تھا کہ یا تو اپنے علائق فعلاً وعملاً پائیگاہ خلافت سے قائم کرتے اور اس کے ایک موجود و عامل نائب کی نیابت حاصل کر کے اپنے فرض اسلامی انجام دیتے اور اگر ایسا ہونا دشوار تھا اور واقعی بات یہ ہے کہ دشوار تھا اعادۂ حال اور تہیۂ کار اور ادائے فرض اسلامی میں کوشاں ہوتے۔ لیکن بدبختانہ ایسا نہیں ہوا اور جہاں غیر مسلم غلبہ واستیلاء پر محکومانہ قناعت کر لی گئی وہیں اس اولین فریضہ ملت کی طرف سے بھی ہمتوں کے قصور اور عزائم کے فقدان نے کوتاہی کی۔ بہرحال ایک زمانہ دراز اس پر گزر گیا اور اب حالت یہ ہے کہ دس کروڑ مسلمان جو تمام کرہ ارض میں سب سے بڑی یکجا اسلامی جماعت ہے جو ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتہ انسلاک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ۔ نہ تو کوئی قائد وامیر ہے اور نہ کوئی آمر و نافذ شرع۔ محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے، ایک گلہ ہے جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی وجاہلی ہے جس میں یہ پوری اقلیم مبتلا ہوگئی ہے۔

اس حالت کے مفاسد وشرور میں ایک بہت بڑا مفسدہ یہ بھی ہے کہ برسوں سے ہندوستان میں شریعت کا باب قضاء گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ قضاء کا وجود بلا قاضی کے نہیں ہوسکتا اور قاضی کا وجود امارت وامامت کے قیام پر موقوف ہے۔

حضرات!

ایک منصب قضاء ہے ایک منصب امارت ہے دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے۔ قضاء امارت کے مقاصد میں داخل اور اس کے ماتحت ہے، مگر مقاصد امارت قضاء سے حاصل نہیں ہوسکتے، پس یہ مقاصد امارت کے فقدان کا ذکر کر رہا ہوں، صرف قضاء کا ذکر نہیں کرتا جس کے لئے محض نام نہاد قاضیوں کا تقرر یا فرضی عدالتوں کا اجراء کافی ہو۔

حضرات!

اب سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ حالت میں ہم کوئی قدم مقاصد اعمال ملیہ کا اٹھا سکتے ہیں، کیا احیائے تجدید ملت اور قیام شرح وادائے فرائض اسلامیہ کی کوئی صحیح راہ پیدا ہوسکتی ہے؟ کیا محض ایک بھیڑ اور انبوہ لے کر ہم وہ فرائض انجام دے سکتے ہیں؟ جن کے لئے اولین شرط عقلاً وشرعاً وجود جماعت منظمہ اور امارت صحیح شرعیہ ہے۔ چھوڑ دیجئے مصطلحات شرعیہ کو اگر ان سے ہمیں اس قدر بعد ہو گیا ہے کہ ساری باتوں کے لئے تیار ہیں مگر بحکم اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرۃ طریق شرعی اور اس کے نظام وقوام کے الفاظ سن کر یکا یک متوحش ومضطرب الحال ہو جاتے ہیں تو صرف انہی قواعد واصولوں کو سامنے لائیں جن پر آج تمام اقوام عالم عامل ہیں، میں پوچھتا ہوں کہ کیا بغیر ایک قائد اور لیڈر کے کوئی جماعت اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے؟ پھر وہی حقیقت تو شریعت نے بھی لفظ امیر یا امام میں مضمر رکھی ہے۔ یہ کیا مصیبت ہے کہ اگر لیڈر کا لفظ کہا جاتا ہے تو آپ اس کا استقبال کریں اور امیر وامام کا لفظ آ جائے تو نفرت واستکراہ سے بھر جائیں۔ کیا یہ وہی

غلطی نہیں جس کو راہ تاسیس اور راہ تجدید کی اصطلاح میں ابھی ابھی عرض کر چکا ہوں۔

اس کو بھی چھوڑیئے۔ آج وقت کی سب سے بڑی مہم اور ادائے فرض شرعی کی سب سے بڑی نازک اور فیصلہ کن گھڑی ہے جو آزادی ہند اور مسئلہ خلافت کی شکل میں ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ آج ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان ہیں جو اس وقت تک سرشار غفلت تھے اور اب آمادہ ہوئے ہیں کہ اطاعت و اعانت خلیفہ عہد، حفاظت وصیانت بلاد اسلامیہ اور آزادی ہندوستان کی راہ میں اپنا اولین فرض اسلام انجام دیں۔

خدارا بتلایئے اس صورت حال میں بھی طریقہ کار کیا ہونا چاہئے اور ایسے وقتوں کے لئے آخر اسلام نے بھی کوئی نظام کار بتلایا ہے یا نہیں یا وہ باوجود دعویٰ تکمیل شرع اس قدر نامراد ہو گیا ہے کہ آج اس کے پاس وقت کی مشکل و مصیبت کا کوئی حل نہیں۔ اگر بتلایا ہے تو وہ کیا ہے یا محض انجمن سازی اور ہنگامۂ مجالس آرائی!؟ کیا محض اتباع آرائے رجال اور تقلید ارباب فن وتخمین؟ میں اعلان کرتا ہوں کہ اس بارے میں راہِ شرعی صرف وہی ایک ہے اور جب تک وہ ظہور میں نہ آئے گی ہماری کوئی سعی مشکور نہیں ہو سکتی۔

جو فتنہ آج یورپ سے اٹھا ہے چھٹی صدی ہجری میں بھی اس کے سیلاب بلا دتا تار و چین سے اٹھے تھے اور تاتاریوں کے استیلا سے تمام عالم اسلامی تہ و بالا ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی تمام بلاد شرقیہ اسلامیہ کا یہی حال تھا جو آج نظر آ رہا ہے۔ لیکن اس عہد کے علماء نے پہلا کام یہ کیا کہ جن بلاد پر تاتاریوں کا قبضہ واستیلا ہو گیا تھا وہاں تنظیم جماعت اور قیام شرع کے لئے ولاۃ مسلمین کے نصب وتقرر کا حکم دیا اسی بناء پر فقہائے متاخرین کے یہاں اس کی تصریح پاتے ہو کہ بلاد محکمہ کفار میں طلب والی مسلم امارت واجب ہے۔ شیخ الاسلام احمد ابن تیمیہؒ نے انہیں بلاد محکمہ تاتار کے لئے فتویٰ دیا تھا کہ وہاں کے مسلمانوں کو ابداً اس تغیر پر قانع نہیں ہونا چاہئے اور ایک لمحہ بھی بغیر کسی امیر کے بسر نہیں کرنا چاہئے۔ یا تو وہاں سے ہجرت کر جائیں اور یا ایک امیر نصب کر کے اپنے فرائض شرعیہ انجام دیں۔''

فی الحقیقت احکام شرعیہ کی رو سے مسلمانان ہند کے لئے صرف دو ہی راہیں تھیں اور اب بھی دو ہی راہیں ہیں یا تو ہجرت کر جائیں یا نظام جماعت قائم کر کے ادائے فرض ملت میں کوشاں ہوں۔ مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نے جن دوراہوں کی نشاندہی فرمائی ہے وہ کتاب وسنت، تاریخ انبیاء اور سیرت خاتم النّبیین اور دینی مسلمات کی روشنی میں فرمائی ہے۔ درحقیقت تیسری راہ یعنی اہل کفر وشرک کے مستقلاً اور بلا کراہیت ماتحت اور زیرنگیں ہو کر رہنے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ استثنائی اور عارضی صورت حال کی بات الگ ہے کہ اس وقت ارتکاب حرام کی بھی اجازت نکل آتی ہے لیکن اس مقام پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ ہجرت کا مرحلہ دوسرے نمبر پر ہے۔ دینی اور شرعی زندگی گزارنے اور اشاعت دین اور غلبہ حق کے لئے راہیں جب بالکل بند ہو جائیں تو ہجرت کا سوال پیدا ہوتا ہے اس کوشش کے بغیر ہجرت کرنا فرار اور اپنی ذمہ داریوں سے گریز کے ہم معنی ہو گی جو ناقابل معافی جرم ہے۔

بابری مسجد سے دستبرداری

شرعاً جائز نہیں

بجواب

مولانا وحید الدین خان

(۱۹۹۳ء)

مولانا عبد العلیم اصلاحیؒ

سہ نکاتی فارمولہ کے شرعی دلائل

ایک جائزہ

مسئلہ بابری مسجد کوحل کرنے کے لئے مولانا وحید الدین خان صاحب نے شریعت کی روشنی میں ایک سہ نکاتی فارمولہ پیش کیا۔ اس وقت ہمارے پیش نظر مولانا کے پیش کردہ شرعی دلائل کا جائزہ لینا ہے۔ یہ دلائل ’’الرسالہ مئی ۱۹۹۳ء‘‘ میں پیش کئے گئے ہیں۔

دعویٰ

’’مسلمان بابری مسجد کے بارے میں اپنے ایجی ٹیشن کوختم کردیں۔ اب وہ شریعت کی رو سے بالکل حق بجانب ہیں کہ اس معاملہ سے اپنے آپ کو الگ کرکے اس کو مستقبل کے حالات کے حوالہ کردیں۔‘‘

’’اگر یہ مان لیا جائے کہ بابری مسجد کو بچانا مسلمانوں کی قومی ذمہ داری تھی، تب بھی موجودہ حالت میں یہ ذمہ داری ان سے ساقط ہوجاتی ہے۔ اب خود شریعت کے حکم اضطرار کے تحت ان کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ سے الگ ہوجائیں تاکہ اپنے آپ کو مزید ذلت اور ہلاکت سے بچا سکیں۔‘‘

(الرسالہ، مئی ۱۹۹۳ء)

مختصراً یہ دعویٰ ہے۔ آگے ہم نمبروار دلیل اور اپنے اشکالات درج کرتے ہیں۔

① ’’۶؍دسمبر کے اس واقعہ کے بعد اب صورت حال بالکل بدل چکی ہے اس لئے اب ہمیں نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا ہے۔ ہمارا ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا کیونکہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں‘‘۔

(الرسالہ، صفحہ:۴)

نئے حالات کے مطابق اپنے کام کا نقشہ بنانا بالکل درست ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ لیکن مولانا نے کام کا نقشہ بنانے کے نام پر کام کو ختم کرنے کی آواز اٹھائی ہے۔ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اسی طرح حالات کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں اس سے بھی کسی کو انکار نہیں ہے۔ لیکن اس کا ایک محدود دائرہ ہے۔ اس اصول کو ہر جگہ چسپاں نہیں کیا جاسکتا ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلامی تعلیمات کا ماخذ قرآن اور سنت نہیں بلکہ حالات زمانہ ہیں کہ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ یہ بالکل طے شدہ بات ہے کہ حالات کا اثر اجتہادی اور قیاسی امور پر ہوتا ہے۔ مسجد کے تئیں ہماری ذمہ داریاں منصوص ہیں۔ دوسری قابل توجہ بات یہ ہے کہ حکم بدلنا الگ چیز ہے اور حکم کا ختم ہونا بالکل الگ چیز ہے۔

مولانا نے اپنے دعویٰ میں ذمہ داری ''حکم'' کے بدلنے کی بات نہیں کہی ہے، بلکہ حکم یعنی ذمہ داری کے ساقط ہونے کی بات کہی ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ دعویٰ الگ ہے اور دلیل الگ ہے۔ دونوں میں کوئی مناسبت اور تعلق نہیں ہے۔ دعویٰ اور دلیل میں مناسبت اور مطابقت اس وقت ہوتی جب کہ یہ کہا جاتا کہ شریعت کا مستقل اصول ہے کہ حالات کے بدلنے سے احکام ختم ہوجاتے ہیں اور ذمہ داری ساقط ہوجاتی ہے۔ اس کو مثالوں سے سمجھئے:

مسلم والدین کی خدمت اولاد پر فرض ہے۔ حالات کے تحت یہ فرض بدل سکتا ہے۔ مثلاً کبھی یہ فرض محض منی آرڈر اور ڈرافٹ بھیج دینے سے ادا ہوجائے گا اور کبھی یہ فرض والدین کے سرہانے کھڑے رہنے، منہ میں نوالہ کھلانے، چمچے سے پانی پلانے اور ان کو نہلانے، دھلانے کی شکل میں بدل جائے گا۔ مگر کبھی بھی یہ فرض حالات کے بدلنے سے ساقط نہ ہوگا۔ اگر کوئی بیٹا حالات کے بدلنے سے استدلال کرے کہ اب میرے تئیں کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو یہ اس کا عذر لنگ ہوگا۔

اسی طرح مسجد کے تعلق سے ذمہ داری کبھی اس کو صاف ستھرا رکھنا اور آباد رکھنا ہوگی، کبھی اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر ہوجانا ہوگی اور کبھی از سرنو اس کو تعمیر کرنا ٹھہرے گی۔ یعنی حالات کی تبدیلی سے ذمہ داری کی نوعیت میں تبدیلی ہوسکتی ہے لیکن حالات کی تبدیلی سے ذمہ داری ہرگز ختم نہیں ہوسکتی۔

مولانا نے خود اسی مضمون میں اعتراف کیا ہے کہ متفقہ طور پر شریعت کا یہ حکم ہے کہ جس جگہ جائز طور پر ایک مسجد بنادی جائے وہ جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد کی جگہ ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں کو اس میں تبدیلی کا کوئی حق نہیں رہتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مسجد کے مسجد ہونے پر حالات زمانہ کے بدلنے کا کوئی اثر نہیں پڑتا تو اس کی حفاظت وصیانت اور آبادکاری کی ذمہ داری کس پر آئے گی۔ مسلمان ہوتے ہوئے اور اس کو مسجد تسلیم کرتے ہوئے اس سے دست کش

اور بے تعلق ہم کیسے ہو سکتے ہیں، اس کو مورتی پوجا کے لئے کیسے دے سکتے ہیں یا اس پر اپنی رضا اور پسند کا اظہار کیسے کر سکتے ہیں؟ بالخصوص جب کہ قرآن نے مساجد کی آبادکاری مسلمانوں کا کام بتایا ہے۔ معلوم ہوا کہ حالات جو بھی ہوں، مسجد مسجد رہے گی اور مسلمان اس سے بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ البتہ ذمہ داری کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے ذمہ داری ساقط نہ ہوگی۔

(۲)''اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا ہے جس عمل کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہ ہو وہ عمل اسلام کے مطابق نہیں۔''

(الرسالہ)

یہ دلیل مولانا نے اس پس منظر میں پیش کی ہے کہ اب بابری مسجد دوبارہ اپنی جگہ نہیں بن سکتی۔ اس لئے اس سلسلہ میں جدوجہد کرنا بے کار اور بے نتیجہ ہے اور بے نتیجہ عمل سے اسلام منع کرتا ہے۔ لہٰذا اسلام کا تقاضا ہے کہ بابری مسجد کے معاملہ سے مسلمان الگ ہونے کا اعلان کردیں اور مسجد کے بجائے مندر کی حیثیت کو تسلیم کرلیں۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام نتیجہ خیز عمل کی تلقین کرتا اور بے فائدہ اور لایعنی عمل سے روکتا ہے۔ لیکن مولانا جیسے لوگوں کو شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ اسلام آخرت میں نتیجہ خیزی کو ترجیح دیتا ہے۔ اگر کوئی عمل آخرت میں نتیجہ خیز ہونے والا ہے تو دنیا میں بے نتیجہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات جب یہ جانتے ہوئے کوئی عمل کیا جاتا ہے کہ دنیا میں اس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے اس کا نتیجہ صرف آخرت میں نکلے گا تو اس عمل کی قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

سورۂ اعراف میں ذکر ہے کہ وعظ ونصیحت کرنے والوں سے لوگوں نے کہا: آپ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کررہے ہیں جو ہرگز ایمان لانے والے نہیں ہیں اور جو اللہ کے عذاب میں گرفتار ہونے والے ہیں تو انہوں نے جواب دیا تاکہ ہم اللہ کے پاس معذرت پیش کرسکیں۔ یہی وہ چیز ہے جو منافقین کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی جس کی بناء پر اللہ کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو بے وقوف ''سفہاء'' کہتے تھے کہ نہ آگے دیکھتے، نہ پیچھے، نہ فائدہ سوچتے نہ نقصان، جان بھی کھپا رہے ہیں اور مال بھی بے دریغ خرچ کررہے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے مسجد کے لئے کوئی جدوجہد بے نتیجہ نہیں ہے۔

مسجد بنے یا نہ بنے جو لوگ اس راہ میں جان ومال کی قربانی اخلاص نیت کے ساتھ پیش کریں گے ان کا یہ عمل بے انتہاء نتیجہ خیز ہوگا اور ان کی قدر وقیمت بہت بڑھ جائے گی۔ اس لئے کہ انہوں نے مایوس کن اور سخت حالات میں اللہ کے گھر کی تعمیر کے لئے جدوجہد جاری رکھی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس دنیا کے نتیجہ سے بے پرواہ ہوکر صرف آخرت کے نتیجہ پر نظر جمائے ہوئے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ سخت

حالات میں صراط مستقیم پر صبر واستقامت کا پیکر بن کر زمانہ کے دھاروں کا منہ موڑ سکتے ہیں اور جو لوگ اس دنیا میں فائدہ نقصان کا حساب لگاتے رہیں گے وہ چند لمحے بھی راہ راست پر قائم نہیں رہ سکتے۔

مسجد اللہ کے شعائر میں سے ہے۔اس کی بے حرمتی نہیں کی جاسکتی اور نہ اس کی بے حرمتی اور پامالی کو گوارا کیا جاسکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ (المائدۃ:۲)

ترجمہ:''اے ایمان والو!اللہ کے شعائر کو حلال نہ کرلو۔''

مسجد اللہ کے شعائر میں سے ہونے کی بناء پر احترام اور تعظیم کی مستحق ہے اور اس کی تعظیم ایمان وتقویٰ کی علامت ہے۔

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج:۳۲)

ترجمہ:''اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا پس وہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔''

مولانا کے سہ نکاتی فارمولہ کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسجد کی بے حرمتی کو گوارا ہی نہیں بلکہ اس پر ہم برضا ورغبت مہر تصدیق لگا دے رہے ہیں جبکہ ہم کو اس کی حرمت کو باقی رکھنے اور تعظیم کا حکم دیا گیا ہے۔

تفسیر، حدیث اور تاریخ کے پورے ذخیرہ میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ مسلمانوں نے اپنی جان بچانے کے لئے اجتماعی طور پر معصیت کا ارتکاب کیا ہو۔اللہ کے شعائر میں سے کسی چیز کی پامالی کو بطور قیمت ادا کیا ہو۔مرجانا، قتل کیا جانا انہوں نے پسند کیا ہے لیکن اللہ کے دین کو رسواء ہونے نہیں دیا ہے۔

بابری مسجد سے بے تعلق ہونے کو ملک کے (۲۰) کروڑ مسلمانوں کی جان بخشی کے لئے ضروری قرار دے کر گویا سارے مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرایا جارہا ہے تیس ہزار مساجد سے بے تعلق ہونے کے لئے۔کیونکہ جس بنیاد پر ایک مسجد کو چھوڑا جاسکتا ہے اس بنیاد پر کسی بھی مسجد کو چھوڑنا جائز ہوگا۔ایک مسجد کو پوری ملت نے حوالہ کیا تو ایک گاؤں اور ایک محلہ کے لوگ اپنی حفاظت کے لئے اپنی مسجد سے دستبردار ہوجائیں تو کسی طرح وہ لائق ملامت نہیں ہوسکتے کیونکہ پوری ملت کی جانب سے بابری مسجد کی حوالگی کا فتویٰ ان کے لئے سند جواز بن جائے گا پھر مسجد چھوڑنا جائز ہوگیا تو اس کے بعد خانقاہ اور قبرستان کی بات ہی کیا رہی۔ان کے لئے معمولی مزاحمت کرنا بھی لوگ پسند نہ کریں گے۔

یہ صحیح نہیں ہے کہ ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء سے پہلے مسئلہ مسجد کی حفاظت کا تھا اور اس کے بعد مسئلہ مسلمانوں کی حفاظت کا ہے۔مسلمانوں کی حفاظت کا مسئلہ جس طرح آج اہم ہے اسی طرح ۶/دسمبر سے پہلے بھی تھا۔

مسلمانوں کی نسل کشی کا سلسلہ بہت پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ بھاگلپور، میرٹھ، مرادآباد اور بھیونڈی کے فسادات جیسے ان گنت واقعات ہوئے ہیں۔ یہ خیال کرنا بالکل غلط ہے کہ یہ مسئلہ ۶ ردسمبر کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اور بابری مسجد کا نام لینا مسلمان بند کردیں تو مسئلہ ختم ہوجائے گا۔ قرائن اور شواہد بتاتے ہیں کہ یہ سلسلہ آسانی سے بند ہونے والا نہیں ہے اور ہمیں یہ سوچ کر آگے چلنا ہوگا کہ بہرصورت ہمیں ایک لمبی مزاحمت اور کشمکش سے گزرنا ہے اس لئے کہ یہ مسئلہ ایک مسجد کا اور مقامی مسئلہ نہیں ہے بلکہ اس کا رشتہ اب عالمی سیاست سے جڑ چکا ہے اور پوری دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کو کمزور کرنے کی جو کارروائیاں اور سازشیں چل رہی ہیں مسلمانانِ ہند کے تحفظ کا مسئلہ ان کا ایک جزو ہے۔

بہرحال یہ مسئلہ ہے اور اہم ترین مسئلہ ہے جس کے حل کا طریقہ کتاب وسنت اور اسلامی روایات میں کہیں بھی مسجد یا قبلہ سے دست برداری یا بے تعلقی نہیں بتایا گیا ہے۔

ہمارے تحفظ کا طریقہ قرآن کی مندرجہ ذیل آیات صاف صاف بتارہی ہیں۔ آخر قرآنی طریقۂ کار سے صرف نظر کیوں کیا جارہا ہے؟!

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ. (سورۂ محمد:۷)

ترجمہ: "اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جمادے گا۔"

اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد، اللہ کی کتاب کی مدد، اللہ کے رسول کی مدد اور اللہ کے گھر کی مدد ہے۔ اس روشنی میں پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کی مدد حاصل کرنے کی شکل یہ نہیں ہے کہ مسلمان اللہ کے گھر یعنی مسجد سے دست برداری اختیار کرلیں بلکہ اس کی نصرت اور معیت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے گھر کی حفاظت صیانت اور تعمیر کے لئے آخری دم تک لڑا جائے۔ جب ہی ہم اپنی عزت وناموس کو بھی بچا سکتے ہیں اور تیس ہزار مسجدوں کو محفوظ رکھنے کی توفیق اور قوت پاسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف انسانوں سے ڈر کر اللہ کی مدد یعنی اس کے گھر کی حفاظت اور آبادکاری سے دامن کش ہوجائیں گے تو اللہ کی نصرت سے محروم ہوکر ذلیل و خوار ہوجائیں گے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ. (آل عمران:۱۶۰)

ترجمہ: ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو کوئی تم سے جیت نہیں سکتا اور اگر تم کو چھوڑ دے تو کون ہے اس کے بعد جو تمہاری مدد کرے اور اللہ ہی پر مسلمانوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔''

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا (النساء:۷۱)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! اپنا بچاؤ اختیار کرو پس نکلو الگ الگ یا جمع ہو کر۔''

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ. (الانفال:۶۰)

ترجمہ: ''اور ان کے لئے جہاں تک ہو سکے قوت اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو، اس کے ذریعہ تم رعب جماؤ گے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ ان کو جانتا ہے۔''

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ دشمنوں سے محفوظ رہنے اور باعزت زندگی کے لئے تین کام مسلمانوں کو کرنے ہیں:

(۱) اللہ کے دین کی مدد کر کے اللہ کی مدد حاصل کی جائے اور اس سلسلہ میں صرف اللہ پر بھروسہ کیا جائے۔

(۲) ہوشیار رہا جائے۔ خوابِ غفلت کو چھوڑ دیا جائے۔

(۳) جہاں تک ہو سکے قوت اور سامان جمع کیا جائے تا کہ دشمنوں کے دلوں میں رعب بیٹھ جائے۔

مولانا وحید الدین خان صاحب کا سہ نکاتی فارمولہ قرآن کے سہ نکاتی فارمولہ کے بالکل برعکس ہے۔ اسی لئے مسلمانوں نے اس فارمولہ کو بالکل ہی مسترد کر دیا۔

(۳) مولانا کی تیسری دلیل یہ ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی تو کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں جو آیت اتری وہ یہ نہیں تھی کہ:

''طهر الكعبة من الاصنام'' ...... کعبہ کو بتوں سے پاک کرو۔''

بلکہ یہ کہا گیا کہ:

''وثيابك فطهر'' ...... ''اپنے کپڑے کو پاک کرو''۔

''یعنی اخلاق کو درست کرو۔ مکی دور میں اسی قسم کی آیتیں اترتی رہیں۔ ان کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے، بلکہ ان کا تعلق صرف اس مسئلہ سے تھا کہ مکہ جیسے حالات میں مسلمانوں کی اپنی ذمہ داری کیا ہے''۔

کعبہ توحید خالص کے لئے بنایا گیا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے ہی دن کہہ دیا گیا تھا:

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (الحج:۲۶)

ترجمہ: ''اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرو اور میرے گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں کے لئے اور قیام، رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔''

وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ. (البقرۃ:۱۲۵)

ترجمہ: ''اور ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل کی طرف حکم بھیجا کہ میرے گھر کو خوب پاک رکھو طواف کرنے والوں اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لئے۔''

معلوم ہوا کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرنے کا حکم پہلے سے موجود تھا پھر ''**وثیابك فطهر**'' کے پہلے اور بعد کے فقرہ کو دیکھئے۔ پہلے کہا گیا: **قم فانذر** ...... ''اٹھو پس ڈراؤ۔ یہ ڈرانا کیا تھا شرک اور بت پرستی کے انجام ہی سے تو ڈرانا تھا۔ اس میں بتوں سے دوستی اور بت پرستوں سے دمسازی کا اظہار تھا یا بیزاری کا؟! بعد میں کہا گیا ''**والرجز فاهجر**'' ...... ''گندگی یعنی بتوں کو چھوڑ دو۔'' اس حکم کا منشاء کیا تھا۔ بتوں اور بت پرستوں سے ہم آہنگی کا اظہار کیا جارہا تھا یا کشمکش کی دعوت تھی!؟ مکہ ہی میں سورہ ''**قل هو الله احد، قل يا ايها الكٰفرون**'' کا نزول ہوا ہے۔ کیا ان آیتوں کا تعلق اس مسئلہ سے نہیں تھا کہ کعبہ کے اندر بت رکھنے کا شرعی حکم کیا ہے۔ آخر وہ کون سی آیات ہیں جن میں کعبہ میں بت رکھنے کی شرعی حیثیت بتائی گئی تھی اور وہ کون سی آیات ہیں جن میں ۳۶۰ بتوں کی موجودہ حیثیت کو تسلیم کرنے اور گوارہ کرنے کی تعلیم دی گئی تھی۔

ایک دوسرے پہلو سے سوچئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل مکہ کے درمیان وجہ نزاع کیا تھی؟ جو قوم اتنی سیکولر مزاج تھی کہ ۳۶۰ بتوں کو گوارہ کر رہی تھی وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر بھڑک اٹھی، گھر گھر کشمکش برپا ہوگئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کی زندگی اجیرن بنادی گئی۔ اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ انہیں جانا پڑا۔ ہجرت حبشہ ہوئی۔ اہل مکہ نے حبشہ تک پیچھا کیا۔ جب ان کو جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی تقریر کے بعد ناکامی ہوئی تو انہوں نے اپنے ایک بڑے سردار عتبہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لالچ دلانے کے لئے بھیجا۔ عتبہ کی پیشکش کو دیکھئے۔ دولت اور اقتدار کی اس نے لالچ دلائی۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرادی۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک محض سکون اور چین

کی زندگی گزارنا اور عزت اور مرتبہ کی کوئی اہمیت ہوتی تو کتنا سنہرا موقع تھا۔ جب لالچ کی یہ تدبیر نہ چلی تب سارے قبیلوں کے سردار اکٹھے ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابوطالب کے پاس آ کر یوں تقریر کی:

''ہم نے آپ کا بہت ادب کیا۔ آپ کا بھتیجا ہمارے ٹھاکروں اور بتوں کو جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے آئے اتنا سخت سست کہنے لگا ہے کہ اب ہم صبر نہیں کر سکتے۔ آپ اسے سمجھا کر چپ رہنے کی ہدایت کر دیں ورنہ ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے اور تم اکیلے ہم سب کا کچھ نہیں کر سکو گے۔''

''سارے ملک کی عداوت دیکھ کر چچا کا دل درد اور محبت سے بھر گیا۔ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا اور سمجھایا کہ بت پرستی کا رد نہ کیا کرو۔ ورنہ میں بھی تمہاری کچھ حمایت نہیں کر سکوں گا۔ اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''چچا اگر یہ لوگ سورج کو میرے داہنے ہاتھ پر لا رکھیں اور چاند کو بائیں ہاتھ پر تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا۔ اور خدا کے حکم میں سے ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔ اس کام میں خواہ میری جان بھی جاتی رہے۔''

ان حقائق کے باوجود اگر یہ کہا جائے کہ کعبہ میں بتوں کی شرعی حیثیت نہیں بتائی گئی بلکہ محض اخلاق سدھار کی بات کہی گئی تو کتنی غلط بات ہے اور اتنی خلاف حقیقت اور خلاف واقعہ بات کو اتنے زوردار انداز سے کہنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے اس وقت حالات چاہے کتنے ہی سخت ہیں مکہ کے حالات اس سے کہیں زیادہ سخت تھے اور مکہ میں مسلمانوں کی تعداد اور ان کے وسائل نسبتاً ہماری تعداد اور وسائل سے بہت کم تھے۔ نیز ہمارے مقابلہ میں باہری دنیا کی انہیں ہمدردیاں انتہائی کم حاصل تھیں۔ لیکن بت پرستی اور مورتی پوجا کے مسئلہ میں کسی طرح کا سمجھوتہ اور مفاہمت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ مارے گئے، پیٹے گئے، طرح طرح ستائے گئے اور مکہ سے نکال دیئے گئے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ اس بارے میں ذرّہ برابر نہ نرم ہوئے، نہ جھکے اور نہ انہوں نے اپنے اندر لچک پیدا کی۔

اس اسوۂ حسنہ کی روشنی میں آخر یہ کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ مسلمان ایک مسجد کو بت خانہ بنانے کی اپنی طرف سے پیشکش کریں یا اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں اور کہہ دیں کہ ہم کو کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ ہماری جان بخش دی جائے۔

(۴) ''چوتھی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کا رویہ ہے ابرہہ کے مقابلہ میں۔''

سوال یہ ہے کہ عبدالمطلب کا عمل کوئی شرعی دلیل ہے؟ ان کا خاتمہ حالت شرک میں ہوا ہے۔ قرآن و حدیث میں ان کے رویہ کے صحیح ہونے کے لئے کوئی اشارہ تک نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اس واقعہ کو دلیل شرعی

کے طور پر پیش کرنا کہاں کی دین فہمی ہے۔ یہاں ایک اور پہلو بھی خاص توجہ کا طالب ہے، عبدالمطلب نے صرف یہ کیا کہ کعبہ کی حفاظت کے لئے میدان میں نہیں آئے لیکن انہوں نے اس پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا نہ اپنی رضا کا اظہار کیا اور نہ کعبہ کی حرمت بیچ کر اپنے لئے کوئی مراعات حاصل کیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا کا سہ نکاتی فارمولہ کتنا گھناؤنا ہے کہ حالت شرک میں ہونے کے باوجود انہوں نے حرمت کعبہ کو بیچنا اپنی خودداری کے خلاف سمجھا اور ہم اتنے بے غیرت بن گئے ہیں کہ مسجد کی حرمت دے کر اپنے لئے تحفظ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ اس دنائت اور پست ہمتی پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

عبدالمطلب کا طرز عمل غیرت اور خودداری کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ غیر منطقی اور غیر عقلی بھی ہے اسی بناء پر بعض محققین نے اس واقعہ کی صحت میں بھی کلام کیا ہے جو بالکل بے وزن بھی نہیں ہے۔

ہر چیز اللہ کی ہے۔ ہمارا مال، ہماری جان، ہمارا دین، ہمارا قرآن اور ہمارا قبلہ سب اللہ کا ہے تو کیا آپ مسلمانوں کو یہی درس دیں گے کہ کسی چیز کی حفاظت اور صیانت کے لئے کچھ نہ کرو۔ اللہ خود اپنی چیز کی حفاظت کرے گا۔ دیکھو کعبہ جیسی باعظمت چیز کی حفاظت عبدالمطلب نے خود نہیں کی، بلکہ اللہ کی چیز تھی لہٰذا اس کی حفاظت اللہ ہی کے ذمہ کردی۔ تم بابری مسجد کے چکر میں کیوں پڑے ہو۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے تو من قتل دون ماله فهو شهيد ...... "جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔" آپ نے کیوں فرمایا۔ قرآن میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ ...... "تم پر جنگ فرض کی گئی" کس بناء پر فرمایا گیا۔ جہاد کو افضل الاعمال کیوں بتایا گیا اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے پر بار بار کیوں ابھارا گیا۔ عہد نبوی میں درجنوں معرکے کیوں گرم ہوئے۔ اور میدان جنگ میں مقابلہ سے فرار کو منافی ایمان کیوں قرار دیا گیا؟؟

معلوم ہوا کہ یقیناً ہر چیز اللہ کی ہے اور وہی ہر چیز کی حفاظت کرنے والا ہے۔ مگر انسانوں پر امتحاناً کچھ ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس کی عدم ادائی کی صورت میں ہم ناکام اور مجرم قرار دیئے جائیں گے۔

⑤ پانچویں دلیل "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق، یعنی کسی مومن فرد یا گروہ کے بس میں جتنا کچھ ہو صرف اتنے کیلئے ہی وہ مکلف ہے۔ اپنے بس سے باہر کی ذمہ داری کسی مسلم فرد یا مسلم گروہ کے اوپر نہیں۔ اس شرعی اصول کو سامنے رکھتے ہوئے بابری مسجد اور مسلمانوں کے مسئلہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اب اس معاملہ میں مسلمانوں کی کوئی شرعی ذمہ داری نہیں ہے۔

اگر ان کے اوپر بابری مسجد کے تحفظ کی ذمہ داری تھی تو وہ اس ذمہ داری کو قربانی کی حد تک جا کر ادا کر چکے ہیں۔انہوں نے پوری طاقت کے ساتھ بابری مسجد کو بچانا چاہا مگر وہ اس کو نہ بچا سکے''۔ (الرسالہ)

اس استدلال میں کئی ایک خامیاں ہیں:

① اس استدلال سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں نے اپنے بس بھر کوشش کی ہے اللہ کے نزدیک ان سے اب باز پرس نہیں ہوگی وہ معذور ہیں۔اس سے آگے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بابری مسجد کے انہدام کو قبول کر لیں اور راضی نامہ لکھ کر دے دیں۔اور اس کے عوض اپنی جان کی امان چاہیں۔جب یہ طے ہے کہ وہ جگہ ہمیشہ مسجد کی جگہ رہے گی تو مسجد کی جگہ دوسروں کے حوالہ کرنے کا جواز اس اصول سے کس طرح ثابت ہوتا ہے۔

② آدمی کے بس میں کیا ہے کہاں تک ہے اس کا فیصلہ تو آخرت میں ہوگا کہ کس کو کیا کرنا تھا اور اس نے کیا کیا۔ظاہری طور سے اس دنیا میں آدمی کی آخری سانس اس کے بس کی آخری حد ہے جو ۶ ردسمبر سے پہلے فوت ہو چکے ہیں۔یقیناً ان کے بارے میں ہم ظاہری طور سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کے بس میں جو تھا انہوں نے کیا لیکن جو لوگ ۶ ردسمبر کے بعد اب تک زندہ ہیں یا جب تک آئندہ زندہ رہیں گے ان کو اپنی آخری سانس تک کا حساب دینا ہوگا کہ ان کے بس میں کیا تھا اور انہوں نے کیا کیا۔مولانا کا استدلال بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص نماز کے لئے مسجد کے راستہ پر نکلا۔راستے میں کتا بیٹھا تھا۔بس تھوڑا انتظار کیا اور ڈر کر واپس آ گیا اور اس کے بعد مطمئن ہو گیا یہ سوچ کر کہ میرے بس میں جو تھا میں نے کر لیا اور میں معذور ہوں۔لیکن قیامت کے دن اگر اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہارے گھر میں ڈنڈا تھا۔ڈنڈے سے کتے کو کیوں نہیں بھگایا تو وہ آدمی کیا جواب دے گا اور کیا وہ اپنے کو معذور ثابت کر سکے گا؟! حقیقت یہ ہے کہ ایک کام چور طالب علم تو اس طرح کا استدلال کر سکتا ہے کہ میں نے ایک بار امتحان دیا، فیل ہو گیا۔بس بھر کوشش کر لی اب آئندہ میں کچھ نہ کروں گا۔لیکن ایک سچا اور محنتی طالب علم ایک بار کوشش کے بعد دوبارہ کوشش کرنے سے ہمت نہ ہارے گا۔الغرض مولانا کا استدلال بہانہ بازوں اور نکموّں کا استدلال ہو سکتا ہے لیکن بابری مسجد کے مخلصین اور باہمت لوگوں کا نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں اپنا جائزہ لیجئے آپ کے سامنے ایک انتہائی چھوٹا مذہبی گروہ اپنی عبادت گاہ کو بچانے کے لئے کیا کیا قربانیاں پیش کر چکا ہے۔عین موقع پر سینکڑوں نے اپنی جانیں نچھاور کر دیں۔اپنے معمولی معمولی مطالبہ

کے لئے ہزاروں افراد جیل جاتے ہیں اور برسوں صعوبتیں جھیلتے ہیں۔ ہزاروں گردنیں کٹا دیتے ہیں۔ ہم اپنی تعداد، اپنے وسائل کا حساب لگائیں اس میں سے کتنے فیصد ہم نے لگایا ہے عین موقع پر جبکہ مسجد ڈھائی جارہی تھی فی کروڑ ایک آدمی بھی جا کر گولی کھا کر شہید ہو گیا ہوتا تو کہا جاسکتا تھا کہ ہمارے بس میں جو تھا ہم نے کر دکھایا۔ پوری ملت دوسروں پر تکیہ کئے ہوئے اپنے گھر میں بیٹھی رہی۔ اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ ہم نے اپنا حق ادا کر دیا ہے، نفس کو دھوکہ دینا ہے۔ یہ ایک قومی اور ملی جرم ہے جو ہم سے سرزد ہوا ہے۔

اس کے وبال سے بچنے کی صورت یہ تھی کہ ہم متحد ہوتے، مستعد ہوتے اور از سرنو مسجد کی تعمیر کے لئے ہندوستانی ملت کے شایان شان کوششوں اور قربانیوں کا نذرانہ بارگاہ رب العزت میں پیش کرتے اور اس سے اپنی کوتاہی کی معافی چاہتے۔ اس کے برعکس انہدام مسجد کو اپنے تحفظ کے لئے بطور فدیہ ہم پیش کررہے ہیں۔ غیرت ایمانی اور حمیت دینی سے اگر ہم خالی ہو گئے ہیں تو کم از کم اس کا خیال تو ہونا چاہئے کہ آئندہ مؤرخ ہمارا تذکرہ کس انداز میں کرے گا۔ پھر بالفرض ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ تک آپ نے بس بھر کوشش کی۔ لیکن مسجد گرادی گئی۔

سوال یہ ہے کہ اس کے بعد آپ کے بس میں جو کچھ ہے وہ کیوں نہیں کریں گے اور آپ پر کیوں ذمہ داری عائد نہ ہوگی۔ یہ مانا کہ آپ یعنی مسلمان بے بس ہیں معذور ہیں تو مسجد کی ذمہ داری دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر آئے گی۔ آپ ان سے کہئے کہ آپ اس ذمہ داری کو سنبھالو ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ آپ مسجد کی حفاظت سے، صیانت سے اور تعمیر سے عاجز ہو کر بیٹھ سکتے ہیں لیکن اس کی حوالگی کا آپ کو کوئی حق نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اللہ آپ کے علاوہ کسی دوسری قوم کو اپنے گھر کے لئے اٹھائے جو ہمارے جیسے کمزور اور معذور نہ ہوں۔

مسجد کی جگہ تو اللہ کی ملکیت ہے اس میں مسلمان اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کر سکتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کسی مسلمان کے لئے کیا جائز ہوگا اور اس کی غیرت گوارا کرے گی کہ اپنی جگہ اور اپنا گھر بت پوجا کے لئے قیمتاً یا کسی معاہدہ کے تحت برضا ورغبت حوالہ کرے اور اگر کوئی چھا گلہ عبدالحمید دلوائی اور عباس نقوی قماش کا فرد اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے ایسی حرکت کرے تو اس کی مسلمانیت باقی رہے گی۔ افسوس کا مقام ہے جس حرکت کا تصور ایک ناخواندہ اور بے عمل مسلمان نہیں کرسکتا اس کو تقاضائے شریعت ثابت کرنے کے لئے ہمارے دانشور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اور آیات اور احادیث کی غیر عقلی، غیر منطقی اور غیر دینی تاویلات کررہے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے اس کے پیچھے بے شعوری، بے عملی ہے یا کچھ دوسرے محرکات۔

متاعِ دین و دانش لٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

⑥ چھٹویں دلیل: ''حقیقت یہ ہے کہ ۶ ؍دسمبر کے بعد دو اور دو چار کی طرح یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اس معاملہ میں اب مسلمانوں کے لئے جو انتخاب ہے وہ بابری مسجد بنانے اور بابری مسجد نہ بنانے کے درمیان نہیں ہے بلکہ بابری مسجد اور ملت کی تباہی کے درمیان ہے۔ یعنی مسلمان اگر دوبارہ اسی مقام پر بابری مسجد تعمیر کرنے کی مہم چلائیں تو اس کے نتیجہ میں یہ ہونے والا نہیں ہے کہ بابری مسجد اپنے اصل مقام پر بن کر کھڑی ہو جائے۔ اس کے برعکس جو ہوگا وہ یہ کہ انڈیا کے مسلمان ناقابل بیان تباہی میں پھنس کر رہ جائیں۔

یہاں میں آپ کو ایک اور شرعی حکم یاد دلاتا ہوں جو بہت زیادہ اس مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس حکم کو قرآن کی زبان میں اضطرار کہا جاتا ہے مثلاً خنزیر کا گوشت کھانا اسلام میں مطلق حرام ہے۔ لیکن اک شخص اگر مضطر ہو جائے یعنی وہ ایسی صورت حال میں مبتلا ہو جائے کہ اس کے پاس کھانے کے لئے صرف خنزیر کا گوشت ہو، اس کے لئے دو میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقع ہو، یا تو وہ خنزیر کا گوشت کھا کر اپنی جان بچائے یا پھر بھوک سے مر جائے۔ ایسی حالت میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس آدمی کو خنزیر کا گوشت کھالینا چاہئے۔ کیونکہ جان بوجھ کر اپنے کو ہلاک کرنا اسلام میں جائز نہیں۔

اس شرعی اصول کی روشنی میں دیکھئے تو آج یہی نازک مسئلہ انڈیا کے پورے مسلم گروہ کے لئے پیدا ہو گیا ہے۔ پھر جو شریعت ایک جان کو بچانے کے لئے حرام غذا کو حلال کر دیتی ہے، وہ شریعت کیا بارہ کروڑ انسانوں کے لئے ایک مسلم گروہ کو ہلاکت سے بچانے کے لئے انہیں کوئی رعایت نہ دے گی۔'' (الرسالہ)

اس استدلال پر غور کیجئے۔ یہاں نقطۂ نظر کا ایک زبردست فرق ہے۔ ایک بے غیرت اور بزدل جس زندگی کو باعزت زندگی سمجھتا ہے غیرت مند اور بہادر اس کو موت خیال کرتا ہے۔ بہن بیٹیوں کی عصمت برسر عام لٹتے ہوئے دم سادھے اپنے کو بچا کر کوئی اپنی ہوشیاری تصور کرتا ہے اور کوئی دوسرا ایسی حالت میں اپنے لئے زمین کی پیٹھ سے بہتر زمین کے پیٹ کو خیال کرتا ہے۔ منافق جس چیز کو زندگی سمجھتا ہے مومن کی نظر میں وہ موت ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
شاہیں کا جہاں اور ہے کرگس کا جہاں اور

مسلمانی نظریۂ زندگی قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ. (البقرۃ:۱۵۴)

ترجمہ: ''اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں تم انہیں مردہ مت کہو۔''

یعنی زندگی اصل میں اللہ کے لئے اپنے آپ کو کھپانا ہے اور حق کے لئے راہ خدا میں شہید ہو جانا ہے۔ آلام و مصائب اور مشکلات و آزمائشوں کو حق کے نام پر انگیز کرنا ہے نہ کہ مشکلات سے ڈر کر گوشۂ عافیت میں بیٹھ جانا۔ اس چیز کو قرآن میں مختلف مقامات اور مختلف انداز سے مسلمانوں کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرۃ:۱۹۵)

ترجمہ: ''اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

اس آیت کو بعض لوگ بالکل الٹے مفہوم میں لیتے ہیں۔ حالانکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات اور مشکلات سے بچارہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی کے جہنم میں جھونک رہے ہوتے ہیں۔ مومن کے لئے زندگی اور بقاء کا اصلی خزانہ خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی ہے نہ کہ جان و مال کو سینت سینت کر رکھنے اور بچانے میں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ. (التوبۃ:۴۲)

ترجمہ: ''اور وہ عنقریب اللہ کی قسم کھائیں گے کہ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ آپ کے ساتھ نکلتے وہ اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔''

اس آیت میں ''يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ'' کے الفاظ سے کنجوسی اور بزدلی کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس حالت کو منافقین زندگی اور کامیابی سمجھتے ہیں اللہ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

جس میں نہ ہو انقلاب، موت ہے وہ زندگی
روحِ امم کی حیات، کشمکشِ انقلاب

مسلمانوں کے تحفظ کا مسئلہ بابری مسجد کے ایشو سے وابستہ نہیں ہے۔ یہ ایشو ختم ہوگا تو کوئی دوسرا ایشو پیدا کرلیا جائے گا۔ اس کے پہلے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزارہا فسادات مختلف ایشوز کے تحت ہوئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ فسادات اور مشکلات کا خوف دلا کر مسلمانوں کو ذلت اور مسکنت کے کس کھڈ میں آپ گرانا چاہتے ہیں؟ حق یا باطل صحیح یا غلط کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے کی تلقین کرنا اور ترغیب دینا الگ بات ہے لیکن خوف اور ڈر کی بنیاد پر کسی موقع پر مسلمانوں کو جھکانا نہایت خطرناک چیز ہے جس گروہ کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہوجائے گی اس کو دنیا کی کوئی طاقت بھی عزت کے مقام پر نہیں بٹھاسکتی۔ عزت و وقار کا منبع ایمان و یقین کے ساتھ اعلیٰ ظرفی، بلند خیالی اور علوہمتی ہے۔ مسلمانوں کو خیر امت اور اعلون ہونے کا اذعان دیا گیا کیونکہ ذہن و دماغ جس کے مرعوب ہوں گے وہ گروہ دوسروں کے مقابلہ میں کیا کھڑا ہوگا!

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں یہ مضمون بیان ہوا ہے کہ ایک ایسا زمانہ آئے گا جبکہ دوسری قومیں مسلمانوں پر

ایسے ٹوٹ پڑیں گی جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پوچھا گیا اس وقت ہماری تعداد کیا بہت کم ہو جائے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ تعداد کثیر ہوگی لیکن تم جھاگ کے مانند ہوگے اور تمہارے اندر وہن پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ وہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے بتایا "حب الدنیا و کراھیة الموت"، یعنی دنیا کی محبت اور موت کو ناپسند کرنا۔ اس روشنی میں جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ باعزت زندگی اور تحفظ حاصل ہونے کے لئے بنیادی صفت مشکلات کے اندیشے اور موت کے ڈر سے حمایت حق کو چھوڑنا نہیں ہے بلکہ دنیا اور دنیا کی زندگی کو ناچیز اور ہیچ سمجھنا اور موت سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ ہے۔ یہ حوصلہ اگر ختم ہو جائے تو مسلمان کی حیثیت کیا رہ جائے گی۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

مسجد تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ طور پر مانی ہوئی اور قابل احترام چیز ہے۔ اگر مرعوبیت اور ڈر کی وجہ سے اس کے لئے بھی ڈٹ کر کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو وہ کسی چیز کے لئے اور کسی موقع پر بھی کھڑے نہیں ہو سکتے۔ ترشول اور تیر دیکھ کر ایک مسجد حوالہ کریں گے تو دوسری اور تیسری مسجد محض ڈنڈا ہی دیکھ کر چھوڑ دیں گے اور چوتھی کا جب مسئلہ پیش ہوگا تو ایک ڈانٹ اور ایک دھمکی ان کے لئے کافی ہوگی۔ بلکہ اس کے بعد یہ نوبت آسکتی ہے کہ مسلمان اپنے ہاتھوں مسجدوں کو توڑیں گے اور اپنے پیسوں سے بت خانہ تعمیر کریں گے کیونکہ ان کے تصور میں اس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہ ہوگا۔

بابری مسجد کے محاذ پر ۲۰ کروڑ مسلمان ہار مان کر مرعوب ذہنیت کے ساتھ اپنی زندگی بچانے کے لئے مسجد کو بت خانہ بنانا برضا و رغبت قبول کرلیں تو صدیوں ان کے اندر زندگی اور بلند ہمتی پیدا ہونا مشکل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ فرعونی ذہنیت کے سامنے بنی اسرائیل نے جب سپر ڈال دی اور ہمت ہار گئے تو ان کی پستی کا یہ حال ہو گیا کہ اللہ کا نبی کہتا ہے کہ سامنے والی قوم سے لڑ جاؤ، اللہ تمہیں ضرور غالب کرے گا لیکن وہ کھڑے نہ ہو سکے اور جواب دیا:

فَاذْهَبْ أَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ إِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (المائدۃ:۲۴)

ترجمہ: "(یعنی) تم اور تمہارے اللہ میاں جا کر لڑیں، ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔"

بنی اسرائیل کا کوئی نرالا واقعہ نہیں ہوا ہے بلکہ غلامانہ اور مرعوب ذہنیت کا یہ خاصہ ہمیشہ رہا ہے۔ مرعوب ذہن کے ایک جوان کو ایک عورت کہتی ہے کہ یہیں کھڑے رہو میں ابھی گھر سے تلوار لے کر آتی ہوں۔ چنانچہ وہ

تلوار لے کر آتی ہے اور اس کو قتل کر دیتی ہے اور اس جوان کو بھاگنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ تاریخ میں ایسا ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔

خوف کی بنیاد پر مسجد کی سپردگی کی صورت میں یہ انجام ہونے والا ہے تاریخ کے اس عمل کو روکا نہیں جا سکتا۔ اس کے برخلاف اس محاذ پر مسلمان اگر جمے اور ڈٹے رہتے ہیں تو دو امکان ہیں: ایک یہ کہ اس سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوگی اور ان کے حوصلے بلند ہو سکتے ہیں اور عین ممکن ہے کہ سامنے والے گھٹنے ٹیک دیں۔ اگر انگریز قوم مجاہدین آزادی کے سامنے اور روس جیسی سپر طاقت افغانیوں کے سامنے جھک سکتی ہے تو کیوں یہ سمجھا جا رہا ہے کہ مسلمان کچھ نہیں کر سکتے اور اگر بالفرض ایسا نہ بھی ہوا تو اتنا ضرور ہوگا کہ مسلمانوں کی دوسری چیز پر ہاتھ اٹھانے کے لئے انہیں سو بار سوچنا پڑے گا۔ اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس راہ میں مسلمان جان و مال کی جو قربانی دیں گے وہ رحمت خداوندی کو ان کی طرف متوجہ کرنے والی ہوگی۔ اور آخرت میں نجات وفلاح کا ذریعہ ہوگی۔ غرض اس راہ میں ڈٹ کر جو وہ پائیں گے اس سے بہت زیادہ ہوگا جو پیچھے ہٹ کر اور مسجد دے کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلی صورت میں دنیا وآخرت دونوں کی رسوائی ہے اور دوسری شکل میں دنیا کی سرخروئی اور سربلندی کی امید ہے اور آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا بالکل غلط اور بے بنیاد ہے کہ مسجد کا ایشو دو دو چار کی طرح مسلمانوں کی تباہی کا سبب ہے۔ یہ کہنے والے ذرا سوچیں کس امت کے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں! یہ تو وہ امت ہے جو تلواروں کے سایے میں پیدا ہوئی ہے اور تیغوں کے سایے میں پروان چڑھی ہے۔ جس کی ایک شاندار تاریخ ہے جس کے آباء واجداد نے حق گوئی و بے باکی کا ہر زمانہ میں تسلسل قائم رکھا ہے۔

براہ کرم اس تسلسل کو توڑیئے نہیں۔ خطرات اور مشکلات سے پامردی کے ساتھ نمٹنے کا اس کو درس دیجئے، ڈرایئے نہیں۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ اس گئی گزری حالت میں فلسطینی مسلمان تقریباً نصف صدی سے یہودی استعمار سے نبرد آزما ہیں اور نہتے افغانی مسلمانوں نے روس جیسی طاقت کا چودہ سال تک مقابلہ کیا اور آخر کار اس کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ تو آخر کیا وجہ ہے کہ بیس کروڑ ہندوستانی مسلمان یہودیوں کے بھائی فرقہ پرستوں کے سامنے اتنے کمزور ثابت ہوں گے کہ وہ آناً فاناً ان کو ہڑپ لے جائیں گے۔

بہرحال اضطرار کا شرعی اصول ایک رخصت ہے کہ ایک آدمی ایک حرام چیز کھا کر اپنی جان بچالے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی ملت اسلامیہ پر ویسی ہی اضطراری حالت طاری ہے جس میں خنزیر کھائے بغیر ایک آدمی زندہ باقی نہیں رہ سکتا؟ بابری مسجد حوالہ کئے بغیر ملت کا وجود باقی نہ رہے گا کیا یقینی بات ہے؟ کیا ملت نے اپنے تحفظ

کی ساری تدبیریں اختیار کرلی ہیں۔ اس کے لئے اب تمام راہیں بند ہوچکی ہیں؟ کیا وہ اس وقت اتنی بے دست و پا ہوچکی ہے کہ اگر فوری مسجد سے دستبرداری اختیار نہ کی تو یکلخت سب کے سب فنا کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے؟ ہمیں پورا یقین ہے کہ دنیا کا کوئی تجزیہ نگار، موجودہ حالات کے تناظر میں یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا۔ ہمارا خیال ہے کہ سو سال تک ملت مزاحمت کرتی رہے تو بھی یہ اضطراری مرحلہ نہ آئے گا۔ مشکلات اور مصائب کا ہجوم اضطرار کی تعریف میں نہیں آتا۔

مکہ میں شعب ابی طالب میں تین سال تک اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم محصور کردیئے گئے۔ ہر طرح ان کا بائیکاٹ کیا گیا۔ بھوکوں مرنے کی نوبت تھی، سوکھے چمڑے چوس چوس کر پانی پیتے تھے۔ لیکن اس حالت کو بھی حالت اضطرار قرار دے کر توحید پرستی کے مسئلہ میں کسی نرمی اور جھکاؤ کا اظہار نہیں کیا گیا۔ مدینے میں پورے عرب کے قبائل امڈ کر آگئے۔ مدینہ کا محاصرہ کرلیا گیا۔ باہر سے کوئی کمک آسکتی تھی نہ کوئی رسد۔ صحابہ کرامؓ کو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پیٹ پر پتھر باندھنے کی نوبت آئی مگر کہیں سے حالت اضطرار کی رخصت سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔

اس سلسلہ کی آخری بات جو نہایت ہی اہم ہے وہ یہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں کسی واقعہ کی نشاندہی نہیں کی جاسکتی جس میں پوری ملت نے محض جان بچانے کے لئے کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہو یا شعائر اسلامی کے کسی جزو کی بے حرمتی کی قیمت پر اپنے آپ کو بچایا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ ایک مضطر آدمی خنزیر کا گوشت نہ کھائے اور مرجائے تو یہ خودکشی اور حرام موت ہوگی۔ لیکن کسی اسلامی قابل احترام چیز کی حفاظت میں کوئی شخص اپنی جان دے دیتا ہے تو وہ شہید ہوگا۔ دونوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ لہٰذا اضطرار کی شرعی اجازت سے مسجد کے بارے میں استدلال کرنا نہایت غلط اور بالکل الٹی بات ہے۔

(۷) ساتویں دلیل: ''صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ: ما خیر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بین امرین الا اختار ایسرھما ... ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو امر میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوتا تو آپؐ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے۔''

اس حدیث کو سامنے رکھ کر سوچئے تو اس وقت مسلمانوں کے لئے دو میں سے ایک چیز کے انتخاب کا موقع ہے۔ ایک یہ کہ بابری مسجد کے ایشو سے خود کو الگ کرکے اس کو ملک کے ضمیر کے حوالہ کردیں۔ دوسرے یہ کہ بابری مسجد کے لئے وہ اپنی لڑائی جاری رکھیں۔ دونوں صورتوں کا تقابل کیجئے تو یقینی طور پر پہلی صورت آسان اور دوسری صورت انتہائی مشکل ہے۔ ایسی حالت میں عین سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضہ ہے کہ مسلمان آسان صورت کو اپنالیں اور مشکل صورت کو چھوڑ دیں۔'' (الرسالہ)

یہ استدلال بغیر سوچے سمجھے پیش کیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دو جائز امر میں انتخاب کا اختیار دیا گیا تو

آپ ﷺ نے اس میں سے آسان کو اپنایا۔ اس موقع پر مولانا کو کوئی ایسی روایت پیش کرنی چاہیے تھی کہ حضور ﷺ کو ایک غلط اور دوسری صحیح چیز کے درمیان اختیار دیا گیا اور آپ ﷺ نے غلط کو نعوذ باللہ اختیار کرلیا ہو۔ اہل مکہ نے آپ ﷺ کے سامنے دولت اور اقتدار کو ایک طرف رکھا اور دوسری طرف بتوں کی تردید کی صورت میں جان سے ماردینے کو رکھا اور کہا کہ اس میں جس کو چاہو قبول کرلو۔ بتائیے آپ ﷺ نے کس چیز کا انتخاب کیا؟ زیر بحث معاملہ میں تو آپ بھی بابری مسجد سے دستبرداری کو سور کے گوشت کے درجہ میں رکھتے ہیں۔ تو غور فرمائیے اس معاملہ میں حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔

اس روایت میں دو جائز چیزوں میں سے آسان ترین کے انتخاب کی بات ہے اور یہاں جائز اور ناجائز کے درمیان انتخاب کا سوال ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری حدیث مولانا کے سامنے نہیں تھی، ورنہ اس موقع پر اس حدیث سے قطعاً استدلال نہیں کرتے۔ اس لئے کہ حدیث میں صاف لفظوں میں بتادیا گیا ہے کہ یہ اس صورت کی بات ہے جبکہ گناہ نہ ہو۔ گناہ کا کام ہوتا تو آپ اس سے دور بھاگتے۔ اس کے انتخاب کا سوال نہیں ہوتا۔

بخاری میں "اختار" کے بجائے "اخذ" کا لفظ آتا ہے اور حاشیہ میں ہے کہ جب سہل اور آسان کام گناہ کا سبب ہوتا تو آپ مشکل ترین کا انتخاب فرماتے۔ مسلم شریف میں یہی حدیث الفاظ کے تھوڑے تغیر کے ساتھ نقل ہوئی ہے۔ امام مسلم نے اس پر جو باب باندھا ہے اس میں صراحت کردی ہے کہ یہاں انتخاب کی بات دو مباح چیزوں کے درمیان ہے۔ پوری حدیث یوں ہے:

ماخیر رسول اللّٰہ ﷺ بین امرین الا اخذ ایسرھما مالم یکن اثما فان کان اثما کان ابعد الناس منہ وما انتقم رسول اللّٰہ ﷺ لنفسہ فی شیء قط الا ان تنتھک حرمۃ اللّٰہ فانتقم للہ بھا۔

ترجمہ: "نبی ﷺ کو دو امر کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا۔ مگر ان میں سے آپ ﷺ نے آسان ترین کو اختیار فرمایا۔ جبکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ ﷺ اس سے سب سے زیادہ دور ہوتے اور آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔ اِلاَّ یہ کہ اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی کسی چیز کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ ﷺ اللہ کے لئے انتقام لیتے۔"

(۸) آٹھویں دلیل: "اس روش کو اختیار کرکے مسلمان کوئی نئی بات نہیں کریں گے۔ وہ وہی کریں گے جس پر وہ تقریباً پچاس سال سے اس ملک میں عمل کرتے رہے ہیں۔ جیسا کہ معلوم ہے پنجاب، ہریانہ اور راجستھان میں ہزاروں کی تعداد میں مسجدیں ڈھائی گئیں۔ مختلف طریقوں سے ان کی بے حرمتی کی گئی۔ مگر مسلمانوں نے کبھی بھی ان مسجدوں کے نام پر کوئی ایجی ٹیشن نہیں چلایا۔ کیوں کہ اس معاملہ میں انہوں نے اپنے کو مضطر پایا تھا۔ اب اگر

وہ بابری مسجد کو بھی اسی فہرست میں شامل کرلیں تو یہ عین وہی ہوگا جس پر اس سے پہلے عملاً قائم رہے ہیں۔

میں نے جو تین نکاتی فارمولہ پیش کیا ہے وہ باعتبار حقیقت کوئی نئی چیز نہیں، یہ ایودھیا کی مسجد کے معاملہ میں اسی اصول کو باعزت طور پر لاگو کرنا ہے جو عملاً ملک کی ہزاروں مسجدوں کے بارے میں تمام علماء کی مرضی سے اختیار کیا جاچکا ہے۔'' (الرسالہ)

بظاہر یہ استدلال بڑا خوشنما ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے انتہائی بودا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی غلط نمونہ کو دوسرے غلط کام کے لئے دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی مفتی کسی شخص کو نماز نہ پڑھنے کی اجازت دے اور اس فتویٰ کی بنیاد یہ بتائے کہ لاکھوں مسلمان نماز نہیں پڑھتے اور تمام علماء کی مرضی اسی میں شامل ہے تو اس آدمی کو بھی انہیں لاکھوں میں شامل سمجھو۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد ہزاروں مسجدوں کے بارے میں مسلم لیڈران، علما، اور مختلف مسلم تنظیموں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اور زبانی اور تحریری احتجاج کیا ہے۔ البتہ بڑے پیمانہ پر کوئی مہم نہیں چلائی گئی ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ مسلمانوں کی مرضی شامل ہے، بے بنیاد بات ہے۔ بابری مسجد منہدم کردی گئی۔ مسلمان آج جتنا خاموش ہیں کل اس سے زیادہ خاموش ہوجائیں گے۔ ان کی یہ خاموشی اللہ کے نزدیک کس خانہ میں رکھی جائے گی نہیں معلوم، لیکن سہ نکاتی فارمولہ انہدام مسجد اور تعمیر بت خانہ پر مسلمانوں کی رضامندی کے اظہار کا مطالبہ کرتا ہے اور دھمکی دے رہا ہے کہ ایسا تم نہ کروگے تو نیست و نابود ہوجاؤ گے اور فرقہ پرستوں کی جارحانہ کارروائی میں بالواسطہ مسلمانوں کو شریک بنانا چاہتا ہے۔ ظلم سہنا، مظلوم بن کر رہنا اور ظلم پر خاموشی اختیار کرنا جائز ہوسکتا ہے لیکن ظالم کے ظلم پر صاد کہنا، ظالم کی ہمنوائی کرنا اور اس کے عوض کوئی مفاد حاصل کرنا انتہائی بھاری جرم ہے۔ ظلم کو ظلم اور ظالم کو ظالم کہنا ملت اسلامیہ کی زندگی کی علامت ہے۔ اگر کسی بھی دور میں یہ امت پوری کی پوری حق کے لئے قربانی اور بے خوفی کے جذبے سے خالی ہوجائے تو وہ اس کے انتہائی زوال اور پستی کا دور ہوگا۔ پھر وہ خدا کی رحمت سے دور ہوجائے گی اور کوئی چیز اس کو تباہی سے نہ بچاسکے گی۔

یہی بات نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں بیان کی گئی ہے:

''جب تم دیکھو کہ میری امت ظالم کو ظالم کہنے سے ڈر رہی ہے تو سمجھ لو کہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔''

یعنی رحمت خداوندی کا سایہ اس سے ہٹ گیا ہے۔ اب وہ خدا کے عذاب میں گرفتار ہوگی۔

بابری مسجد کو منہدم کرنے والے قرآن کی رو سے ظالم ہی نہیں بلکہ اظلم ہیں۔ ان کے ظالمانہ اقدام پر کوئی غیرت مند مسلمان یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔

اسلامی فکر کیا ہے؟

ایک تنقیدی جائزہ

(۱۹۹۶ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

تمہید

اس وقت پوری دنیا میں حتیٰ کہ تہذیب جدید کے اصل مراکز میں بھی اسلام پسندی اور اسلامی تحریک صرف زندہ ہی نہیں بلکہ ہاتھ پیر مارتی ہوئی نظر آتی ہے مخالف کیمپ انتہائی مضبوط موقف میں ہے اعلیٰ عصری ذرائع و وسائل اور اسلحہ کے ساتھ لیس ہے اس کے باوجود جرأتِ رندانہ اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا جانا حیرت انگیز ہے اس کی چھوٹی سی مثال امریکہ کے صعوبت خانہ میں ایک نابینا عالم شیخ عبدالرحمن کی موجودگی ہے یہ معمولی واقعہ نہیں ہے کہ آنکھوں سے معذور ایک شخص دنیا کی سپر طاقت کے مدمقابل ڈٹا ہوا ہے۔

سہ روزہ ''دعوت'' لکھتا ہے:

''دنیا کی واحد سپر طاقت''۔ایک نابینا اور ضعیف عالم سے خوف زدہ

ایک نابینا، ضعیف، بیمار اور امریکہ کی حکومت کی اجازت سے امریکہ میں رہائش پذیر مصری عالم شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو سزائے قید دیئے جانے پر شدید ردعمل ظاہر کرتے ہوئے ایک اسلام پسند مصری تنظیم نے دھمکی دی ہے کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن اور ان کے بھائیوں کو رہا نہ کیا گیا تو تمام دنیا میں 1991ء کے طرز پر امریکی مفادات پر وار کیا جائے گا۔

گزشتہ ہفتہ ایک نچلی عدالت نے شیخ عمر عبدالرحمن کو دیگر نو افراد کے ساتھ سزائیں سنائی تھیں، شیخ عمر عبدالرحمن کو عمر قید کی سزاء دی گئی ہے۔ان پر اقوام متحدہ کی عمارت، حکومت امریکہ کی ایک عمارت اور نیویارک کی دو سرنگوں میں دھماکے کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا تھا۔حکومت امریکہ کی طرف سے اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی کہ اگر شیخ عمر عبدالرحمن ایک خطرناک شخصیت تھے تو ان کو امریکہ میں داخلہ کی اجازت کیوں دی گئی اور ان کی سرگرمیوں کو کیوں جاری رہنے دیا گیا۔ سیاسی مبصرین نے کہا ہے کہ امریکی عدالت کے فیصلے کی پشت پر اسلام دشمنی اور نسل پرستی کے جذبات نمایاں ہیں۔ یہ مبصرین یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ دنیا کی

واحد سپر طاقت ایک نابینا اور ضعیف مسلم عالم سے کیوں خوفزدہ ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی نیوز ایجنسیوں نے شیخ عمر عبدالرحمن کے خلاف مقدمہ کے فیصلے کی خبریں دیتے ہوئے ان کے نابینا ہونے کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔'' (5/جنوری 1996ء)

اسلام پسند اور تحریکات اسلامی سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے دماغوں میں اسلام کو حکمراں بنانے، اسلام کو غالب کرنے اور اسلامی قوانین کو جاری و نافذ کرنے کی آرزوئیں اور نظریات پرورش پا رہے ہیں اور جو مخالف اسلام عقائد، خیالات اور افکار کا علمی اور عملی دونوں میدانوں میں مقابلہ کرنے کے لئے کوشاں ہیں اس صورت حال کو دیکھ کر اسلام مخالف حلقوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا ہے حالانکہ اسلام پسندوں کے مقابلہ میں مخالف طاقتوں کی وہی پوزیشن ہے جو نابینا شیخ عمر عبدالرحمن کے مقابلہ میں امریکہ کو حاصل ہے۔ جب دو متصادم قوتوں کے درمیان یہ نسبت ہو تو ظاہر ہے کہ کمزور فریق کا کتنا نقصان ہوگا اور اس پر کتنی مار پڑے گی اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا چنانچہ اس تصادم اور ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو نقصانات اٹھانے پڑ رہے ہیں ان کا حوالہ دیکر مسلمانوں میں سے ایک دانشور طبقہ اپنی اعلیٰ قابلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ سامنے آ رہا ہے اسلام پسندوں کو مطعون کر رہا ہے اور عقلی، اخلاقی اور دینی ہر پہلو سے ان کو غلط بتا رہا ہے اور اعلان کر رہا ہے اس کے لئے وہ اسلامی تاریخ کی نئی توجیہ، قرآنی اور دینی اصطلاحات کو ایک نیا معنی پہناتے ہوئے دینی اقدار اور مسلمات کا تیا پانچا کر دے رہے ہیں کہ اس کے بغیر وہ اسلام پسندی کی روکو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں موجودہ حالات کے اس پس منظر میں اس قسم کے دانشوروں کی ہمت افزائی اگر وقت کی غالب تہذیب کے علمبرداروں کی طرف سے بھی کی جا رہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ اسلام پسندوں سے بہت سی علمی، عملی اخلاقی اور فنی کمزوریاں سرزد ہو رہی ہوں گی۔ جن پر نکیر کرنی چاہئے اور ان کی اصلاح کے لئے واجبی کوشش بھی ہونی چاہئے۔ مگر اس کے بجائے یہ مسلمان دانشور مستشرقین یورپ اور فسطائیت اور جارحانہ فرقہ پرستی کے نمائندوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فکر اسلامی کو قصور وار ٹھہرا رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کی اصل وجہ یہ فکر ہے۔ لیکن ان کی بات کو کم از کم اسلامی دنیا کوئی وزن نہیں دے سکتی تھی اس لئے انہوں نے کتاب وسنت پر مبنی سلف صالحین سے ورثہ میں ملے ہوئے جذبہ اور فکر ہی پر تیشہ چلانا شروع کر دیا۔ اور گزشتہ تقریباً چار سو سال کے علماء اور مصلحین کو بے خبر اور کتاب وسنت سے نابلد قرار دیا جانا ضروری ٹھہرا۔ ایک طرف یہ ہے اور دوسری طرف اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جارحانہ اور ظلم و بربریت کا مظاہرہ کرنے والوں پر نگاہ غلط بھی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔

حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات
اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

اس سلسلہ کی ایک تحریر برادر محترم مولانا وحیدالدین خان صاحب کی ''فکر اسلامی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے اور بطور خاص مجھے بھی ایک صاحب نے عنایت کی اور پڑھنے کی خواہش کی۔ پوری کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے چند مباحث کا نوٹس لینا ضروری سمجھا گیا۔

دعوت حق کی مخالفت

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

علّامہ اِقبالؔ نے اس شعر میں ایک تاریخی حقیقت کی ترجمانی کی ہے۔ برادر محترم اس کو تسلیم نہیں کرتے اور اس کو بے خبری اور زمانہ ناشناسی کا ایک نمونہ قرار دیتے ہیں جس سے اسلام اور مسلمانوں کا ناقابل تلافی نقصان ہو رہا ہے اس تاریخی حقیقت کو رد کرنے کیلئے مولانا مودودیؒ کی ایک عبارت پر تبصرہ کرتے ہوئے برادر محترم لکھتے ہیں:

''سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نزدیک اسلام ایک مکمل سیاسی انقلاب کی تحریک ہے اس سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ پرجوش طور پر لکھتے ہیں:

''آج دنیا آپ کے موذن کو اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کی صدا بلند کرتے ہوئے اس لئے ٹھنڈے پیٹوں سن لیتی ہے کہ نہ پکارنے والا جانتا ہے کہ کیا پکار رہا ہوں اور نہ سننے والوں کو اس میں کوئی معنی اور مقصد نظر آتا ہے۔ لیکن اگر یہ معلوم ہوجائے کہ اس اعلان کا مقصد یہ ہے اور اعلان کرنے والا جان بوجھ کر اس بات کو اعلان کر رہا ہے کہ میرا کوئی بادشاہ یا فرماں روا نہیں ہے۔ کوئی حکومت میں تسلیم نہیں کرتا۔ کسی قانون کو میں نہیں مانتا۔ کسی عدالت کے حدود و اختیارات مجھ تک نہیں پہنچتے۔ کسی کا حکم میرے لئے حکم نہیں ہے۔ کوئی رواج اور کوئی رسم مجھے تسلیم نہیں۔ کسی کے امتیازی حقوق، کسی کی ریاست، کسی کا تقدس، کسی کے اختیارات میں نہیں مانتا۔ ایک اللہ کے سواء میں سب سے منحرف ہوں۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس صدا کو کہیں بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ آپ خود کسی سے لڑنے جائیں یا نہ جائیں دنیا خود آپ سے لڑنے آجائے گی۔ یہ آواز بلند کرتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا کہ یکا یک زمین و آسمان آپ کے دشمن ہوگئے ہیں اور ہر طرف آپ کیلئے سانپ، بچھو اور درندے ہی درندے ہیں۔'' (اسلامی سیاست، دہلی، ۱۹۸۶ء، صفحہ: ۷۵، ۷۶)

''سید ابوالاعلیٰ مودودی نے یہ پرجوش الفاظ اس لئے لکھے کہ انہوں نے دیکھا کہ آج ہماری مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہو رہی ہے تو کوئی اس کی وجہ سے ہم سے لڑنے نہیں آتا۔ جب کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ

میں توحید کی آواز بلند کی تو ہر طرف سے متشددانہ مخالفت شروع ہوگئی۔ کسی کو گھر والوں نے نکال دیا کسی پر مار پڑی۔ کسی کو قید میں ڈالا گیا۔ کسی کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹا گیا۔ کسی کی سر بازار پتھروں اور گالیوں سے تواضع کی گئی۔ کسی کی آنکھ پھوڑ دی گئی۔ کسی کا سر پھاڑ دیا گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۷۷)

''یہ الفاظ دور جدید سے بے خبری کا ثبوت ہیں۔ مصنف اگر زمانہ حاضر سے گہری واقفیت رکھتے تو وہ جانتے کہ اس فرق کا سبب زمانی عامل (Age Factor) ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تعذیب (Religious Persecution) کا زمانہ تھا، موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ مذکورہ فرق لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے سیاسی مفہوم کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ زمانی فرق کا معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود سید ابوالاعلیٰ مودودی جو یقینی طور پر اس ''انقلابی مفہوم'' کے حامل تھے، انہوں نے اور ان کی جماعت نے غیر منقسم ہندوستان میں دس سال تک اپنے انقلابی مفہوم کے مطابق ''اذان'' دی۔ مگر یہاں کی حکومت نے کبھی اس بناء پر ان کی پکڑ دھکڑ نہ کی۔ اور نہ ان کے سروں پر اس وجہ سے آرے چلائے گئے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اگر اس زمانی فرق کو جانتے تو اس کو وہ اسلامی دعوت کے حق میں ایک عظیم امکان سمجھتے۔ مگر اس فرق کی حقیقت نہ جاننے کی وجہ سے وہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۰۲)

یہاں ضمنی طور پر ہم دو باتوں کی وضاحت کرنی ضروری سمجھتے ہیں اول یہ کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اسلام کو محض مکمل سیاسی انقلاب کی ہی تحریک نہیں سمجھتے بلکہ ہر اعتبار سے اسلام کو مکمل سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر شعبۂ زندگی میں خواہ معاشی ہو یا معاشرتی اخلاقی ہو کہ سیاسی اسلام انقلاب کا داعی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ برادر محترم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مولانا مودودی پھانسی کی سزاء کا فیصلہ سن کر مسکرا چکے ہیں اور جہاں تک ہندوستان کی بات ہے ہم کہہ سکتے ہیں جماعت اسلامی کے مرکزی قائدین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس نے جیل کی روٹی نہ کھائی ہو۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس بات کا اعتراف برادر محترم نے خود بھی کیا ہے لیکن یہاں بھول گئے۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

''اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دعوت حق کے تمام جدید امکانات تباہ ہو کر رہ گئے۔ مدعو انتہائی غیر واقعی طور پر داعی کا حریف بن گیا دونوں کے درمیان داعیانہ تعلق ایک خود پیدا کردہ حریفانہ تعلق میں تبدیل ہو گیا۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۱۱)

مذکورہ بالا دونوں اقتباسوں کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ دعوت حق کو سیاست اور حکومت کے دائرہ میں قدم نہیں رکھنا چاہئے۔ لیکن آج کچھ لوگوں نے دعوت کی ایسی سیاسی اور انقلابی تعبیر کی کہ حکمراں طبقہ دعوت کا

مدمقابل اور مخالف بن گیا۔

دعوت کی پوری تاریخ میں ایک عام آدمی دیکھتا ہے کہ نمرود، فرعون اور سرداران قریش جیسے سر برآوردہ لوگوں نے ہمیشہ دعوت کی مخالفت کی ہے چونکہ تاریخی طور پر اس کا انکار ممکن نہیں تھا اس لئے اس خلش کو دور کرنے اور سامنے کے آدمی کو خاموش کرنے کے لئے یہ توجیہ پیش کردی گئی کہ اب زمانہ بدل گیا اور اس دور کے نئے داعیانِ اسلام اس تبدیلی کو سمجھ نہیں سکے۔ تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ قدیم زمانہ مذہبی جبر کا زمانہ تھا۔ جب کہ سرکاری مذہب کے سواء کسی دوسرے مذہب کے لئے آزادی نہیں تھی اس کے برخلاف موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے اس بات کو نہ سمجھنے کی بناء پر یہ سمجھ لیا گیا کہ دعوت کے صحیح ہونے کی علامت حکمراں طبقہ کی مخالفت ہے۔

یہاں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ کہ برادر محترم سیاسی تعبیر کو غلط کہنے کی صرف ایک دلیل دے رہے ہیں وہ ہے حکمراں طبقہ کا مدمقابل اور مخالف بن جانا جس کی بناء پر دعوت کے بہت سارے امکانات ختم ہو گئے اور نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کا جانی و مالی بھاری نقصان ہو رہا ہے اس پس منظر میں یہاں تین سوال اٹھتے ہیں۔

(۱) کیا واقعی زمانہ میں وہ تبدیلی ہوئی ہے جس کی نشاندہی کی گئی ہے؟

(۲) کیا واقعی دعوتِ اسلامی کی مخالفت ہمیشہ کی گئی ہے اگر کی گئی ہے تو کیوں؟

(۳) دعوت اسلامی کے بنیادی اجزاء کیا ہیں؟

اب ہم ان سوالات کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ زمانہ کے حالات بدلتے رہتے ہیں کوئی دور تھا جب کہ سارے کام پتھر سے لئے جاتے تھے جس کو پتھر کا دور کہا جاتا ہے اس کے بعد لوہے کا دور آیا اور انسان اپنی بیشتر ضروریات پوری کرنے کے لئے لوہا استعمال کرنے لگا اسی طرح موجودہ دور اپنی خصوصیات کی بناء پر سائنس اور ٹکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زمانہ کی ساری تبدیلیوں کے باوجود انسان انسان ہی رہا۔ اس کی فطرت اور نفسیات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے اور نہ آسکتی ہے۔ انسان ہی کیا قدرت نے اول دن جس شئ کو جس خاصیت کے ساتھ پیدا فرمایا ہے وہ خاصیت اس کے ساتھ قیامت تک لگی رہے گی اس طرح انسان پہلے دن جیسا تھا آخری دن بھی ویسا ہی رہے گا۔ اس کی فطرت میں تبدیلی ہونے والی نہیں ہے۔

اس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ حالات بدلے ہیں مختلف میدانوں میں ان گنت ترقیاں اور تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور انسان نے ہر میدان میں فنی اور انتظامی لحاظ سے اپنے معاملات زندگی کو منظم کیا ہے یہ چیز سماجیات، اقتصادیات اور سیاسیات سبھی شعبوں میں دیکھی جاسکتی ہے ہر چیز کو ایک فن اور سبجیکٹ بنا کر محنت کی جارہی ہے

ایسی حالت میں ہر شعبۂ زندگی میں ردوبدل ہوگا اور ترقی بھی ہوگی مثلاً آجر اور مستجیر کے درمیان تعلق کیا ہو ان دونوں کے حقوق کیا ہیں۔ ان کو الگ الگ کن باتوں کا پابند ہونا چاہئے؟

یہ سوالات اور مسائل ہمیشہ سے رہے ہیں۔ لیکن پہلے کے مقابلے میں آج ان کو زیادہ منظم کیا گیا ہے اسی طرح حکمراں اور رعایا کے باہمی ربط و تعلق اور حقوق کو دفعہ واری انداز میں منظم اور مرتب کیا گیا ہے خاندان کا دائرہ کیا ہے سماجی حد کیا ہے سیاست کا عمل دخل کہاں تک رہے اسی پس منظر میں مذہب اور سیاست کو دو خانوں میں بانٹ کر دونوں کی سرحدیں متعین کر دی گئی ہیں یہ ایک طرح کا بندوبست اپنایا گیا ہے تاکہ ٹکراؤ سے بچا جائے۔ مگر اس کے باوجود مذہب اور سیاست کا تصادم ہوتا رہتا ہے بلکہ ہوتا رہا ہے اس کی وجہ یہ بتانا کہ پہلے زمانہ میں حکمراں کا مذہب قبول کرنا ہر شخص کے لئے ضروری تھا۔ اس لئے ٹکراؤ ہو رہا تھا خلاف واقعہ اور فضول سی توجیہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام ساڑھے نو سو برس تبلیغ کرتے رہے اور مخالفتوں کا سامنا کرتے رہے یعنی اتنی طویل مدت تک حکمراں طبقہ کا دین آپ نے قبول نہیں کیا۔ مصر میں بنی اسرائیل خواہ کتنے ہی بے عمل اور بگڑے ہوئے تھے لیکن کہیں سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ انہوں نے فرعون کا دین قبول کر لیا ہو۔ جیسے تیسے بہرصورت وہ مسلمان کی حیثیت میں اپنی الگ شناخت رکھتے تھے۔ اگر وہ ویسے ہی پڑے رہتے اور موسیٰ علیہ السلام ان کو وعظ سناتے رہتے تو کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ مسئلہ اس وقت کھڑا ہوا جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے دربار میں دعوت حق لے کر پہنچے اور کہا کہ اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو بنی اسرائیل پر ظلم و ستم بند کرو۔ فرعون نے یہ نہیں کہا کہ تم اپنے گھر میں میرے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کیوں کرتے ہو؟ بلکہ موسیٰ علیہ السلام نے جا کر کہا کہ تم حاکم نہیں ہو۔ تم بندے ہو۔ سرکشی چھوڑو۔ بندگی اختیار کرو۔

اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کا معاملہ ہے پہلے نمرود نے یہ سوال نہیں اٹھایا کہ تم دوسرے مذہب کو کیوں مانتے ہو؟ میرے مذہب کو قبول کرو۔ چھیڑا تو پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر، بے زور، کمزور اور عاجز پتھر کی مورتیوں کو کیسے پوجتے ہو! اللہ کی عبادت کرو اور میری اطاعت کرو۔ اسی طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معاملہ ہے سرداران قریش نے آکر نہیں کہا کہ ہمارے تین سو ساٹھ بتوں کو کیوں نہیں پوجتے۔ وہاں تو بڑی آزادی تھی۔ ہر قبیلہ کا ایک الگ بت تھا۔ بڑی سیکولر فضاء تھی۔

کشمکش اس وقت شروع ہوئی جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی لوگوں کو بلا کر صاف صاف بتا دیا کہ تم جس راہ پر چل رہے ہو وہ ہلاکت کی طرف جا رہی ہے کوہ صفا پر چڑھ کر عام آواز لگائی، اللہ وحدہٗ لاشریک کی

عبادت اور اپنی اطاعت کی دعوت دی۔ گویا اعتراض یہ نہیں تھا کہ ایک شخص ہمارے عقیدہ کے سواء دوسرا عقیدہ کیوں رکھتا ہے بلکہ اعتراض کی بات یہ تھی کہ یہ شخص ہمارے عقیدہ کو غلط بتاتا ہے اور اپنے عقیدہ کو نہ صرف یہ کہ صحیح قرار دیتا ہے بلکہ اس کی تبلیغ اس انداز میں کرتا ہے کہ لوگ اپنے سابقہ عقیدہ کو چھوڑ کر اس کے پیرو کار بن جائیں۔ یہ وہ بات تھی جس نے تہلکہ مچادیا۔ مولانا حالیؔ نے اسی کو کہا ہے۔

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوت ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

پھر دیکھئے اللہ کے نبی ﷺ نے کسی موقع پر اس ضمن میں کمپرومائز کرنے کی کوشش نہیں کی البتہ فریق مخالف کی طرف سے بار بار کوشش کی گئی کہ تھوڑی کمی بیشی کر کے کشمکش کو ختم کیا جائے لیکن اللہ کے رسول ﷺ اپنے موقف سے ذرہ برابر ہٹنے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ اس رخ سے تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آئے گا پہلے اور اب کو اس طرح تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ اب مذہبی آزادی کا دور ہے اور پہلے مذہبی جبر کا دور تھا۔ یہ تاریخ کا نہایت سطحی مطالعہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب بے لاگ لپیٹ اور غیر لچکدار انبیائی طریق دعوت اپنایا جائے گا تو کشمکش اور محاذ آرائی سے مفر نہیں ہوگا۔

اس دور میں ترقی یہ ہوئی ہے کہ مذہب اور سیاست کی قدیم لڑائی کو ختم کرنے کے لئے اہل سیاست نے صلح کی ایک راہ نکالی ہے اہل مذہب کی طرف سے نہیں بلکہ اہل سیاست کی جانب سے کمپرومائز کی کوشش کی گئی ہے اور چونکہ اہل سیاست کے پاس سارے وسائل و ذرائع ہیں اس لئے انہوں نے اپنے مؤثر ترین ذرائع ابلاغ اور اپنی اعلیٰ تکنیک سے کام لیتے ہوئے ایسی فضاء پیدا کر دی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ایسا ہونا ہی چاہئے کہ مذہب سیاست میں دخل نہ دے۔ بلکہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سیاسی میدان میں آج جو سب سے بڑی گالی دی جاسکتی ہے وہ یہی ہے کہ فلاں شخص مذہب اور سیاست کو خلط ملط کر رہا ہے اور دوسری طرف مذہبی لوگ حالات کے دباؤ کے تحت گوشہ نشینی کو ترجیح دینے پر مجبور ہو گئے مذہب اور سیاست کے درمیان صلح کے جس فارمولہ کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا نام ہے سیکولرزم۔ اہل سیاست کی یہاں بھی یہ ایک عیاری اور فریب کاری دیکھی جاسکتی ہے کہ وہ عام طور پر سیکولرزم کے ایک رخ کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں کہ سیکولرزم کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا۔ کسی مذہب کی طرفداری حکومت نہیں کرے گی۔ اس نظام حکومت میں تمام مذاہب کو یکساں حقوق حاصل ہوں گے۔ سیکولرزم کے دوسرے رخ کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ وہ یہ کہ کسی مذہب کو سیاسی اور اجتماعی امور میں دخل دینے کا حق نہیں ہوگا۔ مذہب کا دائرہ پرائیویٹ زندگی سے آگے

نہیں ہے۔سیکولرزم کا یہ دوسرا رخ بھی کوئی نظری نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ جن کے مذہب میں اجتماعی زندگی کے امور ومعاملات سے متعلق ہدایات اور تعلیمات نہیں ہیں ان کا اس فریب میں مبتلا ہونا قرین قیاس ہے لیکن جن کا مذہب نجی زندگی، خاندان، معاشرہ، سوسائٹی اور امور مملکت وسیاست سے یکساں طور پر بحث کرتا ہے اور جن کا دعوی ہے کہ ان کا مذہب ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہے اور اس کے کسی بھی جزء کو چھوڑ نا بھاری جرم ہوتا ہے۔ان کا سیکولرزم کے فریب میں مبتلا ہونا کیا معنی رکھتا ہے وہ لوگ آخر کس طرح مذہب کی اجتماعی زندگی سے متعلق تعلیمات کو نظرانداز کرسکتے ہیں؟ چنانچہ یہ ایک صاف بات ہے کہ ایک غیر مسلم نے ابھی حال میں لکھا ہے کہ جو لوگ اپنے مذہب کے متعلق ہمہ گیر اور جامع نظام زندگی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے منہ سے سیکولرزم کی بات ناقابل فہم ہے۔

غرض یہ کہ مذہبی جبر اور مذہبی آزادی کے دو زمانوں میں حالات زمانہ کو تقسیم کرنا بالکل ایک مفروضہ ہے جس کا کوئی سر ہے اور نہ پیر۔کبھی پہلے سراسر جبر کا دور تھا اور نہ اب سراسر مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔

پہلے بھی حکمراں طبقہ اپنے مصالح کے تحت جبر یا آزادی کی پالیسی اختیار کرتے تھے اور آج بھی سیکولر حکومتیں خالص اپنی مصلحتوں کو سامنے رکھ کر جبر پر مبنی یا آزادی پر مبنی پالیسیاں بناتی ہیں اور رویہ اختیار کرتی ہیں۔آج ایک حد تو وہ ہے کہ جس میں مذہب کا نام لینا ثابت ہوجائے تو بحیثیت ممبر پارلیمنٹ وممبر اسمبلی کامیاب آدمی ناکام قرار دے دیا جائے گا۔جرم قتل کی سزا بھگتنے والا آدمی جیل میں بیٹھ کر پارلیمنٹ کی سیٹ جیت سکتا ہے لیکن ایک مذہبی آدمی اپنی مذہبی حیثیت میں نہ پارلیمنٹ کی ممبری کا امیدوار بن سکتا ہے نہ سیاسی فیلڈ میں کام کرسکتا ہے اور اگر وہ کرتا ہے تو نااہل قرار دیا جائے گا۔دوسری حد وہ ہے جہاں آزادی دی گئی ہے وہ آزادی بھی بسااوقات سلب کرلی جاتی ہے مثلاً کئی مواقع پر ایسا ہوا ہے کہ مساجد میں جمعہ کی نماز نہیں ہوسکی۔اور جس نے مسجد میں پہنچنے کی کوشش کی وہ پکڑا گیا اس لئے کہ انتظامی لحاظ سے جو قانون لاگو کیا گیا ہوتا ہے وہ ان خاص حالات میں اجازت نہیں دیتا کہ کوئی شخص گھر سے باہر قدم نکالے۔

ا۔ہندوستان کے بڑے علاقہ میں گائے کی قربانی نہیں کی جاسکتی۔کیوں؟

اس لئے کہ اکثریتی طبقہ کو یہ چیز ناپسند ہے۔سیکولر نظام نے مذہبی آزادی دی ہے تو آخر اس کی حفاظت کیوں نہیں کی جاتی۔بابری مسجد میں سینکڑوں برس سے نماز پڑھی جارہی تھی جب انتظامی مصلحتوں کا تقاضا ہوا نمازیوں کے لئے مسجد بند کردی گئی اور پچاس سال کے عرصہ میں بھی سیکولر عدالت کوئی فیصلہ نہ کرسکی۔نقصِ امن کے اندیشہ

کے تحت نمازی کو مسجد میں داخل ہونے سے روک دیا گیا لیکن دوسری طرف دن کی روشنی میں مسجد کو منہدم کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر اس کی جگہ مندر تعمیر کیا جاتا ہے اور جب وہ اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں تو پورے اعزاز کے ساتھ بحفاظت انہیں ان کے گھروں تک پہنچایا جاتا ہے یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ حکمراں طبقہ کی مصلحتوں کا یہی تقاضا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

۲ ۔ کیا واقعی دعوتِ اسلامی کی ہمیشہ مخالفت کی گئی ہے اگر ایسا ہے تو کیوں؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا سب سے معتبر ماخذ قرآن کریم ہے قرآن میں کل چھبیس[۲۶] انبیاء کرام کا ذکر آیا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی اس حیثیت سے نہیں پیش کیا گیا ہے کہ فلاں نبی کے حسن سیرت، حسن کردار اور حسن سلوک کی بناء پر قوم نے ان کی واہ واہ کی اور ہاتھوں ہاتھ لیا یا فلاں نبی نے اعلیٰ درجہ کی حکمت، موعظۂ حسنہ اور مجادلۂ احسن کے ساتھ دعوت پیش کی کہ پوری قوم گرویدہ ہو کر حلقہ بگوش ایمان ہو گئی اس کے برخلاف قرآن جو منظر پیش کرتا ہے اس کے لئے مندرجہ ذیل آیات اور ان کے سیاق وسباق پر نظر ڈالئے۔

قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. (آل عمران:۱۸۳)

ترجمہ: ان سے کہو تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لاتے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا ذکر تم کرتے ہو پھر تم نے ان رسولوں کو کیوں قتل کیا۔ اگر تم سچے ہو۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَیِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِیْرِ. (آل عمران:۱۸۴)

ترجمہ: اب اے نبی! اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِیْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ. (الانعام:۱۰)

ترجمہ: اے نبی! تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے، تو ان مذاق اڑانے والوں پر آخر کار وہی حقیقت مسلط ہو کر رہی جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ.

(الانعام:۱۱۲)

ترجمہ: اور ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے جو ایک دوسرے پر خوش آئند باتیں دھوکے اور فریب کے طور پر القاء کرتے رہے ہیں اگر تمہارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ وہ ایسا نہ کریں تو وہ کبھی نہ کرتے۔ پس تم انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ وہ اپنی افترا پردازیاں کرتے رہیں۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ ○ وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ الْـَٔيْكَةِ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ ○ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ.

(ص:۱۴-۱۲)

ترجمہ: ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور میخوں والا فرعون اور ثمود اور قوم لوط اور ایکہ والے جھٹلا چکے ہیں۔ جتھے وہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کو جھٹلایا اور میری عقوبت کا فیصلہ اس پر چسپاں ہو کر رہا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا. (الطلاق:۸)

ترجمہ: کتنی ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بری طرح سزا دی۔

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ (الانعام:۳۴)

ترجمہ: تم سے پہلے بہت سے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں مگر اس تکذیب پر اور ان اذیتوں پر جو انہیں پہنچائی گئیں انہوں نے صبر کیا یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی اللہ کی باتوں کو بدلنے کی طاقت کسی میں نہیں ہے اور پچھلے رسولوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کی خبریں تمہیں پہنچ ہی چکی ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (ال عمران:۲۱)

ترجمہ: جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلق خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے کے لئے اٹھیں ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ۭ كُلَّمَا جَاۗءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ. (المائدہ:۷۰)

ترجمہ: ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے مگر جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لیکر آیا تو کسی کو انہوں نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کر دیا۔

قرآن کی ان تصریحات کی روشنی میں یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ داعیان حق کو ہمیشہ کشمکش اور آزمائش سے گزرنا پڑا ہے ان کے ساتھ استہزا بھی کیا گیا مار پیٹ کی اذیت بھی دی گئی، گھر بار سے نکالا بھی گیا، قتل بھی کیا گیا، آرے سے جسم کو چیرا گیا اور سولی پر چڑھانے کی کوشش بھی کی گئی۔ غرض کوئی ایسی مصیبت نہیں ہے جو ان پر نہ ڈھائی گئی ہو اور یہ ایک ایسا تسلسل ہے جو کہیں ختم ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ آزمائش وابتلا بھی ایک نمایاں علامت ہے کسی دعوت کے دعوت حق ہونے کی تو اس کی تردید کیونکر کی جاسکتی ہے۔

اس حقیقت کو مزید ایک دوسرے رخ سے سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کیا جانا مفید ہوگا آلام ومصائب میں مبتلا کیا جانا اس لئے ضروری بتایا گیا ہے کہ اس کے بغیر سچے اور جھوٹے، کھرے اور کھوٹے کی تمیز نہیں ہوسکتی۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا۟ اَخْبَارَكُمْ
(سورۂ محمد:۳۱)

ترجمہ: اور ہم ضرور تم لوگوں کو آزمائش میں ڈالیں گے تاکہ تمہارے حالات کی جانچ کریں اور دیکھ لیں کہ تم میں مجاہد اور ثابت قدم کون ہیں۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ. (ال عمران:۱۸۶)

ترجمہ: مسلمانو! تمہیں مال وجان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے اگر ان سب حالات میں تم صبر وخدا ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۭ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۗءُ وَالضَّرَّاۗءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ. (البقرۃ:۲۱۴)

ترجمہ: پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے حتی کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی (اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ) ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔

تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کے مخاطبین کے درمیان کشمکش کا یہ تسلسل ظاہر ہے کہ بلا وجہ نہیں ہوسکتا ضرور بالضرور اس کے پیچھے کوئی وجہ ہوگی۔ وہ وجہ کیا ہے؟ ہمارا خیال ہے تھوڑے سے غور و تامل سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ یہاں موٹی موٹی تین وجوہ کو ہم بیان کرتے ہیں۔

پہلی وجہ:

انبیاء علیہم السلام کی دعوت مختصر لفظوں میں یوں ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ. (الشعراء:۱۴۴)

ترجمہ: اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

یہ الفاظ قرآن میں نو دس بار آئے ہیں۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ. (الاعراف:۵۹)

ترجمہ: یعنی اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں ہے میں تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

تقویٰ، احسان اور نیکی و بھلائی کی بات کی جائے تو کوئی ایسا نہیں ہوگا جو ناک بھوں چڑھائے سب کو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں بلکہ ہر سننے والا سر دھنتا اور واہ واہ کرتا ہے لیکن اسی کے ساتھ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ فلاں فلاں کام نہ کرو اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرو تو بات میں تلخی پیدا ہوجاتی ہے یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انبیاء علیہم السلام اور دوسرے عام نیکی اور بھلائی کا پرچار کرنے والوں کے درمیان فرق ہوجاتا ہے انبیاء علیہم السلام جہاں یہ کہتے ہیں کہ نیکی کرو۔ وہیں یہ بھی کہتے ہیں کہ ان برائیوں سے بچو۔اسی طرح جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کی عبادت کرو۔ وہیں یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور جتنے بھی خدائی کے دعویدار ہیں ان سب کو ٹھکرادو۔یہیں سے وہ کشمکش اور تصادم شروع ہوتا ہے جس کا ذکر پچھلے صفحات میں قرآنی آیات کی روشنی میں کیا گیا ہے چنانچہ شعیب علیہم السلام کی قوم نے حضرت شعیب علیہم السلام سے کہا:

قَالُوْا یٰشُعَیْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِیْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْنَا ضَعِیْفًا وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ وَمَاۤ اَنْتَ عَلَیْنَا بِعَزِیْزٍ. (ھود:۹۱)

ترجمہ: انہوں نے جواب دیا اے شعیب! تیری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آتیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تو ہمارے درمیان ایک بے زور آدمی ہے۔ تیری برادری نہ ہوتی تو ہم کبھی کا تجھے سنگسار کر چکے ہوتے۔ تیرا بل بوتا تو اتنا نہیں ہے کہ ہم پر بھاری ہو۔

دیکھئے حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کیا کہتی ہے:

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَاۤ اَتَنْهٰىنَاۤ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَاۤ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ. (ھود:۶۲)

ترجمہ: انہوں نے کہا اے صالح! اس سے پہلے تو ہمارے درمیان ایسا شخص تھا جس سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کیا تو ہمیں ان معبودوں کی پرستش سے روکنا چاہتا ہے جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے تو جس طریقے کی طرف ہمیں بلا رہا ہے اس کے بارے میں ہم کو سخت شبہ ہے جس نے ہمیں خلجان میں ڈال رکھا ہے۔

اللہ کی عبادت اور اللہ سے تقوی کی تلقین اور دعوت مثبت بات تھی جس سے کسی کو انکار نہیں ہوتا اور نہ کسی کو ناگواری گزرتی لیکن جب یہ کہا گیا کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اللہ کے علاوہ کسی کا خوف دل میں نہ رکھو اور فلاں فلاں کام نہ کرو تو تلخی کا پیدا ہونا یقینی ہو گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے بندگی رب کی دعوت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی بندگی اور عبادت کے انکار کی بات کہی اور منکرات سے اجتناب کی نصیحت کی تو قوم کے لوگ اس کو برداشت نہ کر سکے اور وہ جس انتہاء کو پہنچے اس کا تذکرہ ابھی اوپر کیا گیا۔ ایسے ہی ہر نبی نے مثبت اور منفی دعوت کے ساتھ ساتھ اپنے زمانہ کے نمایاں فحشاء اور منکرات کے خلاف مؤثر آواز بھی اٹھائی ہے ظاہر ہے کہ زمانہ اس کو کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا تھا!

دوسری وجہ:

مثبت اور منفی، جامع اور مانع دعوت بھی گوارا ہو سکتی تھی لیکن اگر تھوڑی رواداری اور نرمی سے کام لیا جاتا اور ذرا لچک دار پالیسی اپنائی جاتی۔ مصلحت اور ہوشیاری کو پیش نظر رکھا جاتا اور خطرات کو خود دعوت دینے کی ابتداء اپنے ہاتھوں نہ کی جاتی۔ چنانچہ اس پہلو سے انبیاء علیہم السلام کا کیا موقف ہے؟ اسے مندرجہ ذیل آیات میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ○وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ. (القلم:۹-۸)

ترجمہ: لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ، یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا○ (بنی اسرائیل: ۷۴-۷۳)

ترجمہ: اے نبی! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنہ میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے۔ تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ. (ھود: ۱۱۳-۱۱۲)

ترجمہ: پس اے نبی اور تمہارے وہ ساتھی جو پلٹ آتے ہیں ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی اور سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

معلوم ہوا کہ دعوت کے باب میں مداہنت، مصلحت پرستی، ظالموں کی رو رعایت اور ان کی طرف جھکاؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی داعی اس نکتہ کو مدنظر نہیں رکھتا تو کار دعوت اس کے لئے باعث اجر وثواب ہونے کے بجائے سخت گرفت کا سبب ہوگا۔ حکمت دعوت کے نام پر جس مصلحت پرستی اور مداہنت کا آج عموماً مظاہرہ کیا جا رہا ہے وہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اللہ کے روبرو حساب کے تصور کے ساتھ اپنی فکر اور اپنے عمل کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اللہ ہمیں اس فتنہ سے محفوظ رکھے۔ آمین!

تیسری وجہ:

ایک اور رخ سے دیکھئے کہ دعوتِ اسلامی کا اللہ کی عبادت، تقویٰ، توکل، انابت اور برائیوں کے ترک کے

علاوہ ایک اہم جز یہ ہے کہ اللہ کے نبی کہتے ہیں اطیعونی (کہ میری اطاعت کرو) چنانچہ قرآن نے یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ......

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ. (النساء:٦٤)

ترجمہ: یعنی جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں اس لئے بھیجے ہیں کہ اللہ کے حکم سے ان کی اطاعت کی جائے۔

دعوت کا یہ جز انتہائی اہمیت کا حامل ہے اس سے زمین پر قیادت، حکمرانی اور پیشوائی کا دعوی کرنے والوں کی کرسی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور قائد کو پیرو اور متبوع کو تابع بن جانے کا الٹی میٹم دیدیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی سلطان کائنات کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے بجا طور پر بلا کسی قید وشرط کے وہ اپنی اطاعت کا مطالبہ کرے گا اور خود کسی کی تابعداری ماتحتی اور محکومیت قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ کا ہر نمرود، فرعون، ابوجہل و ابولہب۔ حضرات انبیاء کرام خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حبیب خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درپۓ آزار ہوگئے اور اس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے جب تک اللہ کے نبی کو ملک بدر نہیں کر دیا بلکہ ملک بدر کرنے کے بعد بھی چین سے نہیں رہنے دیا کہ مبادا کہیں طاقت میں آ کر ہمارے لئے خطرہ نہ بن جائیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب فرعون کے سامنے اپنی دعوت پیش کی تو فرعونی حکومت کے بڑے لوگوں نے عوام سے کہا کہ یہ شخص تم کو تمہارے ملک سے بے دخل کر دینا چاہتا ہے سوال یہ ہے کہ فرعونی حکومت نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معاملے کو اتنی اہمیت کیوں دی؟ جب کہ ان کے ساتھ اس وقت ان کے بھائی کے علاوہ کوئی دوسرا ان کا معاون ومددگار نہ تھا۔

اگر ایک غلام قوم کا بے سروسامان آدمی یکا یک اُٹھ کر فرعون جیسے بادشاہ کے دربار میں کھڑا ہوتا ہے جو شام سے لیبیاء تک اور بحر روم کے ساحل سے حبش تک کے عظیم الشان ملک کا نہ صرف مطلق العنان بادشاہ بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔ تو محض اس کے اس فعل سے کہ اس نے ایک لاٹھی کو اژدہا بنا دیا اتنی بڑی سلطنت کو یہ خطرہ کیسے لاحق ہوجاتا ہے کہ یہ اکیلا انسان سلطنت مصر کا تختہ الٹ دے گا اور شاہی خاندان کو حکمران طبقے سمیت ملک کے اقتدار سے بے دخل کر دے گا؟ پھر یہ سیاسی انقلاب کا خطرہ آخر پیدا بھی کیوں ہوا جب کہ اس شخص نے صرف نبوت کا دعوی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ ہی پیش کیا تھا اور کسی قسم کی سیاسی گفتگو سرے سے چھیڑی ہی نہ تھی؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعوائے نبوت اپنے اندر خود یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ دراصل پورے

نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں، جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی شامل ہے۔ کسی شخص کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس بات کو متضمّن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کھلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی مطیع اور رعیت بن کر رہنے کے لئے نہیں آتا بلکہ مطاع اور راعی بننے ہی کے لئے آیا کرتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کر لینا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے رسالت کا دعوی سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت کے سامنے سیاسی و معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔

نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کو صادق و امین کہا جاتا تھا اور مکارم اخلاق کا اعلیٰ نمونہ لوگ سمجھتے تھے لیکن جب آپ نے کھل کر اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو مکہ کے ماحول میں جیسے ایک زلزلہ آ گیا اور قریش اٹھ پڑے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غیر اللہ کی الوہیت کے انکار اور رسالت و آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکمل طور پر اس رسالت کے حوالے کر دیا جائے اور اس کی بے چوں و چرا اطاعت کی جائے، یعنی اس طرح کہ دوسرے تو درکنار خود اپنی جان اور مال تک کے بارے میں کوئی اختیار نہ رہے اور اس کے معنی یہ تھے کہ مکہ والوں کو دینی رنگ میں اہل عرب پر جو بڑائی اور برتری حاصل تھی اس کا صفایا ہو جائے گا اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی کے مقابلہ میں انہیں اپنی مرضی پر عمل پیرا ہونے کا اختیار نہ رہے گا یعنی نچلے طبقے پر انہوں نے جو مظالم روا رکھے تھے اور صبح و شام جن برائیوں میں لت پت رہتے تھے ان سے دست کش ہوتے ہی بنے گی۔ قریش اس مطلب کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے اس لئے ان کی طبیعت اس ''رسواء کن'' پوزیشن کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھی اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ایسا اس لئے ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانے کا مطلب تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں پورے طور پر آ جانا۔ اپنی خود رائی اور اپنے اقتدار سے دستبردار ہو کر مکمل طریقہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابع داری کو اختیار کر لینا۔ جس کے لئے وہ تیار نہ تھے۔

مسلمان کا قائدانہ مقام

برادرِ محترم کہتے ہیں:

> ''عصر حاضر میں اسلامی فکر کی تشکیل نو کا کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی زیادہ وہ مشکل بھی ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جس میں ایک طرف اگر عصر حاضر کا گہرا مطالعہ ضروری ہے تو اسی کے ساتھ یہ بھی لازم ہے کہ آدمی کو اسلام کی تعلیمات اور اس کی روح سے کامل درجہ کی واقفیت حاصل ہو۔ اس دوطرفہ شرط میں ادنی کمی بھی بھیانک غلطی تک پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس کی ایک مثال ''امامت اقوام'' کا وہ جدید نظریہ ہے جس کو کچھ مسلم مفکرین نے اسلام کی انقلابی تعبیر کے طور پر پیش کیا ہے اس نظریہ کے مطابق مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں۔ مسلمانوں کو خدا کی طرف سے یہ منصب عطا کیا گیا ہے کہ وہ ''انسانی حاکموں'' کو بزور تمام دنیا میں اقتدار سے ہٹائیں اور انسانوں کے اوپر خدا کی حکومت (عملی طور پر خود اپنی حکومت) قائم کر دیں۔

اس نام نہاد انقلابی نظریہ کے لئے قرآن یا حدیث رسولؐ میں کوئی دلیل نہیں۔ اس کی دلیل عہد صحابہ کے ایک واقعہ سے نکالی گئی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ ثانی عمر فاروقؓ کے زمانہ میں جب ایرانی حکومت سے مسلمانوں کا ٹکراؤ ہوا۔ تو اس دوران مسلم لشکر کے سردار سعد بن ابی وقاصؓ نے گفت وشنید کے لئے کچھ وفد ایرانی حکمرانوں کے یہاں بھیجے۔ ان میں سے ایک ربعی بن عامرؓ تھے۔ ربعی بن عامرؓ جب ایرانی سپہ سالار رستم کے دربار میں پہنچے تو رستم سے ان کی لمبی گفتگو ہوئی اس کا ایک حصہ یہ تھا۔

قال رستم ماجاء بکم قال اللّٰہ ابتعثنا واللّٰہ جاء بنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللّٰہ. (تاریخ طبری)

ترجمہ: رستم نے پوچھا کہ تم کس لئے ہمارے ملک میں آئے ہو انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ نے بھیجا ہے، اور ہم کو اللہ لے آیا ہے تا کہ وہ جس کو چاہے اس کو ہم بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔

صحابی کی اس تقریر سے مذکورہ سیاسی نظریہ نکالنا بلاشبہ ایک نامحمود جسارت ہے حتی کہ وہ اسلام کی تصویر کو بگاڑنے کے ہم معنی ہے۔ صحابی کے مذکورہ قول میں اسلام کی توسیعی انسانیت (Extended Humanity) کو بتایا گیا ہے۔ مگر عدم واقفیت کی بناء پر غلط تعبیر کر کے اس کو اسلام کی توسیعی سیاست (Extended Politics) کے معنی میں لیا گیا ہے۔ یہ یقینی طور پر صحابی کے ایک قول کی نہایت غلط توجیہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس وقت ایرانی حاکموں اور اہل اسلام کے درمیان جنگ پیش آئی۔ لیکن جنگ کی حیثیت پورے معاملہ میں محض اضافی یا اتفاقی تھی۔ وہ اس کا اصل مطلوب نہ تھی۔'' (صفحہ ۱۱-۱۲)

اوپر نقل کردہ اقتباس میں جو بات بڑے اونچے مقام سے برادر محترم نے فرمائی ہے وہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ جاننے کے لئے دو سوالوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

① یہ نظریہ کہ مسلمان سارے عالم کے قائد اور حاکم ہیں کیا دینی اعتبار سے صحیح ہے؟

② کیا اس نظریہ کا ماخذ عہد صحابہؓ کا محض ایک واقعہ ہے؟

اس موقع پر قرآن وسنت اور دینی دلائل سے تھوڑی دیر کے لئے قطع نظر کر کے سوچئے دنیا کی ہر قوم اور ہر گروہ کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات جان تک کی بازی لگا دیتا ہے یا کم از کم آرزو اور تمنا رکھتا ہے کہ وہ اقوام عالم کا

قائد اور حاکم بنے اس کے لئے اپنی نئی نسل کے اندر ذہنی بیداری، ہمت اور حوصلہ مندی پیدا کرتا ہے ان کے اندر یہ شعور جگانے کے لئے ہر قسم کا جتن کرتا ہے کہ وہ اٹھے اور کم از کم اپنے ہمسایہ قوموں میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کرے۔ ہمارے ملک میں کوئی کمیونٹی ایسی نہیں ہے جس کے اندر اس طرح کی کوشش نہ ہو رہی ہو سکھ قوم کی کیفیات کا مطالعہ کیجئے۔ ہزاروں برس سے دبائے ہوئے مظلوم طبقوں کو دیکھئے ان کے اندر کس قدر یہ جذبہ موجزن ہے۔ علاوہ ازیں ہندو قوم کا مجموعہ قائد اور حاکم بننے کیلئے کیا کچھ نہیں کر رہا ہے اس تناظر میں اپنی پست ہمتی، مرعوبیت اور ذہنی وفکری زوال کو دیکھئے کہ غلبہ اور عزت حاصل کرنے اور دنیا کی قیادت ورہنمائی کرنے کی سوچ بھی ذہن ودماغ سے نکال دینے کی کوشش کی جارہی ہے اور یہ باور کرایا جارہا ہے کہ یہ سوچ نہ صرف یہ کہ تمہیں دنیا میں تباہ وبرباد کردے گی بلکہ آخرت میں بھی اس غیر مطلوب اور ناجائز تصور اور عمل کو لے کر جاؤ گے تو نجات وفلاح سے محروم ہو جاؤ گے تمہارے لئے امن وعافیت کی بس یہ راہ ہے کہ وقت کی غالب قوموں کے سامنے سر جھکائے ہوئے زندہ رہو تم کمزور ہو اقلیت میں ہو تمہارا کام ہر جبر وظلم کو صبر وشکر کے ساتھ جھیلتے رہنا ہے۔

بتایئے یہ طرزِ فکر کیا کسی قوم اور گروہ کو اپنے مقام پر باقی رکھ سکتا ہے چہ جائے کہ عزت اور وقار سے ہمکنار کرے؟ خصوصاً جبکہ یہ ماحول خارج سے بھی پیدا کیا جارہا ہے اور اندر سے بھی سیاسی دلائل دیئے جارہے ہوں اور دینی مقام پر بیٹھ کر دینی زبان اور دینی اصطلاحات میں بھی مسلمانوں کو مغلوبیت، محکومیت کی حالت میں مطمئن کرنے کی کوشش ہو رہی ہو۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کے زوال کی رفتار کتنی تیز ہو سکتی ہے اس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس بے عقلی اور مردہ دلی کو تعمیری اور حقیقت پسندانہ طرز فکر، بڑے طمطراق کے ساتھ بلکہ بڑی بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس کے بعد دین کے اصل سرچشموں یعنی کتاب وسنت میں تلاش کیجئے کہ کہیں امت مسلمہ کو محکوم ومغلوب بن کر جینے کی کوئی تلقین کی گئی ہے؟ چاہے آپ کتنے ہی دانشورانہ انداز میں اس سوال کا جواب ڈھونڈیں آپ کو ناکامی کے سواء کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف آپ پائیں گے کہ جو لوگ کفر سے نہ لڑ سکتے ہوں اور زیر کفر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش نہ کرتے ہوں ان کو سخت وعید سنائی گئی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء:۹۷)

ترجمہ: جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم

کس حال میں مبتلا تھے انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے۔

بنی اسرائیل فرعون کی غلامی میں پڑے ہوئے تھے اس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا اور فرمایا:

فَأْتِيَاهُ فَقُولَا إِنَّا رَسُولَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنَاكَ بِآيَةٍ مِّن رَّبِّكَ وَالسَّلَامُ عَلَىٰ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَىٰ (طٰہٰ:۴۷)

ترجمہ: جاؤ اس کے پاس اور کہو کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کے لئے چھوڑ دے اور ان کو تکلیف نہ دے۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی نشانی لے کر آئے ہیں۔ اور سلامتی ہے اس کیلئے جو راہ راست کی پیروی کرے۔

قرآن میں موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت بکثرت بیان ہوئی ہے اس پوری سرگزشت میں کہیں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون سے کچھ حقوق اور مراعات مانگ کر مصر میں محکوم قوم کی حیثیت سے زندہ اور باقی رہنے کی خواہش کرتے ہوئے نظر نہیں آتے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا ایک مقصد اللہ وحدہ لاشریک کی بندگی کی دعوت اور دوسرا مقصد بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکالنا تھا، پھر قرآن میں امت مسلمہ کے بارے میں فرمایا گیا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ. (آل عمران:۱۱۰)

ترجمہ: اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

یہ خیر امت کا منصب اور معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا یہ کام کوئی مقہور و مغلوب اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والا گروہ کرسکتا ہے؟ کیا یہ لقب مسلمانوں کو قائدانہ اور حاکمانہ مقام پر نہیں کھڑا کرتا؟ اسی طرح شہادت حق کی ذمہ داری دے کر شہداء علی الناس کے منصب پر فائز کرنے کے کیا معنی ہیں؟ کیا شہادت اور قیادت قریب المعنی الفاظ نہیں ہیں؟ اور کیا یہ کام کوئی مرعوب اور مغلوب گروہ کرسکتا ہے؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ

قَوۡمٍ عَلٰۤی اَلَّا تَعۡدِلُوۡا اِعۡدِلُوۡا هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ. (المائدہ:۸)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

عدل وقسط قائم کرنے کی ذمہ داری کیا یہ تقاضہ نہیں کرتی کہ پہلے ظالم اور جابر لوگوں کے پنجۂ استبداد سے خود یہ گروہ آزاد ہو۔ جو ظالموں اور مفسدین کے زیر اثر اور تابع ہوگا وہ دنیا میں اپنے سے ظلم اور زیادتی کو دور نہیں کرسکتا وہ دوسرے مظلوموں کی کیا دادرسی کرے گا۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ احساس وشعور دلایا گیا ہے کہ تم اقوام عالم میں اونچا مقام رکھتے ہو، اپنے کو کمتر نہ سمجھو۔

فَلَا تَهِنُوۡا وَتَدۡعُوۡۤا اِلَی السَّلۡمِ وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمۡ وَلَنۡ یَّتِرَكُمۡ اَعۡمَالَكُمۡ. (سورۂ محمد:۳۵)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو احساس کمتری سے بچایا ہے اس لئے کہ جس گروہ میں یہ مرض پیدا ہوجائے گا وہ کسی میدان میں دوسروں سے آگے بڑھنے کی بات تو دور کی ہے وہ غیروں کی ہم سری بھی نہیں کرسکتا۔ جو فوج میدان میں نروس ہوگئی وہ میدان میں کیسے کھڑی رہ سکتی ہے اسی بناء پر سربراہوں کی پہلی کوشش ہوتی ہے کہ وہ فوج کے حوصلے کو قائم رکھیں۔ اور اگر حوصلہ باقی نہیں ہے تو سارے ساز و سامان اور اسلحے بیکار ہوجائیں گے۔ تعجب ہے ہمارے دانشوروں پر یہ نکتہ کیسے پوشیدہ ہے ایک طرف محکوم اور مغلوب بن کر زندہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں اور دوسری طرف یہ رونا روتے ہیں کہ مسلمان ہر میدان میں پیچھے ہورہے ہیں مرعوب اور محکوم ذہنیت کے لوگ پیچھے نہیں تو آگے کیسے رہیں گے!

ذیل کی آیت پر غور کیجئے! کیا پیغام دے رہی ہے امت مسلمہ کے لئے کونسی منزل کا تعین کرتی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَةَ عَنۡ یَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ. (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

ان آیات پر ادنیٰ تامل سے یہ بات ظاہر ہوجائے گی کہ مسلمان ملت کو جس منصب پر فائز کیا گیا ہے اور اس کے ذمہ جو کام لگایا گیا ہے اس کا تقاضہ ہے کہ مسلمان اپنی قائدانہ حیثیت کو ہمیشہ اپنے ذہن و دماغ میں مستحضر رکھیں اور کسی وقت بھی مغلوبیت، محکومیت اور تابعداری کی نفسیات میں مبتلا نہ ہوں ورنہ وہ نہ عدل وقسط کی گواہی دے سکتے ہیں نہ ہزیمت اور پسپائی کی دلدل سے نکل سکتے ہیں اور نہ کفار ومشرکین سے جزیہ وصول کرنے کی پوزیشن میں ہوسکتے ہیں بلکہ دوسروں کے ہمیشہ باجگزار بن کر رہیں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے برادر محترم کو یہی دوسری حالت زیادہ پسند ہے۔ لیکن کیوں پسند ہے اس کا جواب اک راز سربستہ ہے جس کو شاید وہ سمجھ رہے ہوں لیکن دوسروں کو سمجھا نہیں سکتے۔

پھر دیکھئے اللہ نے اپنے رسول کو کتاب دے کر بھیجا کس مقصد کے لئے؟ کیا وہ مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو کفر وشرک کی ظلمات سے نکال کر دین حق کی روشنی میں لائیں اور ادیان باطلہ پر دین حق کو غالب کردیں۔ سوچئے اللہ کے رسول ﷺ نے اس زمین پر کیا کارنامہ انجام دیا۔ وہ کارنامہ اس کے سواء کیا تھا کہ آپ ﷺ نے خدا کے بندوں کو خدا کے سامنے جھکایا اور انسانی زندگی پر قرآنی نظام قائم کیا اور تمام غیر اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کا خاتمہ کردیا۔ اس کے لئے آپ ﷺ نے جہاں افہام وتفہیم اور دعوت وتبلیغ سے کام لیا وہیں اسّی سے زیادہ مواقع پر آپ ﷺ نے لشکر بھی ترتیب دیا اور اٹھائیس[۲۸] بار آپ ﷺ بذات خود میدان جنگ میں آئے اور صرف کمان نہیں کی بلکہ کمان کے ساتھ ساتھ ایک سپاہی کی طرح لڑے اور زخم کھائے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا اس کی آپ کیا توجیہ کریں گے؟

آج اگر مسلمان اپنے نبیؐ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق دنیا کی قیادت ورہنمائی اپنا فریضہ سمجھتے ہیں اور اس منصب پر پہنچنے کی آرزو رکھتے ہیں اور اس کے لئے کچھ تگ ودو کرتے ہیں تو وہ کیونکر قابل تنقید اور لائق ملامت ہیں؟ لائق ملامت تو وہ ہیں جو وقت کے نمرود، فرعون اور ابوجہل کے سامنے سرنگوں ہوکر زندگی گزار لینے کو ہی حاصل زندگی اور کمال زندگی سمجھتے ہیں۔ جو باطل نظریات اور ان کے علمبرداروں کی واہ واہ کرتے ہیں لیکن حق کے علمبرداروں پر اپنے تیر ونشتر چلانے کے لئے مستعد رہتے ہیں۔ باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت نہیں کرتے۔ مسجد کے حق میں ایک لفظ بھی نہ بول کر مندر کے لئے فضاء ہموار کرتے ہیں۔ اہل حق کو چھوڑ کر باطل کے ایجنٹوں کی تائید میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں۔ حسن البناؒ، قطب شہیدؒ، مودودیؒ

اور ابوالحسن علی ندویؒ پر وار پر وار کرتے ہیں لیکن ارون شوری، کلدیپ نیئر اور اڈوانی کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں اور پوری ملت کو ان کے چرنوں میں گرنے کیلئے ذہنی طور پر آمادہ کرنے کے واسطے اپنی ساری صلاحیتوں کو لگا دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

یہ کوئی فلسفہ نہیں ہے بلکہ کھلی آنکھوں دیکھی جانے والی چیز ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے کسی کے تابع اور محکوم بن کر زندہ رہنا گوارا نہیں کیا بلکہ زندگی اس انداز میں گزاری کہ لوگوں کو اپنی قیادت میں چلائیں اپنی بات منوائیں اور اپنے حکم کے سامنے لوگوں کو جھکائیں۔تو سوال یہ ہے کہ نبی ﷺ کے جانشین اور نبی ﷺ کے امتی اسوۂ رسول کو چھوڑ کر دوسروں کے تابع اور محکوم کیسے بن کر کے رہیں گے؟ لیکن پھر بھی اگر کوئی مسلمانوں کو کسی کی تابعداری اور محکومیت قبول کرنے کی تلقین کرتا ہے تو اس کو اسوۂ رسولؐ سے کیا نسبت ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ہر شخص اپنے دل میں سوچ لے۔

صحابیٔ رسول ﷺ کا قول

اب آیئے ایک صحابیٔ رسول کے قول پر ہم گفتگو کریں حضرت ربعی بن عامرؓ کی بات سے خود یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اس وقت ایران میں اللہ کی عبادت کے بجائے انسانوں کی عبادت ہو رہی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ عبادت کیا تھی؟ اس سوال کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں۔ایک تو یہ ہے کہ انسانوں کی عبادت سے مراد بتوں کی پوجا ہے تو اس صورت میں اگر عام انسانوں کو بت پرستی سے روکنے کے لئے حکمرانوں کو زیر کرنا ضروری ہو تو اس کے لئے جنگ کے سواء دوسرا راستہ کیا ہو سکتا ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنگ دینی عمل اور مطلوب عمل ہوگی یا محض سیاسی اور نا مطلوب عمل؟ اس سوال کا جواب بالکل صاف ہے کہ لوگوں کو بتوں کی عبادت سے روکنے کے لئے جو کارروائی بھی کی جائے گی اس کو نا مطلوب اور غیر دینی عمل نہیں کہا جا سکتا ورنہ ایران میں صحابۂ کرامؓ نے جو جنگ کی نعوذ باللہ وہ ایک نا مطلوب، سیاسی اور غیر دینی عمل ٹھہرے گا۔دوسری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ انسانوں کی عبادت سے مراد کچھ انسانوں کی قہاری اور جباری میں عام لوگوں کا غلام بن کر رہنا ہے تو اس صورت میں صاف ظاہر ہے کہ انسانوں کی عبادت سے اللہ کی عبادت کی طرف لانے کا مطلب لوگوں کو دین حق کے ماتحت کرنے کے سواء کیا ہوگا؟

''توسیعی انسانیت'' کیا چیز ہے اور اس کا مفہوم کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟ اس کی وضاحت چونکہ برادر محترم

نے نہیں کی ہے اس لئے ہم اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ البتہ ہم نے مانا کہ ایرانیوں سے جنگ ایک اضافی چیز تھی تو ایک اضافی عمل اگر صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے تو اس کے کرنے میں کیا قباحت ہے اور وہ کیوں بے سود ہے؟ اور وہ کیوں لائق ملامت ہے؟ لیکن جہاں تک جنگ کے اتفاقی ہونے کی بات ہے تو یہ بات بھی بالکل غلط اور نا قابل تسلیم ہے اس لئے کہ اتفاقی کہنا اس وقت صحیح ہوتا جب جاتے جاتے ناگہانی طور پر مڈبھیڑ اور ٹکراؤ ہو جاتا۔ یہاں تو صورتحال یہ ہے کہ بالقصد صحابہ کرامؓ گئے تھے اور پورے پلان کے ساتھ جا کر وہاں کہا تھا کہ ایسا ایسا کرو اور نہیں تو میدان میں آؤ۔ آخر اس کو اتفاقی واقعہ کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ اس طرح کے واقعات تاریخ اسلام میں مسلسل ملتے ہیں۔

ان پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ برادر محترم ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کا کوئی سر پیر نہیں ہے اور جس کے لئے نہ کتاب وسنت سے کوئی دلیل مل سکتی ہے اور نہ تاریخ اسلامی سے۔ بس ایک مفروضہ ہے جس کو ثابت کرنے کے لئے زور قلم دکھایا جا رہا ہے اس موقع پر برادر محترم کی زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں عمومی مساوات، اخوت ومحبت اور انسانیت کی ٹھنڈی ہوائیں چلانا ایک اضافی عمل ہے اور اصل مقصود کا لازمی نتیجہ ہے اصل مقصود توحید ربوبیت اور توحید الہ ہے جس کو کسی حال میں نہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ پس پشت ڈالا جا سکتا ہے یعنی اخوت ومحبت کے لئے توحید کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی ہجرت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اس کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی کہ کسی نبی نے اخوت ومحبت اور قومی یکجہتی کے حصول کے واسطے توحید اور توحید کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیا یا اس سلسلے میں کسی مصالحت، مداہنت اور نرمی سے کام لیا ہو۔

بعض مواقع پر برادر محترم نے اضافی اور مقصود کی دو تقسیمیں کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ لوگ سطح پر ہیں اور میں بہت گہرائی میں پہنچا ہوا ہوں۔ مثلاً موصوف انابت اور توکل کو مقصود اور دوسری چیزوں کو اضافی یعنی غیر مقصود کہتے ہیں۔ حالانکہ بعض انہیں باتوں کا نہ ہونا عدم ایمان قرار دیا جاتا ہے جیسے جہاد میں شرکت نہ کرنا، اللہ، رسول کے فیصلے کو نہ ماننا، اور طاغوت کے پاس اپنا مقدمہ لے جانا وغیرہ اس چیز کو ایک اور پہلو سے دیکھئے اسی طرح کی ذہنیت کی بناء پر کئی لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کو بھی اضافی قرار دے کر دل کی نماز پڑھتے ہیں حتّٰی کہ جمعہ کی نماز میں بھی شرکت نہیں کرتے کہ اصل مقصود تو اللہ سے تعلق ہے اس کو دل کی آنکھوں سے دیکھنا ہے اور اس کا وصال حاصل کرنا ہے وغیرہ ذلک۔ اس اعتبار سے اضافی اور غیر اضافی کی تقسیم ایک گمراہ کن تقسیم ہے کیونکہ اصل چیز رضائے الٰہی کے حصول کیلئے سنت رسولؐ کے مطابق جہد وعمل ہے۔

گڈ مسلم اور گڈ انڈین

برادر محترم بڑے دعوی کے ساتھ لکھتے ہیں:

''غیر مسلموں کی طرف سے یہ مسئلہ بار بار مختلف صورتوں میں اٹھایا گیا ہے۔ انگلش میگزین سنڈے (۱۹۔۲۵ر نومبر ۱۹۹۵ء) میں مسٹر ارون شوری کا ایک تفصیلی انٹرویو چھپا ہے۔ اس میں انہوں نے یہ کہا ہے کہ ایک شخص اگر گڈ مسلم ہے تو وہ گڈ انڈین (یا گڈ فرنچ، گڈ جرمن) نہیں ہوسکتا۔

۲۸ر نومبر ۱۹۹۵ء کو میں نے یہ انٹرویو پڑھا۔ اس کے فوراً بعد میں نے مسٹر ارون شوری کو ٹیلی فون کیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیسی بات آپ نے کہہ دی۔ آپ کی تعریف کے مطابق، میں گڈ مسلم ہوں مگر اسی کے ساتھ میں ایک گڈ انڈین بھی ہوں۔ میں نے کہا کہ اگر میں گڈ انڈین نہیں ہوں تو سارے ملک میں کوئی بھی شخص گڈ انڈین نہیں۔ حتی کہ میں کہوں گا کہ اگر کوئی شخص مجھ کو گڈ انڈین نہ مانے تو اس کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مہاتما گاندھی بھی گڈ انڈین نہیں تھے۔

مسٹر ارون شوری نے فوراً اس کی تردید کی۔ انہوں نے کہا کہ میں تو آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ آپ پورے معنوں میں ایک گڈ انڈین ہیں۔ میں نے اپنے انٹرویو میں آپ کا نام لے کر آپ کی بہت تعریف کی تھی۔ مگر میگزین والوں نے میرا پورا انٹرویو نہیں چھاپا۔

مگر سوال کسی ایک فرد کے گڈ انڈین ہونے کا نہیں ہے بلکہ اصول کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ ایک شخص اچھا مسلمان ہوتے ہوئے کیا اچھا انڈین یا اچھا فرنچ بن سکتا ہے یا نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۸)

یہاں ذرا بھی معروضی انداز سے جو سوچے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ ارون شوری صحیح ہے اور ہمارے برادر محترم غلط ہیں ہم برادر محترم سے سوال کریں گے کہ فرض کیجئے دستور ہند کی روشنی میں ملک کی عدالت عالیہ سپریم کورٹ یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کا فیصلہ کردے یا قرآن پر بین لگادے یا انڈین فوج اسرائیل سے مل کر مکہ و مدینہ پر حملہ کردے تو ظاہر ہے ایک گڈ مسلم اور ایک گڈ انڈین دونوں کا فرض اور رول ایک نہیں ہوگا۔ ایک گڈ مسلم ان تینوں فیصلوں کے خلاف جائے گا اور ایک گڈ انڈین ان تینوں کی تائید کرے گا۔

آپ کو یہ سمجھنا چاہئے کہ دو متضاد چیزیں معمول کے حالات میں ایک ساتھ چلتی ہیں اس کو دیکھ کر یہ نہیں کہا جانا چاہئے کہ یہ متضاد نہیں ہیں۔ متضاد تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ کسی وقت یہ دونوں کی راہ الگ الگ ہوسکتی ہے۔ حقیقت پسندی کا یہی تقاضا ہے۔

ارون شوری کے خیال میں گڈ انڈین وہ ہوگا جو وطن پرست ہو۔ لیکن ایک گڈ مسلم وطن دوست ہوگا۔ وطن پرست نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام کی اپنے وطنوں سے ہجرت اس کے لئے شاہد عدل ہے۔

عالمی قومیت

برادر محترم تحریر کرتے ہیں……

''انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں سیاسی ضرورت کے تحت، نہ کہ شرعی تقاضے کے تحت ساری مسلم دنیا میں ایسی تحریکیں اٹھیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ ذہن دیا کہ اسلام ایک عالمی قومیت ہے اور مسلمان اس عالمی قومیت کے بین الاقوامی شہری ہیں پان اسلام ازم، خلافت تحریک، عالمی حکومت الٰہیہ، خدام کعبہ، الاخوان المسلمون، تحریک پاکستان وغیرہ سب نے کسی نہ کسی اعتبار سے مسلمانوں کے اندر اسی قسم کا ذہن بنایا۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ذہن آج شعوری یا غیر شعوری طور پر یہی ہے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ:۱۷)

شرعی تقاضے اور سیاسی ضرورت میں کیا کوئی ایسا تضاد ہے کہ یہ دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے؟ حالانکہ ایک ہی چیز سیاسی ضرورت بھی ہو سکتی ہے اور شرعی تقاضا بھی۔ مثلاً کسی مقام پر مسجد کو منہدم کرنے کے لئے کچھ لوگ جمع ہو جائیں تو شرعی تقاضا ہوگا کہ مسجد کے تحفظ کے لئے کمر بستہ ہوا جائے اور سیاسی ضرورت بھی کہ اگر اس موقع پر ہم چپکے بیٹھے رہیں گے تو دوسری اور تیسری مسجد بھی گرا دینے کی ہمت ہو جائے گی۔ کسی مسجد میں نماز سے روکا جا رہا ہو تو شرعی تقاضا بھی ہے اور سیاسی ضرورت بھی کہ حتی المقدور نماز پڑھنے کی کوشش کی جائے ورنہ ہماری کمزوری سے مخالفین کی ہمت مزید بڑھ جائے گی۔ پھر کیا سیاسی ضرورت کو شرعی تقاضا نہیں بول سکتے۔

طواف کعبہ میں رمل کی سنت کو آپ شرعی تقاضہ کہیں گے یا سیاسی ضرورت؟ دشمن کے نقل وحرکت کی خبر پا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فوجی دستہ ''سریہ'' روانہ کرتے تھے اس کو آپ کس خانہ میں رکھیں گے۔ دشمن کے تعاقب میں سستی نہ کرو۔ اسی طرح جہاد وقتال کے احکام نیز شریعت اسلامی میں حدود وتعزیرات کے بارے میں آپ کیا سوچتے ہیں؟ وہ شرعی تقاضے ہیں یا سیاسی ضرورت؟ الغرض زندگی میں بہت مواقع پر سیاسی ضرورت کو پورا کرنا شرعی تقاضا ہوتا ہے اس لئے سیاسی ضرورت کا نام دے کر کسی بات کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں تک عالمی اخوت کا ذہن اور تصور ہے وہ انیسویں اور بیسویں صدی کا ذہن نہیں ہے بلکہ یہ ذہن اسی دن پیدا کر دیا جاتا ہے جس دن آدمی کلمہ پڑھتا ہے۔ قرآنی آیت پر غور کیجئے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

(الحجرات:۱۰)

ترجمہ: مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی قرار دیا گیا ہے۔ کیا اس میں کوئی استثناء ہے یا کوئی قید لگی ہے کہ صرف ہندی مسلمان بھائی بھائی ہیں پاکستانی اور ایرانی اس برادری سے خارج ہیں یا صرف عرب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور دوسرے ملکوں کے مسلمان الگ ہیں۔ ظاہر ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی بتایا ہے۔ کیا عالمی قومیت نہیں ہے؟

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد ارشادات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سب کے سب جسد واحد کے مانند ہیں۔ جس طرح جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک مسلمان کی تکلیف کو دوسرے مسلمان محسوس کریں۔ خواہ ان میں کا ایک مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں۔ معلوم ہوا کہ ملت اسلامیہ کی وحدت دریا، پہاڑ اور مختلف ملکوں کی سرحدیں نہیں ختم کرسکتیں اور اگر ان وجوہ سے کوئی ملت اسلامیہ میں تفریق کرتا ہے تو وہ شرعی اور اسلامی لحاظ سے ناقابل اعتبار اور غلط ہے۔ اسلام ایک عالمی قومیت ہے۔ اس نظریہ سے اگر آج نظریات ٹکرا رہے ہیں تو کیسے ضروری ہوگیا کہ اپنا نظریہ چھوڑ کر موجودہ نظریات کو قبول کرلیا جائے۔ سیدھی سی بات ہے قومیت کے بہت سارے نظریات ہوسکتے ہیں لیکن ایک مسلمان کے لئے صحیح طرز عمل یہ ہوگا کہ جہاں تک اسلام کے عالمی اخوت سے ٹکراؤ نہ ہو وہاں تک ان کا بھی لحاظ کرے۔ اور جہاں یہ سوال پیدا ہوجائے کہ آپ وطنی قومیت میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا اسلامی قومیت میں تو آدمی اسلامی قومیت میں شامل رہنے کی بات کہے۔ الغرض وطنی قومیت کو تسلم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بشرطیکہ اسلام کی عالمی قومیت کی نفی نہ ہو۔

جو کوئی ملت اسلامیہ کو ایرانی۔ تورانی اور افغانی کے خانوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے اس کو اپنے قلب ونظر کے سارے گوشوں پر خود ناقدانہ نظر ڈال کر جائزہ لینا چاہئے کیونکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ جن کو اپنا مخالف سمجھتے ہیں ان کی ہر بات کو لازماً لائق ملامت ٹھہرائیں۔

سیاست کی اہمیت

> ’’قدیم زمانہ کے حالات میں صرف پولیٹکل ایمپائر ہی اصل اہمیت رکھتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں نے عالمی سطح پر اپنا ایک پولیٹکل ایمپائر بنایا مگر موجودہ زمانہ میں سیاست اور حکومت کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔ اب دوسری غیر سیاسی چیزوں نے اہمیت اختیار کرلی ہے۔ مگر موجودہ زمانے کے مصلحین اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے فائدہ طور پر سیاست کی چٹان پر اپنا سر ٹکراتے رہے۔ جب کہ عین اسی وقت ان کے لئے دوسرے مواقع کو استعمال کرکے دوبارہ زیادہ طاقتور انداز میں دعوہ ایمپائر بنانے کا امکان پوری طرح کھلا ہوا تھا۔‘‘
>
> (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۷-۲۸)

یہ ماضی اور حال دونوں کا ناقص ہی نہیں سراسر غلط مطالعہ ہے اس لئے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا شعبہ سیاسی شعبہ ہے۔ سیاست اور حکومت جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی کی بالادستی ہر شعبۂ زندگی میں ہوتی ہے اور اسی کو غالب کہا جاتا ہے اور بقیہ لوگ مغلوب اور محکوم ہوتے ہیں۔ کیا یہ کوئی سوچ سکتا ہے کہ سیاسی بالادستی کے بغیر کسی ملک میں سوشلزم، کمیونزم یا کسی دوسرے نظام کو قائم کیا جاسکتا ہے؟ اسی طرح سیاسی غلبہ کے بغیر ملک میں سودی نظام کے بغیر اسلام کا معاشی نظام جاری کیا جاسکتا ہے؟ موجودہ زمانہ میں کمیونیکشن کے جدید ذرائع داعی حق کیسے استعمال کرسکتا ہے؟ جبکہ شیطان کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں سیاست اور حکومت کی باگ ڈور ہے۔ انڈسٹری کو آزاد کہا جاتا ہے لیکن کیا جائز اور حلال دائرے میں رہ کر کوئی اس میدان میں کوئی بڑی کامیابی حاصل کرسکتا ہے؟ سیاسی ادارہ کے بغیر ایسی یونیورسٹیاں کیسے بنائی جاسکتی ہیں؟ جو ساری دنیا کے لئے علوم الٰہی کا سرچشمہ بن جائیں۔ ایسے ریڈیو اسٹیشن اور ٹی وی اسٹیشن کیسے قائم کئے جاسکتے ہیں؟ جہاں سے بیک وقت اہل عالم کو خطاب کیا جائے؟ ایسا اقتصادی ہاؤز کیسے بنایا جاسکتا ہے جہاں سے تمام اسلامی سرگرمیوں کو اپنی بنیاد پر جاری کیا جاسکے؟ جدید طرز کے اسپتال، جدید طرز کے رفاہی ادارے، معذور افراد کے لئے جدید معیار کی سہولتیں اور اس قسم کے دوسرے کام کسی حکومت کے اشتراک اور تعاون کے بغیر اعلیٰ ترین سطح پر کیسے کئے جاسکتے ہیں؟ یہ باتیں تو دور کی ہیں آپ ایک ''الرسالہ'' اور چند کتابیں بھی شائع نہیں کرسکتے اگر کسی صاحب اقتدار کی نوازش نہ ہو۔

معیار صحیح وغلط

> ''اورنگ زیب عالمگیر نے مختلف طاقتوں سے ٹکراؤ کیا تو اس کے سامنے اسلام کا صرف یہ حکم تھا کہ اسلام دشمن طاقتوں کو زیر کرو۔ اس کے بعد شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مرہٹوں کے خلاف جہاد کی اسکیم بنائی۔ سید احمد شہید بریلویؒ نے سکھوں کے خلاف جہاد کیا۔ علماء دیوبند نے انگریزوں سے جہاد بالسیف کیا۔ اس طرح کے تمام واقعات اسلام کے حکم ''دشمنوں سے مقابلہ کرو'' سے مستنبط کئے گئے تھے۔
>
> اسی طرح اقبال کا علیحدہ مسلم اسٹیٹ کا نظریہ اور تقسیم کے بعد اٹھنے والی مسلم پرسنل لاء تحریک، بابری مسجد تحریک اس قسم کی تمام تحریکیں تحفظ شریعت کے حکم سے اخذ کی گئی تھیں مگر موجودہ زمانہ میں اسلام اور مسلمانوں کے احیاء کے لئے اس کلی اجتہاد کی ضرورت تھی جو مجموعی مصالح شرعی کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ مگر تمام مصلحین صرف جزئی استنباط کی حد تک پہنچ سکے۔ وہ شریعت کے مجموعی مصالح کے پیش نظر کلی استنباط یا کلی اجتہاد کا ثبوت نہ دے سکے، اس لئے نہ ان کا استنباط مطابق حال تھا اور نہ وہ کسی حقیقی نتیجہ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ ۲۵۔۲۶)

یہاں برادر محترم کو جو چیز بتانی چاہئے تھی اس سے پہلو بچا کر نکل گئے۔ بتانا یہ تھا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ، اور علماء دیوبند نے اسلام کے حکم ''دشمنوں سے مقابلہ کرو'' سے مستنبط کیا۔ اس میں غلطی کیا ہے؟ غلطی تو اس وقت ہوتی جب وہ غیر اسلام کے کسی حکم سے استنباط کئے ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان بزرگوں نے استنباط نہیں کیا۔ استنباط کرنے کی ضرورت وہاں پڑتی ہے جہاں کوئی حکم موجود نہ ہو۔ یہاں تو دشمنوں سے لڑنے کا صریح حکم موجود تھا اور ہے۔ ان بزرگوں نے اس پر صرف عمل کیا۔ اگر یہ غلطی ہے تو واقعی انہوں نے غلط کیا۔ اسی طرح تحفظ شریعت کا حکم بھی موجود ہے جس کا آں محترم کو اعتراض ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ بزرگان دین اور برادر محترم کے نقطہ نظر میں فرق یہ ہے کہ جناب کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار دنیاوی فائدہ کے اعتبار سے کسی نتیجہ کا حاصل ہونا ہے جبکہ بزرگان دین کے نزدیک معیار اور کسوٹی کتاب وسنت کے مطابق ہونا ہے خواہ دنیا میں اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسی چیز کا نام استقامت ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریز ہندوستان چھوڑ دینے پر مجبور کسی ایک واقعہ یا کسی ایک شخصیت کے ڈر سے نہیں ہوا۔ جیسا کہ برادر محترم کا خیال ہے کہ گاندھی جی کے اجتہاد نے انگریز کو بھگایا۔ نہیں، انگریز کے جانے کا اصل سبب وہ جہد مسلسل ہے جس کی آخری علامت علماء دیوبند کی قربانیاں ہیں جہاد مسلسل کا تسلسل اگر نہیں ہوتا تو یہ منزل ہرگز نہیں آتی کہ انگریز ہندوستان کو گاندھی جی اور مسٹر جناح کے حوالے کر دیتے۔

اسلام کا اصل مقصد

> ''اسلام کا اصل مقصد دل کی دنیا کو بدلنا ہے نہ کہ ظاہری ڈھانچہ کو بدلنا، اسلام کا اصل مقصد اظہار ہے، اسلام کا اصل مقصد اقتدار نہیں۔ اسلام کا منشا نظریاتی غلبہ ہے نہ کہ محض سیاسی غلبہ۔ اسلام کا اصل مقصود جنت ہے، اسلام کا اصل مقصود حکومت نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۲۹)

یہ یہاں کھلے طور پر برادر محترم کی ذہنی بیماری ظاہر ہو رہی ہے اسلام کا مقصد دل کا بدلنا بھی ہے اور ہاتھ پیر اور پورے اعضاء وجوارح کو بدلنا بھی ہے۔ اسلام ایک مکمل دین ہے اس کا مقصد مکمل تبدیلی ہے وہ پوری زندگی کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے انسانی زندگی کا نجی شعبہ ہو یا خاندانی، معاشرتی ہو کہ سیاسی سب پر اسلام اللہ اور رسول ﷺ کی حکمرانی چاہتا ہے ہر جگہ سے منکرات اور منکرات کے ایجنٹوں کو نکالنا چاہتا ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ اصل مقصود حکومت ہے مقصود حکومت نہیں ہے۔ لیکن اصل مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے وضو مقصود نہیں ہے لیکن وضو کے بغیر نماز نہیں ہو سکتی اسی لئے وضو فرض ہے۔ معرکہ بدر وحنین مقصود نہیں تھے لیکن فتح مکہ کے لئے ضروری تھے۔ پھر فتح مکہ بھی مقصود نہیں تھا مگر تطہیر کعبہ کے لئے فتح مکہ لازمی تھا۔ نیز تطہیر کعبہ بھی مقصود نہیں لیکن رضاء الٰہی کے لئے کعبہ کو پاک کرنا لازمی تھا۔

جوگیوں، راہبوں اور سادھوؤں کی طرح اگر صرف دل کی دنیا ہی بدلنی ہوتی تو تاریخ دعوت وعزیمت بار بار دہرانے کی ضرورت نہ پڑتی اور اللہ کے پیارے نبیؐ غار حرا سے نہ نکلتے، مکہ میں قریش کی گالیاں نہ کھاتے، طائف میں پتھر کھانے کی نوبت نہ آتی اور بدر وحنین کے معرکوں میں شریک نہ ہوکر دنیا کا لطف اٹھاتے۔

برادر محترم اپنے اسی ذہنی مرض کے بناء پر ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''اب اگر کسی مقام پر اہل اسلام کو حکومتی ادارے میں غلبہ حاصل نہیں ہے تو اس پر انہیں کچھ ملال کرنے کی ضرورت نہیں۔''

گویا آں محترم کہنا چاہتے ہیں کہ اگر مسلمان ذلت اور پستی کی حالت میں ہوں خدا اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے بجائے طواغیت انس وجن اپنی خرافات پھیلا رہے ہوں، قرآن وسنت پر مبنی احکام وقوانین کے بجائے کفر وشرک وزندقہ والحاد کا دور دورہ ہو تو مسلمانوں کو کسی طرح کا ملال نہیں کرنا چاہئے۔ کیا سوچ ہے اللہ رے توبہ! شیطان کا بڑے سے بڑا ایجنٹ بھی کیا اس دھڑلے سے اس طرح کی نصیحت مسلمانوں کو کرنے کی جرات کرے گا؟

یہ کیا ذہنیت ہے!

برادر محترم تحریر کرتے ہیں:

''پروفیسر مشیر الحق یکم راگست 1933ء کو یوپی کے ضلع غازی پور میں پیدا ہوئے 15 راپریل 1990ء کو انہیں سری نگر میں شہید کر دیا گیا۔''

ہمیں پروفیسر مشیر الحق کو شہید کہنے پر کوئی اعتراض نہیں اللہ ان کی شہادت کو قبول فرمائے اور ان کے درجات کو بلند کرے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ کشمیر میں اپنی آزادی کیلئے لڑنے اور مرنے والوں کو دہشت پسند کا لقب دیا جاتا ہے اور سید احمد بریلوی کے ساتھیوں کیلئے ہلاکت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے؟ آخر یہ کیا ذہنیت ہے؟ چنانچہ فرماتے ہیں:

''یہ فتویٰ جاری رہا یہاں تک کہ 1831ء میں سید احمد بریلویؒ نے اپنے ساتھیوں کو لیکر عملی جہاد کیا جس میں تمام کے تمام لوگ ہلاک ہوگئے'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۴۰)

اقوام متحدہ

''علماء اپنی غیر مجتہدانہ سوچ کے تحت صرف ایک ہتھیار کو جانتے تھے اور وہ تشدد کا ہتھیار تھا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ ان کی جدوجہد آزادی کے لئے موجودہ زمانہ میں ایک عظیم تر نظریاتی ہتھیار وجود میں آچکا ہے۔ یہ ہتھیار وہ ہے جس کو حکومت خود اختیاری (Self Determination) کہا جاتا ہے۔ یہ تصور اٹھارویں صدی کے فرنچ

ریولیوشن کے دوران ظہور میں آ چکا تھا۔ جس نے قوموں کو یہ حق دیا کہ وہ تشدد کا استعمال کئے بغیر محض دلیل کی پرامن طاقت سے قومی آزادی کی موثر جدوجہد کرسکیں۔

پہلی عالمی جنگ کے بعد 1919ء میں بننے والی جمعیت اقوام League of Nations کے متعلق مسلمانوں کے رہنما علامہ اقبال صرف اتنا ہی جانتے تھے کہ وہ کفن چوروں کی انجمن ہے جو قبروں کی تقسیم کے لئے منظم کی گئی ہے۔

چیست جمعیت اقوام کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور را انجمنے ساختہ اند

مگر اصل حقیقت ہے کہ جمعیت اقوام نے پہلی بار انٹرنیشنل تصدیق سے یہ سیاسی معیار طئے کیا کہ ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے درمیان اپنی مرضی کی حکومت قائم کرے۔ پھر دوسری عالمی جنگ کے بعد 1945ء میں جب اقوام متحدہ United Nations بنائی گئی تو تمام قوموں کے اتفاق رائے سے یہ اصول آخری طور پر ایک مصدقہ سیاسی اصولوں کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔

مہاتما گاندھی نے عالمی سیاست کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ ان زمانی تبدیلیوں سے آگاہ تھے چنانچہ وہ ساؤتھ آفریقہ سے ہندوستان آئے اور اپنے ''سیکولر اجتہاد کے ذریعہ ہندوستان کے عوام نیز علماء کو بتایا کہ ہمیں اب تشددانہ ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں'' حکومت خود اختیاری'' کے نظریاتی ہتھیار کو ہم زیادہ موثر طور پر اپنے حق میں استعمال کرسکتے ہیں چنانچہ علماء کی مقلدانہ رائے پر گاندھی جی کی مجتہدانہ رائے برتر ثابت ہوئی اس کے بعد جو کچھ پیش آیا وہ اب تمام لوگوں کے لئے ایک معلوم تاریخ بن چکا ہے۔ (فکر اسلامی، صفحہ:۴۱-۴۲)

مذکورہ بالا لمبا اقتباس پڑھنے کے بعد مندرجہ ذیل باتوں پر غور کیجئے:

① ''حکومت خود اختیاری'' کا ہتھیار وجود میں آجانے کے بعد ایسا کیوں نہیں ہوا کہ تمام ممالک نے اپنی فوجوں کو ختم کردیا ہو۔ بلا وجہ ہر ملک اپنی قومی دولت کا ایک بڑا حصہ فوجوں اور ہتھیاروں پر خرچ کرتا ہے اسی طرح یہ کیوں نہیں ہوا کہ دنیا کی نظریاتی، طبقاتی، وطنی اور مذہبی گروہوں نے اپنی جدوجہد اور تگ ودو روک دی ہو۔

② جمعیت اقوام ہو یا اقوام متحدہ ہو ان کے اصولوں نے دنیا کے کتنے مسائل حل کئے ہیں اور کتنے کمزوروں کو انہوں نے ان کا حق دلایا ہے؟

③ کوئی ایسی مثال دیجئے کہ جس کے پاس قوت مدافعت نہیں تھی لیکن اقوام متحدہ کے اصولوں نے اس کا حق دلایا ہو۔ افغانستان سے حملہ آور روس کو قوت نے بھگایا یا دلیل نے؟ اس کے بعد بوسنیا، چیچنیاء کو جو آزادی بھی ملی ہے کیا دلیل کی بنیاد پر ملی ہے؟ افغانستان سے شکست کھا کر روس کے ٹوٹنے سے پہلے

اقوام متحدہ کے اصول اور دلائل کہاں تھے؟ ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہیں ہوگا کہ برادر محترم کی یا تو یہ سادہ لوحی ہے یا پھر کسی اسلام دشمن قوت کے شکار ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی بے سرو پیر کی باتیں مسلمانوں کے ذہنوں میں بیٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور ذرا بھی آگے پیچھے نہیں سوچ رہے ہیں اور اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ ''ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات۔''

۴) قرآن خدا کی آخری کتاب ہے قرآن میں قوت اور طاقت استعمال کرنے کی بار بار تاکید آئی ہے باطل اور اہل باطل کو دبانے یا مٹانے کیلئے۔ کیا اس طرح کے احکام اقوام متحدہ کے وجود میں آنے کے بعد کالعدم ہو گئے ہیں اور ''قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ'' اور ''وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ'' جیسی آیات منسوخ ہو گئی ہیں؟ اور کیا اب مسلمان خیر امت کے لقب کو، اس کے مقتضیات کو اور ''وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ'' کے تصور کو اپنے ذہن و دماغ سے کھرچ کر نکال دیں اور ہاتھ پیر توڑ کر بس بیٹھ جائیں کہ اب اقوام متحدہ کے امن چارٹ کے وجود میں آنے کے بعد کسی عملی جدو جہد کی ضرورت نہیں ہے۔

امام اور قائد کی حیثیت

''انیسویں صدی میں جب مغربی قومیں نئی طاقت سے مسلح ہو کر ابھریں اور انہوں نے ہر جگہ مسلمانوں کو مغلوب کر لیا تو تمام دنیا کے مسلم دانشور ''نحن خلفاء اللّٰہ فی الارض'' (ہم زمین پر خدا کے خلیفہ ہیں) کے اسی تصور میں سرشار تھے۔ وہ اپنی صرف ایک شناخت جانتے تھے اور وہ یہ کہ وہ زمین پر امام اور قائد کی حیثیت سے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ صورت حال آج تک پوری طرح باقی ہے ایک شاعر کے الفاظ میں اس فکر کا خلاصہ یہ ہے:

جس طرح احمد مختارؐ ہیں نبیوں میں امام
ان کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

اس ذہن کی بناء پر مسلم علماء اور دانشوروں کو کرنے کا ایک ہی کام نظر آیا۔ یہ کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی حاکمانہ حیثیت کو دوبارہ حاصل کریں۔ پچھلے تقریباً دو سو سال سے کسی نہ کسی صورت میں یہ جدو جہد جاری ہے۔ مگر ان گنت قربانیوں کے باوجود اس میدان میں مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۴۴)

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں ہے کہ مسلمان اب تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے اندازہ کیجئے اگر مسلمانوں نے ان گنت قربانیاں نہ دی ہوتیں اور آں محترم کے نظریہ کے مطابق بالکل سرنگوں ہو گئے ہوتے اور مخالف قوتوں کے مقابلہ میں سپر ڈال دی ہوتی تو آج ان کے زوال اور پستی کی کیا انتہاء ہوتی اس کا تصور کیجئے۔ آج ان کی جو بھی بچی

کچھی سا کھ ہے انہیں قربانیوں کے صلہ میں باقی ہے۔اسی طرح مسلمانوں کے اندر اپنے امام اور قائد ہونے کے بجائے دوسروں کا خوشہ چیں، دوسری قوموں کا مقتدی اور دوسرے لیڈروں کے پیروکار بن جانے کا تصور عام ہوجاتا، اور احساس کمتری اور پسماندگی کا شکار ہو گئے ہوتے تو اس وقت ان کا کیا حال ہوتا؟

جہاں تک دعوت کا سوال ہے تو دعوت کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ داعی اپنی دعوت اور پیغام کو سارے نظریات اور عقائد سے اونچا اور فائق سمجھے اور دوسرے سارے نظریات کو غلط، بے بنیاد اور انسانیت کے لئے مہلک اور خسارے کا باعث جانے۔اسی کے ساتھ اہل حق کو اہل باطل کے مقابلے میں اہمیت اور عزت و اکرام کے لائق تصور کرے مگر یہ دو چیزیں کسی کے اندر نہیں ہونگی تو وہ کیا دعوت دے گا اور کس چیز کی دعوت دے گا؟ انبیاء علیہم السلام اللہ کی بندگی اور اپنی اطاعت کی دعوت دیتے تھے اگر وہ صرف اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے اور اپنی اطاعت کرانے کے بجائے باطل عقائد کے پیشواؤں اور لیڈروں کے مقتدی اور پیروکار رہنے دیتے تو ان کی دعوت کا کون نوٹس لیتا؟ نیکی اور بدی، صالح اور غیر صالح کے امتیاز اور فرق کا کہاں منظر سامنے آتا؟

نہیں معلوم کس دلیل اور کس محرک کے تحت برادر محترم کو سب سے زیادہ جو چیز ناپسندیدہ اور غلط معلوم ہوتی ہے وہ مسلمانوں کے ذہن میں اپنے امام اور قائد ہونے کا تصور ہے اسی لئے خلیفہ، خلافت اور لفظ شہداء کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو سلف صالحین کی راہ سے ہٹی ہوئی ہوتی ہیں چنانچہ دیکھئے شہداء کے مفہوم میں یقیناً حق کی شہادت کا مفہوم شامل ہے لیکن غور فرمائیے کہ کیا شہادت کا حق صرف قولی شہادت، وعظ وتلقین اور کتابیں تصنیف اور تقسیم کرنے سے ادا ہوجائے گا؟ اور قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت کی ضرورت نہیں ہے؟

یقیناً اس سوال کا جواب اگر یہ ہوگا کہ قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی ضروری ہے تو ظاہر ہے کہ عملی شہادت میں عبادات، اخلاقیات اسلام کے معاشرتی، خاندانی اور سیاسی اصول کی شہادت بھی ضروری ٹھہرے گی۔یہیں سے خلافت کے تصور کا آغاز ہوتا ہے چنانچہ یہ بات بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جب تک نظام خلافت قائم نہیں ہوتا اس وقت تک دعوت اور شہادت حق کا پوری طرح ادا کرنا ناممکن ہے۔اسی لئے فقہائے کرام کہتے ہیں کہ نصب امام یعنی حکومت اسلامیہ کا قیام ایک دینی فریضہ ہے۔

فقہ کی رہنمائی

> ''اس معاملہ کو مثال سے سمجھئے۔موجودہ فقہ خلافت عباسی کے زمانے میں بنی اس وقت مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا۔ چنانچہ یہ مدون فقہ یہ تو بتاتی ہے کہ مسلمان جب حکمراں حیثیت میں ہوں تو ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں؟ اس میں ایسے ابواب کثرت سے پائے جاتے ہیں۔لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان جب اپنے آپ کو غیر حکمراں حیثیت میں پائیں، اس وقت ان کے لئے شرعی حکم کیا ہے؟ تو اس کا

واضح جواب آپ کو موجودہ مدون فقہ میں نہیں ملے گا۔

اسی طرح موجودہ فقہ جس وقت مدون کی گئی اس وقت شخصی حاکمیت کا زمانہ تھا۔ موجودہ قسم کی عوامی جمہوریت اس وقت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے فقہ میں خلیفہ اور سلطان سے متعلق احکام تو بہت ملیں گے۔ لیکن اگر آپ یہ جاننا چاہیں کہ مسلمان کسی ملک میں تنہا حاکم نہ ہوں البتہ وہ جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ شریک حکومت ہوں ایسی حالت میں ان کے لئے شرعی احکام کیا ہیں تو اس کی بابت بھی موجودہ مدون فقہ میں آپ کوئی رہنمائی نہیں پائیں گے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۴۹-۵۰)

برادر محترم کو یہ شکایت ہے کہ فقہ میں آداب غلامی نہیں سکھائے گئے ہیں یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان حاکم ہوں تو کیا کریں لیکن جب محکوم اور غلام ہوں تو کیا کریں نہیں بتایا گیا۔ اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان غلام اور محکوم بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا ہے مسلمان امت زمین پر اللہ کی نمائندہ ہے۔ رسولؐ کی جانشین ہے۔ اسے دنیا کی رہنمائی اور قیادت کے منصب پر فائز کیا گیا ہے۔ اسے خیر امت کا لقب دے کر نیکیوں کا محافظ، بدیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ شیطان کے مقابلے میں اللہ کا وہ سپاہی ہے اسے حزب اللہ کہا گیا ہے اور حزب اللہ کی صفت شیطان کے مقابلے میں اللہ کے لئے لڑنا بتائی گئی ہے ایسی صورت میں کیسے ممکن تھا کہ اسے اچھا غلام بننے اور سچا وفادار اور کسی کا محکوم بننے کی تعلیم دی جاتی۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذت کردار نہ افکار عمیق

حلقۂ شوق میں وہ جرأت اندیشہ کہاں
آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

دوسری بات یہ ہے کہ کیا فقہ میں دشمنانِ اسلام سے جہاد فرض نہیں قرار دیا گیا ہے؟ کیا فقہ کی کتابوں میں ''کتاب الجہاد'' آپ نے نہیں پڑھی ہے؟ مسلمان دارالحرب میں بحیثیت متامن یا بحیثیت تاجر یا بحیثیت

قیدی جائے تو وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں۔ اس طرح کے مسائل پر آپ کی نظر کیوں نہیں پڑتی؟

تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے انداز گفتگو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب وسنت میں آداب غلامی اور آداب محکومی کی تعلیم ضرور دی گئی ہے لیکن فقہ میں وہ درج نہیں ہے اگر ایسی بات ہے تو براہ کرم آپ کو کم از کم دو چار آداب تو ضرور پیش کرنے چاہئے تھے قرآن کی یہ چند آیات پڑھئے اور بتایئے کہ ان آیات کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان کسی غیر کا کس طرح تابع اور محکوم بن کر رہ سکتا ہے۔ (سورۃ الانعام ۱۱۶، الکہف ۲۸، الفرقان ۵۲، الاحزاب ۴۸، القلم ۸، النساء ۲۴، آل عمران ۱۰۰، الشعراء ۱۵۱، سورۂ محمد ۲۶)۔

چوتھی بات یہ ہے کہ کسی جمہوری نظام کے تحت دوسری قوموں کے ساتھ مسلمان شریک حکومت ہوں ایسی حالت کے شرعی احکام فقہ میں نہیں تو کیا کتاب وسنت میں بتائے گئے ہیں؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ شراب کی دوکان میں شریک ہو کر کاروبار کرنا فقہ میں تو نہیں بتایا گیا ہے لیکن کتاب وسنت میں بتایا گیا۔ نعوذ باللہ من ذلک۔ ایک مسلمان اللہ کو حاکم اور آمر مانتا ہے اللہ نے اپنے احکام اور قوانین کو اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ بھیج دیا ہے۔ رسول ﷺ اور رسول ﷺ کے اصحاب نے عملاً بتا دیا ہے کہ حکومت کیسے کی جائے قانون کیسے بنایا جائے۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نقشہ کے خلاف چلنے والی حکومت میں کیونکر شریک ہو سکتا ہے؟ اور کوئی فقیہ اس کے جواز کی صورت آپ کو کہاں سے لا کر بتا سکتا ہے؟

اللہ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ مشترک حکومت سود کو حلال کرتی ہے اللہ کی شریعت میں جوا، شراب اور زنا حرام ہیں اور جمہوری حکومت ان کو جائز کہتی ہے۔ اللہ نے فرمادیا میرے رسول کے خلاف نہ جاؤ، میرے رسول کی اتباع کرو لیکن مشترک حکومت کہتی ہے اس دور کے فلاں فلاں لیڈر ہمارے لئے نمونہ ہیں اس لئے ایسی حالت میں مسلمان شریک حکومت کیسے ہو سکتا ہے؟!

یہ کہنا سراسر جھوٹ اور افترا ہے کہ

> ''مدنی دور کے ابتدائی چند سال وہ ہیں جبکہ ایک صحیفہ کے ذریعہ مسلمان اور یہود یا مسلم اور غیر مسلم کو ملا کر ایک مشترک نظام بنایا گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۵۰)

کیا مدینہ کے اس نظام میں اللہ کے رسول ﷺ ایک لمحہ کیلئے بھی کسی دوسری شخصیت، کسی دوسرے دستور اور کسی دوسرے قانون کے تابع بن گئے تھے اللہ کے دستور وقانون کو چھوڑ کر؟ مدینہ میں دستور نہیں بلکہ ایک معاہدہ طئے ہوا تھا جس میں فیصلہ کی اعلیٰ اور آخری اتھاریٹی اللہ کے رسول ﷺ کو حاصل تھی۔ کیا آج جمہوری ملکوں میں مسلمان اسی حیثیت میں شریک حکومت ہیں؟ کہاں کی مثال کہاں دی جارہی ہے افسوس کی بات ہے۔

آج جمہوری حکومتوں میں اللہ اور رسول ﷺ کی تعلیمات کو تسلیم کرنا اور اس کو آخری سند ماننا تو دور کی بات ہے ان کو کوئی ادنیٰ مقام بھی نہیں دیا گیا ہے چونکہ مدینہ میں اعلیٰ اتھاریٹی رسول خدا ﷺ کو تسلیم کیا گیا تھا اس لئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ رسول ﷺ کسی حکومت اور نظام میں شریک نہیں ہوئے تھے بلکہ معاہدہ کے ذریعہ اپنے نظام میں دوسروں کو شریک بنایا تھا۔ اس نکتہ کو عمداً نظر انداز کر کے عموماً نبی ﷺ کے معاہدات کو غلط طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ پھر ایک پہلو یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ آج کے جمہوری نظام میں مسلمانوں کو من حیث القوم شریک نہیں مانا جاتا بلکہ ملک کے ایک عام شہری کی حیثیت سے شریک مانا جاتا ہے نہ کہ بحیثیت مسلمان۔ بلکہ من حیث القوم انہیں الگ سے کوئی مقام دینے کی کوششوں کو فرقہ پرستی اور علیحدہ پسندی سمجھا جاتا ہے جو دستوری اعتبار سے ایک بھاری جرم ہے۔

شاتم رسول ﷺ

برادر محترم شاتم رسول ﷺ جیسے سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کے بارے میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو نظر انداز کر دیا جانا چاہئے اس لئے کہ ایسا اس لئے ہو رہا ہے کہ دور جدید میں اظہار رائے کی آزادی دی گئی ہے جو ایک عظیم نعمت ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

> ''اس اعتبار سے دیکھئے تو اظہار رائے کی موجودہ آزادی اہل اسلام کے لئے ایک عظیم نعمت ہے کیونکہ وہ ہمارے لئے تبلیغ و دعوت کے بند راستہ کو لامحدود طور پر کھول دینے والا ہے اب اگر سلمان رشدی جیسے کچھ مظاہر پیدا ہو رہے ہوں تو ہم کو اسے اس نظر سے دیکھنا چاہئے جس طرح ایک کسان باران رحمت میں کیچڑ کے مسئلہ کو دیکھتا ہے بارش میں اگرچہ بعض اوقات کیچڑ کے مسائل بھی پیدا ہو جاتے ہیں مگر بارش کے عظیم فائدوں کے مقابلے میں اس جزوی مسئلہ کی کوئی اہمیت نہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۸۶)

اپنے نظریہ کی تائید میں چند باتیں اور بھی کہتے ہیں:

> ''شاتم رسول کے متعلق ابن تیمیہؒ، ابن عابدینؒ اور سبکیؒ وغیرہ کی کتابیں اس وقت لکھی گئیں ہیں جب مسلمانوں کو زمین پر کلی اقتدار حاصل تھا اور موجودہ دور میں ایک تو مسلمان مغلوب ہیں شاتم رسول کو ختم نہیں کر سکتے۔ دوسرے اس دور کی ایک بڑی قوت میڈیا اسلام کو اس بہانے سے تشدد کا مذہب بنا کر پیش کرتی ہے۔''

لیکن سوال یہ ہے کہ اس طرح کی باتیں فتوی پر کس طرح اثر انداز ہو سکتی ہیں شاتم رسول جس طرح دور اقتدار میں قتل کئے جانے کے لائق تھا وہ آج بھی ہے اور آئندہ بھی ہمیشہ رہے گا۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ اسے قتل کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں ہے یا ہم اسے قتل نہیں کر پا رہے ہیں دنیا کے کسی قانون میں ایسا نہیں ہے کہ مجرم پر کسی وجہ سے قانون نہیں لاگو ہو پا رہا ہے تو اسے بے قصور اور قابل نظر انداز قرار دیا جائے یا کہیں کسی قانون کا نام لے

کر مخالفین پروپیگنڈہ کر رہے ہوں تو اس قانون کو قانون کی کتاب سے نکال دیا جائے۔قرآن کی کئی آیات کو لے کر اسلام کے خلاف بولنے والے برابر بولتے رہتے ہیں تو کیا ان آیات کو آپ قرآن سے نکال دیں گے؟

برادر محترم اپنی بات کی تائید میں ایک دلیل یہ بھی دیتے ہیں کہ شاتم رسول کی سزاء کا حکم مدینہ میں نازل ہوا ہے، مکی دور میں شاتم رسول کے خلاف فتویٰ نہیں دیا گیا اس لئے اس دور میں شاتم رسول پر فتویٰ نہیں لاگو ہونا چاہئے لیکن اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے تو آج کئی حرام چیزیں حلال ہو جائیں گی اور کئی احکام پر عمل کرنا ضروری نہ رہے گا اور نتیجہ کے طور پر اس دور میں شریعت کے ایک بڑے حصے سے آزادی کا پروانہ مل جائے گا۔

برادر محترم کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> ''حالانکہ واقعات بتاتے ہیں کہ اس معاملہ میں خود اسلام میں حالات کے اعتبار سے فرق کیا گیا ہے چنانچہ ابن تیمیہؒ اور دوسرے حضرات شاتم کی سزاء کے جتنے بھی واقعات کا حوالہ دیتے ہیں وہ سب مدنی دور سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس دور سے جب کہ اسلام کو بااقتدار حیثیت حاصل ہوگئی تھی اس کے برعکس مکی دور میں جب کہ اقتدار اعلیٰ اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھا ابولہب کی بیوی ام جمیل نے علی الاعلان رسول کو ''مذمما'' کہا مگر نہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاتم کی حد بیان فرمائی اور نہ آپ کے اصحاب دوڑے کہ اس شاتمہ کو قتل کر ڈالیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۵۹)

اس موقع پر ایک عجیب بات دیکھی گئی کہ برادر محترم مکی دور کی بات کو پیش کر کے مدنی دور کے صریح حکم کو آج منسوخ کرنے کا حق اپنے لئے تسلیم کرتے ہیں لیکن مفسرین کو یہ حق نہیں دیتے کہ وہ مکی دور کی آیات کو مدنی دور کی آیات سے منسوخ مانیں۔آں محترم فرماتے ہیں:

> ''مثال کے طور پر کسی مستند تفسیر کو پڑھئے آپ پائیں گے اس میں صبر اور اعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں ''وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ'' کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے ''ھو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین''،اسی طرح آیت ''وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیات آنے کے بعد وہ منسوخ ہوگئی۔ھی منسوخۃ بالقتال''۔
> (فکر اسلامی، صفحہ:۵۹)

یہ کیسی الٹی بات ہے کہ آں محترم کے نزدیک پہلے والا حکم بعد کے حکم کو منسوخ کر سکتا ہے لیکن بعد کا حکم پہلے والے حکم کو منسوخ نہیں کر سکتا

''جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے''

دینی لٹریچر

برادر محترم نے اورنگ زیب عالمگیرؒ سے لے کر اس دور کے مشہور عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندویؒ تک

سب کو نااہل قرار دیا ہے۔حضرت شاہ ولیؒ اللہ کو ایک نہیں کئی بار بے خبر لکھا ہے ان کی مشہور کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں آں محترم کو کوئی عقلی بات نہ ملی۔علامہ اقبال، مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ اور سید قطب شہید آں جناب کی نظر میں اس دور کی سب سے بڑی مصیبت ہیں۔اسی طرح قدیم وجدید سارے دینی لٹریچر خواہ تفسیری ہو یا حدیثی، سیرت سے متعلق ہو یا تاریخ سے سب کا سب نامعتبر ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نظریہ اعراض کے خلاف سارے علماء، فقہاء، محدثین اور مفسرین اور ان کی کتابیں ہیں چنانچہ لکھتے ہیں۔

''اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ قسم کی کتابوں میں بعد کے زمانہ میں پیش آنے والے حالات کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔اس طرح یہ کتابیں اپنی تمام خوبیوں کے باوجود موجودہ زمانہ کے اعتبار سے غیر متعلق ہوکر رہ گئی ہیں۔یہی کم وبیش اس پورے تصنیفی ذخیرہ کا حال ہے جس کو آج اسلامی کتب خانہ کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ کسی مستند تفسیر کو پڑھئے۔آپ پائیں گے کہ اس میں صبر واعراض کی آیتوں کو منسوخ بتایا گیا ہے مثلاً القرطبی کی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں وَاَعۡرِضۡ عَنِ الۡمُشۡرِكِيۡنَ کے تحت لکھا ہوا ہے کہ وہ منسوخ ہے۔ ھو منسوخ بقولہ فاقتلوا المشرکین (۶۲/۱۰) اسی طرح آیت ''وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' کے تحت درج ہے کہ جنگ کی آیت نازل ہونے کے بعد وہ منسوخ ہوگئی ھی منسوخۃ بالقتال۔(۲۰۲/۱۰)

صبر واعراض اسلام کا اہم ترین حکم ہے۔قرآن میں کہیں بالواسطہ انداز میں اور کہیں براہ راست طور پر اس کی تاکید کی گئی ہے۔حتی کہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پورا قرآن کتاب صبر ہے مگر جو آدمی تفسیر کی ان کتابوں کو پڑھے اس کا عام تاثر فطری طور پر یہ ہوگا کہ صبر واعراض کی آیتیں اب صرف تلاوت کیلئے ہیں۔اب اس سے متعلق جو قرآنی حکم ہے وہ صرف جہاد وقتال ہے۔صبر واعراض کا حکم کمزوری کے دور میں تھا۔اب مسلمان طاقتور ہیں، اب ہمیں صبر نہیں کرنا ہے بلکہ لڑ کر غیر اسلامی عناصر کو زیر کرنا ہے۔

اسی طرح حدیث کی کتابیں بے شمار قیمتی تعلیمات سے لبریز ہیں مگر اپنی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے وہ غلط فہمی کا باعث بنتی ہیں۔مثال کے طور پر آپ صحاح ستہ یا حدیث کی اور کوئی مستند کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں آپ کو دعوت وتبلیغ کا باب نہیں ملے گا موجودہ کتب حدیث میں، باعتبار ترتیب، ہر قسم کے ابواب ہیں مگر دعوت وتبلیغ کا باب ان میں سرے سے موجود نہیں۔

جو لوگ ان کتب حدیث کو پڑھتے ہیں وہ قدرتی طور پر تراجم ابواب کے تحت انہیں پڑھتے ہیں۔اس طرح ان کو پڑھ کر شعوری یا غیر شعوری طور پر قاری کے اندر غیر دعوتی ذہن بنتا ہے جہاد وقتال کے ابواب سے تو وہ خوب آشنا ہوجاتا ہے مگر دعوت وتبلیغ کی اہمیت سے وہ یکسر غافل رہتا ہے۔

اسی طرح سیرت رسول ﷺ پر لکھی جانے والی کتابوں کو دیکھئے۔ سیرت کی تقریباً تمام مستند کتابیں غزواتی پیٹرن پر لکھی گئی ہیں ابن ہشام کی مشہور چار جلدوں کی سیرت کا ایک جلد سے کچھ زیادہ حصہ ۱۳ سالہ مکی دور پر ہے اور بقیہ تقریباً تین جلدیں ۱۰ سالہ مدنی دور پر۔ مدنی دور کے ابواب کی ترتیب سیرت کی تمام کتابوں میں غزوات کی بنیاد پر کی جاتی ہے حتیٰ کہ سیرت کی ابتدائی کتابوں کا نام ہی ''مغازی'' ہوا کرتا تھا اگرچہ بعد کی کتابوں کے نام مغازی پر نہیں رکھے گئے۔ مگر عملاً سیرت کی تقریباً تمام کتابیں مغازی ہی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تاریخ تک پہنچ کر یہ صورت حال اور زیادہ سنگین ہوجاتی ہے کیونکہ تاریخ اسلام پر لکھی جانے والی کتابیں، تقریباً بلا استثناء جنگ آزمائی اور کشور کشائی کی داستاں نظر آتی ہے یہ سیاسی فتح وشکست اور بادشاہوں کی موت وحیات کا بیان ہوکر رہ گئی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے پہلی بار اسلامی تاریخ کی اس کمی کا احساس کیا اور وسیع تر انداز میں اسلام کی جامع تاریخ لکھنا چاہا۔ انہوں نے اپنے مقدمہ تاریخ میں کامیابی کے ساتھ اس جدید تاریخ کے اصول مقرر کئے مگر وہ خود بھی اس انداز پر اسلام کی تاریخ مرتب نہ کرسکے۔

بعد کے دور میں جو کتابیں لکھی گئیں (صوفیا کی غیر معتبر کتابوں کو چھوڑ کر) تقریباً سب کی سب اسی نہج پر تھیں۔ مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کو مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک معرکۃ الآرا کتاب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''اس میں دین ونظام شریعت کا نہایت مربوط، جامع اور مدلل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۲۱۵)

''مگر اس کتاب کا حال یہ ہے کہ اس میں مسواک اور ستر ہ تک کے ابواب ہیں مگر اس میں دعوت وتبلیغ کا سرے سے کوئی باب ہی نہیں۔ اس کے برعکس اس میں جہاد وقتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل بتایا گیا ہے۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۵۹ تا ۶۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں اسلاف کے پورے تصنیفی ذخیرہ کو غیر معتبر ٹھہرایا گیا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس میں جہاد وقتال کو سب سے زیادہ اہم اسلامی عمل کے طور پر پیش کیا گیا ہے جبکہ جہاد وقتال کی باتیں آں محترم کے نزدیک تشدد اور تعدی کے ہم معنی ہیں اور ہندوستان میں کفار ومشرکین کے سامنے سرنگوں ہونے اور سپر ڈال دینے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی
دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں
مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر

مسائل قدیم و دلائل جدید

''دارالعلوم دیوبند کے سابق مہتمم قاری محمد طیب صاحبؒ (۱۹۸۳ء-۱۸۹۵ء) جو حکیم الامت کے نام سے مشہور ہیں ان کا ایک طویل مقالہ میں نے پڑھا یہ پورا مقالہ ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر تھا مگر اس میں مجھے اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہیں ملا۔ مولانا طیب صاحبؒ نے لکھا ہے کہ ''اسلامی فکر کی تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں۔ تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابتِ نبوی ﷺ کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔''

(فکر اسلامی کی تشکیل جدید، صفحہ:۸۳، صفحہ ۶۲)

اس اقتباس میں برادر محترم کو اصل سوال کا کوئی واضح جواب نہ ملنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ محترم قاری محمد طیب صاحبؒ نے خلافت الٰہی اور نیابت نبوی ﷺ کو مرکزی نقطہ قرار دیا ہے اگر وہ کہتے کہ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کے لئے اسلام کے تصور جہاد کو اس دور میں ختم کر دینا ضروری ہے تو آپ دیکھتے کہ وہ قاری صاحبؒ کو دور جدید کا صحیح معنی میں حکیم الامت قرار دیتے۔

''مگر مسائل قدیم ہوں اور دلائل جدید ہوں'' کا نظریہ فقہ کے بارے میں کلی طور پر درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن اپنی نوعیت کے اعتبار سے ابدی ہے۔ جب کہ فقہ کی حیثیت اس کے مقابلہ میں وقتی اور زمانی ہے۔
مثال کے طور پر ہماری مدون فقہ پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کرتی ہے دارالاسلام اور دارالحرب، دارالاسلام وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ ہو اور دارالحرب وہ ملک ہے جہاں اسلام کا قانون نافذ نہ ہو۔ اس فقہ کی روشنی میں، مسلمان دارالحرب کے مقابلہ میں امکانی طور پر برسر جنگ قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قاری طیب صاحبؒ کے مذکورہ اصول کے مطابق اس قدیم فقہی اصول کو جدید دلائل سے آراستہ کر کے دوبارہ مستحکم کیا جانا چاہئے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ طرز فکر یقینی طور پر درست نہیں۔ آج اصل ضرورت یہ ہے کہ اس فقہی تقسیم پر نظر ثانی کی جائے نہ کہ اس کو از سر نو مدلل کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔

قدیم فقہ اور جدید حالات میں فرق کی بناء پر اس طرح کے بہت سے نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں مگر جامد تقلید کی بناء پر لوگ نہ تو انہیں سمجھ سکے اور نہ اس کے حل کی راہ نکالنے میں کامیاب ہوئے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۶۲۔ ۶۳)

قرآن اور فقہ دونوں کی حیثیت ہر کوئی جانتا ہے فقہ کو قرآن کے برابر کوئی نہیں سمجھتا۔ لیکن فقہ کو کنڈم کرنا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ اس کی بنیاد قرآن وسنت ہی ہے۔ فقہ نے پوری دنیا کو دو خطوں میں تقسیم کیا ہے تو آخر کیوں غلط ہے؟ اس کا جواب آں محترم کے پاس اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ ہماری مدونہ فقہ نے ایسا تقسیم کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں آخر یہ بھی کوئی دلیل ہے؟ سوچنے کی بات ہے۔ دو چار آیات قرآنی اور احادیث نبوی پیش کر کے بتایا جاتا کہ اللہ اور اس کے رسول نے دنیا کی پانچ تقسیم کی ہے اور فقہ دو ہی تقسیم کر رہی ہے اسی لئے یہ تقسیم غلط ہے۔ تو یہ ایک بات ہو سکتی تھی مگر نہ تو کوئی نقلی دلیل پیش کی گئی اور نہ اصلی۔ پھر یہ بھی کوئی دلیل ہے کہ اس تاریخ سے دنیا کے تمام ممالک دارالحرب قرار پائیں گے۔

قرآن کی رو سے سارے انسانوں کو دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اہل حق یا اہل باطل، اولیاء اللہ یا اولیاء شیطان، مومن یا کافر، تو دنیا کو دو خانوں میں تقسیم کرنے میں آخر کونسی شرعی یا عقلی قباحت ہے؟ آپ کو اس سے کیوں متلی ہو رہی ہے؟ خدا کی زمین پر شیطان کی حکومت قائم کرنے والوں سے آپ کی گاڑھی چھنتی ہے اور ان کے لئے اپنے دل میں بڑی وسعت رکھتے ہیں لیکن خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کرنے کی بات بڑی کڑوی لگتی ہے۔

گمراہی کی بات

برادرِ محترم نے ایک بڑی گمراہی کی بات کہی ہے:

''اس پسماندگی کا واحد سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن ہے مسلمان جدید علوم میں پیچھے ہو گئے اس لئے وہ جدید صنعت میں بھی پیچھے ہو گئے اور جدید صنعت کے پیچھے ہونے کے نتیجہ میں وہ دور جدید کے ہر شعبہ میں پچھڑ کر رہ گئے کیونکہ موجودہ زمانہ میں تمام چیزوں کا تعلق علم سے ہو گیا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۷۹)

مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب جدید علوم میں مسلمانوں کا پچھڑا پن بتایا جاتا تو بڑی حد تک صحیح ہوتی اور کسی کو اس سے انکار نہیں ہوتا۔ لیکن اس کو واحد سبب بتانا یہ بڑی گمراہی کی بات ہے۔ واحد سبب اگر کسی چیز کو کہا جا سکتا ہے تو وہ ہے دین سے دوری، کتاب وسنت سے وابستگی میں کمی، اس کے علاوہ کسی بھی سبب کو واحد سبب نہیں کہا جا سکتا۔ مسلمان جب عروج اور ترقی کے اعلیٰ مقام پر پہنچے تھے تو اس وجہ سے نہیں

کہ وہ اپنے دور کے علوم میں سب سے آگے تھے بلکہ عروج کا واحد سبب دین وایمان میں پختگی تھا۔اس لئے اس پسماندگی کو ختم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ دین سے وابستگی ہے۔

لن یصلح اخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا

ترجمہ: یعنی اس امت کے بعد کے لوگ اسی چیز کے ذریعہ درست ہوں گے جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔

اس قول میں مکمل بات بتادی گئی ہے۔

سیکولرزم

برادرِ محترم سیکولرزم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''دور جدید کے فکری مسائل میں سے ایک وہ ہے جو سیکولرزم کی نسبت سے پیدا ہوا ہے۔موجودہ زمانہ میں اسٹیٹ پالیسی کے لئے سب سے زیادہ مقبول اور مستند نظریہ وہی ہے جس کو عام طور پر سیکولرزم کہا جاتا ہے۔ کسی اسٹیٹ کا سیکولر ہونا اس کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت ہے اور اس کا غیر سیکولر ہونا اس کے غیر ترقی یافتہ ہونے کی علامت۔

مسلمانوں کا ایک گروہ خاص طور پر اسلام پسند طبقہ سیکولرزم کے سخت خلاف رہا ہے وہ اس کو ایک اسلام دشمن نظریہ کے طور پر دیکھتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ سیکولرزم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کو غیر مذہبی اور خالص دنیوی بنیادوں پر قائم کیا جائے۔اس طرح وہ اسلام کی نفی بن جاتا ہے کیونکہ اسلام کا تقاضہ یہ ہے کہ ریاست کو وحی الٰہی کی بنیاد پر قائم ہونا چاہئے۔

مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہاء پسند نمائندوں کی رائے کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے۔مگر یہ ایک ایسی غلطی ہے جسے کچھ غیر مسلم دانشور انتہاء پسند مسلم نوجوانوں کے جنگجو یانہ خیالات کو لیکر اس کی بنیاد پر اسلام کی تصویر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیکولرزم کے بارے میں وہی رائے درست ہے جو انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجین اینڈ ایتھکس میں دی گئی ہے اس کے مطابق سیکولرزم کسی مذہب مخالف نظریہ کا نام نہیں۔وہ اس بات کا نام ہے کہ اسٹیٹ اپنے آپ کو اس کا پابند بنالے کہ وہ ہر شہری کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت (Non-Interference) کی پالیسی اختیار کرے گی۔ یہ دراصل ایک عملی بندوبست کی بات ہے نہ کہ کوئی مقدس نظریہ، اپنی رو کے اعتبار سے صلح حدیبیہ جیسا ایک عملی حل ہے اور وہ اہل اسلام کے عین حق میں ہے۔

سیکولرزم نے تاریخ میں پہلی بار اہل توحید کو یہ موقع دیا کہ ریاست کی طرف سے تعذیب (Persecution) کا خطرہ مول لئے بغیر اپنے عقائد کی آزادانہ تبلیغ کریں۔ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے تو وہ

''اسلامی حکومت قائم کرو'' کے نعرے سے قائم نہیں ہوتی۔ پاکستان کی مثال اس کا واضح ثبوت ہے۔سیکولرزم کا اصول ہمیں یہ موقع دیتا ہے کہ ہم آزادانہ طور پر ساری دنیا میں اسلام کی پرامن اشاعت کریں۔اس عمل کے نتیجہ میں کسی سماج کی اکثریت میں اگر اسلامی حکومت کی طلب پیدا ہوجائے تو وہاں اسلام کی حکومت بھی قائم ہوسکتی ہے اور اسلام کی حکومت ہمیشہ سماجی طلب کی بنیاد پر ہی قائم ہوتی ہے۔وہ مطالباتی سیاست کے ذریعہ کبھی قائم نہیں ہوتی۔'' (فکر اسلامی،صفحہ:۸۶ تا ۸۷)

غور کیجئے برادر محترم نے سیکولرزم کے بارے میں اسلام پسندوں کی رائے سے اختلاف تو کیا ہے لیکن اختلاف کی وجہ نہ کوئی شرعی بنیاد بتلائی ہے اور نہ کوئی عقلی اصول۔آں محترم کو یہاں یہ بتلانا چاہئے تھا کہ اسلام پسندوں نے جس دلیل کی بنیاد پر سیکولرزم کو اسلام کی نفی قرار دیا ہے وہ بنیاد صحیح نہیں ہے اور اسلام پسندوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی اور خالص دنیاوی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر قائم ہوتی ہے لیکن اسلام پسندوں کی ان دو دلیلوں میں سے کسی ایک دلیل پر بھی کوئی بحث نہیں فرمائی گئی ہے۔

اسلام پسندوں نے سیکولرزم سے اسلام کی نفی کا نتیجہ دو مقدموں سے نکالا تھا ایک تو یہ کہ سیکولرزم میں ریاست کی بنیاد غیر مذہبی ہوتی ہے اور اسلام میں ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر ہوتی ہے۔ان دو چیزوں میں سے کسی بھی چیز کی برادر محترم تردید نہیں کرسکے اور نہ کرسکتے تھے اس لئے ایک چٹکلہ چھوڑا اور دامن بچا کر نکل گئے۔یہ کہنا کہ اسلام پسند حضرات کی یہ رائے سیکولرزم کے انتہاء پسند نمائندوں کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے، کافی نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ سیکولرزم کے اعتدال پسند نمائندوں کی کیا رائے ہے؟ کیا وہ ریاست کی بنیاد وحیٔ الٰہی پر رکھنے کی بات کرتے ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو اعتدال پسندوں کی رائے بتا کر اسلام پسندوں کے خیال کی تردید باآسانی کی جاسکتی تھی۔مگر اس طرح کی کسی چیز کا وجود ہی نہیں ہے اس لئے لائیں گے تو کہاں سے لائیں گے؟

اپنے ہندوستان میں پچاس سال سے سیکولر جمہوریت کا دور دورہ ہے لیکن آج تک سیکولرزم کی تعریف نہیں کی جاسکی ہے۔دستوری، قانونی اور عملی کسی اعتبار سے سیکولرزم کی شکل متعین نہیں ہوسکی۔اسی وجہ سے برادر محترم کو سیکولرزم کے مفہوم کو تلاش کرنے کے لئے انسائیکلو پیڈیا کی ورق گردانی کرنی پڑی۔جس سے معلوم ہوا کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے۔لیکن پھر بھی یہ بات تشنہ رہی کہ سیکولرزم اپنے نظام میں مذہب کو دخل دینے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں۔عام طور پر سیکولر پسند لوگ اس سوال کو نظر انداز کردیتے ہیں اس لئے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کہ سیکولرزم مخالف مذہب نہیں ہے بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ سیکولرزم پرائیوٹ اور نجی زندگی میں مخالف نہیں ہے اور جہاں تک سوال اجتماعی زندگی یعنی حکومت اور سیاست کا دائرہ ہے اس دائرے میں سیکولرزم اسلام کیا کسی بھی

مذہب کو جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔اس لئے اسلام پسندوں کا کہنا ہے کہ اس بات کو وہ لوگ تسلیم کر سکتے ہیں جن کے یہاں مذہب کا تعلق صرف پرائیوٹ زندگی سے ہے۔جن کے یہاں پوجا پاٹ کی محض چند مراسم کا نام مذہب ہے۔لیکن مسلمانوں کا مذہب پوری زندگی کو گھیرے ہوئے ہے اور اس کا مطالبہ ہے کہ پوری طرح اسلام میں داخل ہوجاؤ اور اللہ کے رنگ میں مکمل رنگ جاؤ۔ جہاں دین کے بعض حصے کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا پورے دین کو نہ ماننے کے برابر قرار دیا ہے شریعت اسلامی کے قانون سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کو ایمان کے منافی ہونے کی صراحت موجود ہے کوئی قانون اور ضابطہ کتاب وسنت کی ہدایات کو نظر انداز کر کے بنانا ایمان کے خلاف ہے۔حکم دینے اور کسی بات سے روکنے کا حق صرف خدا اور رسول کو جو دیتا ہے ایسے مذہب کا ماننے والا شخص کیسے یہ تسلیم کرے گا کہ سیکولرزم مذہب مخالف نہیں ہے جب کہ سیکولرزم اجتماعی معاملات حکومت اور سیاست کے دائرے میں کسی مذہبی دخل اندازی کے لئے قطعاً روادار نہیں ہے مذہب کے نام پر کسی شخص کا سیکولر نظام کی اسمبلی اور پارلیمنٹ میں داخل ہونا تو دور کی بات ہے وہ بحیثیت امیدوار الیکشن میں کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔

''اسٹیٹ اپنے کو اس کا پابند بنالے کہ وہ شہریوں کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کرے گا۔''

یہ سیکولر نظام کی ایک پالیسی ہے سیکولرزم کی یہ تعریف نہیں ہے۔اس پالیسی کی وجہ سے سیکولرزم کو مخالف اسلام نہ سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہندومت اور جین مت کو اس بناء پر مخالف اسلام نہ سمجھنا کہ ان دونوں مذہبوں میں جانداروں پر مہربانی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ ان مذہبوں کی تعریف نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان مذاہب کی یہی ایک اچھائی ہے۔کچھ اچھائیاں ہر مذہب اور ہر نظریہ میں ہوتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں ہے لیکن ان مذاہب کی بنیادی بات وہ عقائد ہیں جو خدا کی ذات وصفات اور انسان اور خدا کے درمیان اور پھر انسان انسان کے درمیان تعلقات کی بنیاد بنتے ہیں اسی طرح سیکولرزم کیا ہے یہ جاننے کے لئے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ اس نظریہ میں خدا کی ذات وصفات کے بارے میں کیا عقائد ہیں حاکمیت اور قانون سازی کا حق اس نظریہ میں کس کو دیا گیا ہے پھر اس نظریہ میں کس شخصیت کو نمونہ عمل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔اخلاق، قانون، معیشت، معاشرت اور سیاست کے اصول کہاں سے لئے گئے ہیں اس زاویہ نظر سے آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ سیکولرزم سراسر اسلام کے خلاف ہے جہاں تک سیکولرزم میں کچھ فائدے کا مسئلہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں۔جیسا کہ کوئی یہ نہیں کہتا کہ شراب میں کسی طرح کا کوئی فائدہ نہیں ہے لیکن جس طرح کچھ فائدے کی وجہ سے شراب حلال نہیں ہوجاتی اسی طرح کچھ فائدے کی بناء پر سیکولرزم قابل قبول نہیں ہوگا۔

اسلام

① اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑی حقیقت توحید ہے۔ خدا کا وجود، اس کا وحدہ لاشریک ہونا اور اس کی حاکمیت اور ربوبیت کو تسلیم کرنا ہے اسلام کا پورا نظام خدا کی بندگی سے عبارت ہے اور اس کی حاکمیت سے تابع ہے۔

سیکولرزم

① سیکولرزم وجود باری تعالیٰ اور اس کی صفات کے باب میں یا تو بالکل خاموش ہے یا بحث کرتا ہے تو سینکڑوں خداؤں کے لئے اس کے اندر گنجائش ہے لیکن اپنے نظام میں ایک خدا کا بھی عمل دخل قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اسلام

② اسلام مادہ پرستانہ اور ملحدانہ تصور سے بغاوت پر مبنی ہے وہ ساری انسانیت کو انبیاء کرام کے بتائے ہوئے طریقہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔

سیکولرزم

② سیکولرزم مادہ پرستانہ تہذیب کی پیداوار ہے جس قافلہ کے رہنما انبیاء علیہم السلام ہیں اس سے اسے کوئی نسبت نہیں ہے۔

اسلام

③ اسلام کی نگاہ میں زندگی گزارنے کا صحیح راستہ خالق کائنات نے طے کر دیا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس کے نزدیک خیر و شر اور حسن وقبح کا معیار اور کسوٹی اللہ کی بھیجی ہوئی شریعت ہے۔

سیکولرزم

③ سیکولرزم کی نگاہ میں صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز اور شر اور خیر کا معیار اور کسوٹی عامۃ الناس کی اکثریت کی خواہشات اور خدا بیزار لیڈروں کے بنائے ہوئے قوانین اور اصول ہیں۔

اسلام

④ اسلام نے انفرادی و اجتماعی زندگی کے لئے اپنے اصولوں کے مطابق لوگوں کی آزاد مرضی کے ذریعہ تمام انسانی حقوق پر مبنی ریاست قائم کر کے دکھا دیا ہے۔

سیکولرزم

④ سیکولرزم کی عملی دنیا میں تمام انسانی حقوق کی حفاظت کے باب میں کوئی تاریخ نہیں ہے وہ محض ایک خیالی دنیا کی بات ہے۔ جس کا کہیں کوئی تجربہ نہیں کیا گیا۔

اسلام اور سیکولرزم میں اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود خدا جانے کس دلیل کے پیش نظر بعض لوگ کہتے ہیں کہ موجودہ ہندوستان کے تناظر میں موزوں ترین نظام سیکولرزم ہے۔ جس کے معنیٰ ہوتے ہیں کہ اسلام ناقص ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

جہاد

''ایک مسئلہ وہ ہے جس کا تعلق جہاد سے ہے۔ عام تصور یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ ساری دنیا سے لڑ کر انہیں مجبور کریں کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا اسلامی قانون کے ماتحت ہو کر ذمی کی حیثیت سے زندگی گزاریں۔ اسلامی جہاد کا یہ تصور دورجدید کے اس متفقہ بین الاقوامی تصور سے ٹکراتا ہے کہ ہر ملک پر لازم ہے کہ وہ دوسرے ملک کی سرحدوں کا احترام کرے اور کوئی قوم کسی دوسری قوم کے معاملہ میں مداخلت نہ کرے۔

مگر جہاد کے اس تصور کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ یا تو بعض انتہاء پسند مسلم نظریہ سازوں کی اختراع ہے یا غیر مسلم دانشوروں کا اپنا گھڑا ہوا ہے۔

قرآن کے مطابق جہاد (بمعنی قتال) کی صرف دو قسمیں ہیں۔ ایک استیصال فتنہ کے لئے **(وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ)** اور دوسری دفاع کے لئے **(وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ).**

فتنہ سے مراد اردو معنی میں ''فتنہ فساد'' نہیں ہے اس سے مراد مذہبی تعذیب (Religious Persecution) ہے قدیم زمانے میں عرب میں اور ساری دنیا میں یہ فتنہ موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ اور اصحاب رسول کو حکم دیا کہ اس کے خلاف جدوجہد کر کے اس مصنوعی رکاوٹ کا خاتمہ کردو۔ چنانچہ انہوں نے اس کا مقابلہ کر کے اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اب اس فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں۔

دفاع کے لئے جہاد کا حکم اب بھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ تاہم دفاعی جہاد شروع کرنے کیلئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دفاع کے نام پر بطور خود کسی کے خلاف جنگ چھیڑ دے۔

ان دو صورتوں کے سواء کوئی بھی تیسری صورت نہیں ہے۔ جس کے لئے اسلام میں جہاد (بمعنی قتال) کسی کے لئے جائز ہو۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۸۷ تا ۸۸)

مذکورہ بالا پورے اقتباس پر غور کرنے سے برادرمحترم کا ایک دعویٰ یہ سامنے آتا ہے کہ جہاد کے اس تصور کا قرآن وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر پہلی بات یہ ہے کہ اسلامی جہاد کا یہ تصور دور جدید کے متفقہ بین الاقوامی تصور سے ٹکراتا ہے۔ یہاں اس بات کے سلسلہ میں ہمارے خیال میں دورائے نہیں ہوسکتی کہ اس ٹکراؤ والی بات کو کوئی شرعی دلیل کی حیثیت سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دور جدید کے سارے نظریات کی بنیاد مادہ پرستی ہے اس لئے تصور جہاد ہی کیا پورا اسلام دور جدید کے افکار سے متصادم ہے۔ دوسری بات جناب نے یہ فرمائی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کی صرف دو قسمیں ہیں ایک استیصال فتنہ کے لئے اور دوسرے دفاع کے لئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ اب فتنہ کا دنیا میں کہیں وجود نہیں ہے اس لئے اب اس نوعیت کے جہاد کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن اس بات میں بھی دلیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ بات اس وقت قابل قبول ہوسکتی ہے جبکہ یہ ثابت کردیا جائے کہ فتنہ سے مراد مذہبی تعذیب ہے اور اس دور میں مذہبی تعذیب کا کہیں وجود نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں ہم پورے چیلنج کے ساتھ کہیں گے کہ فتنہ کے وہ معنی نہیں ہیں جو برادرمحترم بتاتے ہیں فتنہ سے مراد شرک ہے۔ اس بات کی تصدیق کتب تفاسیر سے کی جاسکتی ہے۔

پھر یہ سوچئے کہ فتح مکہ کے بعد جبکہ مذہبی تعذیب کا خاتمہ ہوگیا تھا اس کے بعد اسلامی فوجوں نے جہاد کا سلسلہ جاری رکھا نہ صرف عرب کے دور دراز علاقوں میں بلکہ ایران، روم اور فارس کی سرحدوں میں گھس کر قتال کیا آخر یہ کس نوعیت کا جہاد تھا اور اس کی کیا وجہ تھی؟ خلافت راشدہ کے دور کی مثالیں تو ضرور بالضرور قرآن کی تفسیر اور دلیل شرعی کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔

اس کے بعد حضور ﷺ کے اس ارشاد پر غور کیجئے کہ ''الجهاد ماض الی یوم القیامة''، یعنی جہاد قیامت تک جاری رہنے والا ہے۔ اس حدیث میں کسی خاص نوعیت کے جہاد کے جاری رہنے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں نوعیت کا جہاد اب باقی نہیں ہے تو اسے اس مسئلہ خاص کے لئے کوئی دلیل دینی ہوگی۔ حدیث سے معلوم ہوا کہ قیامت تک جہاد کی علت موجود رہے گی اس لئے جہاد بھی جاری رہے گا۔

دوسری نہایت غلط بات موصوف کا یہ فرمانا ہے کہ دفاعی جہاد شروع کرنے کے لئے بہت سی لازمی شرطیں ہیں یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دن ہونے کے لئے غروب شمس ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں ہم عرض کریں گے کہ دفاعی جہاد کے لئے ملک اور مقام کی، زمانہ اور وقت کی، کثرت اور قلت کی، خوشحالی اور تنگی کی کوئی شرط نہیں ہے ہر شخص پر فرض ہوتا ہے کہ وہ دفاعی جہاد میں شریک ہو اور اپنا حق ادا کرے حتیٰ کہ عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس کے لئے بھی نکلنا واجب ہوگا ضرورت پر۔ یعنی عورت کو شوہر سے اجازت لینے کی ضرورت

نہیں، بیٹے کو باپ کی، غلام کو آقا کی اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دفاعی جہاد فرض عین ہوتا ہے۔ (بحوالہ تفسیر القرطبی)

جہاد کا مفہوم اور اس کی غرض وغایت پورے طور پر سمجھنے کے لئے ہم محض ایک آیت، ایک حدیث اور چند علماء کی بات یہاں پیش کرتے ہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبة:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں لڑائی کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ کفار ومشرکین کی خودمختاری اور بالادستی ختم ہوجائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین پر نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات دین حق کے ماننے والوں کے ہاتھوں میں آجائیں اور کفار ومشرکین ان کے ماتحت تابع اور مطیع بن کر رہیں۔ اس آیت سے قتال کی وجہ مذہبی تعذیب نہیں معلوم ہوتی بلکہ قتال کی وجہ اور علت دین حق کو نہ ماننا اور مشرکین کی بالادستی ہے۔

مسند امام احمد کی ایک لمبی حدیث کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

قال وما الجهاد قال ان تقاتل الكفار إذا لقيتم

یعنی پوچھنے والے نے پوچھا کہ جہاد کیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہاد یہ ہے کہ تم کفار سے لڑو جب کہ تمہاری ان سے مڈبھیڑ ہوجائے۔

بخاری شریف کے شارح ابن حجرؒ نے جہاد کی تعریف میں کہا ہے کہ:

وبذل الجهد في قتال الكفار.

یعنی جہاد نام ہے کفار سے جنگ میں کوشش کو خرچ کرنے کا۔

بخاری کے ایک دوسرے شارح کے الفاظ ہیں:

قتال الكفار لنصرة الاسلام واعلاء كلمة الله.

یعنی اسلام کی مدد اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کیلئے کفار سے جنگ کرنا جہاد ہے۔

صاحب درمختار نے لکھا ہے:

الدعاء الی الدین الحق وقتال من لم یقبله.

یعنی دین حق کی طرف بلانا اور جو اس کو قبول نہ کریں اس سے جنگ کرنا یہ جہاد ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے لکھا ہے کہ جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کفار سے جہاد بالسیف کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت، حدیث اور علماء کی باتوں سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ جہاد کے مفہوم میں اگرچہ کئی باتیں شامل ہیں لیکن جب جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے جہاد بالسیف ہی مراد ہوتا ہے پھر اوپر کی گفتگو سے یہ بات بھی اچھی طرح سے سمجھی جا سکتی ہے کہ جہاد بمعنی قتال کو برادر محترم نے ختم کرنے یا محدود کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ یا تو ناواقفیت کی بناء پر ہے یا پھر اس کا محرک کوئی ایسی چیز ہے جس کو ہم اپنی زبان پر بھی نہیں لا سکتے۔

بینک کا سود

''اس معاملہ میں کوئی حتمی رائے دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جس کو علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ سے طئے کیا جانا چاہئے۔ تاہم میں یہ کہنے کی جرأت کرونگا کہ کچھ لوگوں کی یہ تجویز قابل غور ہے کہ بینک کا انٹرسٹ کمرشیل انٹرسٹ ہوتا ہے اور ہم کو کمرشیل انٹرسٹ اور حاجاتی سود (Usury) میں فرق کرنا چاہئے۔

حاجاتی سود ایک طرفہ نفع اندوزی پر مبنی ہے اور اس کے حرام ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن کمرشیل انٹرسٹ نفع میں شرکت (Profit Sharing) کے اصول پر مبنی ہے اس اعتبار سے وہ ایک حق تک مضاربت کے اسلامی اصول سے مشابہت رکھتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مضاربت میں نفع اور نقصان دونوں میں شرکت ہوتی ہے اور بینک میں صرف نفع میں شرکت۔

لیکن مضاربت اگر کامیاب اصول ہے تو وہ اس لئے کامیاب اصول ہے کہ اس میں زیادہ امکان نفع کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر نقصان کا اندیشہ بڑھ جائے تو مضاربت کا اصول عملاً معطل ہو جائے گا۔ اس پہلو کو سامنے رکھا جائے تو مضاربت اور کمرشیل بینکنگ کا فرق زیادہ تر جزئی اور اضافی بن جاتا ہے نہ کہ کلی اور حقیقی۔''

(فکر اسلامی: صفحہ ۸۹)

بینک انٹرسٹ کے بارے میں آپ کے نزدیک علماء کی شوریٰ میں اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے اور آپ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے تو آپ اس کو آدھا جائز بتانے کی جرأت کیوں کر رہے ہیں؟

اسلامی مشن کیا ہے؟

''اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام کی ذمہ داری یا اسلامی مشن کا نشانہ لوگوں کے اوپر اسلامی سسٹم کا عملی نفاذ نہیں ہے بلکہ پرامن حدود میں رہتے ہوئے لوگوں کو اسلام سے باخبر کرنا ہے داعی اسلام کی ذمہ داری صرف اسلام پہنچانا ہے اس کے بعد اب مدعو کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو مانے یا اس کا انکار کردے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ:۱۴۱)

اس عبارت کی روشنی میں ہجرت اور جہاد، ایثار وقربانی کے متعلق ساری تعلیمات بلا وجہ کتاب وسنت اور تاریخ اسلام میں نظر آتی ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا کوئی محل نہیں ہوگا کہ آپ نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا الا الہ الا اللّٰہ

یعنی مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کا کلمہ پڑھ لیں۔

چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جو لوگ بھی ایمان نہیں لائے انہیں جزیرۃ العرب سے نکال دیا گیا یا انہیں قتل کردیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہوش وحواس رکھنے والا آدمی اس امر واقعہ کا انکار نہیں کرسکتا۔ جزیرۃ العرب کے باہر دنیا کو اتنی چھوٹ دی گئی ہے کہ وہ اسلام کا کلمہ نہیں پڑھتے تو نہ پڑھیں لیکن انہیں اسلام کا تابع بن کر رہنا ہوگا۔ نہیں معلوم اتنی بڑی بڑی حقیقتوں کا انکار کرنے کی برادر محترم کو کیسے جرأت ہوتی ہے؟

آسان اور مشکل چیز

''یہی بات حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسولؐ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان کا انتخاب کرتے تھے۔'' (بخاری)

برادر محترم نے حدیث کا آخری حصہ چھوڑ دیا ہے پوری حدیث یوں ہے:

نبی کو دو امر کے درمیان اختیار نہیں دیا گیا مگر ان میں سے آپ نے آسان ترین کو اختیار فرمایا جب کہ وہ گناہ نہ ہو، اگر وہ گناہ ہوتا تو آپ اس سے بہت زیادہ دور ہوتے اور آپ نے اپنی ذات کے لئے کبھی کسی معاملہ میں انتقام نہیں لیا الاّ یہ کہ اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی کسی چیز کی حرمت پامال کی جاتی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے لئے انتقام لیتے۔

اس حدیث کا ذکر کرتے ہوئے امام مسلمؒ نے جو باب باندھا ہے اس میں صراحت کردی ہے کہ یہاں انتخاب کی بات دو مباح چیزوں کے درمیان کے متعلق ہے۔ برادر محترم نے جس انداز میں اس حدیث کو پیش کیا ہے اس کو دیکھ کر ایک بچہ کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوگا کہ جب قریش مکہ نے کئی آسان چیزوں کی پیش کش

کی تو اللہ کے رسول ﷺ ان سب کو ٹھکرا کر ان سے کشمکش کے لئے کیوں بضد ہو گئے۔

اسلام کا سیاسی نظام

''جہاں تک خلافت یا اسلام کے سیاسی نظام کا سوال ہے، وہ ایک مشروط حکم ہے نہ کہ مطلق حکم۔ اس کے قیام کے لئے تشدد یا جنگ کا طریقہ اختیار کرنا کسی بھی طرح اسلام میں جائز نہیں کیوں کہ جب بھی ایسا کیا جائے گا تو موجودہ (Existing) نظام سے عملی ٹکراؤ پیش آجائے گا اور قائم شدہ نظام ایسی تحریک کو دبانے کے لئے طاقت کا استعمال کرے گا۔ اس طرح جو چیز پہلے چھوٹا شر (Lesser Evil) کے درجہ میں تھی وہ زیادہ بڑا شر (Greater Evil) کی سطح تک پہنچ جائے گی۔ مزید یہ کہ عملی ٹکراؤ پیش آنے کے نتیجہ میں پرامن دائرہ میں کام کرنے کے مواقع بھی برباد ہو جائیں گے۔ ایسا ہر اقدام قرآن کے الفاظ میں فَسَادٌ فِي الْأَرْضِ (۲:۵۲) قرار پائے گا۔ وہ ایک جرم ہوگا نا کہ کوئی اسلامی عمل۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۲)

یہاں اسلام کے سیاسی نظام یا خلافت قائم کرنے کو مشروط حکم بتانے کی وجہ یہ بتائی جارہی ہے کہ دوسری صورت میں برسر اقتدار نظام کو عملی ٹکراؤ کی ضرورت پیش آئے گی اور اس عملی ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو صورت حال پیش آئے گی وہ فساد فی الارض کی تعریف میں آئے گی یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ فساد فی الارض کی تعریف کیا اللہ کے رسول ﷺ، آپ کے صحابہؓ اور انبیاءؑ سابقین کو معلوم نہیں تھی؟ کہ یہ اللہ کے بندے جہاں بھی رہے اور گئے وقت کے نمرود، فرعون، ابوجہل، ابولہب سے ٹکراتے رہے۔

جنگ میں پہل

''قرآن کے مطابق دوسروں کے خلاف جنگ کا آغاز کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں (۹:۱۳) اسلام میں جنگ صرف دفاع کیلئے ہے نہ کہ جارحیت کیلئے (۲:۱۹۰) مزید یہ کہ اگر کوئی گروہ جنگ چھیڑنا چاہے تب بھی آخری حد تک اعراض کی کوشش کی جائے گی اسلام میں دفاعی جنگ بھی اسی وقت ہے جب کہ فریق ثانی نے عملی جارحیت کر کے کوئی انتخاب (Option) ہمارے لئے باقی نہ رکھا ہو'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۲ تا ۱۴۳)

اس موقع پر ہم برادر محترم سے تین باتیں عرض کریں گے۔ سورہ توبہ کی صرف اس آیت پر غور کیجئے،

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں سے لڑو، جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں لاتے جو اللہ اور اس کے رسول کی حرام

کردہ شئے کو حرام نہیں جانتے، نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے، یہاں تک کہ وہ ذلیل وخوار ہوکر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

اس آیت میں قتال کا جوحکم دیا گیا ہے۔ وہ دفاع کے لئے ہے یا اقدام کے لئے؟ دوسری بات یہ ہے کہ روم وفارس سے جوٹکراؤ ہوا تھا وہ ان ملکوں کی جارحیت کی بناء پر ہوا تھا یا بالقصد اظہار دین اور غلبۂ دین کے لئے ہوا تھا؟ تیسری بات ہم صاحب ہدایہ کے ایک جملہ کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرائیں گے وہ لکھتے ہیں:

''قتال الكفار واجب وان لم يبدؤنا''

یعنی کفار سے جنگ واجب ہے اس عبارت میں یہ بتانا ہرگز مقصود نہیں ہے کہ کفار کے ساتھ جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے اگر ایسی بات ہوتی تو ''واجب'' کے بجائے ''جائز'' کا لفظ استعمال ہوتا لفظ ''واجب'' پہل اور اقدام کو جائز ہی نہیں واجب بتاتا ہے۔ فتح القدیر میں ہے۔

''قتال الكفار الذين لم يسلموا وهم من مشركي العرب اولم يسلموا ولم يعطوا الجزية من غيرهم واجب وان لم يبدونا''

یعنی ان کفار سے جو ایمان نہ لائیں اور وہ مشرکین عرب میں سے ہوں یا غیر عرب میں سے جو ایمان نہ لائیں اور جزیہ نہ دیں جنگ واجب ہے اگر چہ کہ وہ پہل نہ کریں۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور صلح محض جائز ہے اور اس کا جواز بھی مشروط ہے۔

مسلم ملک یا غیر مسلم ملک

''مسلمان خواہ کسی مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں، دونوں حالتوں میں انہیں ملک کے دستور اور قانون کا پابند رہنا چاہئے۔ دستور اور قانون کی خلاف ورزی کرنا یا اسلام کے نام پر غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہونا کسی بھی حال میں مسلمان کے لئے جائز نہیں۔ قانون کی حد ہی ہمارے عمل کی حد بھی ہے۔ جہاں قانونی اجازت کی حد آجائے، اس کے بعد ہمارے لئے صبر ہے نہ کہ ٹکراؤ اور قانون شکنی۔

جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں یعنی ان ملکوں میں جہاں کی اکثریت غیر مسلم ہے اور وہاں ان کی مرضی کا سیاسی نظام قائم ہے وہاں مسلمان کی حیثیت معاہد کی ہے خواہ دونوں کے درمیان لفظی معاہدہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ وہاں بسنے والے مسلمانوں کے لئے ملکی قوانین وضوابط کی پابندی لازمی طور پر ضروری ہے۔ کسی بھی عذر کی بناء پر اس کی خلاف ورزی ان مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔

ان غیر مسلم ملکوں میں ہر جگہ اپنا ایک دستور اور قانونی نظام ہے۔ یہ دستور اور قانون کسی چیز کو جائز (Law Ful) اور کسی چیز کو ناجائز (Un Law Ful) قرار دیتا ہے۔ جب بھی کوئی مسلمان کسی ایسے ملک میں داخل

ہوتا ہے تو اپنے آپ ہی وہ ملک کے قانونی نظام کے تحت آجاتا ہے۔ ایسے مسلمان اور ایسے ملک کے درمیان اپنے آپ ایک خاموش معاہدہ قائم ہوجاتا ہے۔ وہ یہ کہ مذکورہ مسلمان اس ملکی نظام کا مکمل طور پر لفظی اور معنوی پابند رہے گا۔ کسی بھی حال میں وہ اس کی کھلی یا چھپی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔

ایسی حالت میں کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کیلئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کر کے وہاں رہے یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔ تیسرا انتخاب (Option) یعنی ملکی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے وہاں مقیم رہنا۔ یقینی طور پر ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ ایسا عمل سراسر ناجائز ہے۔ جو لوگ اس قسم کا تیسرا انتخاب اختیار کریں وہ اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہیں اور وہ بلاشبہ خدا کے یہاں سزاء کے مستحق قرار پائیں گے۔ ملکی نظام کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں اگر نظام سے ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ نہیں ہوگا بلکہ وہ ایک مجرمانہ فعل ہوگا۔ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ واپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کردیں نہ کہ اس کو دفاع قرار دے کر نظام کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسلامک ایکٹوزم صرف وہی ہے جو دعوت کی راہ سے اور دعوت کے اسلوب میں چلائی جائے۔ دعوت کے اسلوب میں کی جانے والی جدوجہد کو اس دنیا میں اللہ کی نصرت ملتی ہے۔ اسلئے صرف وہی دنیا میں کامیاب ہوتی ہے۔ دوسرے اسلوب کی کوئی جدوجہد خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ خواہ اس کا نام اسلامی اور قرآنی جدوجہد ہی کیوں نہ رکھ دیا گیا ہو۔" (فکر اسلامی، صفحہ: ۱۴۳ تا ۱۴۴)

اس پورے لمبے اقتباس میں کئی مسائل قابل غور ہیں

① مسلم اور غیر مسلم ملک: یعنی مسلمان حاکم اور غیر مسلمان حاکم۔ دونوں کو اطاعت کے معاملہ میں برابر نہیں رکھا جاسکتا قرآن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر "مِنۡكُمۡ" (یعنی تم میں سے) کا لفظ بھی آیا ہے۔ جس سے اس بات کی صراحت ہوجاتی ہے کہ جس "أُولِي الۡأَمۡرِ" یعنی صاحب اقتدار و اختیار کی اطاعت کا حکم دیا جارہا ہے وہ مسلمان ہو نہ کہ کافر مشرک۔ اسی کے ساتھ صراحت کے ساتھ کافر و مشرک کی اطاعت سے متعدد جگہ قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ اسلئے کافر و مشرک حکمراں کی اطاعت کی بات کرنی شرعی لحاظ سے بالکل نادرست ہے۔

② جو مسلمان غیر مسلم ملکوں میں رہتے ہیں ہم نے یہ مانا کہ ان کی حیثیت معاہد کی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ وہ معاہدہ کتنی مدت کے لئے ہے شرعی اعتبار سے کیا کوئی معاہدہ بلا معیاد بھی ہوسکتا ہے؟ اور پھر کیا وہ معاہدہ

ٹوٹ نہیں سکتا۔؟ اگر فریق ثانی اس معاہدہ کا لحاظ وخیال نہ کرے اور بار بار معاہدہ کی خلاف ورزی کرے دورِ نبویؐ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہودیوں سے کیا ہوا معاہدہ صرف اس وجہ سے کالعدم قرار پایا کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان عورت کے ساتھ ناشائستہ حرکت کی تھی۔

(۳) یہ آپ نے صحیح فرمایا کہ کسی غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کے لئے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے ایک تو وہ یہ کہ مذکورہ ملک کے قانون کی مکمل پابندی کرے یا اگر اس کو اس سے اختلاف ہے تو خاموشی کے ساتھ ملک کو چھوڑ کر وہاں سے باہر چلا جائے۔

تیسری صورت اختیار کرنے والا اسلامی اصول کے مطابق مجرم ہے یہ بات جس شکل میں برادر محترم نے پیش کی ہے وہ جزوی حیثیت سے صحیح ہو سکتی ہے لیکن اگر صورت حال یہ ہو ہمارے ملک پر کوئی غیر مسلم خواہ وہ انگریز ہوں یا اور کوئی، زبردستی قابض ہو گئے ہیں اور بزور ہم پر اپنا حکم چلا رہے ہوں تو کیا اس صورت میں بھی ایک مسلمان کیلئے صرف دو ہی راہیں ہیں؟ آخر جبر وظلم کے خلاف اس کیلئے اٹھنا کیوں صحیح نہیں ہوگا؟ اور وہ کیوں مجرم ہوگا اور وہ کیوں خدا کے یہاں سزا کا مستحق قرار پائے گا؟

(۴) ملکی نظام کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں نہیں بلکہ ملکی نظام اپنے معاہدہ یعنی اپنے دستور کی خلاف ورزی کرے اور اس صورت میں ٹکراؤ پیش آئے تو وہ دفاع کا مسئلہ کیوں نہیں ہوگا؟ وہ ایک مجرمانہ فعل کیوں ہوگا اور کس بنیاد پر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ ایسے موقع پر شریعت کا حکم یہ ہے کہ مسلمان ایک طرفہ واپسی کے ذریعہ ٹکراؤ کی حالت کو ختم کر دیں اور دفاع نہ کریں۔

(۵) اللہ کی نصرت ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت آئی جب کہ دعوت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ میدان بدر میں تین سَو تیرہ مسلمان اپنا سب کچھ لے کر آ گئے اور باطل کے خلاف اپنی آخری جان ومال کی پونجی قربان کر دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ دعوت، ہجرت اور جہاد کو ایک دوسرے سے مربوط رکھ کر آپ سوچیں تو صحیح نتیجہ تک پہنچیں گے ورنہ گمراہیوں کے لق ودق صحرا میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں گے۔

آپریشن رحمت کے خلاف نہیں ہے

> ''اسلام بنیادی طور پر ایک امن پسند مذہب ہے اسی لئے پیغمبر اسلام کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے یعنی سارے عالم کے لئے رحمت ۔گویا پیغمبر اسلام پیغمبر رحمت ہیں نہ کہ پیغمبر حرب۔ آپ ﷺ کا طریقہ (Non-Violence) ہے نہ کہ تشدد۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۵۲)

اس میں کیا شک ہے کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے جس طرح ایک ڈاکٹر صحت پسند ہونے کے باوجود

صحت ہی کے لئے نشتر چلانے پر مجبور ہوجاتا ہے اسی طرح ایک امن پسند مذہب امن کے لئے ہی حرب وضرب کا راستہ اختیار کرتا ہے جس طرح صحت کے لئے نشتر اور آپریشن کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح امن کی منزل تک پہنچنے کے لئے اسلام نے تلوار اٹھانے کو ضروری قرار دیا ہے کہ اگر نشتر چلانے والے ڈاکٹر کو بے رحم اور تشدد اختیار کرنے والا نہیں کہہ سکتے تو اسی طرح تلوار اٹھانے کی بات کرنے والے مذہب کو تشدد اور حرب کا مذہب نہیں کہہ سکتے وہ بہر صورت امن پسند مذہب ہی ہوگا۔

کوئی شرعی حکم معلوم کرنے کی وہی ترتیب ہے جو یمن جاتے ہوئے حضرت معاذؓ نے بتائی تھی اور جو اصول فقہ میں بھی بتائی گئی ہے کہ قرآن پھر سنت پھر اجماع اور پھر قیاس۔یعنی قیاس کا اصول اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب کہ قرآن اور سنت و اجماع میں حکم نہیں ملتا۔

قرآن وسنت اور اجماع کے ہوتے ہوئے قیاس نہیں کیا جاتا ہے اور بالکل سیدھی سی بات ہے کہ جب ایک حکم خدا اور رسول ﷺ سے ہمیں مل گیا تو پھر اپنی عقل لگانے کی کیا ضرورت، لیکن اس کے باوجود کوئی شخص اپنی عقل اور قیاس لگاتا ہے تو یہ بڑی گمراہی اور ضلالت کا کام ہوگا۔

فقہاء نے شراب اور نبیذ کی قدر مشترک علت کی بناء نبیذ کو حرام اس لئے قرار دیا کہ نبیذ کا حکم کتاب وسنت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں تھا اگر نبیذ کا حکم کتاب وسنت میں موجود ہوتا تو قیاس کی ضرورت کیوں پڑتی؟

جس طرح مسلم حکمراں کی اطاعت یا اس سے بغاوت کے سلسلہ میں واضح اور صریح حکم موجود ہے اسی طرح غیر مسلم حکمراں کے بارے میں بھی قرآن میں صریح ہدایات موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے قیاس کرنے کی کوشش کرنا شریعت کے صریح احکام کو ٹھکرا دینے کے برابر ہے۔قرآن میں جہاں پر اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کے بعد اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے وہاں پر "مِنْكُمْ" کی قید بھی لگائی گئی ہے یعنی وہ تم میں سے ہو، مسلمان ہو۔

پھر آیت کے آخری ٹکڑے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حاکم کی اطاعت بھی اسی وقت تک کی جائے گی جب تک اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی منشاء کے خلاف حکم نہیں دیتا اسی کو کہتے ہیں اللہ اور رسول ﷺ کے علاوہ کسی کی بھی اطاعت کی جائے گی تو وہ معروف میں کی جائے گی منکر میں نہیں۔اس کے ساتھ احادیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان حکمراں کا فسق برداشت کیا جائے گا اس کے خلاف بغاوت منع ہے اِلاَّ یہ کہ وہ صریح کفر کا ارتکاب کرے۔ یہاں سے یہ بات خود معلوم ہوجاتی ہے کہ کفر بواح کی صورت میں مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت جائز ہے ظاہر ہے کہ جب کوئی حکمراں سرے سے مسلم ہے ہی نہیں تو اس کی اطاعت کا کیا سوال؟ اور اس کے خلاف جانا کیوں منع ہوگا؟

غیر مسلم حکمراں کا معاملہ

خان صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسلم حکمراں کا معاملہ ہے، اس کے خلاف خروج کی حرمت صریح احادیث سے ثابت ہے۔ اسی لئے تمام علماء نے اس پر اتفاق کیا ہے۔ جیسا کہ اوپر کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکمراں اگر غیر مسلم ہو تو اس کے بارے میں شریعت اسلامی کا حکم کیا ہے۔

یہاں شریعت کا اصول قیاس ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ اصول فقہ میں یہ بات مسلم ہے کہ شرعی احکام کے ماخذ چار ہیں ......قرآن، سنت، اجماع اور قیاس۔ زیر بحث معاملہ میں قیاس کے اصول میں ہمارے لئے واضح رہنمائی موجود ہے۔

فقہ کی تمام اہم کتابوں میں قیاس پر بحث کی گئی ہے۔ شرعی قیاس کیا ہے، اس کو اصول فقہ کی کسی بھی کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فنی اصطلاحات سے قطع نظر، سادہ طور پر قیاس کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ اشتراک علت کی بنیاد پر کسی چیز کے بارے میں دوسری چیز کے مماثل حکم ثابت کرنے کا نام ہے اثبات مثل حکم معلوم فی معلوم اٰخر لاشتراکھما فی علۃ الحکم۔ (ناصر الدین البیضاوی، منہاج وصول: ۲/۳)

بیضاوی کے مذکورہ الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے دکتور صلاح الدین زیدان نے لکھا ہے کہ جب حکم کی علت میں مماثلت پائی جائے تو نتیجتاً حکم میں بھی مماثلت ہوگی (التماثل فی علۃ الحکم یؤدی الی التماثل فی الحکم، الدکتور صلاح الدین زیدان، حجیۃ القیاس، صفحہ ۲۳)

مثال کے طور پر شراب کے بارے میں یہ حکم ثابت ہے کہ وہ حرام ہے لیکن کھجور سے تیار کی گئی نبیذ کا حکم صراحتاً قرآن یا حدیث میں موجود نہیں۔ مگر فقہاء نے اس کو حرام قرار دیا ہے کیوں کہ نبیذ اور شراب میں ایک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ ہے دونوں کا مسکر یعنی نشہ آور ہونا۔ اب چونکہ اس قدر مشترک کی بناء پر شریعت نے شراب کو حرام ٹھہرایا ہے لہٰذا نبیذ اور کھانے پینے کی وہ ساری چیزیں جو مسکر (نشہ آور) ہیں ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو شراب کا حکم ہے۔

اس اصول قیاس کو سامنے رکھ کر مذکورہ معاملہ پر غور کیجئے تو جو بات سامنے آئے گی وہ یہ ہے کہ......پیغمبر اسلام نے صراحت کے ساتھ غیر عادل مسلم حکمرانوں کے خلاف خروج (بغاوت) سے منع فرمایا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس قسم کا اقدام زیادہ بڑا نقصان، بدامنی اور جان و مال کی تباہی پیدا کرے گا۔

معلوم ہوا کہ اس ممانعت کی اصل علت شدید تر برائی کا پیدا ہونا ہے۔ یہ شدید تر برائی اس وقت بھی پوری طرح ظہور میں آئے گی جب کہ حکمراں غیر مسلم ہو۔ گویا دونوں جگہ علت کا اشتراک پایا جا رہا ہے اور جب علت مشترک ہے تو شرعی اصول کے مطابق حکم بھی مشترک ہوگا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شریعت میں جس طرح غیر عادل مسلم حکمراں کے خلاف بغاوت ناجائز ہے اسی طرح غیر مسلم حکمراں کے خلاف بھی بغاوت ناجائز ہے خواہ وہ لوگوں کو غیر عادل کیوں نہ دکھائی دیتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس خاص مسئلہ میں مسلم حکمراں اور غیر مسلم حکمراں کا فرق محض اضافی ہے۔ کیونکہ حکمراں کے خلاف خروج کی ممانعت اس لئے نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ یہ ممانعت صرف اس لئے ہے کہ اس قسم کا فعل زیادہ بڑا شر پیدا کرنے کا سبب بنے گا۔ ایسا اقدام عملی طور پر الٹے نتیجہ والا (Counter Productive) ثابت ہوگا۔ اٹھنے والا اپنے خیال کے مطابق توظلم کو ختم کرنے کے لئے اٹھے گا۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے عظیم تر ظلم ظہور میں آئے گا۔'' (فکر اسلامی، صفحہ:۱۵۶)

اوپر کا پورا لمبا اقتباس بے علمی اور بے خبری کی اپنی آپ ایک نادر مثال ہے شرعی احکام کے چار ماخذ ہیں کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ مگر اتنا معلوم ہونا کافی نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ ان میں سے کس کا کیا مقام ہے اور ان میں کیا ترتیب ہے؟

ورنہ ہوگا یہ کہ **ایک** ہی مسئلہ میں ایک شخص قرآن کو پکڑ کر ایک طرف جائے گا۔ **دوسرا** سنت کو لے کر دوسری طرف، **تیسرا** اجماع اور **چوتھا** قیاس کو لے کر تیسری اور چوتھی طرف جائے گا اس لئے ترتیب کا لحاظ ضروری ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللّٰهَ وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا

(الاحزاب:۱)

ترجمہ: اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو حقیقت میں علیم وحکیم تو اللہ ہی ہے۔

یہی بات اسی سورہ کی آیت نمبر ۴۸ میں بھی کہی گئی ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۲)

ترجمہ: پس اے نبی! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لیکر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا (الکہف:۲۸)

ترجمہ: کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط وتفریط پر مبنی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ. (سورۂ محمد:۲۶،۲۵)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ ہدایت واضح ہو جانے کے بعد اس سے پھر گئے ان کیلئے شیطان نے اس روش کو آسان بنا دیا ہے اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کے لئے دراز رکھا ہے اسی لئے انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہیں مانیں گے اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔

خاص طور سے اس آخری آیت پر غور کیجئے کتنی سخت بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ ان کے لئے اپنی اطاعت کا دم بھرتے ہیں جنہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی وحی کو ناپسند کیا ہے وہ گویا ارتداد کے مجرم ہیں یہ بھی حکم ان پر لگایا جا رہا ہے جو بعض معاملات میں کفار کی بات ماننے اور اطاعت کرنے کی بات کرتے ہیں اس پر ان لوگوں کے انجام کو قیاس کیا جاسکتا ہے جو مجبوری اور اضطرار کی وجہ سے نہیں بلکہ خوش دلی کے ساتھ اور جائز سمجھتے ہوئے کفار و مشرکین کی اطاعت کرتے ہیں۔

پھر ذرا سوچئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے خلاف بغاوت کی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کی تابعداری سے انکار کیا، ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرداران قریش کی بات نہ مانی اور اس کی وجہ سے پورے ماحول کا سکون وچین ختم ہو گیا اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے نعوذ باللہ یہ فساد فی الارض تھا؟

ایک عجیب تنقید

برادر محترم لکھتے ہیں کہ

''مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک کتاب ''تنقیحات'' ہے۔ اس میں مصنف کے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جو انہوں نے اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم پر لکھے تھے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ مغربی تہذیب سراسر باطل تہذیب ہے۔ دہریت، الحاد، لامذہبیت اور مادہ پرستی نے اس کو پیدا کیا ہے۔ مذہب کے خلاف عقل وحکمت کی لڑائی نے اس تہذیب کو جنم دیا ہے (صفحہ ۹) اسلام کے اصول تمدن وتہذیب مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں (صفحہ ۲۵) وہ تخم خبیث جو مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے زمانہ میں بویا گیا تھا، چند صدیوں کے اندر تمدن وتہذیب کا ایک عظیم الشان شجر خبیث بن کر اٹھا ہے جس کے پھل میٹھے مگر زہر آلود ہیں۔ جس کے پھول خوش نما مگر خار دار ہیں۔ جس کی شاخیں بہار کا منظر پیش کرتی ہیں مگر وہ ایسی زہریلی ہوا اگل رہی ہیں جو نظر نہیں آتی اور اندر ہی اندر نوع بشری کے خون کو مسموم کئے جا رہی ہیں۔'' (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۸-۲۹)

اس قسم کے مضامین صرف جدید تہذیب سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اس بے خبری کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ زمانہ کے علماء کے لئے یہ تہذیب صرف نفرت وحقارت کا موضوع بن گئی۔ وہ اس کے اندر چھپے ہوئے مثبت امکانات کو دریافت کرنے سے قاصر رہے۔ اور اسی لئے وہ اس کو اپنے حق میں استعمال بھی نہ کر سکے۔''

(فکر اسلامی، صفحہ: ۲۰۳)

اس عبارت کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے مغربی تہذیب کی خوب تعریف کی ہوتی تو مولانا کو برادر محترم باخبر ہونے کا اعزاز دیتے لیکن انہوں نے مغربی تہذیب کو اس کے اپنے رنگ میں پیش کیا اس لئے وہ بے خبری کے طعنہ کے سزاوار ٹھہرے۔ یہ کیسا عجیب معیار تنقید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو راہ ہدایت پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ایک آیت قرآنی سے غلط استدلال

خان صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن میں ایک آیت معمولی لفظی فرق کے ساتھ دو جگہ آئی ہے۔ سورۃ البقرۃ ۱۹۳ اور سورۃ الانفال ۳۹۔ آخر الذکر آیت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ

ترجمہ: اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے ہوجائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ دیکھنے والا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔

فتنہ کے لفظی معنی آزمائش اور ابتلاء ہیں (لسان العرب ۱۳/ ۳۱۷)

صحیح بخاری (کتاب النکاح) میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ما ترکت بعدی فتنة اضر علی الرجال من النساء (فتح الباری ۹/۴۱)

یعنی میں نے اپنے بعد کوئی آزمائش نہیں چھوڑی جو مردوں کے اوپر عورتوں سے زیادہ ضرر رساں ہو۔

مذکورہ آیت میں فتنہ کا لفظ بھی اسی معنی میں ہے۔ امام حسن بصری تابعیؒ (۲۱-۱۱۰ھ) نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ......

حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ کا مطلب ہے: حتی لایکون بلاء (تفسیر طبری ۹/۲۴۸) یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ آزمائش کی حالت باقی نہ رہے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو مذہبی ایذاء رسانی (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ اسلام سے پہلے پوری تاریخ میں مذہب کی آزادی نہ تھی جو طبقہ برسر اقتدار ہوتا وہ اپنے سواء دوسرے مذہب کے لوگوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ اس سے الگ کسی اور مذہب کو مانیں، یا کسی اور مذہبی طریقہ پر عمل کریں۔

ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں اسلام جب عرب میں شروع ہوا تو اس وقت وہاں شرک اور مشرکین کا غلبہ

تھا۔ انہوں نے پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنایا۔ کیوں کہ ان کا عقیدہ مشرکین کے عقیدہ سے مختلف تھا وہ ان کے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ پر خدا کی عبادت کرتے تھے۔ یہ ظلم و ستم آخر کار جنگ تک پہنچا۔ اس وقت اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ ان لوگوں سے لڑو۔ یہاں تک کہ مذہبی جبر کا خاتمہ ہوجائے۔ ہر آدمی اپنی پسند کا مذہب اختیار کرنے کیلئے آزاد ہوجائے۔

آیت کا دوسرا حصہ: وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ

یہ پہلے حصہ کی مزید وضاحت ہے۔ آیت کے پہلے حصہ میں جو بات سلبی انداز میں کہی گئی ہے، اسی بات کو دوسرے حصہ میں ایجابی انداز میں دہرایا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ..... فتنہ کو ختم کردو، تاکہ عدم فتنہ کی حالت دنیا میں پوری طرح قائم ہوجائے۔

اس آیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے۔ یعنی اس سے مراد وہ دین نہیں ہے جو الفاظ کی صورت میں ہمیں عطا کیا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ قانون فطرت ہے جو غیر ملفوظ طور پر براہ راست خدا کی طرف سے سارے عالم میں نافذ ہے۔

قرآن میں دین کا لفظ اس دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً فرمایا:

وَلَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَلَهُ الدِّينُ وَاصِبًا أَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُونَ (النحل:۵۲)

ترجمہ: یعنی خدا ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اسی کے لئے دین ہے (ساری کائنات میں) ہمیشہ، پھر کیا تم اللہ کے سواء کسی اور سے ڈرتے ہو۔

سورہ نحل کی اس آیت میں دین سے مراد وہ دین فطری یا قانون فطری ہے جو بالفعل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے۔ اس معلوم واقعہ کو بطور شہادت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کی قدرت اتنی زیادہ ہے کہ وہ ساری کائنات کو ہر آن ابدی طور پر مسخر کئے ہوئے ہے تو تم کو اسی سے ڈرنا چاہئے، اور اپنی آزادی کو اسی کی ماتحتی کے دائرہ میں استعمال کرنا چاہئے''۔ (فکر اسلامی، صفحہ: ۲۳۵-۲۳۶)

اوپر قرآنی آیت پر برادر محترم کے خیالات آپ نے پڑھ لئے۔ یہ آیت چونکہ موصوف کے فکری قلعہ کو بالکل منہدم کردیتی ہے اس لئے بھرپور زور لگایا ہے آیت کی ایک غلط تفسیر کرنے میں۔

آیت میں حکم قتال کی جو وجہ بتائی جارہی ہے وہ وجہ بظاہر دو معلوم ہورہی ہے ایک فتنہ کو ختم کرنے اور دوسرے پورا دین اللہ کے لئے ہونے کے لئے۔ لیکن بات ایک ہی ہے جس کا منفی اور مثبت دونوں پہلو کھول کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب تک فتنہ ختم نہیں ہوگا اس وقت تک یہ نہیں کہا جاسکتا کہ پورا دین اللہ کے لئے ہوگیا اسی طرح جب تک پورا دین اللہ کے لئے نہ ہوگا اس وقت تک فتنہ کا ختم ہونا نہیں سمجھا جاسکتا۔ برادر محترم کے مطابق آج فتنہ ختم ہوگیا ہے اس لئے حکم قتال بھی باقی نہیں رہا۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ فتنہ ختم ہوگیا۔ تو کیا

پورا دین اللہ کیلئے ہوگیا ہے۔ یہ مشکل سوال تھا موصوف کیلئے، جس کی وجہ سے انہوں نے دین کا مفہوم ہی بدل دیا۔ اور فرما دیا کہ اس آیت میں دین کا لفظ دین شرعی کے معنی میں نہیں ہے بلکہ دین فطری کے معنی میں ہے لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا کہ دین فطری یا قانون فطری تو بالکل ساری کائنات میں مستقل طور پر ہر آن قائم ہے اس کیلئے حکم قتال دینے کی ضرورت کیا تھی۔ تکوینی طور پر کائنات کا ذرہ ذرہ حتی کہ کافر اور مشرک بھی مومن اور مسلم ہے۔ تکوینی اسلام کی دعوت لے کر انبیاء نہیں آئے۔ ہمیشہ تشریعی اسلام ان کا موضوع رہا ہے۔

آیت کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے تین سوالوں کا جواب معلوم کیجئے۔

① فتنہ سے کیا مراد ہے؟

② دین سے کیا مراد ہے؟

③ کفار کے باز رہنے کے کیا معنی ہیں؟

ان سوالوں کا جواب ہم عربی مفسرین کے الفاظ میں یہاں دیتے ہیں۔

عربی میں مختصر ترین مشہور تفسیر، تفسیر جلالین ہے جو درس نظامی کا ایک اہم جزء ہے اور عموماً ابتدائی درجات میں پڑھائی جاتی ہے۔

"قاتلوهم حتى لا تكون "توجد "فتنة"، شرك"، ويكون الدين"، العبادة لله وحده لا يعبد سواه "فان انتهوا"، عن الشرك۔

اس عبارت میں تینوں سوالوں کا جواب آ گیا ہے ایک اردو داں بھی سمجھ سکتا ہے۔ ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے، فتنہ کی تفسیر شرک سے، دین کی تفسیر عبادت سے کی گئی ہے پھر کس چیز سے باز آنا ہے بتایا "**عن الشرك**" شرک سے۔

تفسیر القرطبی میں ہے:

هو الأمر بقتال مطلق لا بشرط ان يبدأ الكفار دليل ذلك قوله تعالى "ويكون الدين لله"، وقال عليه السلام امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فدلت الاية والحديث على ان سبب القتال هو الكفر لانه قال حتى لا تكون فتنة، اى كفر الخ۔

یہ مطلق قتال کا حکم ہے اس شرط کے ساتھ نہیں کہ کفار جنگ کی ابتداء کریں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ "**وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ**" اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں

یہاں تک کہ لوگ لا الہ الا اللہ کہہ دیں پس آیت اور حدیث دونوں سے معلوم ہوا کہ قتال کا سبب ان کا کفر ہے کیونکہ قرآن میں "حَتّٰی لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" آیا ہے فِتْنَةٌ یعنی کفر۔

تفسیر روح المعانی میں ہے:

المراد من "الفتنة" الشرک

یعنی فتنہ سے مراد شرک ہے۔

والتقدیر "فان انتھوا" واسلموا

تقدیر کلام یوں ہے پس وہ اگر باز آ جائیں اور اسلام قبول کرلیں۔ طوالت سے بچنے کے لئے تفسیر امام رازی کا صرف ایک فقرہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

فصار التقدیر کانه تعالی قال وقاتلوھم حتی یزول الکفر ویثبت الاسلام.....

پس تقدیر کلام یوں ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ کفر ختم ہو جائے اور اسلام کو ثبات مل جائے۔

مفسرین کی ان تصریحات کے خلاف جانے کی بناء پر برادر محترم کو کئی بے تکی تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے اور یہ کہہ کر تو غضب ڈھا دیا کہ دین سے مراد لفظوں میں آیا ہوا دین نہیں ہے۔

جاہلیت کے خلاف جنگ

(۱۹۹۷ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

جاہلیت کیا ہے؟

بعثتِ رسول ﷺ سے پہلے زمانہ کو دور جاہلیت کہا جاتا ہے جب کہ اللہ کے بندے نہ اللہ و رسول کو جانتے تھے اور نہ دین و شریعت سے واقف تھے۔ غرور، نخوت اور قبیلہ اور قوم کی عصبیت بے جا میں مبتلا تھے۔ مال و دولت اور جاہلانہ روایات پر فخر و مباہات کا ان میں عام چلن تھا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا. (آل عمران:۱۵۴)

ترجمہ: پھر اللہ نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا۔ یعنی نیند جو آ کر تم میں سے ایک گروہ پر چھائی جا رہی تھی اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ وہ اللہ کے بارے میں خلاف حق زمانہ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے وہ کہتے ہیں کہ اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ ان سے کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوتے ہیں، جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (المائدۃ:۵۰)

ترجمہ: تو کیا یہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ اللہ پر یقین رکھتے ہیں، ان کے نزدیک اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔

اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ (الفتح:۲۶)

ترجمہ: جب کہ ان کافروں نے اپنے دلوں میں جاہلانہ حمیت بٹھالی۔

ایک موقعہ پر ایک شخص نے کسی سے کہا۔ تم کالی عورت کے بیٹے ہو تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ''انک امر ءفیک جاھلیة،، تم ایک ایسے آدمی ہو جس میں جاہلیت ہے۔

اوپر ذکر کردہ پہلی آیت میں اللہ کے بارے میں برا گمان رکھنا، زندگی اور موت، نفع اور نقصان کا بالکلیہ اللہ کو مالک نہ ماننے کو جاہلیت بتایا گیا۔ دوسری آیت میں اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے طالب ہونے اور خدا کی شریعت پر کسی دوسرے قانون کو ترجیح دینے کو جاہلیت کہا گیا۔ تیسری آیت میں حق و صداقت کے بجائے کسی دوسرے محرک کے تحت کام کرنے کو جاہلیت قرار دیا گیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کے ارشاد میں رنگ روپ کو عزت و ذلت کا معیار سمجھنا جاہلیت میں شامل ہونا بالکل ظاہر ہے۔

معلوم ہوا کہ جاہلیت کا تعلق کسی زمانہ سے نہیں ہے، بلکہ حق کے خلاف عقائد خیالات، جذبات اور اعمال و اخلاق کا نام جاہلیت ہے۔ اس طرح لفظ جاہلیت پورے طور سے اسلام کی ضد اور بالمقابل لفظ ہے۔ اسلام کی بنیاد سراسر علم پر ہے۔ تمام حقائق کا علم رکھنے والے کی طرف سے بھیجا ہوا دین ہے۔ عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنی میں کہا گیا تھا کہ اس وقت علم کے بغیر محض وہم وگمان، قیاس یا نفسانی خواہشات کے تحت انسانوں نے اپنے لئے زندگی کے طور طریقے بنا لئے تھے۔ لہٰذا یہ طرز عمل جہاں اور جس دور میں بھی انسان اختیار کرے گا اسے بہر حال جاہلیت کا ہی طرز عمل کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ محض جزوی علم ہے، جو انسان کی رہنمائی اور ہدایت کے لئے کافی نہیں ہوسکتا، لہٰذا خدا کے بھیجے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو طریقہ زندگی اور نظام زندگی جزوی علم کے ساتھ ظن وتخمین، اوہام و قیاسات اور ہوائے نفس کی آمیزش کر کے بنا لئے جائیں گے، وہ بھی اسی طرح جاہلیت کی تعریف میں آئیں گے جس طرح عرب جاہلیت کے طرز فکر و عمل کو جاہلیت کہا گیا ہے۔

حضرت جعفر طیار ؓ نے ہجرت حبشہ کے موقع پر شاہ حبشہ کے سامنے جاہلیت کو اس طرح بیان کیا تھا ''اے بادشاہ ہم جاہلیت والی قوم تھے۔ بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔ فحش کام کرتے تھے۔ رشتوں کا لحاظ نہیں کرتے تھے اور پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کرتے تھے۔ ہمارا طاقتور کمزور آدمی کو کھا جاتا تھا۔''

قرآن میں مشرکین اور اہل کتاب کے جن جن اعتقادات اور اعمال کی تردید کی گئی ہے وہ سب جاہلیت میں داخل ہیں۔ اس جاہلیت کے خلاف پورا قرآن سراپا اعلان جنگ ہے۔ رسول خدا ﷺ کی تیئیس ۲۳ سالہ زندگی اسی

جاہلیت کے خلاف لڑنے میں گزری۔ آپ نے کسی مرحلہ میں جاہلیت کے ساتھ مصالحت اور سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ میلان اور جھکاؤ تک کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور کیسے کر بھی سکتے تھے جب کہ قرآن نے مصالحت اور جھکاؤ سے قطعی طور سے منع کر دیا تھا اور بار بار تاکید کی گئی اور وعیدیں سنائی گئیں۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ○ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (الکافرون:۱،۲)

ترجمہ: کہہ دو! اے کافرو! میں ان کی عبادت نہیں کرتا جن کی تم عبادت کرتے ہو۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ○ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم:۸،۹)

ترجمہ: لہٰذا تم ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آؤ یہ تو چاہتے ہیں کہ کچھ تم مداہنت کرو تو یہ بھی مداہنت کریں۔

وَ اِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا ○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا ○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا ○ (الاسراء ۷۵-۷۳)

ترجمہ: اے نبی! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے۔ تاکہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گھڑو۔ اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

وَ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ○ قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ○ (الانعام ۵۵-۵۶)

ترجمہ: اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں تاکہ مجرموں کی راہ بالکل نمایاں ہو جائے۔ اے نبی! ان سے کہو کہ تم لوگ اللہ کے سوا جن دوسروں کو پکارتے ہو ان کی بندگی کرنے سے مجھے منع کیا گیا ہے۔ کہو میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا۔ اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا۔ راہِ راست پانے والوں میں نہ رہا۔

قرآن کی ان جیسی تصریحات اور کھلے اعلانات کے بعد جاہلیت کے مقابلہ میں مکمل سپردگی، مکمل پسپائی اور پورے طور سے ہتھیار ڈال دینے کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے بلکہ نرمی، جھکاؤ اور مداہنت کی بھی گنجائش ختم ہوگئی۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے خیر و شر اور حق و باطل کے تصادم اور معرکہ آرائی کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ یہی ابتلاء اور آزمائش کا موڑ ہے۔ یہی صبر و ثبات اور استقامت کا مقام ہے۔ اسی موڑ سے حق و باطل کے قافلوں کی راہیں الگ الگ ہوجاتی ہیں۔ اسی مقام پر معلوم ہوتا ہے کہ کون صحیح معنی میں حق پرست اور مخلص ہے اور کون محض حق کا دعویدار اور ایمان و یقین میں ناپختہ اور کچا ہے۔ خبابؓ بن ارت بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ خانہ کعبہ میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہم نے مشکلات اور مصائب کی شکایت کی اور کہا کہ کیا آپ اللہ سے مدد کے لئے دعا نہ فرمائیں گے۔ یہ سن کر آپ نے ارشاد فرمایا۔ تم سے پہلے کے لوگ تھے انہیں گڑھے میں ڈال دیا جاتا تھا۔ ان کے سر پر آرا رکھ کر چیر دیا جاتا تھا اور لوہے کی کنگھی سے گوشت ان کی ہڈی سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ پھر بھی یہ چیز انہیں دین سے پھیر نہ سکی اور تم اتنے ہی میں گھبرا گئے۔

قرآن میں اصحاب الاخدود کے قصہ کو بطور مثال پیش کیا گیا کہ انہیں آگ کے الاؤ میں ڈال دیا گیا اور انہوں نے اس طرح جان دینی گوارا کر لی مگر دین سے نہ پھرے۔ ان کے واقعہ میں ہے کہ ایک عورت آگ میں جانے سے کترا رہی تھی۔ اللہ نے اس کے شیر خوار بچہ کو گویائی دے دی اور بچہ بول پڑا امی صبر کرو آپ حق پر ہیں۔

حبیب بن زید انصاریؓ کا واقعہ ہے کہ مسیلمہ کذاب نے ان سے کہا کہ کیا تم گواہی دیتے ہو کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ انہوں نے کہا ہاں۔ پھر اس نے کہا کیا تم گواہی دیتے ہو کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو انہوں نے کہا۔ میں نہیں سنتا۔ وہ سوال کرتا جاتا اور ان کے جسم کا تھوڑا تھوڑا حصہ کاٹا جاتا۔ لیکن وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہے اور ذرہ برابر مداہنت سے کام نہیں لیا۔

دور فاروقی میں عبداللہ بن حذافہ سہمیؓ کو ایک جنگ میں رومیوں نے قید کرلیا۔ انہیں شاہ روم کے سامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا تم نصرانی بن جاؤ، میں تم کو اپنی بادشاہت میں شریک کرلوں گا اور اپنی بیٹی سے تمہاری شادی کردوں گا تو انہوں نے جواب دیا تم اگر پوری سلطنت دے دو اور عرب کی پوری ملکیت دے دو تو بھی میں دین محمدی ﷺ سے ایک لمحہ کے لئے بھی نہ پھروں گا۔ اس جواب کو سن کر بادشاہ نے دھمکی دی کہ میں تم کو قتل کردوں گا۔ بولے تم جو چاہو کرو۔ اس کے بعد انہیں سولی پر لٹکا دیا گیا اور تیر انداز انہیں تیر مارنے لگے اور ساتھ ہی نصرانیت قبول کرنے کی ترغیب دیتے رہے۔ لیکن وہ انکار کرتے رہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے ان کو سولی سے اتارنے کا حکم دیا۔ انہیں اتار دیا گیا پھر کیا ہوا۔ ان کی نظروں کے سامنے ایک مسلمان قیدی کو لایا گیا

اور اسے کھولتے پانی میں ڈال دیا گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہوگیا۔ یہ دکھا کر حضرت عبداللہ سے کہا گیا۔ نصرانیت قبول کرو ورنہ تمہارا بھی یہی حشر ہوگا۔ مگر وہ ذرہ برابر بھی متزلزل نہ ہوئے اور کسی نرمی کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس کے بعد ان کو بھی کھولتے ہوئے پانی میں ڈالنے کے لئے اٹھایا گیا۔ اس وقت ان کی آنکھ سے آنسو نکل گئے یہ دیکھ کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ اب یہ آدمی ڈر گیا ہے لہٰذا نصرانیت قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے گا۔ فوراً حکم دیا کہ اس آدمی کو میرے پاس لایا جائے۔ وہ لائے گئے اور نصرانیت قبول کرنے کی بات دہرائی گئی تو بھی ان کی کیفیت میں کسی طرح کی تبدیلی نہیں پائی۔ جب رونے کا سبب بادشاہ نے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ میں صرف اس لئے رویا کہ میرے پاس ایک ہی جان ہے، جو اس وقت ختم ہوجائے گی۔ اے کاش! میرے جسم میں جتنے بال ہیں اتنی ہی جانیں ہوتیں، جن کو فی سبیل اللہ یہ سزا دی جاتی۔ یہ جواب سن کر بادشاہ حیرت زدہ رہ گیا۔ اور نہایت متاثر ہوا اور کہا کہ میرے سر کو تم بوسہ دو میں تم کو آزاد کردوں گا۔ حضرت عبداللہ نے کہا تمام مسلمان قیدیوں کو آزاد کردو گے؟ بادشاہ نے کہا ہاں۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے سر کو بوسہ دیا اور سب مسلمان آزاد ہوگئے۔

عبداللہ بن حذافہؓ جب آئے تو بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا گیا حضرت عمر فاروقؓ نے کہا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ وہ عبداللہ بن حذافہؓ کے سر کو بوسہ دے اور سب سے پہلے میں ان کو بوسہ دیتا ہوں۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ایمان ویقین کی یہ کون سی منزل ہے جہاں ہمارے اسلاف پہنچے ہوتے تھے کہ حیرت میں ڈال دینے والے اعمال کا ان سے صدور ہوتا اور جان دے دینا ان کے لئے آسان تھا۔ حکمت اور مصلحت کے نام پر کوئی حیلہ بہانہ کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتے۔ رخصت، جواز اور گنجائش تلاش کرنے کے بجائے مشکلات اور خطرات کو جیسے خود دعوت دے رہے ہیں اور باطل کے مقابلہ میں نرمی اور مداہنت کو غیرت ایمانی کے منافی سمجھتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حبشہ کی جانب ہجرت کی نیت سے نکلے۔ ایک مقام برک غماد تک پہنچے تو قبیلہ قارہ کا سردار ابن دغنہ ملا۔ اس نے پوچھا کہاں کے ارادے ہیں؟ حضرت صدیق نے کہا۔ میری قوم نے مجھے نکال دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زمین میں جہاں چاہوں پھروں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن دغنہ نے کہا آپ جیسا آدمی جو مصائب میں لوگوں کی مدد کرتا ہے۔ صلہ رحمی کرتا ہے۔ مجبور کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ محتاج کی حاجت روائی کرتا ہے اور مہمان کی ضیافت کرتا ہے۔ اس کو کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ آپ کو میں پناہ دیتا ہوں۔ اس کے بعد ابن دغنہ حضرت صدیقؓ کو مکہ واپس لائے اور کہا کہ آپ یہاں اپنے رب کی عبادت کیجئے۔ ساتھ ہی

ابن دغنہ نے پورے مکہ میں اعلان کر دیا کہ ابوبکر کو میں نے پناہ دی ہے۔ یہ سن کر قریش نے کہا ٹھیک ہے، لیکن ابوبکر سے کہو کہ اپنی نماز اور عبادت خاموشی سے ادا کریں۔ اعلان نہ کریں اور ہمیں تکلیف نہ دیں۔ اندیشہ ہے کہ ہمارے بچے اور عورتیں فتنہ میں پڑ جائیں گے۔ حضرت صدیقؓ اس طرح سے اپنے دن گزار رہے تھے۔ قریش کے بچے اور عورتیں حضرت کی قرأت سنتے، نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے۔ اس سے قریش کو پریشانی شروع ہوگئی اور بار بار ابن دغنہ سے شکایت کرنے لگے۔ آخر کار اس نے حضرت صدیقؓ سے کہہ دیا کہ اگر آپ خاموشی سے نہیں رہنا چاہتے تو میرا ذمہ واپس کر دو اور جہاں مرضی ہو چلے جاؤ۔ پھر کیا تھا بلا تأمل حضرت صدیقؓ نے اس کا ذمہ واپس کر دیا اور کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی پناہ کافی ہے اور میں اس کی مرضی پر راضی برضا ہوں۔ ظاہر ہے ان کیلئے کوئی محفوظ مقام نہ تھا۔ کوئی پناہ گاہ نہ تھی لیکن غیرت ایمانی نے کسی طرح کی بے مائیگی کا اظہار نہ کیا اور انہیں یہ برداشت نہ ہوا کہ محض سہولت اور آسائش کی خاطر اہل مکہ کے خوف کو اپنے اوپر اثر انداز ہونے دیں اور حالات کے دباؤ کے تحت کوئی حکمت عملی اپنانے کیلئے آمادہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ جب ایمان لائے تو لوگوں سے پوچھا کہ کسی بات کو بہت زیادہ عام کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ لوگوں نے بتایا جمیل بن عامر، حضرت فاروقؓ جمیل کے پاس گئے۔ اس سے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے محمد کا دین قبول کرلیا ہے اور میں مسلمان ہوگیا ہوں؟ یہ سنتے ہی جمیل سیدھے خانۂ کعبہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں پہنچ کر خانۂ کعبہ کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بلند آواز سے پکارا۔ قریش کے لوگو! تمہیں معلوم ہے ابن خطاب بے دین ہوگیا ہے۔ حضرت فاروقؓ بھی اس کے پیچھے تھے زوردار آواز میں بولے۔ اس نے جھوٹ کہا میں مسلمان بن گیا ہوں۔ یہ سنتے ہی کئی لوگ حضرت عمرؓ سے ہاتھا پائی کرنے لگے اور حضرت بھی اپنی مدافعت کرنے لگے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ حضرت اکیلے تھے، تھک کر بیٹھ گئے اور لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ حضرت نے کہا اس وقت تم جو چاہو کرلو۔ لیکن اگر ہم تین سو ہو گئے تو خدا کی قسم تمہاری مجال نہیں کہ تم کچھ کرسکو۔ یہ تنازعہ چل ہی رہا تھا کہ قریش کا ایک معمر آدمی آ گیا اور اس نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور کہا کہ ایک آدمی نے اپنے لئے ایک چیز پسند کر لی ہے، اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ بنی عدی کے لوگ اپنے ایک آدمی کے ساتھ تمہارے اس سلوک کو گوارا کرلیں گے۔

حضرت فاروقؓ کے اس طرز عمل کی کیا توجیہ کی جائے۔ ہمارے ذہنوں میں دعوتی حکمت اور حکمت عملی کا جو تصور جما ہوا ہے اس سے اس طرز عمل کا کوئی میل نہیں ہے۔ ہمارا دانشور تو یہی کہے گا کہ یہ طرز فکر تو ''آ بیل مجھے مار'' کے مترادف ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ کسوٹی ہماری دانشوری اور حکمت عملی نہیں ہے بلکہ نمونۂ عمل سلف

صالحین کے عمل کو ہی بنانا زیادہ صحیح ہے۔اس اصول کے تحت ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ ایمان آگ کی ایک ایسی چنگاری ہے جو دیر تک راکھ میں دبی نہیں رہ سکتی۔اور دبانے پر شعلہ بن جانے سے اسے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ساتھ ہی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایمان ویقین کا جہاں عقل وخرد اور دانشوری کے جہاں سے بہت آگے ہے۔

شاید یہی بات ہے جو علامہ اقبالؒ کہنا چاہتے ہیں۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

دیکھئے۔ایک روز اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمع ہیں۔گفتگو چل رہی ہے کہ قریش نے ابھی قرآن نہیں سنا ہے کون ہے جو ان کو سنانے کی ہمت کرے۔عبداللہ بن مسعودؓ بول پڑے ''میں''۔ساتھیوں نے کہا تمہاری جان کو خطرہ ہے۔اس کے لئے کسی ایسے آدمی کو اٹھنا چاہئے جس کے قبیلہ کے لوگ اس کی حفاظت کر سکیں۔انہوں نے کہا چھوڑو یہ بات، میری حفاظت میرا اللہ کرے گا۔اس کے بعد خانہ کعبہ کے قریب جا کر کھڑے ہوئے اور بسم اللہ کر کے ''اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' پڑھنا شروع کر دیا۔یہ دیکھ کر قریش کے لوگ ان پر ٹوٹ پڑے اور خوب خوب مارا۔مار کھا کر جب وہ واپس آئے تو ساتھیوں نے کہا اسی چیز کا ہمیشہ اندیشہ تھا۔انہوں نے کہا اس سے کیا ہوتا ہے۔اگر تم چاہو تو کل میں پھر ان کو سناؤں گا۔لوگوں نے کہا نہیں نہیں اتنا کافی ہے۔گویا مار کھا کر، اذیت برداشت کر کے بدست کافرانہ ذہنیت پر ضرب لگائی جارہی ہے اور انسانی ضمیر کو بیدار کیا جارہا ہے اور دعوت توحید کو عنوان بنایا جارہا ہے۔سوچنے کا ایک رخ یہ ہے۔اور دوسرا رخ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہوجائے اور باطل کو چھیڑا نہ جائے ورنہ ماحول میں اضطراب پیدا ہوگا اور دعوت کا موقع باقی نہ رہے گا ان دونوں میں سے کون سا رخ صحیح ہے کون بتائے؟؟

مکہ میں جب سختیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں تو کچھ صحابہ حبشہ ہجرت کر گئے۔تھوڑے ہی دنوں کے بعد انہیں خبر ملی کہ مکہ میں حالات خوشگوار ہو گئے ہیں۔یہ سن کر صحابہ واپس آئے لیکن مکہ کی صورتحال جوں کی توں تھی۔ایک صحابی عثمانؓ بن مظعون، ولید بن مغیرہ کی پناہ لے کر مکہ میں داخل ہوئے اور آزادی کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے جبکہ دیگر اصحاب رسول مشق ستم بنائے جارہے تھے۔یہ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ میں ولید کی پناہ میں آرام سے ہوں اور میرے ساتھی مصائب ومشکلات سے دوچار ہیں یہ بڑا نقص ہے۔چنانچہ ولید کے پاس گئے اور کہا تمہارا وعدہ پورا ہو گیا اب میں تمہارا ذمہ واپس کرتا ہوں۔اس نے کہا آخر کیا بات ہے؟ کیا کسی نے کوئی تکلیف دی ہے؟ انہوں نے کہا نہیں بلکہ میں صرف اللہ کی پناہ میں رہنا پسند کرتا ہوں۔میں نہیں چاہتا کہ اللہ کے سواء کسی

دوسرے کی پناہ میں رہوں۔ ولید نے کہا۔ اچھا تو جس طرح میں نے علانیہ تم کو پناہ دی تھی اسی طرح علانیہ میرے ذمہ کو واپس کرو۔ اس کے بعد دونوں خانہ کعبہ کے پاس آئے اور ولید نے اعلان کیا کہ یہ عثمان ہیں جو آئے ہیں میرا ذمہ واپس کرنے۔ عثمان بن مظعون ؓ نے اس کی تصدیق کی اور کہا ولید ایک شریف اور وعدہ کا ایفاء کرنے والا آدمی ہے لیکن میں صرف اللہ کی پناہ میں رہنا چاہتا ہوں۔

یہ غیرت ایمانی کی انتہائی حساسیت اور زندہ ضمیری کی ایک علامت ہے۔ اس میں صاحب ایمان آدمی کی سوچ اور فکر کیلئے ایک نمونہ ہے اور مصلحت اندیش اور فراری ذہنیت والوں کیلئے سامان عبرت و نصیحت ہے۔

یہی حضرت عثمان بن مظعون ؓ قریش کی ایک مجلس شعر وسخن میں شریک تھے۔ لبید بن ربیعہ نے مصرع پڑھا۔ الا کل شیئ ما خلا اللّٰہ باطل ۔سن لو اللہ کے سواء ہر چیز باطل ہے۔ حضرت نے کہا صدقت تو نے سچ کہا۔ پھر لبید نے دوسرا مصرع کہا۔ کل نعیم لا محالۃ زائل ۔ ہر نعمت لامحالہ ختم ہونے والی ہے۔

اس پر حضرت عثمان ؓ نے کہا کذبت تو نے جھوٹ کہا۔ نعیم الجنۃ لا یزول جنت کی نعمت ختم نہیں ہوگی۔ لبید کو اس سے سخت تکلیف ہوئی۔ اس نے کہا قریش کے لوگو! تمہارے ہم نشیں کی دل آزاری نہیں کی جاتی تھی۔ یہ نئی بات تمہارے اندر کب سے پیدا ہوگئی ہے؟ کسی نے دلاسا دیا اور کہا یہ بیوقوفوں میں سے ایک بیوقوف ہے، جس نے ہمارے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ اس کی بات کا خیال نہ کرو۔ اس پر حضرت عثمان ؓ خاموش نہ رہے۔ معاملہ اور بڑھ گیا اور اس آدمی نے حضرت عثمان ؓ کی آنکھ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ ولید بن مغیرہ یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ میرے بھائی! تم ایک مضبوط ذمہ میں تھے اور تمہاری آنکھ اس طمانچہ سے محفوظ تھی۔ گویا اس نے احساس دلایا کہ تم نے میرا ذمہ واپس کر کے زبردست غلطی کی ہے۔ حضرت عثمان ؓ نے جواب میں کہا۔ میری یہ محفوظ آنکھ محتاج ہے اس جیسی مار کی، جو دوسری آنکھ کو اللہ کی راہ میں لگی ہے۔ خدا کی قسم میں اس ذات کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ زبردست اور طاقتور ہے۔ ولید نے کہا۔ بھائی! اب بھی تم میری پناہ میں آنا چاہتے ہو تو پھر آجاؤ حضرت عثمان ؓ نے کہا نہیں۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ ہستیاں یقین اور معرفت کے کس بلند مقام پر فائز تھیں کہ مار کھائی ہوئی آنکھ دوسری محفوظ آنکھ کے مقابلہ میں ان کے نزدیک زیادہ خوش نصیب اور قابل رشک آنکھ تھی! حق کے لئے مار کھانا اور ستایا جانا ان کے لئے ہتک اور ذلت نہیں بلکہ باعث عزوشرف اور موجب اعزاز تھا۔ اسی چیز نے انہیں ایسا بنادیا تھا کہ مشکلات راہ کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور حالات کے دباؤ میں نہ سوچتے تھے اور نہ اقدام کرتے تھے۔ ان کی ہر سوچ آزاد اور حوصلہ مند اور ہر اقدام پر امید اور پر جوش ہوتا۔ ہر چیز کو اخروی پیمانہ سود و زیاں سے ناپتے اور تولتے اور بس۔

جنگ کے طریقے

جاہلیت کے خلاف جنگ ہر پہلو سے، ہر طریقہ سے اور ہر میدان اور ہر شعبہ زندگی میں قرآن وسنت کی رو سے مطلوب ہے۔ یہ جنگ جب اس لئے کی جاتی ہے کہ جاہلیت کو قلب و دماغ کے قریب پھٹکنے نہ دیا جائے اور آلائش دنیا سے پاک رکھا جائے تو اس کو تعلیم کتاب اور تزکیۂ نفس کا نام دیا جاتا ہے اور جب اسی جاہلیت کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنا اور اس کے انجام بد سے بچانا مقصود ہوتا ہے تو اس کو انذار و تبشیر اور دعوت وتبلیغ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اگر آگے بڑھ کر جاہلیت کے اثر و رسوخ، دبدبہ اور غلبہ کو ختم کرنے کے لئے علمبرداران جاہلیت کے ہاتھوں کو پکڑنے اور ان کے بڑھتے ہوئے قدم کو روکنے اور اہل حق کی راہ سے جاہلیت کے روڑوں کو ہٹانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کو جہاد و قتال کے لفظ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ سب اصطلاحات دراصل جاہلیت کے خلاف جنگ کے مختلف مرحلوں اور طریقوں کو ظاہر کرتی ہیں۔

شریعت اسلامی کی تکمیل تیئس سال کی مدت میں مرحلہ وار ہوئی ہے۔ مثلاً نماز پہلے دو دو رکعت پڑھی جاتی تھی۔ روزہ پہلے عاشورا کا رکھا جاتا تھا اور شراب بتدریج حرام ہوئی۔ اسی طرح جاہلیت کے خلاف طریقۂ جنگ بھی تیئس سال کی مدت میں بتدریج مکمل ہوا ہے، جس کا جامع نام، جہاد ہے۔

غار حرا میں آغاز وحی کے بعد پہلے خاموشی سے تبلیغ کی گئی پھر اعلان کے ساتھ تبلیغ کی گئی۔ ہر ستم اور اذیت پر صبر کیا جاتا تھا۔ ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔ پھر دفاع کی اجازت دی گئی اور کہا گیا کہ صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اس کے بعد آخری حکم آیا کہ کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں جہاد کی اصطلاح ایک مکمل اور آخری اصطلاح ہے جس میں تعلیم و تزکیہ، انذار و تبشیر، دعوت و تبلیغ اور قتال سب شامل ہیں۔ غرض دین کی حمایت اور جاہلیت کا قلع قمع کرنے کے لئے جو آخری اصطلاح کتاب وسنت میں ہمیں ملتی ہے وہ جہاد کی ہے۔ اسی بات کو فقہاء کہتے ہیں کہ جہاد کے دو شعبے ہیں۔ ایک دعوت و تبلیغ اور دوسرے قتال۔

شریعت کے سارے احکام میں آخری مرحلہ والے حکم کا اعتبار ہوتا ہے شراب حرام ہے تو حرام ہے۔اب کسی کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ چونکہ شراب بتدریج حرام کی گئی ہے اس لئے وہ کہے کہ میں اپنے حالات کے تحت شراب پیتا رہوں گا۔نماز شروع شروع دو رکعت پڑھنے کا حکم تھا لہٰذا میں کچھ دنوں دو دو رکعت پڑھوں گا۔ کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ میں ابھی صرف یوم عاشورا کا روزہ رکھوں گا۔کم از کم تیرہ سال کے بعد رمضان کے روزے کی پابندی کروں گا۔اس لئے کہ آغاز میں رمضان کے روزے فرض نہ تھے۔اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ کسی کے لئے قطعاً یہ جائز نہ ہوگا کہ وہ کہے کہ حکم جہاد تیرہ سالہ مکی دور کے بعد نازل ہوا ہے لہٰذا ہمارے لئے حکم جہاد کی بات کرنا صحیح نہیں ہے۔ہم ابھی دعوتی مرحلہ میں ہیں۔ جہاد کا تذکرہ دعوت کے لئے مضر ہے۔اسی طرز فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کئی لوگ غیر مسلموں کو قرآن پڑھنے کے لئے دینا مناسب نہیں سمجھتے۔ کیونکہ قرآن کی ترتیب ویسی نہیں ہے جیسی دعوت کی ترتیب ان کے ذہنوں میں ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس کو آج دعوت کہتے ہیں یہ وہ دعوت نہیں ہے جو دعوت نمرود، فرعون اور ابوجہل وابولہب کو دی گئی تھی اور جس کی وجہ سے نارِ نمرود دہکائی گئی۔جس کی بناء پر حضرت موسیٰؑ کو ملک مصر چھوڑنا پڑا اور جس سے ابوجہل اور ابولہب کی تیوریوں پر بل آگئے تھے۔جس کے سبب شعب ابی طالب میں بنی ہاشم کو محصور کیا گیا تھا اور دارالندوہ میں محمد ﷺ کے قتل کی سازش رچائی گئی تھی۔جس کی وجہ سے معرکۂ بدر وحنین برپا ہوئے اور بالآخر جس کی وجہ سے خانہ خدا سے ۳۶۰ بتوں کو نکال باہر کیا گیا۔ ہماری دعوت تو صرف الا اللہ کی ہے لا الہ کا ذکر نہیں۔اللہ کی عبادت ہمیں مطلوب ہے لیکن بتوں سے بیر کے بغیر۔ رحمن کا ذکر ہم کرنا چاہتے ہیں مگر رام کی چرچا کے ساتھ۔دین کی دعوت ہم دیں گے لیکن ادیان باطلہ کی تردید کے بغیر۔محمد ﷺ کے اسوہ کو اپنانے کا وعظ ہم کہیں گے مگر پرکھوں کی محبت کا دم بھرتے ہوئے۔قرآنی دستور کی خوبیاں ہم بیان کریں گے لیکن سیکولر دستور کی مدح وستائش کے ساتھ۔ہم مسلمان بن کر جینے اور مرنے کی تمنا رکھتے ہیں لیکن کفر وشرک کی چھایا میں۔

غرض دین کی ہر بات ہمارے سر آنکھوں پر سوائے جاہلیت کے خلاف جنگ کے۔ورنہ ہمیں لوگ یہ طعنہ دیں گے "غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ" ان کو ان کے دین نے خبط میں مبتلا رکھا ہے۔یعنی ہیں تو بے سروسامان مٹھی بھر، لیکن چلے ہیں بات کرنے جہاد کی۔ان کے مذہبی جنون نے انہیں ہوش وخرد سے عاری کر دیا ہے۔اپنے جوش میں دیوانے ہوگئے ہیں۔نہ دین کی روح اور اسپرٹ سے واقف ہیں نہ دینی فراست اور حکمت کا علم ہے۔

احکام میں فرق کرنے کی وجہ

اپنی بات کی وضاحت کے لئے ایک سوال ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔نص صریح میں یہ چند احکام ہیں:

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرۃ:۴۳)

ترجمہ: نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ (النحل:۱۲۵)

ترجمہ: اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت کے ساتھ دعوت دو۔

قُمْ فَاَنْذِرْ (المدثر:۲)

ترجمہ: اٹھو اور ڈراؤ

بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ (المائدۃ:۶۷)

ترجمہ: جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

ترجمہ: اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے کنارا کش رہو۔

وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ (المائدۃ:۳۵)

ترجمہ: اس کی طرف وسیلہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ (الانفال:۶۰)

ترجمہ: ان کے لئے جہاں تک ہو سکے سامان حرب اکٹھا کرو۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (البقرۃ:۱۹۳)

ترجمہ: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔

اوپر آیات میں جو احکام دیئے گئے ہیں وہ سب ایک انداز سے صیغۂ امر میں آئے ہیں۔ لیکن جب ملت اسلامیہ کے علمی اور عملی حالات پر ہم نظر ڈالتے ہیں تو کھلے طور پر نظر آتا ہے کہ یکساں انداز اور اہمیت کے ساتھ ان احکام کو نہیں لیا جاتا ہے۔ بلکہ اکثر لوگ اپنے اپنے ذوق کے مطابق کسی حکم کو اہمیت دیتے ہیں اور کسی کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد میں لوگ اقامت صلوۃ کو اپنائے ہوئے ہیں لیکن ایتائے زکوٰۃ کے حکم پر کوئی توجہ نہیں کرتے۔ کچھ لوگ نماز، روزہ اور زکوۃ کے پابند ہوتے ہیں مگر دعوت و تبلیغ کے فریضہ کو ناقابل توجہ سمجھتے ہیں۔ بعض حضرات نماز روزہ کے ساتھ زندگی کے خاص شعبوں میں جائز، ناجائز، سنت اور بدعت، توحید اور شرک کے مسائل بہت چھیڑتے ہیں مگر طاغوت سے اجتناب والے حکم کو سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح تبلیغ و دعوت کا نعرہ لگانے والوں کی بڑی تعداد اعداء اسلام کے مقابلہ میں آ کھڑے ہونے یا کم از کم تیاری کرنے

کو بے دینی کا کام خیال کرتی ہے وعظ ونصیحت، تقریر وخطابت، درس قرآن اور درس حدیث میں مشغول حضرات کے سامنے جہاد کا ذکر بھی کسی نے کر دیا تو ایسا بدک جاتے ہیں جیسے دینی اور روحانی محفل میں فتنہ وفساد پھیلانے کی بات کہہ دی جائے۔ حالانکہ جہاد اسی طرح ایک شرعی اصطلاح ہے جس طرح صوم، صلاۃ حج اور زکوۃ۔ اس سے تنفر کی کیا وجہ ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھی یہودیوں کے مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں جب کہ ان سے کہا گیا تھا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (البقرۃ:۸۵)

ترجمہ: کیا تم ایمان رکھتے ہو کتاب کے کچھ حصہ پر اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ تم میں سے جو ایسا کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے اور روز قیامت سخت ترین عذاب کی طرف لے جائے جائیں گے اور اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ ایک مثال اور دیکھئے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرۃ:۱۸۳)

ترجمہ: تم پر روزے فرض کئے گئے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ. (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تم پر جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لئے ناپسندیدہ ہے۔

مذکورہ بالا دو آیتوں میں دو فرضوں کے بیان میں لفظ اور اسلوب دونوں یکساں استعمال کئے گئے۔ لیکن عملاً ہم دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ روزہ کے فضائل، شرائط اور ارکان وآداب کا بیان ہماری محفلوں میں خوب ہوتا ہے، مگر جنگ کے فضائل، شرائط اور واجبات وآداب کا بھولے سے ذکر خیر نہیں ہوتا۔ آخر کیا وجہ ہے؟

غور سے دیکھئے امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور جہاد کو بالکل یکساں انداز سے اہل ایمان کی ذمہ داری بتائی جاتی ہے۔ لیکن یکساں انداز سے دونوں کا تذکرہ اور بیان کرنے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں حالانکہ جس طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ترک پر وعیدیں آئی ہیں اسی طرح ترک جہاد کو بھی نکبت وادبار اور ذلت ورسوائی کا سبب بتایا گیا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ: ترجمہ: ''مومن آپس میں محض بھائی بھائی ہیں''۔

کے حوالہ سے یہ تو ہم بیان کریں گے کہ مومن ہونے کا تقاضا ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن کا خیر خواہ اور

بھائی بن کر رہے۔ لیکن یہ بولنے کی ہمت کم ہوتی ہے کہ کوئی کہے کہ مومن ہونے کا تقاضا ہے کہ اللہ و رسول پر ایمان ویقین کے ساتھ ساتھ جہاد بھی کرے۔ حالانکہ قرآن کا اسلوب بیان دونوں کے ذکر میں ایک جیسا ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (الحجرات:۱۵)

ترجمہ: مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انہوں نے شک نہیں کیا اور اللہ کے راستہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کیا یہی لوگ ہیں سچے۔

ایک اور آیت پر غور کیجئے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبۃ:۲۴)

ترجمہ: کہہ دو! اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں۔ تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

اس آیت میں اللہ اور رسول کی محبت اور جہاد فی سبیل اللہ کو ایک درجہ میں رکھا گیا ہے مگر جہاد کو ہم وہ درجہ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں جو قرآن نے دیا ہے۔ یہاں کوئی موقتی اور عارضی بات کہی گئی ہے یا ایک مستقل بات ہے۔ اگر عارضی بات ہے تو اس کے لئے کوئی قرینہ ہونا چاہئے اور اگر مستقل چیز ہے تو جہاں محبت خدا و رسول کا چرچا ایک گھنٹہ ہوتا ہے وہیں کم از کم دس منٹ تو فضائل جہاد کے موضوع پر گفتگو ہونی چاہئے۔ اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ رات دن فی سبیل الشیطان جہاد میں مشغول ہوتے ہیں وہ بھی خدا اور سول کی محبت میں سرشار سمجھے جاتے ہیں اور ان کے دعوئے محبت میں کسی کو تضاد نظر نہیں آتا۔

مکی اور مدنی کا فرق

اس موقع پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ جہاد کا حکم مدینہ میں آیا ہے۔ ہمارے حالات مکہ کے حالات جیسے ہیں۔ ہم مکی دور سے گزر رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ شرعی احکام کے درمیان مکی اور مدنی دور کا لحاظ کرتے ہوئے

فرق کی بنیاد کیا کوئی صحیح بنیاد ہے قرآن میں احکام کی ترتیب مکی اور مدنی بنیادوں پر نہیں قائم کی گئی ہے، بلکہ مدنی سورتیں پہلے ہیں جن میں اجتماعی زندگی کے احکام ہیں۔ قرآنی تفاسیر، شروح احادیث اور فقہی کتب میں کہیں بھی مکی و مدنی بنیادوں پر احکام میں تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اگر اس کو کوئی بنیاد تسلیم کرلیا جائے تو ایک بڑے فتنہ کا دروازہ کھل جائے گا۔ مکی دور کے نام پر اکثر معاشرتی اور اجتماعی احکام سے دامن چھڑایا جاسکتا ہے۔ جن چیزوں کی حرمت مدینہ میں نازل ہوئی ہے ان کو حلال ٹھہرانا ممکن ہو جائے گا۔ جو چیزیں مدنی دور میں فرض ہوئی ہیں ان کو بجالانا ضروری نہ قرار دیا جائے گا۔ غرض واجبات کے ترک اور منہیات کے ارتکاب کے جواز کے لئے راہ ہموار ہو جائے گی۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس اعتبار سے مکی اور مدنی دور کی تقسیم کوئی چیز نہیں ہے بلکہ خدا اور سول کی طرف سے جتنے احکام آئے ہیں ان سب کا ماننا اور ان پر عمل کرنا ضروری ہے بشرطیکہ متعلق شخص میں استطاعت پائی جائے اور حکم کے لاگو ہونے کی شرائط پائی جائیں۔ بالفرض کچھ لوگوں میں اور کسی جگہ کسی حکم کے لئے استطاعت اور شرائط نہ بھی ہوں، تو بھی دین کے سارے اجزاء کا بیان اور تذکرہ تو ہونا چاہئے تا کہ استطاعت اور شرط جہاں جہاں پائی جائے اس پر عمل ہو۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ کئی شرائط ایسی ہوتی ہیں جن کا مہیا کرنا ہماری ذمہ داری ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ شرعی اصول ہے کہ جن چیزوں پر کسی واجب کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے ان کو حاصل کرنا بھی ہم پر واجب ہوتا ہے۔ مثلاً نماز کی ادائیگی طہارت پر موقوف ہے تو طہارت کے وسائل مہیا کرنا اور طہارت حاصل کرنا اس شخص پر واجب ہے جس پر نماز فرض ہے۔ لہٰذا اصل چیز ہمارے سوچنے اور سمجھنے کی یہ ہے کہ وجوب جہاد کی علت کیا ہے۔ کن شرائط کے حامل افراد پر جہاد کی ادائیگی واجب ہوگی؟ یعنی اس کی ادائیگی کے وجوب کے لئے کیا شرائط ہیں؟ اور تیسری بات یہ ہے کہ صحت ادائیگی کی شرائط کیا ہیں؟ مسئلہ کو واضح طریقہ پر جاننے کے لئے ان تینوں سوالوں کا جواب معلوم کرنا ہوگا۔

فرضیت جہاد کی علت

فرضیت جہاد کے لئے جن نصوص سے استدلال کیا جاتا ہے ان میں سے چند کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکین سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے۔ اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، الجھاد واجب مع کل امیر براکان اوفاجراً. (ابوداؤد)

ترجمہ: جہاد واجب ہے ہر امیر کے ساتھ نیک ہو وہ یا بے عمل۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ ویقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللّٰہ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں، یہاں تک کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اور وہ نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں جب ایسا لوگ کریں گے تو مجھ سے اپنا خون اور اپنا مال محفوظ کرلیں گے مگر حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے حوالہ ہے۔

فرض کفایہ

یہ ان آیات اور احادیث میں سے چند ہیں جن کی بناء پر جہاد کو بالاتفاق فرض سمجھا جاتا ہے۔ البتہ فقہاء اور علماء کی اکثریت فرض کفایہ مانتی ہے۔ کچھ لوگ فرض عین کہتے ہیں۔ سورہ توبہ آیت ۱۲۲ ''فلولانفر'' اور سورہ نساء آیت ۹۵ ''لَا يَسْتَوِى الْقَاعِدُوْنَ'' سے معلوم ہوتا ہے کہ فرض کفایہ کہنے والوں کی رائے زیادہ انسب اور

درست ہے۔ بعض سلف سے مستحب ہونے کا قول بھی منقول ہے، لیکن اس قول کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ دراصل یہ فرض عین والی بات کے بالمقابل رائے دی گئی ہے۔ یعنی فرض کے بالمقابل مستحب نہیں کہا گیا ہے بلکہ فرض عین کی نفی کرنا مقصود ہے۔ اس سے تائید فرض کفایہ والی رائے کی ہوئی ہے۔ اس توجیہ کی تائید میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جہاد کے سلسلہ میں جس طرح کی نصوص وارد ہوئی ہیں ان سے فرضیت اگر نہیں ثابت ہوگی تو فرضیت کے لئے اور کیا دلائل ہو سکتے ہیں؟!

فرضِ عین

علماء کے نزدیک جہاد تین صورتوں میں فرض عین ہو جاتا ہے۔

① جب دشمن مسلمانوں کے علاقہ پر حملہ کر دے۔

② جب مسلمانوں کا کوئی امیر ہو اور وہ جہاد کے لئے عام بلاوا کر دے۔

③ جب مسلمان اور کفار میدان جنگ میں صف آرا ہو چکے ہوں۔

آئندہ ہم اس مسئلہ پر قدرے تفصیلی بحث کریں گے۔

معنوی علت

جہاد کیوں فرض کیا گیا ہے اس کے جواب میں مذکورہ آیات اور احادیث پیش کر دینا کافی ہے۔ لیکن انہیں نصوص سے علماء نے معنوی علت بھی اخذ کی ہے۔ امام شافعیؒ نے معنوی علت ''کفر'' بتایا ہے اور جمہور فقہاء نے ''قتال'' کو معنوی علت بتایا ہے۔ ان دونوں رایوں سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ امام شافعیؒ کے قول کے مطابق ہر کافر سے جہاد کیا جائے گا اور ہر کافر کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ صاحب نے صراحت کے ساتھ ''کتاب الام'' میں کہہ دیا ہے کہ عورتیں، بچے اور عبادت خانوں میں جو لوگ مشغول عبادت ہوتے ہیں ان کو قتل کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی اس سے نکلتی ہے کہ ان کے نزدیک جزیہ لینا صحیح نہ ہوگا۔ مگر ایسی بات نہیں ہے۔ امام شافعی صاحب کے نزدیک جزیہ لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ قرآن میں صاف ہے کہ اہل کتاب ماتحتی قبول کرتے ہوئے جزیہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں گے تو ان سے جنگ نہیں کی جائے گی۔

جمہور کے قول سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ جو قتال نہ کریں ان سے جہاد نہ کیا جائے گا۔ جنگ صرف ان سے کی جائے گی جو ہم سے جنگ کریں۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے بلکہ جمہور کے نزدیک یہ طے شدہ امر ہے کہ جو جنگ نہ کریں اپنے علاقہ میں سکون سے بیٹھے رہیں ان سے بھی جنگ کی جائے۔ یہاں تک کہ یا تو اسلام قبول کریں یا ماتحت بن کر جزیہ دینا قبول کر لیں۔ اس لحاظ سے یہ کہا جا سکتا ہے امام شافعیؒ اور دوسرے فقہاء کے درمیان کوئی

بنیادی اختلاف نہیں ہے۔اس ضمن میں ہم سورہ توبہ کی آیت ۲۹ پر علماء کے چند نوٹ یہاں درج کرتے ہیں۔ جن سے اس مسئلہ کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔مولانا مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں:

''آیت مذکور میں ان لوگوں سے جہاد وقتال کرتے رہنے کی ایک حد اور انتہاء بھی بتائی گئی ہے۔ "حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ" یعنی یہ قتال اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ وہ ماتحت ہوکر، رعیت بن کر جزیہ دینا منظور نہ کریں۔

جزیہ کے لفظی معنی بدلے اور جزاء کے ہیں۔ اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کفر وشرک اللہ اور رسولؐ کی بغاوت ہے، جس کی اصل سزا قتل ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں یہ تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے۔''

(معارف القرآن)

اور جہاد وقتال کا جو حکم آیت میں بمقابلہ اہل کتاب دیا گیا ہے وہ درحقیقت اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام طوائف کفار کا یہی حکم ہے کیونکہ اس آیت میں حکم قتال کی جو وجوہ آگے بیان کی گئی ہیں وہ سب کفار میں مشترک ہیں تو حکم بھی مشترک ہونا چاہئے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

"حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ" یَدٌ کے اصل معنی تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہ غلبہ، تسلط اور اختیار واقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے۔ یعنی ان کی طرف سے یہ ادائیگی جزیہ تمہارے اقتدار وغلبہ کے نتیجہ میں ہو۔ان سے جنگ کرکے ان کے کس بل اس طرح نکال دو کہ یہ تمہارے آگے گھٹنے ٹیک دیں اور ہاتھ باندھ کر جزیہ دینے پر راضی ہوجائیں۔ "وَهُمْ صَاغِرُوْنَ" یعنی تمہاری ماتحتی ومحکومی قبول کریں اور اس کو غنیمت جانیں۔

اصلاً تو یہاں جو حکم بیان ہوا ہے وہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ سے متعلق ہے لیکن صحابہ کرامؓ کے زمانہ ہی میں یہ مسئلہ بھی طے پاچکا تھا کہ یہی حکم دوسرے غیر مسلموں کا بھی ہے چنانچہ مجوسی کے ساتھ ان کو مشابہ اہل کتاب قرار دے کر یہی معاملہ کیا گیا جس کی ہدایت یہاں اہل کتاب کے باب میں ہوئی ہے۔اس باب میں فقہاء میں کوئی اختلاف رائے ہے تو وہ فروعی نوعیت کا ہے۔(تدبر قرآن)

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کہتے ہیں......

''یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں۔ بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہوجائے۔ وہ زمین پر حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے

نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی وامامت کے اختیارات متبعین دین حق کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ ان کے ماتحت تابع ومطیع بن کر رہیں۔''

''یہ جزیہ وہ چیز ہے جس کے لئے بڑی بڑی معذرتیں انیسویں صدی عیسوی کے دور مذلت میں مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہیں۔اس دور کی یادگار کچھ لوگ اب بھی موجود ہیں جوصفائی دینے میں لگے ہوئے ہیں لیکن خدا کا دین اس سے بالا وبرتر ہے کہ اسے خدا کے باغیوں کے سامنے معذرت پیش کرنے کی کوئی حاجت ہو۔سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ جولوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی یا دوسروں کی نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ حد سے حد بس اتنی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود جوغلطی کرنا چاہتے ہیں کریں لیکن انہیں اس کا قطعاً حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار وفرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی فساد رونما ہوگا اور اہل ایمان کا فرض ہوگا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔'' (تفہیم القرآن)

ہماری اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ جزیرۃ العرب کی حد تک وجوب جہاد کی علت محض ''کفر'' ہے۔یعنی وہاں ''غلبہ کفر'' تو دور کی بات ہے سرے سے ''کفر'' ہی کو برداشت نہیں کیا جاسکتا۔اہل کفر کے لئے وہاں صرف دو راستے ہیں یا تو اسلام قبول کریں یا قتل ہوجائیں۔تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔جزیرۃ العرب کے علاوہ بقیہ ساری دنیا میں کفر کو برداشت کیا جائے گا لیکن ''غلبہ کفر'' ناقابل برداشت ہوگا۔دوسرے لفظوں میں جہاں بھی کفر کا غلبہ ہوگا وہ وجوب جہاد کے لئے کافی علت ہوگا۔جہاد کے وجوب کے لئے کسی دوسرے سبب اور علت کی ضرورت نہیں ہے۔تقریب فہم کے لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ نماز ظہر کے وجوب کے لئے جو حیثیت زوال شمس کی ہے بالکل وہی حیثیت وجوب جہاد کے لئے کفر اور غلبہ کفر کی ہے۔

فرضیت جہاد کی ادائیگی کن پر فرض ہے

اب یہ سوال کہ جن پر جہاد فرض ہوگا ان میں کیا صفات ہونی چاہئیں اور کیا نہیں۔جس طرح صلاۃ کے فرض ہونے کے باوجود اس کی ادائیگی کی فرضیت کے لئے متعلق فرد کے اندر کچھ شرائط کا موجود ہونا ضروری ہے مثلاً بچے اور بے عقل پر نماز کی ادائیگی فرض نہیں ہے۔اسی طرح جہاد اپنی جگہ فرض ہونے کے باوجود اس کی ادائیگی کی فرضیت کے لئے کچھ شرائط ہیں جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ. (الفتح:۱۷)

ترجمہ: ہاں اگر اندھا اور لنگڑا اور مریض جہاد کے لئے نہ آئے تو کوئی حرج نہیں۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (التوبۃ:۹۱)

ترجمہ: ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لئے زادراہ نہیں پاتے اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جب کہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسولؐ کے وفادار ہوں۔

معلوم ہوا کہ اندھے، لنگڑے، مریض، ضعیف اور تنگ دست پر فریضہ جہاد کی ادائیگی فرض نہیں ہے۔ دوسرے شرعی دلائل سے یہ بھی ثابت ہے کہ اسلام، بلوغت، ذکورت، حریت اور عقل بھی شرط ہے۔ یعنی کافر، نابالغ، عورت، غلام اور بے عقل پر جہاد کی ادائیگی فرض نہ ہوگی۔

بدائع الصنائع میں ہے:

فلا يفرض على الاعمى والاعرج والزمن والمقعد والشيخ العرم والمريض والضعيف والذى لا يجد ما ينفق۔

ترجمہ: پس نہیں فرض ہوتا اندھے، لنگڑے، لنجے، اپاہج، بوڑھے، مریض، ضعیف اور اس پر جو اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

ھدایہ میں ہے:

وقتال الكفار واجب وان لم يبدؤا للعمومات ولا يجب الجهاد على الصبى لان الصبى مظنة المرحمة ولا عبد ولا امرة لتقدم حق المولى والزوج ولا اعمى ولا مقعد ولا اقطع لعجزهم فان هجم العدو على بلد وجب على جميع الناس الدفع تخرج المراة بغير اذن زوجها والعبد بغير اذن المولى لانه صار فرض عين۔

ترجمہ: اور کفار سے جنگ واجب ہے اگرچہ وہ شروع نہ کریں۔ عمومات کی بناء پر (یعنی ان آیات اور احادیث کی بناء پر جن میں بغیر کسی شرط اور قید کے جنگ کو واجب بتایا گیا ہے) اور جہاد واجب نہیں ہوتا بچے پر کیونکہ وہ قابل رحم ہوتا ہے۔ نہ غلام پر اور نہ عورت پر کیونکہ ان پر آقا اور شوہر کا حق مقدم ہوتا ہے۔ نہ اندھے پر اور نہ اپاہج پر، نہ لولے پر کیونکہ یہ لوگ عاجز ہوتے ہیں۔ البتہ اگر دشمن کسی شہر پر حملہ کردے تو تمام لوگوں پر مدافعت واجب ہوجاتی ہے۔ ایسی صورت میں عورت کو اپنے شوہر کی اور غلام کو اپنے آقا کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوگی مدافعت میں نکلنے کے لئے۔ کیونکہ مدافعت فرض عین ہوچکی ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ جہاد کی فرضیت اور اس فرضیت کی

ادائیگی کیلئے مذکورہ بالا شرائط کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے۔ کسی خطۂ ارض کے مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ جہاد فرض نہیں ہے اور اس کی ادائیگی ہم پر فرض نہیں ہے۔ کیونکہ زمین کے اکثر حصہ پر کفر و شرک کا غلبہ ہے جو فرضیت جہاد کی علت ہے اور قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کن پر جہاد کی ادائیگی فرض ہے اور کن پر نہیں۔

یہ جو مشہور ہے کہ امیر ہونا ضروری ہے، تو امیر کا ہونا نہ تو فرضیت کے لئے شرط ہے اور نہ ادائے فرض کے لئے شرط ہے بلکہ ادائے فرض کی صحت کے لئے شرط ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے نماز جمعہ کی ادائیگی کے صحیح ہونے کے لئے امام اور جماعت شرط ہے۔ تنہا جمعہ کی نماز نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہزاروں کی بھری آبادی میں یہ کہہ کر ہم بری الذمہ نہیں ہو سکتے کہ نماز جمعہ کے لئے لوگ اکٹھا ہونے کے لئے تیار نہیں ہیں اور کوئی امامت کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا نماز جمعہ فرض نہیں۔ نماز جمعہ کے لئے امام بنانا مصلیوں کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح جہاد کے لئے امیر متعین کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہے جن پر جہاد کی ادائیگی فرض ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء نے نصب امام کو فرض کہا ہے۔ اس طرح امیر کا تعین نہ کرنا خود ایک گناہ ہے جس کو دوسرے گناہ کے لئے وجہ جواز نہیں بنایا جا سکتا۔ ایک دوسری مثال سے بات کو سمجھئے۔ طہارت نماز کی صحت کے لئے شرط ہے نماز کی فرضیت کے لئے شرط نہیں ہے کہ طہارت ہوگی تو نماز فرض ہوگی اور اس کی ادائیگی ضروری ہوگی اور جس کو طہارت حاصل نہیں ہے، وہ بری الذمہ ہے، اس پر نماز فرض کی ادائیگی لازمی نہیں ہے اور وہ عند اللہ بے قصور اور معذور قرار دیا جائے گا بلکہ طہارت حاصل کرنا ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جس پر نماز از روئے شرع فرض قرار پائی ہے۔ طہارت حاصل نہ کرنا خود ایک گناہ ہے۔ اس گناہ کو ترک صلوۃ کے لئے وجہ نہیں بنایا جا سکتا۔

درحقیقت جہاد کی فرضیت کے لئے امیر المومنین کا ہونا ضروری شرط نہیں ہے۔ جس طرح فرضیت نماز کے لئے امام کا ہونا شرط نہیں ہے۔ البتہ استثنائی حالات کے علاوہ جس طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ فرض نماز کسی امام کی امامت میں ادا کی جاتی ہے اسی طرح عام قاعدہ یہ ہے کہ جہاد کسی امیر المومنین کے تحت ہونا چاہئے اور یہ امر واقعہ ہے کہ جب بھی جہاد ہوا ہے مسلمانوں کے دور عروج میں ہوا ہے جب کہ مسلمان کسی امیر المومنین کے تحت ہی زندگی گزار رہے ہوتے تھے۔ ایسی صورت میں امیر المومنین کے حکم اور اجازت کے بغیر جہاد کا ہونا کیسے متصور ہو سکتا تھا۔

دو جواب طلب سوال

اس مقام پر دو سوال جواب طلب ہیں:

① امیر المومنین کے ہوتے ہوئے اگر کچھ لوگ بغیر اجازت جہاد کریں تو اس کا کیا حکم ہوگا؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اور جہاں امیر المومنین نہ ہو، وہاں کیا جہاد کی کوئی صورت ہے؟

پہلے سوال کے جواب میں ہم فقہ کی ایک عبارت پیش کرتے ہیں:

''اگر دارالحرب میں ایسی جماعت داخل ہوتی ہے جسے قوت دفاع حاصل تھی یعنی طاقتور جماعت تھی ان سے بیت المال کے لئے خمس لیا جائے گا اگرچہ یہ جماعت بادشاہ کی اجازت کے بغیر داخل ہوئی ہو۔''

(فتاویٰ عالمگیری)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بادشاہ کی اجازت کے بغیر اس جماعت کا دھاوا بولنا صحیح تسلیم کیا گیا اور اس کو جہاد قرار دیا گیا۔ اس کے برخلاف اگر ایک دو آدمی دارالحرب میں جائیں تو ان سے خمس نہیں لیا جائے گا۔ اس لئے کہ وہ مال غنیمت کی تعریف میں نہیں آئے گا اور ان کا دھاوا بولنا جہاد متصور نہ ہوگا۔ یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ فقہی تفصیلات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کا عمل جہاد کی تعریف میں نہیں آتا اور ان کا دھاوا بولنا جہاد متصور نہ ہوگا لیکن ان کا چھین جھپٹ کر لایا ہوا مال ان کے لئے حلال ہوگا حرام نہ ہوگا۔ بہر حال اوپر مذکورہ دونوں فقہی جزئیوں پر غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ امیر المؤمنین کے ہوتے ہوئے بھی اس کی اجازت کے بغیر جہاد ہوسکتا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ جہاد کے صحیح ہونے اور نہ ہونے میں قوت طاقت اور قوت دفاع کی موجودگی بھی ایک معیار ہے۔ ہدایہ کی شرح فتح القدیر جلد سابع میں ہے کہ:

''شریعت میں وہ زور اور جبر معتبر ہے جو سلطان کی طرف سے ہو، کیونکہ سلطان کو قوت دفاع اور قوت منعہ حاصل ہے اور جس کے پاس قوت دفاع نہ ہو اس کی جانب سے زور اور طاقت کے استعمال کو شریعت نے معتبر نہیں قرار دیا ہے۔''

سلطان کی تعریف شامی جلد ۵ میں پڑھئے:

''شریعت نے سلطان کے بغیر کسی کا زور اور جبر معتبر نہیں مانا ہے، کیونکہ زور اور جبر کی طاقت قوت دفاع کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور جس کے پاس قوت دفاع ہو، وہ سلطان ہے۔''

قوت دفاع کا معیار کیا ہے۔ یعنی کب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب قوت دفاع حاصل ہوگئی؟ اس مسئلہ پر کتب فقہ کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے روشنی پڑتی ہے:

''تین آدمیوں کا حکم بھی ایک کا ہے البتہ چار ہوں تو خمس لیا جائے گا۔ محیط میں ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ سات آدمیوں کی جماعت از روئے شریعت وہ جماعت نہیں ہے جس کو قوت دفاع حاصل ہو۔ دس آدمیوں کی جماعت ایسی جماعت ہے جس کو قوت دفاع حاصل ہوگی۔'' (الفتح القدیر)

عنایہ میں قوت منعہ کی تفسیر سریہ سے کیا ہے، اس تفسیر کو علامہ ناطقی نے ابن شجاع کی کتاب الخراج سے نقل

کیا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

اگر کوئی ایک آدمی اکیلا دارالحرب میں داخل ہوا اس حال میں کہ دارالحرب میں کہیں قریب اسلامی فوج نہ تھی۔ پھر اس آدمی کو کچھ مال ہاتھ آیا تو اس میں بیت المال کا پانچواں حصہ نہ ہوگا، یہاں تک کہ مسلمان حملہ آوروں کی تعداد 9 تک پہنچ جائے۔ جب نو تک تعداد پہنچ جائے تو یہ سریہ ہے لہٰذا اس میں خمس ہوگا۔

جہاد کے لیے ضروری تعداد

معلوم ہوا کہ کفار کے مقابلہ میں (۹ ۔ ۱۰) افراد پر مشتمل کوئی جتھا یا ٹولی ہو تو شرعاً اسے باعتبار عدد قوت دفاع کا حامل کہا جاسکتا ہے، اور وہ جو بھی اقدام کریں گے اس کو جہاد کہا جاسکتا ہے اور اس کے سربراہ کو امیر یا سلطان کہا جاسکتا ہے اور اس کی سرکردگی میں جہاد کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک قوت دفاع کے لیے اسلحہ اور دیگر تیاریوں کا سوال ہے اس کا جواب قرآن کے الفاظ "مَا اسْتَطَعْتُمْ" میں مل جاتا ہے۔ پھر تینوں سوالوں کا جواب یعنی تعداد، اسلحہ وغیرہ کی مقدار کیا ہو اور حدود اقتدار کیا ہوں ابو جندلؓ اور ابوالبصیرؓ کے واقعہ سے ملتا ہے۔ مدینہ کے حدود کیا تھے، مسلمانوں کی تعداد کیا تھی اور ان کے پاس ساز و سامان کتنا تھا جب کہ وہ جہاد کر رہے تھے؟

حضرت ابوالبصیرؓ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آئے۔ ان کے پیچھے ہی مکہ سے ازہر بن عبدعوف اور اخنس بن شرفی کا ایک مکتوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام مدینہ دو آدمی لائے کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی رو سے ابوالبصیرؓ کو واپس کر دیا جائے۔ حضور نے ابوالبصیرؓ کو بلایا اور فرمایا:

''ابوالبصیرؓ ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے ہمارے دین میں عہد شکنی نہیں ہے تم مکہ چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا۔''

ابوالبصیرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ کیا آپ مجھے مشرکوں کی طرف واپس کر رہے ہیں، جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر فرمایا ''مکہ چلے جاؤ اللہ کوئی راہ نکالے گا۔'' حضرت ابوالبصیرؓ مکہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں انہوں نے مقام ذوالحلیفہ میں اپنے دونوں پہرہ داروں میں سے ایک کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا۔ دوسرا پہرہ دار ڈر کر مدینہ چلا گیا اور وہاں حضور سے ابوالبصیرؓ کی شکایت کی۔ اس کے بعد ساتھ ہی ابوالبصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالبصیرؓ مدینہ سے مقام عیص چلے گئے۔ عیص اس راستہ پر ہے جس سے ہو کر وہ شام جاتے تھے۔ سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے۔ مکہ میں جو مسلمان رُکے ہوئے تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہو چکے

تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا تھا اس کو جان چکے تھے۔ اس لیے وہ عیص میں ابوالبصیرؓ سے آ کر مل گئے۔ اس طرح تقریباً ستر آدمی جمع گئے اور انہوں نے قریشیوں کا قافیہ تنگ کر دیا۔ وہ جس قریشی کو پاتے اسے قتل کیے بغیر نہ چھوڑتے اور جو قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس پر چھاپہ مارتے۔

جس وقت حضرت ابوالبصیرؓ اپنی کارروائی کر رہے تھے، اس وقت مدینۃ الرسول دارالاسلام کا صدر مقام تھا جس کے سربراہ بذات خود رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تھی۔ ابوالبصیرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کچھ کر رہے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت اور حکم سے نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے طور پر کر رہے تھے۔ ورنہ مشرکین ضرور اعتراض کرتے کہ حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی ہے۔ پھر بھی آپ کو سب کچھ معلوم تھا جس پر آپ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی، جب کہ یہ ناممکن ہے کہ خلافِ شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور آپ خاموش رہیں۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی یعنی اقرار کو شریعت میں ایک مضبوط دلیل تسلیم کیا جاتا ہے۔ پس آپ کی خاموشی حضرت ابوالبصیرؓ کی ساری کارروائیوں کے صحیح ہونے کی دلیل ہے جو بہت ساری قیل وقال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ کسی ملک میں مسلمانوں کے لیے کوئی حکمت عملی متعین کرنے کے لیے یہ ایک واقعہ کافی ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ابوالبصیرؓ کا نمونہ

آج ابوالبصیرؓ کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ یا کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنانِ دین و ملت کو نشانہ بنائے تو کیوں کر غلط ہو سکتا ہے؟ اور اگر کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعہ دارالاسلام مدینہ کے باہر ہو رہا تھا اس لیے آپ نے اس سے تعرض نہیں فرمایا تو یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نبوت ساری دنیا کے لیے تھی۔ دنیا میں جہاں کوئی مسلمان ہوگا آپ کے حکم کے تابع ہوگا۔ حضرت ابوالبصیرؓ آپ کے حدودِ رسالت واطاعت کے باہر نہ تھے اور اگر اس توجیہ کو صحیح مان لیا جائے تو ہمارے مدعا کو مزید ثبوت اور قوت حاصل ہوگی اور یہ ثابت ہوگا کہ کہیں بھی چند مسلمان اکٹھا ہو کر دین وملت کے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کر سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر شرعی حکومت قائم ہو اور وسیع علاقہ پر امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین کا سکہ جاری ہو۔

دوسرے سوال کا جواب

اب آئیے ہم دوسرے سوال پر غور کریں۔

یعنی جہاں کوئی امیر المؤمنین نہ ہو وہاں جہاد کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟

اس سوال کا جواب بھی پہلے سوال کے جواب میں شامل ہے جس کو بآسانی سمجھا سکتا ہے۔لیکن ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے ہم زیادہ نظری بحث نہ کرتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ انعقاد جمعہ ونماز عیدین کے لیے بھی امام یا قاضی کی ضرورت ہے اور نکاح وطلاق کے نزاعی معاملات میں مسلم قاضی کا فیصلہ درکار رہوتا ہے۔ لیکن ہمارے جیسے ملک میں جہاں امیر نہیں ہے وہاں قاضی کہاں سے آئے گا؟ اور معاملات اور حادثات تو بہر صورت پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ اس مسئلہ کا حل علماء نے یہ نکالا کہ عام مسلمانوں کی جماعت کے فیصلہ کو قضاء قاضی کے برابر قرار دیا جائے۔اسی بنیاد پر پورے ملک میں جمعہ وعیدین کی نمازیں قائم کی جاتی ہیں اور اسی بنیاد پر ملک کے کئی علاقوں میں شرعی پنچایتیں کام کررہی ہیں۔پھر اسی بنیاد پر شریعت میں امام اور امیر المومنین کی جو تعریف ہے، اس کو محدود کرتے ہوئے پرسنل لا کی حد تک ایک امیر بنالیا جائے اور وہ قاضی کا تقرر کرے، اور وہ قاضی فیصل مقدمات کرے تو وہ فیصلہ شرعی فیصلہ تسلیم کرلیا جائے۔امارت شرعیہ بہار اور امارت ملت اسلامیہ آندھرا پردیش اسی بنیاد پر قائم ہیں۔

ایک فقہی نکتہ

اس کی نظیر شریعت کے بہت سے احکام میں ہمیں مل سکتی ہے کہ فرض اپنی جگہ قائم رہتا ہے، اس کی ادائیگی کے شرط نہ ہونے کی صورت میں فرض ساقط نہیں ہوتا۔مثلاً نماز کی ادائیگی کے لیے ستر پوشی ضروری شرط ہے۔ لیکن ستر پوشی کا سامان نہ ملے تو وہ فرض ساقط نہ ہوگا بلکہ فرض ادا کیا جائے گا۔کیسے ادا کیا جائے گا کسی مفتی سے دریافت کیجیے۔

وضو ادائیگی نماز کے لیے شرط ہے، لیکن پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم سے کام لیا جائے گا اور اگر کوئی ایسی صورت فرض کی جائے کہ تیمم کرنا بھی ممکن نہ ہو تو نماز کیسے ادا کی جائے؟ کسی مفتی صاحب سے پوچھیے۔ بہر صورت نماز ادا کرنی ہوگی۔فرض ساقط نہ ہوگا، البتہ بعض شکلوں میں فرض کی شکل بدل سکتی ہے۔

جماعت سازی کی بنیاد

سوال یہ ہے کہ نکاح اور طلاق کے جھگڑے طے کرنے کے لیے ایک ملک میں بحیثیت تیمم امارت قائم کی جاسکتی ہے تو فریضۂ جہاد کی ادائیگی کے لیے کوئی امارت کیوں نہیں قائم کی جاسکتی؟ جو اصل امارت اور اسلامی حکومت کی نسبت سے ویسی ہی ہو جیسے ادائیگی نماز کے اصل وضو کی جگہ تیمم ہوتا ہے۔اسلامی حکومت نہیں ہے، کوئی ہمارا امیر نہیں ہے تو اس بنیاد پر قیامت تک جاری رہنے والے فرض جہاد کو اپنی ڈکشنری سے نکال دینا کسی طرح صحیح نہ ہوگا اس کو کسی شکل میں اور کسی درجہ میں باقی نہ رکھنا کیسے درست ہوسکتا ہے؟

اسی طرح اگر فریضۂ دعوت وتبلیغ کی ادائیگی کے لیے انجمنیں اور مختلف جماعتیں کل ہند پیمانہ پر امیر اور مامور کی اصطلاح میں بات کرسکتی ہیں اور اپنے دائرہ میں امیر کی اطاعت کو دینی فریضہ سمجھتی ہیں، اور ان کا سمجھنا بجا ہے تو فریضۂ جہاد کو ادا کرنے کے لیے کوئی امارت کیوں نہیں بنائی جاسکتی؟ اور اگر ایک ملک میں دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کے لیے کئی کئی تنظیمیں بنانا روا ہے تو فریضۂ جہاد جیسے مہتم بالشان فریضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی نظم کیوں نہیں قائم کیا جاسکتا؟

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کے لیے کسی شرعی بنیاد کی نفی جن مزعومات کے تحت کی جاتی ہے۔ ان کو صحیح مان لیا جائے تو کسی کام کے لیے کوئی انجمن اور جماعت بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ ساری انجمنیں اور جماعتیں اپنے اپنے کاموں کی اہمیت بتانے کے لیے اور اپنے کارکنوں میں جوش عمل پیدا کرنے کے لیے انہیں آیات اور احادیث اور انہیں مسلمات کو پیش کرتی ہیں جو صریح طور سے جہاد کے لیے قرآن وحدیث میں ہمیں ملتی ہیں۔ مگر جب جہاد کا نام لیا جاتا ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے لئے گنجائش نہیں ہے۔

دفاعی جہاد

ایک پہلو مزید سوچنے کا یہ ہے کہ احکام اور شرائط کے اعتبار سے اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد میں آپ کو فرق ملے گا۔ اقدامی جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے لیکن دفاعی جہاد فرض عین ہوجاتا ہے۔ اقدامی جہاد میں تعداد کا، جنگی سامان اور وسائل کا لحاظ اور اعتبار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اقدامی جہاد میں کئی اور لوگوں سے اجازت لینی ہوتی ہے۔ مثلاً غلام کو اپنے آقا کی اجازت درکار ہوگی۔ لیکن دفاع کے موقع پر نہ تعداد کا کوئی سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ وسائل جنگ کی کمی بیشی دیکھی جاتی ہے اور نہ کسی کو کسی سے اجازت لینے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ہر ایک کو ہر حالت میں حسب استطاعت دفاعی جہاد میں شرکت کرنی ضروری ہوتی ہے۔ اسی بناء پر غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت کعب بن مالکؓ اور ان کے دونوں ساتھیوں کو شریک جہاد نہ ہونے کی وجہ سے کیسی عبرتناک سزا دی گئی کہ پچاس دن تک ان سے نہ کوئی سلام وکلام کرتا، نہ سلام کا جواب دیتا اور ان کے لیے زمین تنگ ہوکر رہ گئی۔

قرآن میں دفاع کا ذکر

قرآن میں دفاع کا حکم صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ لیکن ایک نکتہ قابل لحاظ ہے۔ مکی سورتوں میں حکم دفاع کے ساتھ دو باتوں کی صراحت کی گئی ہے۔ ایک ظلم سے بڑھ کر بدلہ نہ لیا جائے اور دوسرے یہ کہ صبر کرو تو بہتر ہوگا۔

مدنی سورتوں میں بغیر کسی قید وشرط کے حکم دفاع ہے بلکہ اقدام اور پہل کرنے کا حکم ہے۔

مکی سورتوں میں

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ (الشوریٰ:۴۰)

ترجمہ: بُرائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ (النحل:۱۲۶)

ترجمہ: اگر تم بدلہ لے لو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو، لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں ہی کے حق میں بہتر ہے۔

مدنی سورتوں میں

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: جو تم پر دست درازی کرے تم بھی اسی طرح دست درازی کرو البتہ اللہ سے ڈرتے رہو۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ. (الحج:۴۰-۳۹)

ترجمہ: اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیئے گئے صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے "ہمارا رب اللہ ہے"۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء:۷۵)

ترجمہ: آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دئے۔

دفاع حدیث میں

① ابوداؤد میں حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ کو جب کسی قوم سے اندیشہ ہوتا تو دعا کرتے اللّٰھم انا نجعلک فی نحورھم ونعوذبک من شرورھم یعنی اے اللہ ہم ان کے مقابلہ میں تجھ کو کرتے ہیں اور ان کے شر سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔

② بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے آپ ﷺ نے فرمایا: لاتتمنوا لِقاءَ العدوِ واَسأَلُوا اللّٰہَ العافیۃَ فاذَا لَقِیتُموھُمْ فَاصْبِرُوا۔ دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اللہ سے عافیت مانگو لیکن مڈبھیڑ ہو جائے تو ڈٹ جاؤ۔

③ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "من قتل دون مالہ فھو شھید" جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

④ ابوداؤد اور ترمذی کی حدیث میں حضرت ابوالاعور سعیدؓ نے کہا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا ہے: "من قُتِلَ دونَ مالہ فھو شھیدٌ و من قُتِلَ دون دمہ فھو شھید و من قتل دون دینہ فھو شھید و من قتل دون اھلہ فھو شھید" جو مارا گیا اپنے مال کی حفاظت میں وہ شہید ہے۔ جو مارا گیا اپنی جان کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے دین کی حفاظت میں وہ شہید ہے اور جو مارا گیا اپنے اہل و عیال کی حفاظت میں وہ شہید ہے۔

⑤ مسلم شریف کی حدیث ہے حضرت ابو ہریرہؓ نے بیان کیا کہ ایک آدمی حضور ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول! آپ کا کیا خیال ہے اگر ایک آدمی آئے میرا مال چھیننے کے لئے۔
آپ ﷺ نے فرمایا اس کو اپنا مال نہ دے، سائل نے عرض کیا اگر وہ مجھ سے جنگ کرے۔ فرمایا تو اس سے جنگ کر۔ سائل نے دریافت کیا اگر وہ مجھ کو قتل کر دے تو آپ نے فرمایا تو شہید ہوگا۔ پھر سائل بولا اگر میں اس کو قتل کر دوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: وہ دوزخ میں جائے گا۔

⑥ مسلم شریف کی حدیث میں ہے آپ ﷺ نے فرمایا: "من علم الرمی ثم ترکہ فلیس منا اوقد عصی" جس کو تیر اندازی سکھائی گئی، پھر اس نے تیر اندازی چھوڑ دی وہ ہم میں سے نہیں یا اس نے نافرمانی کی۔

(۷) ابوداؤد کی ایک روایت میں حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ ایک تیر کے ذریعہ تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا۔ بنانے والا جو اس کے بنانے میں حصول خیر کی نیت رکھتا ہو، تیر پھینکنے والا اور تیر کو اٹھانے والا۔ تیر چلاؤ اور سواری کرو اور تیر چلانا سواری کرنے سے بہتر ہے۔ اور جس نے سیکھنے کے بعد بے رغبتی کی وجہ سے تیراندازی چھوڑ دی تو اس نے ایک خاص نعمت کو ضائع کر دیا۔

(۸) بخاری و مسلم کی حدیث ہے، حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''الحرب خدعة''۔ جنگ دھوکہ ہے۔

دفاع فقہ میں

دفاعی جہاد بالا جماع فرض عین ہے۔ ملک اور مقام کی، زمانہ اور وقت کی، کثرت اور قلت کی، خوشحالی اور تنگ دستی کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ہر شخص پر فرض ہوتا ہے کہ دفاعی جہاد میں شریک ہو اور اپنا حق ادا کرے۔ حتیٰ کہ عورت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس کے لئے بھی نکلنا واجب ہوگا ضرورت پر۔ اس فرض کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نکل سکتی ہے۔ بیٹے کو باپ کی اور غلام کو آقا کی بھی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

علامہ جصاصؒ کہتے ہیں۔

''تمام مسلمانوں کے اعتقاد میں یہ معلوم بات ہے کہ جب سرحدی علاقہ کے لوگوں کو دشمن کا خطرہ لاحق ہو اور ان کے اندر دفاع کی قوت نہ ہو، ان کی جان اور ان کا مال، ان کی عورتیں اور ان کے بچے خطرے میں گھرے ہوں تو پوری امت پر فرض ہو جاتا ہے کہ ان کی طرف ایسے لوگ روانہ ہوں جو ان سے ان کے دشمنوں کو روک سکیں۔ امت کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان سے بیٹھ رہنے کو کسی نے جائز قرار نہیں دیا ہے کہ مسلمانوں کی جان اور مسلمانوں کی عورتیں اور بچوں کی جان کو دشمن حلال کر لیں۔''

دفاع کی اہمیت

''الجہاد فی الاسلام'' میں دفاع کی اہمیت بتاتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

''قرآن اپنے پیروؤں میں حمایت حق کی ایسی ناقابل تسخیر روح پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے ان کے اندر کسی حال میں بدی و شرارت کے آگے سر جھکانے اور ظلم و طغیان کے تسلط کو قبول کرنے کی کمزوری پیدا نہ ہونے پائے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق انسان کی سب سے بڑی ذلت یہ ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام یا مال و دولت یا اہل و عیال کی محبت میں مبتلا ہو کر حفاظت حق کی سختیوں سے ڈرنے لگے اور باطل کو طاقتور دیکھ کر اس کی غلامی قبول کرنے کیلئے آمادہ ہو جائے، قرآن جو درحقیقت صحیفہ فطرت ہے، فطرت کے اس راز کو پوری طرح ملحوظ

رکھتا ہے۔ اسی بناء پر اس نے انسان کو صرف دو راہیں بتائی ہیں۔ یا موت یا شرف۔ زندگی بے شرف کی تیسری راہ اس نے نہیں بتائی۔ چاہے اس کے بدنصیب پیروؤں نے اپنے ایمان کی کمزوری اور حوصلہ کی پستی سے اس کو خود اختیار کر لیا ہو...... قرآن حکیم نے سب معاملات میں تحمل اور برداشت کی تعلیم دی ہے مگر ایسے حملہ کو برداشت کرنے کی تعلیم نہیں دی جو دین اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں پر اسلام کے سواء دوسرا نظام مسلط کرنے کیلئے کیا جائے۔ اس نے سختی کے ساتھ حکم دیا ہے کہ جو کوئی تمہارے انسانی حقوق چھیننے کی کوشش کرے، تم پر ظلم وستم ڈھائے، تمہاری جائز ملکیتوں سے تم کو بے دخل کرے، تم سے ایمان وضمیر کی آزادی سلب کرے، تمہیں اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے سے روکے، تمہارے اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنا چاہے اور اس وجہ سے تمہارے درپے آزار ہو کہ تم اسلام کے پیرو ہو تو اس کے مقابلہ میں ہرگز کمزوری نہ دکھاؤ اور اپنی پوری طاقت اس کے اس ظلم کو دفع کرنے میں صرف کرو۔

دفاع کے ان احکام سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ان دینی فرائض میں جو ان کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں سب سے بڑا اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنے قومی استقلال کی سختی کے ساتھ حفاظت کریں اور اپنے قومی اور دینی وجود کو کسی حال میں فتنہ سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اس کیلئے اسلام نے اپنے پیروؤں کو جنگ کی محض اجازت ہی نہیں دی بلکہ تاکید کی ہے اور تاکید بھی ایسی سخت جس کی کیفیت اوپر بیان کی گئی ہے۔ مگر حملہ کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ ایک سلطنت باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دارالاسلام پر حملہ آور ہو اور اس کو فتح کر کے مسلمانوں کو مٹانے یا غلام بنانے یا ان کی مذہبی آزادی کو سلب کرنے کی کوشش کرے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جن سے ایک قوم کے امن واطمینان اور اس کی اجتماعی زندگی کو خطرہ میں مبتلا کیا جاسکتا ہے۔

''اب دفاعی جنگ کی ان تمام صورتوں پر جو سطور بالا میں بیان کی گئی ہیں ایک غائر نظر ڈالیے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ان سب کے اندر ایک ہی مقصد کام کر رہا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے دین اور اپنے قومی وجود کو کسی حال میں بدی وشرارت سے مغلوب نہ ہونے دیں۔ اور یہ بدی جس راہ سے بھی خروج کرے خواہ باہر سے خواہ اندر سے اس کا سر کچلنے کے لئے ہر وقت مستعد رہیں۔ اللہ کو مسلمانوں سے جو خدمت لینی ہے اس کے لئے اولین ضرورت ان کا فتنوں اور خرخشوں سے محفوظ رہنا اور ان کی قومی وسیاسی طاقت کا محفوظ رہنا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مٹنے سے نہ بچائیں اور اندرونی وبیرونی دشمنوں کی فتنہ پردازیوں سے غفلت برت کر اپنے تئیں ان اجتماعی امراض کا شکار ہو جانے دیں جنہوں نے اگلی ظالم قوموں کو ذلت ومسکنت اور غضب الٰہی میں مبتلا کیا تو ظاہر ہے کہ وہ صرف خود اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں نہ ڈالیں گے بلکہ انسانیت کی اس خدمت عظیم کو انجام دینے کے قابل نہ رہیں گے، جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے ہیں اور یہ ان کا صرف اپنے اوپر ہی

نہیں بلکہ تمام عالم انسانی پر ظلم ہوگا۔ پس ان کو کھول کھول کر نہایت وضاحت کے ساتھ ان دشمنوں کے نشانات بتائے گئے ہیں، جو ان کی بربادی کے موجب بنتے ہیں یا بن سکتے ہیں اور ایک ایک کا دھڑ توڑ دینے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ وہ دنیا سے ہدایت کے نور کو مٹانے اور عالم گیر اصلاح کے کام میں سدراہ بننے کے قابل نہ رہیں۔ پھر اس کے لئے صرف اسی وقت تلوار اٹھانے کی ہدایت نہیں کی گئی جب کہ بدی اپنا سر نکالے اور فتنہ پردازی شروع کردے بلکہ اس کے مقابلہ پر ہر وقت کمر بستہ ومستعد رہنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ اسے سر نکالنے کی جرأت ہی نہ ہوسکے اور اس پر حق کی ایسی ہیبت بیٹھی رہے کہ اس کا دف اندر ہی اندر مرجائے۔'' (صفحہ:۸۰،۸۱)

دفاع کی حکمت عملی

عن عمران بن حصین قال کان ثقیف حلیفا لبنی عقیل فاسرت ثقیف رجلین من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واسر اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رجلا من بنی عقیل فاوثقوہ فطرحوہ فی الحرۃ فمر بہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فناداہ یا محمد یا محمد فیما اخذت قال بجریرۃ حلفاء کم ثقیف فترکہ ومضی فناداہ یا محمد یا محمد فرحمہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فرجع قال ماشانک قال انی مسلم فقال لوقلتھا وانت تملک امرک افلحت کل الفلاح قال ففداہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالرجلین الذین اسرتھما ثقیف۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ ثقیف حلیف تھا قبیلہ بنی عقیل کا۔ ثقیف کے لوگوں نے دو مسلمانوں کو قید کرلیا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے انتقام میں قبیلہ بنی عقیل کے ایک آدمی کو پکڑ لیا اور اس کو باندھ کر گرم پتھر پر ڈال دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا اس کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ آدمی چلایا۔ یا محمد یا محمد! مجھے کس جرم میں پکڑا گیا ہے آپ ﷺ نے فرمایا۔ تمہارے حلیف ثقیف کے جرم میں۔ اتنا کہہ کر آپ ﷺ آگے بڑھ گئے۔ اس نے پھر آواز دی۔ یا محمد یا محمد! اس پر آپ ﷺ کو ترس آگیا اور آپ ﷺ لوٹ پڑے اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے؟ اس نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ جس وقت تم آزاد تھے اس وقت اگر تم نے یہ بات کہی ہوتی تو تم پوری طرح کامیاب ہوگئے ہوتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اس آدمی کو دونوں مسلمانوں کی رہائی کی شرط پر چھوڑا۔

جہاد کیا ہے؟

لغوی اعتبار سے جہاد کے معنی کسی معاملہ میں اپنی پوری کوشش لگا دینے کے ہیں اور شرعی لحاظ سے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے دین پر عمل، دین کی خدمت اور دین کی سربلندی کے لئے اپنی پوری طاقت خرچ کردینا جہاد ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة اللّٰه (رواہ الترمذی)

ترجمہ: مجاہد وہ ہے جو جہاد کرے اپنے نفس سے اللہ کی اطاعت میں۔

والمهاجر من هجر مانهى اللّٰه عنه. (رواہ البخاری)

ترجمہ: اور مہاجر وہ ہے جو چھوڑ دے اس کو جس سے اللہ نے روکا ہے۔

بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص جہاد کے لئے اجازت لینے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا تیرے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا، ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ففيهما فجاهد"، یعنی تم انہیں کے بارے میں جہاد کرو۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے ایک شخص آیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا "دلنی علی عمل کعدل الجهاد"، مجھ کو کوئی ایسا عمل بتایئے جو جہاد کے برابر ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "لا اجده"، میں اس کو نہیں پاتا۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک روایت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَبِرَسُولِهِ، وَأَقَامَ الصَّلَاةَ، وَصَامَ رَمَضَانَ كَانَ حَقًّا عَلَى اللّٰهِ، أَنْ يُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ جَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، أَوْ جَلَسَ فِي أَرْضِهِ الَّتِي وُلِدَ فِيهَا، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَفَلَا نُبَشِّرُ النَّاسَ، قَالَ: إِنَّ فِي الْجَنَّةِ مِائَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللّٰهُ

لِلْمُجَاهِدِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ۔
(رواہ بخاری)

ترجمہ: جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، نماز قائم کرے اور رمضان کے روزے رکھے اس کو جنت میں داخل کرنا اللہ پر حق ہے جہاد فی سبیل اللہ کرے یا اپنے پیدائشی مقام میں بیٹھا رہے، لوگوں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگوں کو بشارت دے دیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں جن کو اللہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے واسطے تیار کر رکھا ہے، ہر دو درجہ میں اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان فاصلہ ہے۔

مسند احمد کی روایت ہے کہ عمرو بن عبسہ ؓ نے بیان کیا:

قَالَ رجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا الْإِسْلَامُ؟ قَالَ: أَنْ يُسْلِمَ قَلْبُكَ لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَأَنْ يَسْلَمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِكَ وَيَدِكَ۔ قَالَ: فَأَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الْإِيْمَانُ۔وَفِي رِوَايَةٍ: قَالَ: خُلُقٌ حَسَنٌ، قَالَ: وَمَا الْإِيْمَانُ؟ قَالَ: تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَ الْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔وَفِي رِوَايَةٍ قَالَ: وَمَا الْإِيْمَانُ؟ قَالَ: الصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ، قَالَ: فَأَيُّ الْإِيْمَانِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الْهِجْرَةُ۔ قَالَ: وَمَا الْهِجْرَةُ؟ قَالَ: تَهْجُرُ السُّوْءَ۔ قَالَ: فَأَيُّ الْهِجْرَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الْجِهَادُ۔ قَالَ: وَمَا الْجِهَادُ؟ قَالَ: أَنْ تُقَاتِلَ الْكُفَّارَ إِذَا لَقِيْتَهُمْ۔ قَالَ: فَأَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: مَنْ عُقِرَ جَوَادُهُ وَأُهْرِيْقَ دَمُهُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وآله وسلم: ثُمَّ عَمَلَانِ هُمَا أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ إِلَّا مَنْ عَمِلَ بِمِثْلِهِا، حَجَّةٌ مَبْرُوْرَةٌ أَوْ عُمْرَةٌ۔

ترجمہ: ایک شخص نے دریافت کیا۔ اے اللہ کے رسول! اسلام کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یہ کہ تیرا دل اللہ کے لیے جھک جائے اور یہ کہ تیرے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔

پھر اس نے سوال کیا۔ کون سا اسلام افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ ایمان۔

اس نے سوال کیا۔ ایمان کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے ملائکہ پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر، اور زندگی بعد الموت پر۔

سائل نے پھر سوال کیا۔ کون سا ایمان افضل ہے؟ فرمایا: ہجرت۔

اس نے سوال کیا۔ ہجرت کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ تم برائی کو چھوڑ دو۔

اس نے پوچھا۔ کون سی ہجرت افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاد۔

اس نے کہا جہاد کیا ہے؟ فرمایا: یہ کہ جب تم کفار سے ملو تو ان سے لڑو۔

اس نے کہا۔کون سا جہاد افضل ہے؟ ارشاد فرمایا: اس کا جہاد جس کا گھوڑا اور وہ خود ختم ہو گئے ہوں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید فرمایا، اس کے بعد دو عمل افضل الاعمال ہیں مگر جو انہیں جیسا عمل کرے حج اور عمرہ۔

اوپر کی پہلی دو حدیثوں میں لفظ جہاد غیر قتال کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن پھر تین حدیثوں میں صاف طور سے قتال کے معنی میں استعمال ہوا ہے اس طرح قرآن میں بعض موقع پر عام کوشش کے لیے آیا ہے، مثلاً سورۃ الفرقان کی آیت ہے "جَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" یعنی قرآن کے ذریعہ بڑا جہاد کرو۔ لیکن دس سے زیادہ مقامات پر جہاد کا لفظ صریح طور پر قتال کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح شرعی نصوص اور دینی لٹریچر میں جہاد بمعنی قتال ہی سمجھا جاتا ہے۔ الا یہ کہ اس کے خلاف کوئی قرینہ ہو۔

علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے:

"بذلُ الْجُهْدِ فِي قِتَالِ الْكُفَّارِ"۔ یعنی جہاد کفار سے جنگ میں کوشش صرف کرنا ہے۔

علامہ عسقلانیؒ کہتے ہیں:

قِتَالُ الْكُفَّارِ لِنصْرَةِ الْإِسْلَامِ وَإِعْلَاءِ كَلِمَةِ اللّٰهِ"۔

''جہاد اسلام کی مدد اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے کفار سے جنگ کرنا ہے۔

صاحب الدر المختار فرماتے ہیں:

الدعَاءِ إِلى الدِّينِ الْحقِ وَقِتَالُ مَنْ لَمْ يقبله

یعنی دین حق کی طرف بلانا اور جو اس کو نہ قبول کریں ان سے جنگ کرنا جہاد ہے۔

علامہ ابن حجرؒ، علامہ عسقلانیؒ اور صاحب الدر المختارؒ جہاد کے معنی قتال کے بتاتے ہیں۔ علامہ ابن رشدؒ نے ایک اصولی بات کہہ کر مسئلہ کی نوعیت واضح کر دی ہے:

وَجَهَادُ السَّيْفِ قِتَالُ الْمُشْرِكِينَ عَلَى الدِّينِ فَكُلّ مِنَ الْقَلْب نَفْسَهُ فِي ذَاتِ اللّٰهِ فَقَدْ جَاهَدَ فِي سَبِيلِهِ إِلَّا أَنَّ الْجِهَادَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ إِذَا طَلَقَ فَلَا يَقَعُ بِإِطْلَاقِهِ إِلَّا عَلَى مُجَاهَدَةِ الْكُفَّارِ بِالسَّيْفِ حَتَّى يَدْخُلُوا فِي الْإِسْلَام او يعطوا الجزْيَةَ عَنْ يَدٍوَّهُم صَاغِرُونَ.

ترجمہ: جہاد بالسیف دین کی بنیاد پر مشرکین سے جنگ کرنا ہے۔ پس جس شخص نے اپنے آپ کو اللہ کیلئے تھکایا اس نے جہاد کیا۔ لیکن جہاد فی سبیل اللہ جب مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد کفار سے جہاد بالسیف کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں یا جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ (مقدمات ابن رشد)

گویا علامہ ابن رشدؒ نے ساری آیات، احادیث اور اقوال علماء کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ اس توجیہ سے ہر بات اپنی جگہ اپنے خانہ میں بیٹھ جاتی ہے اور ہر ایک کا مقام بھی متعین ہو جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاد کے زمرے میں ہر وہ کام شامل ہے جو رضائے الٰہی کے لیے کیا جائے مگر قرآن و حدیث میں جب مطلق جہاد فی سبیل اللہ کا لفظ آتا ہے تو اس سے مراد کفار و مشرکین کے ساتھ جنگ ہی ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر وعدے اور ترغیب اسی جہاد کے لئے آتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد کا اعلیٰ مرتبہ یہی ہے اگرچہ حصول مقصد میں معاون کئی چیزوں کو جہاد کہا جا سکتا ہے اور اس کے درجہ کے مطابق اس کا اجر و ثواب بھی ملے گا لیکن اس سلسلہ کا کوئی بھی کام اس اصل جہاد کا بدل نہیں بن سکتا ہے اور نہ اس کے درجہ اور مرتبہ کو پہنچ سکتا ہے۔

اور یہ بات نہایت ہی معقول اور سمجھ میں آنے والی ہے کہ انذار، تبشیر دعوت اور تبلیغ چاہے لسانی ہو کہ قلمی، ان میں سے کوئی چیز بھی معرکۂ اسلام و جاہلیت میں وہ کام نہیں کر سکتی جو سر بکف مجاہد کی تلوار کرتی ہے۔ بدی کے دیو، برائیوں کے سرغنہ اور شیطان کے ایجنٹ ابو جہل اور ابولہب کو بے اثر بنانے کے لیے تلوار ہی ایک موثر ذریعہ ہے۔ افہام و تفہیم اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سلیم الطبع، خیر پسند اور شریف لوگوں سے نمٹا جا سکتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہمیشہ انسانوں کی گردن ظالموں اور جابروں کے پنجہ میں ہوتی ہے جو کبھی سیدھی اور معقول بات نہ خود سمجھنے اور سننے کے لیے تیار ہوتے ہیں اور نہ انہیں یہ پسند ہوتا ہے کہ دوسرے سنیں اور سنائیں۔ اس لیے وہ اپنی پوری کوشش سے حق کو اور حق و انصاف کی آواز لگانے والوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کے مقابلہ میں وہی لوگ آ سکتے ہیں جو حق کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کا عزم رکھتے ہوں اور اپنی پوری متاع حیات لے کر میدان میں اتر آتے ہیں۔ اگر سرفروشوں کا یہ گروہ نہ ہو تو برسوں کی دعوت و تبلیغ کے اثرات پل بھر میں ختم ہو سکتے ہیں۔ معرکۂ بدر میں اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی تھی:

''اے اللہ یہ مٹھی بھر گروہ اگر ختم ہو جائے گا تو زمین میں تیری عبادت کبھی نہ کی جائے گی۔''

یہ ہے اصل جہاد کی اہمیت۔ اس کی نفی اور تردید کرنے یا اس کا نعم البدل بنانے کے لیے کسی دوسرے کام کو پیش کیا جائے تو یہ صرف ایک بے اصل اور بے دلیل بات ہی نہ ہو گی بلکہ ایک ایسا خطرناک اور مجرمانہ فعل ہو گا، جو اجر و ثواب کے بجائے الٹا عذاب اور غضب الٰہی کا سبب ہو گا۔

ایک موضوع حدیث

کسی غزوہ سے واپس آنے کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: ''رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ

الاَکبر"۔ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے۔بیہقی نے اس حدیث کی سند کو ضعیف کہا ہے۔اس کے ایک راوی یحییٰ بن علاء کو ابن حجرؒ نے حدیث گھڑنے والا کہا ہے۔ذہبیؒ نے میزان میں لکھا ہے وہ ضعیف راوی ہے۔یہی بات ابن معین نے کہی ہے دارقطنیؒ نے یحییٰ بن علاءؒ کو متروک الحدیث بتایا ہے۔احمد بن حنبلؒ نے جھوٹا بتایا ہے۔حسن البناءؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔علماء کے ان اقوال کے علاوہ اس کا مضمون قرآن سے صریح طور پر ٹکرانے والا ہے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا○ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا○

(النساء:۹۶،۹۵)

ترجمہ: مسلمانوں میں سے وہ لوگ جو کسی معذوری کے بغیر گھر بیٹھے رہتے ہیں اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں، دونوں کی حیثیت یکساں نہیں ہے اللہ نے بیٹھنے والوں کی بہ نسبت جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا رکھا ہے اگرچہ ہر ایک کے لیے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے مگر اُس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑے درجے ہیں اور مغفرت اور رحمت ہے، اور اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

مولانا مفتی شفیع صاحبؒ اس آیت پر لکھتے ہیں:

"علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عام حالات میں جہاد فرض کفایہ ہے کہ بعض لوگ اس کو ادا کرلیں تو باقی مسلمان سبک دوش ہوجاتے ہیں۔بشرطیکہ جو لوگ جہاد میں مشغول ہیں وہ اس جہاد کے لیے کافی ہوں اور اگر وہ کافی نہیں تو ان کے قرب و جوار کے مسلمانوں پر فرض عین ہوجائے گا کہ مجاہدین کی مدد کریں۔

اس آیت میں "وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى" فرما کر ان لوگوں کو بھی مطمئن فرمادیا ہے جو جہاد کے علاوہ دوسری دینی ضرورتوں میں مشغول ہیں۔لیکن یہ حکم عام حالات میں ہے جب کہ کچھ لوگوں کا جہاد اسلام کے دشمنوں کی مدافعت کے لیے کافی ہو۔اور اگر ان کا جہاد کافی نہ رہے ان کو مزید کمک کی ضرورت ہو تو اول قرب و جوار کے مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہوجاتا ہے۔وہ بھی کافی نہ ہوں تو ان کے آس پاس کے لوگوں پر فرض عین ہوجاتا ہے۔اور وہ بھی کافی نہ رہیں تو دوسرے مسلمانوں پر یہاں تک کہ مشرق و مغرب کے ہر مسلمان کا یہ فرض ہوجاتا ہے کہ اس میں شریک ہو۔"

فضائل جہاد

اللہ کی راہ میں مرنا ہی حقیقی زندگی ہے لیکن عام طور سے لوگوں کو اس کا شعور نہیں ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

(البقرۃ: ۱۵۴)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انہیں مردہ نہ کہو، ایسے لوگ تو حقیقت میں زندہ ہیں، مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مومن ہی حقیقت میں رحمت خداوندی کے امیدوار ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ. (البقرۃ: ۲۱۸)

ترجمہ: بخلاف اس کے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے، وہ رحمت الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اور اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ○ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ○ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران ۱۶۹-۱۷۱)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اُس پر خوش و خرم ہیں۔ اور مطمئن ہیں کہ جو

اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں وفرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مؤمنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے شہداء کی ارواح ہری چڑیوں کے پیٹ میں ہوں گی۔ان کے قندیل ''گھونسلے'' عرش سے لٹکے ہوئے ہوں گے۔ جنت میں وہ جہاں چاہیں گی پھریں گی۔ پھر ان قندیلوں میں بسیرا کریں گی ان کا رب ان سے فرمائے گا کیا تمھیں کسی چیز کی خواہش ہے؟ وہ جواب دیں گے اے رب! ہم کس چیز کی خواہش کریں۔ جنت میں جہاں جی چاہتا ہے پھرتے ہیں۔ان کا رب تین بار یہ سوال کرے گا۔آخر میں وہ کہیں گے اے رب! ہم چاہتے ہیں کہ ہماری روحوں کو ہمارے جسموں میں لوٹا دیا جائے۔ یہاں تک کہ ہم دوبارہ اللہ کی راہ میں مارے جائیں۔

اللہ کی راہ میں لڑنا ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیش نظر صرف خوشنودی رب کا حصول ہو، اور جو اپنی کامیابی اور خوشحالی کے سارے امکانات قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء:۷۴)

ترجمہ: اللہ کی راہ میں لڑنا چاہئے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کر دیں، پھر جو اللہ کی راہ میں لڑے گا اور مارا جائے گا یا غالب رہے گا اُسے ضرور ہم اجر عظیم عطا کریں گے۔

خدا کے نزدیک اصل قدر و قیمت خدا کی راہ میں قربانی اور جان لڑانے کی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کوئی شرف وتقدس پر مبنی مذہبی اعمال بے حیثیت قرار دیئے جائیں گے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ○ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ○ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ○ (التوبة:۱۹-۲۲)

ترجمہ: کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کی مجاوری کرنے کو اس شخص کے کام کے برابر

ٹھہرالیا ہے جو ایمان لایا اللہ پر اور روز آخر پر اور جس نے جانفشانی کی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے نزدیک تو دونوں برابر نہیں ہیں۔ اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا۔ اللہ کے ہاں تو ان ہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑا اور جان و مال سے جہاد کیا۔ وہی کامیاب ہیں۔ ان کا رب انہیں اپنی رحمت اور خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لئے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔

جان و مال کے ساتھ جہاد اللہ کے رسول اور حقیقی مؤمنوں کی امتیازی شان ہے جنت اور ساری بھلائیوں کے وعدے اسی بناء پر ہیں۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرٰتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبۃ:۸۸-۸۹)

ترجمہ: بخلاف اس کے رسول ﷺ نے اور ان لوگوں نے جو رسول ﷺ کے ساتھ ایمان لائے تھے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور اب ساری بھلائیاں ان ہی کے لئے ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اللہ نے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ ہے عظیم الشان کامیابی۔

اللہ کی راہ میں مارے جانے والے ہر لحاظ سے کامیاب ہیں۔ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ نفع کا سودا ہے۔

وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ، سَيَهْدِيْهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ، وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ. (سورۂ محمد ۴-۶)

ترجمہ: اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں گے اللہ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ ان کا حال درست کر دے گا اور ان کو اس جنت میں داخل کرے گا۔ جس سے وہ ان کو واقف کرا چکا ہے۔

دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی کامیابی ایمان کے ساتھ ساتھ جان و مال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ پر موقوف ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ، تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ

ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ، يَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ وَيُدۡخِلۡكُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِىۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ ذٰلِكَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ، وَاُخۡرٰى تُحِبُّوۡنَهَا نَصۡرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتۡحٌ قَرِيۡبٌ وَبَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (الصّف: ۱۳-۱۰)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، میں بتاؤں تم کو وہ تجارت جو تمہیں عذاب الیم سے بچا دے۔ ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کر لے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ابدی قیام کی جنتوں میں بہترین گھر تمہیں عطا کرے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی اور وہ دوسری چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی تمہیں دے گا۔ اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح۔ اے نبی! اہل ایمان کو اس کی بشارت دے دو۔

بخاری میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک آدمی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہا آپ مجھے ایسا عمل بتایئے جو جہاد کے برابر ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ایسا عمل نہیں پاتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ مجاہد جتنے دن جہاد میں رہے تم اتنے دن مسجد میں جا کر برابر نماز پڑھتے رہو اور مسلسل روزہ رکھتے رہو۔ اس آدمی نے کہا: یہ کون کر سکتا ہے!

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک دوسری روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ کی مثال روزہ رکھنے والے اور نماز پڑھنے والے کی سی ہے اور اللہ نے مجاہد کے لئے یہ ذمہ لے لیا ہے کہ یا تو اسے وفات دے کر اسے جنت میں داخل کرے گا یا اسے صحیح سالم اجر و ثواب اور مال غنیمت کے ساتھ واپس لائے گا۔ یہاں اللہ کو علم ہے کہ فی سبیل اللہ کون جہاد کرنے والا ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جنت کے ایک سَو درجے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لئے تیار کیا ہے ہر دو درجوں کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا زمین اور آسمان کے درمیان فاصلہ ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کوئی مرجانے والا بندہ جس کو اللہ کے پاس خیر ملا ہو دنیا کی طرف لوٹنے سے خوش نہ ہوگا خواہ دنیا و مافیہا اسے مل جائے۔ ہاں شہید، جس نے شہادت کی فضیلت پائی ہے اس کو یہ بات خوش کرے گی کہ اسے دنیا کی طرف لوٹایا جائے اور پھر وہ دوبارہ شہید کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک اور روایت میں ہے کہ فی سبیل اللہ جس کو کوئی زخم لگے گا وہ قیامت کے دن اس

حال میں آئے گا کہ رنگ خون کا رنگ ہوگا اور خوشبو مشک کی خوشبو ہوگی۔

ابوعبس عبدالرحمٰنؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جس بندہ کے دونوں قدم غبار آلود ہوں گے اس کو جہنم کی آگ نہ چھوئے گی۔

عبداللہ بن ابی اوفیؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا "واعلموا ان الجنة تحت ظلال السیوف"، جان لو جنت تلوار کے سایوں میں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا جس نے فی سبیل اللہ کوئی گھوڑا پالا، اللہ پر ایمان کے ساتھ، اور اس کے وعدہ کو سچ مانتے ہوئے تو گھوڑے کا چارہ، پانی، اس کی لید اور اس کا پیشاب روز حشر اس آدمی کے میزان میں ہوگا۔

یہ سب روایتیں بخاری شریف کی ہیں۔

ترکِ جہاد

جہاد سے کترانا اور جی چرانا نفاق کی علامت ہے:

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ. اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ (التوبہ ۴۴-۴۵)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے۔ اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے۔ ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں رکھتے۔ جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (التوبۃ:۸۱-۸۲)

ترجمہ: جن لوگوں کو پیچھے رہ جانے کی اجازت دے دی گئی تھی وہ اللہ کے رسول ﷺ کا ساتھ نہ دینے اور گھر بیٹھے رہنے پر خوش ہوئے اور انہیں گوارا نہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کریں۔ انہوں

نے لوگوں سے کہا کہ۔''اس سخت گرمی میں نہ نکلو''۔ان سے کہو کہ جہنم کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔کاش انہیں اس کا شعور ہوتا۔اب چاہئے کہ یہ لوگ ہنسنا کم کریں اور روئیں زیادہ۔اس لئے کہ جو بدی یہ کماتے رہے ہیں اس کی جزاء ایسی ہی ہے۔

ابن کثیرؒ نے ابوعمران و مسلم سے ایک روایت نقل کی ہے کہ مہاجرین میں سے ایک صحابی نے قسطنطنیہ میں صف بستہ دشمن پر حملہ کردیا یہاں تک کہ انہیں بکھیر دیا۔ یہ دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا اس شخص نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔حضرت ابوایوب انصاریؓ موجود تھے۔انہوں نے بیان کیا کہ ہم نبی ﷺ کے ساتھ رہے معرکوں میں حصہ لیا یہاں تک کہ اسلام غالب ہوگیا۔ہم نے سوچا اب جنگ کے مواقع ختم ہوگئے لہٰذا ہم کو اپنے اہل وعیال میں جا کر اطمینان کے ساتھ رہ جانا چاہئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرۃ:۱۹۵)

ترجمہ:اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

معلوم ہوا کہ ہلاکت میں اپنے آپ کو ڈالنا گھر میں بیٹھے رہنا اور ترک جہاد ہے نہ کہ دشمن کی صف میں گھسنا اور ان کو تتر بتر کرنا۔

قرآن ترک جہاد پر کتنے صاف اور شدید انداز میں اخروی اور دنیوی عذاب کی وعید سناتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ○ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (الانفال ۱۵-۱۶)

ترجمہ:اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم ایک لشکر کی صورت میں کفار سے دوچار ہو تو ان کے مقابلہ میں پیٹھ نہ پھیرو۔جس نے ایسے موقع پر پیٹھ پھیری الا یہ کہ جنگی چال کے طور پر ایسا کرلے یا کسی دوسری فوج سے جا ملنے کے لئے۔تو وہ اللہ کے غضب میں گھر جائے گا۔اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ بہت بری جائے بازگشت ہے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (التوبۃ:۳۹)

ترجمہ:تم نہ اٹھو گے تو خدا تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ کسی اور گروہ کو اٹھائے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

زبان رسالت ﷺ سے سنئے اور کانپ جایئے:

لئن ترکتم الجهاد واخذتم باذناب البقر. وتبايعتم بالعينة. ليلزمنكم الله مذلة في رقابكم لاتنفك عنكم حتى تتوبوا الى الله وترجعوا الى ما كنتم عليه.

(رواه احمد)

ترجمہ: اگر تم جہاد کو چھوڑ دو گے اور گائے کی دم پکڑلو گے اور سودی کاروبار کرنے لگو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری گردنوں میں ذلت لازم کردے گا جو تم سے دور نہ ہوگی یہاں تک کہ تم اللہ کی طرف توبہ کرو اور اپنی پچھلی حالت پر لوٹ آؤ۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

من لم يغز ولم يجهز غازيا اويخلف غازيا في اهله بخير اصابه الله بقارعة قبل يوم القيامة۔ (رواه البيهقى)

ترجمہ: جس نے جنگ نہیں کی اور نہ کسی غازی کو تیار کیا اور نہ کسی غازی کی عدم موجودگی میں اس کے اہل وعیال کی دیکھ بھال کی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت سے پہلے ایک سخت مصیبت سے دوچار کردے گا۔

جس فریضہ کی کتاب وسنت میں یہ اہمیت بتائی گئی ہو اور جس کے ترک پر یہ وعیدیں سنائی گئی ہوں اس کو نہ صرف یہ کہ چھوڑا جارہا ہے بلکہ اپنے اس عمل کو شرعی دلائل سے مدلل کرنے کی کوشش بھی کی جارہی ہے اور اگر کچھ دیوانے اس کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کو دین وملت کا بدخواہ اور علم دین سے بے بہرہ قرار دیا جارہا ہے۔ یہ ہماری فکری اور عملی زبوں حالی کی حد ہے اس کے بعد اگر ہماری مظلومیت بھری آہ آسمان تک نہیں پہنچتی تو کیا تعجب ہے!

اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے مرض کا جو علاج بتایا اس کو برتنے کیلئے ہم تیار نہیں۔ ہم کو چٹکلوں کی کھوج ہے۔ کتاب وسنت نے ہمارے سامنے جو شاہراہ کھول کر رکھ دی ہے اس پر ہم چلنے کیلئے آمادہ نہیں۔ ہم پگڈنڈیوں کی تلاش میں ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے ہے کہ ہمیں دنیا سے عشق ہے اہل دنیا سے دوستی ہے اور فی سبیل اللہ مرنے کی لذت سے ناآشنا ہیں۔ فی سبیل اللہ لذت شوق ہم نے نہیں پائی ہے اس ایمان و یقین سے دور ہیں جو مرنے ہی کو اصل جینا اور کھونے کو پانا باور کراتا ہے۔

یارب دل مسلم کو وہ زندہ تمنا دے
جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے

حکم جہاد کی تاریخ

اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صرف زبان سے جہاد کرنے کا حکم تھا۔ ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ تھی۔

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان:۵۲)

ترجمہ: پس کافروں کی اطاعت نہ کرو اور قرآن کے ذریعہ ان سے بڑا جہاد کرو۔

ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ باقاعدہ منصوبہ کے تحت نہ اقدامی جنگ کی اجازت تھی اور نہ دفاعی جنگ کی۔ یہ بات یوں نکلتی ہے کہ انفرادی مدافعت اور ہاتھا پائی کے متعدد واقعات ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ مارنے والوں کے سامنے سر جھکا دینا مطلوب نہ تھا۔ اپنے طور پر اپنا بچاؤ جو جس طرح کر سکتا تھا کرتا تھا اور ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ ہونے کے خلاف یہ بات نہ تھی بلکہ انفرادی دفاع جائز تھا کم وبیش تیرہ سال کے بعد باقاعدہ مدافعت یعنی دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی۔ اس موقع پر یہ ذہن میں رہے کہ جس وقت تلوار اٹھانے کی یہ اجازت دی جا رہی تھی مسلمانوں کی ساری طاقت مدینہ کے ایک قصبہ میں چند سو افراد پر مشتمل تھی۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ (الحج:۳۹)

ترجمہ: اجازت دے دی گئی ان کو جن سے کہ جنگ کی جا رہی ہے۔ اس لئے کہ وہ مظلوم ہیں اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر قدرت رکھنے والا ہے۔

دفاعی جنگ کا کیا مفہوم ہے؟ اس کو متعین کرنا ضروری ہے۔ اس اجازت کے بعد ۱۶ رمہینہ کے اندر یعنی جنگ بدر سے پہلے پہلے ۸ ر آٹھ فوجی مہم کا تاریخ میں ہمیں ثبوت ملتا ہے۔ بعض میں صرف ۱۲ رصحابہ تھے اور بعض میں دو سو تک لوگ تھے۔ بعض میں آپ بنفس نفیس شریک رہے اور اکثر میں کسی صحابی کی قیادت میں دستے روانہ ہوئے۔ مقصد اطراف واکناف پر رعب ڈالنا اور مشرکین کے مختلف قافلوں کو چیک کر کے یہ ظاہر کرنا تھا کہ اب

ہم پہلے کی طرح خاموش نہیں بیٹھیں گے بلکہ تر کی بہ تر کی جواب دیں گے۔ ان عسکری مہمات میں ٹکراؤ بعض ہی دفعہ ہوا اور وہ بھی معمولی۔ لیکن اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دفاع کا صرف یہی مطلب نہیں ہے کہ جب دشمن دروازہ پر آجائے تو ڈٹ کر مقابلہ کرو۔ بلکہ دفاع میں بغرض مدافعت اقدام بھی کرنا پڑتا ہے۔ دشمن کی سازشوں، کارروائیوں کا پیشگی مطالعہ کرنا اور اس کے مطابق عمل کرنا، دشمن کا تعاقب کرنا، دشمن کی کھوج میں نکلنا اور دشمن کو پسپا کرنے کے لئے تیار اور مستعد رہنا سب دفاع میں شامل ہے۔

اگر کوئی شخص جنگی تیاری، دشمن کو مرعوب کرنے کے لئے کارروائی، دشمن کے ارادوں اور سازشوں کو معلوم کر کے اقدام کرنے اور ان کا تعاقب کرنے کو دفاعی عمل سے آگے کی چیز سمجھتا ہے تو اسے اس کا جواب دینا ہوگا کہ جنگ بدر سے پہلے نبی ﷺ کی عسکری مہمات کو کس خانہ میں رکھا جائے گا؟ اس لئے کہ اس وقت تک اقدامی جنگ کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

تیسرے مرحلہ میں ان لوگوں سے لڑنے کی اجازت دی گئی جو آمادۂ پیکار ہوں۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

چوتھے اور آخری مرحلہ میں تمام کافروں سے جنگ فرض کر دی گئی خواہ وہ اپنی جگہ خاموش ہی کیوں نہ ہوں اور خواہ کتنے ہی بے ضرر کیوں نہ نظر آتے ہوں۔ الا یہ کہ ان سے کوئی معاہدہ ہوا ہو یا ذمی بن گئے ہوں۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور تم سب مل کر مشرکین سے لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان لو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اور جو اللہ اور رسول کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام نہیں مانتے اور نہ دین حق کو اپناتے ہیں لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

یہ آیت اس باب میں صریح ہے کہ غلبہ کفر کو برداشت نہ کیا جائے گا۔ چاہے غلبہ کفر دنیا کے کسی کونے میں ہو با استطاعت مسلمانوں پر فرض ہے کہ غلبہ کفر کو ختم کرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ اس آیت کو سورہ صف اور سورہ حج کی ان آیات سے ملا کر پڑھیے جن میں بعثت کا مقصد بتایا گیا ہے کہ دین حق کو سارے ادیانِ باطلہ پر غالب کرنا ہے خواہ اہل باطل کو یہ کتنا ہی نا گوار ہو۔ قرآن کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ لڑائی کی غرض و غایت یہ ہے کہ کفار کی خود مختاری اور بالا دستی ختم ہو جائے وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات اہل حق کے ہاتھوں میں ہوں اور کفار و مشرکین ماتحت، تابع اور مطیع بن کر رہیں۔ یہ وہ آخری مرحلہ ہے جس پر حکم جہاد مستقل ہو گیا یعنی اس میں اب کسی طرح کی کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد مسلمانوں کی نسبت سے کفار کی تین قسمیں ہوں گی۔ محارب، معاہد اور اہل ذمہ۔ یہاں یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ معاہدہ اور مصالحت محض جائز ہے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں معاہدہ اور مصالحت کی جا سکتی ہے کسی حال میں ضروری اور فرض نہیں ہے اور جو معاہدہ اور مصالحت بھی ہو گی وہ مطلق اور بے مدت نہ ہو گی۔ بلکہ اس کی ایک مدت متعین ہو گی۔ اس رخ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کفار کی مستقل دو ہی قسم ہے محارب یا اہل ذمہ، دوسری کوئی بھی قسم اور حیثیت استثنائی اور عارضی ہو گی۔

ایک درجن سے زیادہ علمائے تفسیر کی رائے کے مطابق آخری مرحلہ نے سابقہ تمام مرحلوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ بعض اسلاف نے اس پر اجماع کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ سلف صالحین میں سے بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ حالات کے تحت پچھلے مرحلہ والی آیات پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے بعض نے نسخ کے قائلین پر نقد بھی کیا ہے اور بعض نے نسخ کا معنی یہ بتایا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ ان آیات پر کبھی عمل ہی نہیں کیا جا سکتا۔

ان مختلف رایوں کے درمیان کوئی تصفیہ کرنا ہمہ شما کے بس سے باہر ہے۔ البتہ اتنی بات پورے یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح شریعت کے دوسرے احکام میں اعتبار آخری مرحلہ کا ہوتا ہے اسی طرح اس باب میں بھی اعتبار آخری مرحلہ کا ہونا چاہئے۔ رہے دوسرے مرحلے تو وہ بدرجہ مجبوری حد جواز میں آ سکتے ہیں استثنائی اور عارضی حالات میں ان کو لیا جا سکتا ہے۔ مستقل اصول کی حیثیت سے ابتدائی مرحلوں کو نہیں اپنایا جا سکتا مثلاً حرمت شراب کا آخری مرحلہ اصل ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی فرضیت کا آخری مرحلہ اصل ہے۔ ان کے ابتدائی

مراحل کو اصل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اِلاَّ یہ کہ بعض عوارض اور مجبوریوں کے تحت ابتدائی مرحلہ کو اختیار کیا جا سکتا ہے جیسے عارضہ سفر پیش آنے کی صورت میں نماز چار کے بجائے دو رکعت پڑھی جائے گی اور روزے ماہ رمضان کے علاوہ دوسرے دنوں میں رکھے جائیں گے۔ اس موقع پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آخری مرحلہ کے لئے اصلاً بہت زیادہ دلیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ابتدائی مراحل کو اختیار کرنے کے لئے دلیل اور حجت کی زیادہ ضرورت ہونی چاہئے۔ مگر یہ عجیب تماشہ ہے کہ ابتدائی مراحل میں سے کسی ایک مرحلہ کو اپنانے کے لئے لوگ دلیل کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ بلا دلیل ان کو اپنانا عین تقاضائے شریعت سمجھتے ہیں اور آخری اور مستقل مرحلہ کے واسطے انہیں کوئی دلیل نظر نہیں آتی ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپکا حسنِ کرشمہ ساز کرے

جہاد کی دو قسمیں

جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ مسلمان اقدام اور پہل کریں اور دشمن کی سرحد میں جنگ ہو۔ یہ اقدام کرنے سے پہلے جمہور فقہاء کے نزدیک کفار کو اسلام کی دعوت دینا ضروری ہے۔ اگر ان تک دعوت نہ پہنچی ہو اور اگر دعوت پہنچ چکی ہو تو قبول اسلام کی دعوت دینا مستحب ہے اگر اسلام قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ تم اسلام کے ماتحت بن کر رہو۔ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو میدان میں دعوتِ مبارزت دی جائے۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل نصوص شاہد ہیں۔

فَإِذَا انْسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التوبۃ:۵)

ترجمہ: پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً وَّاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکین سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ

وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ. (التوبہ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہ لائیں اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ ویقیموا الصلوۃ ویوتوا الزکاۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے لڑوں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ کی گواہی دیں۔ نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں۔ پس جب وہ ایسا کریں گے تو مجھ سے اپنی جان اور مال بچالیں گے الا یہ کہ اسلام کا حق ہے اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

دوسرا ارشاد ہے:

من مات ولم یغز ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من نفاق۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: جو مر گیا اس حال میں کہ اس نے جہاد نہیں کیا اور نہ جہاد کی آرزو کی وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔

اس طرح کی بہت ساری نصوص شرعیہ کی بناء پر جہاد کی یہ قسم اکثر علماء وفقہاء کے نزدیک فرض کفایہ ہے۔ وجوب جہاد کے سلسلہ میں فقہاء اسلام کے اقوال پیش کرنے کے بعد حسن البناءؒ ایک مقام پر لکھتے ہیں:

فھا انت ذاتری من ذالک کلہ کیف اجمع اھل العلم مجتھدین و مقلدین وسلفیین و خلفیین علی ان الجھاد فرض کفایۃ علی الامۃ الاسلامیۃ لنشر الدعوۃ۔

ترجمہ: پس ہاں تم ان تمام سے دیکھتے ہو کہ کس طرح اہل علم، خواہ وہ مجتہد ہوں یا مقلد، پہلے کے لوگ ہوں یا بعد کے۔ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ جہاد ملتِ اسلامیہ پر اشاعتِ دعوت کی غرض سے فرض کفایہ ہے۔

علامہ کاسانیؒ کہتے ہیں:

جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ اس لئے کہ اس کی غرض اشاعتِ اسلام، اعلاء کلمۃ اللہ، کفار کے شر کو دفع کرنا اور انہیں

زیر کرنا ہے یہ مقصد کچھ لوگوں کے ذریعہ حاصل ہو جائے گا۔

ابن ہمامؒ نے فتح القدیر میں فرمایا ہے: جہاد فرض کفایہ ہے کیونکہ وہ فرض ہے فرض کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ اس فرض کو ادا کر رہے ہوں تو بقیہ لوگوں سے بھی فرض ساقط ہو جائے گا۔ لیکن یہاں یہ بات بہت ہی قابل لحاظ ہے کچھ افراد کی محض ادائیگی فرض کی کوشش کافی نہیں ہے بلکہ بقیہ لوگوں سے فرض اسی وقت ساقط ہوگا جب کہ کچھ افراد کی سعی مقصد جہاد کو پورا کر رہی ہو۔

حاشیہ ابن عابدینؒ میں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

وایاک ان تتوهم ان فرضیته تسقط عن اهل الهند بقیام اهل الروم مثلاً بل یفرض علی الاقرب فالاقرب من العدوالی ان تقع الکفایة فلولم تقع الا بکل الناس فرضا عینا کصلوة وصوم۔

ترجمہ: یعنی تم یہ خیال چھوڑ دو کہ مثلاً اہل روم کے قیام سے اہل ہند سے جہاد کی فرضیت ساقط ہو جائے گی۔ بلکہ دشمن سے قریب سے قریب تر پر جہاد فرض ہوگا یہاں تک کہ کفایت حاصل ہو جائے اگر کفایت حاصل نہ ہو سکے مگر تمام لوگوں کے ذریعہ تو جہاد، نماز اور روزہ کی طرح فرض عین ہو جائے گا۔

یہاں واضح رہنا چاہئے کہ بعض سلف سے جہاد کے مستحب ہونے کا قول بھی ملتا ہے لیکن محققین علماء نے کہا ہے کہ بعض سلف کے قول سے مستحب ہونے کا جو گمان ہوتا ہے وہ محض گمان ہی ہے، صحیح نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ کئی اسلاف ایسے بھی ہیں جو حکم جہاد پر مشتمل آیات اور احادیث سے فرض عین ہونے کی بات کہتے ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے کہا ہے جنس جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہے یعنی کسی نہ کسی شکل میں جہاد کرنا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ ہاتھ سے نہیں تو زبان سے یا مال سے یا دل سے ابن قیمؒ نے کہا دل سے، یا زبان سے یا مال سے یا ہاتھ سے جہاد فرض عین ہے۔ لیکن جان سے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔

سورۂ صف میں دیکھئے کتنے واضح انداز میں دوزخ سے نجات، مغفرت کے حصول، جنت میں دخول اور پھر ساتھ ہی دنیاوی فتح اور کامرانی کو ایمان اور جہاد سے جوڑ دیا گیا ہے اور سورہ توبہ کی آیت اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا میں کتنی شدت کے ساتھ جہاد میں نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اس طرح کی آیات کی روشنی میں بعض اسلاف کی عجیب وغریب کیفیت سامنے آتی ہے۔ فرض عین اور فرض کفایہ کے قانونی انداز میں نہ سوچ کر جیسے اصل روح کو انہوں نے اپنا لیا ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت سعید بن مسیبؓ جہاد کے لئے نکل پڑے اس حال میں کہ ان کی ایک آنکھ ضائع ہو چکی تھی۔ لوگوں نے ان سے کہا آپ بیمار ہیں معذور ہیں۔ کیوں زحمت کرتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہلکے اور بوجھل

سب کو نکلنے کو فرمایا ہے۔ اگر میں جنگ نہ کرسکوں گا تو تعداد میں اضافہ کروں گا۔ سامان کی دیکھ بھال کروں گا۔

طبریؒ نے نقل کیا ہے کہ حضرت مقداد بن اسودؓ بہت موٹے تھے تابوت سے باہران کا جسم ہو رہا تھا۔ لوگوں نے کہا آپ کو اللہ تعالیٰ نے معذور قرار دیا ہے تو جواب دیا ہم ہی پر اِنۡفِرُوۡا خِفَافًا وَّثِقَالًا کی آیت نازل ہوئی ہے۔

حضرت ابوطلحہؓ نے اپنے بیٹوں سے فرمایا: اللہ نے جہاد میں ہلکے اور بوجھل ہر حالت میں جانے کا حکم دیا ہے۔ میرے لئے سامان سفر تیار کرو۔ بیٹوں نے کہا اللہ آپ پر رحم فرمائے آپ نے اللہ کے رسول ﷺ کے ہمراہ جہاد کیا۔ حضرت صدیقؓ اور حضرت فاروقؓ کے ہمراہ ہو کر جہاد کیا اب ہم لوگ آپ کی طرف سے جہاد کریں گے۔ لیکن وہ نہ مانے اور بغرض جہاد بحری سفر پر نکل پڑے اور اسی سفر میں انتقال کر گئے۔ ان کو دفن کے لئے جگہ نو دنوں کے بعد بڑی مشکل سے ملی اور نو دنوں تک میت میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوئی۔

یہ واقعات دراصل انسانی فطرت کے ایک پہلو کو واضح کرتے ہیں کہ معاشرہ میں ہمیشہ کچھ افراد ہوتے ہیں جو اپنے جذبہ، اپنے حوصلہ اور اپنے احساس میں عام لوگوں کے مقابلہ میں بہت آگے ہوتے ہیں اور فکر وعمل دونوں میں ممتاز اور نمایاں ہوتے ہیں۔

فرض عین اور فرض کفایہ کے مسئلہ کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جہاں جہاں سر بکف اور سرفروشوں کی ضرورت ہے وہیں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو پیچھے رہ کر دوسرے محاذوں پر مستعد رہتے ہوئے محاذ جنگ پر مجاہدین کو مدد پہنچائیں۔ گویا میدان جنگ سے دور ہوتے ہوئے میدان جنگ میں ہیں۔ ان کے لئے بھی حسنیٰ کا وعدہ ہے خواہ مجاہدین کے برابر نہ ہوں۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا (النساء:۹۵)

ترجمہ: اگرچہ ہر ایک کے لئے اللہ نے بھلائی ہی کا وعدہ فرمایا ہے مگر اس کے ہاں مجاہدوں کی خدمات کا معاوضہ بیٹھنے والوں سے بہت زیادہ ہے۔

اسی زمرہ میں ان لوگوں کو شامل کیا جا سکتا ہے جو علمی، تحقیقی اور ذہنی وفکری کاموں میں مصروف رہ کر مجاہدین کو تقویت پہنچا رہے ہوں۔ یہی بات آیت ۱۲۲ سورۃ توبہ میں کہی گئی ہے۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ.

(التوبۃ:۱۲۲)

ترجمہ: اور یہ کچھ ضروری نہ تھا کہ اہل ایمان سارے کے سارے ہی نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کی آبادی کے ہر حصہ میں سے کچھ لوگ نکل کر آتے اور دین کی سمجھ پیدا کرتے اور واپس جا کر اپنے علاقے کے باشندوں کو خبردار کرتے تاکہ وہ (غیر مسلمانہ روش سے) پرہیز کرتے۔

صحیح مسلم شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قبیلہ بنی لحیان کو کہلا بھیجا کہ ہر دو آدمی میں سے ایک نکلے۔ مزید فرمایا کہ تم میں کا جو شخص نکلنے والے کے مال و جائیداد اور اہل و عیال کی اچھی طرح دیکھ بھال کرے گا اس کو نصف ثواب ملے گا۔

صحیح مسلم کی ایک اور بھی روایت ہے آپ نے فرمایا:

فمن جهز غازیا فی سبیل اللّٰہ فقد غزا ومن خلف غازیا فی اهله بخیر فقد غزا۔

ترجمہ: پس جس نے کسی غازی کو تیار کیا اللہ کے راستہ میں اس نے جہاد کیا اور جس نے غازی کی قائم مقامی کی اس کے اہل و عیال میں اس نے جہاد کیا۔

مسئلہ کے اس پہلو سے ان لوگوں کے لئے کوئی چھوٹ اور گنجائش نہیں ملتی جو دوسرے محاذوں پر کام کر رہے ہوں لیکن میدانی جہاد کو بے وزن بنا رہے ہوں اور سرفروشوں کی حوصلہ شکنی کر رہے ہوں اور اس اصل جہاد کو بے وقت کی راگنی اور دین و ملت کے لئے نقصان خیال کرتے ہوں اور جہاد کا لفظ سنتے ہی جن کی تیوری پر بل آ جاتا ہو۔ ایسے لوگوں کو چاہئے کہ کتاب و سنت کے نصوص، زمانہ کے دباؤ سے الگ ہو کر پڑھیں اور دیکھیں اور اپنے اعمال خیر کو اکارت ہونے سے بچائیں اور میدان میں نہ جا کر بھی میدان کا ثواب حاصل کریں۔ حتی الوسع مجاہدین کے لئے تقویت کا سبب بنیں اور جہاد میں عدم شرکت کو اپنی بدنصیبی تصور کریں۔

جہاد ایک قرآنی اصطلاح ہے قرآن میں جہاد کا صریح حکم ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی کامرانی اور کامیابی کا سررشتہ ایمان اور جہاد سے جوڑ دیا گیا ہے۔ نبی ﷺ نے قیامت تک جاری رہنے والا فریضہ بتایا ہے ایسی حالت میں لفظ جہاد سے تنفر اور ناپسندیدگی کا اظہار نہایت ہی سنگین جرم ہوگا۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص جہاد کا معنی اور مفہوم کچھ کا کچھ بتائے یا کوئی شخص یہ کہے کہ جہاد کے شرائط یہ ہیں اور وہ ہیں جو پورے نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ کے دباؤ کی بناء پر لفظ جہاد سے کسی مسلمان کو کراہت اور الرجی ہونے لگے۔ کیونکہ لفظ جہاد کے ساتھ ایک فریضہ مسلمانوں پر بالکل اسی طرح عائد کیا گیا ہے جس طرح صلوۃ، زکوۃ اور حج وصوم کے نام سے مسلمانوں پر کچھ مخصوص اعمال فرض کئے گئے ہیں۔ تفسیر قرطبی میں ہے:

والتشاقل عن الجهاد مع اظهار الكراهة حرام۔ (قرطبی، جلد:۸، ص:۱۴۱)

ترجمہ: اظہار ناپسندیدگی کے ساتھ جہاد سے پہلوتہی کرنا حرام ہے۔

یہ معلوم ہونے کے بعد کہ کفار کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کیا جائے۔ اس کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو ان سے جنگ کرنا فرض ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ فرض کیسے ادا ہوگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کفر وشرک کا فتنہ جب تک زمین پر باقی ہے اور جب تک زمین کے چپہ چپہ پر اسلام کا غلبہ نہیں ہوجاتا حتیٰ کہ ایک بالشت بھی زمین مشرک کے قبضہ میں ہے اس وقت تک جہاد کا فریضہ باقی رہے گا۔ اس فریضہ کی ادائیگی کی صورت یہی بنتی ہے کہ جس طرح تقویٰ حسب استطاعت اختیار کرنے کا حکم ہے اس طرح جہاد بھی استطاعت کے مطابق کرنا ہے اور کرتے رہنا ہے۔ لیکن امت کے ایک طبقہ علماء نے اس کی تحدید کر دی ہے کہ سال میں ایک بار ضرور جہاد کیا جائے۔ اس بات کو قرطبی نے ان الفاظ میں کہا ہے۔

> قسم ثان من واجب الجهاد فرض ایضا علی الامام اغز طائفة الی العدو کل سنة مرة یخرج معهم بنفسه اویخرج من یثق به لید عوهم الی الاسلام ویر غمهم ویکف اذاهم ویظهر دین اللّٰه علیهم حتی یدخلوا فی الاسلام اویعطوا الجزیة عن یدوهم صاغرون. (قرطبی، جلد:۸، ص:۱۵۲)
>
> ترجمہ: واجب جہاد کی دوسری قسم، امام پر یہ بھی واجب ہے کہ وہ ہر سال ایک مرتبہ ایک گروہ کو دشمن کی طرف لڑنے کے لئے لے جائے۔ ان کے ساتھ بذات خود جائے یا اپنے معتمد آدمی کو بھیجے۔ دشمنوں کو اسلام کی دعوت دے۔ ان کو دبائے اور ان کی اذیت کو روکے اور ان کے اوپر دین کو غالب کرے۔ یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہوجائیں یا چھوٹے بن کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

یہ علامہ قرطبی نے گویا استطاعت کی کم از کم ایک حد متعین کر دی ہے اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں رائیں باہم متصادم نہیں ہیں۔

مقاصد جہاد

جہاد کا نام سنتے ہی بعض لوگ اس لئے چونک جاتے ہیں کہ غیر شعوری طور پر ان کے ذہن میں دعوت اور جہاد دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ گویا جہاد کا تصور آتے ہی دعوت کا تصور ختم ہوجاتا ہے۔ حالانکہ اصل واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جہاد، دعوت کی اعلیٰ شکل ہے۔ اکثر احکام اپنے آغاز میں جس شکل میں تھے آخر میں وہ شکل کسی نہ کسی لحاظ سے بدل گئی۔ نماز، روزہ اور زکوۃ کی شکل شروع میں کچھ تھی اور آخر میں کچھ ہوگئی۔

اسی طرح دعوت کا حکم بھی تصور جہاد سے مل کر اپنی آخری اور اعلیٰ شکل کو پہنچا ہے۔ اب جہاد کا تصور ذہن سے نکال کر دعوت کا تصور ناقص تصور ہوگا۔ شوق شہادت کے جذبات سینوں میں پرورش نہ کرتے ہوئے دعوت کے عمل کو دعوت اسلامی کا نام دینا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص بس صبح وشام دو دو رکعت پڑھ لے اور کہے کہ میں نمازی ہوں اور اس میں سلام وکلام کا سلسلہ جاری رکھے اور کہے کہ اس کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

جہاد کا مقصد ملک گیری، کسی نسل اور قوم کی بالادستی اور حکومت دوسری نسل وقوم پر قائم کرنا نہیں ہے۔ کسی ایک طبقہ کو دوسرے طبقہ سے بڑھانا بھی نہیں ہے بلکہ نیکی کو برائی پر، خیر کو شر پر بڑھاوا دینا ہے، فساد کو ختم کرنا اور انسان کو صرف اللہ کا تابعدار اور بندہ بنانا اور انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں داخل کرنا ہے۔ اللہ کے علاوہ خدائی کے تمام دعویداروں کی خدائی کا خاتمہ کرنا ہے اس لئے کہ سارے فساد کی جڑ انسان پر انسان کی خدائی اور حاکمیت ہے۔ چنانچہ جہاد کی غرض قرآن نے یوں بیان کی ہے:

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرۃ:۱۹۳)

ترجمہ: تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہوجائے، پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سواء اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَّيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلّٰهِ فَإِنِ انْتَهَوْا فَإِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (الانفال:٣٩)

ترجمہ: ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کیلئے ہوجائے پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔

ارشادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے:

ومن قاتل لتكون كلمة الله هي العليا فهو في سبيل الله۔

ترجمہ: جو جنگ کرے اس لئے کہ اللہ کا حکم بلند ہو تو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

امرت ان اقاتل الناس حتى يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله ويقيموا الصلوة ويوتوا الزكوة فاذا فعلوا ذالك عصموا مني دماء هم واموالهم الا بحق الاسلام وحسابهم على الله۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لوگ گواہی دیں کہ اللہ کے سواء کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں پس جب یہ کریں گے تو وہ اپنی جان اور مال مجھ سے محفوظ کرلیں گے مگر اسلام کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ کے حوالہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

بعثت بين يدي الساعة بالسيف حتى يعبد الله تعالىٰ وحده لا شريك له وجعل رزقي تحت ظل رمحي وجعل الذل والصغار على من خالف امري۔ (رواه احمد)

ترجمہ: قیامت کے سامنے مجھے تلوار کے ساتھ بھیجا گیا ہے، یہاں تک کہ اللہ کی تنہا عبادت کی جائے اس حال میں کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میرا رزق میرے نیزے کے سائے میں بنایا گیا اور ذلت اور رذالت میرے مخالفین کے مقدر کردی گئی ہے۔

حضرت جبیرؓ کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ہمیں بلایا اور ہم پر نعمان بن مقرن کو امیر بنا کر روانہ کیا۔ جب ہم دشمن کی سرزمین پر پہنچے تو کسریٰ کا گورنر چالیس ہزار فوج کے ساتھ ہمارے مقابلہ میں آیا اور ان کا ترجمان آگے بڑھ کر بولا۔ تم میں کا کوئی آئے اور مجھ سے بات کرے۔ حضرت مغیرہؓ نے کہا۔ کیا معلوم کرنا

چاہتے ہو پوچھو۔اس نے سوال کیا تم کون ہو۔حضرت مغیرہؓ نے جواب دیا۔ہم عرب لوگ ہیں۔ہم انتہائی بدبختی اور مصیبت میں تھے، جانوروں کا چمڑہ اور کھجور کی گٹھلی بھوک میں چوستے تھے، جانوروں کے بال کا لباس پہنتے تھے، پتھر اور درخت کو پوجتے تھے۔

اسی اثناء میں ربِ کائنات نے ہماری طرف ہمارے ہی لوگوں میں سے ایک آدمی کو نبی بنا کر بھیجا، جس کے حسب ونسب کو ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔اللہ کے اس نبی نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم تم سے جنگ کریں یہاں تک کہ تم ایک اللہ کی عبادت کرو یا پھر جزیہ ادا کرو۔اس نبی نے ہمارے رب کا یہ پیغام ہم تک پہنچایا ہے کہ اس راہ میں ہم میں سے جو مارا جائے گا وہ سیدھے جنت میں جائے گا اور جنت کی نعمتیں ایسی ہوں گی جن کی کوئی مثال نہیں اور ہم میں سے جو باقی بچے گا وہ تمہاری گردنوں کا مالک بن جائے گا۔(بخاری)

مشہور واقعہ ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضرت ربعی بن عامرؓ کو رستم کے پاس بھیجا۔حضرت ربعیؓ پہنچے تو رستم تاج پہنے ہوئے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔جلسہ گاہ حریر و دیبا کے غالیچوں سے سجی ہوئی، قیمتی موتی اور یاقوت نمایاں انداز میں جڑے ہوئے تھے اور ہر طرف کمال درجہ کی زیب وزینت کا اہتمام تھا۔

جبکہ حضرت ربعیؓ معمولی کپڑے میں تھے محض ایک تلوار اور ایک ترکش ساتھ میں تھا۔سواری کا گھوڑا ابھی پستہ قد تھا۔گھوڑے سے اترے بغیر، فرش کو روندتے ہوئے دربار میں جا دھمکے، پھر جب گھوڑے سے اترے تو گھوڑے کو ایک ستون سے باندھ کر ہتھیار بند زرہ اور خود کے ساتھ رستم کی جانب بڑھنے لگے۔درباریوں نے کہا ہتھیار اتار دو۔حضرت ربعیؓ نے کہا۔میں خود آیا نہیں ہوں۔تمہاری دعوت پر آیا ہوں۔اگر تمہیں میری حالت منظور نہیں ہے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔رستم نے کہا۔چھوڑو، آنے دو۔

اس کے بعد حضرت ربعیؓ اپنے نیزہ پر ٹیکہ دیتے ہوئے آئے جس سے فرش میں سوراخ پڑ گئے۔وہاں حضرت ربعیؓ سے سوال کیا گیا، تم کس مقصد سے آئے ہو۔انہوں نے جواب دیا۔ہم کو اللہ نے اس لئے بھیجا ہے کہ ہم اللہ کے بندوں کو دوسرے بندوں کی عبادت سے نکال کر اللہ کی عبادت کی طرف لے جائیں۔دنیا کی تنگی سے اس کی وسعت کی طرف پہنچائیں اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل میں داخل کریں۔اس نے اپنا دین دے کر ہمیں اپنی مخلوق کی جانب بھیجا ہے کہ ہم ان کو اس کے دینِ حق کی طرف دعوت دیں۔جو قبول کرے ہم بھی اسے قبول کریں اور پھر واپس چلے جائیں اور جو انکار کرے ہم اس سے جنگ کرلیں یہاں تک کہ اللہ کے وعدہ تک ہم پہنچ جائیں۔

سوال کیا گیا وہ وعدہ کیا ہے، جواب دیا۔ اس کا وعدہ ہے کہ انکار کرنے والوں سے جنگ کرتے ہوئے جو مارا جائے اس کیلئے جنت ہے اور جو باقی بچ جائیں ان کے لئے فتحیابی ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

فرضیت جہاد کی دو غرض ہے اول یہ کہ مسلمانوں کے لئے جن دشمنوں سے خطرہ ہے ان کے بالمقابل ایسے لوگ آجائیں جو ان کو روک دیں۔ دوسری غرض یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے جو لوگ با استطاعت ہیں وہ لڑتے رہیں یہاں تک کہ بت پرست ایمان لائیں یا اہل کتاب جزیہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

امام محمدؒ فرماتے ہیں قتال کی فرضیت سے مقصود دین حق کو باعزت بنانا اور مشرکین کو مقہور کرنا ہے۔

ابن قیمؒ کہتے ہیں جہاد سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کا حکم بلند ہو اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو کر رہ جائے۔ اس کے تقاضے میں کفر اور اہل کفر کا ذلیل ہونا اور چھوٹے بن کر رہنا شامل ہے نیز جزیہ دینا اس میں داخل ہے اس کے برخلاف اگر ان کو عزت پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنا دین اپنی مرضی کے مطابق قائم کریں اور ان کا دبدبہ اور شوکت برقرار رہے تو یہ جہاد کے مقصود سے ٹکرانے والی بات ہے۔

علّامہ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں تمام اہل کفر سے لڑا جائے مگر یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں۔ یا وہ جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ یہ ہے جہاد کا اصلی اور بنیادی مقصود۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مقاصد بھی ہیں۔

① مسلمانوں پر ہونے والی زیادتیوں کو روکنا۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا. (النساء:۷۵)

ترجمہ: اور آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پاکر دبالئے گئے ہیں اور فریاد کررہے ہیں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کردے۔

② فتنہ کو ختم کرنا تا کہ اللہ کے بندے آزادی کے ساتھ اسلام کے محاسن دیکھ اور سمجھ سکیں اور اللہ کی راہ پر چلنے میں ان کے لئے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کیلئے ہو جائے۔

تفسیر قرطبی میں ایک روایت ہے کہ ایک مسلمان عورت سواری پر جا رہی تھی۔ ایک ذمی نے اس سواری کو بدکا دیا۔ جس کی وجہ سے عورت گر گئی اور اس کی بے ستری ہوگئی۔ وہ ذمی حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کیا گیا تو حضرت عمرؓ نے اس کو سولی پر لٹکانے کا حکم دے دیا۔

اسی طرح کا ایک واقعہ دور رسالت میں پیش آیا تھا۔

یہودی قبیلہ بنی قینقاع کے ایک شخص نے مسلمان عورت کا کپڑا کھول دیا تھا۔ یہ منظر وہاں موجود ایک مسلمان برداشت نہیں کر سکا چنانچہ اس نے اس یہودی کو قتل کر دیا لیکن اس پر نبی ﷺ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ نہ تو یہ فرمایا کہ اتنے چھوٹے جرم پر قتل کی سزا کیوں دی اور نہ یہ کہا کہ اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں کیوں لیا بلکہ اس واقعہ کو آپ ﷺ نے خود اتنی اہمیت دی کہ اس کے بعد قبیلہ بنی قینقاع کو مدینہ سے جلاوطن ہونا پڑا۔

اِشاعتِ دین میں جہاد کا اثر

ایک عرصہ سے یہ سوال جواب طلب رہا ہے کہ اسلام دلیل اور اخلاق سے پھیلا یا تلوار سے۔ بڑی عیاری کے ساتھ دشمنان اسلام مستشرقین نے یہ سوال اٹھا کر اہل اسلام کو مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسلام میں کوئی معقولیت نہیں ہے اور نہ اس میں لوگوں کے لئے کوئی اپیلنگ ہے اور اسلام کے نام لیوا اخلاق وانسانیت سے خالی ہوتے ہیں۔ انہوں نے بہت ہی زور وشور سے پروپیگنڈہ شروع کیا کہ اسلام محض تلوار کے زور پر پھیلا۔

یہ عجیب تماشا ہے کہ انہیں میں سے بعضوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اسلام تلوار سے نہیں بلکہ اخلاق اور تبلیغ سے پھیلا ہے۔ یہ دونوں باتیں کہنے والے دو رخ سے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے تھے۔ لیکن ہم نے سمجھا کہ تبلیغ کو ذریعہ بتانے والے حق پسند حق گو اور ہمارے ہم خیال ہیں۔ حالانکہ ایک گروہ اسلام کو خونخوار مذہب بتا کر بدنام کر رہا تھا تو دوسرا گروہ یہ کوشش کر رہا تھا کہ مسلمانوں کے اندر سے روح جہاد کو نکال دیا جائے تاکہ مسلمان وعظ و پند سے آگے نہ بڑھے۔

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

مغرب سے مرعوبیت کی بناء پر اعداء اسلام کی طرف سے اس قسم کی ابلیسی چالوں کو عموماً سمجھا نہیں گیا۔ حالانکہ قرآن کی آیات، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارشادات اور تاریخی شواہد یہ سمجھنے کے لئے کافی موجود تھے کہ اسلام کا پورا نظام سراسر مطابق عقل ہے۔ فطرت انسانی کی پکار کا جواب ہے اور انسان کی روحانی اور مادی دونوں ضرورتوں کی تکمیل کا سامان اس کے اندر موجود ہے۔

اسلام نے روحانیت اور مادیت دونوں پہلوؤں کا جس طرح صحیح توازن کے ساتھ لحاظ کیا ہے۔ اسی طرح

اپنے پیغام کے ارسال اور اشاعت کے لئے افہام و تفہیم، موعظت اور نصیحت اور عملی نمونہ کے ساتھ ساتھ حدود و تعزیرات اور قوت و طاقت کے استعمال کا حکم بھی نہایت ہی عدل و انصاف اور احترام انسانیت کا لحاظ کرتے ہوئے دیا ہے۔ دیکھئے معابد اور مساجد کی حفاظت کیلئے کس طرح ٹکراؤ اور تصادم کو ذریعہ بنانے کی بات قرآن میں کہی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج:۴۰)

ترجمہ: اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں، جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جائیں۔

یعنی یہ اللہ کا بڑا فضل ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دنیا میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ سے دفع کرتا رہتا ہے ورنہ اگر ایک ہی گروہ کو کہیں اقتدار کا پٹہ مل گیا ہوتا تو قلعے اور قصر اور ایوان سیاست اور صنعت و تجارت کے مرکز ہی تباہ نہ کر دیئے جاتے بلکہ عبادت گاہیں تک دست درازیوں سے نہ بچتیں۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ○ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا. (النصر:۱-۲)

اس آیت کے تحت ابن کثیرؒ نے لکھا ہے کہ اہل عرب اس انتظار میں تھے کہ حضرت محمد ﷺ اور اہل مکہ کی کشمکش کا انجام کیا ہوتا ہے چنانچہ مکہ فتح ہوتے ہی پورا عرب جیسے دوڑ پڑا اور پھر دو سال کے اندر سارا عرب اسلام کے زیر نگیں ہو گیا۔ غالباً تین ہجری میں غزوۂ احد کے قریبی زمانہ میں بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے اہل اسلام کی مردم شماری کا حکم فرمایا۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی تو پندرہ سو کی تعداد معلوم ہوئی۔ اس موقع پر صحابہ نے عرض کیا کہ کیا آپ کو اندیشہ ہے، ہم نے وہ زمانہ بھی دیکھا ہے جبکہ نماز بھی ڈرتے ڈرتے ہم میں کا کوئی پڑھتا تھا۔ اب تو ہم ڈیڑھ ہزار ہیں۔

اس کے بعد بڑی تیزی کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہوا۔ غزوۂ تبوک میں اسلامی فوج تیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ تیس ہزار لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ حج ادا کیا اور آپ کے ساتھ شریک حج نہ ہونے والوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

علّامہ ابن حزمؒ کہتے ہیں کہ مکہ میں آپ ﷺ ۱۳ سال دعوت دیتے رہے۔ شق القمر اور واقعۂ معراج جیسے معجزات بھی لوگوں کے سامنے آئے۔ لیکن ایمان لانے والوں کی تعداد ایک سو تک بھی نہیں پہنچی۔ لیکن حکم جہاد کے بعد دس سال کے اندر اسلام غالب آ گیا۔

غزوۂ خیبر کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ کل جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ سے محبت کرتا ہے اور اللہ اسے محبوب رکھتا ہے جس کے ہاتھ پر اللہ فتح نصیب فرمائے گا۔ لوگ اشتیاق میں تھے کہ جھنڈا کس کو دیا جاتا ہے۔ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا علیؓ کہاں ہیں، لوگوں نے بتایا، اے اللہ کے رسول ان کی آنکھیں آشوب میں ہیں۔ آپ نے حضرت علیؓ کو بلوا بھیجا۔ حضرت علیؓ آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی آنکھوں میں اپنا لعاب دہن لگا دیا۔ وہ ایسے ہو گئے جیسے کبھی تکلیف میں تھے ہی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھنڈا ان کے حوالہ فرمایا۔ حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا۔ کیا میں اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ ہمارے جیسے مسلمان نہ ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ سیدھے ان کے علاقہ میں پہنچو۔ ان کو اسلام کی طرف دعوت دو اور اللہ کی جانب سے عائد کردہ حقوق سے باخبر کرو۔ اللہ کی قسم یہ بات کہ اللہ تمہارے ذریعہ کسی ایک آدمی کو راہِ ہدایت پر لائے۔ سرخ اونٹوں سے کہیں بہتر ہے۔

یہ محض وعظ نہ تھا بلکہ قوت آمیز دعوت تھی جس کی تاثیر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر طاقت اور تلوار دعوت الی اللہ میں مؤثر نہ ہوتی تو آپ حضرت علیؓ کو فوج کا جھنڈا تھما کر دعوت کا حکم نہ فرماتے۔

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

• سیکولر جمہوری نظام
• الیکشن
• تحریکِ اسلامی

(۱۹۹۸ء)

مولانا عبد العلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

پیشِ لفظ

زیرِ نظر کتابچہ میں پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب بھٹکل، ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب علی گڑھ اور ریاض احمد صاحب بمبئ کے مقالات ’’زندگئ نو‘‘ کا قرآنی آیات کی روشنی میں تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ انقلاب امامت کا صحیح طریقہ، عقیدۂ توحید کا صحیح تقاضا اور تحریکِ اسلامی کا مرکزی نکتہ واضح کیا گیا ہے، فکری اور عملی انحراف کی نشاندہی کی گئی ہے، جس سے تحریکِ اسلامی کے چہرے پر پڑے ہوئے گرد و غبار صاف ہو جائیں گے اور تحریک اقامتِ دین کے اطراف چھائے ہوئے شکوک و شبہات کے بادل چھٹ جائیں گے اور تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لئے صحیح سمت متعین کرنے میں مدد ملے گی۔

اوصاف احمد فلاحی

(رکن جماعتِ اسلامی ہند، بھیونڈی)

اِنقلابِ امامت کا طریقہ کیا ہو

انقلابِ امامت اور اسلامی انقلاب کا طریقہ کیا ہو؟

یہ سوال اس وقت ایک عالمی سوال ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اس سوال نے اب کافی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ ایک بڑی تعداد میں ایسے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کے لئے موجودہ الیکشنی سیاست میں داخل ہونا ضروری ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسری راہ نہیں ہے اسی نظریہ کی تائید اور ترجمانی کرتے ہوئے جناب پروفیسر عمر حیات خان غوری ''زندگی نو'' اپریل ۹۸ء میں لکھتے ہیں:

> ''تحریکِ اسلامی اقامت دین یا انقلاب امامت کو اپنا نصب العین متعین کر کے سرگرم عمل ہے دنیا میں انقلاب لانے کے چند ہی طریقے ہیں: ① زیر زمین سازشیں ② لاقانونیت ③ مسلح بغاوت ④ جمہوری دستوری طریقے۔ ان چار طریقوں میں سے پہلے تین تو تحریک اپنے آغاز ہی سے مسترد کر چکی ہے۔ چوتھی کو اس لئے نہیں اپنا سکتی کہ اس سے عقیدۂ توحید پر ضرب پڑتی ہے۔ پھر آخر وہ کونسا طریقہ ہوگا جس کے ذریعہ انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا۔''

اپنے عقیدہ کے خلاف عمل نہ کیجئے

غوری صاحب نے گویا انقلاب امامت کو جمہوری اور دستوری طریقہ کے ساتھ لازم وملزوم کی طرح محصور کر دیا ہے ان کے خیال میں اس طریقہ کو چھوڑنے کے بعد دوسرا کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ موصوف اگر یہ کہتے کہ جمہوری طریقہ بھی ایک طریقہ ہے تو بات ذرا آسان ہوتی اور غوری صاحب جیسے لوگوں کو صرف ایک دعویٰ کی دلیل دینی پڑتی۔ مگر اس صورت میں دو باتیں محتاج دلیل بن جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ جمہوری طریقہ بھی کئی طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ہے ہی نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غوری صاحب نے اپنی اس بات پر غور کئے بغیر رواروی میں قلم چلا دیا کیونکہ اس بات کو کہنے کا مطلب سابق

میں انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین کے اختیار کردہ طریقوں کی نفی ہے یا ان کو منسوخ قرار دینے کا دعویٰ ہے۔ ظاہر ہے یہ بہت بڑا اور سنگین دعویٰ ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور سلف صالحین نے جمہوری طریقہ تو نہیں اپنایا تھا۔ دوسرے جو لوگ جمہوری طریقہ اختیار کرنے کے مخالف ہیں ان کا یہ کہنا ہرگز نہیں ہے کہ یہ طریقہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ اس وقت آپ لوگ جمہوری طریقہ جس طرح اپنا رہے ہیں اس سے عقیدۂ توحید پر زد پڑتی ہے ورنہ اگر کوئی ایسا جمہوری طریقہ اختیار کیا جائے جس سے کوئی شرعی حد نہ ٹوٹتی ہو تو اس کے غلط ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بذات خود الیکشن غلط اور حرام نہیں ہے بلکہ اس کو حرام بنانے والی بات یہ ہے کہ ایک آدمی ووٹ دے کر کسی کو کتاب وسنت سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کا حق دیتا ہے اور ایک ممبر پارلیمنٹ کیلئے جائز قرار دیتا ہے کہ کتاب وسنت کی پرواہ کئے بغیر قانون بنائے جبکہ ہمارے عقیدہ میں یہ ہے کہ:

> ''اللہ تعالیٰ کے سواء کسی کو مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو بہ اختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے۔''

(دستور جماعت اسلامی)

قرآن کا صریح حکم

قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (النساء:۶۰)

ترجمہ: کیا تم نے ان کی طرف نہیں دیکھا جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایمان لائے اس چیز پر جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس چیز پر جو آپ سے پہلے نازل کی گئی۔ وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کے پاس مقدمہ لے جائیں۔ حالانکہ انہیں طاغوت کے ساتھ کفر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ پوری طرح انہیں گمراہ کرے۔

اس آیت میں دو باتیں بہت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہیں۔ اول یہ کہ طاغوت کے پاس مقدمہ لے جانا ایمان کے منافی اور سراسر منافقت ہے دوسری بات یہ کہ طاغوت کے ساتھ کفر کرنے کا حکم ہے طاغوت کو تسلیم کرنا، طاغوت کو عزت کا کوئی مقام دینا اہل ایمان کا کام نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ جمہوری نظام اور

اس کی پارلیمنٹ طاغوت نہیں ہے؟ جبکہ وہ خدا اور رسول کے بنائے ہوئے نظام اطاعت کے بالمقابل ایک دوسرا نظام اور قانون وضع کرنے اور چلانے والے ہیں۔ایسی حالت میں ووٹ دینا اور اس کی تشکیل میں شامل ہونا کیا کفر بالطاغوت کے حکم کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے؟ اور کیا نص قطعی سے ثابت شدہ حکم کا عملی انکار نہیں۔آخر اس کی سنگینی کو کیوں محسوس نہیں کیا جاتا ہے۔

دوسرے مقام پر طاغوت سے اجتناب کا حکم موجود ہے ووٹ دینا اور الیکشنی سیاست میں حصہ لینا اس حکم کی کھلی خلاف ورزی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:۳۶)

ترجمہ:اور ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو۔

قرآن ایک طرف اجتناب کا حکم دے رہا ہے اور آپ ہیں کہ طاغوت سے دوستی اور قربت حاصل کرنے سے دس قدم آگے بڑھ کر طاغوت کو قانون سازی کی کرسی پر بٹھانے کی مہم چلاتے ہیں اور تو اور اسی میں ملت اسلامیہ کی نجات اور فلاح مضمر بتا رہے ہیں گویا قرآن کے نزدیک جو مرض ہے اس کو علاج اور جو گناہ ہے اس کو ثواب ثابت کر رہے ہیں۔

انقلاب کا قرآنی طریقہ

انقلاب امامت کے قرآنی اور انبیائی طریقے کیوں نہیں معلوم کئے جاتے اور ان کو اپنانے کی دعوت کیوں نہیں دی جاتی اور اس کے لئے ان آیات پر غور کیوں نہیں کیا جاتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (سورۂ محمد:۷)

ترجمہ:اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جما دے گا۔

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ○ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ○ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ○ (الصافات:۱۱۴،۱۱۵،۱۱۶)

ترجمہ:اور ہم نے موسیٰ اور ہارون پر احسان کیا اور ان دونوں کو اور ان کی قوم کو بڑی مصیبت سے نجات دی اور ان کی ہم نے مدد کی پس وہ غالب ہو گئے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (آل عمران:۱۶۰)

ترجمہ:اگر اللہ تمہاری مدد کرے تو تم پر کوئی غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو کون ہے جو تمہاری مدد

کرے گا اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ کرنا چاہئے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (الصّف:۱۰-۱۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تمہیں بتاؤں ایک تجارت جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچائے وہ یہ کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ جہاد کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ (الصّف:۱۳)

ترجمہ: اور دوسری بات جو تم پسند کرتے ہو اللہ کی طرف سے مدد اور قریب ملنے والی فتح ہے۔

یہ آیات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ نصرت اور غلبہ حاصل کرنے کا طریقہ حق کی مدد کرنے، حق کے واسطے باطل کے مقابل میں جمنے اور ثابت قدم رہنے میں مضمر ہے دنیا اور آخرت دونوں جہاں کی کامیابی راہ خدا میں جان و مال کے ساتھ جہاد کے ذریعہ حاصل ہوگی نہ کہ باطل کے سامنے جھکنے، کمزوری کا مظاہرہ کرنے اور باطل کی ہاں میں ہاں ملانے سے۔ بلکہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اپنی نصرت اور معیت سے محروم کر دیتا ہے۔ جس کے بعد ظاہر ہے دنیا کی کوئی طاقت عزت اور غلبہ نہیں دے سکتی۔

اہل باطل کے ساتھ مودت اور موالات کا رشتہ جوڑنے سے منع کیا گیا ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ... الخ (المجادلہ:۲۲)

ترجمہ: تم کوئی ایسی قوم نہ پاؤ گے جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتی ہو، اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے محبت کرتی ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ (الممتحنہ:۱۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! ایسے لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَآءَ (المائدۃ:۵۱)

ترجمہ: اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ۔

اہل باطل سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی کھلی ممانعت ان آیات کے علاوہ کئی آیات میں آئی ہے۔ دوستی تو

الگ رہی معمولی جھکاؤ اور میلان پر بھی سخت عذاب کی وعید آئی ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (ھود: ۱۱۳)

ترجمہ: اور ان کی طرف مائل نہ ہو جنہوں نے ظلم کیا پس تم کو آگ چھولے گی اور تمہارے لئے اللہ کے بالمقابل کوئی مددگار نہیں ہوگا پھر تمہاری مدد نہیں کی جائے گی۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (بنی اسرائیل: ۷۴، ۷۵)

ترجمہ: اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلے میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

ووٹ دینے کا مطلب

ان قرآنی ہدایات کی روشنی میں انقلاب امامت کے اس طریقہ پر غور فرمایئے جو آپ حضرات تجویز فرما رہے ہیں۔ مودّت، موالات اور جھکاؤ کا کیا سوال، آپ تو اہل باطل کو رہنمائی اور قانون سازی کے منصب پر فائز کرنے کی کوشش میں ہیں!

فرمایئے ووٹ دینے اور سیکولر پارٹیوں کی تائید کے لئے مہم چلانے کا اس کے علاوہ بھی کوئی مطلب ہوسکتا ہے دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ کیا یہ رویہ اللہ کے غضب کا باعث بنے گا یا اس کی رحمت کا۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اتنی کھلی ہوئی گمراہی اور کتاب الٰہی سے انحراف کی راہ کو راہ نجات بتا رہے ہیں۔ آخر گرنے کی بھی تو کوئی حد ہونی چاہئے!

انبیاء علیہم السلام کے طریقہ عمل میں تین اصطلاحات دعوت، ہجرت اور جہاد کا نام عام طور پر ملتا ہے۔ اس موضوع پر اک مفصل کتاب ''دعوتِ دین اور اس کا طریقہ کار'' تحریک اسلامی کے لٹریچر میں عرصہ سے موجود ہے آخر اس پر کیوں غور نہیں کرتے، اس سے گریز اور کترانے کی روش کیوں اختیار کی جاتی ہے اور قرآن کی صاف اور واضح شاہراہ کو چھوڑ کر پگڈنڈیوں کی تلاش میں سرگردانی کی وجہ کیا ہے اس سوال کا جواب مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس طرح دیتے ہیں:

''ہر دعوت حق کو کامیابی کی آخری منزل تک پہنچنے کے لئے بالعموم ③ تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

.... دعوت ...... ہجرت ...... جنگ

''اس زمانے میں لوگ زیادہ تر صرف یورپ، امریکہ، روس اور ترکی وغیرہ ہی کے انقلابات سے واقف ہیں اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ جو مرحلے ان انقلابات میں آئے ہیں وہی ہر انقلاب میں پیش آتے ہیں اور جو طریقے ان انقلابات میں آزمائے جا چکے ہیں ہر انقلاب میں کارگر ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی ہے جس میں لوگ محض اس وجہ سے مبتلا ہیں کہ ان کے سامنے خالص اسلامی طرز کے کسی انقلاب کی تاریخ نہیں ہے۔ ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام یا ان کے طریق پر کام کرنے والوں کی رہنمائی میں جو انقلاب برپا ہوئے ہیں ان کی خصوصیات ان انقلابات کی خصوصیات سے بالکل مختلف ہیں جو مجرد سیاسی طرز کی تحریکات سے برپا ہوا کرتے ہیں اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ہم خالص اسلامی انقلاب کے مختلف مدارج اور اس کے ہر درجہ کی خصوصیات اور تقاضوں پر یہاں بالاجمال گفتگو کریں گے۔''

(دعوتِ دین اور اس کا طریقہ کار، صفحہ: ۱۹۲)

مولانا اصلاحیؒ کی تحریر کا وزن کم کرنے کے لئے یہ نوٹ لگایا گیا ہے لیکن اس امکان کے لئے ابھی نہ تو کوئی عقلی دلیل کسی جانب سے پیش کی جا سکی ہے اور نہ کوئی تاریخی شہادت موجود ہے بالفرض اس امکان کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ شرعی حدود سے بے نیاز ہو کر جمہوری طریقہ اختیار کیا جائے نیز انقلاب امامت کو الیکشنی سیاست کے اندر محصور کرنے کی کیا دلیل ہے خصوصاً اس وقت جو لوگ الیکشنی سیاست میں حصہ لے رہے ہیں وہ دعوت حق دینے کے بجائے دعوت سیکولرزم اور قیام جمہوریت کا علم بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس دوران کسی طرح بھی یہ بول نہیں بولے جا سکتے کہ انسانیت کے سارے دکھوں کا علاج اللہ کے دین اسلام میں ہے۔ اس لئے کہ یہ بات بولتے ہی میدان سیاست میں داخل ہونے کا سرٹیفکیٹ آپ کے ہاتھوں سے چھین لیا جائے گا اور فرقہ پرستی اور بنیاد پرستی کا لیبل لگ جائے گا۔

ایک سوال

پروفیسر صاحب کا یہ کہنا کہ اگر ووٹ کی سیاست میں داخل نہیں ہوا جائے گا تو اسی فیصد لوگ بھی تحریک سے وابستہ ہو جائیں گے تو بھی انقلاب امامت نہیں ہوگا اس موقع پر ہم پروفیسر صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ ووٹ کی سیاست کو صرف اس لئے تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ایک کارگر تدبیر ہے کیا کسی عمل کے کارگر ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح ہے اور جس عمل سے مقصد حاصل ہونے والا نہ ہو وہ غلط ہے ہمیں اُمید ہے کہ جناب یہ تسلیم کریں گے کہ صحیح اور غلط کا یہ معیار نہیں ہے بلکہ صحیح اور غلط کا معیار کتاب وسنت کے نصوص ہیں۔ کسی عمل کے کارگر اور مفید مطلب ہونے کے تعلق سے سوچنے سے پہلے اس کو کتاب وسنت کے معیار پر جانچنے اور پرکھنے کی

ضرورت ہے یہی وہ پوائنٹ ہے جس کو آج پروفیسرس اور ڈاکٹر حضرات نظر انداز کر دے رہے ہیں اور اُلٹے رخ پر جا رہے ہیں جبکہ اس پوائنٹ کو اہمیت دینے والے مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا سید احمد عروج قادریؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ نے موجودہ الیکشنی سیاست کے تحت ووٹ دینے کو عقیدۂ توحید کے منافی قرار دیا۔

ووٹ کارگر نسخہ نہیں ہے

جہاں تک اس کے کارگر ہونے کا سوال ہے اس پر غور کر لیجئے۔

موجودہ الیکشنی سیاست کے ذریعہ کب تک اور کیوں کر انقلاب امامت ممکن ہو سکے گا؟ اس سوال کو سامنے رکھئے اور بتایئے کہ ہندوستان کے ساٹھ کروڑ ووٹروں میں سے ہم نے کتنے لوگوں کا ذہن تیار کیا ہے جو اسلامی اصولوں کے لئے ووٹ دیں گے پورے ملک میں ۵ ر ہزار ارکان جماعت ہیں ہر رکن کے ساتھ بیس ہم خیال فرض کر لئے جائیں تو ایک لاکھ ووٹر ہوئے اس طرح حساب لگایا جائے تو ہر حلقہ پارلیمنٹ میں ہم نے زیادہ سے زیادہ دوسو ووٹر بنائے ہیں۔ یہ پچاس سالہ کارکردگی کا نتیجہ ہے اس رخ سے سوچئے تو ووٹ کے استعمال کے ذریعہ کم از کم ایک ہزار سال درکار رہوں گے بشرطیکہ ہماری یہ موجودہ رفتار کار برابر قائم رہے۔

پھر یہ امکان یوں بھی مارکھا رہا ہے کہ اس وقت آپ اسلام کی ضرورت کا احساس بھی نہیں دلا رہے ہیں بلکہ آپ کی ساری دوڑ دھوپ سیکولرزم اور جمہوریت کے تحفظ اور بقاء کے لئے ہو رہی ہے اور عوام الناس سے کہہ رہے ہیں سیکولرزم کی بقاء پر ہندوستان کی سلامتی منحصر ہے اس طرح آپ ہندوستان کے لئے اسلام کے بجائے سیکولرزم کو ناگزیر بتا رہے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی کوششوں کے ذریعہ عام ذہن یہ بنے گا کہ اجتماعی اور ملکی معاملات میں کسی مذہب کو دخل نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ ہندوستان ٹوٹ جائے گا اس مقام پر اپنے دل سے پوچھئے کہ آپ اس عمل سے اسلام کے لئے راستہ بند کر رہے ہیں یا اسلام کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں؟ کل کے دن آپ کس منہ سے کہہ سکیں گے کہ اسلام کے ذریعہ ہندوستان نجات پا سکتا ہے اور اس ملک میں ہم اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں۔

ان پہلوؤں پر جو بھی ٹھنڈے دل سے غور کرے گا وہ اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ الیکشنی سیاست انقلاب امامت کے لئے قطعاً مفید مطلب نہیں ہے بلکہ اسلام کے لئے ہندوستان کا دروازہ بند کرنے کا سبب ہے۔

امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان وغیرہ ممالک میں الیکشنی سیاست کے ذریعہ جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ صرف ہاتھوں کی تبدیلی ہے نظریاتی حکومت کی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اسی کے ساتھ ترکی، الجزائر وغیرہ میں اب

تک الیکشنی سیاست کے جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ اس سسٹم کی ناکامی کو مزید یقینی بنا رہے ہیں ان ملکوں میں اکثریت مسلمانوں کی ہے پھر بھی انقلاب امامت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ نہایت درجہ ناکام ثابت ہو چکا ہے ایسی حالت میں غیر مسلم اکثریت والے ملکوں میں کیا ہوگا سمجھا جاسکتا ہے۔

تحریک اسلامی کے علاوہ پوری مسلمان قوم شروع ہی سے الیکشنی سیاست میں حصہ لے رہی ہے پچاس سال کی مدت میں کتنے ایم پی مسلمان ہوئے ہیں اور وہ کس قسم کے مسلمان ہیں اور وہ کس طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ غیر مسلم ووٹر کسی مسلمان امیدوار کو شاذ و نادر ہی ووٹ دیتے ہیں البتہ سیکولر پارٹیوں کے مسلم کینڈیڈیٹ کو کبھی کبھار خاص پس منظر میں ہی غیر مسلم ووٹ دیتے ہیں لہٰذا مجموعی اعتبار سے عملاً تحریک اسلامی کے معاون ووٹر مسلمانوں میں سے ہی ملنے والے ہیں۔ اب دیکھئے مسلمانوں میں سے کتنے لوگوں کو تحریک نے اپنی طرف کھینچا ہے وہ اعداد و شمار کی روشنی میں بالکل روشن ہے۔

یہ صورتحال ہے اس میں کس بنیاد پر انقلاب امامت کے لئے الیکشنی سیاست کو اختیار کرنے پر زور دے رہے ہیں۔

الیکشن کے نقصانات

اب تک ہم نے الیکشنی سیاست کے فوائد کے پہلو سے گفتگو کی ہے ذرا نقصانات کو بھی ذہن میں رکھئے۔ جن کا اندیشہ ہے۔

① ابھی محض ووٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن اس کی وجہ سے کس قدر انتشار فکر کی کیفیت پیدا ہوئی ہے آئندہ جب امیدوار کھڑے کرنے کا سوال پیدا ہوگا تو وہ سارے نزاعات اور جھگڑے پیدا ہوں گے جو سیاسی پارٹیوں میں پیدا ہو رہے ہیں۔

② ابھی الیکشن سے دور ہیں لیکن اس کے لئے مہم کے دوران اللہ اور رسول کا نام لینے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اسلامی نظام اور اسلامی تعلیمات کا ذکر بالکل مفقود ہے اس کے بجائے جمہوریت اور سیکولرزم کے فضائل خوب خوب بیان ہوتے ہیں۔

③ اللہ اور رسول کی مرضی اور آخرت کی فوز و فلاح کے بجائے اپنی ساری اپیلوں کی بنیاد محض ملک کی سلامتی اور یکجہتی کو بنایا جاتا ہے بے دین لیڈروں کی تقریروں اور اپیلوں میں اور ہماری اپیلوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا کہ لوگ ہمارے امتیاز کو سمجھ سکیں۔ اس طرح تحریک کی دینی اور اخلاقی ساری امیج خاک میں مل جانے والی ہے اور ذہن و فکر میں اتنی تبدیلی آچکی ہے کہ اندر اور باہر کے لوگ کھلا ہوا فرق محسوس کر رہے ہیں ابھی تو ابتدائے عشق ہے آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:

''ہمارا ووٹ کا حق استعمال نہ کرنا اسلام دشمن فسطائی قوتوں کو تقویت دینا اور کرسی اقتدار تک پہنچانے کے لئے ان کی راہ ہموار کرنا ہے۔''

اسلام دوستی کا معیار

جناب نے ہندوستانی پارٹیوں کو دو خانوں ''اسلام دشمن اور اسلام دوست'' میں تقسیم کیا ہے۔ آخر اس کی بنیاد کیا ہے۔ اسلام نے دوستی اور دشمنی کا کیا معیار بتایا ہے جس کو دشمن کہہ رہے ہیں وہ تو ظاہر ہے لیکن جس کو دوست بتا رہے ہیں وہ کیسے دوست ہیں۔ کس اصول کے تحت انہیں دوست کہا جا رہا ہے کیا انہیں دوستوں کے زیر اقتدار ہزاروں فساد نہیں ہوئے ہیں، کیا انہیں دوستوں نے مسلمانوں کی عزت اور آبرو پر سینکڑوں بار ڈاکہ نہیں ڈالا ہے، مسلمانوں کی زبان کو کس نے ختم کیا۔ مسلمانوں کو کاروبار میں، تعلیم میں اور ملازمتوں میں ہمیشہ پیچھے ڈھکیلنے کی کوشش کس نے کی ہے؟؟؟ تحریک اسلامی پر دوبار انہیں نے پابندی لگائی ہے۔ مسلمانوں کے ووٹوں کو بے اثر بنانے کے لئے اسمبلی اور پارلیمنٹ کی خاص انداز میں حد بندی انہوں نے کی ہے مسلمان جہاں جہاں موثر ہو سکتے تھے وہاں ان کی آبادی کئی حصوں میں انہیں نے بانٹا ہے بڑی مشکل سے ۵۴۲ پارلیمنٹ حلقوں میں سے ۲۵۔۳۰ حلقے ایسے ہیں جہاں کوئی مسلمان کامیاب ہو سکتا ہے۔

مگر کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کی جا سکتی جہاں کوئی مسلمان غیر مسلم ووٹ سے محض جیت سکا ہو، لہٰذا جن کو آپ دوست کہتے ہیں ان کو دوست سمجھنا آپ کی بنیادی غلطی ہے اور اس غلطی کے نتائج برابر سامنے آتے جا رہے ہیں لیکن آنکھ نہیں کھلتی مقام حیرت ہے!

ووٹ دینا باعث گناہ

بالفرض وہ دوست ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دوستوں کی حمایت میں کس حد تک جانا ہمارے لئے درست ہو سکتا ہے کیا ان کی حمایت میں ان کے نظریات اور عقائد کی تائید اور تصویب بھی کرنا ہمارے لئے صحیح ہوگا مثلاً اس وقت ہمارے ملک میں کونسا سسٹم اور نظام موزوں ترین ہے؟ کیا اس سوال کے جواب میں ایک داعیٔ حق ایک لمحہ کے لئے بھی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نظام اور نظریئے کا نام لے سکتا ہے اور اگر لیتا ہے اور غیر اسلام کے لئے مہم چلاتا ہے تو آپ کے خیال میں اگر صحیح ہے تو ارشاد فرمائیے اس کی دلیل کیا ہے؟ قرآن نے اعلان کر دیا ہے کہ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ یعنی حق کے علاوہ جو کچھ ہے وہ ضلالت اور گمراہی ہے لہٰذا دعوتِ اسلام کے علاوہ جس دعوت کی بھی تائید اور نصرت میں آپ مہم چلائیں گے وہ ضلالت کے سواء کچھ نہ ہوگی۔

اب سوچئے آپ کی مہم برائے بقاء جمہوریت اور آپ کا فورم برائے جمہوریت اور کانگریسیوں اور کمیونسٹوں کی تائید کیا غیر اسلام اور غیر حق کے لئے جہاد میں شامل نہیں ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ ہمارے کسی صحیح اقدام سے باطل کے کسی گروپ کو کسی درجہ میں تقویت ملتی ہے۔ لیکن اس کے لئے کیا جواز ہے کہ بالقصد کسی باطل کی تقویت اور قیام و بقاء کے لئے جدوجہد کی جائے اور بالقصد وارادہ کسی غلط مقصد کے لئے تگ ودو کر کے خدا کی باز پرس سے ہم بچ سکیں گے؟

آپ بتائیے جس گھڑی دین جمہوریت کے قیام و بقاء کے لئے کوشاں ہوں گے اس وقت اقامت دین اور دعوت حق کا تصور کہاں ہوگا۔ ووٹ نہ دینا اسلام دشمن طاقتوں کی مدد ہو سکتی ہے جس کے لئے ہم خدا کے پاس معذور ہو سکتے ہیں لیکن ووٹ دے کر کسی باطل کی تقویت کا سبب بہم پہنچانا ایک ایسا جرم ہوگا جس سے بچنے کے لئے ہم کوئی عذر بھی نہیں پیش کر سکتے۔ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والے ارکان پارلیمنٹ حدود اللہ کو توڑیں گے اور اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے بالمقابل قانون بنائیں گے۔ سودی نظام اور جوا اور شراب کا لائسنس دیں گے تو کیا آپ اس گناہ میں شامل نہ ہوں گے؟ بعض وقت ایسا بھی ہوا ہے کہ جس فسطائیت سے بچنے کے لئے کچھ لوگوں کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا گیا وہی لوگ فسطائیت کے قیام کا سبب بن گئے۔ ۱۹۹۸ء کے پارلیمانی الیکشن میں آندھرا پردیش میں کیا ہوا۔ تلگو دیشم کو ووٹ اس لئے آپ نے دیا کہ بی جے پی کا توڑ کیا جا سکے لیکن وہی تلگو دیشم بی جے پی حکومت کے قیام کا سب سے بڑا ذریعہ بنی۔ اس طرح تلگو دیشم کو ووٹ دینے والے قیام فسطائیت کے گناہ میں شریک ہو گئے۔

صلح حدیبیہ سے غلط استدلال

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> ”رسول اکرم ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر مشرکین مکہ سے جو صلح کی تھی اس کا مسلمانوں کو سب سے بڑا فائدہ تو یہی ہوا کہ انہیں جنگ سے نجات مل گئی تھی۔ پُرامن ماحول میسر آ گیا تھا اور اس مدت کو انہوں نے دعوت وتبلیغ کے لئے استعمال کر کے ایک بڑے علاقے کو اسلام کی آغوش میں لانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ موجودہ ہندوستان میں ہمیں یہ سہولتیں میسر ہیں ان کی حفاظت کرنے کے بجائے انہیں گنوا دینا نہ دین کی خدمت ہوگی نہ تحریک کی اور نہ ملّتِ اسلامیہ کی۔“

انگریزی دور اقتدار میں پھر اس کے بعد پچاس سالہ جمہوری دور میں دعوت وتبلیغ کا موقع رہا ہے کتنے علاقوں کو ہم آپ اسلام کی آغوش میں لانے میں کامیاب ہو سکے ہیں؟ اسلام کا دائرہ وسیع ہوا ہے یا اسلام کے آثار

کے مٹنے میں اضافہ ہوا ہے؟ جس دور جمہوری کے بقاء کے آپ متمنی ہیں اگر وہ پچاس سال مزید رہ گیا تو اسلام اور مسلمانوں کی کیا حالت ہوگی اس کا اندازہ کر کے ملت کے دردمند حضرات خون کے آنسو رو رہے ہیں اور انہیں مسلمانوں کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے اور آپ لوگ ہیں جو اسی کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے ہیں۔

صلح حدیبیہ کے سلسلہ میں یہ نکتہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ صلح کی درخواست رسالت مآب ﷺ نے نہیں کی تھی بلکہ مشرکین کی جانب سے صلح کی خواہش کا بار بار اظہار کیا گیا اور پھر صلح ہوئی۔ یہاں یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ صلح کا خواہش مند ہمیشہ میدان مقابلہ سے فرار کی راہ اختیار کرنے والا کرتا ہے اور اس خواہش کا اظہار پسپائی کی علامت ہوتی ہے صلح حدیبیہ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صلح اگرچہ دس سال کے لئے کی گئی تھی لیکن دو سال میں ختم ہوگئی۔

آنحضور ﷺ نے نہیں بلکہ مشرکین نے یہ کوشش کی کہ معاہدہ کو کسی طرح آگے کے لئے قائم رکھا جائے، دعوت وتبلیغ کے اثرات کا انکار نہیں مگر اصل چیز جس کی وجہ سے دو سال کی قلیل مدت میں اسلام کی قوت میں اضافہ ہوگیا وہ ہے صلح کے نام سے مشرکین مکہ کی شکست کا کھل کر دنیا کے سامنے آجانا، سارا عرب جان گیا کہ قریش مکہ کا دم خم نکل چکا ہے اور عرب کی غالب اور قاہر قوت کا نام اب اسلام ہے پھر کیا تھا، ''يَدۡخُلُونَ فِي دِينِ ٱللَّهِ أَفۡوَاجًا'' کا منظر دیکھ کر ساری دنیا حیرت زدہ رہ گئی۔

یہ کہنا کہ امن وامان کی فضاء ہوگئی جس میں دعوت وتبلیغ سے کام لیا گیا غلط ہے دعوت وتبلیغ کا کام تو ہر حالت میں جاری رہا تھا، لیکن اس کی اثر پذیری میں سیلاب اور طوفان جیسی تیزی اس وقت آئی جبکہ مشرکین عرب کی پسپائی کھل کر سامنے آگئی۔ اور یہ معلوم ہوگیا کہ اسلام کے سیل رواں کے سامنے کوئی بندھ نہیں باندھا جا سکتا۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جو میدان میں ہارتا ہے وہ زندگی کے ہر میدان میں ہار جاتا ہے اور جو میدان میں اپنا لوہا منوا لیتا ہے وہ ہر شعبۂ زندگی میں پیش قدمی کرتا ہوا نظر آتا ہے آج ہندوستانی مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور اولوالعزمی کے فقدان کے باعث تعلیمی اور معاشی ترقی کے واسطے دانشوران قوم کی ساری تلقینات اور کوششیں بے اثر ثابت ہورہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملت کو پہلے کسی طرح اعلیٰ نصب العین کے ذریعہ حوصلہ مند بنایا جائے اور پھر اسے نصیحت کی جائے بے حوصلہ نوجوانوں میں کسی بھی کام کے لئے کہاں سے حوصلہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

سہولتوں کا نقصان دہ پہلو

موجودہ ہندوستان میں جن سہولتوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان کی حیثیت درحقیقت نامراد بھکاریوں کو دیئے ہوئے چند ٹکڑوں کی ہے جو تن کو باقی رکھنے کا ذریعہ تو یقیناً ہیں لیکن رفتہ رفتہ روح کا گلا گھونٹ دینے والے ہیں۔

چنانچہ اب لوگ اس بات کی درخواست کر رہے ہیں کہ حضور والا ہمیں پسماندہ طبقہ میں شامل کیا جائے۔ یہ ذہنی پستی اور زوال اور بے حوصلگی کی کھلی علامت ہے اس کے بعد کیا رہ جائے گا اور کس بنیاد پر ملت کی تعمیر کی جائے گی۔ ملت کے بڑے لوگ بس اسی کو غنیمت شمار کر رہے ہیں کہ جو چند ٹکڑے اکثریت کی جانب سے مل رہے ہیں ان کی سپلائی باقی رہے ورنہ ان سے بھی محروم کر دیئے جائیں گے تو زندہ کیسے باقی رہیں گے؟ اپنی قوت بازو سے کچھ حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں ہے ان ٹکڑوں کی حفاظت کی صورت ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ سیکولر قوتوں کی پناہ میں اپنے آپ کو دے دیا جائے اپنے قدم پر کھڑے ہونا، اپنے بازو میں طاقت پیدا کرنا، اور اپنی الگ کوئی مستقل حیثیت بنانا اب خواب وخیال میں بھی نہیں آتا۔

انبیاء علیہم السلام کا اسوہ

پروفیسر صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ کسی مملکت میں کسی شہری کو سب سے بڑی سزاء جو دی جاسکتی ہے وہ ہے اسے شہری حقوق سے محروم کر دینا جس کے نتیجہ میں دوسرے لوازمات کے ساتھ اسے ووٹ کے حق سے بھی محروم کر دیا جانا ہے اب اگر ہم خود اس حق سے دست بردار ہو رہے ہیں تو یہ حکومت کو موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ دوسرے لوازمات بھی ہم پر نافذ کر دے اور یہ نفاذ صرف تحریکی ارکان پر ہی نہیں ہوگا پوری امت پر ہوگا اور ہمیں اس مظلوم امت کو مزید آزمائشوں میں ڈالنے سے گریز کرنا چاہئے۔''

ملّتِ اسلامیہ کے اصل پیشوا انبیاء علیہم السلام کی دعوتی سرگرمیوں پر نظر ڈالئے۔ یہ حضرات اپنے ملک کے شہری حقوق کے کبھی طالب اور خواستگار کی حیثیت سے سامنے نہیں آئے۔ وہ دینے والے کی حیثیت میں اپنے کو پیش کرتے ہیں وہ کسی کی بالا دستی کو ایک لمحہ کے لئے تسلیم نہیں کرتے کہ اس سے مانگیں اور اس سے توقع رکھیں۔ وہ مکمل طریقہ پر بے نیاز بن کر سامنے آتے ہیں اور دعوت دیتے ہیں۔ وہ مانگیں گے کس سے، جن سے حقوق کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے ان کی فرعونیت اور نمرودیت کو وہ چیلنج کرتے ہیں اور اللہ کے نمائندہ کی صورت میں علی الاعلان پکارتے ہیں۔ آؤ میری اطاعت کرو۔ میرے تابع بن جاؤ ورنہ تباہ وبرباد ہو جاؤ گے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے سامنے اپنے ملکی اور شہری حقوق کا کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو شہری حقوق کا مطالبہ کرتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ اللہ کے یہ بندے اپنا جینا مرنا اللہ کے لئے بنا چکے تھے۔ حالات زمانہ کی کوئی پرواہ کئے بغیر دعوت حق کا علم ہاتھوں میں تھامے صرف اللہ کے سہارے، اسی پر توکل کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لئے رواں دواں نظر آتے ہیں۔ ان کے اندر یہ یقین

جا گزیں تھا کہ جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اسے رزق فراہم کرے گا۔ ان کی ڈیوٹی اپنا فرض ادا کرنا ہے بقیہ سب اللہ کے ذمے ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے دعوتی اسوہ کی روشنی میں یہ حقیقت صاف دیکھی جا سکتی ہے کہ حقوق طلبی والی ذہنیت کے ساتھ کارِ دعوت نہ کبھی انجام دیا گیا ہے اور نہ دیا جا سکتا ہے کیونکہ حقوق طلب کرنے والا گروہ بے شمار لوگوں کو متاع غرور کے واسطے اپنا فریق بنالے گا۔ گویا جس چیز کی طالب ساری دنیا ہے اسی چیز کا طالب وہ بھی ہے دنیا اور آسائش دنیا کا حصول جس طرح سب کی منزل ہے اسی طرح اس کی منزل بھی۔ یہ زندگی اور وسائل زندگی ہیں۔ لہٰذا داعی اور مدعو میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ لہٰذا جو گروہ انبیائی طریقہ پر کارِ دعوت انجام دینا چاہتا ہے اسے اپنی ذہنیت بدلنی ہوگی اور شہری حقوق کے حصول کو پیش نظر رکھ کر نہ اسے سوچنا چاہئے اور نہ اپنا لائحہ عمل بنانا چاہئے۔

شہری حقوق اور دوسروں کے دیئے ہوئے حق رائے دہی کو قیمتی انعام سمجھ کر اس کی حفاظت کے چکر میں سرگرداں ہوں گے تو اس چکر سے کبھی نکل نہ سکیں گے۔ اس سے انکار نہیں کہ حق رائے دہی ایک قابل قدر اور قیمتی شئ ہے اسے استعمال ہونا چاہئے لیکن کہاں اور کس لئے استعمال ہونا چاہئے؟! پروفیسر عمر حیات خاں غوری صاحب جیسے دانشوروں سے ہم صرف یہ گزارش کرتے ہیں کہ اس ہیرا کو مٹی اور دھول خریدنے کے لئے استعمال نہ کیجئے۔ بلکہ گھی اور شہد اس کے عوض حاصل کیجئے۔

آپ خود غور فرمایئے کیا آپ ایک کمیونسٹ اور کانگریسی کو ووٹ دے کر کمیونزم اور کانگریسیت کے تحفظ اور بقاء کا سامان نہیں کر رہے ہیں یعنی زیادہ سے زیادہ آپ جو کارنامہ انجام دے رہے ہیں وہ ایک فاسد نظام کی جگہ دوسرے فاسد نظام کے اقامت کا کام ہے ایک بت کو توڑ کر دوسرا بت کھڑا کر رہے ہیں۔ یہ چکر برابر چلتا رہے گا اور ایک طرف آپ کے گناہ میں اضافہ ہوتا رہے گا اور دوسری طرف جو قوت اقامت دین کے لئے صرف ہونی تھی وہ ضائع ہوتی رہے گی اور وہ موقع کبھی نہیں آئے گا کہ آپ کا ووٹ اقامت دین کا ذریعہ بن سکے۔

آپ دس برس یہ نعرہ لگاتے رہیں گے کہ سیکولرزم اور لادینی جمہوریت ہندوستان کے لئے موزوں ترین سسٹم ہے تو گیارہویں سال کس طرح کہیں گے کہ دین اسلام موزوں ترین نظام ہے۔ جب ایک عرصہ تک پکار پکار کر لوگوں سے کہتے رہیں گے کہ مذہب کو سیاست میں داخل کرنا مہاپاپ ہے جو بی جے پی والے کر رہے ہیں تو کس منہ سے یہ کہنے کی ہمت کریں گے کہ دین کے بغیر سیاست چنگیزی ہے اور اسلام جس طرح مسجد میں ہے اسی طرح پارلیمنٹ اور اسمبلی میں رہے گا۔ الغرض ہم کہتے ہیں حق رائے دہی اقامت باطل کے لئے نہ کیجئے حق کے لئے کیجئے اگر اس کا موقع نہیں ہے تو انتظار کیجئے۔

اتباع وحی کا دائرہ وسیع ہے

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے جس کا ایک دستور ہے اس دستور کے مطابق حکومت تشکیل پاتی ہے اسی دستور میں دیئے گئے شہری حقوق سے فائدہ اٹھا کر ملک میں لاتعداد سیاسی، اقتصادی، تہذیبی اور تعلیمی، لسانی اور مذہبی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں ان میں سے ہر تنظیم اپنا لائحہ عمل و دستور رکھتی ہے ان کی اپنی منتخبہ مجلس انتظامیہ ہوتی ہے اور ان کے اپنے اپنے صدور، ان کے اپنے دستور اور ملکی دستور کے پس منظر میں تنظیم کو چلاتا ہے۔ مجلس انتظامیہ پیش آمدہ معاملات میں فیصلے کرتی اور قانون و ضابطہ بناتی ہے صدر اور مجلس انتظامیہ کے فیصلے تنظیم کے سارے ارکان پر نافذ کئے جاتے ہیں اور ہر شخص پر ان کی پابندی لازمی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا ان تنظیموں کے سربراہوں یا مجلس انتظامیہ کے لئے اقتدار اعلیٰ تسلیم کیا جاسکتا ہے؟''

قرآن حکم دیتا ہے

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (الاعراف:۳)

ترجمہ: پیروی کرو اس کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور پیروی نہ کرو اللہ کے علاوہ دوسرے اولیاء کی۔ تم کم ہی یاددہانی قبول کرتے ہو۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ (المائدہ:۴۸)

ترجمہ: پس آپ ان کے درمیان فیصلہ کیجئے اس کے ساتھ جو اللہ نے اتارا ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجئے حق سے ہٹ کر۔

ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت اور نظام کی اتباع اور پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بتایا گیا کہ اللہ کی شریعت کے علاوہ لوگوں کے اھواء اور خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ غور کیجئے ایک طرف اللہ کا دین اسلام انسانوں کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت میں آج محفوظ ہے اس کے ہوتے ہوئے دوسرے انسانوں کے وضع کردہ دستور اور قانون کو ہم خود مانیں اور اس پر عمل پیرا ہوں اور اس کی طرف دعوت دیں تو ہمارے عمل کی سنگینی کا کوئی اندازہ ہوسکتا ہے؟ اس طرح کی صاف صاف ہدایات کے بعد کسی بھی ملک کے دستور

کا اپنے آپ کو تابع بنا کر رکھنا کیا معنی رکھتا ہے موجودہ ملکی دستور کے تحت مختلف لوگ مختلف تنظیمیں بناتے ہیں ان تنظیموں کے صدر، سکریٹری وغیرہ کے احکام کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ اس موقع پر یہ بحث بے مطلب کی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی کیا تعریف ہے اور ان مختلف شکلوں میں کوئی اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے یا نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اقتدار اعلیٰ ہو کہ اقتدار ادنیٰ کسی پیمانہ کا اقتدار ہو اس کو مستقل بالذات امر و نہی کا حق دینا یا اس کی مطلق اطاعت کرنا شرک کی تعریف میں آئے گا۔ اور دین الٰہی چھوڑ کر لوگوں کی اھواء اور خواہشات کی پیروی بلا تأمل اس کو کہا جاسکتا ہے۔

مزید وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل آیت کو بھی سامنے رکھئے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰـھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ. (التوبۃ:۳۱)

ترجمہ: انہوں نے اپنے علماء اور فقہاء کو رب بنالیا، اللہ کے علاوہ اور مسیح بن مریم کو حالانکہ انہیں صرف ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ پاک ہے ان کے شرک سے۔

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت مطلق ہے اس کے ساتھ کوئی شرط اور قید نہیں لگی ہے لیکن ان کے بعد ہر ایک کی اطاعت کے ساتھ شرط اور قید لگی ہوئی ہے۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے لیکن اللہ اور رسول کی اطاعت کے تحت ہوگی، آزاد نہیں۔ حکمراں اور عام مسلمان کے درمیان جھگڑا ہوسکتا ہے جس کا فیصلہ اللہ اور رسول کے حکم کی بنیاد پر ہوگا۔ کسی شہنشاہ کی اطاعت کا مسئلہ ہو یا کسی جمہوریت کے صدر کا یا کسی تنظیم کے صدر اور سکریٹری کی اطاعت کا مسئلہ ہو سب برابر ہیں جو بھی اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد ہوگی وہ حرام ہوگی جس اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت کی سند حاصل نہ ہو وہ خُطُوَاتِ الشَّیْطٰنِ کی اتباع میں شمار ہوگا۔

دین کی تابعداری ہر حالت میں

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''کیا اقامت دین کی منزل کے آنے سے پہلے ملک میں کوئی اصول، کوئی قانون، کوئی دستور اور کوئی حکومت نہیں قائم ہونی چاہئے اور اگر ہونی چاہئے تو اس کی شکل کیا ہو؟''

نہیں معلوم اس سوال سے پروفیسر صاحب کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ جناب کی یہ منشاء تو ہرگز نہیں ہوگی کہ اقامت دین کی منزل آنے سے پہلے کفر و شرک کی حکومت قائم ہونا اور مسلمان کا طاغوتی نظام کا بہی خواہ اور مؤید ہونا حق بجانب ہے۔ اگر یہ کہنا چاہتے ہیں تو کوئی دلیل شرعی پیش کرنی چاہئے لیکن ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر

صاحب یہ جملے بلا سوچے سمجھے لکھ گئے ہیں۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی ہر حالت میں دین کی تابع ہوگی۔ چاہے اقامت دین کی منزل کتنی ہی قریب ہو یا کتنی ہی دور ہو۔ مسلمان اپنی استطاعت کی حد تک ہمیشہ اللہ کا بندہ بن کر رہے گا اور کسی حالت میں شیطان کی نہ عبادت کرے گا نہ اطاعت۔

مختصر یہ کہ اقامت دین کی منزل آنے سے پہلے بھی کسی طرح یہ روا نہیں ہوسکتا کہ اپنی زندگی کے معاملات شیطان اور اولیاء شیطان کے حوالے کر دے۔ اس کی ذمہ داری حد استطاعت تک ہے۔ استطاعت کے باہر کا جہاں تک معاملہ ہے اس کی خواہش تو یہی ہوگی کہ جو کچھ ہو دین کے مطابق ہو۔ سوچئے ایک مسلمان بہ سلامتی ہوش وحواس یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ اقامت دین کی منزل آنے سے پہلے پہلے کفر وشرک کا بول بالا ہونا چاہئے اور اللہ کی اطاعت کا نظام قائم ہونے سے پہلے شیطانی نظام اور حکومت ہونی چاہئے لیکن اگر شیطانی نظام قائم ہے تو حتی الوسع اس سے اجتناب کرے گا اور بادل نخواستہ اسے گوارا کرے گا اور اسی حالت میں اپنی منزل تک رواں دواں رہنے کی کوشش کرے گا۔ اگر یہ بھی ممکن نہ رہے گا تو کم از کم اپنی منزل اپنے دل کے سامنے رکھے گا ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ اقامت دین کی منزل آنے سے پہلے دین فرعون، دین نمرود یا دین جمہور کی اقامت کے لئے مہم چلانے لگے اور خدا بیزار لوگوں کو قانون سازی کا اختیار دینے لگے اور اولیاء شیاطین کی تابع داری قبول کر کے محض جینے کے لئے مراعات اور سہولتوں کا طالب بن جائے اور جس کی طرف سے چند ٹکڑے مل جانے کی توقع ہو اس کی بولی بولنے لگے؟؟؟

عقیدہ کی قیمت پر سیاسی اثر کا استعمال

غوری صاحب لکھتے ہیں:

> ''غیر مسلم اکثریتی جمہوری ملک میں جس میں مسلمانوں کو بھی مساوی حقوق دیئے گئے ہوں۔ مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہئے اور کیا اس میں ظلم وستم سے بچنے کے لئے اور اسے مزید تخریب کاری سے روکنے کے لئے مسلمانوں کو اپنا سیاسی اثر استعمال کرنا حرام ہے؟''

مسلمانوں کو اپنا سیاسی اثر ضرور استعمال کرنا چاہئے لیکن اسلامی تعلیمات کے حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ واضح رہے کہ ظلم وستم سے بچنے اور تخریب کاری سے روکنا یقینا کار نیک ہے لیکن اس کے لئے کسی غلط نظریہ اور فکر و عقیدہ کی تائید اور ترویج کی گنجائش نہیں ہے۔ مثلاً ظلم اور ناانصافی کے خلاف کوئی فورم بنایا جانا درست ہے مگر فورم برائے جمہوریت اور سیکولرزم بنایا جانا اسلام کی راہ مارنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سوشلزم اور کمیونزم کی تائید اور حمایت کی جائے اس کی گنجائش ہرگز نہیں نکل سکتی۔ کیونکہ یہ نظریات انسانی زندگی کے مختلف شعبوں

کے لئے اپنے مخصوص قواعد وضوابط رکھتے ہیں جو روح اسلام کے منافی اور ضد ہیں۔ نیز یہ احتیاط بھی ملحوظ رکھنی ہوگی کہ اپنی گردن میں کسی ایسی اطاعت کا قلادہ ڈالنا جائز نہ ہوگا جو خدا اور رسول کی مرضی کا لحاظ نہ کرنے والی ہو کیا ان باتوں کا آپ لحاظ کر رہے ہیں؟ اور اگر نہیں کر رہے ہیں تو کیوں؟

حالات نہیں حکم الٰہی کارفرما ہے

غوری صاحب لکھتے ہیں:

> ''تاریخ میں جن حکومتوں نے اسلامی حکومت کا باجگزار بننا تسلیم کر لیا تھا۔ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا اور دعوت و تبلیغ کے ذریعہ ان میں اصلاح کا عمل جاری کر دیا گیا تھا۔ آج کے دور میں اس کی شکل کیا ہوگی؟''

پروفیسر صاحب نے یہ سوال اس لئے اٹھایا ہے کہ غیر شعوری طور پر ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اس دور میں اسلامی حکومت کا قیام اور پھر غیر اسلامی حکومتوں کا باجگزار ہونا ناممکن ہے حالانکہ جس اللہ نے اسلام کو سابق میں غلبہ و اقتدار دیا تھا وہ آج بھی اسلام کو غالب و حکمراں بنا سکتا ہے۔ حالات زمانہ سے یہی مرعوب ذہنیت ہے جس نے اچھے اچھے لوگوں کو انحراف کی راہ پر ڈال دیا ہے۔

بدی کو روکنا شرعی حدود میں

غوری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ہمیں ظالم کو ظلم سے باز رکھنے کے لئے اس کا ہاتھ پکڑنے کی ہدایت کی گئی ہے تو کیا ایسے ملک میں جہاں فسطائی قوتیں اہل ملک کے مختلف طبقات بالعموم اور امت مسلمہ کو بالخصوص ظلم کا ہدف بنائے ہوئے ہیں ایک ایسی حکومت منتخب کرنے میں مدد دینا نہیں چاہئے جو زیادہ انصاف پسند ہو اور ظالم کو ظلم سے باز رکھنے اور اس کی قوت کو توڑنے کے عزم کا اظہار کرے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہوگی؟''

ظالم کا ہاتھ پکڑنے میں کسی کی بھی مدد بالکل روا ہے لیکن صحیح فکر و عمل کے دائرہ میں رہ کر کرنی چاہئے۔ آپ خود سوچئے اگر کہیں ظالم کا ہاتھ توڑنے کے لئے یہ تجویز پیش کی جائے کہ فلاں مقام پر ایک بت خانہ بنایا جائے جہاں لازماً کچھ لوگ ہر وقت موجود رہیں گے اس طرح ظلم و جور کا راستہ خود بخود بند ہو جائے گا تو ایک مسلمان اس تجویز کی تائید کرے گا یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرے گا؟ الغرض ظالم کا ہاتھ پکڑنے کے لئے بھی کتاب و سنت کے قائم کئے ہوئے حدود کے اندر رہنا ہے۔ اگر یہ تسلیم ہے تو بتائیے فسطائیت کی روک تھام کے لئے غیر اسلام کے قیام و بقاء کی جدوجہد کیسے جائز ہوسکتی ہے؟!

نادر حکمتِ عملی

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''کیا مظلوم کو ظلم سہتے رہنا، خود ہدف ظلم بنا رہنا اور اپنے منفی رویہ سے ظالم کی قوت میں اضافہ کا ذریعہ بنا رہنا دین وشریعت کا مطالبہ ہوسکتا ہے؟''

یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں مسلسل نصف صدی سے ظلم سہنا پڑ رہا ہے اور ہم ظلم کا ہدف بنے ہوئے ہیں۔ کس کی طرف سے؟ کیا اس میں دو رائے ہوسکتی ہے کہ یہ سارا ظلم سیکولرزم اور جمہوریت کا علم اٹھانے والی قوتوں کی جانب سے کیا جا رہا ہے جن کی تائید وحمایت کی مہم آپ حضرات چلا رہے ہیں۔ آخر اتنی کھلی ہوئی چیز کیوں نہیں نظر آتی اور تو اور جس گروہ نے تحریک اسلامی پر دو بار پابندی لگائی ہے اسی کا سایہ اپنے اوپر قائم رکھنے کے لئے آپ حضرات بے چین ہیں۔ یہ نادر حکمت عملی ہے جس کی مثال شاید ہی تاریخ میں مل سکے!

نہ ظلم سہتے رہنا درست ہے اور نہ ظلم کا ہدف بننا صحیح ہے اور نہ اپنے منفی رویہ سے ظالم کی قوت میں اضافہ کا ذریعہ بننا ٹھیک ہے لیکن خاموش رہنا اور منفی رویہ اس لئے اپنایا جائے کہ اگر ہم بولتے ہیں تو راست ایک ظلم اور ایک منکر کی تائید لازم آئے گی تو بتایئے کہ یہ کیوں غلط ہے جب کہ جلب منفعت پر درءِ مفسدہ کو مقدم رکھنا ایک عام اصول ہے بی جے پی اپنی سوچ اور فکر کے اعتبار سے یقیناً ایک ظالم اور فسطائی گروہ ہے لیکن کانگریس کا ظلم اور فسطائیت بھی ایک کھلی کتاب ہے۔ پچاس برس سے ہمیں اس سے سابقہ ہے اس تجربہ کے بعد بھی ایک مسلمان کے لئے کیا یہ صحیح ہوگا کہ نہ صرف یہ کہ کانگریسی اقتدار کے قیام وبقاء کے لئے بلکہ کانگریسی نظریات اور تصورات کے استحکام کے لئے جدوجہد کرے اور یہ نعرہ لگائے کہ اس کے بغیر ملک ٹکڑے ٹکڑے ہوجائے گا اور یہی موزوں ترین سسٹم ہے؟ آخر اس موقع پر یہ کیوں نہیں سوچا جاتا ہے کہ یہ پالیسی اور رویہ اختیار کرنے سے ہماری اصل دعوت یعنی اسلام کی نفی ہوجاتی ہے اس لئے کہ سیکولرزم کی جو تعریف بھی کی جائے اس کی تعریف میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اجتماعی اور سیاسی دائرہ میں کسی مذہب کو دخل دینے کا حق نہیں ہے اور جو گروہ مذہب کو سیاست میں داخل کرے گا اس کو ہم برداشت نہیں کریں گے۔ اب آپ بتایئے کہ سیکولرزم کی تائید کرکے اپنی دعوت کو کالعدم کرنے کے لئے کیسے آپ تیار ہوگئے ہیں اور کیسے اپنی پالیسی کو اقامت دین کی جدوجہد کا ایک جز کہتے ہیں؟!

اس صدی کا سب سے بڑا المیہ

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''کیا اس وقت جب آنے والے سیلاب کو ایک تنکے سے روکا جاسکتا ہے خاموش بیٹھے رہنا اور سیلاب امنڈ

آنے پر جوابی سیلاب بننے کا انتظار کرنا جب کہ آنے والے سیلاب کی قوت و طاقت کا اندازہ بھی ہو اور خود جوابی سیلاب بننے کی صلاحیت بھی جانتے ہوں یا بیٹھے انتظار کرتے رہنا، دور اندیشی اور حکمت و دانائی کی تعریف میں آتا ہے؟''

کسی سیلاب کو آتے دیکھ کر خاموش بیٹھے رہنا اور جس حد تک ہم روک سکتے ہیں روکنے کی کوشش نہ کرنا یقیناً حکمت و دانائی کی تعریف میں نہیں آتا! لیکن سوال یہ ہے کہ کسی سیلاب کو روکنے کے نام پر کیا ہم اپنی بنیادی دعوت، بنیادی نظریات اور عقائد کو پس پشت ڈال سکتے ہیں اور کیا ایک سیلاب سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو دوسرے سیلاب کے حوالہ کر دینا کوئی دانشمندی ہے اور کیا یہ حکمت و دانائی ہوئی کہ خود جوابی سیلاب بننے کے لئے درکار صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے کی فکر سے ہم خالی ہو جائیں اور فٹ بال کی طرح ایک مارے تو دوسری طرف اور دوسرا مارے تو تیسری طرف لڑھکتے پھریں؟! جیسا کہ پچاس سال سے ہم اس چکر میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چکر سے نہ نکلنے دینے کے لئے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازش کرنے والوں نے اس گروہ کو بھی اپنے جال میں پھنسالیا ہے جو مسلمانوں کو اس دلدل سے نکال سکتا تھا اور جو مسلمانوں میں جوابی سیلاب بننے کا شعور پیدا کر رہا تھا۔ اس پہلو سے حالات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ اس صدی کا سب سے بڑا المیہ ہے اور ملک و ملت کی بڑی بدقسمتی ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کی طرف بلا رہے تھے وہ انسانوں کے خود ساختہ نظاموں کی طرف دعوت دیتے ہوئے نظر آ رہے ہیں!

قیصر کے خوف سے کسریٰ کی گود میں بیٹھنا

غوری صاحب لکھتے ہیں:

''آزمائشوں کے آنے کا خود سبب بننا اور انہیں آتے دیکھ کر بے فکر بنا رہنا اور ان کے روکنے کی تدابیر پر عمل کی فکر نہ کرنا دین داری کی کس تعریف میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ کیا جنگ تبوک کا واقعہ آنے والے سیلاب اور آزمائشوں کا وقت سے پہلے ہی زور توڑ دینے کا درس نہیں دیتا؟''

آزمائشوں کا خود سبب بننا، ان کو روکنے کی تدابیر نہ سوچنا دین داری نہیں ہے لیکن آزمائشوں کے خوف سے صراط مستقیم کو چھوڑنا بھی سراسر دین داری کے خلاف ہے اللہ کے نیک بندے ہمیشہ آزمائشوں میں پڑے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی اپنے آپ کو آزمائشوں سے نہیں بچا سکے ہیں بلکہ سنت الٰہی یہی ہے کہ ہر نیک بندہ آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔

ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بموجب جس کا دین جتنا مضبوط ہوتا ہے اس کی آزمائش بھی اتنی سخت کی جاتی ہے۔ قرآن اہل باطل سے محبت اور موالات کے ساتھ معاملہ کرنے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ مداہنت سے منع کرتا ہے

ان کی طرف معمولی جھکاؤ پر سخت وعید سناتا ہے، طاغوت سے اجتناب کو تقاضائے ایمان قرار دیتا ہے اس کے ساتھ مشکلات اور مصائب میں صبر وتوکل کی تلقین کرتا ہے اور اس کے فضائل بیان کرتا ہے اور صلہ کے طور پر جنت کی بشارت دیتا ہے۔

قرآن کی ان تعلیمات کی روشنی میں آپ غور فرمائیے اہل باطل کے اصول ونظریات کو اپنے ملک کے لئے موزوں سسٹم بنانا، ان کی کامیابی کے لئے مہم چلانا، ان کو قانون ساز اداروں میں پہنچانے کے لئے ووٹ دینا، کیا مداہنت اور جھکاؤ سے آگے کا قدم نہیں ہے اور محبت اور موالات کے ساتھ فی سبیل الباطل جہاد نہیں ہے؟؟ قرآن کی اتنی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے اللہ کے پاس حاضر ہوں گے تو وہ کونسی دلیل ہے جو آپ کے کام آئے گی!۔ آپ حکمت عملی کے نام پر جو کچھ کررہے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ میں اس کا کہیں پتہ نہیں ہے ورنہ کوئی آگ میں نہ ڈالا جاتا، نہ کوئی گھر سے نکالا جاتا، نہ کوئی آروں سے چیرا جاتا اور نہ معرکۂ بدر وحنین جیسے معرکے گرم ہوئے ہوتے۔

جنگ تبوک کا ذکر کر کے تو آپ نے اپنے موقف کو انتہائی کمزور کردیا ہے کاش جنگ تبوک کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ لیتے۔ جنگ تبوک کے موقع کی کوئی بات تو بتائیے۔ جس سے ظاہر ہورہا ہو کہ آزمائش سے بچنے کے لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے باطل اور اہل باطل کی ہمنوائی اور تائید کی ہو اور قیصر کے ڈر سے کسریٰ کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کی ہو، اس کے برخلاف جس تیاری اور مستعدی کے ساتھ اور جن مشکل اور نازک حالات میں آزمائش کا مقابلہ کرنے کے لئے مدینہ سے آپ نکلے ہیں اور صحابہ کرام نے جس ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کیا ہے اس سے آپ کی حکمت عملی کا کیا تعلق ہے؟! کسی حقیقت کو جھٹلانے کی اس سے بڑی مثال مشکل سے ملے گی۔ ایک طرف ایثار، قربانی، پامردی، حوصلہ مندی اور جرأت اور اقدام ہے اور دوسری طرف بے ہمتی، خوف، ڈر، بزدلی اور فرار ہے اور دونوں کو ایک قرار دیا جارہا ہے افسوس صد افسوس!

اپنے پیر پر کلہاڑی مارنا

غوری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ملک میں ایسی حکومت کی راہ نہ روکنا جو دعوت دین کا راستہ روکنے والی ہو، دین حق اور اس کی ترویج وتوسیع میں معاونت نہیں ہوگی؟''

دعوتِ دین کی راہ روکنے والی حکومت کی راہ روکنا یقیناً واجب ہے لیکن اپنے عقیدہ اور آئیڈیالوجی کی نفی کر کے ہرگز صحیح نہیں ہوگا اگر اس طرح کی حکومت کی راہ اس بنیاد پر روکی جائے کہ خدا کے دین کی حکومت قائم

ہوگی یا فلاں خدا پرست اور صالح گروہ کے لوگوں کو برسر حکومت آنا چاہئے۔ تو ٹھیک تھا، مگر آپ اس حکومت کی راہ اس نعرہ کے ساتھ روک رہے ہیں کہ ہندوستان کے لئے موزوں نظام، جمہوریت اور سیکولرزم ہے اور حکومت کانگریسی فکر اور سیکولرزم کے حاملین کی ہونی چاہئے وہ کانگریس جو دوبار دعوتِ دین کی راہ روک چکی ہے۔ جس کے دور حکومت میں ہزارہا مسلم کش فسادات ہو چکے ہیں اور کسی ایک مجرم کو سزا نہیں دی گئی جس نے پوری کوشش کی ہے کہ مسلمان اپنا تشخص کھودیں۔ جس کانگریس نے بابری مسجد کو تالا لگایا اور پھر چالیس سال کے بعد اسی نے پوجا پاٹ کرانے کے لئے تالا کھولا اور آخر میں اسی نے مسجد کی جگہ مندر بنانے کا موقع فراہم کیا۔

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ کی حکمت عملی کے معنی اپنے ہی پیر پر کلہاڑی مارنا ہے کیونکہ ایک طرف آپ بڑے زور سے کہتے ہیں کہ دعوت دین کے لئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی ضروری ہے اور قومی منافرت کی فضا ختم ہونی چاہئے لیکن دوسری طرف ملک کی اصل ہندو اور سب سے بڑی پارٹی کے خلاف غیر مذہبی لوگوں کے حق میں مہم چلا رہے ہیں اور اپنی دعوت اور اسلام کا پیغام پس پشت ڈال کر ایسا کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ جہاں اسلام کا نام لیں گے وہیں غیر مذہبی یعنی سیکولر لوگوں کے کان کھڑے ہو جائیں گے اور ان کی نظر میں آپ اور بی جے پی کے لوگ دونوں برابر ہو جائیں گے۔ غرض دعوت دین کی راہ روکنے والی حکومت کی راہ روکنے کا ایسا طریقہ اپنایا گیا ہے جس میں پہلے ہی قدم پر خود ہمیں ہی دعوت دین کو روکنا پڑ رہا ہے۔ یعنی جو کام بی جے پی کرتی وہ کام خود ہم ہی کر رہے ہیں۔ فرق صرف عنوان کا ہے۔

دعوت دین کی راہ میں دشواریوں میں اضافہ کرنا اور آزمائشوں کے آنے کے راستے کھلے چھوڑ دینے کو یقینا دانش مندی نہیں کہا جا سکتا اور نہ مومنانہ فراست، لیکن اس سے بڑی بے دانشی اور بدبختی یہ ہے کہ سہولتوں اور آسائشوں کی خاطر صراط مستقیم سے ہٹ کر عذاب الٰہی کو دعوت دی جائے۔

بنیادی فکر اور عقیدۂ توحید کے خلاف عمل

ووٹ اور الیکشن کے بارے میں کم وبیش تیس سال سے چلنے والی بحث کو ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب نے ایک مقام تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں کئی بنیادی باتیں تقریباً متفقہ حقیقت بن گئی ہیں۔ مثلاً:

① سیکولر جمہوری نظام میں قانون کا ماخذ صرف جمہور کا اجتماعی ارادہ ہوتا ہے اس کے اوپر اور کوئی اتھاریٹی اور سند نہیں ہوتی، نہ انسانی اور نہ خدائی۔ اس کی بنیاد حاکمیت الٰہ کے انکار اور حاکمیت جمہور کے اقرار پر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک کافرانہ اور طاغوتی نظام ہے۔

② دوسرے اس نظام کو جائز اور برحق تسلیم کرنا اور ماننا ایمان کے منافی ہے۔

③ تیسرے اس نظام کو چلانے کیلئے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں جانا ہماری بنیادی فکر اور عقیدہ توحید کیخلاف ہے۔ اس کے بعد کے مباحث کی تنقیح کیلئے ہم ڈاکٹر انصاری صاحب کے مضمون ''زندگی نو'' ۔ جون ۹۸ء پر تفصیلی بحث کریں گے۔ یہ مضمون کتابی شکل میں بھی ''سیکولرزم، جمہوریت اور انتخابات'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، مرکزی مکتبہ اسلامی نے شائع کیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے دو کام

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں:

''ترجمان القرآن'' کی زندگی کے ابتدائی چار سال اس کوشش میں صرف ہوئے کہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں گمراہی کی جو جو شکلیں پیدا ہوگئی ہیں ان پر گرفت کی جائے اور اسلام سے جو روز افزوں بعد ان میں پیدا ہو رہا ہے اسے روکا جائے۔ میری کتاب ''تنقیحات'' اس کوشش کا آئینہ ہے۔

''ابھی یہ کوشش جاری تھی کہ ۳۷ء میں یکا یک یہ خطرہ سامنے آ گیا کہ ہندوستان کے مسلمان کہیں اس وطنی قومیت کی تحریک کا شکار نہ ہو جائیں جو آندھی اور طوفان کی طرح ملک پر چھائی چلی جارہی تھی۔ یہ ظاہر بات ہے کہ ہم موجودہ ظالمانہ نظام حکومت کے خواہ کتنے ہی مخالف ہوں، اور ہمارے دل میں اس کے پنجے سے

نکلنے کی خواہش چاہے کانگریسی حضرات سے بھی بڑھی ہوئی کیوں نہ ہو، مگر ہم کسی طرح بھی یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ جو لوگ اس وقت تک تھوڑے یا بہت اسلام کے حلقۂ اثر میں ہیں ان کو ہندوستانی قوم پرستی کی تحریک اپنی ربط عوام کی تدبیروں سے، اور اپنی وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کے ذریعہ سے، اور اپنے سیاسی و معاشی تفوق کے زور سے اپنے اندر جذب کر لے، اور ان کے نظریات اور ان کی زندگی کو اتنا متغیر کر دے کہ ایک دو پشتوں کے بعد ہندوستان کی آبادی میں اسلام اتنا ہی اجنبی ہو کر رہ جائے جتنا جاپان یا امریکہ میں ہے۔

اس خطرہ کو اور زیادہ پریشان کن جس چیز نے بنادیا وہ یہ تھی کہ محض انگریزی اقتدار سے آزاد ہونے کے لالچ میں مسلمانوں کے مذہبی رہنماؤں کا ایک سب سے زیادہ بااثر طبقہ وطنی قوم پرستی کی تحریک کا معاون بن گیا اور اس نے انگریز دشمنی کے اندھے جوش میں اس چیز کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر لیں کہ اس تحریک کا فروغ ہندوستان میں اسلام کے مستقبل پر کس طرح اثر انداز ہوگا۔ لہٰذا اس خطرے کا سدباب کرنے کیلئے میں نے ''مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش'' کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ ۳۷ء کے آخر میں اور پھر دوسرا سلسلہ ۳۹ء کے آغاز میں شائع کیا ان مجموعوں میں میرے پیش نظر صرف یہ چیز تھی کہ مسلمان کم از کم اپنی مسلمانیت کے موجودہ مرتبے سے نیچے نہ جانے پائیں اور اپنے تشخص کو گم نہ کر دیں۔ اس لئے میں نے ان کے اندر اسلامی قومیت کا احساس بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کو اس جمہوری لادینی نظام حکومت کے نقصانات سے آگاہ کیا جو واحد قومیت کے مفروضہ پر ہندوستان میں قائم کیا جارہا تھا۔ ان آئینی تحفظات اور بنیادی حقوق کی حقیقت واضح کی جن پر اعتماد کر کے مسلمان اس مہلک جمہوری دستور کے جال میں پھنسنے کے لئے آمادہ ہو رہے تھے۔''

چند سطروں کے بعد مولانا پھر لکھتے ہیں:

''یہ کام جس غرض کے لئے کیا گیا تھا اللہ کے فضل و کرم سے وہ پچھلے دو تین سال میں حاصل ہو چکی ہے اور اب اس امر کا کوئی خطرہ باقی نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمان کسی وطنی قومیت میں اپنے آپ کو گم کر دیں گے یا اپنے آپ کو کسی ایسے جمہوری نظام میں منتھی کرالیں گے جو واحد قومیت کے مفروضہ پر تعمیر کیا گیا ہو۔''

لیکن مولانا علیہ الرحمۃ کو کیا معلوم تھا کہ ان کی آنکھ بند ہونے کے صرف پانچ سال بعد انہیں کی برپا کی ہوئی تحریک کے ذمہ دار اور نمائندے مسلمانوں کو اسی جال میں پھنسانے کی کوشش شروع کر دیں گے جس جال سے نکالنے کے لئے مرحوم نے جان توڑ محنت کی تھی اور انہی کی تحریروں سے یہ ثابت کریں گے کہ مولانا لادینی جمہوری نظام کے داعی اور مبلغ تھے۔ قارئین نے ''زندگی نو'' جون ۹۸ء میں پڑھا ہوگا کہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب نے قاسم رضوی کے نام مولانا کے ایک خط کے حوالے سے اور ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے مسئلہ فلسطین کے تعلق سے مولانا کے ایک بیان سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مودودیؒ لادینی جمہوری نظام میں شرکت کے مخالف نہیں۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے جس پر افسوس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

مولانا مودودیؒ کی ہزاروں صفحات پر مشتمل تحریریں جس چیز پر کھلے طور پر گواہی دے رہی ہیں اور جس کی عملی شہادت جماعت اسلامی نے تقریباً نصف صدی تک دی ہے اس کے خلاف کسی خط اور کسی بیان کو پیش کرنا بالکل ویسا ہی ہے جیسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں سے عرس اور قوالی کے کار ثواب ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے۔

معاہدہ کرنے اور کسی نظام میں شریک ہونے اور اس کے ساتھ نتھی ہونے میں زمین اور آسمان کا فرق ہے جسے محسوس کرنا چاہئے تھا۔ مولانا مودودیؒ کی دونوں تحریروں میں معاہدہ کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ معاہدہ میں ہر فریق کی اصل حیثیت اور اس کا اپنا تشخص تسلیم شدہ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کس نے دب کر معاہدہ کیا ہے اور کس کی پوزیشن مضبوط ہے۔ مولانا نے کسی کے ساتھ ضم ہونے اور کسی نظام میں نتھی ہونے کی بات ہرگز نہیں کی ہے۔ اس کے برخلاف ہندوستانی جمہوری نظام میں مسلمان بہ حیثیت امت مسلمہ نہیں شریک ہو رہے ہیں اور نہ دستور کے لحاظ سے اس کی گنجائش ہے۔ یہاں مسلمان کو متحدہ قومیت کا ایک جزء فرض کر لیا گیا ہے اور اس کو ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں نے بھی قبول کر لیا ہے لیکن مولانا اس کے مخالف تھے۔ بقول ڈاکٹر صاحب مولانا مودودیؒ کی بات میں سلطنت در سلطنت کی بات ہے۔

غور فرمائیے موجودہ ہندوستان کی صورت حال میں کیا مسلمانوں کا سیاسی رول سلطنت در سلطنت کے قیام کا ہے اس پہلو سے مکرر غور کرنے کی ڈاکٹر صاحب سے ہم خواہش کریں گے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اقامت دین اور نظام اسلامی کے داعی کے بجائے مولانا مودودیؒ کو لادینی جمہوری نظام کا مؤید ثابت کرنا بڑی بے انصافی کی بات ہے اور مولانا پر بڑا ظلم ہے۔

اسی بے انصافی کا دوسرا نمونہ ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب کے یہ جملے بھی ہیں۔

> ''مولانا مودودیؒ کی بعض تحریروں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کے بارے میں ہمارا جو اصولی موقف ہے اس کی روشنی میں اس نظام کے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے الیکشن میں کسی طرح کا حصہ لینا جائز نہیں۔ خواہ اس کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے کتنے ہی مفادات متاثر ہوں یا انہیں کتنے ہی غیر معمولی نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہو'' (''زندگی نو'' جون ۹۸ء)

آنکھوں میں دھول جھونکنا

''تاثر ملتا ہے'' کے الفاظ ذہن میں رکھئے اور مولانا مودودیؒ کے یہ صریح الفاظ پڑھئے اور دیکھئے کس طرح آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے۔

''دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ کافرانہ نظام کے خلاف ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے۔ جس کے لئے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے بخلاف اس کے ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے اگر ہندوستان کے علماء اور عامۃ المسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کیلئے مقتضیات ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشہ سے اس اصولی مسئلہ میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے۔

آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوششیں کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لئے اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لئے اس معاملہ میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتاب الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہئے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔'' (رسائل مسائل اول)

سیکولرزم اور جمہوریت ڈاکٹر صاحب کی نظر میں

''ایک سیاق میں مذہب انسان کا صرف ذاتی اور نجی مسئلہ ہے۔ خدا کی ہدایت یا آسمانی کتاب کا تعلق صرف اسی حصے سے ہے جہاں تک اجتماعی امور کا تعلق ہے، وہ مذہب سے آزاد اور خدائی ہدایت سے بے نیاز ہیں۔ اس دائرے میں تمام فیصلے انسانوں کو اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں انجام دینے چاہئیں، نہ کہ کسی آسمانی کتاب یا ہدایت کی روشنی میں۔

دوسرے سیاق میں سیکولرزم آج کی مختلف ریاستوں کا ایک اساسی تصور ہے یعنی یہ کہ جو اجتماعی امور ریاست کی حدود میں آتے ہیں، ان میں ریاست ہر خدائی ہدایت اور مذہبی رہنمائی سے کلیۃً آزاد ہوگی۔ اس کے سارے قوانین اور ضابطے سارے اصول اور پالیسیاں اور تمام فیصلے ریاست کے شہری اپنی عقل و تجربے کی روشنی میں طے کریں گے۔''

''ہندوستان کی ریاست ایک سیکولر ریاست ہے اس کا اساسی تصور یہ ہے کہ اجتماعی امور میں حکومت کسی مذہب یا الٰہی ہدایات کی پابند نہیں ہے۔ اس کے تمام قوانین اور ضوابط اور سارے فیصلے اصولاً اس کے باشندوں کی مرضی کے مطابق اور ان کی عقل و تجربے کی روشنی میں طے پائیں گے۔''

''جمہوری ریاستیں اس اساس پر قائم ہوتی ہیں کہ حاکمیت (Sovereignty) کے حق دار ریاست کے جمہور عوام ہیں یعنی قانون کا ماخذ نہ کوئی خاندان ہے، نہ کوئی طبقہ اور نہ کوئی گروہ یا فرد۔ اس کا ماخذ صرف اور صرف جمہور کا اجتماعی ارادہ ہے، اس سے اوپر اور کوئی اتھاریٹی نہیں۔ نہ انسانی اور نہ خدائی، جمہوری ریاست اور اسلامی حکومت میں بنیادی فرق اسی نکتے پر ہے۔''

ڈاکٹر صاحب نے سیکولر جمہوریت کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ہے۔ ان کی موجودگی میں سیکولر جمہوریت کے ایک کافرانہ اور مشرکانہ طاغوتی نظام ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کافرانہ نظام کے تحفظ و بقاء اور قیام کی مہم چلانے کے لئے کہاں سے گنجائش نکلتی ہے جب کہ جمہوری نظام سے بڑھ کر صریح اور کھلا ہوا کفر کیا ہوسکتا ہے اس کفر بواح کی تائید وحمایت کی جاسکتی ہے تو بتایئے وہ کونسا کفر اور کافرانہ نظام ہوگا جس کے مٹانے کی جدوجہد ایک مسلمان کا فریضہ ہوگا اور اس سے بڑا وہ کونسا منکر ہوگا جس کو ختم کرنے یا کم از کم دل سے ناپسند کرنا، ایمان کی علامت بتائی گئی ہے۔

بالخصوص ایک ایسا مسلمان جس نے اقامت دین کو اپنا نصب العین بنایا ہو اور دین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں جاری و نافذ کرنا جس کی ساری دوڑ دھوپ کا ماحصل ہو، اس کے متعلق یہ کس منطق، کس عقل اور کس شرعی دلیل کی بنیاد پر تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے اس طاغوتی نظام کے قیام و بقاء کی بات سوچ سکتا ہے۔ چہ جائے کہ وہ اس کے لئے مہم چلائے اور فضا ہموار کرے۔

لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس طاغوتی نظام کی تائید وحمایت کو جائز قرار دینے کا فریضہ انجام دیا مگر اس کے لئے نہ قرآنی آیتیں پیش فرما سکے، نہ کوئی حدیث اور نہ کوئی شرعی اصول۔

ڈاکٹر صاحب کے دلائل انہیں کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں۔ روداد شوریٰ سے ایک اقتباس درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''آپ ان الفاظ پر غور کریں پہلی چیز جو آپ کو نوٹ کرنی چاہئے وہ یہ ہے کہ یہاں جو بات زیر بحث ہے وہ حاکمیت جمہور کا نظریہ نہیں ہے، بلکہ جمہوریت کی آزادیٔ رائے وضمیر جیسی قدریں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ شوریٰ جمہوریت کی انہیں قدروں کی تائید کررہی ہے نہ کہ اس کے نظریۂ حاکمیت کی۔ تیسری بات یہ ہے کہ شوریٰ اگر ہندوستان میں جمہوریت کی بقاء اور فروغ کی کوشش کرتی ہے تو اس کی ایک وجہ آزادیٔ رائے وضمیر کا تحفظ ہے جو جمہوریت میں بھی ویسے ہی محترم ہیں جیسے کہ اسلامی ریاست میں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ

آزادی نہ صرف ملک کی صحیح تعمیر و ترقی کیلئے ضروری ہے بلکہ جماعت اسلامی کی اپنی سرگرمیوں اور دعوتی و تحریکی کوششوں کے جاری رہنے کیلئے بھی ناگزیر ہے۔ چوتھی بات جو الفاظ سے سامنے آتی ہے وہ جماعت اسلامی کا یہ اندیشہ ہے کہ اگر جمہوریت کی تائید نہیں کی گئی تو کلیت پسندی اور آمریت کے رجحانات ترقی پائیں گے۔ جس سے ملک کی ترقی بھی متاثر ہوگی اور جماعت اسلامی کی دعوت بھی۔ اس احساس کے تحت جماعت اسلامی جمہوریت کی نہ صرف زبانی تائید پر اکتفاء کرنا چاہتی ہے، اس کیلئے رائے عامہ بھی ہموار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔''

انصاری صاحب کے چار دلائل

ڈاکٹر صاحب کی پہلی بات کو لیجئے۔ سوال یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کا نظریہ کیوں زیر بحث نہیں لیا گیا جبکہ جمہوریت کی جان حاکمیت جمہور ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندومت کی تائید و حمایت کا مسئلہ ہو اور کہا جائے کہ بت پرستی کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ دوسری دلیل پر غور کیجئے کہ گویا آپ جمہوریت کی آدھی چیز کی تائید کرتے ہیں۔ آپ آدھی کے بارے میں کیا کہتے ہیں وہ بھی تو معلوم ہونا چاہئے۔ الیکشن کے زمانہ میں جب مہم چلائی جاتی ہے تو کیا اس کی صراحت کی جاتی ہے کہ ہم جمہور کی حاکمیت کو نہیں مانتے اور کیا ایک کمیونسٹ یا کانگریسی امیدوار کو آپ پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں تو اس کو یہ بول کر بھیجتے ہیں کہ دیکھو تم صرف جمہوری قدروں کے حق میں رائے دینا اور حاکمیت جمہور کے خلاف بولتے رہنا؟

تیسری دلیل کو دیکھئے، آزادیٔ رائے وضمیر کا تحفظ بلاشبہ محترم شئ ہے لیکن کیا اس کی حفاظت کے لئے حاکمیت الٰہ کو چھوڑ کر حاکمیت جمہور کو قبول کرنا اور اس کے قیام کی جدوجہد شرعاً جائز ہوگی۔ حالانکہ حاکمیت الٰہ کا عقیدہ تو وہ شئ ہے جس کے لئے رائے اور ضمیر کیا جان و دل سب کچھ قربان کر دینے کی تاریخ موجود ہے اور جان و دل اور اپنی ساری متاع ایک مومن جنت کے عوض فروخت کر چکا ہوتا ہے۔

جہاں تک ملک کی صحیح تعمیر و ترقی کا سوال ہوسکتا ہے کہ جمہوریت کی دی ہوئی آزادی پر موقوف ہو لیکن جہاں تک دعوتی و تحریکی کوششوں کے جاری رہنے کی بات ہے اس کا سوال بھی کیا ہے جبکہ حاکمیت الٰہ کے بجائے حاکمیت جمہور کو قبول کر لیا جائے اور دین جمہور کے قیام کی مہم شروع کر دی جائے۔ آخر دعوت و تحریک کس چیز کا نام ہوگا اور کس چیز کی دعوت دی جائے گی اور کس چیز کے لئے تحریک چلائیں گے؟؟ آپ کی چوتھی دلیل ایک اندیشہ ہے کہ اس اندیشہ کی بنیاد پر حاکمیت الٰہ کے عقیدہ سے دستبرداری اختیار کر لیا جانا روا ہوگا؟ دعوتِ اسلامی کی تاریخ میں نمرود اور فرعون کی کلیت پسندی اور آمریت کی چیرہ دستیوں اور اذیتوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارہ کیا

گیا لیکن حاکمیت الٰہ کے عقیدہ کی کسی چیز سے دستبرداری کی سوچ کو قریب آنے نہیں دیا گیا۔ یہ کونسی انوکھی آمریت ہے اور اس کا کیا خوفناک اندیشہ ہے کہ ہم ایمان کی اس کمزوری کا مظاہرہ کر رہے ہیں!

جماعت اسلامی کس چیز کی تائید کرتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''جماعت اسلامی کی شوریٰ کی قراردادوں میں جمہوریت کی جو تائید ملتی ہے وہ صرف اس جمہوری طرز حکمرانی، ان جمہوری قدروں کی تائید ہے جو جمہوریت اور اسلامی ریاست دونوں میں مشترک ہے۔ نہ کہ حاکمیت جمہور کے نظریہ کی۔''

اگر یہ بات ہے تو ان کمیونسٹ اور کانگریسی امیدواروں کو کیسے ووٹ دیا جاتا ہے جو مکمل جمہوریت پر ایمان رکھتے ہیں اور جمہوریت کے کسی ایک جزء کے بھی انکاری نہیں ہیں آخر ایسے لوگ جماعت اسلامی کی نمائندگی پارلیمنٹ میں کیسے کر سکتے ہیں؟!

آپشن کی بات

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی کی ایک قرارداد سے کچھ حصہ نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''اس اقتباس سے چند چیزیں بڑی وضاحت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت اسلامی اگر سیکولر جمہوری نظام کی بقاء کی تائید کرتی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ سیکولر جمہوریت اسے مطلوب ہے یا اس کا نصب العین ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے سامنے جو دو آپشن ہیں ان میں بہتر آپشن یہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا آپشن وہ ہے جو ملک وملت دونوں کے لئے خطرناک اور جماعت کی دعوت کے لئے ضرر رساں ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جماعت کی یہ تائید وقتی ہے مطلق نہیں، یہ تائید اس وقت تک ہی باقی رہے گی جب تک اہل ملک کے سامنے جماعت کا اپنا نصب العین ایک آپشن کے طور پر نہ آجائے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ جب تک وہ وقت نہیں آتا جماعت اپنے نصب العین کی طرف دعوت بھی دیتی رہے گی اور ساتھ ساتھ اس کی بھی کوشش کرتی رہے گی کہ ہندوستانی ریاست کا سیکولر جمہوری کردار باقی رہے تاکہ ملک ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور جماعت کیلئے اپنی دعوت کا دروازہ کھلا رکھے۔''

رب موسیٰ اور فرعون کی اطاعت کا نعرہ

اس سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ہم نقل کر آئے ہیں کہ جماعت اسلامی مکمل جمہوریت کی تائید نہیں کرتی بلکہ صرف جمہوری طرز حکمرانی اور جمہوری قدروں کی تائید کرتی ہے لیکن یہاں کہا جارہا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کی تائید کرتی ہے۔ اس تضاد بیانی کی اس کے علاوہ کوئی توجیہ نہیں کی جا سکتی کہ جہاں جیسا موقع ملا ویسا

جواب دے کر چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔

بہرصورت یہاں سیکولر جمہوری نظام کی تائید کی تین وجہ بتا رہے ہیں۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ملک کے سامنے موجودہ دو آپشنوں میں سے یہ آپشن بہتر آپشن ہے۔ یہاں غور طلب سوال یہ ہے کہ کیا یہ کوئی شرعی دلیل ہے؟ جب آپ کو اقرار ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کی بنیاد حاکمیت الٰہ کے انکار پر رکھی گئی ہے تو اس کی تائید کے لئے آپ کی بتائی وجہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کا مطلب اس کے سواء کیا ہے کہ دو شیطان الوہیت کے دعویدار ہیں ان میں سے ایک کی اطاعت آپ نے محض اس بنیاد پر قبول کر لی کہ وہ کچھ زیادہ سہولت مہیا کرنے کا وعدہ کرتا ہے۔

اس وقت ملک میں جب دعوت اسلامی کو ایک آپشن کی حیثیت میں نہیں ابھارا جا سکا تو مزید شدت کے ساتھ دعوت اسلامی یعنی نظام اسلامی کی افادیت، ضرورت اور اہمیت باشندگان کے سامنے پیش کرنی تھی۔ جس موقع پر اہل ملک کے سامنے یہ سوالیہ نشان آئے کہ ملک کی نجات کس فارمولہ میں ہے؟ اس وقت ہم بھی دوسروں کی آواز میں آواز ملا کر بولیں کہ نجات وفلاح کی راہ یہ نہیں ہے جبکہ وہی وقت تھا کہ ہم کہیں کہ لوگو! تمہاری نجات اور سلامتی نہ ہندوتوا میں ہے اور نہ سیکولر جمہوریت میں ہے۔ تمہاری سلامتی اسلام میں ہے اور اسلام کے علاوہ سارے سسٹم اور نظام تباہی اور بربادی کی طرف لے جائیں گے۔

افسوس ہے کہ بات کہنے کا جو وقت ہوتا ہے اس وقت کو ہم نہ صرف کھو دے رہے ہیں، بلکہ اُلٹی بات کہتے ہیں اور اپنی اصل بنیاد کو ڈھا دیتے ہیں۔

دوسری وجہ کے سلسلہ میں یہ سوال ہے کہ حاکمیت الٰہ کا انکار کرنے والے نظام کی تائید وحمایت موقتی طور پر بھی کیسے کی جا سکتی ہے اور پھر وہ کونسا وقت اور وہ کس طرح آئے گا کہ آپ حاکمیت الٰہ کے نظریہ پر مبنی نظام کی بات کریں گے؟ جن اسباب اور حالات کی بناء پر اس وقت غیر الٰہی نظام کی تائید وحمایت کر رہے ہیں وہ حالات مزید ابتر نہ ہوں گے؟ جس مصلحت اندیش طرز فکر نے انحطاط کی اس منزل تک پہنچایا ہے وہ بھی حوصلہ مندی اور ایسی جرأت نہ پیدا کر سکے گا کہ حالات کے علی الرغم صدائے لا الہ الا اللہ بلند کر سکیں۔

تیسری وجہ پر بھی غور کیجئے جب تک آپ کوشش کرتے رہیں گے کہ ہندوستانی ریاست کا سیکولر جمہوری کردار باقی رہے اس وقت تک حاکمیت الٰہ کے نظریہ کی بات کیسے کریں گے ایک طرف حاکمیت جمہور کی حمایت کریں اور دوسری طرف حاکمیت الٰہ کی بات کریں۔ یہ دونوں کام ایک ساتھ کیسے ہو سکتے ہیں بیک وقت رب موسیٰ اور فرعون دونوں کی اطاعت کا نعرہ کبھی نہ لگایا گیا ہے اور نہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ محض شیطانی منطق ہے جس کا مقصد لوگوں کا منہ بند کرنا ہے اور بس۔

اعتراض

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں سیکولر جمہوری نظام کے سلسلہ میں جماعت کے اصولی موقف پر اپنے بعض دوستوں کے دو اعتراض کا ذکر فرمایا ہے لیکن ان دوستوں کے اعتراض کی صحیح ترجمانی نہیں کی ہے۔ اعتراض یہ نہیں ہے کہ آپ جمہوری نظام کا تجزیہ کیوں کرتے ہیں۔ بلکہ اصل اعتراض یہ ہے کہ جس غرض کے لئے تجزیہ کرتے ہیں وہ غرض صحیح نہیں ہے۔ نیز اس تجزیہ میں جمہوری نظام کے بعض اجزاء کی تحسین فرماتے ہیں اور بعض کی نفی کرتے ہیں۔ لیکن حمایت کرتے وقت اس بات کو نظرانداز کردیتے ہیں اور سیکولر جمہوری نظام کی مکمل تائید وحمایت کرتے ہیں پارلیمنٹ کے کسی امیدوار کی ادھوری حمایت تو نہیں کرتے اور نہ آدھا ووٹ دیتے ہیں۔ ایسی شکل میں آپ کا تجزیہ ایک فعل عبث کے سواء کیا ہوتا ہے؟

ایک سوال اور انصاری صاحب کا جواب

> ''ایک سوال البتہ یہاں اٹھایا جاسکتا ہے کہ کیا ہندوستان کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے الیکشن میں حصہ لینے سے اس کے سیکولر جمہوری نظام کو جائز اور برحق ماننا لازم نہیں آتا۔ اگر آتا ہے تو پھر کیا یہ ہمارے عقیدے کے خلاف نہ ہوگا؟
>
> میں عرض کروں گا کہ اگر ہم اس نظام کے سیکولر کردار اور اس کے حاکمیت جمہور کے نظریے پر اپنی اصولی تنقید کرتے رہیں اور اس نظام کو چلانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت اور انہیں غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لئے الیکشن میں حصہ لیں یا الیکشن کے عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں تو اس کی وجہ سے اس ملک کے سیکولر جمہوری نظام کو جائز و برحق تسلیم کرنا لازم نہیں آئے گا۔''

یہاں ڈاکٹر صاحب نے گویا سیکولر جمہوری نظام کی حمایت اور تائید کو غلط تسلیم کرلیا ہے اور صحیح بات یہ ہے کہ اس کے علاوہ ان کیلئے کوئی راستہ نہیں ہے لیکن موصوف نے صفائی دی ہے کہ ہم دل سے اس نظام کے جائز و برحق ہونے کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ہماری تائید عقیدہ کے خلاف نہیں ہوگی۔ اس موقع پر ہم عرض کریں گے۔ یقیناً آپ کی یہ بات صحیح ہے اگر دل سے اس کو کوئی جائز اور برحق مانے گا تو اس کیلئے دائرہ اسلام سے باہر ہونے کا اندیشہ ہے مگر عقیدہ کے خلاف عملی مظاہرہ کرنا کفر نہیں تو دائرۂ فسق میں چلے جانے کا ڈر تو بہر حال موجود ہے۔ سوچئے کیا یہ معمولی بات ہے جس کے دل میں اللہ کا ذرہ برابر تقویٰ ہوگا وہ اس تصور سے کانپ نہیں جائے گا۔

سورۃ النساء آیت ۶۰ میں طاغوت سے کفر کرنے اور سورۃ النحل آیت ۳۶ میں طاغوت سے اجتناب کرنے کی بات صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ اس روشنی میں اگر کوئی طاغوتی نظام کو دل سے جائز اور برحق نہیں مانتا لیکن اس کی اطاعت کرتا ہے اس سے اجتناب نہیں کرتا تو گویا ایک حکم کو بجالایا اور دوسرے حکم کی خلاف ورزی کی۔

دین میں اس طرز عمل کی کیا حیثیت ہے سب کو معلوم ہے اس کے بیان کی ضرورت نہیں اس عمل کی سنگینی یوں اور کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ یہاں نہ صرف یہ کہ اجتناب کے بجائے اتصال اور قربت کو اپنایا جا رہا ہے بلکہ طاغوت سے اتصال اور قربت کیلئے مہم چلائی جاتی ہے جس کے قتال فی سبیل الطاغوت کا ہم معنی بن جانے کا اندیشہ ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ. (النساء:٧٦)

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ اللہ کے راستہ میں قتال کرتے ہیں اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ طاغوت کے راستہ میں قتال کرتے ہیں۔

پھر ایک اور پہلو سے معاملہ کو دیکھئے اپنے نفس کو کوئی شخص بھی دل سے نہیں مانتا لیکن نفس کی مطلق اطاعت کو کتنا بڑا جرم بتایا گیا ہے! اس رخ سے ہم دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سیکولر جمہوری نظام کو خواہ جائز اور حق نہ مانا جاتا ہو مگر اس کے قیام و بقاء اور پھر اس کی تابعداری کرنے اور کرانے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہو تو یہ کتنا بڑا سنگین گناہ ہو جاتا ہے اس معاملہ کو اس آیت قرآنی کی روشنی میں دیکھئے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا. (الفرقان:٤٣)

ترجمہ: کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟

انصاری صاحب کا اعتراف

''سیکولر جمہوری نظام پر ہماری تنقید اصلاً دو نکتوں پر ہے ایک یہ کہ اس نظام میں تمام اجتماعی امور جو ریاست کے دائرہ میں آتے ہیں، خدا کی ہدایت سے آزاد ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس نظام میں حاکمیت خدا کی نہیں انسانوں کی ہوتی ہے۔ درآں حالیکہ اس زمین میں انسان کا مقام حاکم کا نہیں خدا کے خلیفہ یا نائب کا ہے۔ یہ بات ہمارے لٹریچر میں بھی کہی گئی ہے اور ہماری شوریٰ کی قراردادوں میں بھی ہے۔ ہمیں احساس ہے کہ ہندوستان کے سیکولر نظام کے کچھ محاسن بھی ہیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے اور جن کی بناء پر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس نظام کی جگہ دوسرا نظام نہ آئے، جس کی بناء پر ہندو مذہب اور ہندو کلچر کا غلبہ ہو اور جس کا کردار جمہوری کے بجائے آمرانہ اور فسطائی ہو، لیکن سیکولر جمہوری نظام پر ہماری اصولی تنقید کی روشنی میں ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم اس نظام کو جائز اور صحیح قرار دیں اور اس کو چلانے کے لئے اس کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیں۔ ایسا کرنا ہماری بنیادی فکر اور ہمارے عقیدۂ توحید کے خلاف ہوگا۔ اسی بات کی صراحت ہمارے لٹریچر نے بھی کی ہے اور شوریٰ کی روداد میں بھی اس موقف کا اعادہ دوٹوک الفاظ میں کیا گیا ہے۔

البتہ جو بات شوریٰ کے زیر بحث رہی ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہندوستان میں ایسے حالات ہیں یا پیدا ہو سکتے ہیں

جن میں ہم ہندوستانی نظام کو چلانے کیلئے نہیں، صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت کے لئے یا اسلام اور مسلمانوں کو غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لئے الیکشن میں حصہ لے سکیں یا انتخابی عمل کو متاثر کرنے کی کوشش کریں؟؟''

تحریک کی عمارت کو منہدم مت کیجئے

اس اقتباس میں ڈاکٹر صاحب نے صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کو جائز اور حق ماننا اور اس کو چلانے کے لئے پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینا ہماری بنیادی فکر اور ہمارے عقیدۂ توحید کے خلاف ہے۔ اس سیاق میں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہی اصل سوال ہے کہ کیا مفادات کی حفاظت اور نقصانات سے بچنے کے لئے بنیادی فکر کو چھوڑا جا سکتا ہے اور اپنے عقیدۂ توحید کی خلاف ورزی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب کتاب وسنت کی روشنی میں تلاش کیا جائے۔ ساری بحث کا دارومدار اسی جواب پر ہوگا۔ عقیدہ کے خلاف یعنی کلمۂ کفر زبان پر لانے کی رخصت دی گئی ہے۔ لیکن کسی خاص حالت میں۔ مستقل طور پر کلمۂ کفر زبان سے ادا کیا جاتا رہے یا اعمال شرکیہ کا ارتکاب کیا جاتا رہے اس کی گنجائش شرعی طور پر کہیں سے نہیں ملتی۔

اب سوچئے کہ آپ اپنی بنیادی فکر اور عقیدہ کو پس پشت ڈال کر کچھ مفادات کے پیچھے پڑ جائیں گے تو آپ کے پاس رہ کیا جائے گا۔ اس طرح کی کسی رخصت سے کوئی فرد فائدہ اٹھا کر پھر اصل عزیمت پر آ سکتا ہے؟!! لیکن کسی گروہ کا رخصت کی راہ پر پڑ جانے کے بعد تقریباً مشکل ہے کہ دوبارہ اصل راہ پر واپس آ جائے۔ پھر غور فرمایئے ابھی وہ کون سی آفت اور آزمائش ہے کہ ہم اس رخصت پر عمل کرنے کی سوچ رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے تحریک کی عمارت منہدم کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''خلاصہ یہ کہ ہندوستان کے سیکولر جمہوری نظام کی پارلیمنٹ اور اسمبلی کے انتخابات میں اگر اس نظام کو چلانے کے بجائے صرف اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت اور غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لئے حصہ لیا جائے تو اس سے نظام کا جائز و برحق ماننا لازم نہیں آتا۔''

''اب یہ سوال کیا کہ ہندوستان کے حالات ایسے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کی حفاظت یا انہیں غیر معمولی نقصانات سے بچانے کے لئے انتخابات میں حصہ لینا چاہئے۔ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس میں فیصلہ جماعت اسلامی کی حد تک اس کی وہی ہیئت کرے گا جو اس کے دستور کے مطابق ایسے فیصلے کرنے کی مجاز ہے۔ یعنی جماعت کی شوریٰ اور بعض حالات میں نمائندگان۔ یہ کام نہ رکن کے کرنے کا ہے نہ کسی مقامی یا حلقے کی جماعت کا۔''

یہ صحیح ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے سے سیکولر جمہوری نظام کو جائز و برحق ماننا لازم نہیں آتا۔ بشرطیکہ اس کا سب کو شعور ہو، اور لوگوں کو بتایا جائے کہ یہ نظام کافرانہ نظام ہے اور اس کو چلانے کی کوشش کرنا عقیدہ کے خلاف ہے۔ پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ کچھ مفادات کے حصول کے لئے اور کچھ نقصانات سے بچنے کے لئے عقیدہ کے خلاف عمل کرنے کی اجازت کی شرعی نوعیت کیا ہے وہ بھی جب کہ اجتماعی طور پر عقیدہ کے خلاف مظاہرہ کیا جائے؟ اس نقطہ نظر سے آپ سوچیں گے تو اس کو اضطراری حالت کہہ سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں اجتہادی مسئلہ جو کچھ رہ جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ کیا ہم ایسے حالات سے گزر رہے ہیں جن میں کلمۂ کفر زبان سے ادا کرنا جائز ہو جاتا ہے۔

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس حالت میں کلمۂ کفر زبان پر لانا جائز ہوتا ہے کیا اس حالت میں کفر کی دعوت دینا یا نظام کفر کے قیام و بقاء کے لئے مہم چلانا بھی جائز ہے؟ اس لئے کہ یہاں سیکولر جمہوری نظام کے قیام و بقاء کے لئے صرف ووٹ ہی نہیں دیا جاتا ہے بلکہ اس کے لئے عوام الناس کے اندر مہم چلائی جاتی ہے۔

اجتہادی مسئلہ وہ ہوتا ہے جس کے بارے میں کتاب وسنت سے بصراحت کوئی حکم معلوم نہیں ہوتا۔

سیکولر جمہوری نظام طاغوتی اور کافرانہ نظام ہے وہ ڈاکٹر صاحب کی بحث کے بعد کوئی مختلف فیہ مسئلہ اب ہمارے درمیان نہیں رہا۔ پھر بھی "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" اور "فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ" جیسی آیات دلیل کے لئے کافی ہیں۔

طاغوت اور طاغوتی نظام کے ساتھ کفر کرنے اور اس سے اجتناب کا مسئلہ بھی سورۃ النساء آیت ۶۰ اور سورۃ النحل آیت ۳۶ کی روشنی میں، نہ مختلف فیہ ہے اور نہ اجتہادی مسئلہ ہے۔

اسی طرح مسرفین، کافرین اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت سے آزاد نظام کی اطاعت سورۃ الشعراء آیت ۱۵۱، سورۃ النساء آیت ۵۹، سورۂ محمد آیت ۲۶، سورۃ آل عمران آیت ۱۴۹ اور سورۃ الفرقان آیت ۵۲ کی روشنی میں ممنوع اور حرام ہے۔ ان قرآنی دلائل کے بعد یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ سیکولر جمہوری نظام کے قیام و بقاء کے لئے ووٹ دینا اور اس کے واسطے مہم چلانا ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور اس کا تعلق عقیدہ سے نہیں بلکہ حکمت عملی سے ہے جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا۔

اجتہادی مسئلہ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ کیا ہماری حالت حالت اضطرار ہے؟ جس میں کلمۂ کفر زبان پر لانا اور مردار کھانا جائز ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مسئلہ کا کوئی جز بھی اجتہادی نہیں ہے ہر جزء سے متعلق قرآن کی نص موجود ہے۔ اگر یہ اجتہادی مسئلہ ہے تو ترو پتی، بنارس، ہردوار اور متھرا میں جو مشرکانہ مراسم ادا کئے جاتے ہیں

ان کے مشرکانہ ہونے کے لئے نص قطعی نہیں پیش کی جاسکتی۔ پھر ہندوستان میں بت پرستی بھی ایک اجتہادی مسئلہ بن جائے گا۔

مجلس شوریٰ کی حیثیت

رہا یہ سوال کہ اجتہادی مسئلہ میں فیصلہ کون کرے گا؟ بڑا اہم سوال ہے۔ آپ خود فرمائیں کہ مجلس شوریٰ کے ارکان کے انتخاب میں دستوری اعتبار سے صرف یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ موجودہ ارکان جماعت میں کون نسبتاً تقویٰ، اخلاص، فہم وفراست میں بہتر ہے۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کے اندر شرعی اجتہاد کرنے کے شرائط ہیں۔ یہ بڑی زیادتی اور بھیانک غلطی ہوگی کہ جو باڈی محض جماعتی مشنری اور نظم چلانے کے لئے منتخب کی جاتی ہے اس کے ذمہ اجتہاد اور استنباط کا کام سونپ دیا جائے۔ جبکہ روزمرہ کے صوم وصلوٰۃ اور زکوٰۃ وحج سے متعلق مسائل میں بھی ارکان شوریٰ کی طرف رجوع کرنا عموماً مناسب نہیں سمجھا جاتا اور نہ وہ خود اپنے کو اس کا اہل سمجھتے ہیں چہ جائے کہ کسی اجتہادی مسئلہ میں ان پر بھروسہ کیا جائے۔ اجتہاد اور استنباط کے لئے علماء اور فقہاء نے کئی شرائط بتائی ہیں جن میں کم از کم ان کے اندر راست کتاب وسنت سے استفادہ کی صلاحیت کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مفسرین کی تفاسیر، شارحین حدیث کی شروح، فقہاء مجتہدین اور اصولیین کے اصولی مباحث اور تفریعات پر ان کی نظر ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ جن اموراور مسائل میں کتاب وسنت کی کوئی نص نہ ملے ان میں مجلس شوریٰ کسی ایسی ہیئت یا مجلس کی طرف رجوع کرے جس کے ارکان شرائط اجتہاد واستنباط کو ملحوظ رکھتے ہوئے منتخب کئے گئے ہوں۔ جماعت کی مجلس شوریٰ کو مجلس افتاء کا درجہ دینا اور اس کی طرف کسی اجتہادی مسئلہ میں رجوع کرنا اور اس کے فیصلہ کو شرعی حیثیت دینا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے مسائل نماز میں مسجد کی کمیٹی کو اصل قرار دیا جائے اور علماء کی طرف رجوع کی ضرورت نہ سمجھی جائے۔

علماء کا معاملہ

ووٹ دینا عقیدہ کے خلاف ہے اس کی تائید میں مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ، مولانا صدر الدین اصلاحیؒ، مولانا سید حامد علیؒ اور مولانا عروج قادریؒ کی رائیں موجود ہیں۔ ان کے مقابلہ میں کسی قابل ذکر معتبر عالم رکن شوریٰ کی رائے منظر پر ابتک نہیں آئی ہے۔

تحریکِ اسلامی کا مرکزی نکتہ کیا ہے

انحراف کی دو علامتیں

''زندگیٔ نو" جولائی ۹۸ء میں برادر محترم ریاض احمد صاحب کا ایک مضمون ''دعوتِ اسلامی کے مراحل'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ عنوان اور مضمون میں باہمی کیا تعلق ہے مضمون کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہندوستان میں تحریک اسلامی کے دو فیصلوں کے لئے دلیل فراہم کی جائے۔ ایک موجودہ الیکشنی سیاست میں اس فارمولہ کے ساتھ شریک ہونا کہ سیکولر گروپوں کی تائید میں ووٹ دیا جائے اور عام ہندوستانی باشندوں کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستان کے سیکولر جمہوریت کا تحفظ انتہائی ضروری ہے ورنہ ملک کی سلامتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ دوسرا فیصلہ فورم برائے جمہوریت کا قیام ہے جس کا مقصد ہندوستانی جمہوریت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ملک کی تعمیر دستور ہند کے مطابق کرنی ہے۔ یہ دونوں فیصلے اس بات کی بڑی علامت بن گئے ہیں کہ تحریک اسلامی ہندوستان میں اپنے محور سے ہٹ چکی ہے اور کتاب وسنت اور خود اپنے دستور سے انحراف کر رہی ہے۔

ہمارے دوستوں کی الجھن

ریاض احمد صاحب کا مضمون دراصل اسی تاثر کو ختم کرنے کی غرض سے لکھا گیا ہے اس مقصد کے لئے کئی لوگوں نے نت نئی دور دور کی کوڑی لانے کی کوشش کی ہے لیکن کوئی کوڑی اور کوئی گونٹی جمتی ہوئی نظر نہیں آتی بلکہ ایک ہی بات کو ثابت کرنے کے لئے لکھنے والے ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ بعض دوستوں نے بڑے طمطراق سے کہا کہ مولانا مودودیؒ کا ایک اجتہاد تھا اور اب یہ ہمارا اجتہاد ہے مگر یہ بات چل نہ سکی۔ اس لئے کہ مولانا مودودیؒ کا اجتہاد کتاب وسنت کی روشنی میں تھا اور ہمارے ان دوستوں کے اجتہاد کی کوئی شرعی بنیاد نہیں تھی۔ اور نہ انہوں نے اجتہادی اصولوں کی رعایت ملحوظ رکھی تھی۔ ان کا سارا سرمایہ کچھ صحافیوں کے تبصرے اور کچھ تجزیہ نگاروں کی نگارشات تھیں۔

اسی طرح بعض لوگوں نے سیکولرزم اور جمہوریت کی تشریح اور تعبیر اس انداز سے شروع کی کہ گویا انہوں نے بڑا تیر مارا ہے یہ ثابت کر کے کہ سیکولر جمہوریت اور اسلام میں کوئی ٹکراؤ کی بات نہیں ہے مگر یہ دلیل بھی اپنا کوئی اثر دکھاتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ باہر کے لوگ کہنے لگے اب جماعت اسلامی قومی ڈگر پر آرہی ہے اور اندر کے لوگوں نے کہا کہ اب تو ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے پچاس برس پہلے نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمانوں نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اندر اور باہر کی اس آواز کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس پس منظر میں ہمارے بعض انتہائی مخلص حضرات نے سیکولر جمہوریت کی اصلیت اور حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے نئے انداز سے اپنی بات پیش کرنے کی کوشش کی ہے انہیں میں برادر محترم ریاض احمد صاحب ہیں۔لیکن ذرا بھی غور وفکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ محترم نے اپنے مقدمہ کو مضبوط تو نہیں کیا البتہ اپنے کئی ہمنواؤں کے دلائل کو رد کر دیا ہے۔

باطل کی زمرہ بندی

ریاض احمد صاحب لکھتے ہیں:

''قرآن کریم میں انبیائے کرام کی بعثت اور دعوت کے بنیادی اور مرکزی نکتے کو یوں واضح کیا گیا ہے۔''

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل:٣٦)

ترجمہ: ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سب کو خبردار کیا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (ھود:٥٠)

ترجمہ: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو اس کے سواء تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔

اللہ کی عبادت کرنے اور طاغوت کی عبادت واطاعت سے بچنے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اہل ایمان اللہ، اس کے رسول اور اس کی کتاب کی اتباع کریں اور اس کے علاوہ کسی اور طریقے پر نہ چلیں۔ اپنے باہمی اختلافات کے فیصلے اور مسائل کے حل کے لئے اللہ کی کتاب کی طرف رجوع کریں۔ اس پر راضی ومطمئن رہیں، پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے بچیں۔ جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے یوں دیا ہے:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (الاعراف:٣)

ترجمہ: لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے، اس کی پیروی کرو اور اپنے رب کو چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ (الشوریٰ:۱۰)

ترجمہ: تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ (البقرۃ:۲۰۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو، کیوں کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

قرآن کے درج بالا احکام کا واضح تقاضہ یہ ہے کہ اللہ کا پسندیدہ دین اسلام عملاً اس دنیا میں نافذ و جاری ہو۔ کیوں کہ اس کی اقامت و نفاذ کے بغیر اس دنیا میں اللہ کی کامل عبادت و اطاعت اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے مکمل اجتناب ناممکن ہے۔ اعتقاداً اور اصولاً اللہ کی عبادت و اطاعت کا اقرار اور طاغوت کی عبادت و اطاعت سے انکار تو ہر وقت، ہر جگہ اور ہر حالت میں ممکن ہے لیکن عملی دنیا میں طاغوت کی اطاعت سے مکمل آزادی اور نجات، اقامت دین اور غلبۂ دین کے بغیر ممکن نہیں اور یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کسی بھی ملک یا جگہ پر اقامت دین، غلبہ دین کی جدوجہد اور دعوت کے عملاً شروع ہوتے ہی دین غالب نہیں ہو جاتا بلکہ دعوت کی ابتداء اور دین کے بالفعل قیام میں ایک مدت اور وقفہ لازماً درکار ہوتا ہے اور اس درمیانی مدت اور وقفے میں سرزمین دعوت پر کوئی نہ کوئی باطل یا غیر اسلام کا غلبہ ہوتا ہے اور داعی کو غلبۂ دین کی جدوجہد کا آغاز نظام باطل کے غلبہ کے تحت اور اس کی دی ہوئی رعایتوں اور سہولتوں میں رہ کر ہی کرنا پڑتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ حق متعدد شکلوں کا نہیں بلکہ ایک ہوتا ہے۔ لیکن حق کے مقابلے میں باطل کی ہزاروں شکلیں صرف ممکن نہیں بلکہ عملاً یا بالفعل دنیا میں پائی بھی جاتی ہیں اور ان مختلف قسم کے باطل نظاموں میں دعوت اسلامی کے نقطۂ نظر سے کوئی نوے فیصد باطل ہوگا، کوئی پچاس فیصد، کوئی دس فیصد اور کوئی اس سے بھی کم۔ نظری اور اصولی حیثیت سے باطل کی یہ تمام قسمیں داعی کی نظر میں طاغوت اور باطل کے حکم میں داخل و شامل ہیں اور ان سب کو مٹانا اور ان کی جگہ پر دین اسلام کا قیام ہی اس دنیا میں داعی کا مقصد اور نصب العین ہے''۔

ریاض احمد صاحب کی پیش کردہ آیات پر غور

اس پوری عبارت پر غور کیجئے۔ پہلی آیت ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا'' میں اللہ تعالیٰ نے دو حکم فرمائے ہیں اول یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور دوسرا حکم ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرو۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکم ایک ہی ہے جسے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ طاغوت سے اجتناب عبادت الٰہی کا ایک جزء ہے جیسے کلمۂ توحید منفی اور مثبت دو باتوں سے مکمل ہوتا ہے اور لا الہ الا اللہ میں سے کسی ایک جزء کا بھی انکار کرنے والا

توحید پرست نہیں کہا جائے گا اسی طرح عبادت الٰہی اور اجتناب طاغوت میں سے کسی ایک جزء کو بھی نظر انداز کرنے والا شخص فرمان الٰہی کا ماننے والا اور انبیائی دعوت کا علمبردار نہیں کہا جاسکتا۔ کوئی فرد یا گروہ عبادت الٰہی کا دعویٰ کرے اور ساتھ ہی طاغوت سے اجتناب کرنے کے بجائے طاغوت سے وابستہ ہو اور نظام طاغوت کا حامی، مؤید اور شریک ہو تو اس کی عبادت میں نقص ہوگا اور اسے خالص نہیں کہا جاسکے گا بلکہ دو دو چار کی طرح یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نے انبیائی مشن اور مقصد کے بنیادی اور مرکزی نکتہ سے اپنی نظر ہٹالی ہے۔ طاغوت کیا ہے اور کیا نہیں اس میں اختلاف ہوسکتا ہے؟ لیکن اس امر میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنا اللہ تعالیٰ کا ایک اہم حکم ہے اور انبیائی دعوت کا ایک جزء نہیں بلکہ نصف جزء ہے۔ حکمت عملی اور طریقہ کار کا حصہ نہیں ہے کہ کوئی کہے کہ طاغوت سے اجتناب کرنے کے بجائے حکمت عملی کے تحت طاغوت سے وابستہ ہونا خاص حالات کے پیش نظر ضروری ہے۔ طاغوت سے اجتناب کا حکم قرآن یعنی دلیل قطعی سے ثابت ہے۔ اس لئے اس کا تعلق حکمت عملی سے نہیں، عقیدہ سے ہے۔ اس پر صرف عمل کرنا فرض نہیں ہے بلکہ اس کو دل سے ماننا اور تسلیم کرنا بھی ضروری ہے۔

اب اگر آپ سیکولر جمہوری نظام کو طاغوت سمجھتے ہیں تو آپ کو اس سوال کا جواب دینا ہوگا کہ موجودہ الیکشنی سیاست میں داخل ہوکر کسی امیدوار کو ووٹ دینا اور طاغوتی نظام کی تشکیل میں حصہ لینا کیونکر جائز ہوگا اور آپ کا یہ دعویٰ کیسے صحیح ہوگا کہ ہم قرآن کے خلاف نہیں جارہے ہیں؟ طاغوت سے اجتناب کا حکم دلیل قطعی سے ثابت ہے اس لئے اس کے خلاف طرز فکر و عمل اختیار کرنے کے لئے ''دلیل قطعی'' قرآن سے دلیل لانی پڑے گی۔ قرآن کے صریح اور واضح حکم کے مقابلہ میں قرآن کے علاوہ کوئی دوسری دلیل استدلال کی دنیا میں مانی نہیں جاتی ہے قرآن کے مقابلہ میں تاریخ وسیر کے واقعات نہیں پیش کئے جاسکتے کیونکہ ان میں بہت سارے احتمالات ہوسکتے ہیں اور قرآن کا بیان احتمالات سے پاک ہے۔

طاغوت سے اجتناب کا حکم جان لینے کے بعد یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ اجتناب کا کیا مفہوم ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر اجتناب کا لفظ آیا ہے ان کو دیکھنے سے اجتناب کا مفہوم اور مطلب بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً سورۃ المائدہ آیت ۹ میں شراب اور جوّا کو ''رِجۡسٌ مِّنۡ عَمَلِ الشَّيۡطٰنِ'' کہا گیا ہے پھر حکم دیا گیا اس سے اجتناب کرو۔ اسی لئے شراب کا بیچنا، خریدنا، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کو لانا اور لے جانا وغیرہ ساری چیزیں ممنوع قرار پائی ہیں اس حکم کے بعد کوئی شخص شراب خانہ اور جوا خانہ تعمیر کرے یا کرائے اور اس کے نظم و نسق کو چلانے میں مدد و معاون بن کر حصہ لے تو کیا آپ اس کے جواز کا فتویٰ دیں گے؟ اگر شراب خانہ اور

جوا خانہ چلانے کی گنجائش نہیں ہے تو طاغوت خانہ بنانے اور چلانے کی گنجائش کہاں سے پیدا ہوتی ہے! جبکہ شراب اور طاغوت دونوں سے دور رہنے کے لئے ایک ہی لفظ اور صیغہ "فَاجْتَنِبُوْهُ" استعمال ہوا ہے اور جس طرح شراب سے اجتناب کا حکم صریح ہے اسی طرح طاغوت سے اجتناب کا حکم بھی صریح ہے نہ کسی تاویل کی گنجائش ہے اور نہ کسی توجیہ کی۔

لہٰذا شراب اور طاغوت میں فرق نہیں ہوسکتا۔ یہ کہنا کہ ہر باطل اور ہر طاغوت برابر نہیں ہوتا اور سب کے ساتھ یکساں برتاؤ نہیں کیا جاسکتا بالکل درست ہے آپ سب سے اجتناب کرنے میں برابری نہ کیجئے لیکن اجتناب کو اتصال سے بدل تو نہیں سکتے اس کا جواز کہاں سے لائیں گے کہ طواغیت میں سے کسی طاغوت کے ساتھ اجتناب کے بجائے اتصال، قربت اور دوستی کا رویہ اپنالیں۔ اجتناب کے لئے قرآنی آیت موجود ہے اتصال کے لئے بھی قرآن میں کوئی آیت تلاش کرنی پڑے گی۔ اجتناب کی کیفیت اور کمیت میں فرق ہوسکتا ہے لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ اجتناب کے بجائے اتصال پیدا کرلیا جائے اور پھر دعویٰ ہو، اتباع قرآن کا۔

ریاض احمد صاحب کی پیش کردہ دوسری آیت میں عبادت اور الٰہ کے الفاظ پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلی آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہی بات اس آیت میں بھی کہی گئی ہے یعنی اللہ کی عبادت کا حکم اور غیر اللہ کی بندگی اور غلامی کی نفی۔

تیسری آیت

اسی طرح تیسری آیت "اِتَّبِعُوْا" میں اللہ کی نازل کردہ شریعت کی اتباع کا حکم ہے جس کا مفہوم بالکل واضح ہے دوسرا حکم اللہ کے علاوہ دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرنے کا حکم ہے۔ اس کی صورت اس کے سواء کیا ہوگی کہ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر غیر اللہ کے بنائے ہوئے دستور اور قانون کی پیروی نہ کی جائے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے ضابطۂ حیات اور رسول خدا کی سنت کی موجودگی میں دنیا کے کسی بھی ضابطہ اور قانون کی پابندی اختیار کرنے کے معنی اللہ کے علاوہ دوسروں کو اولیاء بنانا اور ان کی اتباع اور پیروی کرنا ہے اسی روشنی میں اگر یہ کہا جائے کہ قانون ساز اداروں کی تشکیل اور ان کے ممبران کا انتخاب کرنا اللہ کے علاوہ دوسروں کو اولیاء بنانا ان کی اتباع اور پیروی ہے جس سے قرآن نے صراحت کے ساتھ منع کیا ہے تو اس کا انکار آپ کیونکر کرسکتے ہیں۔ انہیں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر بانی تحریک نے لکھا تھا۔

> ''اس نظریہ سے ہٹ کر اول الذکر جمہوری نظریے کو قبول کرنا گویا عقیدۂ توحید سے منحرف ہوجانا ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹ موجودہ زمانہ کے جمہوری اصولوں پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لئے ووٹ دینا حرام ہے۔'' (رسائل ومسائل، اول، صفحہ ۳۰۷)

مزید تفصیل کے لئے اسی کتاب میں صفحہ ۳۴۵ پر پڑھئے ''جماعتِ اسلامی کا مسلک''۔

خطوات شیطان

''اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً'' والی آیت کو دیکھئے دین میں پورے کے پورے داخل ہونے اور شیطان کے خطوات کی پیروی نہ کرنے دو باتوں کا حکم دیا گیا ہے دین میں پورے کا پورا داخل ہونے کی صورت کیا ہے اور اس کا تقاضہ کیا ہے اسی طرح خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کیا ہیں جن کی پیروی سے منع کیا گیا ہے؟

شریعت الٰہی کے علاوہ دنیا کے طور طریقے، قانون اور دستور کے علاوہ وہ کونسی چیزیں ہیں جو خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ہوں گی۔ پھر خدا اور رسول سے بے نیاز ہو کر ضوابط وقوانین بنانے والے کیا شیطان نہیں ہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ اس کا جواب نفی میں نہیں دیا جاسکتا اب بتائیے کہ شیطان اور خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور آپ اپنی اسمبلی، پارلیمنٹ اور اپنے امیدواروں کو کس بنیاد پر اس دائرے کے باہر نکال سکیں گے اور پھر آپ ووٹ دے کر کس طرح دین میں پورے کے پورے داخل ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور کیونکر خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ کی اتباع کرنے کے الزام سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔ بڑا ہی نازک مقام ہے ذرا سوچئے ہمیں خدا کے سامنے اس الزام سے بچنا ہے۔

اس طرح ذرا گہرائی میں جائیں تو ریاض احمد صاحب کی ساری باتوں کی تردید کے لئے صرف یہ آیت کافی ہے جناب نے باطل اور طاغوت کی نوے فیصد اور دس فیصد کی جو تقسیم کی ہے وہ اس آیت کی روشنی میں بے فائدہ ہو جاتی ہے۔ یہ آیت اعلان کرتی ہے کہ تم پورے کے پورے دین میں داخل ہو جاؤ۔ نوے فیصد طاغوت کو بھی چھوڑو اور دس فیصد طاغوت کو بھی چھوڑ دو۔ بڑے بت کی پوجا بھی ترک کرو اور چھوٹے بت کی پوجا سے بھی باز رہو۔ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیے، اگر کوئی شخص نوے فیصد طاغوت سے کفر اور اجتناب کرتا ہے لیکن دس فیصد طاغوت پر ایمان رکھتا ہے اور اس سے اجتناب کے بجائے اس کو سینے سے لگاتا ہے تو کیا وہ ''اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً'' کا قرآنی مطالبہ پورا کرتا ہے یا اس کو ٹھکرا رہا ہے اور کیا وہ ''تُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضٍ وَّتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ'' کا اپنے آپ کو مصداق نہیں بنا رہا ہے؟؟

ریاض احمد صاحب نے مذکورہ بالا تحریر میں ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے کہ ''اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً'' کا حکم کس دور کیلئے ہے؟ غلبہ دین کے دور کیلئے ہے یا غلبہ دین سے پہلے والے دور میں بھی یہ حکم لاگو ہوگا؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ حکم غلبۂ دین کی صورت حال کے لئے ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ آج کے دور میں اجتناب طاغوت کا حکم کالعدم ہو جائے گا اور جو لوگ دین میں پورے کے پورے داخل ہونے اور طاغوت سے اجتناب کی رٹ

لگائے ہوئے ہیں ان کی سوچ غلط ہے اور ان کی تحریک بے بنیاد تحریک ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ حکم ہر زمانہ ہر حالت کے لئے ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ طاغوت سے کفر اور اجتناب کرنے کے بجائے آپ طاغوت سے اتصال، وابستگی اور طاغوت کی تائید وحمایت کی مہم چلانے کی بات کہاں سے لا رہے ہیں۔ تعجب ہے برسہا برس سے تحریک اسلامی سے وابستہ لوگ اس حد تک تضاد فکری کے شکار ہو چکے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں!

تضاد کی مثال

دین حق کے سواء سارے ادیان اور نظامہائے زندگی کو باطل اور سراسر غلط ماننا اور کہنا ان سب کو مٹانا اور ان کی جگہ دین اسلام کا قیام ہی اس دنیا میں داعی کا مقصد اور نصب العین قرار دینا ایک طرف اور دوسری طرف باطل کی بعض قسموں کو تحفظ دینے اور برسر اقتدار لانے کے لئے جد و جہد اور مہم چلانا۔ کیا دونوں میں تضاد نہیں ہے اور کیا یہ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں؟ اسی عملی دشواری کی وجہ سے سیکولر جمہوریت کے تحفظ اور بقاء کی مہم کے دوران آپ کو کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے لئے یہی باطل ''سیکولر جمہوریت'' موزوں نظام ہے اور ہندوستان کی سلامتی اس کے بغیر باقی نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے خلاف موقف اختیار کرنے کا مطلب ایسا ہی ہوتا ہے کہ جیسے کوئی کہے کہ دیکھو یہ زہریلا سانپ ہے اور پھر دوسرے لمحہ میں کہے کہ اس کو گود میں رکھ لو ورنہ مر جاؤ گے تو ظاہر ہے اس طرح کی متضاد باتیں کوئی سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا اور کہنے والے کو پاگل سمجھے گا اسی بناء پر الیکشن کے زمانہ میں بیداری کی مہم چلانے کے دوران ہماری طرف سے یہ نہیں کہا جاتا کہ اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر اور رہتی دنیا کے لئے نظام زندگی ہے اور دنیا اور آخرت کی فلاح اور کامرانی بلا قید زمان ومکان اسلام میں ہے بلکہ یہ کہا جاتا ہے کہ سیکولرزم کے علاوہ ملک کے لئے اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے کوئی راہ نجات نہیں ہے۔

باطل کی مختلف قسموں کے درمیان فرق کرنے کا جہاں تک سوال ہے اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے اور ہونی چاہئے کہ جو نوے فیصد باطل ہے اس کو دفع کرنے کے لئے نوے فیصد اپنی قوت لگائی جائے اور جو دس فیصد باطل ہے اس کو توڑنے کے لئے دس فیصد قوت صرف کی جائے۔ یعنی بڑے بت پر بڑی کلہاڑی سے وار کیا جائے اور چھوٹے بت کو توڑنے کے لئے چھوٹی کلہاڑی استعمال کی جائے۔ لیکن اس طرح کا فرق کرنا کہ بڑے بت کی پوجا نہ کی جائے مگر چھوٹے بت کو تحفظ دیا جائے اور اس کے سامنے سجدہ روا رکھا جائے اور کہا جائے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ حالات کے پیش نظر ایسا کرنا ضروری ہے۔ غرض یہ کہ اس طرح کا فرق کرنا جس طرح بڑے اور چھوٹے بت کے درمیان غلط ہے جس کے لئے انبیائی تاریخ سے کوئی دلیل لائی نہیں جاسکتی۔ اسی طرح بڑے اور چھوٹے طاغوت کے درمیان فرق کرنا غلط اور بے بنیاد بات ہے۔

قرآن نے طاغوت سے اجتناب کا حکم بلاتفریق دیا ہے اس لئے جس طرح صنم پرستی خلاف توحید ہے خواہ بت بڑا ہو یا چھوٹا اسی طرح طاغوت کا اقرار اور اس سے وابستگی منافی ایمان ہے خواہ طاغوت نوے فیصد کا ہو یا دس فیصد کا۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ دس فیصد طاغوت سے وابستگی کے لئے صرف جواز کے ہی لئے کوشش نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس وابستگی کو تقاضائے ایمان اور تقاضائے عقل و بصیرت ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے اگر آپ جس طرح طاغوت سے اجتناب کے لئے قرآن کی آیت پیش کرتے ہیں طاغوت سے وابستگی اور طاغوتی نظام کے قیام و بقاء کے لئے بھی کوئی قرآنی آیت تلاش کر کے پیش کر دیں۔

چھوٹا اور بڑا باطل

ریاض احمد صاحب لکھتے ہیں:

''چنانچہ داعی اپنے مقصد و نصب العین کی نظری و اصولی وضاحت کے وقت بلاتفریق اگر طاغوت کی ان سب اقسام کے باطل اور برسر غلط ہونے کا اعلان کرتا ہے تو وہیں قیام دین کی عملی جدوجہد کے وقت، عملی نقطۂ نظر سے ان مختلف اقسام کے باطل کے درمیان فرق کرنا اس کے لئے لازمی و ناگزیر ہوتا ہے۔ کیونکہ عمل اور معاملے کے لحاظ سے ان سب کو ایک درجہ میں رکھنا اور سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا حکمت دعوت کے لحاظ سے غلط اور غلبۂ دین کے امکانات کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ اس لئے آج کے حالات میں، تحریک اسلامی کا تمام باطل نظاموں کو عملی معاملے کے لحاظ سے ایک درجہ میں رکھنا انبیائے کرام کی دعوت اور طریقہ کار کا ناقص مطالعہ، فہم دین کی کمی اور بے بصیرتی کا مظہر ہوگا۔''

ہم کہتے ہیں کہ صرف یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ فرق کرنا لازمی اور ناگزیر ہے اور فرق نہ کرنا فہم دین کی کمی اور بے بصیرتی کا مظہر ہے بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کے مطلق حکم کو مقید کرنے کی کوئی شرعی دلیل پیش کی جائے اور بتایا جائے کہ بڑے اور چھوٹے بت اور طاغوت میں فرق کرنا قرآن سے ثابت ہے۔

ہماری بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے نجاست کی مثال سامنے رکھئے۔ نجاست اور نجاست کے درمیان کچھ شرعی بنیادوں پر فرق کیا جاتا ہے چنانچہ نجاست غلیظہ اور نجاست خفیفہ میں بعض اعتبار سے فرق کیا گیا ہے مگر کسی شرعی بنیاد پر، بلا دلیل نہیں لیکن ایسا فرق کہ نجاست غلیظہ کو نجاست کہا جائے اور اس سے بچا جائے اور نجاست خفیفہ کو طہارت کا درجہ دیا جائے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ وضوء کرنا جائز قرار دیا جائے اس کی نہ کوئی بنیاد ہے نہ کوئی نظیر۔

دو باطل کی جنگ کی صورت میں ہمارا غیر جانبدار رہنا ریاض احمد صاحب کے نزدیک صحیح نہیں ہے ہم عرض

کریں گے۔ غیر جانبدار رہنے اور خاموش بیٹھنے کی کیا بات ہے مسلمان تو حق کا داعی ہے اسے ہر حالت میں حق کا داعی اور گواہ بن کر رہنا ہے باطل آپس میں برسر جنگ ہوں یا باہم دوستی رکھتے ہوں۔ ہم مسلمان ہیں ہم اپنے آپ کو کسی باطل کی دعوت اور گواہی دینے کے لئے کیوں مجبور پارہے ہیں اور اس کے لئے کہاں سے وجہ جواز لا رہے ہیں؟ جب ایک کمیونسٹ کہتا ہے کہ ہندوستان کی نجات کمیونزم میں ہے فسطائی ذہنیت کا ترجمان دعویٰ کرتا ہے کہ ہندوستان کی سلامتی اور نجات ہندوتوا میں ہے اور ایک کانگریسی نعرہ لگاتا ہے کہ ہندوستان کا بھلا سیکولرزم میں ہے تو ہم کیوں نہ یہ آواز لگائیں کہ ہندوستان سمیت ساری دنیا کے لئے نسخہ شفاء قرآن میں ہے۔

اسلام میں ہے اپنی بات کہنے کے بجائے مختلف باطلوں کے درمیان انتخاب کے چکر میں کیوں پڑے ہیں اور اس کے لئے کیا دلیل ہے اور کون سی نظیر ہے؟؟ جب باشندگان کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث ہو کہ ہندوستان کی نجات کا کیا راستہ ہے۔ کیا طریقہ ہے؟ دراصل وہی وقت ہوتا ہے اسلام کی دعوت ٹھیک ٹھیک پیش کرنے کا۔ لیکن ہماری یہ کتنی بڑی بدقسمتی اور بے توفیقی ہے کہ ہم اس وقت اسلام کے بجائے سیکولرزم کے لئے مہم چلانی شروع کر دیتے ہیں۔

٦٦ء کا فیصلہ

ریاض احمد صاحب نے اپنے مضمون میں باطل کی تین قسمیں کی ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان تین قسموں کے درمیان فرق نہ کرنا اپنے فرض سے غفلت کے مترادف ہے اور اس غفلت پر آخرت میں اللہ کی گرفت اور مؤاخذہ سے بچنا ممکن نہیں۔ پھر موصوف نے بتایا ہے کہ ہندوستان میں اقامت دین کی جدوجہد کو لاحق امکانی خطرہ کے پیش نظر جماعت اسلامی نے جولائی ١٩٦٦ء میں اپنے طریقۂ کار کا یہ نہایت اہم نکتہ اس طرح واضح کیا ہے کہ۔

> ''موجودہ نظام حکومت کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اس کو اسلامی نظام سے تبدیل کرنے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔''

> ''موجودہ نظام کو غیر اسلامی اور خلاف حق سمجھتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے اہم مفادات کے تحفظ کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے۔''

جماعت کے اندرونی اور بیرونی حالات سے جو لوگ واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ١٩٦٦ء کے فیصلہ تک عمومی طور پر کوئی خاص بے چینی اور انتشار فکر نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس فیصلہ میں یہ بات تو نہیں کہی گئی تھی کہ الیکشن میں حصہ لینا شرعی حدود کا لحاظ کئے بغیر بہر صورت جائز ہے اگر ٨٤ء کا فیصلہ ایسا ہوا ہوتا کہ اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی اور بنیادی عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہ ہوتی تو اختلاف میں اتنی شدت نہ پائی جاتی کیونکہ

فی نفسہ الیکشن میں حصہ لینے کا اصل مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کی جو شکل فی الحال اختیار کی گئی ہے کیا وہ صحیح ہے اور کیا کتاب وسنت اور خود دستور جماعت سے متصادم تو نہیں ہے؟

اوپر ہم نے ۱۹۶۶ء کے فیصلہ کی دو دفعات نقل کی ہیں۔ پہلی دفعہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام سے بدلنے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز ہے اس سے صاف واضح ہے کہ غیر اسلامی نظام کو چلانے کے لئے الیکشن میں حصہ لینا جائز نہ ہوگا چنانچہ یہ بات دوسری جگہ صراحت کے ساتھ کہی بھی گئی ہے۔ اب ذرا بتایئے آپ جب ایک کمیونسٹ کو ووٹ دے کر پارلیمنٹ میں بھیجتے ہیں تو کس لئے بھیجتے ہیں کیا وہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام سے بدلنے کے لئے کوشش کرے گا یا غیر اسلامی نظام کو چلانے میں شریک ہوگا اس طرح ۸۴ء کا فیصلہ ۱۹۶۶ء کے فیصلہ کے بھی خلاف ہے پھر آپ کی پوزیشن کیا ہوگی جب کہ آپ کا نمائندہ پارلیمنٹ میں جا کر غیر اسلامی نظام کے چلانے میں شریک ہوتا ہے؟

ریاض احمد صاحب کا اعتراف

ریاض احمد صاحب کی اس عبارت پر بھی غور کیجئے:

> ''ایک طرف سیکولر جمہوریت اپنے فلسفۂ حیات اور اصل کے اعتبار سے ایک باطل نظام ہے کیونکہ وہ انسانوں کے اجتماعی وسیاسی معاملات سے خدا اور مذہب کو بے دخل کرتی ہے اور اجتماعی زندگی میں جمہور کی خلافت کے بجائے جمہور کی حاکمیت اعلیٰ کی علمبردار ہے اور اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کی منکر ہے......دوسری طرف......''

ان جملوں کے بعد موصوف نے جمہوریت کے کچھ فوائد کا تذکرہ فرمایا ہے ذرا غور فرمایئے۔ یہ مانا کہ جمہوریت کے ایک نہیں لاکھ فوائد ہیں لیکن ان فوائد کے حصول کے واسطے اللہ کی حاکمیت کا انکار کرنے اور اپنی حاکمیت کا دعویٰ کرنے والے نظام کے تحفظ، بقاء اور قیام کے لئے مہم چلا کر خدا کے سامنے کیسے منہ دکھائیں گے اور پھر خلق خدا کے روبرو کیسے یہ دعویٰ لے کر کھڑے ہوں گے کہ ہمارا نصب العین اقامت دین ہے۔ اور ہم یہ سب کچھ زمین پر اللہ کی حاکمیت اور اللہ کا قانون نافذ اور جاری کرنے کے لئے کرتے ہیں یہ کتنا بڑا تضاد ہے۔ جس تضاد اور تناقص کو مسلمانوں کے اندر سے ختم کرنے کے لئے تحریک اسلامی وجود میں آئی تھی۔ افسوس ہے اسی تضاد اور تناقص کے ہم داعی بن گئے۔ عام مسلمان اپنی بے علمی اور بے شعوری کی بناء پر اور احساس گناہ کے ساتھ تناقص میں مبتلا تھا لیکن ہم ہیں جو پورے شعور کے ساتھ اس تناقص کو اپنا رہے ہیں اور اسی میں اپنی، سارے مسلمانوں کی اور پورے ملک کی نجات سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر بیسویں صدی کا کوئی المیہ نہیں ہوگا۔

ہندوستان میں مسلم سیاست کیا ہو؟

(۱۹۹۹ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

سیاست کی ضرورت

سیاست کتنی ضروری چیز ہے اوراس کی کیا اہمیت ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے یہ حقیقت اپنے پیش نظر رکھئے کہ جوگروہ بھی سیاست سے کنارہ کش رہے گا وہ بیل اور گھوڑے کے مانند ہوگا۔بیل اورگھوڑے کا کام اپنے مالک کی گاڑی کھینچنا ہوتا ہے اور مالک صبح وشام جو چارہ دے وہ خاموشی سے کھائے۔اسی طرح سیاست سے کنارہ کش رہنے والے لوگ غالب حکمرانوں کی مرضی کے تابع بن کر رہیں گے۔ان کی مرضی اور پسند کا ملکی اور قومی امور میں کوئی دخل نہ ہوگا حتی کہ انہیں اپنے ذاتی معاملات میں بھی بڑی حد تک حکمران طبقہ کی مرضی کا خیال کرنا ہوگا اس لئے کوئی ایسا گروہ جو زندگی اور کائنات کے بارے میں اپنا مخصوص عقیدہ اورنظریہ رکھتا ہواور اس عقیدہ کے تحت پوری زندگی کا مکمل نقشہ اور نظام رکھتا ہو وہ سیاست سے کیونکر کنارہ کش رہ سکتا ہےاور اگر سیاست سے بےتعلق ہو یا ایسی سیاست کے نہر میں غوطہ لگارہا ہو جواس کے اپنے عقیدہ اورنظریہ کے مخالف چشمے سے نکلی ہوتو ان دونوں صورتوں میں وہ گویا اپنے عقیدے اورنظریہ کے درخت پرخود کلہاڑی چلا رہا ہےاوراپنی عزت اور خودداری سے ہمیشہ کے لئے دامن جھاڑ چکنے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

ہندوستان میں مسلم قوم کا یہی حال ہے۔تقسیم ہند کے بعد جب انہوں نے ایک بزرگ کے زیر صدارت یہ فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کی علیحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانی نہ صحیح ہے نہ مفید تو اسی وقت گویا یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ مسلمان اس ملک میں ہمیشہ کے لئے غیروں کے تابع بن کر رہیں گے اور وہ بحیثیت ایک گروہ یا ایک قوم اور ملت کبھی بھی عزت کے مقام پر نہیں بیٹھیں گے۔ان کا عقیدہ توحید شرک اور الحاد کے ماتحت رہے گا ان کی تہذیب دیو مالائی تہذیب کے مقابلہ میں مغلوب ہوگی۔ان کی زبان کسمپرسی کی حالت میں ہوگی اور ان کا اپنا تشخص مشرکانہ طورطریقہ کی زد میں ہوگا۔چنانچہ ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ان کا عقیدہ، ان کا دین حتی کہ ان کا پرسنل لاء، ان کی کتاب، ان کی تہذیب اور زبان ان کی عبادتگاہیں غیروں کے ہمہ جہتی حملوں کی زد

میں ہیں اور ان کا کام مدافعانہ طور پر التجا، گزارش اور مطالبہ کرنے کے سواء کچھ نہیں رہا۔ یہ جو کچھ ہوا وہ بالکل فطری اور منطقی نتیجہ کے طور پر ہوا کیونکہ جب انہوں نے اپنے دماغ سے ملی حیثیت میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کی سوچ ہی نکال دی اور یہ سمجھ لیا کہ اب اس ملک میں ہم اقتدار کے منصب پر فائز ہی نہیں ہو سکتے تو کیا ہوگا۔ انسان جب کوئی بات سوچ تک نہیں سکتا تو اس کے کرنے کا کیا سوال؟

جب کوئی فوج شکست خوردہ ہو جائے، اس کے حوصلے پست ہو جائیں تو وہ کیا میدان میں اترے گی اور کیا میدان مارے گی۔ اس کی مکمل تصویر اگر دیکھنی ہو تو ہماری پچھلی پچاس سالہ تاریخ کو کوئی دیکھ لے۔ ہم میدان سیاست میں اگر اترے تو دوسروں کے دست نگر اور محتاج بن کر، غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے سائل اور ایسے بھکاریوں کے روپ میں آئے جن کو ہر در سے نامراد واپس کیا گیا۔

ایک دوسرے رخ سے غور کیجئے

اسلام ہمارے عقیدہ کے مطابق ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ہدایات اور بنیادی اصول اس کے اندر موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے مختلف وجوہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا مذہبی طبقہ سیاست میں پڑنے کو دینداری کے خلاف سمجھتا ہے۔ دوسری بدقسمتی یہ ہے کہ جو لوگ سیاست کے میدان میں آتے ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس اصول کو مانتے ہیں کہ سیاست میں دین اور مذہب کو دخل نہیں دینا چاہئے۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے زندگی کو کئی خانوں میں اس طور پر تقسیم کرنا صحیح نہیں ہے کہ یہ مذہبی حصہ ہے اور یہ سیاسی؛ بلکہ زندگی کو مکمل طریقہ سے مذہبی اور دینی ہونا چاہئے کسی بھی شعبہ کو الگ کرنا ایک غیر دینی عمل ہوگا۔ جس چیز سے مسلمان کی آخرت بننے والی ہے اسی سے دنیا بھی بنے گی۔ دنیا و آخرت دونوں جہاں کی کامیابی کی منزل تک پہنچنا ایک ہی راستہ سے ممکن ہے۔ دنیا کے لئے الگ راستہ اور آخرت کے لئے الگ راستہ اپنانا دینی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ جو لوگ اس اصول کے تحت نقشہ کار بناتے ہیں انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی دنیا بھی بگڑے گی اور آخرت کے بگڑنے کا بھی سخت اندیشہ ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے "الدنیا مزرعة الآخرة"۔

اس روشنی میں جب آپ سیاست کے موضوع پر سوچیں گے تو خود بخود یہ بات لازم ہو جائے گی کہ ہمارا سیاسی فارمولہ لازماً ایسا ہونا چاہئے کہ جو اسلامی اصولوں کے تحت ہو اور جس پر عمل پیرا ہو کر ہم اخروی کامیابی بھی حاصل کر سکیں اور دنیا میں بھی بامراد ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے ہٹ کر سیاسی حکمت عملی اختیار کریں گے تو آخرت میں خسارہ سے دوچار ہوں گے اور دنیا بھی بگڑے گی۔ اس لحاظ سے بحیثیت مسلمان ہم مجبور

ہیں کہ ہم جو بھی سیاسی نقشہ کار بنائیں اس کا ماخذ کتاب وسنت میں موجود ہو۔اس مقام پر ملت اسلامیہ کی تیسری بدقسمتی یہ سامنے آتی ہے کہ مسلمان دانشور حتی کہ علماء بھی جب سیاسی موضوع پر سوچتے ہیں یا گفتگو کرتے ہیں تو دینی سرچشموں سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے کفار ومشرکین، مذہب بیزار اور مادہ پرست لیڈروں اور سیاست دانوں کے افکار ونظریات کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔کتاب الٰہی اور اسوۂ نبوی کی روشنی میں دنیا کے سامنے کوئی نقشہ کار پیش کرنا تو دور کی بات ہے خود اپنے لئے بھی زمانے سے ہٹ کر کوئی لائحہ عمل متعین نہیں کر پاتے۔

بہرصورت سیاسی موضوع پر سوچتے وقت پہلا سوال یہ آنا چاہئے کہ سیاسی اعتبار سے وہ کیا مقصد ہے جسے ہمیں حاصل کرنا ہے اور وہ کونسی منزل ہے جس تک ملت اسلامیہ کو پہنچنا ہے۔اس سوال کا جواب شریعت کی روشنی میں سامنے آنا چاہئے۔مگر اس رخ پر سوچا نہیں گیا۔چنانچہ اس سوال کا جواب ہماری موجودہ سیاسی سرگرمیوں کو دیکھنے سے یہ ملتا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں کسی نہ کسی طرح وہ حقوق حاصل کرسکیں جو انہیں دستور ہند نے دیئے ہیں۔گویا مسلمانوں کی ساری سیاسی سرگرمیوں کا محور حقوق طلبی اور دستور ہند کے چوکھٹے میں رہ کر ترقیوں کی منزلیں طے کرنا ہے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے چار فارمولوں کو گزشتہ پچاس سالوں میں اپنایا گیا ہے۔اگرچہ کہ تقسیم کے فوراً بعد مولانا آزاد نے لکھنؤ میں ایک کانفرنس کرکے طے کردیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی علیحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم بنانا نہ صحیح ہے اور نہ مفید۔اس کے باوجود کئی گوشوں سے مسلمانوں کی الگ سیاسی تنظیم بنائی گئی ہے۔اگرچہ کہ یہ راہ اپنانے والے بھی فرقہ پرستی کے الزام سے بچنے اور اپنے کو سیکولر ثابت کرنے کے لئے برائے نام اپنا دروازہ غیر مسلموں کے لئے کھولنے کا دعویٰ کرتے رہے ہیں۔

اس زمرے میں مجلس اتحاد المسلمین حیدرآباد، مجلس بچاؤ تحریک حیدرآباد، مسلم مجلس لکھنؤ اور مسلم لیگ کو شامل کیا جاسکتا ہے۔دوسرا فارمولہ جو بنایا گیا وہ یہ تھا کہ مسلمان انفرادی طور پر جس سیاسی پارٹی میں چاہیں شریک ہوں اور مسلم مفاد کے لئے کام کریں۔چنانچہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کو ہم تین زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔پہلے مذہب بیزار مثلاً کمیونسٹ پارٹی، دوسرے نام نہاد سیکولر پارٹیاں جو ایک سے زائد تعداد میں موجود ہیں۔تیسرے ہندو احیاء پرست پارٹی مثلاً بھاجپا۔آپ دیکھئے کہ ان تینوں قسم کی پارٹیوں میں مسلمان کسی نہ کسی مقدار میں اور کسی نہ کسی کیفیت کے ساتھ شریک ہیں اور ان کی بھرپور معاونت کرتے ہیں۔اس طرح مجموعی لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت بہرصورت سیاسی عمل سے وابستہ رہی ہے بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ ملک کی دوسری اکائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی چیخ پکار الیکشن کے موقع پر زیادہ سنائی دیتی ہے۔اس کا اندازہ مسلم علاقوں میں جلسے جلوسوں اور ووٹنگ کے وقت برقعہ پوش خواتین کی قطاروں سے لگایا جاسکتا ہے۔ایک چوتھا فارمولہ جس

کا چرچا عموماً کیا جاتا ہے اور بعض حلقوں نے عملی طور پر بھی اپنانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان دوسرے اقلیتی اور پس ماندہ طبقوں سے مل کر اپنے حقوق کے لئے جدو جہد کریں۔

ان چار فارمولوں کے علاوہ کوئی نیا فارمولہ اس وقت مسلمانوں کے سامنے نہیں ہے۔ اس لئے گھوم پھر کر انہیں چار فارمولوں میں سے کسی ایک کو مختلف لوگ اپنا رہے ہیں۔ اس کی واضح مثال وہ فیصلہ ہے جو ملک کی پانچ مذہبی جماعتوں نے کیا ہے اور ایک مسلم ایجنڈہ مرتب کر کے قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے اس مسلم ایجنڈہ پر ایک نظر ڈال لیجئے۔

مشاورتی گروپ کے کنوینر مسٹر سیف الدین سوز نے کہا ہے کہ ''مسلم ایجنڈا تفصیلی صلاح ومشورے کے بعد تیار کیا گیا ہے۔ یہ ایجنڈا ملک کے اس دوسرے سب سے بڑے مذہبی گروپ کی جائز امنگوں کی نمائندگی کرتا ہے جس نے ہمیشہ سیکولر نظام میں یقین رکھا ہے۔ لیکن جس کی سیاسی مایوسی کو سیکولر مخالف طاقتیں غلط طور پر استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ مسٹر سوز کے مطابق اس سیاسی مایوسی کی زیادہ تر وجہ مقننہ اور اقتدار کے ڈھانچے، سرکاری ملازمتوں اور اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں کم نمائندگی ہے۔ مسلم اقلیت کو حکومت اور ایڈمنسٹریشن میں ناکافی نمائندگی دی جارہی ہے اور ترقیاتی اور فلاحی فنڈز کی تقسیم میں اس کے ساتھ امتیاز کیا جارہا ہے۔ مسٹر سیف الدین سوز نے مزید کہا کہ سیکولر طاقتوں میں افراتفری سے بھی مسلمانوں میں احساس مایوسی پیدا ہوا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ سیکولر پارٹیوں کے درمیان مکمل مفاہمت پیدا ہوتا کہ فرقہ واریت کے سیلاب اور فرقہ پرست پارٹیوں کے پھیلاؤ کو روکا جاسکے۔ انہوں نے کہا کہ اس مسلم ایجنڈے کے اجراء کے بعد مسلم تنظیموں کے سربراہ یا نمائندے سیکولر سیاسی پارٹیوں اور لیڈروں سے جلد از جلد ملاقاتیں کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان سیکولر سیاسی پارٹیوں سے مسلم ایجنڈے پر ہمدردانہ غور کرنے اور اس ایجنڈے کو ان کے انتخابی منشور میں شامل کرنے کی درخواست کی جائے گی۔ مسلم تنظیمیں ان سیاسی پارٹیوں پر اس بات کے لئے بھی زور دیں گی کہ وہ متحد ہوجائیں اور ردو بدل یا مفاہمت کے ذریعہ انتخابات میں فرقہ پرست پارٹیوں سے سیدھا مقابلہ کریں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان سیاسی پارٹیوں سے یہ درخواست بھی کی جائے گی کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی میں اضافہ کریں اور جہاں تک ممکن ہوسکے تقریباً ایک سو سے زیادہ مسلم آبادی والے پارلیمانی حلقوں میں صرف ایک مشترکہ مسلم امیدوار نامزد کریں۔''

ایک پریس نوٹ کے مطابق اس مسلم ایجنڈے میں اقلیتی تعلیم کی ایک کل ہند کونسل تشکیل دینے کی تجویز بھی پیش کی گئی ہے جس کو قانونی درجہ حاصل ہوگا۔ تمام سرکاری ملازمتوں کی تمام سطحوں پر مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، اردو اور دوسری تمام اقلیتی زبانوں کو ان ریاستوں میں جہاں ان کی آبادی دس فیصد ہے۔ دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینا، مسلم پرسنل لاء میں عدم مداخلت کی یقین دہانی کرانا، بابری مسجد کے مقام کو مسجد کی دوبارہ تعمیر کے لئے مسلمانوں کے حوالے کرنا، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی عبادت گاہوں کی حیثیت برقرار رکھنے

کے قانون مجریہ ۱۹۹۱ء پر فوری عمل، مسلم ایجنڈے میں شامل دوسرے نکات ہیں۔ اس ایجنڈے کے دیگر اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

- مسلم فرقہ کو شدت پسند قوم پرست عناصر کے دباؤ اور اس کو بدنام کرنے کیلئے شروع کی گئی مہم سے مسلم فرقہ کے وقار کے تحفظ کے لئے موثر اقدامات۔
- تمام وقف املاک کو کرایہ کنٹرول قانون، شہری جائیداد کی حد بندی اور زرعی اصلاحات سے متعلق قوانین سے مستثنٰی کیا جائے۔
- جن وقف املاک کا حلیہ اس طرح تبدیل کر دیا گیا ہے کہ ان کی بحالی ممکن نہیں ہے، ان کا معاوضہ موجودہ بازار بھاؤ کے مطابق ادا کیا جائے۔
- از کار رفتہ حج کمیٹی قانون مجریہ ۱۹۵۱ء کی جگہ ایک نیا قانون بنایا جائے۔
- سہ لسانی فارمولہ کے تحت اردو کو پہلی زبان کے طور پر اختیار کرنے اور پرائمری اسکول کی سطح پر اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کے بارے میں امتیاز کو ختم کیا جائے۔
- آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ان تمام مرکزوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی آبادی ہے ان کے تناسب سے اردو پروگراموں کے لئے وقت دیا جائے۔
- آسام میں ناجائز تارکین وطن کا سراغ لگانے کے لئے بنائے گئے قانون آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ مجریہ ۱۹۸۳ء کو برقرار رکھا جائے۔''

(پانچ مسلم تنظیموں کا ایجنڈا ایک پریس کانفرنس میں جاری کیا گیا جس میں ان تمام تنظیموں کے نمائندے موجود تھے) سہ روزہ دعوت دہلی ۱۳؍جولائی ۱۹۹۹ء۔

اس مسلم ایجنڈا میں کیا دم خم ہے اس کا اندازہ لگانے کے لئے ہم چار اخباری تبصرے یہاں پیش کرتے ہیں۔ سہ روزہ دعوت دہلی کے مدیر ۱۹؍جولائی ۱۹۹۹ء کے اداریہ میں رقمطراز ہیں:

''کوئی شک نہیں کہ مسلم ایجنڈا مسلمانانِ ہند کی امنگوں اور ان کے احساسات کا ترجمان ہے اس میں شامل کئے گئے امور و مسائل حل طلب ہیں۔ پانچ تنظیموں نے انہیں اٹھا کر ایک دیرینہ ضرورت کی تکمیل کی ہے۔ لیکن اس موقع پر نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ بعض بنیادی حقائق کو سامنے رکھنا ہوگا۔ ان حقائق سے چشم پوشی نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ کسی بھی قسم کی خوش فہمی یا سادہ لوحی مسائل پیدا کرسکتی ہے۔ ایک تو یہ سمجھنا درست نہ ہوگا کہ ملک کے ارباب سیاست مسلمانوں کے ان مسائل سے واقف نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنے مزاج کے لحاظ سے یہ ارباب سیاست اتنے دیانتدار اور انصاف پسند واقع نہیں ہوئے ہیں کہ جیسے

ہی ان کے سامنے مسلمانوں کی یہ ضروریات پیش کی جائیں گی وہ بغیر کسی مصلحت کے ان کی تکمیل میں لگ جائیں گے۔ تیسرے یہ دیکھنا ہوگا کہ جن پارٹیوں کو سیکولر سمجھا جاتا ہے ان کے لیڈر فی الواقع کتنے سیکولر ہیں اور اپنی بات پر قائم رہنے کی کتنی جرأت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سیکولرزم ان پارٹیوں کا عقیدہ نہیں کہ اس کی خاطر وہ ہر صورت حال کا سامنا کریں گی خواہ اس میں انہیں سیاسی لحاظ سے گھاٹا ہی ہور ہا ہو۔ سیکولرزم دراصل ان پارٹیوں کی حکمت عملی یا سیاسی ضرورت ہے اور مسلمانوں سے ان کی دلچسپی صرف ان کے ووٹوں تک محدود ہے۔ چوتھی اہم بات یہ ہے کہ قانون ساز اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا سوال اس انداز میں اٹھانے سے فرقہ پرست اور فسطائی حلقوں کو تقویت مل سکتی ہے وہ مسلمانوں کے خلاف شور مچا کر نام نہاد ہندو اکثریت کو ورغلانا شروع کردیں گے۔ لہٰذا یہ دیکھنا ہوگا کہ ریزرویشن جیسے حساس مسئلے پر وہ مسلم مخالف ماحول پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہونے پائیں۔ اسی ضمن میں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ نچلے اور پسماندہ طبقات پر مسلمانوں کے اس مطالبہ کا کوئی منفی ردعمل تو نہیں ہوگا۔ ریزرویشن کے سلسلہ میں، بالخصوص سرکاری ملازمتوں کے تعلق سے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کے ہاتھ تو کچھ نہ آئے الٹا ان کے مخالف سیاسی طور پر مضبوط ہو جائیں۔ امید ہے مسلم مشاورتی گروپ کے ذمہ داران اپنی مہم آگے بڑھانے سے قبل ان حقائق کا جائزہ اچھی طرح لیں گے۔''

ہفت روزہ ''اخبار نو'' دہلی نے ۲۱ر تا ۲۷ر جولائی ۱۹۹۹ء کی اشاعت میں لکھا ہے:

''عام انتخابات کے موقع پر ملک کی پانچ بڑی مسلم جماعتوں کے درمیان اتحاد کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا جہاں تک ۳۴ نکاتی ایجنڈا کا معاملہ ہے تو وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبودگی سے وابستہ ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ملک میں جس طرح غیر یقینی سیاسی صورتحال ہے اور صرف مفاد پرستی کی سیاست کی جارہی ہے کیا سیکولر جماعتیں فرقہ پرستی کے خلاف یا اس نام پر متحد ہوسکتی ہیں جب بھی ملک میں انتخابات کا وقت آتا ہے تو سیکولر ووٹوں کی تقسیم روکنے اور فرقہ پرست طاقتوں کو ہرانے کی اپیل کی جاتی ہے لیکن سیکولرزم کا نقاب لگائے جماعتیں آج بھاجپا کی انگلیوں پر ناچ رہی ہیں۔ سمتا پارٹی، ترنمول کانگریس، لوک شکتی جیسی پارٹی کے قائد سیکولرزم کا راگ الاپ رہے ہیں اور بھاجپا کی قیادت والے محاذ میں بھی شامل ہیں۔ جہاں تک غیر بھاجپا جماعتوں کا تعلق ہے تو کانگریس اور سماج وادی کے درمیان اتحاد اب ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ اسی طرح بہوجن سماج پارٹی اور کانگریس کے درمیان اتحاد ممکن ہے۔ لیکن سماج وادی کے ساتھ اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک علاقائی جماعتوں کا تعلق ہے تو بیشتر جماعتیں بھاجپا قیادت والے محاذ میں شامل ہیں۔ ملک میں اب سیکولرزم کی بقاء کے لئے فرقہ پرست بھاجپا کو ہرانے کا نعرہ دم توڑ رہا ہے کیوں کہ نام نہاد سیکولر جماعتیں صرف اپنے مفاد اور بقاء کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں جب کہ سیکولر جماعتیں

انتشار کا شکار ہیں اور مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان اس وقت اختلافات میں مزید شدت پیدا ہوئی۔ جب مرکز میں بھاجپا سرکار اقلیت میں آگئی اور سیکولر جماعتیں متبادل حکومت کی جگہ ملک میں انتخابات کرانے میں دلچسپی لینے لگیں تو ایسے حالات میں ملک کی سب سے بڑی اقلیتوں کی نمائندہ تنظیموں کی سیکولر جماعتوں سے اپیل کتنی کامیاب ثابت ہوگی یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ جہاں تک اس اتحاد کا تعلق ہے وہ قابل ستائش ہے۔ مگر صرف ایجنڈا بنا کر سیاسی جماعتوں کے ساتھ بات کرنے سے کیا ہوگا؟ اگر مسلمان الیکشن میں اس ایجنڈا کے تعلق سے کوئی رخ اپنائیں تو سیاسی جماعتوں پر انہیں یہ یقین کیسے آئے گا کہ وہ اس ایجنڈا پر واقعی عمل کریں گے؟ دوسرے سیاسی جماعتوں میں سے اگر کوئی اس کو ماننے کے لئے تیار ہوتی ہے تو پھر ان پانچوں تنظیموں کے رہنماؤں سے وہ جماعت یا جماعتیں حمایت کی بھی طلبگار رہوں گی اور وہ جماعتیں الیکشن میں ایک دوسرے کے مدمقابل بھی ہوسکتی ہیں۔ اس صورت میں کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے اور پانچوں تنظیموں کے ذمہ داروں کو اس پر اور بھی زیادہ گہرائی سے غور کرنا چاہئے۔‘‘

اطہر معین صاحب نے روزنامہ منصف حیدرآباد ۱۱ر اگست ۱۹۹۹ء میں لکھا ہے:

’’ملک اس صدی کے آخری ایام میں نازک سیاسی حالات سے دوچار ہے اور آئندہ چند دنوں میں انتخابات کا بھی سامنا ہے۔ ان انتخابی نتائج کے دوررس نتائج حاصل ہونے والے ہیں۔ ایسے میں مسلمانوں کو بڑی دور اندیشی اور سیاسی حکمت عملی کا مظاہرہ کرنے اور موجودہ سیاسی حالات میں نہایت ہی اہم اور کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔ انتخابات سے قبل بعض تنظیموں نے مسلم مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ایک منصوبۂ عمل مرتب کیا ہے جسے سیاسی پارٹیوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے اسے قبول کرنے والی سیاسی جماعتوں کی تائید کرنے کا اعلان کیا گیا لیکن ان تنظیموں نے ملک کے مختلف ریاستوں کی سیاسی صورتحال کا صحیح اندازہ نہیں لگایا ہے اور نہ ہی مقامی مسائل کو اپنے منصوبۂ عمل میں شامل کیا۔ علاوہ ازیں مسلم تنظیموں کی جانب سے مرتبہ منصوبۂ عمل صرف کانگریس پارٹی کو ہی پیش کیا گیا جسے اس نے قبول بھی کرلیا۔ اس منصوبۂ عمل میں صرف مطالبات پیش کئے گئے لیکن مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی ترقی کے لئے کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کیا گیا۔ سیاسی سطح پر مسلمانوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی دینے کا مطالبہ کیا گیا لیکن اس خصوص میں کوئی واضح تیقن نہیں لیا گیا اور نہ ہی اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی گئی کہ آئندہ انتخابات میں ہی پارٹی مخصوص تعداد میں مسلم امیدواروں کو ٹکٹ دے۔ ماضی میں بھی یہ دیکھا گیا کہ انتخابات سے قبل سیاسی پارٹیاں مسلمانوں کے منشور مطالبات کو بلا چوں و چرا قبول کرلیتی ہیں چونکہ وہ کسی بھی صورت میں مسلم ووٹ بینک کو کھونا نہیں چاہتیں لیکن جب اقتدار میں آجاتی ہیں تو اپنے وعدوں اور دعوؤں کو نہ صرف فراموش کرجاتیں بلکہ مسلم دشمن اقدامات سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ہمارے پاس ایسی نظیر بھی موجود ہے کہ اردو کی ترقی کے لئے قائم کردہ کمیشن کے سربراہ

جب وزارت عظمیٰ کے عہدہ پر پہنچ گئے تو انہوں نے خود اپنی سفارشات کو روبہ عمل لانے سے احتراز کیا لہٰذا مسلم تنظیموں کو صرف منشور مطالبات پیش کر کے مطمئن نہیں ہونا چاہئے کہ حکومت تشکیل پانے پر ان کے پیش کردہ پروگرام پر عمل آوری ہوگی بلکہ انہیں اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوگا۔''

ڈاکٹر اسلام الدین مجاہد صاحب روزنامہ منصف ۱۳؍اگست ۱۹۹۹ء میں لکھتے ہیں:

''اس مرحلہ پر مسلم قیادت کو بھی طے کر لینا چاہئے کہ بازار سیاست میں بے وزن بکنے سے بہتر ہے کہ اپنے مسائل کو اپنے طور پر حل کرنے کا عزم کر کے اٹھیں۔ اگر مسلم قیادت یہ طے کرتی ہے کہ جو پارٹی اس ''مسلم ایجنڈے'' کو تسلیم کرتی ہے جو ملک کی پانچ سرکردہ مسلم تنظیموں کی جانب سے جاری کیا گیا ہے تو پھر آنے والے انتخابات میں مسلمان ایک اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ جمعیۃ العلماء ہند، جماعت اسلامی ہند، کل ہند مسلم پرسنل لاء بورڈ، ملی کونسل اور مسلم مجلس مشاورت نے جس مسلم ایجنڈے کے خدوخال پر اتفاق رائے کر لیا تھا وہ تو منظور کر لیا گیا اور اخبارات میں اس کی اشاعت بھی عمل میں آ گئی۔ لیکن تادم تحریر ان جماعتوں نے ملک کی اہم سیاسی جماعتوں سے نہ کوئی رابطہ قائم کیا اور نہ ہی مسلم رائے عامہ کو ''مسلم ایجنڈے'' کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیس کروڑ کی ملت اسلامیہ ہند کا یہ قافلہ آنے والے انتخابات کے موقع پر بھی بے قیادت رہے گا اور ہر علاقہ کے مسلمان اپنے طور پر فیصلہ کریں گے جس سے سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ مسلم ایجنڈے میں جن امور کا تذکرہ کیا گیا وہ مسلمانان ہند کو گذشتہ پچاس سال سے درپیش ہیں۔ پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن، مسلم پرسنل لاء میں مداخلت یا تبدیلی کے امکان کا خاتمہ، بابری مسجد کی تعمیر نو، شرپسندوں کی شرارتوں اور مسلم مخالف مہم سے مسلمانوں کا تحفظ، اوقاف کی جائیدادوں کا تحفظ، اردو کی ترویج و ترقی اور آسام کے مسلمانوں کو غیر ملکی باشندوں کا ہوا کھڑا کرنے والوں کی ریشہ دوانیوں سے بچانا، یہ مسلم ایجنڈے کے خاص نکات ہیں۔ ملک کی جو بھی پارٹی ان نکات کو روبہ عمل لانے کا وعدہ کرتی ہے مسلمان بہرحال اس کے حق میں سوچ سکتے ہیں لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں شامل بعض ''کالی بھیڑیں'' اس مسلم ایجنڈے کو عام مسلمانوں سے اوجھل رکھ کر کسی ایک پارٹی کے کشکول میں مسلمانوں کے ووٹ ڈلوانا چاہتی ہیں۔ اگر ملک کی کوئی پارٹی اس سازش میں کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر ایک بار مسلمانوں کو الیکشن کے بعد کف افسوس ملنے کے سواء اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس تاریخ ساز الیکشن میں جس کے دروازے پر ہم پہنچ چکے ہیں ہمیں بہت ہی دوراندیشی اور مومنانہ فراست سے فیصلہ کرنا چاہئے۔ ہمیں کسی پارٹی کے تعلق سے کوئی خوش فہمی یا سادہ لوحی کا شکار ہوئے بغیر حقائق کی بنیاد پر اس کے حسن و قبح کا جائزہ لینا چاہئے اور بغیر کسی مصلحت کے ملت کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اجتماعی فیصلہ کرنا چاہئے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیونکہ ہمارے قائدین نے پہلے سے طے کر لیا ہے کہ ان کی ہمدردی کس پارٹی کے ساتھ ہے۔

یہ تبصرے بڑے احترام اور ادب کے ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن دبی زبان میں مسلم ایجنڈا کی بے مائیگی اور سطحیت کو انہوں نے اجاگر کردیا ہے۔ یہاں سوچنے کا یہ پوائنٹ بھی ہے کہ جن چار فارمولوں کو بار بار پچاس سال تک آزمایا گیا ہے انہیں کو پھر آزمانے کا کیا جواز ہے؟ کیوں نہ ہم تھوڑا توقف کرکے کوئی دوسرا نسخہ تلاش کریں۔

موجودہ پارلیمانی سیاست اور سیاسی نظام کی سب سے بڑی ناانصافی یہ ہے کہ مسلم آبادی کے لحاظ سے فیصلہ کن موثر حلقہ ہائے انتخابات کو درج فہرست ذاتوں کے لئے مخصوص کردیا گیا ہے اور کئی حلقوں کو اس طرح تقسیم کردیا گیا ہے کہ مسلم ووٹوں کی اہمیت گھٹ گئی جس کی وجہ سے پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں مسلمان ارکان کی تعداد کم ہورہی ہے۔ ساتویں لوک سبھا میں مسلم ارکان کی تعداد ۴۶ تھی۔ آٹھویں لوک سبھا میں ۴۱ ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں ۳۳، ۱۹۹۱ء میں ۲۸، ۱۹۹۵ء میں ۲۷ اور بارہویں لوک سبھا میں ۲۸ رہ گئی۔

اس طرح مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن انتہائی کمزور ہوگئی ہے۔ قومی اقلیتی کمیشن نے حالیہ مردم شماری کی رپورٹ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اقلیتیں ملک کی آبادی کے ۱۸.۵۹ فیصد پر مشتمل ہیں۔ اگر ان اقلیتوں میں مسلمانوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ۱۴ کروڑ ہے۔ لیکن ملک کی دولت اور اقتدار میں ۳ فیصد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کو نہیں مل رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس نوبت تک کس نے پہنچایا ہے۔ اس کے جواب میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب کچھ کیا دھرا سیکولر لوگوں کا ہے اس لئے کہ ۱۳ ماہ ۱۳ دن کے علاوہ چالیس سال ملک کی زمام کار سیکولر پارٹیوں بالخصوص کانگریس کے ہاتھ میں رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود سیکولر پارٹیوں سے آس لگا کر بیٹھنا کہاں کی دانشمندی ہوگی۔''

یہی وہ بات ہے جو الیاس اعظمی صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ نے کہی ہے:

''آج پچاس سال گزرنے کے باوجود مسلم اقلیت سیاسی طور پر لاچار ہی نظر آرہی ہے۔ ملک کی آزادی کے دن تقریباً چار کروڑ کی تعداد والی آج پچاس سال بعد جو اپنے کو پچیس کروڑ کہتی نہیں تھکتی لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تیرہ کروڑ ہونے کے باوجود اپنا سیاسی طور پر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ آج سے پچاس سال قبل جس چوراہے پر کھڑی تھی آج بھی وہیں نظر آرہی ہے۔

میری اس بات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کریں گے کیونکہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمان کاروباری طور پر کافی مضبوط ہوگیا ہے وہ عرب دنیا سے روپئے کمانے کے بعد اس انداز کا ہوگیا ہے کہ وہ اپنے ہم وطنوں کے مقابلے میں مکان خریدتا ہے۔ اپنے ذاتی اخراجات سے ایک بہتر زندگی گزارتا ہے اور اپنی شادی بیاہ کی تقریبات میں اپنے ہم وطنوں کو دوسرے نمبر پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو بیشک مسلمانوں نے ترقی کی ہے جس سے کسی کو انکار بھی نہیں ہے لیکن ایسے مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے۔ جس ترقی کی بات میں کررہا ہوں اس میں تو ہم بہت پیچھے چلے گئے ہیں چھوٹی سے چھوٹی تعداد رکھنے والی

اقلیت بھی آج اپنا سیاسی وزن محسوس کراتی ہے لیکن ہم تیرہ فیصد کی تعداد رکھنے والے مسلمانوں نے وعدوں کے سہارے ہی پچاس سال گزار دیئے اور پھر بھی ہم مزید وعدوں پر بھروسہ کرنے کو تیار ہیں۔

جب کہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک کی آزادی کے وقت ہمارے تیس فیصد افراد سرکاری نوکریوں میں تھے جو آج گھٹ کر صرف دو فیصد رہ گئے ہیں۔ آج ہماری آبادی کے تیس فیصد افراد ندی کے پشتوں پر نالوں کے کنارے، سڑکوں کے کنارے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آج ہمارے مسلم محلے گندی بستیوں کے نام سے مشہور ہیں۔ آج بھی مسلم علاقوں میں اسکولوں، شفاخانوں، مستورات کے لئے کڑھائی بنائی کے تربیتی مراکز کا فقدان ہے۔ تقریباً بیس ہزار فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر احساس جرم پیدا کرنے کی کوشش کا کیا جانا، بابری مسجد میں بزور طاقت مورتیوں کا رکھا جانا، سب انسپکٹر رام دیو دوبے کے ذریعہ لکھائی گئی ایف آئی آر پر عدالت کا کوئی کارروائی نہ کرنا، مسجد کو دفعہ ۱۴۵ کے تحت قرق کرنا اور مسلمانوں کے لئے مسجد سے دوسو میٹر دور رہنے کے احکامات صادر کرنا، مسجد کا تالا کھلوانا، متنازعہ جگہ پر شیلا نیاس کرانا اور پھر فرقہ پرست تنظیم آر ایس ایس اور اس کے سیاسی بازو بھاجپا کی سرپرستی میں ہی اس کی ذیلی جماعتوں کے ذریعہ بابری مسجد کو شہید کرادیا جانا، یہ سب وہ حالات ہیں جو پچاس سال میں مسلمانوں کے حصے میں آئے۔

اس میں تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پچاس برسوں میں مسلمانوں کے سب سے پہلے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ پھر مسلمانوں کی لیڈر اندرا گاندھی ہوئیں، پھر مسلمانوں کے لیڈر بہوگنا ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر چودھری چرن سنگھ ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر راجیو گاندھی ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر نرسمہا راؤ ہوئے، پھر مسلمانوں کے لیڈر ملائم سنگھ یادو ہوئے، اس کے بعد لیڈر کون ہوگا یہ وقت ہی بتائے گا لیکن یہ سب وہ لیڈران ہیں جنہیں گزشتہ پچاس برسوں میں مسلمانوں نے ووٹ دیا جس کا نتیجہ سامنے ہے۔

مندرجہ بالا لیڈران وہ ہیں جنہیں سیکولر کہا جاتا تھا اور جن کے ہاتھ میں اقتدار بھی تھا وہ اپنے اقتدار کے ذریعہ مسلم اقلیت کو پریشانیوں سے نجات دلانے کی حالت میں تھے۔ لیکن ان لیڈران نے کسی ایک معاملہ میں بھی فرقہ پرست تنظیموں کے سامنے سینہ سپر ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ جس کی مثال اس طرح دی جاسکتی ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد جتنے بھی تحقیقاتی کمیشن تشکیل پائے ان میں سے کچھ کے علاوہ زیادہ تر کی رپورٹ منظر عام پر نہیں آئی اور اگر چند کی رپورٹ منظر عام پر آ بھی گئی تو اس رپورٹ کی بنیاد پر جن سرکاری یا غیر سرکاری افراد پر الزامات ثابت ہوئے ان میں سے کسی ایک کے خلاف بھی قانونی کارروائی کر کے سزاء نہ دلائی جاسکی۔ بھیونڈی (مہاراشٹرا) کے فساد کے بعد جسٹس مادان کمیشن تشکیل پایا تھا جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں کہا تھا کہ ایسے لوگ پولیس کی وردی پہنے ہوئے تھے جن پر پولیس کی وردی زیب نہیں دیتی۔ ان لوگوں نے پولیس کی وردی کی بے عزتی کی ہے۔ اس کے باوجود کسی ایک کو بھی سزا نہیں مل پائی۔ اسی طرح مرادآباد میں ۱۹۸۰ء کا فساد ہوا تھا اس کی رپورٹ پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ میرٹھ، ہاشم پورہ اور ملیانہ کے واقعات میں

جب کمیشن کی رپورٹ سے ثابت ہوگیا کہ بدنام زمانہ پی اے سی کے ذریعہ ۴۲ کڑیل نوجوانوں کو گولی سے اڑا دیا گیا کمیشن کے ذریعہ پی اے سی کے جوانوں کو نامزد بھی کردیا گیا لیکن آج تک وہ آزاد گھوم رہے ہیں۔

اس کے برعکس ۳۱/اکتوبر۱۹۸۴ء کو مسز اندرا گاندھی کے قتل کے ردعمل میں سکھ قوم کے خلاف فسادات کا سلسلہ شروع ہوا جس میں کافی تعداد میں سکھ قوم کے افراد مارے گئے لیکن سکھ قوم نے ایک فساد پر ہی دہلی ہائی کورٹ جا کر انصاف حاصل کرلیا۔ گناہ گاروں کو سزاء دلوائی اور اپنے رشتہ داروں کی موت کا معاوضہ دس، دس لاکھ روپئے منظور کرایا۔ یہ سکھ قوم بھی ہندوستان کی ایک اقلیت ہے جو مسلمانوں کے ۱۳ فیصد کے مقابلے میں صرف ۲ فیصد ہی ہے۔

یہ قومیں ہماری طرح نہیں کہ ہم انتظار کرتے رہے کہ یہ سیکولر پارٹیاں اپنے کئے وعدوں کے مطابق بابری مسجد کی حفاظت کے لئے ایودھیا میں موجود رہیں گی اور فرقہ پرستوں کے سامنے سینہ سپر ہوں گی لیکن ایودھیا میں کسی ایک بھی سیکولر لیڈر کا پتہ نہ تھا اور بابری مسجد آسانی کے ساتھ شہید کردی گئی اور حکومت وقت کے سربراہ مسٹر نرسمہا راؤ کی خاموش حکمت عملی نے اس کام کو اور بھی آسان بنادیا۔ کانگریس اور سیکولر پارٹیوں کے لیڈران اپنے اپنے گھروں میں ٹی وی پر یہ تماشہ دیکھتے رہے اور ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت خون کے آنسو روتی رہی اور قومی یکجہتی کونسل کی قراردادیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔ آج کانگریس نے اپنے سابقہ رویہ پر معافی مانگی ہے تو تمام سیکولر پارٹیوں کو بھی مسلمانوں سے معافی مانگنی چاہئے کیونکہ یہ پارٹیاں بھی بابری مسجد کے انہدام میں برابر کی شریک ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سیکولر پارٹیاں ہمارے ووٹ حاصل کرنے کے بعد ہمارے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہیں۔ ہماری کمزوری یہ کہ ہم ۱۳ فیصد ہونے کے باوجود حکومت میں حصہ دار نہیں بن پاتے کیونکہ ان کو اپنی پارٹی کے وہپ کا پابند ہونا پڑے گا۔ اگر انہوں نے اپنے ضمیر کی آواز پر ووٹ دے دیا تو ان کی ممبری ختم ہوجائے گی۔

ایسے حالات میں ہماری حالت بالکل ایسی ہوگئی ہے کہ ہم بس میں دھکا لگا کر اسے اسٹارٹ کرنے کے بعد دوسری بس میں دھکا لگانے کے لئے الیکشن کا انتظار کرنے لگتے ہیں یعنی جس بس کو ہم نے دھکا لگا کر اسٹارٹ کردیا تھا اس کا ڈرائیور ہاتھ نکال کر ہمارا شکریہ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا بس میں سوار کرنا تو الگ بات ہے۔'' (رہنمائے دکن ۲۵/اپریل ۱۹۹۹ء)

مسلمانوں کی لاچاری، بےبسی اور محرومی کی آخر وجہ کیا ہے کہ پچاس سال کے دوران کوئی نسخہ کام نہ آیا اور کوئی دوا بھی ان کے درد کا درماں ثابت نہیں ہوئی جبکہ اسی سرزمین پر دوسری اکائیاں بھی ہیں جو اپنے مسائل کا حل نکال لیتی ہیں اور جن کا وزن محسوس کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمانوں نے جمہوریت کو

کما حقہ پہچانا نہیں بحیثیت مجموعی انہوں نے سادہ لوحی کا ثبوت دیا۔ انہیں جمہوریت کے فریب میں صرف مبتلا ہی نہیں کیا گیا بلکہ بہلا بہلا کر فریب میں رکھا گیا۔

اس ضمن میں مولانا محمد اسحاق سندیلوی ''استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ'' کے چند الفاظ لائق ملاحظہ ہیں۔

''دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پرفریب اور پرتلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام ونشان بھی نہیں ہے جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں غربت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب اس کے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں جس میں انسانیت کو کند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے۔ جس میں شخصی آزادی کا گلہ گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب و کمزور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔''

''رواداری کا وعظ کہنے والے ذرا سطحیت کو چھوڑ کر حقیقت پر نظر کریں تو انہیں معلوم ہوگا کہ دنیا کی سب قومیں یہی کر رہی ہیں۔ مذہبی اقلیتوں کو وضع قانون کا منصب واقعہ کے لحاظ سے کہاں نصیب ہوتا ہے؟ نگاہ حقیقت بیں تو ہر جگہ ''دیو استبداد'' ''جمہوری قبا'' میں پائے کوب'' دیکھ رہی ہے، اور دنیا کو'' آزادی کی نیلم پری'' کا فریب دینا جمہوریت کا بین الاقوامی مزاج بن چکا ہے طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم نام بنام ایک ایک ملک کی جمہوریتوں کی نقاب فریب چاک کر کے ان کی اصلی شکل دکھا دیتے اور یہ مکروہ واقعہ نظر آجاتا کہ ان میں مغلوب قوموں کے نمائندے صرف اس لئے مجالس قانون ساز میں باریاب ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کو ذبح کرانے میں آلۂ کار بن سکیں یا کسی غالب پارٹی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں اور دنیا کے سامنے حکومت کی رواداری (بے تعصبی) کے گیت گاتے رہیں۔

اگر باطل مذاہب نے اعتقادی شرک کی ترویج کی ہے تو یہ باطل نظریات سیاسی شرک پھیلا رہے ہیں''۔

(''اسلامی سیاست''، مطبوعہ دار المصنّفین، اعظم گڑھ)

مسلمانوں نے حاکمیت الٰہ کی بنیاد پر سیاست کو چھوڑ کر حاکمیت جمہور والی سیاست کو اپنایا۔ لیکن جمہوریت کو ماننے کا بھی حق ادا نہ کر کے خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ کے مصداق بنے ہوئے ہیں آخرت کا انجام روز قیامت معلوم ہوگا دنیا کے خسران کا رونا تو ہر ایک رو رہا ہے۔ دین کے رمز شناس اور دور جدید کے باطل نظریات کے نباض نے کہا تھا کہ جمہوریت میں حقوق ملتے نہیں بلکہ چھینے جاتے ہیں لیکن مسلمانوں نے عام طور سے اسی کو غنیمت سمجھا کہ جمہوریت نے آنسو بہانے اور رونے کا حق دیا ہے۔ اس کے بعد جس نے ہمدردی کا اظہار کیا اور حسین لفظوں میں حسین وعدے کئے اس کو الیکشن میں ووٹ دے دیا اور جب وعدہ کرنے والوں نے وعدہ پورا نہیں کیا تو گلہ اور شکوہ کیا حالانکہ جمہوریت نے جہاں گلہ شکوہ کرنے، رونے دھونے اور مطالبات کی

فہرست پیش کرنے کا حق دیا تھا وہیں اس نے چند جدید ہتھیار بھی دیئے تھے کہ ان کو استعمال کر کے اپنے مطالبات منوا سکتے تھے لیکن مسلمانوں نے ان ہتھیاروں کو کبھی استعمال نہیں کیا۔ ان کی مثال اس گائے کی ہو گئی جو صرف دودھ دینا جانتی ہے نہ سینگ چلاتی ہے اور نہ لات مارتی ہے۔ مسلمان ووٹ دے کر کامیاب کرتے ہیں لیکن کامیاب ہونے والا اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے تو وعدے یاد دلانے کی بھی ہمت نہیں کرتے۔

جمہوریت کے جدید ہتھیاروں میں اسٹرائیک، دھرنا دینا، ریلی، پہیہ جام کرنا اور جیل بھرو کے پروگرام ہیں۔ قطع نظر اس میں کیا صحیح ہے اور کیا غلط جن لوگوں نے اپنی کوئی بات منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو استعمال کیا۔ ان کی بات کسی نہ کسی درجہ میں مانی گئی اور ان کے مطالبوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکا۔ حکومت کسی پارٹی کی ہو جب اس کے سامنے رکاوٹ کھڑی کی جاتی ہے تو وہ رک کر سوچتی ہے۔ حکومت کے پاس چاہے کتنی ہی قوت ہو اور وہ خواہ کتنی ہی مضبوط حکومت ہو لیکن پانچ سو لوگ کسی مطالبہ کو منوانے کے لئے سینہ کھول کر کھڑے ہو جائیں تو وہ ہزار پانچ سو لوگوں کو گولی سے بھون نہیں سکتی ہے۔ حکومت کے پاس ہزار ہا ملزموں کو بند کرنے کے لئے جیل ہوتی ہے۔ مگر ایک ہزار افراد کسی ایشو پر گرفتاری دینے کے لئے تیار ہو جائیں تو حکومت اتنے لوگوں کی رایوں کو اپنے خلاف ہونا آسانی سے برداشت نہیں کر سکتی۔ سو پچاس نہیں دس بیس آدمی بھی دھرنے پر بیٹھ جاتے ہیں تو حکومت دردسر میں تو ضرور مبتلا ہو جاتی ہے ہزار دو ہزار لوگوں پر مشتمل جلوس اور ریالی نکالی جائے تو حکومت خاموش نہیں بیٹھ سکتی۔ اسے کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑتا ہے اور نیچے سے اوپر تک فکر اور تشویش لاحق ہو جاتی ہے تمام پبلک کا موضوع گفتگو بن جاتا ہے اور اگر جلوس میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تو اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی پر اندر اور باہر تبصرے ہوتے ہیں۔ کسی موقع پر پہیہ جام کرنے کا اعلان اگر کسی گروہ نے کیا تو بڑے پیمانے پر حکومتی عملہ کو انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ غرض یہ کہ جن لوگوں سے حکومت کو اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری راہ میں مشکلات کھڑی کر سکتے ہیں ان کی آواز پر کان دھرا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اس راہ کو اپنانے سے پولیس کے ڈنڈے کھانے پڑتے ہیں۔ سڑکوں پر گھسیٹے جانے کا بھی اندیشہ ہو سکتا ہے قید و بند کا مرحلہ بھی آ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے لیکن ایسے گروہ کی باتوں کو نظر انداز کرنا کسی حکومت کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔

اب جائزہ لے کر دیکھئے...... مسلمانوں نے اپنے مطالبوں کو منوانے کے لئے ان ہتھیاروں کو کتنا استعمال کیا ہے اگر جمہوریت کے دیئے ہوئے ہتھیاروں کو استعمال نہیں کیا۔ صرف ووٹ دیتے رہے۔ اپنی ٹوپی، موزے، دستانے اور شیروانیوں کو گرد و غبار سے بچانے کی فکر دامن گیر رہی ہے تو جمہوریت کے دیئے ہوئے میدان میں

انہیں فتح کیسے نصیب ہوسکتی تھی؟ صرف قرار دادیں اور ریزرویشن پاس کرنے سے کسی کا کیا بگڑتا ہے اور کوئی کیوں آپ کے لئے زحمت کرے گا؟؟

مختصر یہ کہ مسلمانوں نے ایک غلط اور غیر مفید نسخہ دواساز سے بندھوایا مگر استعمال اس کو بھی پورا نہیں کیا تو ظاہر ہے کہ ان کا مرض کیسے ختم ہوتا اور ان کے دکھ درد کا کیسے مداوا ہوتا۔ حکمراں طبقہ ہمیشہ طاقت کی زبان سمجھتا ہے طاقت خواہ کسی طرح کی ہو۔ اس مقام پر یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج کیا ہے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ہمارے دکھ کا علاج ایسے نسخہ سے ہوگا جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات سے اخذ کیا گیا ہو۔ لن یصلح اٰخر ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا۔ اس امت کے بعد والے لوگ اسی چیز سے درست ہوں گے، جس سے پہلے کے لوگ درست ہوئے تھے۔ یہ صحیح اور سچی ایمان کی بات ایسے ہمارے دماغوں سے نکل گئی ہے کہ ہمارا بڑے سے بڑا آدمی بھی ملک وملت کے سدھار اور نجات کے موضوع پر بولتا ہے تو یہی بولتا ہے کہ ہمارے سارے امراض کا علاج جمہوریت اور سیکولرزم کی بقاء اور استحکام میں ہے یہ بولنے کی ہمت اور توفیق نہیں ہوتی کہ سارے جہاں کی بیماریوں کے لئے نسخہ شفاء اسلام میں ہے قرآن میں ہے۔

آپ ٹھنڈے دل ودماغ سے سوچیں گے تو یہ ماننے کے لئے مجبور ہوں گے کہ مسلمان اس وقت جس شکل میں بھی سیاسی عمل کررہے ہیں وہ بحیثیت مسلمان نہیں کررہے ہیں کیونکہ مسلمان ایک صاحب نظریہ اور صاحب عقیدہ ملت ہیں جن کے پاس عقیدۂ توحید پر مبنی ایک دستور، ایک تفصیلی قانون ''فقہ'' اور مکمل نظام ہے وہ معیشت، معاشرت اور سیاست کے باب میں کچھ ایسے بنیادی اصول رکھتے ہیں جو وقت کے مروجہ اصول سیاست، معاشرت اور معیشت سے بالکل جداگانہ ہیں لیکن مسلمان ان اصولوں کو لے کر سیاست میں شریک نہیں ہورہے ہیں اور نہ برسر اقتدار پارٹی اور اپوزیشن ان اصولوں کے ساتھ انہیں کچھ دینے کے لئے تیار ہیں بلکہ انہیں گوارا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کی جو حیثیت بھی بنتی ہے وہ یہ کہ بھارت کا ایک اقلیتی گروہ ہے جو بھارت کے دستور کے دیئے ہوئے کچھ حقوق اور اختیارات کا مستحق ہوتا ہے۔ ان کی حیثیت اور مقام کا تعین دستور ہند کرتا ہے نہ کہ قرآن اور سنت۔ وہ اللہ اور اس کے رسول کے ماتحت نہیں ہیں وہ دستور ہند کے ماتحت ہیں۔ وہ شریعت کے محکوم نہیں ہیں آئین ہند کے محکوم ہیں یہ حقیقت واقعہ ہے جس کو تسلیم کئے بغیر ہمیں کوئی چارہ نہیں ہے۔ لیکن اس کو برضاء ورغبت قبول کرنا اور اسی پر راضی اور قانع ہوکر محض حقوق طلبی کی سیاست پر قناعت کرنا اور اسی کو کافی سمجھنا نہ عقلی لحاظ سے صحیح ہے اور نہ دینی اعتبار سے۔ اس لئے کہ دستور اسلامی کے بجائے کسی دوسرے کے تابع اور محکوم بن کر حقوق طلبی کی سیاست اختیار کرنے کا آخری نتیجہ غیر اسلامی تہذیب

میں ضم ہوجانا ہے۔ اس لئے کہ جس حالت میں پچاس سال گزرے ہیں۔ حقوق طلبی والی سیاست کے ذریعہ آئندہ اس حالت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آسکتی اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ جو تبدیلی بھی ہوگی وہ زوال اور انحطاط کی طرف مائل ہوگی۔ جس کا اندازہ ہمیں اقتدار اور دولت میں مسلمانوں کی حصہ داری کو دیکھ کر ہوتا ہے کہ کبھی پارلیمنٹ میں ۴۶ مسلمان ممبر تھے اور اب ۲۸ رہ گئے ہیں آزادی کے وقت سرکاری نوکریوں میں ۳۰ فیصد مسلمان تھے اب ۲ فیصد باقی ہیں۔ اسی طرح غیرت دینی اور قومی حمیت میں کمی آئی ہے اور اپنی تہذیب زبان اور اپنے تشخص کے تحفظ کے لئے مدافعانہ کوشش اور احساس زیاں کا گراف بھی ڈاؤن ہے فرض کیجئے اسی طرح اسی کیفیت میں سَو دوسَو سال ملّت پر گزر جائیں تو ہماری حالت کیا ہوگی؟ دل پر ہاتھ رکھ کر غور فرمائیے اور بتائیے کہ اکیسویں صدی کے ختم تک ملت زبوں حالی کے کس مقام تک پہنچے گی؟!

لہٰذا دینی اعتبار سے موجودہ حقیقت واقعہ کو بخوشی قبول کرنا اور موجودہ سیاسی حکمت عملی کو کافی سمجھنا اور اس پر راضی اور خوش رہنا قطعاً صحیح نہیں ہے اس لئے کہ

① کوئی شخص ہو یا کوئی قوم یا گروہ یا کوئی پارٹی مسلمان کسی کا مستقل تابع دار اور محکوم بن کر نہیں رہ سکتا۔ اس نے اللہ اور رسول کی تابع داری اور محکومیت بلا کسی شرط اور بلا کسی استثناء کے قبول کرلیا ہے۔ اس نے اللہ کو معبود، حاکم، آمر اور ناہی بلا شرکت غیر کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھ کر مان لیا ہے۔ مختصر یہ کہ جس طرح اللہ کی عبادت میں کسی غیر کی شرکت مسلمان کے نزدیک ناقابلِ قبول ہے اسی طرح اطاعت مطلقہ میں بھی اللہ اور اس کے رسول کے سواء کسی کو شریک کرنا ازروئے کلمۂ توحید ناقابل تسلیم ہے اس کے لئے صرف ایک آیت قرآنی بطور دلیل کے کافی ہوگی۔

① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا. (النساء:۸۹)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اور اگر تم کسی چیز میں جھگڑو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ اولی الامر کی اطاعت کے لئے دو شرطیں ہیں اول ان کا مومن ہونا دوسرے اللہ اور اس کے رسول کے خلاف نہ ہونا۔

① اُمّتِ مسلمہ اپنے منصب اور ذمہ داری کے لحاظ سے رسول اللہ کی جانشین ہے قرآن نے صراحت کے ساتھ واضح کردیا ہے کہ ہر رسول مطاع ہوتا ہے۔ یعنی اس کی اطاعت کی جاتی ہے سب لوگ اس کے تابع ہوتے

ہیں وہ کسی کا تابع اور مطیع نہیں ہوتا ہے۔ اس روشنی میں امت مسلمہ کی حیثیت بھی اس زمین پر مطاع کی ہے وہ کسی کی تابع، مطیع اور ماتحت نہیں ہوسکتی۔

② وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ (النساء:۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا ہے مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس مضمون کی تائید آیت "وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ" سے بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے کو اقلیت اور بے مایہ تصور کرنا پس ماندہ طبقات میں شمار کرنے کیلئے درخواست کرنا اور تحفظات کی بھیک مانگنا کسی طرح امت مسلمہ کیلئے زیبا نہیں۔

③ مسلمانوں کو خیر امت اور امت وسط کا لقب دیا گیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ وہ دنیا کے سامنے سوالی بن کر نہ آئے۔ بلکہ اللہ کے بندوں کو مادی اور روحانی ہر اعتبار سے دینے والا انہیں بننا ہے اور اونچے مقام پر کھڑے ہوکر ساری دنیا کو بتانا ہے کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے؟ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ پھر اس کی حیثیت صرف واعظ اور ناصح کی بھی نہیں ہے دنیا میں عدل اور قسط قائم کرنے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔

③ كُنۡتُمۡ خَيۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ. (ال عمران:۱۱۰)

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالی گئی ہے تم معروف کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

④ وَكَذٰلِكَ جَعَلۡنٰكُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَيۡكُمۡ شَهِيۡدًا (البقرۃ:۱۴۳)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا تا کہ لوگوں پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ بنے۔

⑤ اِتَّبِعُوۡا مَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَلَا تَتَّبِعُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اَوۡلِيَآءَ (الاعراف:۳)

ترجمہ: تم اتباع اس چیز کی کرو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے تمہارے رب کی جانب سے اور اتباع نہ کرو اللہ کے سواء دوسرے اولیاء کی۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت حق کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ غلبہ دین کی جدوجہد بھی اس پر فرض ہے اور غلبہ دین کے لئے وہ سب کچھ کرنا جو اللہ اور رسول نے بتایا ہے۔

⑥ هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ. (الصّف:۹)

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ دین حق کو تمام دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرکین ناپسند کریں۔

گویا میدان سیاست میں مسلمانوں کی منزل اور گول کو یہ آیت متعین کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ رسول کا مشن دین حق کو تمام دینوں پر غالب کرنا تھا۔ اس لئے مسلمان ملت کا مشن بھی یہی ہونا چاہئے۔ سیاست کے میدان میں جتنے گروپ بھی کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی نظریہ اور نظام کو غالب اور حکمران بنانے کی بات کرتے ہیں اس پس منظر میں مسلمان کا سیاسی مشن عقیدہ توحید پر مبنی نظام اسلامی کو غالب اور حکمران بنانے کی کوشش کرنے کے سواء کیا ہوسکتا ہے۔

آیت نمبر۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ۔ وحی الٰہی کے علاوہ ہر فکر، ہر خیال ہر نظریہ اور ہر عقیدہ خواہ ''کسی شکل میں ہو'' کی اتباع سے منع کیا گیا ہے اس لئے زندگی کے ہر میدان میں جدوجہد کرتے وقت اس بات کا خیال رہنا چاہئے کہ ہم وحی کی پیروی کریں۔ لوگوں کے اھواء کی اتباع سے محفوظ رہیں اس حکم کا اطلاق سیاسی میدان میں بھی ہوگا۔

آیت نمبر۳۔۴ میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان کو اپنے منصب اور مقام کا خیال ہونا چاہئے زندگی کے کسی میدان میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں نیچے مقام پر کھڑا نہیں ہونا چاہئے۔ ان کا دست نگر بننے کا مظاہرہ نہ ہو اور اس کردار کا سیاسی زندگی میں مزید نمایاں ہونا ازبس ضروری ہے۔

آیت نمبر۱۔۲ سے کھلے طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ کسی مرحلہ اور کسی حالت میں مسلمان کا کردار یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اللہ اور رسول کی سند کے بغیر کسی اطاعت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لے۔

ان قرآنی اصولوں کی روشنی میں ہماری موجودہ سیاسی حکمت عملی اور اس کی بنیادوں کا غلط ہونا کھلے طور پر دیکھا جاسکتا ہے حقوق طلبی کو سیاسی مقصد بنانا اور پھر اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے جو چار فارمولے آزمائے گئے ہیں وہ بھی غلط ہیں اس لئے کہ ہر فارمولہ میں قرآن کی کسی نہ کسی تعلیم کو نظرانداز کرنا پڑے گا۔ جہاں تک ان فارمولوں کے بےفیض اور ناکام ہونے کا سوال ہے اس کا جواب گذشتہ پچاس سال کے تجربہ نے لکھ دیا ہے اس کا کم سے کم تقاضہ یہ ہے کہ ان چاروں فارمولوں کو کچھ عرصہ کے لئے ہم چھوڑ دیں اور کوئی نیا فارمولہ تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اصل مشن غلبۂ دین کو چھوڑ کر حقوق طلبی کی سیاست نے ملک کی اکثریت کو جو ہمارا دشمن بنا دیا ہے ممکن

ہے اس میں کچھ کمی ہوجائے اور فسطائی قوتوں کو غذا ملنی بند ہوجائے۔ یہ ایک عارضی اور ضمنی فائدہ ہوسکتا ہے سیاسی مفادات کی بناء پر جو اختلافات ہمارے اندر پیدا ہوگئے ہیں ان میں بھی کمی واقع ہوجائے گی۔

اس کے علاوہ ہم انبیاء علیہم السلام کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اپنے وقت کے شرک اور الحاد کی بنیاد پر چلنے والے سسٹم سے الگ رہ کر اپنے مشن کی مہم چلائی۔ بنی اسرائیل جن کے حالات سے ہندوستانی مسلمان ملت کے حالات زیادہ مشابہ ہیں۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعونی سسٹم سے بالکل الگ رہ کر اپنی مہم چلائی۔ اس طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مشرکانہ سسٹم سے اجتناب کرتے ہوئے اپنی مہم جاری رکھی۔ حتی کہ مشرکین نے اقتدار اور دولت میں بڑا حصہ دینے کی پیشکش کی تو بھی اس کو قبول نہیں کیا اور وقت کے جاری اور حکمراں سسٹم سے باہر رہ کر جدوجہد کرتے رہے یہاں تک کہ بڑے سے بڑا سیاسی مقصد حاصل کرلیا۔ ان وجوہ کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ صحیح ہے اور مفید کہ وہ اقتدار و دولت میں حصہ داری اور دوسرے مطالبوں، اسمبلیوں میں نمائندگیوں اور ملازمتوں کے لئے کشمکش ترک کردیں۔ یہ روش اور طریقہ کار بحیثیت مجموعی ملّتِ اسلامیہ کیلئے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں مضر ہے۔ یہ کوئی منفی کام نہیں ہے بلکہ غلط لائن چھوڑ کر صحیح لائن پر گاڑی کو ڈالنا ہے وہ صحیح لائن یہ ہے کہ......

① بلا کم و کاست پورے دین کی دعوت دی جائے نہ کسی سے مرعوب ہوا جائے اور نہ کسی کا خوف کھایا جائے۔ مذاہب کی جانب سے عبادت میں پیدا کئے ہوئے شرک کے خلاف بھی آواز لگائی جائے اور اطاعت مطلقہ میں جدید نظریات کے شامل کئے ہوئے شرک کی تردید بھی کی جائے اور بتایا جائے کہ جس طرح بتوں کی پوجا انسانیت کیلئے تباہ کن ہے اسی طرح انسان پر انسان کی حکومت بھی تباہی کا موجب ہے۔ خواہ فسطائیت کی شکل میں ہو یا جمہوریت کی صورت میں۔ عبادت اور اطاعت دونوں کے سلسلہ میں توحید کے کھرے کھرے تقاضے پیش کئے جائیں۔ شرک جس صورت میں بھی اور جہاں بھی پایا جائے گا دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں باعث ہلاکت ہوگا۔ یہ بات واشگاف انداز میں رکھی جائے۔

دعوت کے اس مفہوم کے ساتھ جو لوگ بھی اکٹھا ہوں ان کو منظم کیا جائے ان کی تربیت اور تزکیہ کیا جائے اور پھر ایک منظم جتھے کے ساتھ بے لاگ برملا دوٹوک انداز میں راست اسلام کی طرف بلایا جائے یہاں تک کہ ملک میں قومی کشمکش کے بجائے حق و باطل اور توحید اور شرک کی کشمکش شروع ہوجائے۔ اس وقت جب کہ ہندوتوا اور سیکولرزم دو آپشن ہیں اور لوگوں کے سامنے یہ سوال ہے کہ

کس کو اختیار کیا جائے اور کس کی تائید کی جائے ہماری کوشش ہو کہ دو کے بجائے تین چیزیں سوالیہ نشان کے طور پر ابھر کر منظر عام پر آ جائیں کہ ان تینوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے اور کس میں ملک کی اور انسانیت کی نجات اور فلاح ہے۔ ہندوتوا، سیکولرزم یا اسلام؟

(۲) اپنے تحفظ اور حقوق کو ایشو بنانے کے بجائے پوری خلق خدا کی فلاح و بہبود کیلئے مہم چلائی جائے اور ہر موقع پر ان کے دکھ درد میں شریک ہوا جائے۔ ظلم و ناانصافی جہاں بھی ہو اس کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور نیکی اور اچھائی کی تائید بلا کسی تعصب اور ذات اور برادری کے امتیاز کے بغیر کی جائے۔

(۳) دور جدید کے جدید ہتھیاروں مثلاً اسٹرائیک، مظاہرے، جلسے، جلوس، دھرنا، پہیہ جام کرنا وغیرہ کو ان کی قباحتوں سے بچتے ہوئے منکرات کے مٹانے اور نیکی اور بھلائی کی ترویج میں استعمال کیا جائے جبکہ دوسرے لوگ محض اپنے معاشی مفادات کے لئے یہ ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔

(۴) ملک کی اکثریت سے اگر کوئی مطالبہ کرنا ہے تو یہ مطالبہ کیا جائے کہ مسلمانوں کو ایک اقلیتی گروہ نہیں بلکہ ایک صاحب عقیدہ نظریاتی گروہ کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے اور ایسی عدالتیں ہمارے لئے قائم کی جائیں جن میں مسلمانوں کے آپسی سارے مسائل اور مقدمات کا فیصلہ شریعت اسلامی کی روشنی میں کیا جائے اور ان کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ داری حکومت قبول کرے۔ اوقاف کا پورا نظم و انصرام مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو عصری اور دینی دونوں تعلیم کا نظم بھی مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو۔ مختصر یہ کہ اس طرح کا پورا سسٹم چلانے کیلئے ایک باڈی بنائی جائے جس کے ممبران اور ذمہ داران مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب ہوں اور یہ انتخاب بھی الیکشن کمیشن کے ذریعہ کرایا جائے اور مسلمانوں کے ان منتخب نمائندوں کی حیثیت ایم۔ پی کے برابر ہو۔ ملک کی اکثریت کو یہ سمجھایا جائے کہ اس میں نہ ملک کا نقصان ہے نہ ملک کے کسی طبقہ کا نقصان ہے۔ اور فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان ملت کے اندر زیادہ سے زیادہ اطمینان و سکون پیدا ہوگا اور وہ اس طرح ملک کے لئے زیادہ مفید ہو سکیں گے۔

ازالۂ شبہات

اس مقام پر چند شبہات کا ازالہ بھی ضروری ہے۔

(۱) موجودہ سیاسی حکمت عملی کو ترک کرنے کی جو بات ہم نے کہی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہم الیکشن کو شجر ممنوعہ سمجھتے ہیں۔ الیکشن میں شریک ہوا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض وقت ضروری ہوگا۔ بشرطیکہ

کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔اس وقت کے الیکشن میں قباحت یہ ہے کہ یہاں کئی ایک باطل اور فاسد نظریات وعقائد کی جنگ ہے۔ الیکشن میں شرکت کا مطلب یہ ہے کہ ایک باطل نظریہ کے مقابلہ میں دوسرے باطل نظریہ کی ہم تائید کرتے ہیں۔ایک فاسد اور مشرکانہ نظام کی جگہ دوسرے فاسد اور مشرکانہ نظام کے قیام کی جدوجہد میں ہم شریک ہورہے ہیں۔غور فرمایئے اگر دو بت رکھے ہوئے ہوں اور دونوں کے پروہت دعوی کریں کہ ہمارا بت قابل پرستش ہے اور ہر ایک عوام کی تائید حاصل کرنے کی کوشش کرے اور آخری فیصلہ کیلئے ووٹنگ ہوتو کیا اس ووٹنگ میں کسی مسلمان کا شریک ہونا جائز ہوسکتا ہے؟ ہاں اگر ایک طرف باطل نظریہ اور فاسد نظام ہو اور دوسری طرف عقیدۂ توحید اور نظام حق ہوتو اس وقت ووٹنگ میں شرکت ایک مسلمان کا فرض ہوگا اور وہ نظام حق کے حق میں ووٹ ڈالے لیکن ایک ناحق کی جگہ دوسرے ناحق کو ثابت اور قائم کرنے کیلئے کوئی مسلمان کیسے کھڑا ہوسکتا ہے؟!

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ (النساء:٧٦)

ترجمہ: ایمان لانے والے اللہ کے راستہ میں لڑتے ہیں اور کفر کرنے والے طاغوت کی راہ میں لڑتے ہیں۔

(٢) لوگ کہیں گے کہ اس طرح تو ہم ملک میں یکا وتنہا ہوکر ہر اعتبار سے پیچھے ہوجائیں گے۔ میں پوچھتا ہوں آپ نے اپنے آپ کو پچھلی لائن میں کھڑا ہی کرلیا ہے سوچئے موجودہ جمہوری سسٹم میں کیا آپ کبھی اکثریت میں آسکتے ہیں؟ الا یہ کہ اللہ تعالی اپنی قدرت سے کوئی راستہ نکال دے۔ اگر آپ اکثریت میں نہیں آسکتے تو آپ آگے کیسے آئیں گے۔ آپ کا دس فیصد آنا بھی اس وقت محال نظر آتا ہے تو آپ کی بات کیسے چلے گی۔ آپ کا وزن کیسے محسوس کیا جائے گا۔ آپ آگے کیسے آئیں گے؟ اِلّا یہ کہ سیاست میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا کی جائے۔ ہم کہتے ہیں آگے آنا ہے تو اس سسٹم کو ہٹانے کی کوشش کیجئے۔ ورنہ پس ماندگی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتے ہیں۔

(٣) کہا جاتا ہے کہ ووٹ ایک امانت ہے اور ووٹ دینا ہمارا قانونی حق ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے مگر یہ بھی تو سوچئے اس امانت کا اہل کون ہے یہ امانت اہل کفر کے حوالہ کی جاسکتی ہے؟ یا ایسے لوگوں کے حوالہ کی جاسکتی ہے جو اپنے دعویٔ ایمان کے باوجود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی سند کے بغیر قانون سازی کرتے ہیں اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کو اجتماعی اور سیاسی امور میں پیش نظر رکھنے کے قائل نہیں ہیں اور جو لوگ منصب اور عہدہ کی طلب رکھتے ہیں اور اس کے لئے دن رات دوڑ

دھوپ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ امانت کیسے سونپی جاسکتی ہے؟ کیا کسی ایسے شخص کو مسجد میں امام بنایا جاسکتا ہے جو امامت کی طلب رکھتا ہو اور اس کی کوشش کرتا ہو؟ ان پہلوؤں سے آپ سوچیں گے تو آپ تسلیم کریں گے کہ موجودہ سیاسی سسٹم ہماری دنیا اور آخرت دونوں کے لئے سم قاتل ہے۔ لہٰذا ہمیں شریعت اسلامی کی روشنی میں کوئی دوسرا راستہ نکالنا پڑے گا۔

(۴) ممکن ہے ان باتوں کو پڑھ کر کچھ لوگ یہ کہیں کہ یہ کیا عجیب بحث کی جارہی ہے۔ اس لئے اس ضمن میں اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کے لئے حالیہ ایک قصہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔

ماہ اگست ۹۹ء کے دوسرے دہے میں اتفاقاً حیدرآباد میں ایک بحث چھڑ گئی۔

مولانا محمد حمیدالدین عاقل حسامی صاحب نے کسی موقع پر کہہ دیا کہ فلاں پارٹی کو ووٹ دینا حرام ہے۔ اس اعتبار سے مولانا نے صحیح لائن اختیار کی کہ شرعی اصطلاح استعمال فرمائی۔ کسی چیز کی شرعی حیثیت متعین کرنے کیلئے یہی طریقہ مناسب ہے۔ اس کے جواب میں کہا جانا چاہئے تھا کہ فلاں فلاں وجہ سے حرام نہیں۔ مباح یا مستحب ہے وغیرہ۔ لیکن بے لائن کی بات کہی جانے لگی۔ مثلاً کل ہند سنی علماء بورڈ نے کہا ''ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے......لوگ مختلف سیاسی جماعتوں سے وابستہ ہیں اور اپنی پارٹی کو ووٹ دینے کا قانونی جواز رکھتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جمہوری ملک میں شرعی بنیادوں پر بات نہیں کہی جاسکتی۔ کیا اس کے لئے کوئی شرعی دلیل ہے؟

قانونی جواز سے کیا مطلب ہے؟ کیا شرعی جواز کے مقابلہ میں قانونی جواز کی بات کہی جاسکتی ہے؟ جس قانون کی بات آپ کہہ رہے ہیں اس قانون کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟ پھر کہا گیا کہ مولانا عاقل صاحب کو فتوی دینے کا حق نہیں ہے۔ فی الحال یہاں نہ تو ہم اصل مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مولانا عاقل صاحب کی بات صحیح ہے یا غلط۔ اگر ضرورت پڑے گی تو ان دونوں پہلوؤں پر کسی وقت گفتگو کی جاسکتی ہے اور گفتگو ہونی چاہئے۔ مولانا عاقل صاحب سے پوچھنا چاہئے تھا کہ حرام کہنے کی علت کیا ہے؟ پھر اس کے بعد بحث کی جاتی کہ ان کی بتائی ہوئی علت صحیح ہے یا غلط ہے اور اس علت کی بنیاد پر کوئی حکم لگانا کیا حیثیت رکھتا ہے؟

افسوس ہے کہ وضو اور غسل وغیرہ چند مسائل میں علماء فقہی طرز پر بحث اختیار کرتے ہیں۔ بقیہ اجتماعی مسائل میں عام لوگوں کی روش اختیار کر لیتے ہیں۔ جواب طلب سوال صرف ایک ہے وہ یہ کہ کسی قانون ساز ادارہ میں کتاب وسنت، قیاس اور اجماع کو نظر انداز کر کے قانون سازی کیلئے کسی شخص کو شرعاً متعین کیا جاسکتا ہے؟ اس جواب کے بعد معلوم ہوگا کہ کس کو ووٹ دینا حرام اور کس کو حلال ہے۔

مساجد اللہ

(۲۰۰۱ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

''ملک کی ترقی، بھلائی اور نجات کا دارومدار نہ بائیں بازو کی حکومت پر ہے نہ دائیں بازو کی حکومت پر ہے۔ اسی طرح نہ ہندوتوا کے برسر اقتدار آنے پر ہے اور نہ سیکولر گروپ کے گدی سنبھالنے پر ہے بلکہ سارا دارومدار صرف اس پر ہے کہ ملک میں انسانی اور اخلاقی اقدار پروان چڑھیں اور امانت، دیانت اور عدل وانصاف کا بول بالا ہو......ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو......اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلے۔ اللہ کا نام لینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور عبادت گاہیں محفوظ رہیں۔''

فہرستِ مضامین

تمہید

ہمارے ملک ہندوستان کے ایک اہم مقام ایودھیاء، ضلع فیض آباد، اتر پردیش میں ایک مسجد ''بابری مسجد'' کے نام سے تقریباً پانچ سَو (۵۰۰) سال پہلے تعمیر کی گئی تھی، تاریخ تعمیر ۱۵۲۸ء سے ۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء تک اس مسجد میں نماز باجماعت مسلمان ادا کرتے رہے۔ ۲۲ر اور ۲۳ر دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی شب میں چوری سے مسجد میں مورتیاں رکھ دی گئیں۔ اس کے بعد معاملہ پولیس میں گیا اور آخر کار عدالت کے حکم سے مسجد مقفل کر دی گئی اور وہاں ایک پجاری کو بٹھا دیا گیا اور معاملہ جوں کا توں کم و بیش ۴۶ سال تک باقی رہا، اس کے بعد یکم فروری ۱۹۸۶ء کو کچھ سیاستدانوں نے اپنی سیاسی مصلحتوں کے تحت عدالت کے حکم سے تالا کھلوا دیا، اور عام ہندوؤں کے لئے پوجا پاٹ کا موقع فراہم کیا گیا۔

دوسری طرف ۱۹۴۹ء سے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں مسجد کی ملکیت کی بابت مقدمہ چل رہا ہے اور آج پچاس سال میں بھی عدالت کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ بلکہ الٹے عدالت کے ذریعہ ہی ہندوؤں کو یہ موقع فراہم کیا گیا کہ وہ بزور مسجد کو منہدم کر دیں اور مسجد کی جگہ مندر کا نیا عارضی ڈھانچہ تیار کر لیں۔ یہ سارا عمل دن دھاڑے ساری دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ تیسری طرف مسجد کے رکھوالے یعنی ہندوستانی مسلمان ملک کی عدالت اور انتظامیہ پر بھروسہ کئے بیٹھے رہے۔ البتہ مسجد کے انہدام کے بعد پورے ملک میں سینکڑوں جو شیلے نوجوانوں نے اپنے غم وغصہ کا جب اظہار کیا تو پولیس نے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا اور ان گنت مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ ان ہنگاموں کے دوران جو واقعات پیش آئے ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت مسلمانوں کو اس طرح مرعوب کر دینا چاہتی ہے کہ وہ آہ بھی نہ کر سکیں۔ اور حکومت اپنے اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک طبقہ ذہنی اور فکری طور پر پسپا ہو چکا ہے جس میں مذہبی اور غیر مذہبی علماء اور جدید

دانشور سب ہی شامل ہیں۔ انتہاء یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بتوں کو منہدم کرنے پر طالبان کو خوب خوب ملامت کی، لیکن مسجد کو گرانے والوں کو کچھ نہ کہہ سکے۔ بلکہ اُلٹے مسجد سے دستبرداری ہی کو باعث خیر ثابت کرنے پر زور لگایا۔اس بات کے ثبوت میں ہم چار باتیں کہہ سکتے ہیں:

① گذشتہ پچاس سال میں فسادات کا مسئلہ ہو یا بابری مسجد میں تالا لگنے یا تالا کھلنے، شیلا نیاس ہونے یا پھر مسجد کا انہدام اور انہدام کے بعد دوبارہ مندر بننے کا ہو، یہ سب کچھ سیکولر اقتدار کے چھایہ تلے ہوا ہے۔مگر پھر بھی اونچی سطح کے کچھ لوگ اپنے لئے آخری پناہ گاہ سیکولر اقتدار ہی کو سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں ہندوستان میں زندہ رہنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

② بابری مسجد کا مسئلہ خالص دینی مسئلہ ہے۔لیکن اس مسئلہ کو عام طور پر دینی مسئلہ قرار نہ دے کر سیکولرزم اور جمہوریت کی بقاء اور علامت کا مسئلہ قرار دیا گیا۔

③ مسلمانوں کی کسی قابل ذکر شخصیت اور تنظیم نے بابری مسجد کے تیئں اپنے کسی عزم کا اظہار نہیں کیا۔ زیادہ سے زیادہ جو کیا وہ بس یہ ہے کہ مسجد کی برقراری کا اقرار کیا۔

④ چوتھی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی جانب سے بلاضرورت یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ ہم عدالت کے فیصلے کو تسلیم کریں گے جب کہ دوسرا فریق صاف صاف کہہ رہا ہے کہ یہ مذہبی مسئلہ ہے۔ اس میں ہم عدالت کے فیصلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ عدالت کے فیصلہ کو نہ ماننے کا مسلمانوں کی جانب سے کہاں سے اندیشہ ہوسکتا تھا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ مسلمان عدالت کے کسی فیصلہ کو رد کر دینے کے موقف میں ہیں؟ خواہی نہ خواہی انہیں عدالت کا فیصلہ تو ماننا ہی ہے۔ اس کے اعلان کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

یہ تحریر دراصل پسپائی قبول کرنے والوں کو ذہنی اور فکری پسپائی سے نکالنے کیلئے ایک کوشش کے طور پر تیار کی گئی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہے اس کا فیصلہ ہم قارئین پر چھوڑتے ہیں۔ دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بضاعت مزجات کو قبول کرے اور ملّتِ اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ اور بابری مسجد کی بازیابی کا اسے ذریعہ بنائے۔آمین

مسئلہ کی نوعیت

مسجد سے متعلق جو مسئلہ ہمارے سامنے درپیش ہے، وہ مسجد بابری کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ مختلف اسباب کی بناء پر اتنا اہمیت اختیار کر چکا ہے کہ ہندوستان کا کوئی لیڈر جب خطاب کرتا ہے یا کوئی مقالہ نگار یا تجزیہ نگار ملکی حالات پر قلم اٹھاتا ہے تو کسی نہ کسی نوعیت سے بابری مسجد کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ملکی سیاست پر اس مسئلہ کے گہرے

اثرات ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ جہاں ایک طرف بابری مسجد کے سلسلہ میں اپنے خاص طرز عمل کی بناء پر ہندوستان کی سب سے مضبوط اور سب سے قدیم پارٹی کانگریس کو اقتدار سے محروم ہونا پڑا وہیں بی جے پی اپنے خاص طرز عمل اور رویہ کے ذریعہ اقتدار کی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ تیسری طرف ایک عام تاثر یہ ہے کہ ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کو واقع ہونے والے سانحہ کی بناء پر مسلم نوجوانوں میں ایک خاص قسم کی بیداری پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ پرانی مسلم قیادت کو اس سانحہ نے مزید بے حوصلہ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ چند سطروں پہلے اس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ اس مسئلہ کو چھیڑنے سے دعوتی مواقع تباہ ہو جائیں گے۔ کوئی بڑے ہی دانشورانہ اور علمی انداز میں بولتا ہے کہ اس مسئلہ کی وجہ سے مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی ترقی میں خلل ہوگا۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ ہم اقلیت میں ہیں، کسی اقلیت کا اکثریت سے ٹکرانے کا مطلب ''آ بیل مجھ کو مار'' ہے اس مسئلہ میں پڑنا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ کوئی صاحب بڑے حقیقت پسندانہ لب ولہجہ میں فرماتے ہیں کہ ایک مسجد کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بے شمار مسجدیں موجود ہیں اور مزید کئی نئی مسجدیں بنائی جاسکتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم پر دعوت دین کی اہم ذمہ داری بحیثیت خیر امت کے اللہ کی جانب سے ڈالی گئی ہے، لہٰذا ہمیں دعوتی مواقع تلاش کرتے رہنا چاہیے اور میسر مواقع کو باقی رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر قیمت پر؟ کیا دعوتی مواقع کی بقاء کیلئے اپنے ذمہ عائد ہونے والے فرائض اور ذمہ داریوں سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے؟......کیا نماز کو اس غرض کیلئے چھوڑ سکتے ہیں؟......اور اگر نماز کو چھوڑ نہیں سکتے تو مسجد کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟؟......اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد دعوتی حکمت عملی کے تحت مشرکین مکہ کی کتنی رعایت کی؟......کیا اس سلسلہ میں دو چار مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ آپ ﷺ نے اور آپؐ کے اصحابؓ نے ایسی ذمہ داریوں کو ادا کرنا چھوڑ دیا ہو جو شریعت کی جانب سے ان پر ڈالی گئی ہوں تاکہ دعوت کیلئے فضاء اور ماحول پرسکون رہے؟ مکی دور میں جو اذیت ناک حالات تھے ان کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے مگر ماحول کو ہم آہنگ اور پرسکون رکھنے کیلئے کوئی کوشش اس انداز کی نبیؐ کی طرف سے نہیں کی گئی کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی ہدایت کو پس پشت ڈال دیا گیا ہو۔ جبکہ حالات کے دباؤ اور دعوتی حکمت عملی کے تحت اس طرح کی سوچ پیدا ہوسکتی تھی۔ یا ممکن ہے بعض لوگوں کے اندر پیدا ہوئی ہو، یا پیدا ہونے کا امکان ہو۔ غالباً اسی پس منظر میں مسلمانوں کو نبی ﷺ کے توسط سے بار بار تاکید کی جاتی ہے کہ تم شک میں نہ پڑو، اپنے موقف پر قائم رہو اور استقامت کا مظاہرہ کرو۔ ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکو۔

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ یعنی ان کی خواہش ہے کہ آپ تھوڑا نرم ہوں تو وہ بھی نرم ہوجائیں گے۔ چنانچہ ہم سب جانتے ہیں کہ مکہ میں نبی اکرم ﷺ کو ذرا نرم کرنے کیلئے مشرکین نے بار بار مختلف تجویزیں پیش کیں اس کے برخلاف کوئی ایک ایسا واقعہ نہیں ہے کہ آپ ان کے پاس کوئی تجویز لے کر گئے ہوں کہ کشمکش ختم ہو یا کم ہوجائے۔ اسی طرح ہجرت کے بعد مدینہ پہنچتے ہی سرایا بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوگیا اور دو سال کے اندر ہی غزوۂ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ اس طرح کی ساری سرگرمیاں بظاہر دعوتی مواقع کو برباد کرنے والی تھیں۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟...... اس کا ایک ہی جواب ہے کہ یہ سرگرمیاں دراصل دین وایمان کا تقاضہ تھیں۔ یعنی دعوت دینا تو ضرور ہے لیکن دینی فرائض اور دینی تقاضوں سے صرف نظر کرکے نہیں۔ فرائض کی عدم ادائیگی کی صورت میں ہم تقویٰ اور خشیت الٰہی کی صفت سے خالی ہوجائیں گے جو ایک داعی کی بنیادی صفت ہے۔ غرض یہ کہ دین وایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دعوت کی ذمہ داری کو ادا کرنا ہے۔ اس لئے اصل چیز جو ہمیں سوچنے اور دیکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کے تئیں ہمارا فرض کیا بنتا ہے؟...... اگر مسجد کی حفاظت کے ضمن میں ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا ہو تو کوئی حرج نہیں جو ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں۔ لیکن اگر فرض بنتا ہے تو اس کو پورا کرنا چاہئے بقیہ باتیں اللہ کے حوالہ ہوں گی۔ یہی وہ موقع ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ اے نبیؐ! آپ کے ذمہ صرف پہنچا دینا ہے ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔ گویا بہت ساری ذمہ داریوں میں سے ایک بڑی ذمہ داری دعوت پہنچانا ہے، اس لحاظ سے یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ایک فرض کو ادا کرنے کے لئے دوسرے فرض کو چھوڑ دیا جائے۔

ہم کہتے ہیں کہ مسجد کو آباد کرنا، اس کی حفاظت کرنا، اس پر سے کفار ومشرکین کے قبضہ کو ختم کرنا اور منہدم کردہ مسجد کو از سر نو تعمیر کرنے کی کوشش کرنا ہماری شرعی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری سے فرار دنیا اور آخرت دونوں جگہ اللہ کے غضب کا سبب بنے گا۔ اس لئے اس مسئلہ کو سرسری انداز سے دیکھنا صحیح نہیں ہے۔

بابری مسجد کے مسئلہ پر لڑائی جاری رکھنے کی وجہ سے معاشی اور تعلیمی نقصان ہوسکتا ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ لیکن اس نقصان کو ہمیں برداشت کرنا چاہئے۔ اسی کا نام قربانی ہے۔ اس طرح کی قربانی دیئے بغیر نہ دنیا میں سرخروئی حاصل ہوسکتی ہے اور نہ آخرت میں۔ یہی وہ چیز ہے جسے اپنا کر ایک گروہ ہمیشہ کامران وکامیاب ہوتا رہا ہے اور اسی سے بھاگنے والے خسران اور ناکامی سے دوچار ہوتے رہے ہیں۔

اقلیت اور اکثریت کا جہاں تک مسئلہ ہے۔ اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن بتائیے اہل حق کب اکثریت میں رہے ہیں؟ اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کا کھڑا ہونا ہی تو سبب ہے بلندئ درجات کا۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ.
(الحدید:۱۰)

ترجمہ:تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہوسکتا جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کیا وہ لوگ درجہ میں ان سے بڑھ کر ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جنگ کیا اور اللہ نے ہر ایک سے اچھائی کا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ اس سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔

محض اقلیت میں ہونے کی بناء پر اللہ کی راہ میں جدوجہد نہ کرنے کی ذہنیت ایک بڑے مرض کی علامت ہے۔قرآن نے بنی اسرائیل کے دو گروہوں کا تذکرہ کیا ہے جب کہ انہیں جالوت سے لڑنے کا حکم دیا گیا تھا، ایک نے کہا:

قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ (البقرۃ:۲۴۹)

ترجمہ: یعنی انہوں نے کہا آج ہمارے اندر جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں ہے۔

دوسرے گروہ نے کہا:

قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (البقرۃ:۲۴۹)

ترجمہ: یعنی جنہیں اللہ سے ملنے کا یقین تھا، انہوں نے کہا کتنے ہی چھوٹے گروہ ہیں جو بڑے گروہ پر غالب ہو گئے اللہ کے اذن سے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہاں جس واقعہ کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے اس کو اپنے سامنے رکھیے اور یہ فیصلہ کیجئے کہ ہم کس گروہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

یہ بات کہ ایک مسجد کے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اس سوال پر یہ ایک سوال اٹھتا ہے کہ کیا بات ہے کہ پوری تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں نظر آتا جس میں کسی باوقار ملک کی فوج نے یہ کہا ہو کہ ایک چوکی کے چلے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے چند گز زمین کا مسئلہ ہے دشمن کو لے جانے دو۔

بایں وجوہ بابری مسجد کے مسئلہ سے صرف نظر کرنا اور اس سے اپنے کو دور رکھنا اور بچانا نہ صرف یہ کہ ایک دینی ذمہ داری کو ادا کرنے سے کتراناہے اور آخرت کا سودا کرنے کے بجائے دنیا کے حقیر مفادات کی محبت میں گرفتار ہونا ہے نیز اوپر اٹھنے کے بجائے پستی کی جانب گرنا ہے۔ بلکہ اس بات پر اپنی آمادگی اور رضا کا واضح طور

پر اعلان ہے کہ بس ہماری جان بخش دی جائے ہم نمبر دو اور تین کے شہری بن کر رہنے کے لئے تیار ہیں۔ اس پہلو سے بابری مسجد کا مسئلہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ بلکہ اسی ایک مسئلہ میں سارے مسائل ضم ہو گئے ہیں۔ مسلمانوں کے ان گنت مسائل اگر حل ہوں گے تو اسی مسئلہ کے حل ہونے کی صورت میں حل ہوں گے۔ اگر یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا تو آئندہ بھی کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا جیسے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہوا ہے بلکہ لاینحل مسائل میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قدرت کی مہربانی ہے کہ اس نے ہمارے سارے مسائل کو ایک مسئلہ میں سمیٹ دیا ہے جیسے کسی فوج کو درجنوں محاذوں پر لڑنے کے بجائے قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہوں کہ وہ ایک ہی محاذ پر قوت آزمائی کرے اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھا کر فتح مند ہو جائے یا اپنے نکمّے پن کا ثبوت دے کر پسپا ہو جائے۔

دین میں مسجد کی اہمیت

اسلام میں مساجد کا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں دل کا ہے۔ دل کی حرکت سے زندگی شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح مسجد سے ایمانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ دل کی حرکت بند ہونے کے بعد زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح بمشکل ہی کسی ایسی مسلم آبادی کا تصور کیا جا سکتا ہے جہاں مسجد نہ ہو۔

امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں آیت ''اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللّٰہِ'' کے تحت لکھا ہے کہ مسجد کی آبادکاری ایمان کی دلیل ہے بلکہ لفظ ''اِنَّمَا'' سے اشارہ ہو رہا ہے کہ ایمان صرف انہیں لوگوں میں ہوگا جن کے اندر مسجد کو آباد کرنے کی صفت پائی جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ آنے کے بعد سب سے پہلے مسجد بنائی۔ اس کے بعد ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجرے بنائے گئے۔ کعبۃ اللہ بھی ایک مسجد ہے، اس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنا مسلمان ہونے کیلئے ضروری ہے۔ دنیا کی تمام مسجدیں اسی مرکزی مسجد کی شاخیں ہیں۔ اسی طرح دنیا کی کسی مسجد کی بے حرمتی کعبۃ اللہ کی بے حرمتی کے ہم معنی ہے اور کسی بھی مسجد کی خدمت اور آبادکاری کعبۃ اللہ کی خدمت اور آبادکاری سے ملتی جلتی چیز ہے۔ ''اقامت صلوٰۃ'' کا حکم ایمان باللہ کے بعد پہلا حکم ہے اور ایمان کا ایک اہم ترین تقاضا ہے۔ اس حکم کی تعمیل کے لئے مسجد ایک لازمی چیز ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اَحَبُّ البلادِ الی اللّٰہ تعالی مساجدھا وابغض البلاد الی اللّٰہ اسواقھا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: اللہ کے نزدیک زمین پر سب سے محبوب جگہ مساجد ہیں۔ اور اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ مقام بازار ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ایک دوسری روایت ہے:

من تطھر فی بیتہ ثم مشی الی بیت من بیوت اللّٰہ لیقضی فریضۃ من فرائض اللّٰہ کانت خطواتہ احداھما تحط خطیئۃ والاخری ترفع درجۃ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: جس نے اپنے گھر میں وضو کیا، پھر کسی مسجد کی طرف چلا تا کہ کوئی فرض نماز ادا کرے تو اس کا ایک قدم اس کی خطا کو مٹاتا ہے اور دوسرا اُس کے درجہ کو بڑھاتا ہے۔

حضرت ابو سعید خدری ؓ نے بیان کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

اذا رایتم الرجل یعتاد المسجد فاشهدوا له بالایمان فان اللّٰہ تعالی قال انما یعمر مساجد اللّٰہ من اٰمن باللّٰہ والیوم الاخر ...الخ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: جب کسی آدمی کو دیکھو کہ مسجد کو آتا جاتا ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو صرف وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

بشر المشائین فی الظلم الی المسجد بالنور التام یوم القیامة۔ (رواہ ابن ماجه)

ترجمہ: خوشخبری دے دو ان کو جو اندھیرے میں مسجد کی طرف پیدل جاتے ہیں کہ انہیں قیامت کے دن نور کامل عطا ہوگا۔

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ مسجدیں اللہ کے گھر ہیں اور اللہ پر یہ حق ہے کہ اللہ ان کی عزت کرے جو اللہ کے گھر میں اللہ سے ملنے کیلئے آئیں۔ (بحوالہ تفسیر کبیر)

ایک مشہور حدیث ہے:

من بنی للّٰہ مسجدا بنی اللّٰہ له بیتا فی الجنة۔ (متفق علیه)

ترجمہ: جو کوئی اللہ کیلئے کوئی مسجد بنائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں ایک گھر بنا دیں گے۔

یہ کتنی عظیم بشارت ہے اس کا اندازہ اور اس کی قدر وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق اور عنایت خاص سے حصول جنت کا شوق پیدا کر دیا ہو۔ اسی بنا پر ہر دور میں مسلمانوں کے اندر مسجد بنانے اور مسجد کی خدمت کا بے پایاں ذوق وشوق پایا گیا ہے۔

مسجد اللہ کی ملکیت ہوتی ہے

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (الجن:۱۸)

ترجمہ: اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی ہیں لہٰذا ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو۔

سلسلۂ بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو حکم فرمایا کہ آپ کہہ دیجئے کہ میری طرف جن باتوں کی وحی کی گئی ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مسجدیں اللہ کیلئے خاص ہوتی ہیں۔

تفسیر کبیر میں اس آیت کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے: "ای فلا تدعوا مع اللّٰہ احداًفی المساجد لانها للّٰہ خاصة" پس اللہ کے ساتھ کسی اور کو مسجدوں میں نہ پکارو۔ اس لئے کہ مساجد اللہ کے لئے خاص ہیں۔

قرآن مجید میں کم از کم ۱۹ جگہ "مسجد" اور ۶ جگہ "مساجد" کا لفظ آیا ہے۔ ان سارے مقامات کو دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسجد اور مساجد سے مراد وہ جگہ ہے جو عبادت کیلئے مخصوص کی گئی ہو۔ اس کے باوجود بعض بزرگوں نے سات اعضاء، دونوں ہاتھ، دونوں قدم، دونوں گھٹنے اور پیشانی کو مراد لیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کے اطلاق سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ان اعضاء پر اللہ کے سوا کسی اور کیلئے سجدہ نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس آیت اور حدیث۔"میرے لئے پوری زمین مسجد بنادی گئی ہے"۔ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زمین پر اللہ کے سوا کسی اور کو نہ پکارو۔ بہرصورت مسجد اور مساجد سے مراد عبادت کے لئے مخصوص طور پر بنائی ہوئی جگہ ہے۔

آیت کے نزول کے وقت روئے زمین پر صرف دو مسجدیں تھیں۔ ایک کعبۃ اللہ مکہ معظّمہ میں اور دوسرے مسجد اقصیٰ فلسطین میں۔ اس کے باوجود جمع کا لفظ مساجد آیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حکم رہتی دنیا تک زمین پر تعمیر ہونے والی تمام مسجدوں کے بارے میں دیا گیا ہے۔

مشرکین مکہ خانۂ کعبہ میں اور یہود و نصاریٰ اپنی اپنی عبادتگاہوں میں اللہ کے ساتھ کئی خداؤں کی پوجا کرتے تھے، اور کئی بتوں کے سامنے سجدہ کرتے تھے، اس پس منظر میں حکم دیا گیا کہ مساجد میں صرف اللہ کو پکارو، اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو، یعنی کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ مساجد اللہ کے واسطے مختص ہوتی ہیں۔ اور اللہ کی ملکیت میں ہوتی ہیں۔ 'للّٰہ' میں لام ملکیت کو بتاتا ہے جیسے: "اِنَّ الۡاَرۡضَ لِلّٰهِ" "بلاشبہ زمین اللہ کی ہے"...... 'انا للّٰہ' "ہم اللہ کے ہیں۔"

ایک اہم نکتہ

یہاں شرعی، فقہی اور قانونی لحاظ سے ایک بڑی اہم بات معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی مسجد کا صرف اللہ کی عبادت کیلئے مختص ہونا اور کسی مسجد کا اللہ کی ملکیت ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اجتہاد اور استنباط کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے بلکہ یہ حکم ہر مسجد کیلئے نص صریح سے ثابت ہے۔ یہ مسئلہ اجتہاد کے دائرے سے باہر ہے اسی بناء پر کسی فرد یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی مسجد کو غیر اللہ کی عبادت کیلئے دے دے یا اس کی ملکیت میں تبدیلی پیدا کردے۔ مسجد کی ملکیت کے مسئلہ کو سمجھنے کیلئے ایک واقعہ کا ذکر کرنا یہاں نامناسب نہ ہوگا۔ ہمارے معتبر واعظین بیان کرتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ تم صبح تک میری حدودِ سلطنت سے باہر

چلی جاؤ ورنہ تم پر طلاق ہے۔اس کے بعد سب کو پریشانی لاحق ہوگئی کہ صبح تک حدود سلطنت سے نکل جانے کی کوئی صورت نہیں ہے اس لئے طلاق واقع ہو جائے گی۔ عام علماء اور مفتیان کے نزدیک اس کے علاوہ کہنے کی کوئی بات نہیں تھی۔لیکن ایک بڑے فقیہ نے کہا کہ طلاق سے بچنے کی ایک صورت ہے اور یہ ہے کہ بیگم صاحبہ صبح سے پہلے کسی مسجد میں چلی جائیں مسجد اللہ کی ملکیت ہوتی ہے، کسی بھی بادشاہ کی سلطنت سے باہر ہوتی ہے۔

سب مسجدیں یکساں قابل احترام ہیں

اس آیت کا اطلاق جس طرح کعبۃ اللہ اور مسجد اقصیٰ پر ہوتا ہے اسی طرح دنیا کی ہر مسجد پر ہوگا اور جس طرح یہ دونوں مسجدیں محترم ہیں اور ان پر غیر شرعی طور پر کوئی تصرف نہیں کیا جا سکتا۔اسی طرح دنیا کی کسی مسجد پر شرعی دلیل کے بغیر کوئی تصرف کرنے کی گنجائش نہیں نکالی جاسکتی۔کعبۃ اللہ میں ایک نماز ایک لاکھ، اور مسجد نبوی میں ایک نماز پچاس ہزار کے برابر ہے۔اس فرق مراتب سے قطع نظر مطلق احترام اور ملکیت کے اعتبار سے ہر مسجد برابر ہے۔جس طرح کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی کی حفاظت، آبادکاری اور خدمت امت مسلمہ کی ذمہ داری ہے اسی طرح ہر مسجد کی حفاظت، آبادکاری اور خدمت مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہے۔زمین کے کسی کونے میں کوئی مسجد ہو اور اس کی بے حرمتی ہوتی ہے تو روئے زمین پر بسنے والا کوئی مسلمان اپنے کو قطعاً بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔مسجد تو مسجد ہے دارالاسلام کی زمین کے چھوٹے سے چھوٹے علاقہ پر اگر کفار اور مشرکین قابض ہو جائیں تو درجہ بدرجہ تمام مسلمانوں پر فرض ہو جاتا ہے کہ اس علاقہ کو کفار کے قبضہ سے نکالیں۔

تمام مساجد یکساں طور پر قابل احترام ہیں جیسے جان سب کی سب قابل احترام ہیں۔ایک جان کو قتل کرنا سب جانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے لیکن کسی مرد صالح اور عالم کو قتل کرنا اور بڑا جرم ہے پھر کسی نبی کو قتل کرنا اتنا بڑا جرم ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔

اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدۃ:۳۲)

ترجمہ: جس نے کسی ایک انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا اور جس نے اس کو بچایا اس نے گویا تمام انسانوں کو بچایا۔

اسی طرح جس نے ایک قابل احترام مسجد کو ڈھایا، اس نے گویا تمام مساجد کو ڈھایا اور جس نے ایک مسجد کو بچایا، گویا اس نے تمام مساجد کو بچایا۔

انسانوں میں جس طرح مراتب کے لحاظ سے فرق کیا جا سکتا ہے لیکن مطلق احترام کے اعتبار سے کوئی فرق

نہیں ہے۔ اسی طرح مساجد میں بھی فرق ہوسکتا ہے لیکن بلحاظ احترام بحیثیت مجموعی فرق نہیں ہے سب یکساں ہیں۔ کعبۃ اللہ، مسجد نبوی اور مسجد اقصیٰ کی بے حرمتی انتہاء درجہ کا جرم اور گناہ ہے اور اس کو برداشت کرنا انتہائی درجہ کی بے غیرتی اور بے ایمانی ہے۔ ایسے ہی کسی بھی مسجد کی بے حرمتی کو گوارہ کرلینا بھی نسبتاً کم درجہ کی سہی بے ایمانی اور بے غیرتی کی ہی بات ہوگی، اور ایمان سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوسکتا۔ چھوٹی سے چھوٹی مسجد کی بے حرمتی کو جیتے جی برداشت کرلینا دعویٰ ایمان سے میل کھانے والی چیز نہیں ہوسکتی چاہے اس کی مصلحت خواہ کتنے ہی معصومانہ انداز سے بیان کی جائے اور یہ بیان خواہ کتنے ہی مقدس اسٹیج اور مسند ارشاد و افتاء سے جاری ہو۔ یہ اس دور کا المیہ ہے کہ کھلی ہوئی بے غیرتی اور ضعف ایمانی کو دینداری کے روپ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

ذرا غور کیجئے! مسجد کو مسجد اور اللہ کا گھر سمجھنے اور کہنے کے باوجود اس کی بے حرمتی اور مسماری کو آنکھوں سے دیکھنے اور کانوں سے سننے کے باوجود نہ کانوں پر جوں رینگے اور نہ آنکھوں سے خون ٹپکے، نہ دل دھڑکے، نہ ہاتھ اٹھیں، نہ قدم آگے بڑھیں، نہ دل روئے، نہ ہمارے عیش و عشرت میں خلل پڑے تو کہاں ہے ہمارا ایمان؟...... اور کیسی ہے اللہ اور اس کے رسول سے ہماری محبت؟ اور کیا معنی رکھتی ہے دعوت و تبلیغ کی ہماری چیخ و پکار؟......ایسی زبان سے جس کے پیچھے محبت حق، غیرت ایمانی اور سوز دل نہ ہو۔

جان خواہ کسی کی ہو۔ کسی لکڑہارے کی ہو، کسی چرواہے کی ہو اس کو قتل کرنا تمام انسانوں کے قتل کے مترادف ہے اور اس کو بچانا تمام انسانوں کو بچانے کے برابر ہے کوئی مسجد خواہ کتنی ہی چھوٹی سی ہو۔ وہ محترم ہے اس کو منہدم کرنا تمام مساجد کو منہدم کردینے کے ہم معنی ہے۔ اور اس کو بچانا تمام مساجد کو بچانے کے برابر ہے۔

ہمارا جرم

جن لوگوں نے ایک بابری مسجد کو ڈھایا ہے انہوں نے گویا دنیا کی تمام مسجدوں پر وار کیا ہے اور جن لوگوں نے ایک مسجد کو منہدم ہوتے ہوئے دیکھا ہے اور خاموش رہے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے وہ بھی جرم میں شریک ہیں۔ وہ جنہوں نے اللہ کے ایک گھر پر پھاؤڑا اور سبل چلا کر تمام مساجد اللہ کی حرمت کو پامال کرنے کی کوشش کی ہے ان کے جرم اور ظلم میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ لیکن کیا ہم جیسوں کا جرم بھی کچھ کم ہے؟...... جو کہتے ہیں کہ بابری مسجد تا قیامت مسجد رہے گی جبکہ اس مسجد میں پتھر کی بے جان مورتیاں پوجی جارہی ہیں اور ان مورتیوں کو ہٹانے کیلئے ذرا ہلنے اور جنبش کرنے کیلئے ہم تیار نہیں ہیں اور نہ اس کیلئے آمادہ ہیں کہ سڑک پر نکلیں اور پیروں میں گرد لگے، اور شیروانی، کرتے پائجامے پر شکن پڑے اور استری ٹوٹ جائے۔ جیل جانا، پتھر کھانا، لاٹھی چارج کا سامنا کرنا تو دور کی بات ہے ساری دوڑ دھوپ کی انتہاء پوری احتیاط کے ساتھ زبان و قلم کا استعمال

ہے اور بس۔ حالانکہ زبان و قلم کا استعمال معقول لوگوں کیلئے کارآمد ہوتا ہے جن کے پاس کوئی کردار ہو، صحیح اور غلط کی جن کو تمیز ہو، جنہیں شرم و حیاء ہو۔

ظالموں سے بات کرنا مفید نہیں

لیکن جو انسانیت اور معقولیت کی ساری حدیں پار کر چکے ہوں جو اپنی طاقت اور قوت کے نشے میں چور ہوں۔ ظلم اور بے انصافی اور جور و جفا جن کا شیوہ بن چکا ہو اور جنہوں نے ملک بھر سے لاکھوں افراد کو جمع کیا اور مسجد توڑ ڈالی، لیکن جب کمیشن کے سامنے بیان دینے کا وقت آیا تو پوری بے شرمی کے ساتھ کہہ دیا کہ ہم تو مسجد بچانے کے لئے گئے تھے جو اتنا سفید جھوٹ بول سکتے ہوں ان سے کسی معقولیت کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟ جو اتنے بے شرم ہوں ان سے کسی بھی بھلی بات کو تسلیم کرنے کی اُمید کون کر سکتا ہے؟ جن کے نزدیک نہ ہی اپنے ملکی قانون کا پاس و لحاظ ہے اور نہ بین الاقوامی اخلاق اور ضابطہ کی کوئی حیثیت ہے۔ ان کے سامنے کسی کی شیریں زبان اور پر اثر مدلل تحریر کیا معنی رکھتی ہے؟

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

اور پھر:

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی دلیل اور حجت

وَلَا تُجَادِلُوٓا اَهۡلَ الۡكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ اِلَّا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡهُمۡ
(العنکبوت:۴۶)

ترجمہ: اہل کتاب سے مباحثہ نہ کرو مگر اچھے طریقہ سے، سوائے ان لوگوں سے جو ان میں ظالم ہیں۔

اس آیت میں جہاں بحث مباحثہ عمدہ طریقہ سے کرنے کی تعلیم دی گئی ہے وہیں ظالموں سے مباحثہ کرنے سے صاف طور پر منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ مباحثہ سمجھنے سمجھانے کے لئے ہوتا ہے لیکن جو لوگ معقولیت سے عاری ہوں اور ظلم پر کمر بستہ ہو چکے ہوں وہ بات کیا سمجھیں گے؟! وہ تو معقولیت کے ساتھ بات چیت کو کمزوری و بے بسی اور مسکنت پر محمول کریں گے۔ اسلام اہل حق کو شائستگی، شرافت اور معقولیت تو ضرور سکھاتا ہے مگر عاجزی اور مسکینی نہیں سکھاتا کہ ظالم لوگ ان کو نرم چارہ سمجھ بیٹھیں۔ چنانچہ کھلے لفظوں میں مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ ظالم دشمنوں کو مرعوب اور ہیبت زدہ رکھنے کے لئے ہر طرح تیاری رکھو۔

مسلمانوں کو خاص ہدایت

وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال:۶۰)

ترجمہ: اور تم جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے انکے مقابلہ کیلئے مہیاء رکھوتا کہ اسکے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اوران دوسرے اعداء کو خوفزدہ کروجنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔

یہ مستقل جنگی تیاری رکھنے کی بات اسی لئے کہی گئی ہے کہ بہرصورت ہر زمانہ میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو افہام وتفہیم سے صحیح بات ماننے کیلئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اور جن کو شرانگیزی سے روکنے کیلئے طاقت کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے ورنہ حمایت حق کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ نیز جو گروہ ساز وسامان اور فوجی طاقت کے لحاظ سے کمزور سمجھا جاتا ہے اس پر کوئی بھی دست درازی کرنے پر تل جاتا ہے اوراس کے برخلاف اگر کوئی دبدبہ والا ہوتو اس کی جان ومال اوراس کے قابل احترام تہذیبی مظاہر اور شعائر پر ہاتھ کیا انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا۔ اسی لئے ایک دوسرے مقام پر اہل ایمان کی بہترین صفات میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ وہ ظالموں اور جابروں کیلئے نرم نوالہ نہیں ہوتے اوران کی شرافت کا تقاضہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جب وہ غالب ہوتے ہیں تو مغلوب کے قصور معاف کردیتے ہیں لیکن کوئی طاقتور اپنی طاقت وقوت کے زعم میں ان پر دست درازی کرتا ہے تو وہ عاجزی اور منت وسماجت نہیں کرتے بلکہ ڈٹ کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اوران کے دانت کھٹے کردیتے ہیں۔ مومن کی شان یہ نہیں کہ وہ ظالم سے دب جائے اور متکبر کے سامنے سر جھکا دے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ، وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ (الشوریٰ:۳۹)

ترجمہ: اور جولوگ بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے دور رہتے ہیں اور انہیں غصہ آجاتا ہے تو درگزر کرجاتے ہیں اور جولوگ اپنے رب کے حکم پر لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات آپسی مشورے سے ہوتے ہیں اور جو ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور جب ان پر زیادتی کی جاتی ہے تو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ظلم وزیادتی کرنے والوں کا مقابلہ کرنا اوران سے بدلہ لینا دینداری اور شان بندگی کے خلاف نہیں ہے۔

دعوت اور محاذ آرائی

بعض لوگ ایسا سوچتے ہیں کہ دعوتی حکمت عملی کا تقاضہ ہے کہ ظلم اور فسطائیت کو گوارا کر لیا جائے اور مقابلہ کے لئے سامنے نہ آیا جائے۔ ورنہ مقابلہ آرائی کی صورت میں دعوت کے مواقع ختم ہو جائیں گے۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ دنیاوی اور مادی مفادات کیلئے کشمکش اور محاذ آرائی سے گریز کرنا چاہئے لیکن جہاں تک باطل کے مقابلہ میں حق کیلئے کشمکش کرنے، شعائر اللہ کی حفاظت اور صیانت کرنے اور دین وملت کی عزت اور شوکت کو باقی رکھنے کیلئے محاذ آرائی کا سوال ہے تو وہ تو مقصود و مطلوب ہے۔ اور اس سے بچنے کو دورِ اوّل میں نفاق کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ معرکۂ حق و باطل میں جان و مال کی قربانی پیش کرنا اس وقت حقیقی اور سچے ایمان کی پہچان تھی۔

معلوم نہیں یہ غلط خیال کہاں سے لوگوں کے ذہنوں میں آ گیا ہے کہ محاذ آرائی کے ساتھ دعوت کا کام نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ دعوت کی پوری تاریخ کشمکش اور محاذ آرائی کی تاریخ ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی دعوتی سرگرمیوں کی داستان دیکھ جایئے۔ پھر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوہ صفا والی پہلی تقریر سے لیکر فتح مکہ تک کے واقعات اپنے سامنے رکھیے۔ کتنے لمحے ہم آہنگی اور سکون کے گزرے ہیں؟ مکی دور میں جبکہ جہاد کا حکم نہیں آیا تھا۔ گھر گھر اور گلی گلی کیسی کشمکش اور کیسی منافرت کا دور دورہ تھا؟! شعب ابی طالب میں تین سال تک محرومی اور بائیکاٹ کشمکش کی ایک بڑی مثال ہے۔ ہجرت حبشہ اور آخر میں ہجرت مدینہ کی آخر کیوں نوبت آئی؟ حالانکہ اس وقت اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام طور پر طاقت کا استعمال نہیں کر رہے تھے۔ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ انبیائی دعوت حق کو اہل کفر نے ٹھنڈے پیٹوں نہ کبھی برداشت کیا ہے اور نہ آئندہ کبھی کریں گے۔ اس لئے ہم آہنگی اور ماحول کو پرسکون بنانے کے لئے کھلے ہوئے دینی اور ایمانی تقاضوں کو پس پشت ڈالنا صحیح حکمت عملی نہیں ہو سکتی۔ پھر اس سوال پر غور کیجئے کہ مدینہ میں جب حکم جہاد آیا تو پورے دس سالہ مدنی دور میں کیا دعوت متروک ہو گئی تھی؟ جبکہ کم از کم ہر چالیس دن میں کوئی نہ کوئی چھوٹی بڑی جنگی مہم میں اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور نکلے ہیں۔ اس سوال کا جواب بھی ایک ہی ہے کہ ناموس رسول، ناموس قرآن اور ناموس امت اسلامیہ کو بچانے اور کفر اور اہل کفر کو دبانے، مٹانے کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ دعوت کا کام بھی جاری تھا۔ دور نبوی کے بعد خلفاء راشدین، تابعین اور تبع تابعین کے دور میں جنگوں اور فتوحات کے لمبے سلسلے کے ساتھ ساتھ دعوت کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ اس لئے یہ سوچنا اور کہنا کہ دعوت حق اور حمایت حق دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے، ایک ایسی فاحش غلطی ہے جس پر پوری دعوت و عزیمت کی تاریخ شاہد ہے۔ ایک دوسرے پہلو سے سوچئے کہ حمایت حق کا جذبہ کسی بھی مصلحت کی خاطر کسی کے

دل سے نکل جائے تو وہ دعوت کیا دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ حمایت حق کے تقاضوں میں سے ایک اہم تقاضہ دعوت ہے۔ جب اصل نہیں ہوگی تو تقاضہ کا کیا سوال؟ تیسرے رخ سے مسئلہ کو دیکھئے۔ ایک مرعوب اور مغلوب ذہن کی دعوت بھی بے جان دعوت ہوگی جس کو کوئی اہمیت نہیں دی جائے گی۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہندوستان میں دی جانے والی دعوتوں کا آج حال دیکھ لیجئے۔

انبیاء علیہم السلام اور صلحائے امت کی کوئی مثال ایسی نہیں پیش کی جاسکتی جس سے معلوم ہو کہ داعی نے ظلم اور بربریت کے سامنے سپر ڈالدی ہو اور دعوت کو بچانے کے نام پر حمایت حق کو چھوڑ کر ظالم کے سامنے سرنگوں ہو گیا ہو۔

دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اور فیصلہ کیجئے کہ ایک داعی کے نزدیک دعوت کا حاصل اور اس کی منزل کیا ہے؟۔ اس کا جواب ایک لحاظ سے سادہ لفظوں میں یہ دیا جاسکتا ہے کہ دعوت کی منزل پوری زمین کو صحیح معنی میں مسجد بنانا اور عدل وقسط سے زمین کو بھر دینا ہے تو جو داعی پوری زمین کو مسجد بنانے کی منزل تک پہنچنے کی آرزو رکھتا ہو۔ وہ ایک بنی بنائی ہوئی مسجد کو منہدم ہوتے ہوئے کیسے دیکھ سکتا ہے؟!...... اور وہ جو کچھ کرسکتا ہے وہ نہ کرے اور کہے کہ میں محاذ آرائی سے دعوتی مصلحت کی خاطر بچنا چاہتا ہوں۔ اسی طرح جو شخص پوری دنیا کو کلمہ پڑھانا چاہتا ہے اس کے لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی آنکھوں کے سامنے کلمہ پڑھنے والوں کو مرتد بنایا جارہا ہو اور وہ خاموش بیٹھا رہے اور کلمہ گو امت کو ارتداد سے بچانے کے لئے جدوجہد نہ کرے۔

پوری دنیا کو مسجد بنانے کا دعویٰ کرنے والا بنی بنائی مسجد کے تحفظ کی نہ سوچے۔ پوری دنیا کو کلمہ پڑھانے کا عزم رکھنے والا پہلے سے موجود کلمہ گو گروہ کی حفاظت نہ کرے۔ یہ کیسی تعجب انگیز بات ہوگی!۔ ایسا تو نہیں کہ اندر سے سوچ وفکر میں کوئی بیماری لگ گئی ہو دل میں تقویٰ اور خوف الٰہی کی جگہ نفاق کا سایہ پڑ رہا ہو؟!

شعائر اللہ کی تعظیم

قرآن نے کہا ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (الحج:۳۲)

ترجمہ: اور جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔

گویا جس دل میں شعائر اللہ کی تعظیم نہ ہو وہ تقویٰ اور خوف الٰہی سے خالی ہے۔

شعائر اللہ کیا ہیں؟

شعائر جمع ہے "**شعیرۃ**" کی۔ جس کے معنی علامت کے ہیں۔ شعائر اللہ سے مراد وہ اعمال ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے دین کی علامتیں قرار دیا ہے۔ (معارف القرآن: البقرۃ:۱۵۸)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں:

''شعائر شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی کسی ایسی چیز کے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان ہو Symbol ہو، اصطلاح دین میں اس سے مراد شریعت کے وہ مظاہر ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کیلئے بطور ایک نشان اور علامت مقرر کئے گئے ہیں۔'' (تدبر قرآن، البقرۃ:۱۵۸)

مزید تشریح کیلئے دیکھئے......

''ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدہ یا طرز فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعار کہلائے گی، کیونکہ وہ اس کیلئے علامت یا نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے، فوج اور پولیس وغیرہ کے یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی، زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں۔ کیس اور کڑا اور کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہیں۔ سواستیکا آریہ نسل پرستی کا شعار ہیں۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دراصل اس نظام کیخلاف دشمنی رکھتا ہے اگر وہ توہین کرنے والا اسی نظام سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے ارتداد اور بغاوت کا ہم معنی ہے۔'' (مولانا مودودیؒ)

مسجدیں اللہ کے شعائر ہیں اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ اسی بناء پر مسجدوں کو ویران کرنے والوں کو دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم کی وعید سنائی گئی ہے اور مسجد بنانے والے کو جنت میں اللہ گھر دے گا۔ اس کی خوش خبری رسول اللہ ﷺ کی زبانی دی گئی ہے اور قرآن میں مسجد کی آبادکاری اور تعمیر کو ایمان کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ مساجد کے احترام کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسجد سے جو چیز متعلق ہوگی وہ محترم بن گئی مسجد میں جو سامان استعمال ہوگیا خواہ وہ لکڑی کی جنس سے ہو یا کپڑے کی جنس سے، حتیٰ کہ مسجد کے کوڑا کرکٹ کا بھی احترام کیا جاتا ہے۔ مسجد، کعبۃ اللہ کا غلاف، کعبۃ اللہ کی جانب جانے والا قربانی کا جانور، بلکہ اس کے گلے کا پٹہ بھی محترم ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ...الخ (المائدۃ:۲)

ترجمہ: اے ایمان والو! بےحرمتی نہ کرو۔ خدا تعالیٰ کی نشانیوں کی اور نہ حرمت والے مہینوں کی اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوئے ہوں۔

اس آیت میں شعائر اللہ کے احترام کا عام حکم دینے کے بعد چند شعائر کا نام بھی لیا گیا ہے۔اب بتایئے مسجد جیسے شعائر اللہ کی نہ صرف حرمت پامال کی جائے بلکہ جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کی جگہ کو بت خانہ بنا دیا جائے اور دعویٰ ایمان کرنے والوں پر جوں بھی نہ رینگے۔ان کے ایمان کی چنگاری بھڑکے تک نہیں بلکہ دبی کی دبی رہے تو ایمان اور تقویٰ کی کھوج کہاں کی جائے اور ایسی حالت میں ایمان کی ہماری خود ساختہ علامتوں کی قدر و قیمت کیا رہ جائے گی؟!

کسی بھی نظام میں شعائر کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔موجودہ دور کی حکومتوں کو دیکھئے اپنے شعائر مثلاً اپنے جھنڈوں کا کتنا احترام کرتی ہیں۔اور اس معاملہ میں کتنی حساسیت کا ثبوت دیتی رہتی ہیں۔اگر اس میں شبہ ہو تو کسی ملک کے جھنڈے کو صرف پیروں تلے ڈال کر کوئی دیکھے۔سکھ قوم کے شعائر ٹیمپل کی بے حرمتی کرنے والوں کو غیرت مند سکھوں نے برداشت نہیں کیا اور بے حرمتی کرنے والے لوگوں کو انہوں نے کیسا مزہ چکھایا۔اگر ان کا ٹیمپل ڈھا دیا گیا ہوتا تو نہیں معلوم ہندوستان میں وہ کیا قیامت برپا کر دیتے!

مسلمانوں کی بے غیرتی

غرض شعائر کی صرف اسلام ہی میں نہیں بلکہ ہر دین و مذہب میں بڑی اہمیت ہے لیکن کچھ مسلمان اپنی بے غیرتی کو چھپانے کیلئے کہتے ہیں کہ ایک مسجد گئی تو گئی ہم کئی دوسری مسجدیں بنالیں گے۔کبھی کہتے ہیں ہم عدالت کے فیصلہ کو مانیں گے۔تعجب پر تعجب یہ ہے کہ جو لوگ موجودہ عدالتوں کو طاغوت کہتے رہتے ہیں وہ بھی یہ کہتے نہیں تھکتے کہ ہم عدالت کا فیصلہ تسلیم کریں گے۔جو مفتیان کرام نکاح و طلاق کے مسئلہ میں موجودہ عدالتوں کا فیصلہ نہیں مانتے وہ بھی مسجد کے مسئلہ میں عدالت کا فیصلہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں۔حالانکہ یہ اعلان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔کون ہے جو ملک کی عدالت کا فیصلہ نہ مانے گا؟! ہاں عدالت کے فیصلہ کو ماننے اور نہ ماننے کا سوال ان کے بارے میں ہوسکتا تھا جو اکثریت میں ہیں اور بابری مسجد توڑ کر جنہوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کر دکھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عدالتوں کے فیصلوں کو بھی نظر انداز کر دیا ہے بلکہ عدالتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ ان کے فیصلہ کی تائید میں فیصلہ کریں۔بہر صورت اس پورے پس منظر میں قرآن کی آیات ذیل پر کم از کم غور تو کرنا چاہئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ وَاَمْلٰى لَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝ (سورۂ محمد:۲۶-۲۵)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ جولوگ ہدایت واضح ہونے کے بعد مرتد ہوگئے ان کیلئے شیطان نے اس روش کو آسان بنادیا اور جھوٹی توقعات کا سلسلہ ان کیلئے دراز کردیا ہے۔ ایسا اسلئے ہے کہ انہوں نے اللہ کے نازل کردہ دین کو ناپسند کرنے والوں سے کہہ دیا کہ بعض معاملات میں ہم تمہاری مانیں گے۔ اللہ ان کی یہ خفیہ باتیں خوب جانتا ہے۔

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ جن عدالتوں کے فیصلہ کو ہم برضا ورغبت تسلیم کرنے کا اعلان کرتے ہیں وہ ''اَلَّذِیْنَ کَرِهُوْا مَانَزَّلَ اللّٰهُ'' میں شامل ہیں، بدرجۂ مجبوری ماننا اور تسلیم کرنا الگ بات ہے اور بخوشی تسلیم کرنا الگ ہے۔ پہلی صورت میں ہم کو ممکن ہے معذور قرار دیا جائے لیکن دوسری صورت میں ارتداد کے دائرہ میں داخل ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّكْفُرُوْا بِهٖ وَیُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا (النساء:۶۰)

ترجمہ: اے نبی! تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں اس کتاب پر جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور ان کتابوں پر جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں مگر چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کیلئے طاغوت کی طرف رجوع کریں۔ حالانکہ انہیں طاغوت سے کفر کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ شیطان انہیں بھٹکا کر راہ راست سے بہت دور لے جانا چاہتا ہے۔

''یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلہ کرتا ہو اور وہ نظام عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدار اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو، لہٰذا یہ آیت اس معنی میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو، اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کیلئے لے جانا خود ایمان کے منافی ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کردے۔ قرآن کی رو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم وملزوم ہیں اور اللہ اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا منافقت ہے۔''

آخر اس طرح کی قرآنی تصریحات کو کیوں نظر انداز کردیا جارہا ہے۔ جو بے شعور ہیں اور دینی حقائق سے بے بہرہ ہیں ان کی طرف سے اس طرح کی چوک اور کوتاہی قابل فہم ہوسکتی ہے لیکن جو صاحب علم وشعور ہیں ان کے اندر کتاب اللہ کے خلاف یہ جرأت اور دلیری قوم کی تباہی اور بربادی کو دعوت دینے والی ہے۔ اے کاش اس کا شعور ہمارے اندر پیدا ہوجائے اور اللہ کے غضب سے محفوظ ہوجائیں!

آیت وَمَنْ اَظْلَمُ

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْکَرَ فِیْہَا اسْمُہٗ وَسَعٰی فِیْ خَرَابِہَا اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَہُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْہَآ اِلَّا خَآئِفِیْنَ لَہُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (البقرۃ:۱۱۴)

ترجمہ: اوراس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ کی مسجدوں میں اللہ کے ذکر سے روکے اوران کو ویران کرنے کی کوشش کرے۔ ایسے لوگوں کیلئے نہیں ہے کہ وہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے، ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اورآخرت میں ایک بڑا عذاب ہے۔

اس آیت پر گفتگو سے پہلے ہم حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا تفسیری نوٹ درج کرتے ہیں:

''بہرحال آیت کا شان نزول تومفسرین کے نزدیک ان دونوں واقعوں میں سے کوئی خاص واقعہ ہے مگراس کا بیان عام لفظوں میں ایک مستقل ضابطہ اور قانون کے الفاظ میں فرمایا گیا ہے تاکہ یہ حکم انھیں نصاریٰ یا مشرکین وغیرہ کیلئے مخصوص نہ سمجھا جائے بلکہ تمام اقوام عالم کیلئے عام رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خاص بیت المقدس کا نام لینے کے بجائے ''مساجد اللہ'' فرما کر تمام مساجد پراس حکم کو عام کردیا گیا۔ اورآیت کا مضمون یہ ہوگیا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی کسی مسجد میں لوگوں کو اللہ کا ذکر کرنے سے روکے یا کوئی ایسا کام کرے جس سے مسجد ویران ہوجائے تو وہ بہت بڑا ظالم ہے۔''

مساجد اللہ کی عظمت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ان میں جو شخص داخل ہو ہیبت وعظمت اورخشوع وخضوع کے ساتھ داخل ہو جیسے کسی شاہی دربار میں داخل ہوتے ہیں۔

اس آیت سے جو چند ضروری مسائل واحکام نکلے ان کی تفصیل یہ ہے:

اوّل یہ کہ دنیا کی تمام مساجد آداب مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں جیسے بیت المقدس، مسجد حرام یا مسجد نبوی کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے اگرچہ ان تینوں مساجد کی خاص بزرگی وعظمت اپنی جگہ مسلم ہے کہ مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر اور مسجد نبوی ونیز بیت المقدس میں پچاس ہزار نمازوں کے برابر ملتا ہے ان تینوں مساجد میں نماز پڑھنے کی خاطر دوردراز ملکوں سے سفر کرکے پہنچنا موجب ثواب عظیم اور باعث برکات ہے برخلاف دوسری مساجد کے کہ ان تینوں کے علاوہ کسی دوسری مسجد میں نماز پڑھنے کو افضل جان کر اس کیلئے دور سے سفر کرکے آنے کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد میں ذکر ونماز سے روکنے کی جتنی بھی صورتیں ہیں وہ سب ناجائز وحرام ہیں ان میں سے ایک صورت تو یہ کھلی ہوئی ہی ہے کہ کسی کو مسجد میں جانے سے یا وہاں نماز وتلاوت سے صراحۃً روکا

جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ مسجد میں شور وشغب کر کے یا اس کے قرب وجوار میں باجے گاجے بجا کر لوگوں کی نماز وذکر وغیرہ میں خلل ڈالے یہ بھی ذکر اللہ سے روکنے میں داخل ہے۔

اسی طرح اوقات نماز میں جبکہ لوگ اپنی نوافل یا تسبیح وتلاوت وغیرہ میں مشغول ہوں۔ مسجد میں کوئی بلند آواز سے تلاوت یا ذکر بالجہر کرنے لگے تو یہ بھی نمازیوں کی نماز وتسبیح میں خلل ڈالنے اور ایک حیثیت سے ذکر اللہ کو روکنے کی صورت ہے اسی لئے حضرات فقہاء نے اس کو بھی ناجائز قرار دیا ہے۔ ہاں جب مسجد عام نمازیوں سے خالی ہو اس وقت ذکر یا تلاوت جہر کا مضائقہ نہیں۔

اسی سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس وقت لوگ نماز وتسبیح وغیرہ میں مشغول ہوں مسجد میں اپنے لئے سوال کرنا یا کسی دینی کام کے لئے چندہ کرنا بھی ایسے وقت ممنوع ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ مسجد کی ویرانی کی جتنی بھی صورتیں ہیں سب حرام ہیں۔ اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم اور ویران کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کیلئے لوگ نہ آئیں یا کم ہو جائیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر وآبادی دراصل درودیوار یا ان کے نقش ونگار سے نہیں بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے۔ اسی لئے قرآن شریف میں ایک جگہ ارشاد ہے:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (التوبۃ:۱۸)

ترجمہ: یعنی اصل میں مسجد کی آبادی ان لوگوں سے ہے جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں اور روز قیامت پر، اور نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈریں۔

اسی لئے حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد اور مزین وخوب صورت ہوں گی مگر حقیقتاً ویران ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو جائیں گے۔

حضرت علی مرتضیٰ ؓ کا ارشاد ہے کہ شرافت وانسانیت کے چھ کام ہیں۔ تین حضر کے اور تین سفر کے۔

حضر کے تین یہ ہیں: تلاوت قرآن کرنا، مسجدوں کو آباد کرنا، ایسے دوستوں کی جمعیت بنانا جو اللہ تعالیٰ اور دین کے کاموں میں امداد کریں۔

سفر کے تین کام یہ ہیں: اپنے توشہ سے غریب ساتھیوں پر خرچ کرنا، حسن خلق سے پیش آنا، اور رفقائے سفر کے ساتھ ہنسی خوشی تفریح وخوش طبعی کا طرز عمل رکھنا۔ بشرطیکہ یہ خوش طبعی گناہ کی حد میں داخل نہ ہو جائے۔

حضرت علی ؓ کے اس ارشاد میں مسجدوں کے آباد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہاں خشوع وخضوع کے ساتھ حاضر بھی ہوں اور وہاں حاضر ہو کر ذکر وتلاوت میں مشغول رہیں۔ اب اس کے مقابلہ میں مسجد کی ویرانی یہ

ہوگی کہ وہاں نمازی نہ رہیں یا کم ہوجائیں یا ایسے اسباب جمع ہوں جن سے خشوع وخضوع میں خلل آئے۔

اور اگر آیت کا شان نزول واقعہ حدیبیہ اور مشرکین مکہ کا مسلمانوں کو مسجد حرام سے روکنا ہے تو اسی آیت سے یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ مساجد کی ویرانی صرف یہی نہیں کہ انہیں منہدم کردیا جائے بلکہ مساجد جس مقصد کیلئے بنائی گئی ہیں یعنی نماز اور ذکر اللہ، جب وہ نہ رہے یا کم ہوجائے تو مساجد ویران کہلائیں گی۔'' (معارف القرآن)

آیت زیر بحث کے پہلے سے ذکر چلا آرہا ہے یہود ونصاریٰ کے ان جرائم کا جن کی وجہ سے انہیں دنیا کی پیشوائی اور امامت وقیادت کے منصب اور درجہ سے ہٹایا گیا اور ان کی جگہ اُمت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو امت وسط بنا کر بٹھایا گیا جن کا فریضہ یہ بتایا گیا کہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت تمہیں دینی ہے۔

یہ اہل کتاب اپنی دنیاوی وجاہت کو باقی رکھنے کیلئے ایک دوسرے کو بے دین بتاتے تھے اور ایک دوسرے کو عبادت گاہوں سے روکتے تھے۔ یہودی نصاریٰ کی اور نصاریٰ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو اُجاڑنے اور ویران کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت گاہوں میں اللہ کا نام لینے سے روکنا اور عبادت گاہوں کو ویران کرنا بھی ان جرائم میں سے ایک جرم ہے جس کے بعد کوئی قوم عزت کے مقام پر باقی نہیں رکھی جاتی اور اس کیلئے دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب مقدر کردیا جاتا ہے۔

چونکہ مشرکین ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی مسلمانوں کو کعبۃ اللہ سے روکتے تھے اس لئے آیت میں ایک طرف اہل کتاب کی دناءت اور شرارت کو بتایا گیا ہے اور دوسری طرف مشرکین مکہ کو بھی تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ اب تم بھی اپنے انجام بد کو پہنچنے والے ہو۔

آیت میں تین باتیں

آیت میں ''مساجد اللہ'' کا لفظ جمع استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم عام ہے لہٰذا کسی بھی مسجد میں اللہ کا نام لینے سے روکنے والے ظالم ٹھہریں گے۔ دیکھئے آیت میں تین باتیں کہی گئیں ہیں:

① ...... جو کسی بھی مسجد کو ویران کرنے کی کوشش کرے گا اور جو کوئی کسی مسجد میں اللہ کا ذکر کرنے سے منع کرے گا وہ اللہ کے نزدیک بڑا ظالم قرار پائے گا۔ قرآن کی دوسری تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ظالموں کا بڑا برا انجام ہونے والا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ — اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ — ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے۔

لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ — ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کریں گے۔

قرآن کی ان وعیدوں کے پیش نظر خود مسلمانوں کو بھی بہت محتاط رہنا چاہئے۔ اسلئے کہ مسلمان بھی بسا اوقات اللہ کے ذکر سے اور تلاوت قرآن اور درس قرآن سے اپنے باہمی فروعی اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے کیلئے مسجدوں کے دروازے بند کردیتے ہیں اور انتظام کے نام پر ایسی پابندیاں لگا دیتے ہیں جن کی وجہ سے اللہ کا نام لینے سے رکاوٹ ہوتی ہے۔ مساجد کی کمیٹیاں یقیناً یہ حق رکھتی ہیں کہ جن کو چاہیں روکیں اور جن کو چاہیں اجازت دیں لیکن ان کا یہ اختیار مساجد میں اللہ کا نام لینے سے منع کرنے کو جائز نہیں قرار دے سکتا۔ کمیٹیوں پر لازم ہے کہ اپنے اختیارات کا استعمال شریعت کے تابع رکھیں ورنہ ان پر بھی یہ وعیدیں لاگو ہوں گی اور وہ بھی ظالموں کے زمرہ میں شامل ہوں گی۔

مساجد کو ویران کرنے کی کوشش دو طریقے سے ہوسکتی ہے ایک یہ کہ اللہ کا ذکر کرنے والوں کو مسجد تک جانے سے روک دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مسجد کو منہدم کردیا جائے۔ ان دونوں صورتوں کا ذکر ہمارے قدیم مفسرین نے کیا ہے اور ان دونوں صورتوں کی مثال اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مسجد اقصیٰ پر یہودیوں کا کنٹرول ہے وہ طرح طرح کی پابندیاں مسلمانوں پر لگاتے ہیں اور ہندوستان میں بابری مسجد کو بالکل منہدم کردیا گیا ہے۔

تفسیر جلالین میں آیت کی تفسیر

تفسیر جلالین میں آیات کی تفسیر پڑھئے:

”'' مَنْ اَظْلَمُ ''یعنی کوئی بڑا ظالم نہیں ہے۔ ''مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ'' یعنی نماز اور تسبیح سے روکے۔ ''وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا'' یعنی منہدم کرکے، معطل کرکے۔ ''اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ'' انداز خبر دینے کا ہے لیکن منشاء حکم دینا ہے۔ یعنی ان کو جہاد کے ذریعہ خوف زدہ کرو تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ داخل نہ ہوں۔ ''لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ'' ذلت ہے قتل کی صورت میں یا قید ہونے کی صورت میں یا جزیہ دینے کی صورت میں۔“

تفسیر بیضاوی میں یہ آیت نقل کرنے کے بعد علامہ نے لکھا ہے:

① ''عام لکل من خرب مسجدا وسعی فی تعطیل مکان مرشح للصلوۃ وان نزل فی الروم'' یعنی یہ حکم عام ہے ہر اس کیلئے جس نے کسی مسجد کو ویران کیا یا نماز کیلئے تیار کی ہوئی کسی جگہ کو معطل کرنے میں کوشش کی۔ اگرچہ آیت اہل روم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

''سَعٰى فِيْ خَرَابِهَا'' کی تفسیر ''بالھدم او التعطیل'' کے الفاظ میں کیا ہے:

② ''مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا ...'' کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''یعنی حق نہیں ہے کہ وہ ان میں داخل ہوں مگر اس

حال میں کہ وہ مسلمانوں سے ڈر رہے ہوں کہ مسلمان انہیں دبوچ لیں گے چہ جائے کہ الٹا وہ مسلمانوں کو روکیں۔“

اس کا کھلا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ ان ظالموں کو خوف و دہشت میں رکھیں۔ اس بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سمجھنے کیلئے تفسیر کبیر کے یہ الفاظ دیکھئے۔

③”وان کان لفظه لفظ الخبر لکن المراد منه النهی عن تمکینهم من الدخول“ یعنی لفظ اور انداز بیان خبر دینے کا ہے لیکن مقصود منع کرنا ہے اور مسلمانوں کیلئے اس میں حکم ہے کہ تم ان ظالموں کو مسجد میں داخل نہ ہونے دو اور وہ مسجد پر قبضہ نہ کر سکیں۔“

اس حکم کو ذہن میں رکھئے اور تصور کیجئے اس صورت حال کا کہ ہمارے سامنے ایک مسجد کو نہ صرف ویران کیا گیا بلکہ اس پر قبضہ کیا گیا اور پھر اس کو بنیاد سے اکھیڑ پھینکا گیا اور پھر وہاں بت خانہ بنا کر بتوں کی پوجا ہو رہی ہے۔ اور ہم ہیں کہ اس کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہیں۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو مسجد اقصیٰ کے مقابلہ میں بابری مسجد کا معاملہ انتہائی سنگین ہے۔ مسجد اقصیٰ پر تو یہود کا صرف قبضہ ہے لیکن یہاں تو مسجد کی عمارت کو نیست و نابود کر دیا گیا ہے، اور مزید آگے بڑھ کر وہاں مورتیاں رکھ کر پوجا پاٹ ہو رہی ہے اور کسی مسلمان کو اس کے قریب تک جانے نہیں دیا جا رہا ہے۔

الغرض ”مَا كَانَ لَهُمْ“ میں محض ایک بات کی خبر نہیں دی جا رہی ہے بلکہ ایک حکم دیا جا رہا ہے کہ دیکھو ایسا نہ ہونے دو کہ مشرکین مسجد پر قبضہ جما لیں۔

ایک قرآنی اُسلوب

اس طرز بیان کی ایک مثال دیکھئے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ (الاحزاب:۵۳)

ترجمہ: تمہارے لئے نہیں ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ۔

اس آیت میں دراصل مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ زیر بحث آیت اور اس آیت کا طرز بیان بالکل ایک ہے۔ اس روشنی میں ان لوگوں کی باتوں کا بودا پن اور کھوکھلا پن کھل کر سامنے آجاتا ہے جو لوگ مختلف انداز میں یہ تاثر پیدا کرتے ہیں کہ بابری مسجد کا تحفظ کرنا ہماری ایسی ذمہ داری نہیں ہے کہ ہم اس کیلئے مہم چلائیں اور اپنے کو جوکھم میں ڈالیں۔

تیسری بات

”لَهُمْ فِی الدُّنْيَا خِزْيٌ“ دنیا میں ان کیلئے ذلت ہے اور آخرت میں ایک بڑا عذاب ہے۔ سوال یہ ہے

کہ ان کے ذلیل ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ اس سوال کا بھی جواب مفسرین کی تحریروں سے ہمیں یہ ملتا ہے کہ یہ کام مسلمانوں کے ہاتھوں ہونا ہے گویا مسلمانوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ ان کی ذلت ورسوائی کا سامان کریں۔ علامہ بیضاوی کے الفاظ پڑھیے "لَهُمۡ فِي الدُّنۡيَا خِزۡيٌ – قتل او سبی او ذلة بضرب الجزية"، یعنی قتل کرنا یا قید کرنا یا ان پر جزیہ لگا کر انہیں ذلیل کرنا۔ ظاہر ہے کہ ذلت کی یہ تینوں شکلیں اسی وقت ہوں گی جب مسلمان حرکت میں آئیں گے۔ اور مسجد کو ویران کرنے والے ظالموں کو قتل کرنے یا قید کرنے یا مغلوب کرنے کیلئے مہم چلائیں گے۔

دل پر ہاتھ رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ بابری مسجد اور بیت المقدس کے تعلق سے اس آیت کی روشنی میں ہم مسلمانوں پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں تو یہ کہاں تک روا ہوسکتا ہے؟

سنہری موقع نہ کھوئیے

قرآن نے کہا جو لوگ مساجد میں اللہ کا نام لینے سے روکتے ہیں اور مساجد کو ویران کرنے کی سعی کرتے ہیں وہ بہت بڑے ظالم ہیں اور ان کیلئے دنیا میں ذلت اور رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔ قرآن کی اس روشنی میں پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جو لوگ ان بڑے ظالموں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہوں گے اور ان کے منصوبوں کو ناکام بنانے کی سعی کریں گے ان کا شمار یقیناً محسنین میں ہوگا اور ان کیلئے دنیا میں عزت اور سرخروئی ہوگی اور آخرت میں وہ اجر عظیم کے مستحق ٹھہریں گے۔ "وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ" کے مقابلہ میں "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ" کی سند ہمارے سامنے موجود ہے۔ قرآن کا یہ بیان برائے بیان نہیں ہے بلکہ اس کا کچھ مقصد ہوگا۔ عین ممکن ہے کہ قرآن کچھ باتیں کھلے طور پر اور کچھ باتیں اشارے اور کنایہ کی زبان میں کہہ کر عزت و وقار کے ساتھ ساتھ آخرت میں اجر عظیم کے طلبگاروں کی طلب اور ان کے ذوق وشوق کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر دور میں اس طلب اور ذوق وشوق کے امتحان کے مواقع موجود ہوں۔ اسلئے کہ امتحان اور آزمائش کے مواقع اور شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ ہم اپنے موجودہ حالات کے تناظر میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسجد اقصیٰ اور بابری مسجد کے سانحے کی صورت میں مشیت ایزدی نے اس دور کے مسلمانوں کیلئے ایک موقع اور Chance عطا کیا ہے کہ جو حوصلہ مند لوگ ہوں وہ اپنے کو محسنین کے زمرہ میں اپنے عزم اور اقدام کے ذریعہ شامل کرسکتے ہیں۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو جس صورت حال سے ہم دوچار ہیں وہ زحمت اور مصیبت نہیں بلکہ مخلص مومنین کیلئے ایک سنہری موقع ہے۔ اس طرح کے مواقع بار بار نہیں آتے۔ اسلئے گردش دوراں اور حالات کی ناسازگاری کا شکوہ کرنے کے بجائے اس کو ایک نادر موقع سمجھ کر پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اس مقام پر

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ زمانہ زبان حال سے آواز لگا رہا ہے کہ:

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (المطففین:۲۶)

ترجمہ: جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ (آل عمران:۱۳۳)

ترجمہ: دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ خدا ترس لوگوں کیلئے مہیاء کی گئی ہے۔

جنت اور مغفرت کے حصول کا یہ سنہری موقع ہم کھو رہے ہیں تو کیوں؟ جان کو بچانے کیلئے، مال کو بچانے کیلئے اور اپنے اہل وعیال کو بچانے کیلئے۔ لیکن ہم اس عہد کو اور اس معاملہ کو بھول چکے ہیں جو اللہ نے ہر کلمہ گو سے لیا اور کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (التوبۃ:۱۱۱)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور انکے مال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں۔

جس اہل وعیال کی خاطر آدمی پیش قدمی کرنے سے رُکتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے فتنہ بنایا اور اس سے آگاہ بھی کر دیا۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (التغابن:۱۵)

ترجمہ: تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔

اپنے طرز فکر کا جائزہ لیجئے

اب آپ مساجد اللہ کے بارے میں اپنے طرز فکر وعمل اور اپنی حکمت عملیوں کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ ان کی کیا بنیاد ہے۔ من جانب اللہ ملے ہوئے چانس کو کھو کر کتنی بڑی سعادت کو ہم کھو رہے ہیں!۔ کتنے عظیم اجر و ثواب کو ہم ضائع کر رہے ہیں! اور اس کے مقابلہ میں کیا بچا رہے ہیں!؟ جو بچا رہے ہیں اور جو ضائع کر رہے ہیں دونوں کا موازنہ کیجئے اور یقین رکھئے کہ اللہ کی یہ بات سچی ہے۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ (آل عمران:۱۵۷)

ترجمہ: اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔

اس یقین کے نہ ہونے کی حالت کو حدیث شریف میں "حب الدنیا و کراھیۃ الموت" کا نام دیا گیا ہے۔ حضرت ثوبانؓ سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا ایک زمانہ آئے گا کہ قومیں مسلمانوں پر ایسے ٹوٹ پڑیں گی جیسے بھوکے دسترخوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تو صحابہ کرامؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! کیا اس زمانے میں ہماری تعداد اتنی کم ہوجائے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ ان کی تعداد سمندر میں بہنے والے جھاگ کی طرح ہوگی۔ مگر ان کے اندر وہن پیدا ہوجائے گا تو صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ وہن کیا چیز ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "حب الدنیا و کراھیۃ الموت"۔

ویران مسجد کو بسانا

ایک اور پہلو سے اس مسئلہ کو دیکھئے۔ حدیث شریف میں آیا ہے۔

من بنی للّٰہ مسجدا بنی اللّٰہ لہ بیتا فی الجنۃ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: جو کوئی اللہ کیلئے کوئی مسجد بنائے گا اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت میں ایک گھر بنادیں گے۔

یہ بشارت ہے کوئی نئی مسجد بنانے والے کیلئے۔ سوال یہ ہے کہ جو ظلماً منہدم کی ہوئی کسی مسجد کو ظالموں کی منشا کے خلاف تعمیر کرنے کی کوشش کرے گا اور ظالموں کے ظلم و جور کی پرواہ نہ کرے گا اپنی جان اور مال کو جوکھم میں ڈالے گا اس کا اجر و ثواب کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کیلئے ایک دوسری حدیث پر غور کیجئے۔

من احیی سنۃ من سنتی قد امیتت بعدی فان لہ من الاجر مثل اجور من عمل بھا من غیر ان ینقص من اجورھم شیئا۔ (رواہ الترمذی)

ترجمہ: جس نے میری سنتوں میں سے کسی مردہ سنت کو میرے بعد زندہ کیا اس کیلئے ان کے برابر اجر ہے جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کا اجر کچھ کم کیا جائے۔

اسی مفہوم کی ایک دوسری حدیث ہے:

من تمسک بسنتی عند فساد امتی فلہ اجر مأۃ شھید۔ (رواہ البیہقی)

ترجمہ: جس نے میری سنت کو مضبوطی کیساتھ تھاما میری امت میں بگاڑ کے وقت، اس کیلئے سو شہیدوں کا ثواب ہے۔

ان حدیثوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجر میں اضافہ کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو سنت پر عمل کرنے کا اجر ملے گا۔ اور دوسرے ایک مردہ سنت کو زندہ کرنے کا اجر۔ اس روشنی میں بلا کسی شک وشبہ کے یہ بات کہی

جاسکتی ہے کہ ایک منہدم مسجد کو دوبارہ کھڑی کرنے میں ایک تو مسجد بنانے کا دوسرے اللہ کے دشمنوں اور شیطان کے ظالم ایجنٹوں کی ناراضگی کی پرواہ نہ کرنے کا اور ان کو ذلیل وخوار اور ناکام کر کے اللہ کی منشا کو پوری کرنے کا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام انتہائی دشوار گزار مراحل سے گزر کر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس طرح کسی منہدم مسجد کو دوبارہ بنانا نئی مسجد بنانے کے مقابلہ میں زیادہ ایثار وقربانی اور جانفشانی کا متقاضی ہے۔ اس لئے اس کے اجر وثواب میں اضافہ ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

من الف المسجد الفه اللّٰہ۔ (رواہ البیہقی)

ترجمہ: جو شخص مسجد سے الفت رکھے گا اللہ اس کو محبوب بنالے گا۔

مسجد سے الفت کا کیا تقاضہ ہوسکتا ہے؟ اس کو سمجھنا کوئی دشوار بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ آدمی کسی سے محبت کا دعویٰ کرے اور اس کو ذلیل ورسواء ہوتے ہوئے دیکھے پھر بھی خاموش رہے تو اس کے دعوئ محبت کی کیا حیثیت رہ جائے گی؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص مسجد میں چراغ جلائے گا اس کیلئے فرشتے اس وقت تک استغفار کرتے رہیں گے جب تک اس چراغ کی روشنی باقی ہے۔ قابل غور بات ہے کہ مسجد میں روشنی کرنے کا یہ اجر ہے تو شہید مسجد کو نئے سرے سے کھڑی کرنے کے اجر کا کیا اندازہ کیا جاسکتا ہے؟ اس سے یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ مسجد کو تیرہ وتاریک جو دیکھتا رہے، روشنی کرنے کی فکر نہ کرے، اس کے گناہ گار ہونے میں کوئی شبہ نہ ہوگا۔ اسی طرح مسجد کو منہدم ہی نہیں بلکہ اس کی جگہ بت خانہ بنا ہوا دیکھنے والے دیکھیں اور ان کے اندر کوئی فکر، کوئی بے چینی اور کوئی حرکت نہ پیدا ہو تو ان کے مردہ دل اور گناہگار ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟۔ اسی لئے مسجد کی آباد کاری کو قرآن میں ایمان کی علامت اور ایمان کا تقاضہ بتایا گیا ہے۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (التوبۃ:۱۸-۱۷)

ترجمہ: مشرکین کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے مجاور وخادم بنیں درآنحالیکہ اپنے اوپر وہ خود کفر کی شہادت دے رہے ہیں ان کے تو سارے اعمال ضائع ہوگئے اور جہنم میں انہیں ہمیشہ رہنا ہے۔ اللہ کی مسجدوں کے آباد کار تو وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو اللہ اور روز آخر کو مانیں اور نماز قائم کریں زکوۃ دیں اور اللہ کے سواء کسی سے نہ ڈریں۔

ان آیات کا خلاصہ معارف القران میں مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے جو پیش فرمایا ہے اس کو پہلے دیکھ لیجئے:

''مشرکین مکہ اپنی مشرکانہ رسوم کو عبادت اور مسجد حرام کی عمارت و آبادی کا نام دیتے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کے متولی اور اس کی عمارت کے ذمہ دار ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عباس ؓ جب اسلام لانے سے پہلے غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے اور مسلمانوں نے ان کو کفر وشرک پر قائم رہنے سے عار دلائی تو انہوں نے جواب دیا کہ تم لوگ صرف ہماری برائیاں یاد رکھتے ہو اور بھلائیوں کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم بیت اللہ اور مسجد حرام کو آباد رکھنے اور اس کا انتظام کرنے اور حجاج کو پانی پلانے وغیرہ کی خدمات کے متولی بھی ہیں۔ اس پر قرآن کریم کی یہ آیتیں نازل ہوئیں: مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ...... یعنی مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مساجد کی تعمیر کریں۔ کیونکہ مسجد صرف وہی جگہ ہے جو ایک اللہ وحدہ کی عبادت کیلئے بنائی گئی ہے، شرک اور کفر اس کی ضد ہے۔ وہ عمارت مسجد کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔

عمارت مسجد کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے کئی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ظاہری در و دیوار کی تعمیر، دوسرے مسجد کی حفاظت اور صفائی اور ضروریات کا انتظام، تیسرے عبادت کے لئے مسجد میں حاضر ہونا، عمرہ کو عمرہ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ اس میں بیت اللہ کی زیارت اور عبادت کیلئے حاضری ہوتی ہے۔

مشرکین مکہ تینوں معنی کے اعتبار سے اپنے آپ کو معمار بیت اللہ اور عمارت مسجد حرام کا ذمہ دار سمجھتے تھے اور اس پر فخر کیا کرتے تھے۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرمادیا کہ مشرکین کو اللہ کی مساجد کی عمارت کا کوئی حق نہیں جبکہ وہ خود اپنے کفر و شرک کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے اعمال حبط اور ضائع ہوگئے اور وہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہیں گے۔

خود اپنے کفر و شرک کی گواہی کا مطلب یا تو یہ ہے کہ اپنے مشرکانہ افعال واعمال کے سبب گویا خود اپنے کفر و شرک کی گواہی دے رہے ہیں۔ یا یہ کہ یہ عادۃً جب کسی نصرانی یا یہودی سے پوچھا جائے کہ تم کون ہو؟ تو وہ اپنے آپ کو نصرانی یا یہودی کہتا ہے۔ اسی طرح مجوس اور بت پرست اپنے کافرانہ ناموں سے ہی اپنا تعارف کرواتے ہیں۔ یہی ان کے کفر و شرک کا اعتراف اور شہادت ہے۔ (ابن کثیر)

اس آیت میں عمارت مسجد کا منفی پہلو بیان کیا گیا تھا کہ مشرکین اس کے اہل نہیں ہیں۔ دوسری آیت میں عمارت مسجد کا مثبت پہلو اس طرح ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰۤى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ. (التوبۃ:۱۸)

یعنی مسجدوں کو آباد کرنا انہیں لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لاویں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوۃ دیں اور بجز اللہ تعالیٰ کے کسی سے نہ ڈریں۔ سو ایسے لوگوں کے متعلق توقع ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔

مطلب یہ ہے کہ مساجد کی اصلی عمارت صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے احکام الٰہی کے پابند ہوں اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز زکوۃ کے پابند ہوں اور اللہ کے سواء کسی سے نہ ڈرتے ہوں اس جگہ صرف اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے ذکر کرنے کی اس لئے ضرورت نہ سمجھی گئی کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی کوئی صورت بجز اس کے ہو ہی نہیں سکتی کہ رسول پر ایمان لائے۔ اور اس کے ذریعہ جو احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئیں ان کو دل سے قبول کرے۔ اسلئے ایمان باللہ میں ایمان بالرسول فطری طور پر داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام سے پوچھا تم جانتے ہو کہ اللہ پر ایمان کیا چیز ہے؟ صحابہ نے عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ پر ایمان یہ ہے کہ آدمی دل سے اس کی شہادت دے کہ اللہ تعالیٰ کے سواء کوئی قابل عبادت نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اس حدیث نے بتلادیا کہ رسول پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے میں داخل اور شامل ہے۔ (مظہری بحوالہ صحیحین)

اور یہ جو ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سواء کسی سے نہ ڈرے، اس کے معنی یہ ہیں کہ دین کے معاملہ میں کسی کے خوف سے اللہ کے حکم کو ترک نہ کرے۔ ورنہ خوف کی چیزوں سے ڈرنا اور دہشت کھانا تو تقاضائے عقل وفطرت ہے۔ درندے اور زہریلے جانوروں سے چور ڈاکو سے طبعی طور پر ڈرنا اس کے خلاف نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے جب جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنا کر دکھلائے تو وہ ڈر گئے۔ "اَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِهٖ خِیۡفَةً مُّوۡسٰی" اس لئے ایذا اور نقصان پہنچانے والوں سے طبعی خوف نہ حکم قرآنی کے خلاف ہے، نہ رسالت اور ولایت کے۔ ہاں اس خوف سے مغلوب ہو کر اللہ تعالیٰ کے احکام میں خلل ڈالنا یا ان کو ترک کر دینا مؤمن کی شان نہیں، یہی اس جگہ مراد ہے۔

بعض مسائل متعلقہ آیت:

اور عمارت مسجد جس کے متعلق ان آیتوں میں یہ ذکر ہے کہ مشرک کافر نہیں کر سکتے بلکہ وہ صرف نیک صالح مسلمان ہی کا کام ہے۔ اس سے مراد مساجد کی تولیت اور انتظامی ذمہ داری ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کافر کو کسی اسلامی وقف کا متولی اور منتظم بنانا جائز نہیں، باقی رہا ظاہری در و دیوار وغیرہ کی تعمیر سو اس میں کسی غیر مسلم سے بھی کام لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ (تفسیر مراغی)

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ثواب سمجھ کر مسجد بنادے یا مسجد بنانے کیلئے مسلمانوں کو چندہ دے دے تو اس کا قبول کر لینا بھی اس شرط سے جائز ہے کہ اس سے کسی دنیوی یا دینی نقصان یا الزام کا یا آئندہ اس پر قبضہ کر لینے کا یا احسان جتلانے کا خطرہ نہ ہو۔ (ردالمحتار، شامی، مراغی)

اور اس آیت میں جو یہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کی عمارت اور آبادی صرف نیک مسلمان ہی کا کام ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو شخص مساجد کی حفاظت، صفائی اور دوسری ضروریات کا انتظام کرتا ہے اور جو عبادت اور

ذکر اللہ کیلئے یا علم دین اور قرآن پڑھنے پڑھانے کیلئے مسجد میں آتا جاتا ہے اس کے یہ اعمال اس کے مومن کامل ہونے کی شہادت ہیں۔

امام ترمذی اور ابن ماجہ نے بروایت ابوسعید خدریؓ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ مسجد کی حاضری کا پابند ہے تو اس کے ایمان کی شہادت دو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: اِنَّمَا يَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ اور صحیحین کی حدیث میں ہے کہ ’’آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح شام مسجد میں حاضر ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کیلئے جنت کا ایک درجہ تیار فرما دیتے ہیں‘‘۔

اور حضرت سلمان فارسیؓ نے روایت کیا کہ ’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسجد میں آیا وہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والا مہمان ہے، اور میزبان پر حق ہے کہ مہمان کا اکرام کرے۔‘‘

(مظہری بحوالہ طبرانی، ابن جریر بیہقی وغیرہ)

مفسر قرآن حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے فرمایا کہ ’’عمارت مسجد میں یہ بھی داخل ہے کہ مسجد کو ایسی چیزوں سے پاک کرے جن کیلئے مسجدیں نہیں بنائی گئیں، مثلاً خرید و فروخت، دنیا کی باتیں، کسی گم گشتہ چیز کی تلاش، یا دنیا کی چیزوں کا لوگوں سے سوال، یا فضول قسم کے اشعار، جھگڑا، لڑائی اور شور و شغب وغیرہ۔‘‘ (مظہری)

زیر بحث آیات فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان آیات سے پہلے بات یہ چل رہی ہے کہ مشرکین سے قطعی علاحدگی اختیار کرو اور ان کو ہم راز نہ بناؤ اور ان سے جہاد کرو۔ ان آیات کے بعد بھی جہاد کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس طرح سیاق و سباق کی روشنی میں ان دونوں آیتوں سے جو بات معلوم ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ مشرکین سے بے تعلقی اختیار کرنا، ان سے دوستی نہ کرنا، اور ان سے جہاد کرنا، اس لئے ضروری ہے کہ وہ اقراری کافر و مشرک ہونے کے باوجود مسجد حرام پر قابض ہیں اور اللہ کے گھر میں بتوں کی پوجا کر رہے ہیں لہٰذا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مشرکین کو بے دخل کریں اور اللہ کے گھر کو صحیح معنی میں آباد کریں۔

سوچئے کہ مشرکین کو حق نہیں ہے کہ وہ مساجد کو آباد کریں اور اللہ کی مسجدوں کو صرف اہل ایمان آباد کرتے ہیں۔ بات یہ کس سے کہی جا رہی ہے اور کیوں کہی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے مخاطب مسلمان ہی ہیں۔ گویا ان سے کہا جا رہا ہے کہ مسجد حرام کو مشرکین سے آزاد کراؤ۔ لیکن چونکہ مساجد اللہ کا جمع لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ تمام مساجد کو مشرکین سے آزاد رہنا چاہئے اور اگر کسی مسجد پر مشرکین قابض ہیں تو مسلمانوں کو چاہئے کہ ان کو بے دخل کریں۔ ان آیات میں محض ایک بات کی خبر نہیں دینی ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کو ایک حکم دینا مقصود ہے جیسا کہ ہم نے ’’مَا كَانَ لَهُمۡ اَنۡ يَّدۡخُلُوۡهَا‘‘ پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے۔ اس موقع پر مزید وضاحت کے لئے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا تفسیری نوٹ دیکھئے:

’’پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدون امتحان کے یونہی نہیں چھوڑے جاسکتے بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال (مثلاً جہاد وغیرہ) میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائے گی اور یہ کہ تمام دنیا کے تعلقات پر کس طرح خدا اور رسول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس رکوع میں یہ بتلایا کہ خدا کی مساجد (عبادت گاہیں) حقیقتاً ایسے ہی اولوالعزم مسلمانوں کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں۔ مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو۔ ’’ذکر اللہ‘‘ کرنے والے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں۔ لغویات وخرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ مقصد کفار ومشرکین سے کب حاصل ہوسکتا ہے؟ دیکھئے مشرکین مکہ بڑے فخر سے اپنے کو ’’مسجد حرام‘‘ کا متولی اور خادم کہتے تھے۔ مگر ان کی بڑی خدمت گذاری یہ تھی کہ پتھر کی سینکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھیں ان ہی کی نذر و نیاز کرتے اور منتیں مانتے تھے بہت سے لوگ ننگے طواف کرتے تھے ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں تک پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے لے دے کر ان کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیل لگادی یا حرم شریف میں چراغ جلادیا۔ کعبہ پر غلاف چڑھایا یا کبھی ضرورت ہوئی تو شکست وریخت کی مرمت کرادی مگر یہ اعمال محض بے جان اور بے روح تھے۔ کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اُس کا قبلۂ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کی ذات منبع الکمالات نہیں ہوسکتی۔ اسی لئے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک زندہ اور معتد بہ عمل نہیں ہے۔ (اسی کو ’’حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ‘‘ سے تعبیر فرمایا) الغرض کفار ومشرکین جو اپنے حال وقال سے اپنے کفر وشرک پر ہر وقت شہادت دیتے رہتے ہیں۔ اس لائق نہیں کہ اُن سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہوسکے۔ یہ کام صرف اُن لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لاچکے ہیں جوارح سے نمازوں کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں اموال میں سے باقاعدہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اور خدا کے سواء کسی سے نہیں ڈرتے۔ اسی لئے مساجد کی صیانت وتطہیر کی خاطر جہاد کیلئے تیار رہتے ہیں۔ ایسے مومنین جو دل و زبان، ہاتھ پاؤں، مال ودولت، ہر چیز سے خدا کے مطیع فرمانبردار ہیں۔ ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد رکھیں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ اُن کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے۔‘‘

ان آیات سے متعلق چند جملے مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ کے دیکھئے:

’’فقہاء نے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ کوئی کافر کسی مسجد کا متولی یا بانی و خادم ہونے کے لائق نہیں۔ واقتضت الایۃ منع الکفار من دخول المساجد ومن بناءھا وتولی مصالحھا والقیام بھا‘‘
(جصاص تفسیر ماجدی)

مساجد کو آباد کرنے والوں کی صفات

مساجد اللہ کو آباد کرنے والوں کے اندر چار صفات اور خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر آباد کاری کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ وہ چار صفات یہ ہیں:

① اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان
② اقامتِ صلوٰۃ
③ اِیتاءِ زکوۃ
④ اللہ کے علاوہ کسی سے نہ ڈرنا

ان صفات کو ایک رُخ سے دیکھا جائے تو وہ ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہیں جن کو مساجد اللہ سے محبت کا دعویٰ ہو۔ یا جو لوگ مساجد کی حفاظت اور صیانت کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے اپنے اندر ان صفات کو پیدا کریں اور اس کسوٹی پر اپنے کو پرکھیں اور اس پہلو سے جو کمی ہو اس کو دور کرنے کی فکر کریں ورنہ نہ مساجد کی محبت کا حق ادا ہوگا اور نہ ان کی جدوجہد صحیح ڈھنگ پر ہوسکتی ہے اور بڑی بات یہ کہ دنیا کی نظروں میں چاہے اس کی کچھ قیمت اور اہمیت ہو لیکن اللہ تعالیٰ کے پاس اس کی کوئی قدر و قیمت نہ ہوگی۔

ایک دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ بابری مسجد کے تحفظ اور صیانت میں جو سرد مہری منظرِ عام پر آئی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟۔ زیر بحث آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کی آباد کاری کی صلاحیت ایمانی صفات سے پیدا ہوتی ہے اور نااہلی کا سبب کفر ہوتا ہے۔ لہٰذا کفر سے جتنی دوری اور ایمانی صفات سے جتنی مناسبت اور قربت ہوگی اتنی ہی مساجد کی صیانت اور حفاظت کا حق ہم ادا کرسکیں گے۔

ہمارے اندر ضعف ایمانی کے علاوہ اقامت صلوۃ کی صفت کا بڑا فقدان ہے۔ جہاں اقامت صلوۃ ہے وہاں بسا اوقات ایتاء زکوۃ نہیں ہے۔ اور جہاں یہ دونوں صفات پائی جارہی ہیں وہاں چوتھی صفت کی نمایاں کمی یا فقدان ہے۔ چنانچہ دیندار اور مذہبی طبقہ کو دینی مصلحتیں اور مفادات دنیا کی فکر ایسا گھیرے ہوئے ہے کہ وہ اپنی ساری خوبیوں کے باوجود موجودہ دور کے نمرودوں، فرعونوں، ابوجہلوں اور ابولہبوں کے خوف سے لرزاں اور ترساں ہیں۔ سعی و جدوجہد کرنا تو دور کی بات ہے اس مسئلہ کا ذکر بھی ان کے نزدیک خود اپنی کشتی کو خطرناک طوفان میں ڈال دینے کے برابر ہے۔

مساجد کو بچانے قتال کی مشروعیت

وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ لَّهُدِّمَتۡ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذۡكَرُ فِيۡهَا اسۡمُ اللّٰهِ كَثِيۡرًا وَلَيَنۡصُرَنَّ اللّٰهُ مَنۡ يَّنۡصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيۡزٌ. (الحج:۴۰)

ترجمہ: اور اگر نہ ہٹایا کرتا اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں نام لیا جاتا ہے اللہ کا بہت اور ضرور اللہ مدد کرے گا اس کی جو مدد کرے اس کی۔ بیشک اللہ زبردست زور والا ہے۔

سورۃ بقرہ آیت: ۲۵۱ میں اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بتائی گئی ہے کہ زمین کو شر و فساد سے بچانے کیلئے کسی کو اقتدار اور تسلط مستقل طور پر نہیں دیا جاتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہٹاتے بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں اسی سلسلہ کی یہ بات بتائی جارہی ہے کہ عبادت گاہوں اور مسجدوں کو انہدام سے بچانے کیلئے ایک کو دوسرے کے ذریعہ ہٹانا اللہ کا دستور ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ کوئی گروہ عبادت گاہوں اور مساجد کی بے حرمتی کرکے اور ان کو منہدم کرکے اقتدار پر باقی نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ اسے ضرور زوال اور ذلت سے دوچار کرے گا اور یہ کام انسانوں میں سے ہی کسی گروہ کے ذریعہ لیا جائے گا اور اللہ کا یہ کام جو کریں گے وہ گویا اللہ کی مدد کریں گے اور جو اللہ کی مدد کرے گا اللہ اس کی مدد کریں گے اور اللہ زبردست اور زور والا ہے۔ اسکے سامنے کسی کی طاقت اور قوت کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس طرح آیت میں ان لوگوں کیلئے خوشخبری ہے جو بابری مسجد یا کسی ویران مسجد کی تعمیر نو کیلئے کوشش کریں گے کہ انہیں اللہ کی مدد اور نصرت ملے گی انہیں اطمینان رکھنا چاہئے گھبرانے کی ضرورت نہیں اور یہ کہ ان کا شمار انصار اللہ میں ہوگا۔

اس آیت کو مزید سمجھنے کیلئے علّامہ شبیر عثمانیؒ کی یہ تفسیر پڑھئے:

''یعنی اگر کسی وقت اور کسی حالت میں بھی ایک جماعت کو دوسری سے لڑنے بھڑنے کی اجازت نہ ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے قانون فطرت کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ اس نے دنیا کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ ہر چیز یا ہر شخص یا ہر جماعت دوسری چیز یا شخص یا جماعت کے مقابلہ میں اپنی ہستی برقرار رکھنے کیلئے جنگ کرتی رہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور نیکی کو اللہ تعالیٰ اپنی حمایت میں لے کر بدی کے مقابلہ میں کھڑا نہ کرتا تو نیکی کا نشان زمین پر باقی نہیں رہتا۔ بددین اور شریر لوگ جن کی ہر زمانہ میں کثرت رہی ہے تمام مقدس مقامات اور یادگاریں ہمیشہ کیلئے صفحۂ ہستی سے مٹادیتے۔ کوئی عبادتگاہ، تکیہ، خانقاہ، مسجد، مدرسہ محفوظ نہ رہ سکتا۔ بناء علیہ ضروری ہوا کہ بدی کی طاقتیں خواہ کتنی ہی مجتمع ہوجائیں قدرت کی طرف سے ایک وقت آئے جب نیکی کے مقدس ہاتھوں سے بدی کے حملوں کی مدافعت کرائی جائے۔ اور حق تعالیٰ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی خود مدد فرما کر ان کو دشمنان حق وصداقت پر غالب کرے بلاشبہ وہ ایسا قوی اور زبردست ہے کہ اس کی اعانت وامداد کے بعد ضعیف سے ضعیف چیز بڑی سے بڑی طاقتور ہستیوں کو شکست دے سکتی ہے۔ بہر حال اس وقت مسلمانوں کو ظالم کافروں کے مقابلہ میں جہاد وقتال کی اجازت دینا اسی قانون قدرت کے ماتحت تھا۔ اور یہ وہ عام قانون ہے جس کا انکار کوئی عقلمند نہیں کرسکتا۔ اگر مدافعت وحفاظت کا یہ قانون نہ ہوتا تو اپنے اپنے زمانہ میں نہ عیسائی راہبوں کے صومعے (کوٹھرے) قائم رہتے نہ نصاری کے گرجے نہ یہود کے عبادت خانے نہ مسلمانوں کی وہ مسجدیں جن میں اللہ کا ذکر بڑی کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ سب عبادت گاہیں گرا اور ڈھا کر برابر کردی جاتیں۔ پس اسی عام قانون کے تحت کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک وقت مناسب پر اپنے دشمنوں سے لڑنے کی اجازت نہ دی جائے۔''

ایک دوسرا تفسیری نوٹ بھی دیکھئے:

''جہاد وقتال کی ایک حکمت: **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ**، اس میں جہاد وقتال کی حکمت کا اور اس کا بیان ہے کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء اور ان کی امتوں کو بھی قتال کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی۔ سارے ہی دین ومذہب اور ان کی عبادت گاہیں ڈھا دی جاتیں۔

"لھدمت صوامع وبیع وصلوت ومسجد" جتنے دین ومذہب دنیا میں ایسے ہوئے کہ کسی زمانے میں ان کی اصل بنیاد اللہ کی طرف سے اور وحی کے ذریعہ سے قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہوگئے اور ان میں تحریف ہوکر کفر وشرک میں تبدیل ہوگئے مگر اپنے اپنے وقت میں وہی حق تھے، ان سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے کیونکہ اپنے اپنے وقت میں ان کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی۔ ان

مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی۔ جیسے آتش پرست مجوس یا بت پرست ہندو کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

آیت میں صَوَامِعُ، صَومَعَۃٌ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے تارک الدنیا راہبوں کی مخصوص عبادت گاہ کو کہا جاتا ہے اور بِیَعٌ بِیْعَۃٌ کی جمع ہے جو نصاریٰ کے عام کنیسوں کا نام ہے اور صَلَوٰتٌ صَلٰوۃٌ کی جمع ہے جو یہود کے عبادت خانے کا نام ہے اور مساجد مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا نام ہے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ کفار سے قتال و جہاد کے احکام نہ آتے تو کسی زمانے میں کسی مذہب وملت کیلئے امن کی جگہ نہ ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صلوت اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صوامع اور بیع اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مسجدیں ڈھادی جاتیں۔'' (قرطبی) (معارف القرآن)

فتاویٰ

مسجد کو دوسری جگہ منتقل کرنا

سوال ایک مسجد وسط محلہ میں واقع ہے، پانی کی بڑی دقت ہے، نمازیوں کو نماز ادا کرنے میں بھی دشواری کا سامنا ہے، دریں حالات اس مسجد کو یہاں سے ہٹا کر ایسی جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے جس میں اس قسم کی دشواریاں نہ ہوں اور نماز بہ سہولت ادا کی جا سکے؟ **بینوا توجروا**

جواب الجواب باسم ملھم الصواب: **مسجد کو کسی حال میں بھی منتقل کرنا جائز نہیں، جو جگہ ایک بار مسجد بن گئی وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی۔** بالفرض مسجد ویران ہو جائے اور کوئی نماز پڑھنے والا بھی وہاں نہ رہے تو بھی اس کا ابقاء واجب ہے۔ البتہ ویران مسجد کے سامان پر خطرہ ہو تو اس کو دوسری قریب تر کسی مسجد کی طرف منتقل کیا جا سکتا ہے۔ **واللہ تعالیٰ اعلم**

۱۱ رجب ۱۳۸۹ (احسن الفتاوی، ۴۵۱، باب المساجد)

مسجد پر امام کا مکان بنانا

سوال **امام کی سکونت کیلئے مسجد کے اوپر مکان تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا**

جواب الجواب باسم ملھم الصواب: **زمین کے جتنے قطعہ کو ایک بار مسجد شرعی قرار دے دیا گیا اس کے اندر اور نیچے اوپر کوئی دوسری چیز بنانا جائز نہیں۔** مسجد شرعی قرار دینے سے قبل امام کیلئے مکان یا مصالح مسجد کیلئے اور کچھ بنانا طے کر لیا ہو اور اس کی عام اطلاع بھی کر دی ہو تو جائز ہے۔ مسجد شرعی ہو جانے کے بعد اگر متولی نے شروع ہی سے نیت کا دعویٰ کیا تو یہ قبول نہ ہوگا۔

قال فی شرح التنویر: لو بنی فوقه بیتا للامام لایضر لانه من المصالح امالوتمت المسجدیة ثم ارادالبناء منع ولو قال عنیت ذلک لم یصدق تاتر خانیة (ردالمحتار، ص:۳۸۲ جلد ۳). **واللہ تعالیٰ اعلم**

۱۱ محرم ۱۳۸۶ھ (احسن الفتاوی جلد ۶ ص ۴۴۴)

مسجد کی زمین میں امام کا مکان بنانا

سوال: ایک مسجد کافی وسیع ہے، اس کا کچھ حصہ خارج کر کے اس میں امام مسجد کیلئے مکان تعمیر کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: الجواب باسم ملهم الصواب: جو زمین ایک دفعہ مسجد میں داخل ہو چکی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی، کسی بھی ضرورت کیلئے اسے مسجد سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔

قال فی شرح التنویر ولو خرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً عند الامام والثانی ابداً الی قیام الساعة وبه یفتی۔

وفی الشامية (قوله ولوخرب ماحوله الخ) ای ولو مع بقائه عامرا وكذا لوخرب وليس له ما يعمر به وقد استغنى الناس عنه لبناء مسجد اخر۔ **والله تعالیٰ اعلم** (ردالمحتار، ص:۵۱۳، ج:۳) ۱۹رشوال ۱۳۷۴ھ (احسن الفتاوی جلد ۶، ص ۴۳۶)

پرانی مسجد کو مکتب بنانا

سوال: پرانی مسجد کو مکتب بنانا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: الجواب باسم ملهم الصواب: مسجد جب ایک بار بن گئی تو وہ ہمیشہ مسجد ہی رہے گی، خواہ لوگ اس میں نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، لہٰذا اس کو مکتب بنانا جائز نہیں۔ البتہ اس کی مسجدیت اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس میں دین کی تعلیم دینا ان شرائط سے جائز ہے:

① معلم اجرت لے کر نہ پڑھائے۔ بقدر ضرورت وظیفہ لے سکتا ہے۔
② چھوٹے بے سمجھ بچوں کو مسجد میں نہ آنے دیا جائے۔
③ مسجد کے احکام اور ادب و احترام کا پورا اہتمام رکھا جائے۔

قال فی التنویر: ولوخرب ما حوله واستغنی عنه یبقی مسجداً۔

وقال العلامة ابن عابدين رحمه الله تعالىٰ: ولايجوز نقله ونقل ماله الى مسجد اخر سواء كانوا يصلون فيه اولا وهو الفتوى حاوى القدسى واكثر المشايخ عليه مجتبى وهو الاوجه فتح اوبحر۔ **والله تعالیٰ اعلم**

(ردالمحتار، ص:۳۸۲، جلد:۳) ۶رجمادی الثانی ۱۳۹۲ھ (احسن الفتاوی جلد ۶، ص:۵۴۶)

جامع مسجد میں نماز پنجگانہ افضل ہے
یا مسجد محلہ میں اور جامع مسجد کی فضیلت جمعہ کے ساتھ مختص ہے یا عام

سوال ① جامع مسجد میں پنجوقتی نماز باجماعت پڑھنا افضل ہے یا محلہ کی مسجد میں پڑھنا باجماعت افضل ہے؟
② اور یہ فضیلت مختص بہ صلوٰۃ جمعہ ہے؟
③ یا عام ہے؟ بینوا توجروا

جواب ① محلہ کی مسجد میں۔
② ہاں غیر اہل محلہ کیلئے۔
③ ہاں اہل محلہ کیلئے فقط (۶ ؍ رمضان المبارک ۱۳۳۰ھ، تتمہ اول، ص: ۴۲) (امداد الفتاوی جلد: ۲، ص: ۶۵۸)

عدم جواز اجازت طبل و باجہ وغیرہ کفار را بقرب مسجد

سوال جناب مقام صدر بدنور ضلع بیتول جو ریلوے اسٹیشن ہے وہاں ایک بازار نیا گنج تیار ہوا ہے اور بفضل خدا چند مسلمانان وہاں جمع ہو گئے اور شہر بدنور سے اسٹیشن ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ہے اور مسجد شہر میں ہے۔ گنج شہر سے مسجد آنے میں سخت دقت پڑتی ہے اس لئے مسلمانان گنج و شہر والوں نے ایک درخواست دوسری مسجد گنج میں بنانے کو صاحب ضلع بہادر کو دی اور اجازت مسجد دے کر بنوانے کا حکم بھی اس شرط پر ہو گیا کہ باجا بجنا مسجد سے کتنے فاصلہ پر سے بند کیا جائے کہ جس میں تشویش نماز میں مصلیوں کو نہ ہو۔ فتویٰ ہندوستان سے کسی مولوی و مفتی کا منگوادو صاحب ضلع بہادر نے مانگا ہے؟
بینوا توجروا

جواب ای ردالمحتار فی حاشیۃ الحموی عن الامام الشعرانی اجمع العلماء سلفا و خلفا علی استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد و غیرھا لا ان یشوش جھرھم علی نائم او مصل او قاری الخ (ص: ۶۹۱، ج: ۱)

اس روایت سے معلوم ہوا کہ جب پکار کر ذکر کرنا باوجودیکہ فی نفسہ مستحب ہے جس وقت اُس سے کسی نماز پڑھنے والے یا قرآن پڑھنے والے کو تشویش ہو وہ ناجائز ہو جاتا ہے تو باجا جو کہ فی نفسہ بھی ناجائز ہے جب اُس سے ایسی تشویش پیدا ہو، ضرور اُس سے روکا جاوے گا۔ اور تشویش میں یہ بھی داخل ہے کہ جماعت ہو رہی ہو اور باجہ کی آواز سے امام کی آواز، قرأت یا تکبیر کی مقتدیوں تک نہ پہنچے اور اس لئے ان کی نماز اس طرح خراب ہو کہ امام مثلاً سجدہ سے اٹھا اور مقتدی بوجہ آواز نہ پہنچنے

کے سجدہ ہی میں پڑے رہے تو ایسی تشویش کسی قدر دور کے باجہ سے ہوسکتی ہے جب تک بہت دور نہ ہو اور یہ بات تجربہ سے معلوم کر کے اندازہ فاصلہ کا مقرر کیا جاسکتا ہے۔ شریعت میں اس کی کوئی خاص حد نہیں۔ فقط (۸ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ، خوادث خامس، ص:۷)، (امداد الفتاوی، جلد:۲، ص:۶۵۸)

حکم درختاں نصب کردہ عامئے در قبرستان

سوال: کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین مسئلہ مندرجہ ذیل میں:

① عام قبرستان میں اگر کسی نے درخت پھلدار لگائے تو اُس درخت کا پھل ولکڑی وہ شخص اپنے مصرف میں لانے کا مستحق ہے یا نہیں اور اُس درخت کا مالک ہے یا نہیں؟

② بلا اجازت غارس کے عام مسلمانان اُس درخت کی لکڑی کسی میت کے تختہ میں دے سکتے ہیں یا نہیں؟

③ اگر وہ درخت غارس کا نہیں ہے تو اُس کا پھل ولکڑی خود غارس و نیز عام مسلمانان کو کھانا و لے جانا درست ہے یا نہیں؟

④ ان درختوں کی قیمت سے مسجد کی مرمت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ یا صرف قبرستان ہی پر صرف کیا جاوے؟ بینوا توجروا

جواب: الجواب عن الکل: اگر اُس نے بہ نیت وقف لگائے ہیں تو اُس وقف کا جو مصرف ہے وہی ان درختوں کا مصرف ہے اور اگر بہ نیت اپنے مالک ہونے کے لگائے ہیں تو خود اس کی ملک ہیں دوسروں کو اُن سے منتفع ہونا بلا اس کی اذن کے جائز نہیں۔ البتہ متولی قبرستان کو یا عام مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس شخص کو مجبور کریں کہ وہ ان درختوں کو اُکھاڑ لے اور زمین قبرستان کو خالی کر دے۔ اس تقریر سے سب سوالوں کا جواب ہوگیا۔ فقط

(۱۷ر شوال المکرم ۱۳۳۲ھ، تتمہ ثانی، ص:۵۷) (امداد الفتاوی، جلد:۲، ص:۶۰۸)

حکم مساجد ومقابر منہدمہ

سوال: پرانی دہلی میں بہت سی مساجد قدیمہ ایسی ہیں جو گردش زمانہ سے بالکل ویران ہوگئی ہیں اور قطعی طور پر غیر آباد ہیں۔ ان میں سے اکثر پر لوگوں نے مالکانہ تصرف کرلیا ہے اور اُن میں یا تو رہائش اختیار کرلی ہے یا مویشی باندھتے ہیں یا اُن کا چارہ از قسم بھوسہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ بعض ایسی بھی ہیں جو کہ بالکل خالی ہیں اور اُن کو وہ لوگ جنھوں نے کہ اُس زمین کو جہاں کہ وہ واقع ہیں خرید لیا ہے یا ترکہ

میں پایا ہے اپنی ملکیت گردانتے ہیں۔ پس علمائے دین متین سے یہ سوالات ہیں:

① آیا کہ مسجد کسی وقت میں کسی کی ملکیت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اُس کو کوئی شخص اپنی ملکیت بنا کر فروخت کرسکتا ہے یا نہیں؟

② اگر کوئی شخص کسی مسجد پر مالکانہ تصرف رکھتا ہو آیا یہ امر ضروری ہے یا نہیں کہ اُس کے قبضہ تصرف سے وہ مسجد نکال لی جاوے اور اس کو بطور مسجد رکھا جاوے؟

③ پرانی دہلی میں مقبرے قدیمہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اُن میں سے اکثر کی یہی کیفیت ہے جو مذکورہ بالا مساجد کی۔ ان مقبروں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ بینوا توجروا

جواب: فی الدر المختار ولو خرب ماحوله واستغنى عنه يبقى مسجداً عندالامام والثانی ابداً الی قيام الساعة وبه يفتی حاوی القدسی فی ردالمحتار قوله لوخرب ماحوله الخ۔ ای ولو مع بقائه عامرا او كذالو خرب وليس له مايعمر به وقد استغنى الناس عنه خرب لبناء مسجد اخر۔ قوله عندالامام والثانی فلايعود ميراثا ولا يجوز نقله ونقل ماله الى مسجد اخر سواء كانوا يصلون فيه اولا وهوالفتوى حاوی القدسی واكثر المشائخ عليه مجتبى وهوالاوجه فتح (ج:۳، ص:۵۷۳)

① اس روایت سے معلوم ہوا کہ مسجد کسی وقت کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی اور اُس کو کوئی شخص اپنی ملک بنا کر فروخت نہیں کرسکتا۔

② یہ نکال لینا ایک فرع ہے ازالۂ منکر کی، سو اس کا مدار قدرت پر ہے۔ اگر کسی کو اس پر قدرت ہو تو اُس پر واجب ہے اور اگر قدرت نہ ہو تو دل سے ناگواری اور عمل میں صبر کافی ہے۔

وهذا ظاهر من القواعد الشرعية (ب) فی الدر المختار بعد العبادة المادة فی (الف) وكذا الرباط والبئر اذا لم ينتفع بهما اه قلت قوله وكذا ای مثل المسجد فی الحكم ای عدم عوده الیٰ ملک احد ويتفرع عليه الحكم المذكور فی (الف۲).

اس سے ثابت ہوا کہ ان مقبروں کا بھی وہی حکم ہے جو مساجد کا مذکور ہوا۔ (الف ۲) میں بھی۔ فقط

(یکم ذی القعدہ ۱۳۳۲ھ، تتمہ ۲، ص:۱۷۹) (امداد الفتاویٰ، جلد:۲، ص:۶۰۹)

مسجد کے دریا برد ہونے کے خوف سے اُس کو منہدم کرنا

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ دریائے راوی نے ہمارے قصبہ

سیدوالہ کو گرانا شروع کر دیا ہے۔قصبہ کی آبادی کا ایک حصہ دریا نے کاٹ کر صاف کر دیا ہے اور بعض بڑے بڑے مقامات گر چکے ہیں دریائے مذکور کی حالت اس قسم کی خوف ناک ہوچکی ہے جس سے اہالیان شہر کا متفقہ خیال ہو چکا ہے کہ اب یہ شہر ضرور منہدم ہوجائے گا۔لوگ نئی آبادی کی بنیاد ڈالنے کے واسطے تجاویز کر چکے ہیں۔اس قصبہ میں تقریباً چھ سات مساجد اہل سنت والجماعت مسلمانوں کی ہیں اور وہ قصبہ کے باقی محلات کے ساتھ سخت خطرہ میں ہیں۔

اگر دریا شہر کو کاٹ کر بتدریج ان مساجد کے قریب پہنچے اور ان کو گرانا شروع کر دے جس سے یقیناً تمام ملبہ و پختہ اینٹیں، لکڑی کا سامان، شہتیر، باسے وغیرہ دریا میں غرق ہوجائیں گے یا بہہ جائیں گے۔ اور چونکہ یہاں کے مسلمان بہت مفلوک الحال اور افلاس زدہ ہو چکے ہیں اس قسم کی پختہ عمارات زمانہ قدیم کی تعمیر شدہ ہیں، اس صورت میں اور متذکرۃ الصدر حالات کے ماتحت اگر مسلمان مساجد کا تمام ضروری اور کارآمد ملبہ مع پختہ فرشوں کے اکھیڑ لیں تاکہ نئی مسجد کی تعمیر میں لگایا جاسکے تو شرعاً مسلمانوں کا یہ فعل جائز ہے یا نہیں۔یعنی تحریم مساجد کے منافی تو نہیں جو خدا و خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک قابل مؤاخذہ ہو۔ جواب جلد ارسال فرماویں تباہی ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ بینوا توجروا

جواب نازک مسئلہ اور بڑے درجہ کے سائل۔اس کا جواب تو محققین کے مشورہ سے دیا جانا مناسب تھا اب بھی ممکن ہے کہ دیوبند سے رجوع فرمایا جائے اور یہ میری تحریر بھی بھیج دی جائے باقی امتثال امر کیلئے میں بھی اپنا خیال عرض کر دوں۔ جزئیہ کا حوالہ تو ذہن میں نہیں قواعد سے عرض کرتا ہوں۔اگر غالب گمان گرنے کا نہ ہو تو ہدم جائز نہیں اور اگر غالب گمان ہو تو اس نیت سے جائز ہے (اور اس نیت کا اعلان بھی کر دیا جائے) کہ اگر دریا بُرد ہوگئی تو اس کے ملبہ سے نئی آبادی میں مسجد بنائیں گے اور اگر سالم رہی تو پھر اصلی جگہ تعمیر کر دیں گے اور یہ سب تفصیل اس وقت ہے کہ جب خود منہدم ہوجانے کے وقت حمل ونقل کی قدرت نہ رہے گی ورنہ خود انہدام کا انتظار ضروری ہے۔فقط

(۲۰ رجمادی الاوّل ۱۳۵۴ھ)　(امداد الفتاوی، جلد:۲، ص:۲۲۷)

عدم جواز ساختن حوض کہ جزوی ازاں زیر مسجد باشد

سوال کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک محلہ میں ایک مسجد قدیم ہے۔ اس کے آگے ایک دوسری زمین ہے۔فنائے مسجد سے اس میں حوض بنانا چاہتے ہیں مصالح مسجد کیلئے۔مگر حوض کیلئے وہ جگہ

کافی نہیں اگر وہ حوض کسی قدر مسجد کے نیچے آوے اور اُس کے اوپر سے ویسی ہی چھت ڈالی جائے جیسے کہ پہلے تھا تو آیا یہ درست ہے یا نہیں۔اس صورت میں مسجد بھی کم نہ ہوگی اور حوض بھی بقدر دو گز کے مساجد کے نیچے کو آجاوے گا اور اوپر سے چھپا ہوا ہوگا بہ مثل سابق لوگ اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔
بینوا توجروا

جواب درست نہیں۔فقط (ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ) (امداد الفتاوی،جلد:۲،ص:۶۸۶)

عدم جواز ساختن حوض کہ جزوے ازاں زیر مسجد باشد

سوال کیا فرماتے ہیں علماء دین ومفتیان شرع متین کہ جامع مسجد حسن پور میں حوض نہیں ہے جس کی وجہ سے وضو آسانی سے نہیں ہوسکتا اور مسجد کے صحن کے علاوہ حوض بنانے کے واسطے اراضی حاصل نہیں ہوسکتی اگر صحن مسجد میں حوض بہ شکل مستطیل جس کا طول ۲۴ درعہ اور عرض ۴ گز چار تسو جس کا رقبہ سو گز ہوگیا بنا کر اوپر پاٹ دی جاوے تا کہ نماز کی جگہ میں کچھ کمی نہ ہو اور وضو کرنے کے واسطے جو اس نالی وضو کی موجود ہے اور دیوار فصیل مسجد جن دونوں کا مجموعہ سو گز ہے کافی ہے بنالینا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب فی الدر المختار فی دلیل بعض الفروع لانہ مسجد الی عنان السماء فی ردالمحتار وکذا الی تحت الثری الخ (ج:۱،ص:۶۸۶) وفی الدر المختار واما المتخذ لصلاۃ جنازۃ اوعید فھو مسجد فی حق جواز الاقتداء وان انفصل الصفوف رفقا بالناس لافی حق غیرہ بہ یفتی فی ردالمحتار قولہ بہ یفتی لکن قال فی البحر انہ یجوز الوطاء والبول والتخلی فیہ ولا یخفی مافیہ فان البانی لم یعدہ لذلک فینبغی ان لا یجوز وان حکمنا بکونہ غیر مسجد الخ (ص:۶۸۷،ج:۱)، وفی الدرالمختار محرمات المساجد والوضوء الافیما اعد لذلک وغرس الاشجار الالنفع کتقلیل نزفی ردالمحتار قولہ والوضوء لان مائہ مستقذر طبعًا فیجب تنزیہ المسجد عنہ کما یجب تنزیہ عن المخاط والبلغم بدائع قولہ کتقلیل نزقال فی الخلاصۃ غرس الاشجار فی المسجد لاباس بہ اذا کان فیہ نفع للمسجد بان کان المسجد ذانز والاسطرانات لا تستقر بدونھا وبدون ھذا لایجوز اھ وفی الھندیۃ عن الغرائب ان کان لنفع الناس بظلہ ولا یضیق علی الناس ولا یفرق الصفوف لاباس بہ وان کان لنفع نفسہ بورقہ اوثمرہ اویفرق الصفوف اوکان فی موضع تقع بہ المشابھۃ بین

البیعۃ والمسجد یکرہ اھ وبعد اسطر لان فیہ شغل ما اعد للصلوۃ ونحوھا وان کان المسجد واسعا او کان فی الغرس نفع بثمرتہ اھ (ج:۱،ص:۶۹۱)

اِن روایات سے معلوم ہوا کہ حوض بطریق مذکور فی السوال بنانا جائز نہیں۔

اولاً اس لئے کہ بانی نے فرش مسجد کا اس غرض کیلئے نہیں بنایا انظر الیٰ قولہ فان البانی لم یعدہ لذلک الخ

دوسرے اس لئے کہ حوض کے اندر کم وبیش غسالہ وضو کا ضرور گرتا ہے اور اس کا مسجد میں گرانا جائز نہیں۔ انظر الیٰ قولہ لان ماءہ مستقذر الخ۔

تیسرے اس لئے کہ اس سے نماز کی جگہ میں تنگی اور تفریق صفوف واقع ہوگی اور یہ جائز نہیں۔ انظر الیٰ قولہ ولا یضیق علی الناس الخ اور تقلیل نز پر قیاس نہ کیا جاوے کیونکہ وہ ضرورت شدیدہ میں ہے اور یہاں ضرورت شدیدہ نہیں انظر الیٰ قولہ والاسطرانات لاتستقر الخ اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اُس کے پاٹ دینے سے ضیق وتفریق نہ ہوگی کیونکہ اولاً تو پاٹنے تک یہ محذور لازم ہی رہے گا دوسرے پاٹنے میں بھی ہر چہار طرف نالی کے قریب تو ضرور کچھ کچھ خالی چھوڑا جاوے گا اس قدر اتصال میں خلل پڑے گا اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ پانی وضو کا اگر گرے گا تو پانی کی سطح پر گرے گا فرش مسجد پر نہ گرے گا۔ جواب یہ ہے کہ وہ سطح بھی مسجد ہے۔ انظر الیٰ قولہ لانہ مسجد الیٰ عنان السماء الخ فقط

(۲۶/رجب المرجب ۱۳۳۱ھ، تتمہ ثانی، ۲، ص:۵۸) (امداد الفتاوی، جلد:۲، ص:۶۸۶)

حکم اتلاف اشیائے مسجد

سوال اگر کوئی شخص بعض اشیائے مسجد کو مثل فرش وظروف وغیرہ وغیرہ کو بخیال غصب تلف کرے تو متولی اور نمازیان مسجد کو معاوضہ بجبر یا بلا جبر جائز ہے یا نہیں؟

جواب فی ردالمحتار (ج:۳،ص:۵۷۴) قال الزیلعی وعلیٰ ھذا حصیر المسجد وحشیشہ اذا استغنی عنھما الیٰ قولہ ینقل الیٰ مسجد اٰخر۔ پس باوجود استغناء کے بھی خود انتفاع کسی کو جائز نہیں ہے تو احتیاج وضرورت کے وقت تو کب درست ہو جو شخص قادر ہو اُس کو عوض لینے پر جبر جائز ہے۔ واللہ اعلم۔ فقط (۲/ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) (امداد الفتاوی، جلد:۲، ص:۶۷۲)

اگر بعض اشرار وقف جائیداد اور املاک......الخ

سوال اگر بعض اشرار وقف جائیداد اور املاک مسجد کو ضائع اور تلف اور غصب کریں تو مسلمان اُسکے واسطے کسی قسم کی تدبیر استخلاص اور وصول کی کریں یا اُس پر صبر کریں۔ اگرچہ نمازیان مسجد کو تکلیف ہو اور اس کی

وجہ سے نماز مسجد میں ادا نہ کر سکیں۔

جواب: فی الدر المختار و کذا الرباط والبئر اذا لم ینتفع بھما فیصرف وقف المسجد والرباط والبئر والحوض الی اقرب مسجد أو رباط أو بئر أو حوض الیه (ج:۳،ص:۵۷۴)
یہاں بھی یہی سمجھنا چاہئے کہ جب باوجود عدم احتیاج کے کوئی اُس کو اپنے صرف میں نہیں لا سکتا تو مسجد کی حاجت ہوتے ہوئے یہ فعل کب حلال ہوگا اس میں بھی قادر کو تدبیر وسعی استخلاص کی کرنا جائز بلکہ واجب ہے اور سکوت ناجائز۔ واللہ اعلم۔ فقط (۳؍ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) (امداد الفتاوی، جلد:۲،ص:۶۷۲)

حکم مسجد بنا کردہ بمال حرام

سوال: رنڈی کی بنوائی ہوئی مسجد، مسجد شرعی ہے یا نہیں؟

جواب: چونکہ مال حرام سے انتفاع جائز نہیں تو آلۂ قربت تو بدرجۂ اولیٰ نہ ہوگی لہٰذا ایسی مسجد شرعاً مسجد نہیں۔ وھذا ظاھر۔ واللہ اعلم وعلمه اتم واحکم۔ فقط
(یوم الاضحیٰ ۱۳۲۲ھ) (امداد الفتاوی، جلد:۲،ص:۶۷۲)

طوائف کی زمین میں مسجد بنانے کا حکم

سوال: ایک مسجد طوائف (یعنی جو ناجائز فعل سے گزر اوقات کرتی ہیں) کے نام سے مشہور ہے لیکن وہ جائے کسی ہندو راجہ نے ایک طوائف مسمی چھوٹم بھاگا کو تعزیہ بنانے کے واسطے مفت دی۔ اور راجہ کو سوائے گانے بجانے کے اور کوئی تعلق ناشائستہ نہ تھا۔ یعنی طوائف اُس کو گانا بجانا سنایا کرتی تھی لہٰذا خوش ہو کر اُس کو دیا تھا بلکہ اور کھیت وغیرہ بھی دیا ہے۔ اُس جائے پر تعزیہ بھی بنتا تھا اور اب بھی بنتا ہے لیکن کسی زمانہ میں وہیں قوم نماز بھی پڑھا کرتی تھی اس سبب سے مسجد مشہور ہے کسی وقت میں وہ مسجد (یعنی امام باڑہ) پانی کے سیلاب سے بہہ گیا تھا پھر شہر کے سنی مسلمانوں نے مسجد باندھا یعنی بنایا لیکن نماز نہیں پڑھی گئی۔ اب وہ جائے طوائفوں کے قبضہ میں ہے وہ یہ چاہتی ہیں کہ کوئی مسلمان مسجد باندھے ہم وہ جائے مفت دیتے ہیں اور جو کچھ ہماری مسجد کی عمارت ہے ہم لے جاتے ہیں ایسا وہ کہتی ہیں آیا اُس پر مسجد باندھی جاوے تو نماز جائز ہوگی یا نہیں۔ اگر نہیں جائز ہے تو کوئی صورت بھی جائز ہونے کی ہے یا نہیں؟ اُمید کہ کوئی حیلہ شرعی بیان فرماویں جس سے مسجد کے جواز کی کوئی صورت ہو جاوے۔ **بینوا توجروا**

جواب: چونکہ گانا بجانا بھی معصیت ہے اور معصیت کے عوض جو چیز حاصل ہو اس سے انتفاع جائز نہیں اسلئے وہ زمین مسجد کے قابل نہیں ہے البتہ اگر یہ تاویل کی جاوے کہ اُس معصیت کا عوض تو جدا ملتا تھا مثلاً

تنخواہ ملتی ہوگی مزید برآں انعام واکرام ملتا تھا اس لئے یہ زمین اُس معصیت کا عوض نہ تھا بلکہ ابتداءً ایک تبرع تھا اس طرح اُس سے انتفاع ہوسکتا ہے تو البتہ گنجائش ہے بشرطیکہ موافق فرائض کے جو اُس اوّل طوائف کا وارث اور اس زمین کا مالک ہو وہ اجازت دے دے یا یہ ثابت ہوجاوے کہ اس طوائف نے مسجد کیلئے اس کو وقف کردیا تھا اور اُس کے روبرو لوگ اُس میں نماز پڑھنے لگے تھے۔ فقط (۱۸ ربیع الثانی ۱۳۲۷ھ، تتمہ اوّل، ص ۱۲۱) (امداد الفتاوی، جلد: ۲، ص: ۶۷۳)

چندہ ہندو در مسجد یا صرف مال حرام در تعمیر مسجد

سوال: علمائے دین وشرع متین اس مسئلہ میں کیا فرماتے ہیں کہ مقام پاتھرڈیہ ضلع مان بھوم میں ایک مسجد نئی تیار ہوئی ہے اور اس میں ہندو لوگ چندہ دینا چاہتے ہیں۔ وہ روپیہ ہندو لوگوں کا مسجد میں لگانا درست ہے یا نہیں؟

جواب: اگر یہ احتمال نہ ہو کہ کل کو اہل اسلام پر احسان رکھیں گے اور نہ یہ احتمال ہو کہ اہل اسلام ان کے ممنون ہوکر ان کے مذہبی شعائر میں شرکت یا ان کی خاطر سے اپنے شعائر میں مداہنت کرنے لگیں گے اس شرط سے قبول کرلینا جائز ہے۔ فقط

(۲۰ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ، تتمہ خامسہ، ص: ۱۹۰) (امداد الفتاوی جلد ۳، ص ۶۶۴)

تعمیر کافر مسجد را

س: آیت مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ کے ذیل میں امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں:

قال الواحدی دلت هذه الاية على ان الكفار ممنوعون من عمارة مسجد من مساجد المسلمين ولو اوصى بها لم تقبل وصية اه اور عدم جواز کی یہ وجہ لکھتے ہیں والكافر يهينه ولا يعظمه۔

اور یہ بھی لکھتے ہیں:

وايضاً اقدامه على مرمة المسجد تجرى مجرى الانعام على المسلمين ولا يجوز ان يصير الكافر صاحب المنة على المسلمين اه.

اور تفسیر خازن میں ہے:

واختلفوا فى المراد بالعمارة على قولين احدهما ان المراد بالعمارة العمارة

المعروفة من بناء المسجد وتشييدها ومرمتها عند خرابها فيمنع من الكافر حتی لو اوصی بناء مسجد لم تقبل وصية اه۔

پس جب قول واحدی ہندوؤں کا مال تعمیر مسجد میں صرف کرنا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ مولوی عبدالحیٔ صاحب لکھنوی نے اپنے مجموعۂ فتاویٰ میں اسی کو اختیار کیا ہے اور استاذ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کے مجموعہ فتاویٰ میں جلد: ۲، صفحہ: ۳۰ میں ہے۔ تعمیر ومرمت مسجد میں شیعہ وکافر کا روپیہ لگانا درست ہے اھ و ایضا فیہ جس کافر کے نزدیک مسجد بنانا عبادت کا کام ہے اس کے مسجد بنانے کو حکم مسجد کا ہوگا۔ دریافت طلب یہ امر ہے کہ اگر ہندو بخوشی تعمیر مسجد کیلئے چندہ دیں تو لینا درست ہے یا نہیں اگر درست ہے اور یہی قول صحیح وراجح ہے تو جواب مع ماخذ تحریر فرمائیے؟

جواب یہاں دو مقام ہیں ایک تحقیق حکم کی فی نفسہ اور دوسرے تحقیق حکم کی باعتبار خارج عارض کے۔ سو تقریر اول کی یہ ہے کہ ہدایہ وغیرہ کتب فقہ کی کتاب الوصیۃ میں مصرح ہے کہ کافر کی وصیت ایسے امر کے ساتھ ہو جو اس کے اور ہمارے نزدیک قربت ہے جائز ہے پس اس بناء پر اگر کوئی ہندو اپنے اعتقاد میں اس کو قربت سمجھتا ہے تو اس قاعدہ کلیہ کے اقتضاء سے اُس کا چندہ لینا جائز ہونا چاہئے البتہ اگر اس مسئلہ کی تفسیر یہ ثابت ہوجائے کہ اُس کے مذہب کی رو سے وہ قربت ہو اور یہ بھی ثابت ہوجائے کہ اس طور پر یہ قربت نہیں ہے تب البتہ عدم جواز کا حکم دیا جاوے گا۔ والظاہر ہوالاول۔

اور مفسرین کا استنباط کرنا عدم جواز کو اس آیت سے فقہاء کے مقابلہ میں درست نہیں کیونکہ ''لکل فن رجال'' اور آیت کے یہ معنی بھی نہیں بلکہ سیاق وسباق وسبب نزول میں نظر کرنے سے مطلب آیت کا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رد ہے افتخار مشرکین کا عمارت مسجد حرام اور سقایہ حاج پر اس طور پر کہ مشرکین میں بوجہ فقدان ایمان کے کہ شرط ہے قبول عمل صالح کی اس عمل کی اہلیت شرعیہ نہیں پس یہ عمل اُن کا مقبول نہیں بلکہ کالعدم ہے اور عمل غیر مقبول پر فخر کرنا محض لغو ہے البتہ ایمان والوں سے یہ عمل مقبول ہے پس اس میں جواز اور عدم جواز سے تعرض ہی نہیں اور لِلْمُشْرِكِيْنَ لام جواز کا نہیں بلکہ لام استحقاق وصلاحیت کا ہے۔ وقد بسطانه فی تفسری للقران۔ اور تقریر ثانی کی یہ ہے کہ بوجہ احتمال منت علی المسلمین فی امر الدین کے اس سے بچنا چاہئے۔ جیسا کہ سوال میں بھی نقل کیا ہے اور جو شیعی حد کفر تک نہ پہنچا ہو اس کا حکم کافر سا نہیں۔ فقط

(۲ر ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ) (امداد الفتاوی جلد ۲، ص ۶۶۵)

انتباہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کرلیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف

بابری مسجد کے مسئلہ کا ایک بہت ہی خاص اور اہم پہلو ہے جس طرح یہ مسئلہ ملّتِ اسلامیہ ہند کیلئے ملی اور قومی اعتبار سے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اسی طرح بحیثیت مجموعی پورے ملک کیلئے بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

بابری مسجد کا انہدام ایک قومی جرم اور اجتماعی ظلم ہے، قدرت انفرادی فروگذاشتوں سے اغماض کرتی ہے اور بخش دے سکتی ہے لیکن اجتماعی خطاؤں کو معاف نہیں کرتی ہے۔ دن کی روشنی میں ملک کے کونے کونے سے لاکھوں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ پوری شان وشوکت کا اظہار کرتے ہوئے فخریہ انداز میں مسجد کو توڑتے ہیں الکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس ظلم صریح کو پوری دنیا نے دیکھا ہمارے ملک کے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بوڑھے، جوان، مرد، عورت ہر ایک کے سامنے یہ منظر آیا۔ بہت ممکن ہے کہ کچھ لوگوں نے آنسو بھی بہائے ہوں مگر ایک ارب انسانوں میں دو چار ایسے بھلے لوگ بھی نہیں نکلے جنہوں نے اس ظلم کو روکنے کی کوشش کی ہو۔ پھر دیکھئے مسجد توڑنے والوں کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک اختیار کیا گیا۔ ان کو بحفاظت ان کے گھروں تک پہنچانے کا انتظام ہوا۔ ان میں سے بڑی اکثریت کو ٹکٹ بھی خریدنا نہیں پڑا۔ جب یہ لوگ اپنے گھر پہنچ گئے تو ان کا گرم جوشانہ استقبال کیا گیا اور شاباشی دی گئی۔ اسی کے ساتھ سانحہ کی تحقیق کیلئے ایک کمیشن قائم کیا گیا جو آٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی کسی نتیجہ تک نہیں پہنچا، عدالت میں یہ کیس پچاس سال سے اٹکا ہوا ہے۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ یہ تسلیم کرتے ہوئے ہو رہا ہے کہ ایک جرم ہے جس کا ارتکاب ہوا ہے۔

تحقیق طلب بات صرف یہ ہے کہ جرم کس نے کیا ہے۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ مکان کا ڈھایا جانا جب ثابت ہے تو مکان بنا کر دے دیا جاتا یا کم از کم مالک مکان کو موقع فراہم کیا جاتا کہ وہ خود اپنا مکان بنا لے۔ لیکن انصاف کا یہ ادنیٰ تقاضا بھی پورا نہیں کیا جا رہا ہے۔ ملک کی یہ اخلاقی صورت حال ایسی ہے جو ملک کی تباہی اور بربادی کیلئے آسمانی اور زمینی آفات کو دعوت دینے والی ہے اور شدید اندیشہ ہے کہ پورا ملک اللہ کے عذاب میں گرفتار ہو جائے اور ہندوستانی قوم کا نام بھی ان اقوام میں آجائے جو اجتماعی غلط کاریوں کی پاداش میں برباد کر دی گئیں۔

قرآن کی کئی آیات کی روشنی میں اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ اقوام عالم میں ہندوستانی قوم ذلیل اور رسواء ہو اور خود اپنے ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کرے۔ قرآن نے بہت کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا ہے کہ جو عبادت گاہوں کو ویران کرتے ہیں اور ان کو منہدم کرتے ہیں وہ سب سے بڑے ظالم ہیں ان کیلئے اللہ کے پاس دردناک عذاب ہے اور اس دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔ اسی طرح قرآن کی بعض آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عبادتگاہوں کو منہدم کرنے والے ظالموں کو اللہ تعالیٰ دفع کرنے اور اقتدار کی کرسی سے ہٹانے کیلئے کچھ لوگوں کو اٹھاتا اور تیار کرتا ہے۔ ان کو عزت کے مقام سے ہٹا کر دوسرے لوگوں کو ان کی جگہ بٹھاتا ہے۔ اس بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں عذاب کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ملک کا نظام مسلسل عدم استحکام کا شکار ہو جائے اور اس کے نتیجہ میں فرقہ واریت، طبقہ واریت اور آپسی بے اعتمادی کا دور دورہ ہو جائے اور ملک مکمل نراج اور انتشار کے طوفان میں پھنس جائے۔

ان حالات میں ملک کے بہی خواہوں پر یہ بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ان ظالموں کو قدرت کی جانب سے آنے والے عذاب سے آگاہ کریں۔ اور انہیں اجتماعی توبہ کرنے پر آمادہ کریں اور اگر یہ ظالم اس کیلئے تیار نہ ہوں تو ان کو بزور باز و اس ظلم سے روکیں۔ ملک کی بھلائی اور خیر خواہی چاہنے والوں کا یہ فرض بنتا ہے۔

اے کاش! کوئی گروہ ایسا اٹھتا جو اس فرض کو محسوس کرتا اور اللہ کے بندوں کے ساتھ اپنی سچی بہی خواہی اور خیر خواہی کا حق ادا کرتا ملک کا سب سے بڑا وفادار اور خیر خواہ حقیقت میں وہی گروہ ہوگا جو باشندگان ملک کو اس ظلم سے روکے۔

گجرات کا زلزلہ ایک قسم کے عذاب کا نمونہ تھا تو دوسری قسم کے عذاب کا نمونہ سماجی اور سیاسی افراتفری کے وہ حالات ہیں جو تہلکہ ڈاٹ کام کی وجہ سے ملک میں پیدا ہو گئے ہیں۔ انسانیت کے سچے بہی خواہوں کیلئے ان واقعات اور حالات میں عبرت اور نصیحت کے بے شمار گوشے ہیں۔ جن کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے والے تو نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن دل کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں کہ انسانی بنیادی اقدار کس طرح پامال ہو رہی ہیں۔ اگر یہ

سلسلہ روکا نہیں گیا تو نہیں معلوم قدرت کا کوڑا کس کس انداز میں ہم پر برسے گا اور ہماری تباہی کس انتہاء کو پہنچے گی ۔ یہ معلوم ہے کہ قوم کو ظلم عظیم سے روکنے والوں کا استقبال نہیں کیا جائے گا لیکن کرنے کا یہی کام ہے ۔ تاریخ میں انسانیت کے حقیقی بہی خواہوں کو بمشکل ہی برداشت کیا گیا ہے ۔ اس لئے جو لوگ ہر طرح کی لالچ سے دور اور بے غرض ہوں گے وہی یہ کام کر سکتے ہیں ۔

ملک کی ترقی ، بھلائی اور نجات کا دار و مدار نہ بائیں بازو کی حکومت پر ہے نہ دائیں بازو کی حکومت پر ہے ۔ اسی طرح نہ ہندوتوا کے برسر اقتدار آنے پر ہے اور نہ سیکولر گروپ کے گدی سنبھالنے پر ہے بلکہ سارا دار و مدار صرف اس پر ہے کہ ملک میں انسانی اور اخلاقی اقدار پروان چڑھیں اور امانت ، دیانت اور عدل و انصاف کا بول بالا ہو......ظلم وزیادتی کا خاتمہ ہو......اور خدا کی زمین پر خدا کی مرضی چلے ۔ اللہ کا نام لینے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور عبادت گاہیں محفوظ رہیں ۔

مجسّموں کا مسئلہ

ایک سیر حاصل بحث

(۲۰۰۱ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

مجسّموں کا مسئلہ

افغانستان میں طالبان نے قدیم مجسّموں کو توڑنے کا جس دن سے آغاز کیا اسی دن سے پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ حتیٰ کہ ہندوستان جہاں سے بدھسٹوں کو ملک بدر کیا گیا اوران کی بے شمار عبادت گاہوں کو ختم کیا گیا وہاں کے لوگ بھی چیخ و پکار میں کسی سے کم نہیں تھے۔ بلکہ اس لحاظ سے آگے ہی تھے کہ سیکولر اسٹیٹ ہونے کے باوجود مذہبی حیثیت رکھنے والے مجسموں کو اپنے خرچ پر ہندوستان منتقل کرنے کی انہوں نے پیش کش کی۔ نہیں معلوم کہ سیکولر لوگوں کے لئے یہ پیش کش کیونکر زیب دیتی ہے۔ ہندوستانی لوگوں میں مسلم اور غیر مسلم سیاستدانوں نے اپنی اپنی سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر واویلا مچانے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کی۔ جہاں تک سیاسی میدان میں اچھل کود کرنے والے لوگ ہیں ان کی جانب سے مجسموں کے انہدام کی مذمت کوئی غیر متوقع بات نہیں ہوسکتی تھی لیکن تعجب ہے کہ بعض ایسے لوگ جن کا تعلق یا تو درس وتدریس سے ہے یا دعوت وتبلیغ سے ہے مجسموں کے انہدام کی مذمت مذہبی اصطلاحوں میں کرنے لگے اور شرعی دلائل دینے کے انداز میں مختلف چیزیں پیش کرنے لگے جو اس لئے بڑی اہم ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین میں کوئی بھی چیز متفق علیہ نہیں رہ گئی حتیٰ کہ بتوں سے متعلق اسلامی نظریہ اور عقیدہ بھی کوئی متعین اور معلوم چیز نہ رہا اور نہ اس پر اتفاق ہے۔ حالانکہ قرآن میں بتوں کی گندگی سے بچنے کا صریح حکم موجود ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ (الحج:۳۰) ...... ترجمہ: پس بتوں کی گندگی سے بچو۔

اس پر ایک فاضل مفسر نوٹ لکھتے ہیں یعنی بتوں کی پرستش سے اس طرح بچو جیسے غلاظت سے آدمی گھن کھاتا ہے اور دور ہٹتا ہے گویا کہ وہ نجاست سے بھرے ہوئے ہیں اور قریب آتے ہی آدمی ان سے نجس اور پلید ہوجائے گا۔

بتوں کی گندگی سے بچنے کی اس مثبت بات کے ساتھ منفی بات کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ بت اور بت پرستی کے سلسلہ میں کس قدر احتیاط مطلوب ہے اور یہاں کس طرح بے احتیاطی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ (ھود: ۱۱۳)

ترجمہ: یعنی ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آجاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

پھر دوسری بات جو سامنے آتی ہے کہ شرعی دلیل اور بنیاد بھی کوئی اپنی حقیقت نہیں رکھتی۔

بت پرستی، بت فروشی اور بت گری کا حرام ہونا کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر دلیل لانے کی ضرورت ہو۔ حتی کہ پرستش کے لئے نہیں کسی دوسرے مقصد کے لئے پتھر یا مٹی کا مجسمہ بنانا اور اس کو قابل تعظیم سمجھنا یہ سب چیزیں ایک مسلمان کے نزدیک عقیدۂ توحید کے منافی سمجھی جاتی رہی ہیں۔ لیکن مجسمے کے مسئلہ پر جو مذمتی بیانات آئے ہیں ان سے یہ سارے تصورات مشتبہ ہوگئے ہیں۔ شرعی دلائل میں قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کا ہونا ایک معلوم اور مسلم حقیقت ہے۔ لیکن مجسموں کو منہدم کرنے کی مذمت کرنے والے لوگوں میں سے کسی نے بھی نہ تو کوئی قرآن کی آیت پیش کی نہ کوئی حدیث پیش کی نہ اجماع اور قیاس صحیح سے کوئی استدلال کیا۔ بس مصلحتوں اور کچھ یہاں وہاں کے واقعات کے ذکر سے آگے بات نہیں بڑھی۔ اس مسئلہ پر سادہ طریقہ سے بھی سوچا جائے کہ مجسموں کا منہدم کرنا آخر کیوں قابل مذمت اور غیر اسلامی فعل ہے؟ اگر مجسمے بنانا اور ان کا رکھنا فرض ہوتا یا واجب ہوتا یا سنت موکدہ ہوتا تو یقیناً ان کو منہدم کرنا اور ان کی بے حرمتی کرنا غیر اسلامی اور قابل مذمت ہوتا۔ علاوہ ازیں اگر مجسموں کو بنانا اور ان کو رکھنا ایک مسلمان کے لئے جائز بھی ہوتا تو بھی اس کے توڑنے کو غیر اسلامی اور قابل مذمت نہیں کہا جاسکتا تھا۔ شریعت میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے یعنی منہی عنہ فعل کرنا قابل مذمت ہے اور غیر اسلامی ہے لیکن جو چیز صرف جائز ہو اس کے کرنے اور نہ کرنے دونوں کا اختیار ہوگا نہ اس کے کرنے پر مذمت کی جاسکتی ہے اور نہ نہ کرنے پر۔ بالفرض کچھ لوگ مجسموں کو بنانا اور رکھنا جائز بھی سمجھتے ہوں تو ان کو بھی یہ حق نہیں ہے کہ کسی توڑنے والے کی مذمت کریں۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹا ہے حقیقت یہ ہے کہ مجسمہ بنانا اور رکھنا شرعی لحاظ سے غیر اسلامی اور قابل مذمت ہے۔ مجسمے بنانے کی اجازت نہ قرآن سے ثابت کی جاسکتی ہے اور نہ حدیث سے اور نہ انبیائی تاریخ سے۔ بالخصوص نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے۔ اس کے برخلاف بت شکنی اور مجسموں کا انہدام انبیاء علیہم السلام کی زندگی سے وہ شخص بھی ثابت کرسکتا ہے جو صرف دور سے انبیاء علیہم السلام

کے واقعات کبھی کبھار سنتا رہا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑا بلکہ ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ کون مسلمان ہے جس نے یہ واقعہ نہ سنا ہو اس کا ذکر قرآن کی سورہ انبیاء (آیت ۵۸) میں صاف طریقہ سے موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ کی قسم میں تمہارے بتوں کے ساتھ چال چلوں گا تمہارے ہٹ جانے کے بعد۔ پس حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا سب کو، بڑے بت کے سوا تا کہ وہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ○ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ. (الانبیاء:۵۷،۵۸)

''اس کی طرف رجوع کریں''۔ایک مفہوم یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم کا منشا اس کارروائی سے یہ تھا کہ اپنے بتوں کا یہ حال دیکھ کر شاید ان کا ذہن میری طرف منتقل ہوگا اور یہ مجھ سے پوچھیں گے تو مجھ کو پھر ان سے صاف صاف گفتگو کرنے کا موقع مل جائے گا۔

قرآن کی ایک اور سورت سورۃ الممتحنہ کے شروع میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں اور بتوں کے پوجنے والوں سے بیزاری کا اعلان کیا اور ان سے دشمنی کا برملا اظہار کیا۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ. (الممتحنہ:۴)

ترجمہ: تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف صاف کہہ دیا۔ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں ہم نے تم سے کفر کیا۔ اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

تعجب ہے کہ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کردار بت پرستی، بت گری اور بت دوستی کے تعلق سے اتنے واضح طریقہ سے پیش کیا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے اور یہ بھی حکم دیا گیا کہ ملت ابراہیمی کی پیروی کرو ان سب باتوں کے باوجود نہیں معلوم وہ کونسا دباؤ اور وہ کونسی مجبوری ہے کہ بت شکنی اور بت بیزاری کی مذمت کی جارہی ہے اور اسے غیر اسلامی عمل بتایا جارہا ہے۔ اور بت گری کی حمایت کی جارہی ہے اور بت دوستی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اور وہ بھی ماہ ذی الحجہ میں جب کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت سمجھ کر قربانی کی جاتی ہے اور مناسک حج ادا کئے جاتے ہیں اور اس گھر کا طواف کیا جاتا ہے جس گھر کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بتوں کی نجاست سے اس کو پاک رکھیں۔

ایک اور پہلو سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں تک بت شکنی کا موقع ومحل اور مناسب یا نامناسب حالات کا تعلق ہے تو مجسموں کے انہدام کی مذمت کرنے والے بتائیں کہ کس لحاظ سے حضرت ابراہیمؑ کی بت شکنی برمحل تھی اور افغانیوں کی بت شکنی بے محل؟ کس لحاظ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بت شکنی کے لئے حالات مناسب اور سازگار تھے اور کس اعتبار سے افغانیوں کا اقدام غیر مناسب اور ناسازگار حالات میں ہوا؟ کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل حکمت کے عین مطابق تھا اور افغانستان میں مجسموں کا انہدام حکمت کے خلاف تھا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنے والے نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف یہی نہیں کہ خانۂ کعبہ کو سینکڑوں بتوں سے پاک کیا بلکہ پورے عرب سے بتوں کو نکال باہر کیا۔ آپ کا یہ عمل ایسا نہیں ہے کہ جس کی مثال تاریخی کتابوں کی طویل ورق گردانی سے معلوم ہوتی ہو۔ لیکن تعجب اور افسوس ہے کہ ملک کے ایک معروف فقیہ صاحب فرماتے ہیں۔

> یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ نے فتح مکہ کے موقع سے بیت اللہ شریف کے بتوں کو منہدم فرمایا اور مکہ میں جہاں کہیں جو بت تھے انہیں صاف کرنے کا حکم دیا لیکن یہ ایک استثنائی واقعہ ہے۔ (روزنامہ ''منصف'')

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کے نزدیک اصل اور عام حکم تو بتوں کو بحفاظت اور باحترام رکھنا ہے اور جو مکہ میں بت شکنی ہوئی وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک استثنائی فعل تھا اس موقع پر موصوف نے صرف مکہ اور کعبہ کی خصوصیت بتائی ہے۔ لیکن یہ بات اس وقت صحیح ہوتی جب کہ عرب کے پچیس پچاس مقامات پر بتوں کو پورے احترام کے ساتھ بحفاظت رکھا گیا ہوتا۔ موصوف کی اس طرح کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا طرۂ امتیاز بت شکنی، بت بیزاری اور بت دشمنی نہیں ہے بلکہ بت گری، بت پرستی اور بت دوستی اسلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ موصوف نے اور فرمایا۔

> ''دوسرا اصول مذہبی رواداری اور دوسروں کے مذہبی جذبات کی رعایت کا ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ تشریف لے گئے تو آپ اس بات پر قادر تھے کہ یہودیوں کی مذہبی عبادت گاہوں کو منہدم کرا دیتے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا نہیں کیا۔''

موصوف سے اگر یہ پوچھا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودیوں کی عبادت گاہوں کو نہیں تڑوایا تو وہ عبادت گاہیں آج کیوں موجود نہیں ہیں۔ جس رواداری کے تحت آپ نے ایسا نہیں کیا وہ رواداری کب ختم ہوئی؟

وہ عبادت گاہیں کب توڑی گئیں؟ اور کیونکر توڑی گئیں؟ کیا ایسا ہے کہ جس رواداری کو اللہ کے رسول ﷺ نے قائم کیا تھا نعوذ باللہ آپ کے متبعین نے اس کو ختم کر دیا؟؟ حضور ﷺ کا یہ فرمان موصوف کیوں بھول گئے کہ یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ حضور ﷺ نے اپنی زندگی ہی میں یہودیوں کو ان کے قلعوں اور عبادت گاہوں سے بے دخل فرما دیا تھا۔ کیا یہ چیز سیرت کے کسی ادنیٰ مطالعہ کرنے والے سے مخفی ہے چہ جائیکہ کوئی عالم اور فقیہ سے۔ لیکن روادار ذہن کی یہی کمزوری ہے جس کی طرف شاعر نے اشارہ کیا۔

جو قوم کہ ہے غیرت و کردار سے خالی
وہ معرکۂ وقت میں بنتی ہے روادار
آجائے اگر ہاتھ میں شمشیر بھی اس کے
بن جائے گی اغیار کی عظمت کی وفادار

ایسی بودی دلیلوں کا کیوں سہارا لیا گیا ہے اس کی ہم کوئی توجیہ نہیں کر سکتے۔ صحیح بات یہ ہے کہ بے اصل چیزوں کو جب کوئی صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے گا وہ اسی طرح کے کمزور سہاروں کے بل بوتے پر آگے بڑھے گا۔ موصوف نے خود یہ کہا ہے کہ افغانستان میں صد فی صد مسلم آبادی ہے اس لئے مجسموں کا وہاں ہونا چنداں مضر نہیں تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر چنداں مضر نہیں تھا تو کیا چنداں مفید تھا؟ کیا یہ بات معلوم نہیں ہے کہ جس مقام پر تصویر اور بت ہوں گے وہاں رحمت کے فرشتے نہیں آئیں گے۔ پھر موصوف سے ہم پوچھنا چاہیں گے کہ اگر کوئی غیر مسلم فیملی ہے اس کے گھر میں بت رکھے ہوئے ہیں اور ان کی پوجا ہو رہی ہے اگر وہ فیملی مسلمان ہو جائے تو ان بتوں کے بارے میں اس کا عمل کیا ہوگا؟ کیا بتوں کو پرانی یادگار سمجھ کر گھر میں محفوظ رکھنا مناسب اور جائز ہوگا یا ان کو توڑ پھوڑ کر ضائع کرنا؟؟ ایسی فیملی کو آپ کیا مشورہ دیں گے؟ جب افغانستان میں ان بتوں کو پوجنے والے موجود نہیں ہیں تو افغانی لوگ اپنے ملک میں آخر کیوں انہیں رکھتے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ کیوں ان مجسموں کو رکھنا فرض اور واجب تھا جس کے ترک پر آپ ان کی مذمت فرما رہے ہیں۔ موصوف نے حضرت عمرؓ وغیرہ کے دور میں مصر وغیرہ مفتوحہ علاقوں میں غیر مسلموں کی عبادتگاہوں کو باقی رکھا گیا اس کا تذکرہ فرمایا ہے لیکن ان کا تذکرہ بالکل بے محل ہے۔

اس لئے کہ اسلام کی جہاں عام تعلیم بت گری، بت پرستی اور بت دوستی سے اجتناب کی ہے وہیں یہ تعلیم بھی ہے کہ مسلمانوں کے زیر اقتدار جو ذمی غیر مسلم ہوں ان کی عبادتگاہوں کو بعض شرائط کے ساتھ ان کے تصرف میں

رہنے دیا جائے اوران کوختم نہ کیا جائے۔ اگر افغانستان میں ذمی کی حیثیت سے بدھسٹ ہوتے تو یقیناً حضرت عمرؓ کے واقعات پر قیاس کر کے کہا جا سکتا تھا کہ جس طرح حضرت عمرؓ اور دوسرے خلفاء نے ذمیوں کو ان کے معبودوں کے ساتھ باقی رکھا اسی طرح افغانی لوگوں کو بھی بدھسٹوں کو ان کے بتوں کے ساتھ باقی رکھنا چاہئے تھا لیکن افغانستان میں اس طرح کا کوئی واقعہ ہے ہی نہیں۔ اس لئے یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے۔

موصوف نے فرمایا:

''اور یہ ہرگز بہتر بات نہ ہوگی کوئی مسلمان ناشائستہ ردعمل کا سبب بنے۔ قرآن نے اسی لئے معبودانِ باطلہ کو برا بھلا کہنے سے منع کیا کہ اگر مسلمان ایسا کریں گے تو وہ بھی جواب میں شان باری تعالیٰ میں گستاخی کے مرتکب ہوں گے اور بالواسطہ طریقہ پر ہم اس کا سبب بنیں گے۔''

اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ معبودان باطلہ کو برا بھلا کہنے سے سورۃ الانعام آیت ۱۰۸ میں منع کیا گیا اس کے لئے ''لَا تَسُبُّوا'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی میں گالی گلوج اور فحش کلامی کا مفہوم ہے۔ یعنی جس چیز سے منع کیا گیا ہے سب وشتم اور فحش کلامی ہے۔ ورنہ بتائیے وہ برا بھلا کہنا کیا تھا جس سے باز رہنے کا مشرکین مکہ مطالبہ کررہے تھے اور اللہ کے رسول ﷺ تھے کہ ان کے مطالبہ کو ماننے سے سختی کے ساتھ انکار کردیا اور حضرت ابوطالب سے فرمایا:

''چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں کہ میں اس کام کو اس حد تک پہنچائے بغیر چھوڑ دوں کہ یا تو اللہ اسے غالب کردے یا میں اسی راہ میں فنا ہوجاؤں تو نہیں چھوڑ سکتا۔''

اس کے بعد آپ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں اور آپ ﷺ رو پڑے۔

بہرصورت یہ اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ کون سی رواداری ہے جس کا حکم قرآن دے رہا ہے اور وہ کون سی رواداری ہے جس کے لئے اللہ کے رسول ﷺ تیار نہیں تھے۔ اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے سورہ ھود آیت ۱۱۳ کو بھی سامنے رکھیئے:

''نہ جھکو ان کی طرف جنہوں نے ظلم کیا کہ تم کو آگ چھولے گی اور اللہ کے سواء کوئی مددگار نہ ہوگا۔ پھر کہیں سے مدد نہ پاؤ گے۔''

جہاں تک ناشائستہ ردعمل کا سبب نہ بننے کا مسئلہ ہے وہ بھی اتنا سادہ نہیں ہے جتنا کہ عام طور سے سمجھا جارہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے آیت ۱۰۸ سورۃ الانعام کی تفسیر کا تھوڑا حصہ دیکھنا ضروری ہے۔

مفتی شفیعؒ صاحب لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا ایک طاعت اور کار ثواب تھا، مگر اس پر لوگوں کی ناواقفیت کے سبب ایک خطرہ کا ترتب دیکھ کر آپ ﷺ نے اس ارادہ کو ترک فرما دیا۔ اس واقعہ سے بھی یہی اصول مستفاد ہوا کہ اگر کسی جائز بلکہ ثواب کے کام پر کوئی مفسدہ لازم آتا ہو تو وہ جائز کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے۔

لیکن اس پر ایک قوی اشکال ہے جس کو روح المعانی میں ابومنصور سے نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد وقتال لازم فرمایا ہے۔ حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمانوں کو قتل کردیں گے اور مسلمانوں کا قتل حرام ہے۔ تو اس اصول پر جہاد بھی ممنوع ہوجانا چاہئے۔ ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوت قرآن پر نیز اذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں۔ تو کیا ہم ان کے اس غلط رویہ کی بناء پر اپنی عبادات سے دستبردار ہوجائیں گے؟!

اس کا جواب خود ابومنصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظرانداز کردینے سے پیدا ہوگیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ جائز کام جس کو لزوم مفسدہ کی وجہ سے منع کردیا گیا ہے اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو۔ جیسے معبودان باطلہ کو برا بھلا کہنا۔ اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں۔ اسی طرح بیت اللہ کی تعمیر کو بناء ابراہیمی کے مطابق بنانا اس پر بھی کوئی اسلامی مقصد موقوف نہیں۔ اس لئے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کردیا گیا اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں یا کوئی مقصد اسلامی اس پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا بلکہ اس کی کوشش کی جائے گی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں اور پیش آنے والے مفاسد جہاں تک ممکن ہو بند ہوجائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت حسن بصریؒ اور امام محمد بن سیرینؒ دونوں حضرات ایک جنازہ کی نماز میں شرکت کے لئے چلے، وہاں دیکھا کہ مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی اجتماع ہے اس کو دیکھ کر ابن سیرین واپس ہوگئے۔ مگر حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ لوگوں کی غلط روش کی وجہ سے ہم اپنے ضروری کام کیسے چھوڑ دیں؟ نماز جنازہ فرض ہے اس کو اس مفسدہ کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا ہاں اس کی کوشش تابمقدور کی جائے گی کہ یہ مفسدہ مٹ جائے۔

یہ واقعہ روح المعانی میں نقل کیا گیا ہے۔

اس لئے خلاصہ اس اصول کا جو آیت مذکورہ سے نکلا ہے یہ ہوگیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو مگر مقصد شرعیہ میں سے نہ ہو اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کردینا واجب ہوجاتا ہے۔ بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے۔

اس اصول سے فقہاء امت نے ہزاروں مسائل کے احکام نکالے ہیں۔ فقہاء نے فرمایا ہے کہ کسی شخص کا بیٹا

نافرمان ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لئے کہوں گا تو انکار کرے گا اور اس کے خلاف کرے گا جس سے اس کا سخت گناہگار ہونا لازم آئے گا۔ تو ایسی صورت میں باپ کو چاہئے کہ اس کو حکم کے انداز میں کسی کام کے کرنے یا چھوڑنے کو نہ کہے بلکہ نصیحت کے انداز میں اس طرح کہے کہ فلاں کام کرلیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ تاکہ انکار یا خلاف کرنے کی صورت میں ایک جدید نافرمانی کا گناہ اس پر عائد نہ ہو جائے۔'' (خلاصۃ الفتاویٰ)

''اسی طرح کسی کو وعظ و نصیحت کرنے میں بھی اگر قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ وہ نصیحت قبول کرنے کے بجائے کوئی ایسا غلط انداز اختیار کرے گا جس کے نتیجہ میں وہ اور زیادہ گناہ میں مبتلا ہو جائے گا تو ایسی صورت میں نصیحت ترک کر دینا بہتر ہے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری میں اس موضوع پر ایک مستقل باب رکھا ہے۔

باب من ترک بعض الاختیار مخافۃ ان یقصر فھم بعض الناس فیقعوا فی اشد منه۔

یعنی بعض اوقات جائز بلکہ مستحسن چیزوں کو اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ اس سے کم فہم عوام کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہ ہو۔

مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض و واجبات ہوں یا سنن موکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی۔ اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ابتداء اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز و تلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا بلکہ خود آیت مذکورہ کے شان نزول میں جو واقعہ ابوجہل وغیرہ روساءِ قریش کا ذکر کیا گیا ہے اس کا حاصل یہی تھا کہ قریشی سردار اس پر صلح کرنا چاہتے تھے کہ آپ ﷺ توحید کی تبلیغ کرنا چھوڑ دیں۔ جس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ کام کسی حال میں نہیں کر سکتا اگرچہ وہ آفتاب و ماہتاب لاکر میرے ہاتھ پر رکھ دیں۔'' (معارف القرآن)

ایک اور دینی بزرگ نے افغانیوں سے اپیل کی کہ ہندوستان کی پیش کش کو وہ قبول کر لیں اور مجسموں کو ہندوستان منتقل کر دیں۔ یہ اپیل اس اظہار کے ساتھ کی گئی ہے کہ بت اور مجسمے دونوں حرام ہیں۔ سوال یہ ہے کہ افغانی لوگ مجسّموں کو ہندوستان کے حوالے کیوں کر دیں اور کس طرح؟؟ کیا وہ مجسّمے ہندوستان کے ہیں اور کیا قیمت لے کر کے مجسّموں کو ہندوستان کے حوالے کریں یا تحفتاً۔ ان سوالوں پر موصوف نے غالباً غور نہیں فرمایا ورنہ ایسی بات کسی قیمت پر نہیں کہتے۔ مجسموں کو قیمت لیکر حوالے کرنا بلاشبہ بت فروشی ہوتی جو کسی طرح جائز نہیں۔

بخاری شریف کی حدیث ہے آپ ﷺ نے فرمایا: بلاشبہ اللہ اور اس کے رسول نے شراب، مردار، سور

اور بتوں کی خرید وفروخت کو حرام قرار دیا ہے۔

اور اگر تحفتاً دیا جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا کسی حرام شئ کو تحفہ میں دینا جائز ہے؟ شراب حرام ہے اس کو بیچنا جس طرح حرام ہے اسی طرح اس کو تحفہ میں دینا بھی حرام ہے۔کوئی مسلمان یہ کام نہ خود کر سکتا ہے نہ کسی کو اس کا مشورہ دے سکتا ہے اور نہ کسی سے اس کی اپیل کر سکتا ہے۔خود کرنا، کسی کو مشورہ دینا اور کسی سے اپیل کرنا سب کا سب حرام ہوگا اور فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ.(الحج:۳۰) کے صریح حکم کے خلاف ہوگا۔

دلّی کے ایک قاسمی مولانا نے افغانستان میں بت شکنی کو بے عقلی، ناعاقبت اندیشی اور بیوقوفی قرار دیا اور دلیل میں اس کے سواء کچھ نہیں کہ طالبان خود مصائب میں گھرے ہوئے ہیں اور ادھر ہندوستان میں فرقہ پرست ان کے عمل کو اسلام کے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ یہ طرز فکر دراصل اسلامی معیار اور کسوٹی کو سامنے رکھ کر نہ سوچنے کا نتیجہ ہے۔قرآن میں اُولُو الْاَلْبَابِ اور عاقل کن لوگوں کو کہا گیا ہے اور بیوقوف کن لوگوں کو؟ مثال کے طور پر بت شکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا گیا:

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ. (البقرۃ:۱۳۰)

ترجمہ: یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ سے پھرنے والے ہی بیوقوف ہیں ہم نے انہیں دنیا میں چن لیا اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہیں۔

آیت صاف بتا رہی ہے کہ بت شکنی کا عمل کرنے والے بیوقوف نہیں ہیں بلکہ بیوقوف وہ لوگ ہیں جو طریق ابراہیمی یعنی بت شکنی سے دور رہنا چاہتے ہیں۔اسی طرح موصوف نے احترام مذہب اور احترام آدمیت کا درس دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ

> ''ہمارا طرز معاشرت یہ ہونا چاہئے کہ ہم پرستش تو صرف خدائے وحدہ لاشریک کی کریں لیکن احترام پوری انسانیت کا کریں جس کی تعلیم اللہ کے رسولؐ کی زبانی قرآن نے ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ'' کی شکل میں دے دی ہے۔اس کی رو سے جس طرح ہم پر توحید پر قائم رہنا فرض ہے اسی طرح احترام مذہب وآدمیت بھی واجب ہے۔''

''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ'' سے احترام مذہب پر استدلال کرنا بالکل ہی غلط استدلال ہے۔قرآن کے ان الفاظ کے ذریعہ شرک وکفر سے بالکلیہ بیزاری کا اعلان کیا گیا ہے اور مشرکین کو ایک طرح کی دھمکی دی گئی ہے کہ جو دین قیم اللہ نے ہم کو مرحمت فرمایا ہے اس پر ہم نہایت خوش ہیں۔اور تم نے اپنے لئے بدبختی سے جو روش پسند

کی ہے وہ تمہیں مبارک رہے۔ ہر ایک فریق کو اس کی راہ وروش کا نتیجہ مل کر رہے گا۔ ان الفاظ سے کہیں سے بھی مصالحت اور بقائے باہم اور رواداری کا تصور نہیں نکلتا۔

مزید وضاحت کے لئے سورۂ کافرون کا تاریخی پس منظر دیکھئے۔

مکہ معظّمہ میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب نبی ﷺ کی دعوتِ اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپ ﷺ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔

اس سلسلے میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں (کسی میں قریش کی یہ پیش کش مذکور ہے کہ) ہم آپ کو اتنا مال دیئے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں۔ آپ جس عورت کو پسند کریں اسی سے آپ کی شادی کئے دیتے ہیں۔ ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہیں آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں (کسی میں یہ تجویز موجود ہے کہ) ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی۔

موضوع اور مضمون

اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی برأت اور بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہ بات اگرچہ ابتداً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن یہ انہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ دین کفر جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے قول وعمل میں برأت کا اظہار کرنا چاہئے۔

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں اس سورہ کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ ذیل کی چند احادیث سے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ میں بارہا حضور ﷺ کو نماز فجر سے پہلے اور مغرب کی نماز کے

بعد کی دو رکعتوں میں "قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" اور "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ" پڑھتے دیکھا ہے۔

حضرت خبابؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جب تم سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹو تو "قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ" پڑھ لیا کرو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خود بھی یہ طریقہ تھا کہ جب آپ سونے کے لئے لیٹتے تو یہ سورہ پڑھ لیا کرتے تھے۔ (بزار، طبرانی، ابن مردویہ تلخیص)

بعض سادہ لوحوں نے یہ دلیل دی ہے کہ مجسمے تہذیبی اور انسانی ورثہ ہیں ان کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔ لیکن نہیں معلوم کس آیت قرآنی یا کس حدیث رسولؐ اور کس فقہی کلیہ سے انھوں نے یہ حکم اخذ فرمایا؟! انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مظاہر شرک ہر دور میں تہذیبی ورثہ سمجھے گئے ہیں اور بت پرست اور مشرک قومیں اسی بنیاد پر بت پرستی کو جائز اور حق بجانب قرار دیتی رہی ہیں۔ غرض یہ کہ ان چند دلائل کا ذکر ہے جو ہندوستان میں شرعی اصطلاحوں میں گفتگو کرنے والے مجسموں کے انہدام کی مذمت میں پیش کرتے ہیں۔ اب جب کہ مجسمے توڑ پھوڑ دیئے گئے۔ چنداں ضرورت نہیں تھی ان باتوں کی۔ لیکن اس اعتبار سے ضرورت تھی کہ صحیح دلائل کے ساتھ صحیح منزل تک پہنچنے کی عادت ہمارے اندر ہونی چاہئے۔ حالات کا دباؤ اس قدر قبول کرنا صحیح نہیں ہے کہ بات بھی غلط کہی جائے اور دلیل بھی غلط دی جائے اور پھر اس کو شرعی بات کے طور پر پیش کیا جائے۔

آج باوجود بہت سی مشکلات اور دشواریوں کے ایسے حالات تو ہرگز نہیں ہیں کہ بت پرستی، بت گری اور بت دوستی کے حق میں زبان کھولی جائے اور وہ بھی بلاضرورت۔ بہتر تھا کہ تھوڑا بہت نقصان برداشت کرلیا جاتا اور یہ طرز گفتگو اختیار نہ کی جاتی۔

اس موقع پر ایک دینی اور دعوتی اخبار نے اس انداز سے مذمت کی کہ:

> ''دین اسلام صرف افغانستان کا دین نہیں ہے اور نہ قرآن صرف افغانستان کے لئے ہے اور نہ شریعت محض افغانستان میں نافذ ہونے کے لئے آئی ہے اس لئے افغانستان کے لوگوں کو اس بات کا لحاظ کرنا چاہئے تھا کہ بیرونی دنیا میں دعوتِ اسلامی کے کام پر کیا اثر پڑنے والا ہے؟ ابھی دنیا کے انسانوں کی اکثریت تک اسلام کی دعوت پہنچانا دنیا کے موجودہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے جن میں افغانستان کے طالبان بھی شامل ہیں۔ لہٰذا افغان کے لوگوں کو اس عمل سے باز رہنا چاہئے تھا اور دعوتِ اسلامی کے وسیع تر مفاد اور اسلامی حکمت اور مومنانہ فہم وفراست اور دوراندیشی کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا۔''

لیکن یہ انداز اور استدلال کتنا صحیح ہے؟ اس سوال پر غور کیجئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بتوں کو توڑا تو کیا دنیا کی اکثریت تک دعوت اسلامی پہنچ چکی تھی؟ اور کیا مدینہ میں مشرکین اور ان کے معبودوں کے خلاف کبھی کسی اقدام سے صرف اس لئے باز رہا گیا کہ اس کا مکہ میں پھنسے ہوئے مسلمانوں پر

خراب اثر پڑے گا؟ اس طرح کی باتوں سے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی اسلام پسند گروہ بذات خود کوئی صحیح اقدام بھی نہیں کر سکتا اس لئے کہ اسلام پوری دنیا کا مذہب ہے۔ گویا پوری دنیا کے مسلمانوں سے پوچھ کر کوئی اقدام کرنا چاہئے۔ اس منطق کا تقاضا تو یہ ہے کہ کہیں کے بھی مسلمان ہوں خواہ افغانستان اور پاکستان کے ہوں یا ہندوستان کے، بذات خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اسی منطق کی بنیاد پر مسلمانوں کا ترقی یافتہ طبقہ کہتا ہے کہ اسلامی سیاست کا نام نہ لو۔ نظام اسلامی کے قیام اور اقامت دین کا ذکر نہ چھیڑو۔ اس لئے کہ اس سے دوسری قومیں اندیشہ محسوس کرتی ہیں اور اسلام کو توسیع پسند اور شدت پسند مذہب کہہ کر بدنام کرتی ہیں لہٰذا دعوتی مفاد اور خود مسلم ملت کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اسلامی نظام کی بات نہ کریں۔

مختصر بات گویا یہ ہوئی کہ دین کی جن جن باتوں سے بیرونی دنیا کو الرجی ہو رہی ہو ان باتوں کو دعوتی حکمت کے تحت چھوڑ دیا جائے۔ لیکن مجبوری ہے کہ دعوت کی پوری تاریخ میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ دعوتی حکمت کے نام پر بنیادی عقیدوں کے تقاضوں کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ طالبان کے عمل کا ایک اور مثبت پہلو یہ بھی ہے جو نظروں سے اوجھل ہے طالبان نے اپنے عمل سے ایک بڑا کام یہ کیا ہے کہ بت پرستی پوری دنیا میں موضوع گفتگو بن گئی ہے اور اسلام کا نقطۂ نظر صاف طریقہ سے منظر عام پر آ گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ طالبان نے اپنے اس عمل سے دنیا کی ساری سوپر طاقتوں کی پرواہ نہ کر کے ان کی بالادستی کو چیلنج کر دیا ہے۔ جو دنیا میں دعوتی اور اسلامی تحریکات کے لئے ایک مشعل راہ ہے۔ اس سے جہاں عالم اسلام کو یہ حوصلہ ملتا ہے کہ دنیا کی بڑی طاقتوں کے مقابلے میں کھڑا ہونا ممکن ہے وہیں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو یہ سمجھ میں آ گیا کہ ہم اسلامی رو کو روک نہیں سکتے۔ یہ صورت حال سیاسی طور سے اسلام اور دعوت اسلام کے حق میں بہت بڑی کامیابی ہے۔

طالبان کے اس عمل سے اسلام مخالف قوتوں پر اندر ہی اندر لرزہ طاری ہے۔ یہ وہ تاریخی موڑ ہے جس کی اہمیت کو ہمیں سمجھنا چاہئے اور اس سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اگر دنیا بھر کے مسلمانوں نے ہر طرح کے خوف و ہراس سے بالاتر ہو کر طالبان کے اقدام کی کھلم کھلا تائید اور حمایت کی ہوتی تو اسلام کے حق میں مزید فضا ہموار ہوتی۔ اور باطل اور اہل باطل اسلام اور مسلمانوں کے تئیں نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور ہوتے۔ لیکن باوجود اس کے کہ ہر ملک میں کچھ لوگوں نے طالبان کے اقدام کی مذمت کی ہے پھر بھی دنیا یہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ طالبان کا اقدام ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک قابل ستائش اسلامی عمل ہے۔

بین الاقوامی قوانین کے تناظر میں

محترم عدنان فہد صاحب لکھتے ہیں:

طالبان کی افغانستان میں موجود بتوں اور مجسموں کو توڑنے کی کارروائی نے پوری دنیا میں کہرام مچا دیا ہے۔ اس پر طالبان سے ''اپنے'' بھی ناراض ہیں اور بیگانے بھی ناخوش۔ بیگانوں کی خفگی تو قابل فہم ہے لیکن ''اپنوں'' کی پریشانی اور اظہار ناراضی کی توجیہ مشکل ہے لیکن یہ بھی ایک غور طلب پہلو ہے کہ اپنوں کی کیفیت بھی یکساں نہیں ہے۔ اپنوں کے ''بڑے'' تو اس پر بے چین و بے قرار ہیں اور ان کی پوری کوشش اس وقت یہ ہو رہی ہے کہ کسی طرح طالبان کے اس عمل کو خلاف شریعت قرار دے دیا جائے وہ اس پر اپنی ساری توانائیاں صرف کر رہے ہیں اور قلم وقرطاس کی قوت اور ذہنی وجسمانی صلاحیت استعمال کر کے اس کو اپنے تئیں خلاف اسلام ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں لیکن ان ''بڑوں'' کے یقین وخیال کے مطابق ''جاہل'' اور دین سے ''بے بہرہ'' مسلمان عوام یعنی ملت اسلامیہ کا سواد اعظم طالبان کی اس کارروائی کو عین حق سمجھ رہا ہے۔ طالبان کی اس کارروائی پر مختلف پہلوؤں سے غور وفکر ہو سکتا ہے اور اس پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے۔

یہ غور وفکر اور اظہار خیال دو کیفیتوں سے خالی نہیں ہو سکتا۔ اس کی ایک کیفیت وہ ہو سکتی ہے جس کو دفاعی اقدام کہا جا سکتا ہے اور دوسری کیفیت کو اقدامی عمل کہا جا سکتا ہے۔ دفاعی اقدام اپنی تمام تر اہمیت وافادیت کے باوجود ایک کمزوری ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کارروائی کے خلاف شور وغوغا کرنے والوں کو آئینہ دکھایا جائے اور ان کا کریہہ چہرہ دنیا کے سامنے لایا جائے۔ درج ذیل تحریر اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے اس میں صرف ایک پہلو سے بحث کی گئی ہے اس کے اور بھی دوسرے اطراف ہو سکتے ہیں اور جن کو حسب ضرورت وموقع اجاگر کیا جا سکتا ہے۔

افغانستان میں وہاں کی حکومت کا پورے ملک میں پائے جانے والے بتوں اور مجسموں کے توڑنے کا فیصلہ موجودہ عہد (Modern age) میں ساری دنیا میں رائج دستور اور قدروں کے عین مطابق ہے اور طالبان کا

یہ عمل ہرصورت سے درست اور تسلیم شدہ (Recognised) ہے یہ وہ عمل ہے جس پر آج کی دنیا میں پائی جانے والی حکومتیں اور عالمی ادارے عمل پیرا ہیں۔ بناء بریں طالبان کے اس اقدام میں کوئی بھی بات غیر معمولی یا خلاف معمول نہیں۔

طالبان نے جن بتوں اور مجسموں کو اپنے سپریم کورٹ کے فیصلے کے تحت توڑنے کا اعلان کیا ہے اس طرح کے بتوں اور مجسموں کا توڑا جانا موجودہ عہد میں پوری دنیا میں ایک تسلیم شدہ امر ہے۔ آئے دن مختلف حکومتیں ایسا کرتی رہتی ہیں۔ اگر ان بتوں اور مجسموں کو تاریخی ورثہ یا یادگار بھی قرار دیا جائے تب بھی ان کا توڑا جانا خلاف معمول نہیں بلکہ یہ ایک مسلمہ اصول ہے۔ واضح رہے کہ تاریخی یادگار (Historical Monuments) یا عالمی تاریخی ورثاء (World Human Heritage) سے مراد وہ تاریخی یادگاریں ہیں جو انسانی سماج کے ماضی اور اس کی تاریخ سے وابستہ ہیں قطع نظر اس سے کہ ان سے کسی قوم کی اچھی یا بری یادیں وابستہ ہوں یا وہ کسی کے لئے پسندیدہ اور دوسروں کے لئے ناپسندیدہ ہوں۔ بہرصورت وہ تاریخی یادگاریں یا عالمی تاریخی ورثہ کہلا سکتی ہیں ایسی تاریخی یادگاروں کا توڑا جانا ایک معمول رہا ہے اور جس کو دنیا نے تسلیم بھی کیا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۹ء میں سوویت یونین کے زوال کے بعد ماسکو کے ریڈ اسکوائر اور لینن گراڈ کے مرکزی مقام پر اور اسی طرح پورے (سابق) سوویت یونین میں مختلف مقامات پر لینن کے عظیم الشان اور دیوہیکل مجسموں کو ہزاروں لوگوں کے سامنے بڑی بڑی کرینوں سے منہدم کردیا گیا اور پوری دنیا نے یہ منظر دیکھا۔ اسی طرح چیکوسلواکیہ میں چاؤسسکو اور یوگوسلاویہ کے عظیم قائد جوزف بروز ٹیٹو کے مجسموں کو تباہ کردیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمنی میں ایڈولف ہٹلر کی ایک ایک یادگار کو چن چن کر مٹا دیا گیا۔ اسی طرح دیوار برلن کو نہ صرف ڈھا دیا گیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ساری دنیا میں فتح کی یاد میں تقسیم کردیئے گئے۔ ان تاریخی یادگاروں کی مسماری کے اس عمل کو ساری دنیا کی حکومتوں، عالمی اداروں مثلاً اقوام متحدہ اور یونیسکو نے معمول کی کارروائی قرار دے کر تسلیم کرلیا۔ کسی نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا۔ حالانکہ یہ ساری یادگاریں متعلقہ ملکوں کی تاریخ کا ناقابل تنسیخ حصہ تھیں۔ دنیا کی تاریخ ۱۹۱۷ء کے بالشویک انقلاب اور اس میں لینن کی تاریخی حیثیت کو، سوویت یونین میں ستر برس سے بھی زیادہ قائم رہنے والے مارکسی نظام کی تاریخی حیثیت کو، چیکوسلواکیہ میں شاؤسسکو اور یوگوسلاویہ میں ٹیٹو کے مرتبے و مقام کو اور جنگ عظیم اول کے بعد جرمنی کی بحرانی تاریخ میں ایڈولف ہٹلر اور جرمنی کی حفاظت اور اس کی ترقی اور بقاء کے لئے اس کے رول کی تاریخی حیثیت کو نہ کبھی فراموش کرسکتی ہے اور نہ اس کا انکار کرسکتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ شخصیتیں، نظام یا حکومتیں کسی کے لئے پسندیدہ تھیں اور کسی کی نظر میں ناپسندیدہ۔

بہرحال ان سے ہزاروں لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں۔ سوویت روس، مشرقی یورپ اور ساری دنیا میں پائے جانے والے ایسے لوگوں کی تعداد کروڑوں میں ہے جن کا اب بھی مارکس ازم بالشویک انقلاب اور لینن سے قلبی تعلق ہے اور ان کے لئے لینن کی ذات کسی مذہب کی مقدس شخصیت سے کم نہیں۔ لیکن بایں ہمہ ساری

دنیا نے ان کارروائیوں کو معمول کی کارروائی قرار دے کر تسلیم کر لیا۔ لہٰذا طالبان کا یہ عمل موجودہ عہد میں ساری دنیا میں رائج دستور اور قدروں کے عین مطابق اور تسلیم شدہ ہے۔ بلاشبہ اس عمل کے تعلق سے لوگوں کی ذاتی رائیں یا پسند و ناپسند میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تاہم جہاں تک ساری دنیا میں رائج قوانین، ضابطے، نظریے اور رواج کا تعلق ہے افغانستان کی حکومت یا طالبان کا یہ عمل خلاف ضابطہ، قوانین و رواج نہیں ہے بلکہ ان کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا افغانستان کے خلاف کوئی بھی کارروائی عالمی قوانین اور ضابطوں کی سراسر خلاف ورزی ہوگی۔

اب جہاں تک طالبان کے اس عمل کی مذمت کرنے والے افراد، طبقات، حکومتوں اور عالمی اداروں کا معاملہ ہے وہ سراسر منافقت اور جانبداری پر مبنی ہے اور اس سے عالمی استعماریت کی بو آتی ہے۔ جس کے تحت کوئی صرف اپنے حق کو تسلیم کرنے پر اصرار کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار۔ چنانچہ اصولاً اگر کوئی حق ہے تو اس کا اطلاق سب پر یکساں ہونا چاہئے۔ ایسی تمام صورتیں انسانیت کے دائرے سے باہر ہیں اور اس کی خلاف ورزی کے مترادف ہیں جہاں کسی مخصوص قوم یا حکومت کا حق تو تسلیم کیا جائے اور اسے جائز درست اور حق بھی قرار دیا جائے مگر دوسروں کے حقوق کو حق ماننے سے انکار کیا جائے اور انہیں ان کے حق سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ ایسی تمام کوششیں، منافقت پر مبنی ہیں اور چونکہ ان کے ذریعہ عالمی استعماریت کو مضبوط تر کرنے کی سعی کی جا رہی ہے اس لئے باشعور انسانیت ان کوششوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتی۔

دنیا کے باشعور افراد اور قومیں مٹھی بھر لوگوں یا چند ملکوں کو اس کی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ جس چیز کو چاہیں اسے عالمی انسانی ورثہ کو تباہ کرنے، مسخ کرنے یا مجروح کرنے والا عمل قرار دے دیں اور دوسرے فرد، گروہ یا ملک کے اس سے بالکل ملتے جلتے یا اس سے بھی سنگین عمل کو جائز قرار دے دیں۔ دنیا کے باشعور افراد اور قومیں مٹھی بھر لوگوں یا چند ملکوں کو اس کی بھی اجازت نہیں دے سکتیں کہ وہ کسی ایک فرد، گروہ یا ملک پر یکطرفہ طور پر کوئی فرد جرم عائد کر کے اس کے خلاف بین الاقوامی اخلاقی ضابطوں اور قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقدامات کریں اور دوسرے اسی طرح کے بلکہ اس سے بھی سنگین عمل کو جائز ٹھہرائیں۔

چنانچہ حکومت افغانستان کے اس عمل کی مذمت کرنے والوں اور عالمی تاریخی ورثہ کے نام نہاد علمبرداروں کو مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دینا چاہئے اور اس سلسلہ میں اپنی پوزیشن صاف کرنی چاہئے۔

① اگر افغانستان کے یہ مجسمے عالمی انسانی ورثہ ہیں تو پھر ان کی نظر میں تاریخی بابری مسجد کا مقام اور اس کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ عالمی تاریخی ورثہ نہیں تھی؟ کیا اس کو عالمی تاریخی ورثہ کا درجہ نہیں دیا جانا چاہئے؟ اگر نہیں تو آخر کیوں؟ اگر بابری مسجد بھی عالمی انسانی ورثہ تھی...... اور وہ یقیناً تھی...... تو یہ افراد، حکومتیں اور عالمی ادارے ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک جب کہ اسے بزور طاقت مسمار کر دینے کی علانیہ کوششیں ہو رہی تھیں اور ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے سیاسی عزم پوری طرح مشکوک ہو چکے تھے بلکہ خود اس عمل میں یہ حکومتیں خفیہ

اور علانیہ اور ایجابی اور سلبی طور پر ملوث ہو چکی تھیں...... اس عالمی انسانی ورثہ کو بچانے کے لئے وہ اقدامات کیوں نہیں کر رہے تھے جن کا وہ آج مظاہرہ کر رہے ہیں۔ بابری مسجد کو بچانے کے لئے حکومتوں کے کتنے وفود حکومت ہند پر دباؤ ڈالنے کے لئے آئے۔ سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ نے کتنی قرار دادیں منظور کیں اور اس تباہی کو رکوانے کے لئے اس کے کتنے وفود متحرک ہوئے اور جب ایک حکومت بابری مسجد کی حفاظت کے وعدے کے باوجود اسے بچانے میں دانستہ اور علانیہ طور پر ناکام ہوگئی اس کے خلاف کیا اقدامات کئے گئے اور آج وہ بابری مسجد کو اسی مقام پر بحال کرنے کی کیا کوششیں کر رہے ہیں؟؟

(۲) عالمی انسانی ورثہ ایک وسیع الاطراف اصطلاح ہے۔ اس کے دائرے میں صرف عمارتیں ہی نہیں آتی ہیں بلکہ انسانی تہذیب، تمدن اور تاریخ سے وابستہ ہر فرد، قوم اور کسی مقام پر پائی جانے والی مرئی و غیر مرئی، طبی اور کیفیاتی، موضوعی اور معروضی، منقولہ و غیر منقولہ یادگاریں شامل ہیں۔ مثلاً تہذیب، تمدن، وضع قطع، عادات و اطوار، نسل، آبادی، زبان، علمی سرمایہ اور تجربہ حتی کہ کسی زبان کے معمے اور مصوتے بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

(الف) چنانچہ عالمی انسانی ورثہ کے نام نہاد علمبرداروں کا جو افغانستان کے عمل کے خلاف عالمی انسانی ورثہ (WHH) کی دہائی دے رہے ہیں ...... شمالی امریکہ اور بطور خاص ریاست ہائے متحدہ امریکہ (U.S.A) میں ہونے والے عمل کے تعلق سے کیا خیال ہے۔ اس پورے براعظم میں وہاں کے لوگوں کی تہذیب، نسل، زبان، ثقافت حتی کہ اس خطے کے نام کو مٹا کر اس پر دوسری تہذیب، نسل، زبان، ثقافت مسلط کر دی گئی۔ انہیں ایک ایسے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جو ان کا نہیں۔ سرخ ہندوستانیوں کا خاتمہ عالمی انسانی ورثہ کی صریح خلاف ورزی نہیں ہے۔ کیا ہندوستان کا نام صرف اس لئے دی گاما (DE-GAMA) رکھ دیا جائے کہ ۱۴۹۸ء میں دی گاما ہندوستان آیا تھا۔ واضح رہے کہ امیر کس ویس پک چی (Americus vespucci) وہ شخص تھا جس کے لئے کولمبس کام کرتا تھا۔ ایک پورے براعظم کی انسانی آبادی، اس کی تہذیب، ثقافت، تمدن، زبان، حتی کہ ان کے نام کو ختم کر دیا گیا۔ اور آج تک اسے بحال نہیں کیا گیا ہے۔ نہ اس کی کوئی فکر پائی جاتی ہے۔ کیا یہ عالمی انسانی ورثہ کی کھلی اور بدترین خلاف ورزی نہیں ہے۔ کیا عالمی انسانی ورثہ کے علمبردار اس کے لئے بھی اسی طرح کوشاں ہیں جس طرح وہ افغانستان کے مجسموں کو بچانے کے لئے کوشاں ہیں؟؟

(ب) عالمی انسانی ورثہ کی بدترین خلاف ورزیوں میں سے یہ بھی ایک خلاف ورزی ہے کہ کسی جگہ کے مقامی باشندوں کی پوری کی پوری آبادی کو طاقت اور ظلم سے ہانک کر ان کے ملک سے بے دخل کر دیا جائے اور وہاں صد فیصد مصنوعی آبادی پر مشتمل ایک مصنوعی ریاست قائم کر دی جائے۔ چنانچہ فلسطین ہمیشہ سے فلسطینیوں کا ملک اور ان کی نسل، تہذیب، ثقافت اور زبان کا مسکن رہا ہے۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں خود اقوام متحدہ نے فلسطینیوں کو ان کے آبائی مسکن سے بے دخل کر کے ایک صد فیصد مصنوعی اور خارجی آبادی پر مشتمل مصنوعی ریاست

کے بنانے کی راہ ہموار کردی۔ ریاست اسرائیل نام کی کوئی ریاست تاریخ انسانی میں کبھی بھی وہاں موجود نہیں رہی ہے وہ علاقہ ہمیشہ سے فلسطینیوں کا رہا ہے۔ جس وقت ۱۹۴۸ء میں ریاست اسرائیل بنی، اقوام متحدہ نے اسے بلا تاخیر تسلیم کرلیا۔ اس وقت جو لوگ لاکھوں کی تعداد میں وہاں سے بے دخل کر دیئے گئے ان کی بیسیوں پشتیں وہاں مسلسل رہتی چلی آئی تھیں جبکہ اقوام متحدہ نے جس مصنوعی ریاست اسرائیل کو تسلیم کیا تھا۔ اس میں دو فیصد آبادی بھی ایسی نہیں تھی جس کی صرف تین پشتیں بھی وہاں مسلسل رہی ہوں۔

کیا یہ عالمی انسانی ورثہ کی بدترین خلاف ورزی نہیں تھی؟ جب ایک پوری قوم، اس کی تہذیب، تمدن، ثقافت، زبان، خودمختاری کو ختم کر کے اسے بے دخل کر دیا گیا۔ کیا عالمی انسانی ورثہ کے نام نہاد علمبردار اس مصنوعی ریاست کے خاتمہ اور وہاں کی حقیقی آبادی اور اس کی تہذیب، تمدن، ثقافت، زبان نیز اس کی خودمختاری کی بحالی کے لئے اسی طرح کوشاں ہیں جس طرح وہ آج افغانستان میں ان مجسموں کے لئے ہیں؟

(عدنان فہد۔ ''دعوت''، دہلی)

مصالحت کا سوال

اقبال احمد انجینئر صاحب لکھتے ہیں......

''طالبان کے اس عمل پر اسلامی وغیر اسلامی اصطلاحات استعمال ہوئیں۔ اسلام کی بنیاد توحید، رسالت و آخرت ہے۔ خالق کی وحدانیت کا اعلان کرنا، رسول پر ایمان لانا، مرنے کے بعد اٹھائے جانے پر یقین رکھنا ہے روز قیامت دنیاوی زندگی کے ہر لمحے کا حساب دینا ہے۔ خالق کائنات جس کا کوئی شریک نہیں ہے اس نے دنیا کو ایک وقت تک کے لئے بنایا جس کا علم صرف اسے ہی ہے۔ انسانوں کو ان کی عمروں کے اعتبار سے مہلت دی۔ اختیارات دیئے، کسی کو کمزور بنایا تو کسی کو طاقتور بنایا، کسی کو امیر بنایا، کسی کو اقتدار دیا اور کسی کو محکوم بنایا، وہ چاہے تو حاکم کو محکوم بنادے اور محکوم کو حاکم بنادے۔ سب کچھ اس کے اختیارات میں ہے۔ آدمی کے ہر عمل سے وہ واقف ہے۔ دلوں کے بھید کو وہ جانتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی زمین و آسمان کا واحد مالک ہے۔ اس نے انسان کو علم دے کر پیدا کیا۔ اس کی رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً رسولوں کو بھیجتا رہا۔ ہر قوم و قبیلے میں ڈرانے والے آئے۔ پہلے انسان زمین پر آدم تھے اور سب ان کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کائنات کو انسان کے حوالے کیا تاکہ غور وفکر کرے اور اپنی زندگی کی ضروریات کی تکمیل کے لئے خدائی کتاب سے رہنمائی حاصل کرے اور زمین پر فتنہ وفساد برپا نہ کرے۔ ہر طاقتور کمزور کی حفاظت کرے، امیر غریب کا خیال رکھے، حاکم محکوم کی ضروریات کی تکمیل کا نظم ونسق سنبھالے۔ انسان اختیارات کے باوجود مجبور و بے بس ہے، انسانوں کی بنیادی ضروریات ہوا، پانی، روشنی اللہ کے اختیار میں ہے اور موت وزندگی اس کے قبضہ میں ہے۔ یہ زندگی دراصل آزمائش گاہ ہے کہ کون اچھے اعمال کر کے کامیاب ہوتا ہے اور کون اپنی بداعمالی سے دنیا و آخرت میں نقصان اٹھاتا ہے۔ موجودہ مذاہب دنیا شاہد ہیں کہ نوح علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی۔ بتوں کی پرستش سے لوگوں کو روکا۔ قوم نے انکار کیا تباہ کردی گئی۔ ہود علیہ السلام وصالح علیہ السلام

نے قوم عاد وثمود کو اللہ کی توحید کی طرف بلایا اور بت پرستی سے روکا، قوم نے انکار کیا صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں۔ موجودہ قوم یہود کو بھی اللہ کی توحید کی دعوت دی گئی لیکن بچھڑے کی پرستش میں انہوں نے تعلیمات کو بھلا دیا۔ قوموں کی امامت چھین لی گئی۔ نصرانی قوم کو عیسیٰ علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی لیکن انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنالیا۔ اللہ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی یہی دعوت دی اور تمام انسانوں کو اللہ کی توحید کی طرف بلایا اور بت پرستی سے منع کیا۔ انسانوں کی رہنمائی کے لئے قرآن نازل کیا گیا جو صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے ہے۔ یہی انسانی دستور حیات ہے جس پر انسانی دنیاوی واخروی زندگی کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس پر عمل کرنے سے کامیابی اور انکار سے محرومئ دنیا وآخرت ہے غرض ابتداء دنیا سے ایک ہی طریقہ زندگی رہا وہ ہے اسلام۔

فتح مکہ کے بعد جب سارا عرب اسلام میں داخل ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ کو بتوں سے پاک کیا۔ مکہ کی پہاڑیوں پر موجود لات ومنات کے بت گرا دیئے گئے اور طائف میں موجود بتوں کو تباہ کر دیا گیا۔ سنت ابراہیمی جو اکیلے ہی قوم سے لڑ گئی تھی اور اپنی قوم کو بت پرستی سے روکنے کی کوشش کی تھی وہی سنت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دہرائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک سے یہ تکمیل کو پہنچی اور روز قیامت تک مکہ کے دروازے سوائے مسلمانوں کے سب کے لئے بند کر دیئے گئے اور یہ شہر مرکز اسلام بن گیا۔

ان ممالک کا معاملہ دوسرا ہے جہاں اسلام فاتح کی حیثیت سے داخل ہوا ہو۔ انسانی قانون سے آزادی دلانے کے بعد وہاں کی موجود غیر مسلم آبادی کا بھی تحفظ کیا گیا۔ ان کے مذہبی مقامات وطریقۂ زندگی کی حفاظت کی گئی۔ تاریخ کی دوسری اقوام نے مفتوح قوموں کی عزت وآبرو لوٹ لی ان کے مردوں کو ختم کیا اور ملکیت پر قابض ہوئے لیکن اسلام نے اس کے برعکس ان کی عزت وآبرو کی حفاظت کی اور ناحق خون خرابے کی اجازت نہیں دی۔ ان کی ملکیت پر قبضہ نہیں کیا۔ ان کی حفاظت وتحفظ کے لئے ایک ٹیکس TAX جزیہ لیا گیا۔ اسلام کی یہ دو صورتیں ذہن میں ہوں تو افغانستان کا معاملہ صاف صاف سمجھ میں آتا ہے۔ اب جب کہ حکومت افغانستان کا دستور قرآنی ہے۔ حکومت اسلامیہ کے قیام کا اعلان کر چکی ہے اس کی رعایا تمام کی تمام مسلمان ہے تو ایسی صورت میں ہر وہ نشان جو توحید کے خلاف ہو مٹانے کا اس کو حق حاصل ہو جاتا ہے اور یہ حق اسے کتاب الٰہی نے دیا ہے جو خالق کائنات کی طرف سے ہے اور واحد انسانی رہنمائی کا ذریعہ ہے۔ اب اس پر ذمہ داری ہے کہ وہ حکمت ودانش سے اس حق کو استعمال کرے۔

اسلام دنیا میں سب سے الگ وجدا مذہب ہے۔ یہ ایک طریقۂ زندگی ہے جس کی بنیاد توحید پر ہے اور اس پر وہ مصالحت نہیں کرتا اور اپنے علاوہ دوسرے طریقۂ زندگی کو صحیح نہیں سمجھتا۔ ہندوتوا کے مفکر جی آر ملکانی کا یہی کہنا ہے کہ اگر اسلام اپنے علاوہ دوسرے مذاہب کو بھی آج حق مانے تو ہمارا مسلمانوں سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ توحید وشرک دو الگ الگ راستے ہیں ان میں مصالحت ناممکن ہے۔'' (منصف)

مولانا وحید الدین خاں کے فرمودات پر بھی ایک نظر

مولانا وحید الدین خان صاحب طالبان کی بت شکنی والے عمل کو غیر اسلامی بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''طالبان کا یہ عمل بلا شبہ ایک غیر اسلامی فعل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام بت پرستی کے خلاف ہے مگر بت پرستی اور بت شکنی دونوں میں فرق ہے۔ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ بتوں کو نہ پوجو۔ مگر قرآن میں یہ حکم نہیں دیا گیا ہے بتوں کو توڑ ڈالو۔ اسلام کا طریقہ دلوں سے بت پرستی کو ختم کرنا ہے نہ کہ پتھر کے مجسموں کو توڑ کر ختم کرنا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے کچھ مثالیں لیجئے۔ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اے مسلمانو! تم لوگ نماز پڑھو مگر قرآن میں یہ حکم نہیں دیا گیا کہ جو لوگ نماز نہ پڑھیں انہیں مار ڈالو۔ ایسی حالت میں اگر کوئی شخص نماز کے قرآنی حکم کو لے کر بے نمازیوں کو مارنے لگے تو وہ قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوگی بلکہ وہ قرآن کے نام پر سرکشی ہوگی۔''

(منصف اتوار ۲۵ / مارچ سنہ ۲۰۰۱ء)

او پر ہم نے خان صاحب کی جو عبارت نقل کی ہے شاید وہ ایک عام قاری کے نزدیک بہت ہی خوب عصری دلائل سے بھر پور ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ عبارت بے علمی اور گمراہی کا ایک شاہکار ہونے کے سواء کچھ نہیں ہے۔ یہ تاثر دینا کہ بت پرستی اور بت شکنی دونوں کو طالبان اور ان کے حامیان ایک قرار دیتے ہیں یہ بالکل بے بنیاد بات ہے اگر یہ تاثر دینا نہیں ہے تو بت پرستی اور بت شکنی میں فرق بتانے کی آخر کیا وجہ ہے؟ کون بے وقوف ہے کہ بت کے سامنے سجدہ کرنا اور بت پر ہتھوڑا چلانا دونوں کو برابر کہے۔ خان صاحب نے فرمایا کہ قرآن میں بت کی پوجا سے منع کیا گیا لیکن بت توڑنے کا حکم نہیں دیا گیا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ ایسے ہے جیسے کوئی کہے قرآن میں بت پوجنے سے منع کا بھی حکم نہیں ہے اگر حکم ہے تو کوئی آیت پیش کیجئے۔ اسی طرح کوئی کہے کہ قرآن میں مسجد بنانے کا حکم نہیں ہے اگر حکم ہے تو حوالہ دیجئے۔

اسی طرح کوئی کہے کہ شراب پینے سے بھی منع نہیں کیا گیا ہے اگر یہ حکم ہے تو کوئی آیت لائیے۔ کوئی کہے کہ شراب کے مٹکوں کو توڑنے کا حکم بھی نہیں ہے اگر ہے تو کوئی آیت پیش کیجئے۔ اسی طرح شراب کی تجارت سے منع کا بھی کوئی حکم نہیں ہے اگر ہے تو کوئی ایک آیت پیش کیجئے۔ اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ شریعت میں کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم صرف قرآن ہی سے ثابت نہیں ہوتا۔ قرآن کے علاوہ کسی حکم کے ثابت ہونے کے لئے سنت بھی ایک اہم دلیل ہوتی ہے۔ خان صاحب کے طرز پر سوچنے والا یہی کہے گا کہ جس طرح قرآن میں بت توڑنے کا حکم نہیں ہے اسی طرح شراب پینے سے منع کا حکم بھی نہیں ہے اور نہ بتوں کی پوجا سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ جس طرح قرآن میں اِكْسِرُوا الْاَصْنَامَ ''بتوں کو توڑ دو'' نہیں آیا ہے اسی طرح لَا تَعْبُدُوا الْاَصْنَامَ بھی نہیں آیا ہے اور وَلَا تَشْرَبُوا الْخَمْرَ بھی نہیں آیا ہے۔ بتوں کی پوجا سے منع کرنا اور شراب پینے سے روکنا یہ دقیانوسی ملّاؤں کا کام ہے یہ احکام قرآن میں کہیں نہیں دیئے گئے ہیں۔ ہم خان صاحب سے اور ان کے ہمنواؤں سے کہیں گے کہ اس سوال کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟ ہمارا جواب ملاحظہ فرمائیے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ جس طرح شراب پینے، شراب بیچنے، شراب خریدنے اور ان کے مٹکوں کو توڑنے کا حکم قرآن میں دلالۃً موجود ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اسی طرح بتوں کی عبادت سے منع اور ان کو توڑنے کا حکم بھی قرآن میں دلالۃً موجود ہے۔ قرآن کا کوئی حکم عبارۃ النص سے ثابت ہوتا ہے۔ کوئی اقتضاء النص سے، کوئی دلالۃ النص سے اور کوئی اشارۃ النص سے، ان میں سے کسی طریقہ سے ثابت ہو قرآن کا حکم مانا جائے گا مثلاً کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسجد بنانے کا حکم قرآن میں نہیں دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ جب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم دیا گیا تو اقتضاء النّص سے مسجد بنانے کا حکم بھی نکل آیا۔ اگر خان صاحب کے ذہن میں دلالتوں کی اقسام مستحضر ہوتیں تو مطلقاً یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ قرآن میں بتوں کو توڑنے کا حکم نہیں ہے۔ قرآن کی آیت ہے۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (المائدہ:۹۰)

ترجمہ: اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، شراب اور جوا اور یہ بت اور پانسے۔ یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔

اس آیت میں دو لفظ خاص طور پر قابل غور ہیں ایک ہے ''رِجْسٌ'' جس کے معنی ہیں گندگی اس آیت میں کئی چیزوں کے ساتھ خمر یعنی شراب کو گندگی کہا گیا اور اس گندگی سے دور رہنے کے لئے اجتناب کا لفظ استعمال کیا گیا اب یہ دیکھئے کہ شراب پینے سے منع کرنے کے لئے کوئی صریح لفظ نہیں ہے اور نہ مٹکوں کو توڑنے کے لئے کوئی

لفظ آیا ہے۔ لیکن اس آیت اور اس کے بعد والی آیت سنتے ہی لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے اور شراب خانے برباد کر دیئے اور مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب بہنے لگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرما دیا کہ اب جن کے پاس شراب ہے وہ نہ اسے پی سکتے ہیں نہ بیچ سکتے ہیں بلکہ وہ اسے ضائع کر دیں۔ بعض لوگوں نے پوچھا ہم یہودیوں کو تحفہ کیوں نہ دے دیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے یہ چیز حرام کی ہے اس نے اسے تحفہ دینے سے بھی منع کر دیا ہے۔ بعض لوگوں نے پوچھا ہم شراب کو سرکہ میں کیوں نہ تبدیل کر دیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے بھی منع فرمایا اور حکم دیا کہ اسے بہادو۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے شراب پر اور اس کے پینے والے پر اور پلانے والے پر اور بیچنے والے پر اور خریدنے والے پر اور کشید کرنے والے پر اور کشید کرانے والے پر اور ڈھو کر لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے لئے وہ ڈھو کر لے جائی گئی ہو۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بنی ثقیف کے ایک شخص رویشد نامی کی دکان اس بناء پر جلا دی گئی کہ وہ خفیہ طور پر شراب بیچتا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر ایک پورا گاؤں حضرت عمرؓ کے حکم سے اس قصور پر جلا ڈالا گیا کہ وہاں خفیہ طریقہ سے شراب کی کشید و فروخت کا کاروبار ہو رہا تھا۔ یہ سب باتیں آیت میں فَاجْتَنِبُوْا سے نکلی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اور عمل اور صحابہ کا عمل دراصل حکم اجتناب کی شرح ہیں۔ اس بناء پر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شراب پینے سے منع کرنے کا حکم اور شراب کے مٹکوں کو توڑنے کا حکم اور شراب خانہ کو برباد کرنے کا حکم قرآن میں سرے سے موجود نہیں ہے اس کے بعد اس آیت پر غور کیجئے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (الحج:۳۰)

ترجمہ: سو بچتے رہو بتوں کی گندگی سے۔

اس آیت میں ایک چیز کو رجس کہا گیا اور اس سے بچنے کے لئے لفظ اجتناب استعمال کیا گیا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ شراب کو رِجْسٌ کہا گیا اور اس سے بچنے کے لئے اجتناب کا لفظ استعمال ہوا۔ سوال یہ ہے کہ جب شراب سے اجتناب میں شراب سے متعلق نصف درجن سے زیادہ چیزوں سے بچنے کا حکم شامل ہے حتی کہ مٹکوں کو توڑنا اور شراب خانوں کو جلانا۔ تو کیا اس طرح بتوں کی گندگی سے اجتناب میں کیا کچھ شامل نہیں ہو سکتا۔ کیا بتوں اور مجسموں کو کوئی اگر پوجے نہیں تو اپنے گھر میں انہیں بنا سنوار کر کے رکھنا، اس کی نمائش کرنا، انہیں تراشنا اور بحفاظت رکھنا جائز ہوگا؟ اور حکم اجتناب کے خلاف نہ ہوگا؟ اور کیا حکم اجتناب میں بتوں اور مجسّموں کو توڑ پھوڑ کر کے پھینکنا شامل نہ ہوگا؟ اسی طرح اگرچہ کہ لَا تَعْبُدُوا الْاَصْنَامَ قرآن میں نہیں آیا ہے اور نہ یہ آیا ہے کہ بتوں کو توڑو لیکن قرآن سے بتوں کے توڑنے کا حکم اقتضاء النص اور دلالۃ النص سے ثابت ہے۔

اس بناء پر مطلق قرآن میں نہ ہونے کا دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے۔ دیکھئے سورۂ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی ہے کہ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. (ابراہیم:۳۵)

ترجمہ: اے رب اس شہر کو امن والا بنادے اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس بات سے دور رکھ کہ ہم بتوں کو پوجیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کو قبول فرمایا اور بتوں کی عبادت سے دور رہنے میں یہ بات ہمیں شامل نظر آتی ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کی عبادت نہیں کی اسی طرح انہوں نے ان کا کوئی احترام نہیں کیا بلکہ انہوں نے بے حرمتی کی اور ان بتوں کو توڑ کر کے رکھ دیا۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ○ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ○ (الانبیاء:۵۷،۵۸)

ترجمہ: اور قسم اللہ کی میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا تا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

اس آیت کے ساتھ سورہ ابراہیم کی (آیت ۳۵) اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ...... والی آیت ملا کر کے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بتوں کی عبادت سے دور رہنے میں جس طرح بتوں کی پوجا نہ کرنا ہے اسی طرح اس میں بتوں کو توڑنا بھی شامل ہے۔ اس کے برخلاف بتوں کی پوجا نہ کرنا لیکن بتوں کا احترام کرنا، ان کو بیش بہا ورثہ سمجھنا، ان کو بحفاظت رکھنا یہ سب چیزیں بتوں کی عبادت سے دور رہنے کی ضد ہیں۔ بتوں کا توڑنا، بتوں کی گندگی سے دور رہنے اور بتوں کی عبادت سے دور رہنے کا ایک اہم جز ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہوتا ہے اسی طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بذات خود کعبۃ اللہ کے بتوں کو توڑنے اور عرب کے دوسرے علاقوں میں بتوں کو تڑوانے کا عمل بھی اس میں شامل ہے اور اس کی تفسیر ہے۔

ان حقائق کے بعد بھی کوئی اگر یہ کہتا ہے کہ قرآن میں بتوں کو توڑنے کا حکم نہیں ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ قرآن سے کوئی ایک آیت ایسی پیش کیجئے جس میں بتوں کو بحفاظت باقی رکھنے کا حکم ملتا ہو۔ یا کوئی ایسی آیت پیش کیجئے جس سے بتوں کی حفاظت کرنے اور اپنے گھر میں رکھنے کا وجوب ثابت ہوتا ہو یا استحباب سمجھ میں آتا ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو آپ کس بات پر غصہ ہو رہے ہیں؟

یہ بات کہ ''اسلام کا طریقہ دلوں سے بت پرستی کو ختم کرنا ہے نہ کہ پتھر کے مجسّموں کو توڑ کر ختم کرنا'' یہ بات آخر کس آیت قرآنی اور کس حدیث رسول سے ثابت ہے کہ صرف دلوں سے بت پرستی کو نکالنا اسلام کا طریقہ اور اسلام کا مقصود ہے؟؟ اور مظاہر شرک چاہے وہ بتوں کی شکل میں ہوں ان سے تعرض کرنا نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ بات بھی لاعلمی کی ایک دلیل ہے ورنہ قرآن میں سورہ مائدہ کی ابتدائی آیات پر نظر ہوتی اور ان ارشاداتِ نبوی ﷺ پر جن میں تصویر بنانے اور قبروں کو پختہ کرنے سے منع کیا گیا ہے تو یہ بات سمجھ میں آتی کہ جس طرح سے دلوں سے بت پرستی کو نکالنا اسلام میں مقصود ہے اسی طرح خارج میں شرک، مظاہر شرک اور ذرائع شرک کو ختم کرنا بھی مقصود ہے ورنہ سارے عرب سے بتوں کو توڑ کر پھینکنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

خان صاحب نے اپنی بات کو سمجھانے کے لئے جو یہ بات کہی کہ

> ''قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم تو دیا گیا ہے لیکن بے نمازیوں کو مارنے کا حکم نہیں ہے اگر کوئی بے نمازیوں کو مارے تو وہ قرآنی حکم کی تعمیل نہیں ہوگی بلکہ وہ قرآن کے نام پر سرکشی ہوگی۔''

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اس مثال کا اصل مسئلہ سے کوئی جوڑ نہیں ہے دوسری بات یہ کہ بے نمازیوں کو مارنا قرآنی حکم کے خلاف ہے تو اسلامی قانون میں بے نمازیوں کے لئے سزا کیوں متعین کی گئی ہے؟ حتیٰ کہ فقہائے مالکیہ اور شافعیہ نے بے نمازی کو قتل کرنے کا فتویٰ دیا ہے اور حنفیہ کے نزدیک بے نمازی کو قید میں رکھا جائے گا یہاں تک کہ وہ توبہ کرے یا مر جائے۔ کیا فقہاء کے فیصلے قرآن کے مغائر ہیں اور اگر نہیں ہیں تو کیوں؟ خان صاحب کے برخلاف قرآن میں نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا اس حکم کا تقاضا ہے کہ نماز نہ پڑھنے والوں کو سزا دی جائے اس کی تائید دوسرے شرعی دلائل سے ہوتی ہے۔ نماز پڑھو اور نماز قائم کرو میں یہ فرق ہے جس کو خان صاحب ملحوظ نہیں رکھ سکے۔

خان صاحب جو بات ثابت کرنا چاہتے تھے اس میں نبی ﷺ کی بت شکنی فتح مکہ کے بعد ایک رکاوٹ بن رہی تھی اور اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا اس لئے الفاظ کی جادوگری سے کام نکالنا چاہا اور یہ فرمایا کہ

> ''کعبہ کے اندر رکھے ہوئے بتوں کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا تھا وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بت شکنی کا معاملہ نہ تھا بلکہ کعبہ کی تطہیر کا معاملہ تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کعبۃ اللہ سے اہل شرک کے ناجائز قبضہ کو ختم کر کے دوبارہ اس کو اہل توحید کے حوالے کر دیا جائے۔''

سوچئے کہ بت شکنی اور تطہیر میں کیا کوئی تضاد ہے کہ ''بت شکنی ہوگی تو تطہیر نہیں ہوگی اور تطہیر ہوگی تو بت شکنی نہیں'' آخر یہ بات کیوں نہ مان لی جائے کہ تطہیر کی گئی بت شکنی کے ذریعہ۔ اور اگر کعبہ میں بت باحترام و

بحفاظت باقی چھوڑے گئے ہوتے تو تطہیر نہیں ہوسکتی تھی۔ تطہیر کو ماننا اور بت شکنی کے واقعہ کا انکار کرنا ایک ایسی منطق ہے جو کم سے کم اس دور کے لوگوں کو سمجھ میں نہیں آسکتی۔ ممکن ہے زمانہ آگے مزید ''ترقی'' کرے اور خان صاحب جیسے لوگ کچھ اور ''دانشور'' عصری علوم کے ماہر پیدا ہوں وہ سمجھ سکیں۔ دوسری بات اگر کعبہ میں خان صاحب کے ارشاد کے مطابق صرف مشرکین کا قبضہ ختم کرنے کے لئے بت توڑے گئے تو اگر طالبان نے غیروں کا قبضہ ختم کرنے کے لئے ہی بتوں کو توڑا ہو تو کیوں بے جا ہے؟ اور کیوں غیر اسلامی فعل ہے؟ اس لئے کہ اغیار تو اغیار خاں صاحب بھی مجسموں کو ملکیت میں ساری دنیا کو شریک سمجھتے ہیں یہ تو اچھا ہوا کہ افغانیوں نے مجسموں کو توڑ کر اس فتنہ کو ختم کر دیا۔ ورنہ دنیا کے دوسرے ملکوں کو یہ نکتہ سمجھ میں آ گیا ہوتا تو وہ افغانستان کے ایک علاقہ پر اپنا حق جتاتے اور وہاں جا کر کے اپنا اڈہ قائم کرتے اور ظاہر ہے اس اڈہ تک پہنچنے کے لئے ایک کشادہ سڑک بھی بنانی پڑتی۔ اس طرح افغانستان کا ایک بڑا حصہ غیروں کے قبضہ میں چلا جاتا پھر ایک ائیر پورٹ بھی بنانا پڑتا تا کہ ساری دنیا کے لوگ وہاں پہنچ سکیں اس طرح پورے افغانستان پر دوسروں کا پھر قبضہ ہو جاتا۔

آگے خاں صاحب نے مسجد اقصیٰ پر مسلمانوں کا جو دعویٰ ہے اس کی بنیاد جس نظریہ کو بنایا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور مسلمانوں کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اور یہ فرمانا:

> ''اس نظریہ کو نہ مانا جائے تو مسجد اقصیٰ یا اس کی سائٹ صرف یہودیوں کی ملکیت قرار پائے گی اس میں مسلمانوں کا کوئی حصہ تسلیم کرنا ممکن نہ ہوگا۔''

یہ بات انتہائی خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی کم فہمی کا ثبوت ہے اصل یہ ہے کہ مسلمان حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہودیوں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہیں ہم مسلمان اس کو نہیں مانتے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے وارث یہودی ہیں۔ ان کے وارث تو صحیح معنی میں وہ لوگ ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صدق دل سے ایمان لائے ہیں یہی وہ حقیقت ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مدینہ میں ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ حقدار ہیں۔

خان صاحب نے طالبان کا عقیدہ جس انداز میں بتایا ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاں صاحب کے عقیدہ کے مطابق جن مجسموں کی پرستش جائز نہ ہو ان کو فروخت کرنا جائز ہوگا۔ بہرصورت موصوف کا جو بھی عقیدہ ہو لیکن موصوف کو یہ الفاظ تو نہیں لکھنا چاہئے تھا کہ

> ''افغانستان کی کسی حکومت کو زیادہ سے زیادہ کوئی حق دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ وہ اعلان کر دے کہ جو ملک چاہے ان کو اٹھا کر اپنے یہاں لے جائے۔ مگر تاریخی اہمیت کے ان مجسّموں کو برباد کرنے کا حق کسی ملکی

حکومت کو ہرگز نہیں۔''

موصوف کو معلوم ہونا چاہئے کہ جس عقیدہ کے مطابق مجسموں کو چاہے وہ تاریخی ہوں یا غیر تاریخی فروخت کرنا جائز نہیں ہے اسی عقیدہ کے مطابق ان کو تحفتاً دینا بھی جائز نہیں ہے اور مجسمہ سازی یا مجسموں کو بحفاظت رکھنے میں تعاون دینا بھی جائز نہیں ہوگا۔ اس لئے مجسّموں کو منتقل کرنے کے لئے دوسرے ملکوں کو سہولت دینے میں وہ کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟

یہ مختصراً ان چند دلائل کا پوسٹ مارٹم ہے جن کی بنیاد پر خان صاحب نے طالبان کے عمل کو غیر اسلامی بتایا ہے۔ بقیہ دلائل کو بھی انہی پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان کی کیا حقیقت ہوگی؟ اور کچھ باتوں پر مثلاً بتوں کو گالی نہ دو یا لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ پر ہم دوسرے لوگوں کا جواب دیتے ہوئے گفتگو کر چکے ہیں۔

لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

طاقت کا استعمال

قرآن کی روشنی میں

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی

کے مقالات پر ایک تنقیدی نظر

(۲۰۰۵ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

ہمت ہار جانا مومنانہ کردار نہیں ہے

ماہ نامہ ''زندگی نو'' مارچ ۲۰۰۴ء میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کا مضمون ''تشدد اور مسلمان'' ہم نے پڑھا۔ یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کی نئی کتاب ''اکیسویں صدی میں اسلام، مسلمان اور تحریک اسلامی'' میں ''تشدد، اسلام اور تحریک اسلامی'' کے نام سے شامل ہے۔ موصوف نے جو باتیں لکھی ہیں ان کیلئے ساری دنیا میں نہایت سازگار ماحول ہے لیکن ان کے خلاف لکھنے اور بولنے کیلئے فضا بالکل سازگار نہیں ہے۔ پھر بھی چند ضروری پہلوؤں پر تبادلۂ خیال کرنا فرض کا تقاضہ ہے۔

> خلاصہ: ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یا ماحصل یہ ہے کہ فی زمانہ امریکہ چاہے اس کی کارروائیاں اور اقدامات کچھ بھی ہوں اور خواہ اس کی سنگینی جیسی کچھ بھی ہو اس کے خلاف قدم اٹھانا نہ تو جائز ہے اور نہ مسلمانوں کے حق میں مفید اور سودمند۔ اسی طرح ہندوستان میں ہندوتوا کے علمبردار کچھ بھی کر ڈالیں ان کا مقابلہ کرنے کے لئے جو قدم بھی قوت استعمال کرنے کے سلسلہ میں اٹھایا جائے گا وہ شرعی اعتبار سے غلط اور مسلمانوں کے لئے نقصان دہ اور مضر ہوگا۔

نا قابل قبول

ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں:

> ''مسلمانوں کیلئے سب کچھ برداشت کرنے کے سواء کوئی راہ نہیں ہے۔ یعنی ہاتھ اٹھانے اور ہاتھ استعمال کرنے کی گنجائش نہ شرعاً ہے اور نہ عقلاً۔ ہابیل نے قابیل کے مقابلہ میں جو رویہ اپنایا تھا وہی رویہ مسلمانوں کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔'' (زندگئ نو، مارچ ۲۰۰۴ء)

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ایک لمحہ کیلئے بھی ایک عام مسلمان کے لئے نہ شرعاً قابل قبول ہوسکتی ہے اور نہ عقلاً۔ اس لئے کہ جانی اور مالی نقصان برداشت کرنا حتیٰ کہ گھر بار چھوڑنا، ترک وطن کرنا اور مع اہل وعیال اپنے کو حق کی خاطر قربان کرنے کا جواز ہی نہیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور اس کی ترغیب قرآن وحدیث کے نصوص اور

انبیائی تاریخ سے بآسانی ثابت کی جاسکتی ہے۔ لیکن مار کھاتے رہنا اور نقصان اٹھاتے رہنا جس کی کوئی حد نہ ہو اور اپنی آئندہ نسلوں کو فتنہ کے حوالے کرنا اور فتنہ کو دفع نہ کرنا ایک ایسی بات ہے جس کو شرعی بنیادوں پر ثابت نہیں کیا جاسکتا اور اسے اللہ اور اس کے رسول ؐ کی منشا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگر کوئی فرد یا گروہ دشمنوں کے نرغے میں پھنس جائے اور اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں اختیار کرسکتا ہو تو یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن اگر کچھ کرسکتا ہے تو اسے ضرور کرنا چاہئے ورنہ وہ خودکشی ہوگی جس کے لئے شریعت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ دیکھئے اصحاب کہف غار میں کیوں چھپے! حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہجرت کیوں کی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام پوری قوم بنی اسرائیل کو رات کے سناٹے میں لے کر مصر سے کیوں نکلے؟ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے کان اور آنکھ سے بچتے ہوئے بیعت عقبہ مدینہ کے لوگوں کے ساتھ کیوں کی اور اس سے پہلے کچھ صحابہ کرام ؓ نے ہجرت حبشہ کیوں کی اور خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے وطن مالوف کو کیوں چھوڑا؟ ان سارے سوالوں کا جواب اس کے سواء کیا ہے کہ ان خدا رسیدہ بندوں نے اپنے بچاؤ کے لئے اپنے اپنے حالات کے لحاظ سے جو ممکن شکل ہوسکتی تھی اس کو اختیار کیا۔

ممکن ہے کہ اس موقع پر کوئی یہ کہے کہ اپنے بچاؤ کیلئے نہیں بلکہ دعوت کی بقاء اور توسیع کیلئے کیا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ دعوت کی بقاء اور توسیع، داعی کی ذات کی بقاء کے ساتھ وابستہ ہے اور داعی کو منظر سے ہٹا دینے کے معنی دعوت کا خاتمہ ہے۔ غالباً یہی وہ راز ہے جو اللہ کے اس وعدہ میں پوشیدہ ہے کہ اللہ نے داعیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: "وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" یعنی اللہ آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔ اس بات کی اہمیت کا یوں بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو فرعون کے ظلم وستم اور غلامی سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث فرمایا اور اس کو اتنی اہمیت دی کہ ان کی بعثت کے مقصد میں اس کو شامل کیا۔

قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الاعراف:۱۰۵)

ترجمہ: میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ پس میرے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى (طٰہٰ:۴۷)

ترجمہ: پس تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ پس اس سے کہو، ہم تیرے رب کے رسول ہیں۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو بھیج دو اور ان کو ستاؤ نہیں۔ ہم تیرے پاس تیرے رب کی طرف سے ایک نشانی لے کر آئے ہیں۔ اور سلام اس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات نہایت ہی سنگین ہیں اور صورتحال یہ ہے کہ غار اور کھوؤں میں چھپنا بھی بچاؤ کے لئے ممکن نہیں رہا۔ یہاں تک کہ چوہے کی طرح بل میں کوئی چھپا ہوتا ہے تو اس کو بھی پکڑ لیا جاتا ہے اور ایسے ایسے آلات ایجاد ہو چکے ہیں کہ تہہ خانوں کی اندرونی تصویر لے لی جاتی ہے اور بڑی طاقتوں نے ایسے بم بنا لئے ہیں کہ پہاڑ کے غاروں میں آدمی کی بو سونگھتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور کام کر لیتے ہیں۔ کوئی کہاں چھپے اور اپنے کو کیسے بچائے؟! دنیا کے ایک سو اکتیس ملکوں میں امریکی فوج پھیلی ہوئی ہے اور سات سو پچیس فوجی اڈے مختلف علاقوں میں اس نے قائم کر رکھے ہیں اس طرح پوری دنیا امریکہ کی فوجی گرفت میں ہے اور زمین کے کسی خطے میں امریکہ کی مرضی کے خلاف کوئی چوں نہیں کر سکتا اور ساری قومیں دم سادھے بیٹھی ہیں۔ ان وجوہ کی بناء پر بہت زیادہ سوچنے والے اور بہت زیادہ تیز نگاہ رکھنے والے ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ اب امریکہ اور اس کے ایجنٹوں کے چنگل سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے اور جو ہاتھ پیر مارے گا وہ خود اپنا ہاتھ پیر توڑ لے گا۔

یہ ایک ایسی صورتحال ہے جس کو ہر خاص و عام اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور دل میں محسوس کر رہا ہے لیکن جن کی نگاہیں بہت تیز ہیں اور ذرائع معلومات جن کے پاس جتنے ہی زیادہ ہیں ان کی نظر میں یہ منظر اور بھی زیادہ بھیانک معلوم ہوتا ہے۔ واقعاتی دنیا میں اس بھیانک منظر کو پیش کرنا اور اس کا دنیا کو قائل بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لیکن اس بات کو ثابت کرنا بالخصوص شرعی اعتبار سے کہ مسلمانوں کو اس اژدھے کے سامنے سپر ڈال دینی چاہئے بہت مشکل ہے۔ اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے علم اور اپنی ذہانت کے بل پر کتاب وسنت اور اسلامی تاریخ سے ایسا مواد اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ امریکہ جیسے اژدھے کے سامنے موجودہ حالات میں دم سادھے بیٹھے رہنے ہی میں دین و دنیا کی بھلائی ہے یعنی دنیاوی مصلحت کا بھی یہی تقاضہ ہے اور دین و شریعت کا بھی۔

ایک اہم پہلو

اس پس منظر میں ہم ڈاکٹر صاحب کے دلائل کا تفصیلی جائزہ لینا چاہتے ہیں مگر آگے بڑھنے سے پہلے ایک اور پہلو پر نظر ڈالئے تاریخ عالم ہمیں بتاتی ہے کہ جو قومیں زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ کسی حال میں ہمت نہیں ہارتیں، حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتیں کہ زندگی نام ہے دراصل ہمت اور حوصلے کا۔ جس نے حوصلہ نہ ہارا وہ بالآخر کامیاب و کامران ہو کر رہا ہے۔ تاریخ میں کئی قومیں بہت سے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی دیکھی جاسکتی ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال اور فتح وشکست کی کہانیوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ ان کہانیوں کے پیچھے کارفرما جوہر فکری بلندی، حوصلہ مندی اور عزم محکم ہوتا ہے یہ وہ چیز ہے جس کے سامنے بڑی سے بڑی فوجیں اور بھاری سے بھاری اسلحہ اور سامان جنگ ہوا ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یہ ایک ایسی عام تاریخی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنے ماننے والوں کے اندر سب سے پہلے جو اذعان ویقین پیدا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران:۱۳۹)

ترجمہ: ہمت نہ ہارو اور غم نہ کرو تم ہی بلند رہو گے اگر تم مومن ہو۔

فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ (سورۂ محمد:۳۵)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو۔

وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (آل عمران:۱۴۶)

ترجمہ: اور بہت سے نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی ہے۔ انہوں نے ہمت نہیں ہاری، اللہ کی راہ میں پیش آنے والے مصائب کی بناء پر وہ کمزور نہیں پڑے اور نہ درماندہ ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یعنی سربلندی اور سرفرازی کا دارومدار ایمان پر ہے ایمان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ دنیا میں عروج وزوال، عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ملنے والی چیز ہے۔ اللہ جسے عزت دینا چاہے اسے کوئی ذلیل نہیں کرسکتا اور جسے زوال کے کھڈ میں گرانے کا فیصلہ کرے اسے عروج وترقی سے کوئی ہمکنار نہیں کرسکتا۔ اسی یقین کے مظاہر ہیں بدر واحد اور حنین کے معرکے، اور اُن تیز رفتار فتوحات کے سیلاب جن کو دیکھ کر دنیا آج تک حیرت زدہ ہے۔

اس یقین کو مزید تقویت دینے والے تاریخی شواہد کی طرف نظر اٹھانے کیلئے فرمایا گیا ہے:

كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ (البقرۃ:۲۴۹)

ترجمہ: بہت سے چھوٹے گروہ اللہ کے حکم سے بڑے گروہ پر غالب ہوئے ہیں۔

ایمان ویقین کی یہ چنگاری سینوں میں موجود ہو اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے جدوجہد جاری رہے تو اللہ تعالیٰ مشکلات ومصائب کے بھنور سے اور غلامی سے نجات کی راہ پیدا کرتا ہے اور عروج وعزت کا سامان غیب

سے نمودار ہوتا ہے۔ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں آج یہ کیوں سمجھا جا رہا ہے کہ عصر حاضر کی امریکہ جیسی سپر طاقتیں زیر نہیں ہو سکتیں۔

اِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (سورۂ یوسف: ۸۷)

ترجمہ: بلاشبہ کافر لوگ ہی اللہ کی قدرت سے مایوس ہوتے ہیں۔

شایان شان بات

ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیت کے حامل لوگوں کے شایان شان ہرگز یہ نہ تھا کہ بے بسی اور مجبوری کی حالت کو مسلمانوں کا مقدر بنا کر پیش کرتے جبکہ روئے زمین پر کم از کم ایک ارب دس کروڑ مسلمان ہیں اور خود ہندوستان میں بائیس کروڑ سے زائد اسلام کے نام لیوا پائے جاتے ہیں اور وسائل اور ذرائع کے طور پر ان کے پاس کیا چیز نہیں ہے؟! موجودہ دنیا کی سب سے ضروری چیز تیل کا خزانہ ان کے پاس ہے۔ اس طرح افرادی قوت کے ساتھ ساتھ دولت دنیا کی فراوانی بھی موجود ہے۔ جو کمی ہے وہ ہے حوصلہ کی، عزم کی، توکل علی اللہ کی اور ایمان و یقین کی۔ اگر ڈاکٹر صاحب مسلمانوں سے کہتے کہ مسلمانو! تم ہمت نہ ہارو اللہ پر بھروسہ کرو تم ایک فیصد نہیں بلکہ فی ہزار ایک کی نسبت سے قربانی دینے کیلئے تیار ہو جاؤ تو تمہارے سروں سے ذلت اور نکبت کے سارے بادل اور ساری گھٹائیں چھٹ جائیں گی تو یہ قرآن کی روشنی میں ایک صحیح اور بجا بات ہوتی۔

مضمون کا ایک تفصیلی جائزہ

ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''تشدد اصلاً ایک غیر اخلاقی عمل ہے اخلاقی اصولوں پر کار بند مہذب سماجی زندگی میں تشدد کی اجازت صرف جرم کی سزاء کے طور پر'' تا کہ جرائم کا سد باب ہو سکے'' اور دفاع کے لئے دی جا سکتی ہے'' تا کہ خود کو دوسروں کے تشدد سے محفوظ رکھا جا سکے'' اس کے علاوہ کسی بھی حال میں تشدد کا استعمال نا روا ہے۔''

تشدد کسی حال میں بھی روا نہیں

ہمارے خیال میں تشدد کسی بھی حال میں روا نہیں ہے کسی جرم کی سزا کے طور پر یا دفاع کے لئے جو عمل کیا جاتا ہے اس کو تشدد کہنا مناسب نہیں ہے۔ تشدد تو ناحق اور بے جا زور اور طاقت استعمال کرنے کو کہتے ہیں جس کو ہر مہذب آدمی ناپسند کرتا ہے۔ جبکہ جرم پر سزا دینا اور اپنا دفاع کرنا صحیح اور حق ہمیشہ اور ہر جگہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ اخلاقی اور قانونی دونوں لحاظ سے جائز سمجھا گیا ہے۔ کسی جرم کی سزا کو بھی تشدد قرار دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری دنیا ہمیشہ تشدد کی قائل رہی ہے اور ہمیشہ تشدد کا ارتکاب کرتی رہی ہے جو خلاف واقعہ اور غیر معقول بات ہے۔

تشدد کیا ہے؟

صحیح جگہ طاقت اور زور استعمال کرنے کو انسانی تاریخ میں نہ کبھی خراب سمجھا گیا ہے اور نہ آج خراب سمجھا جارہا ہے۔ بلکہ بجا اور ضروری سمجھا گیا ہے اور اس کی ستائش کی گئی ہے اور اسلام میں تو اس کو ایمان کی علامت بتایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَإِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ وَذَلِكَ أَضْعَفُ الإِيمَانِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے۔ چاہئے کہ وہ اُسے اپنے ہاتھ سے بدل دے پس اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتا تو چاہئے کہ اسے اپنی زبان سے بدلے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو چاہئے کہ وہ اسے اپنے دل سے برا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ لَا تَعْلَمُونَهُمُ اللَّهُ يَعْلَمُهُمْ. (الانفال:٦٠)

ترجمہ: اور تم لوگ جہاں تک بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کیلئے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعہ اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو اور ان دوسرے دشمنوں کو خوف زدہ کردو جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ انہیں جانتا ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرۃ:١٧٩)

ترجمہ: اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو! تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔

یعنی خون کا بدلہ خون ہے قاتل کو جرم قتل کی وجہ سے قتل کرنے کا جو قانون بنایا گیا ہے اس پر عمل کرنے میں لوگوں کی زندگیوں کی حفاظت ہے جو لوگ انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں وہ عقل وخرد کے خلاف عمل کرتے ہیں اور اپنی آستینوں میں سانپ پالنے کی بے وقوفی کرتے ہیں اور ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔

جہاد تشدد نہیں

قرآن وحدیث کی روشنی میں جرم کی سزا کو تشدد کہنا نہایت غلط اور غیر اسلامی بات ہے درحقیقت مجرم کو جرم سے روکنے کیلئے جو سزا دی جاتی ہے وہ تشدد اور سختی نہیں ہے بلکہ سراسر نرمی اور باعث رحمت وبرکت ہے۔ بہرصورت

تشدد کے جو بھی معنی ہوں ڈاکٹر صاحب کا تشدد کو صرف دو صورتوں میں منحصر بتانا بھی انتہائی غلط ہے اور دین حق کی آمد اور نبی کریم ﷺ کے مقصد بعثت پر کاری ضرب لگانے کے مترادف ہے۔ سورۂ توبہ آیت ۲۹ پر غور کیجئے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُونَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: اور جنگ کروان لوگوں سے جو ایمان نہیں رکھتے اللہ پر اور نہ آخرت پر اور حرام قرار نہیں دیتے ہیں اس کو جس کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام قرار دیا ہے اور نہیں اختیار کرتے دین حق کو ان میں سے جنہیں کتاب دی گئی ہے یہاں تک کہ وہ جزیہ ادا کریں ہاتھ سے چھوٹے بن کر۔

اس آیت میں تین صفات رکھنے والوں سے جزیہ دینے تک جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(۱) اللہ اور آخرت پر یقین نہ رکھتے ہوں۔

(۲) اللہ اور اس کے رسولؐ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہ مانتے ہوں۔

(۳) دین اسلام کو اختیار نہ کرتے ہوں۔

ان صفات کے حامل لوگوں سے جنگ اسی وقت بند ہوگی جبکہ وہ ذلیل بن کر رہنے اور جزیہ ادا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" دین میں زبردستی نہیں ہے۔ یہ تسلیم شدہ چیز ہے لیکن اس کا تعلق صرف عقیدہ کو قبول کرنے اور نہ کرنے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اہل کفر کو ان کے عقیدہ کے ساتھ زمین میں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور ان سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ اگر ایسی بات ہو تو اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا ہے یہ بات کہنے کا کیا مطلب ہوگا؟

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (الصّف:۹)

ترجمہ: وہ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تا کہ وہ دین کو سب دینوں پر غالب کردے خواہ مشرکین ناپسند کریں۔

پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوگا اور ہاں فرضیت جہاد کے اندر کیا معنویت باقی رہے گی؟! نبی ﷺ کا معمول تھا کہ جب کسی مہم پر لشکر کو روانہ فرماتے تو کچھ ہدایات اور نصیحتیں فرماتے۔ ان میں یہ بات ہوتی کہ

کافروں سے اللہ کا نام لے کر جنگ کرو اور جنگ شروع کرنے سے پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کریں تو فلاں فلاں حقوق و واجبات سے آگاہ کرو اور اگر دعوت قبول نہ کریں تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو اور مسلمانوں کی ماتحتی قبول کرنے کو کہو اور اگر اس کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں تو ان سے لڑو۔ یہی معمول خلفاء راشدین اور بعد کے خلفاء کا بھی تھا۔ پوری اسلامی تاریخ اس سے بھری پڑی ہے۔ مسلمانوں کی لشکر کشی کے واقعات مشہور و معروف ہیں آپ کہاں تک صفائی پیش کریں گے اور کہاں تک تاویل کریں گے!

اُمت مسلمہ کا فرض منصبی

جس طرح اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا واجب اور فرض ہے اسی طرح ادیان باطلہ پر اسلام کو غالب کرنے اور اہل کفر و شرک کو ماتحت اور زیر نگیں بنانے کی جدوجہد کرنی بھی فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری شہادت حق اور اظہار دین کے عنوان سے مسلمانوں پر ڈالی ہے وہ صرف وعظ و نصیحت اور دعوت و تبلیغ سے ادا ہونے والی نہیں ہے ورنہ غزوات و سرایا کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورے کا پورے اللہ کیلئے ہوجائے۔

دین کو غالب کرنے اور بدیوں کے سرچشموں کو بند کرنے کے لئے جہاد فرض کیا گیا ہے اسی کام کی اہمیت کے پیش نظر جہاد فی سبیل اللہ کے فضائل قرآن واحادیث میں بتائے گئے اور اسی لئے تمام کفار سے جنگ کرنے کا حکم صاف اور صریح لفظوں میں دیا گیا ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو جیسا کہ وہ سب ملکر تم سے جنگ کرتے ہیں۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

(البقرۃ:۲۱٦)

ترجمہ: تم پر جنگ فرض کردی گئی ہے اور وہ تمہارے لئے ناگوار ہے ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

غلبۂ دین کا فریضہ خود یہ تقاضہ کرتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے پہل کرنے کا انتظار نہ کریں وہ خود پہل کریں اسی بات کو فقہ میں یوں کہا گیا ہے۔

قتال الکفار واجب وان لم یبدأونا

ترجمہ: کفار سے جنگ واجب ہے چاہے وہ ہمارے ساتھ پہل نہ کریں۔

تعجب ہے جولوگ غلبۂ دین اور اقامت دین کو سب سے بڑا دینی فریضہ قرار دیتے ہیں ان کی حلق کے نیچے یہ بات نہیں جاتی اور قرآن کی صاف اور صریح آیات اور احادیث شریفہ کی تاویل کرتے ہیں اور سرے سے قرآن وسنت سے ثابت شدہ فریضہ کا انکار کرتے ہیں اگر وہ یہ کہتے کہ یہ سب تسلیم ہے۔لیکن ہمارے اندر اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے استطاعت نہیں ہے تو کسی قدر معقول بات ہوسکتی تھی لیکن یہ لوگ جہاد، کو دفاع کو اور دشمن سے انتقام لینے ہی کو متنازعہ فیہ مسئلہ بنا کر پیش کرتے ہیں اور پھر عدم جواز پر دلائل لانے کی کوشش کرتے ہیں اس طرز فکر وعمل کو نہ معقول کہا جاسکتا ہے اور نہ جائز۔

اس مسئلہ کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص بیمار اور کمزور ہے پانی استعمال کرنے کی سکت نہیں رکھتا تو اس کے لئے معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ تیمم کے لئے اپنی بیماری اور معذوری کو وجہ بتائے۔لیکن اگر وہ حکم وضو ہی کو متنازعہ فیہ بنانے کی کوشش کرے اور کہے کہ صاحب وضو کا مکی آیات میں کہیں ذکر نہیں ملتا۔مکہ میں ۱۳ سال تک مسلمان وضو کیسے کرتے تھے۔ان کی تفاصیل ہمیں کہیں نہیں ملتیں۔اس لئے حالات کے تناظر میں بہت کچھ گنجائش ہے وضو وضو کی رٹ نہ لگاؤ۔

غلط طرز استدلال

الغرض ڈاکٹر صاحب نے دشمنان دین وملت سے نمٹنے کے مسئلہ پر جس طرح بحث کی ہے اس طرز استدلال کی رو سے دین کا کوئی فریضہ بھی اپنی اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتا۔حتیٰ کہ نماز بھی اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ نماز کی موجودہ شکل شروع میں نہیں تھی کئی مرحلوں سے گزرتے ہوئے نماز اس شکل میں پہنچی ہے تو کیا ابتدائی اور درمیانی شکلوں کو زیر بحث لاکر نماز کو کوئی شخص متنازعہ فیہ بنانے کی کوشش کرے تو اس کو معقول و جائز کہا جاسکتا ہے!؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ نے ۱۳ سال تک جمعہ نہیں پڑھا۔اذان اور اقامت نہیں کہی۔باجماعت نماز کا اہتمام نہیں کیا۔کعبۃ اللہ کو ۱۴ سال تک قبلہ نہیں بنایا۔طویل عرصہ تک نماز میں سلام اور کلام سب چلتا تھا۔۱۳ سال تک شراب اور سود حلال سمجھے گئے۔

اگر کوئی سوال کرے آخر ان سب چیزوں کی گنجائش کیوں ختم ہوگئی جبکہ ہم بھی اسی طرح کمزور اور غیروں کے تحت ہیں جس طرح مکہ میں مسلمان تھے جب یہ سب گنجائشیں ان کے لئے تھیں تو ہمارے لئے کیوں نہیں ہیں؟؟

ڈاکٹر صاحب اس سوال کا جو جواب دیں گے وہی جواب ہمارا بھی ہوگا۔ اس سوال کے جواب میں جو انہوں نے آج مسلمانوں کی کمزوری اور اقتدار سے محرومی کے حوالے سے دفاعی ذمہ داریوں کے ضمن میں اٹھایا ہے۔

ایک بے موقع بات

ایک ذیلی ہیڈنگ ''تشدد اور اخلاق'' کے تحت ڈاکٹر صاحب نے یہ بتانے کی کوشش فرمائی ہے کہ اسلام تشدد کا نہیں اخلاق کا مظہر ہے۔ اسلام رحمت، شفقت، رواداری، نرم روی اور عفو و درگذر پر مبنی دین ہے۔ اس کی دلیل میں کئی آیات قرآنی اور احادیث درج کی ہیں۔ اگرچہ کہ قدرے سختی کا بھی اعتراف کیا ہے لیکن ''خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ'' جیسی آیات پیش کر کے تشدد کی تقریباً نفی کی ہے اور نرم روی کو دین کی اصل بتایا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت پوری روئے زمین پر امریکہ اور اس کے حلیفوں کی چیرہ دستیوں اور سفاکیوں کا افغانستان، عراق اور فلسطین میں جو منظر ساری دنیا نے دیکھا ہے اور ہندوتوا کا نعرہ لگانے والوں نے جو کارنامے گجرات میں انجام دیئے ہیں اس پس منظر میں مسلمانوں کو اخلاق کا سبق پڑھانے کا کونسا موقع تھا؟!

جبکہ اس آسمان کے نیچے اور زمین پر بے در اور بے گھر ہو کر کیمپوں میں زندگی گذارنے والوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیلوں میں انسانیت سوز اذیتوں کا سامنا کرنیوالے اکثر مسلمان ہیں۔ لا پتہ ہونے والوں میں مسلمانوں کے نام سرفہرست ہیں۔ اپنی جنم بھومی سے بے دخل کئے جانے والوں کا سروے کیا جائے تو مسلمان سب سے زیادہ ملیں گے۔ حقوق انسانی کی پامالی کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ستم کا شکار ہونے والے بڑی تعداد میں مسلمان ہیں۔ اجتماعی طور پر عورتوں کی عصمت دری آج کی مہذب دنیا میں اگر کہیں کی گئی ہے تو وہ مسلمان عورتیں ہیں، زندہ آباد بستیوں پر بلڈوزر چلائے جانے کی اگر تاریخ لکھی جائے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلمانوں کی آبادیاں ہیں۔ خواتین کے پیٹ چاک کرنے کے واقعات کی لسٹ بنائی جائے تو اس لسٹ میں خالدہ اور ناصرہ جیسے نام نظر آئیں گے۔ آخر وہ وقت کب آئے گا جب ہمارے پتھر دل نرم ہوں گے اور امت مسلمہ کی مظلومیت کی کسک محسوس کریں گے! کیا اس وعظ کی مثال بالکل ایسے ہی نہیں ہے جیسے ڈاکوؤں کی ایک مسلح ٹولی کسی غریب کے گھر پر دھاوا بول رہی ہو اور گھر کے نہتے مکینوں کی جان کے لالے پڑے ہوں اور آپ ڈاکوؤں کو روکنے کی کوئی تدبیر اختیار کرنے یا ان کو سرزنش اور فہمائش کرنے کے بجائے گھر والوں کے سامنے عفو درگذر کے عنوان پر وعظ فرمانے لگیں۔

افراط وتفریط کی مثال

اور وہ بھی ایسا وعظ جو افراط وتفریط پر مبنی ہو اور صحیح اسلامی فکر اور اسپرٹ کے خلاف ہو۔ اسلام نے جہاں یہ کہا کہ جس نفس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے اسے قتل نہ کرو۔ وہاں پر "اِلَّا بِالْحَقِّ" کی قید لگائی ہے۔ اسی طرح جہاں یہ کہا گیا کہ جس نے ایک جان کو قتل کیا وہاں "بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ" کا استثنیٰ بھی کر دیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نہیں کہا گیا کہ کسی جان کو کسی حال میں بھی قتل نہ کرو۔ اگر ایسا کہا جاتا تو یہ تعلیم کا نقص ہوتا، عدل نہ ہوتا، بلکہ ظلم کے ہم معنی ہوتا۔ یہ نقص کسی انسانی تعلیم اور قانون میں تو ہوسکتا ہے مگر خدائی قانون میں اس طرح کے نقص کا ہونا ناممکن تھا۔ اسی لئے صاف طریقے سے بتا دیا گیا کہ انسانی خون کی حرمت اسی وقت تک ہے جب تک اس پر حق نہ قائم ہوجائے یعنی کسی کو زندہ رہنے کا حق صرف اس کی جائز حدود کے اندر دیا جاسکتا ہے۔ مگر جب وہ ان حدود سے تجاوز کر کے فتنہ وفساد پھیلائے یا دوسروں کی جان پر ناحق حملہ کرے تو وہ اپنے زندہ رہنے کے حق کو خود بخود کھو دیتا ہے اور اس کے خون کی حرمت زائل ہو کر حلت سے بدل جاتی ہے اور پھر اس کی موت ہی انسانیت کی حیات کی ضامن ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا "اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" یعنی قتل بری چیز ہے مگر اس سے زیادہ بری چیز فتنہ وفساد ہے جب کوئی شخص اس بڑے جرم کا مرتکب ہو تو اس کی اس بڑی برائی کا خاتمہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ اسی حقیقت کو اس دور کے ایک بڑے مفکر اور تحریک اسلامی کے داعی سید مودودیؒ نے نہایت ہی جامع مانع اور مختصر لفظوں میں یوں پیش کیا ہے۔

> "قتل بغیر حق کی ایسی سخت ممانعت اور قتل بالحق کی ایسی سخت تاکید کر کے شریعت الٰہیہ نے افراط وتفریط کی دو راہوں کے درمیان عدل وتوسط کی سیدھی راہ کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔"

"خُذِ الْعَفْوَ (الاعراف:۱۹۹)، لَآ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (البقرہ:۲۵۶) اور لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ (حم السجدہ:۳۴،۳۵) کے ساتھ ساتھ سورۃ التوبہ آیت ۴۳، سورۃ الانفال آیت ۴۷، سورۂ محمد آیت ۴ کو بھی نظر میں اگر رکھا جاتا تو مناسب ہوتا۔ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کسی ایک رخ پر بہہ جانا اور اس کے خلاف رخ کو بالکل نظر انداز کر دینا، کوئی علمی انداز بحث نہیں ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب علمی طریقہ اختیار فرماتے تو ہرگز یکطرفہ بات نہ کرتے اور افراط و تفریط سے بچ جاتے اور انہیں کہنا پڑتا کہ اسلام میں جہاں نرم روی ہے وہیں سخت گیری بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ جیسے غفور رحیم ہے ویسے ہی شَدِیْدُ الْعِقَابِ اور شَدِیْدُ الْعَذَابِ بھی ہے اور اللہ کے بندے اگر رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ ہیں تو اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ بھی ہیں۔ حسب ذیل آیات پر غور کیجئے ان سے ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی ژولیدگی اور حقیقت سے دوری کھل کر سامنے آجائے گی۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جٰهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التوبۃ:۷۳)

ترجمہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (الانفال:۶۷)

ترجمہ: کسی نبی کیلئے یہ زیب نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں۔ جب تک کہ وہ زمین میں دشمنوں کو اچھی طرح کچل نہ دے تم لوگ دنیا کے فائدے چاہتے ہو اور اللہ کے پیش نظر آخرت ہے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

فَإِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتّٰى إِذَا أَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا. (سورۂ محمد:۴)

ترجمہ: پس جب ان کافروں سے مڈبھیڑ ہو تمہاری تو پہلا کام گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ جب تم ان کو اچھی طرح کچل دو۔ تب قیدیوں کو مضبوط باندھو۔ اس کے بعد احسان کرو یا فدیہ کا معاملہ کرو تا آنکہ لڑائی اپنا ہتھیار ڈال دے۔

ان آیات میں دین کا جو پہلو اجاگر کیا گیا ہے اس کو نظر انداز کر دینے کے لئے کون سی چیز لوگوں کو آمادہ کر دے رہی ہے خدا ہی کو معلوم ہے!

گمراہی کی بات

ایک پُرفریب ذیلی ہیڈنگ ''قتال کی اجازت'' کے ذیل میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں صحت اور اعتدال کی راہ چھوٹ گئی ہے بلکہ زبردست گمراہی کی بات کہی گئی ہے۔ یہ ہیڈنگ لگا کر یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اصل تو یہ ہابیل کا نمونہ ہے جس پر عمل ہونا چاہئے مگر قتال کی اجازت بھی ہے۔ اجازت کا مطلب ہے کرو یا نہ کرو تمہیں اختیار ہے نا کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ حالانکہ قتال فرض ہے اور ترک فرض پر گرفت اور مواخذہ ضرور ہوگا ورنہ فرض کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے۔ یہ فرضیت صیغۂ امر ''قَاتِلُوْا'' کے ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے اور دوسرے طریقہ سے بھی جیسا کہ قرآن میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَ عَسَى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ عَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ.

(البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تم پر جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لئے ناپسندیدہ ہے اور ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو پسند ہو اور وہ تمہارے لئے بری ہو اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

حدیث میں ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصموا منی دمائھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللّٰہ تعالٰی (مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ پس جب وہ اس کو کہیں گے تو مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال کو بچا لیں گے مگر ان کے حق کے ساتھ اور ان کا حساب اللہ تعالٰی پر ہے۔

فقہ میں ہے:

اعلم ان جھاد الکفار فی بلادھم فرض کفایۃ باتفاق العلماء

ترجمہ: جان لو بلاشبہ کفار سے جہاد ان کے ملکوں میں فرض کفایہ ہے باتفاق علماء

وحکی عن ابن المسیب وابن شبرمۃ أنہ فرض عین

ترجمہ: اور ابن المسیّب اور ابن شبرمہ سے حکایت ہے کہ جہاد فرض عین ہے۔

ومعنی فرض الکفایۃ انہ اذا قام بہ من فیہ کفایۃ سقط الحرج والاثم عن الباقین فان ترک الجمیع اثموا۔ (مشارق الاشواق، جلداول، ص:۹۸)

ترجمہ: اور فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ جب اس کو اتنے لوگ انجام دیں جو کافی ہوں تو جرم اور گناہ بقیہ لوگوں سے ساقط ہوجائیگا اور اگر سب لوگ جہاد چھوڑ دیں تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔

ایمان کی کسوٹی

جہاد سے جی چرانے والوں کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں برے انجام کی وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ آخرت میں جہنم اور دنیا میں ذلت اور نکبت کی خبر دی گئی ہے۔ جہاد کو ایمان کی کسوٹی بتایا ہے۔ گویا جہاد اور جذبۂ جہاد کے بغیر ایمان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (الحجرات:۱۵)

ترجمہ: حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہی سچے لوگ ہیں۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

ومن مات ولم يغز ولم يحدث نفسه بالغزو مات على شعبة من النفاق۔
(رواہ مسلم)

ترجمہ: اور جو شخص مرجائے اور اس نے جنگ نہ کی ہو اور نہ اپنے دل میں جنگ کے متعلق سوچا ہو تو وہ نفاق کے شعبہ پر مرا۔

اسی کے ساتھ نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ جہاد کے مقاصد میں سب سے اہم مقصد اہل باطل اور اعداء دین کی قوتوں کو توڑ کر اسلام کو غالب کرنا اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے راستے میں جنگ کون کرتا ہے تو آپ نے فرمایا:

هو من قاتل لتكون كلمة الله هي العليا ولا يقاتل رياء ولا سمعة

ترجمہ: وہ وہ ہے جس نے جنگ کیا تا کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو اور دکھاوے اور شہرت کیلئے نہ لڑتا ہو۔

یعنی فی سبیل اللہ جنگ اس کی ہوگی جو اس لئے لڑے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، دکھاوے اور شہرت کے لئے نہ لڑے۔ جہاد کو محض جائز قرار دینے سے اس مقصد کی نفی ہو رہی تھی لیکن دبے لفظوں میں ہو رہی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے صاف صاف لفظوں میں اس کو یوں ظاہر کر دیا۔

اسلام کی عام پالیسی

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

''ایک عام پالیسی کے طور پر اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی ہمت افزائی کرے بلکہ وہ اسے بہتر سمجھتا ہے کہ آئندہ تشدد کے سد باب کی تدابیر اختیار کی جائیں اور جو کچھ ہو گیا اس کے سلسلہ میں عفو و درگذر سے کام لیا جائے۔''

اب دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا إِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ. (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: پس تم پر جو دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِکِیْنَ کَآفَّۃً کَمَا یُقَاتِلُوْنَکُمْ کَآفَّۃً. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے تم سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ إِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَی الْاَرْضِ...اِلَّا تَنْفِرُوْا یُعَذِّبْکُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا وَّیَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ.
(التوبۃ:۳۸-۳۹)

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کے لئے کہا گیا تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے.... اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لا دے گا۔

وَمَا لَکُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ ھٰذِہِ الْقَرْیَۃِ الظَّالِمِ اَھْلُھَا.
(النساء:۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پا کر دبا دیئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور ترغیب بھی۔ نیز جنگ سے جی چرانے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن میں جنگ میں جان کی بازی لگانے والوں کے لئے مغفرت کی اور جنت کی اور فتح و کامرانی

کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا انہیں کو حقیقی زندگی حاصل ہے بتایا گیا۔ جہاد وقتال کو فرض بتایا گیا اور کہا گیا ہے کہ بظاہر ناپسندیدہ ہے لیکن حقیقت میں وہ تمہارے لئے باعث خیر ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کے درجات علیا اور اجر وثواب کا ذکر جس انداز میں اور جس کثرت سے کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ تشدد کا جواب تشدد سے دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بات بالکل ایسی ہے کہ کوئی دانشور بھری مجلس میں پورے زور سے کہے کہ قرآن میں جہاد وقتال کا لفظ نہیں آیا ہے اور جنگ بدر وحنین اور جنگ احد اور خندق نام کا کوئی معرکہ کبھی پیش نہیں آیا ہے۔

جہاد وقتال سے متعلق درجنوں آیات قرآنی، سینکڑوں فقہی اوراق کتب اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کو نظر انداز کرتے ہوئے قرآن کے دو مقامات کو اپنی بات کی تائید میں ڈاکٹر صاحب نے پیش کیا ہے۔ آیئے ان پر غور کریں۔

قرآن کے دو مقامات پر غور

موصوف نے سورۂ شوریٰ آیات ۴۰ تا ۴۳ پر غور کرنے کی دعوت دی۔ حالانکہ ۳۷ تا ۴۳ آیات پر غور کرنا چاہئے۔ اس لئے کہ ایک گروپ یا یہ کہا جائے کہ ایک مضمون کی یہ آیات ہیں۔ اس گروپ کی ۳۹ نمبرویں آیت پر پہلے مولانا مودودیؒ کا نوٹ پڑھئے:

> ''یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات سے ہے وہ ظالموں اور جباروں کے لئے نرم چارہ نہیں ہوتے ان کی نرم خوئی اور عفو ودرگذر کی عادت کمزوری کی بناء پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں۔ جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو اس سے چشم پوشی کرجائیں لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور منکر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لے گا۔''

ظاہر ہے آیت نمبر ۳۹ ڈاکٹر صاحب کے مدعا کے خلاف ہے غالباً اسی بناء پر اس پر غور کرنے کی دعوت نہیں دی یا اس لئے کہ وہ اپنے مفہوم میں واضح ہے جو کچھ بھی ہو۔ آیئے ان آیات پر غور کریں۔

ایک تفسیری اشکال

ان سات آیات میں غور طلب بات یہ ہے کہ ایک جگہ ''هُمْ يَغْفِرُوْنَ'' یعنی وہ معاف کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ''اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ'' یعنی جب ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ تیسری جگہ ''فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ'' کہا گیا۔ یعنی پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان باتوں میں باہمی ربط اور تعلق کیا ہے۔ بظاہر دو متضاد صفتوں کا حامل مسلمانوں کو بتایا ہے۔ ایک طرف کہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاف کرنے کی صفت پائی جاتی ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہا جارہا ہے کہ وہ مقابلہ کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟! اس اشکال کو مختلف مفسرین نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

صاحب روح المعانیؒ کا جواب

صاحب روح المعانیؒ نے کہا:

''کئی لوگوں نے کہا ہے ہر صفت کے ظاہر ہونے کا ایک موقع ہے جس میں وہ قابل تعریف ہوتی ہے پس درگزر کی صفت اس وقت قابل تعریف اور محمود ہوتی ہے جب معافی اور درگزر ایسے شخص سے کیا جائے جو کمزور ہو اور اسے اپنے جرم کا اعتراف ہو۔ لفظ ''يَغْفِرُوْنَ'' سے اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اور انتقام اور مقابلہ اس وقت محمود ہوتا ہے جب سامنے والا دشمنی اور مخاصمت پر اصرار کر رہا ہو اور لفظ ''يَنْتَصِرُوْنَ'' اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگر اس کے برعکس درگزر اور انتقام کا عمل کیا جائے تو دونوں مذموم ہیں۔''

اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے علامہ نے عربی کے دو شعر پیش کئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم کسی شریف کی عزت کرو گے تو وہ تمہارا گرویدہ ہوجائے گا اور جب کسی کمینہ کا اکرام کرو گے تو وہ اپنی کمینگی میں اور بڑھ جائے گا۔ تلوار کی جگہ شبنم اور شبنم کی جگہ تلوار رکھنا مضر ہے۔

امام رازیؒ کا جواب

امام رازیؒ نے اس شبہ کو یوں دور کیا ہے:

''عفو و درگزر کی دو قسمیں ہیں ایک عفو درگزر وہ ہے جس سے فتنہ دب جائے اور جو مجرم کے لئے سزا ثابت ہو اور وہ اپنے جرم سے باز آجائے۔ دوسرا عفو و درگزر وہ ہے جس سے مجرم کی جرأت میں اضافہ ہوجائے اور اس کے غیظ و غضب کو شہ ملے۔ عفو و درگزر سے متعلق آیات میں پہلی قسم کے درگزر کی تعریف کی گئی اور اس کو

مسلمانوں کی صفت بتائی گئی ہے اور جہاں عفو درگزر سے جرم پر جرأت بڑھ جانے کا امکان ہو وہاں عفو درگزر کے بجائے مومنانہ صفت انتقام لینے کو بتایا گیا ہے۔''

مفتی شفیعؒ کا جواب

اس کی مزید وضاحت کے لئے تفسیر معارف القرآن کے یہ الفاظ پڑھئے:

''حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومنین اپنے آپ کو فساق وفجار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساق وفجار کی جرأت بڑھے گی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا اور معافی کا افضل ہونا اس صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر نادم ہو اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابوبکر ابن عربیؒ نے احکام القرآن میں اور قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو وانتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں جو ظلم کرنے کے بعد شرمندہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی ضد اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا جواب

مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب نے آیت ۴۱ کے فقرہ ''وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ'' پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضا یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین پر سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔''

دوسرا اشکال

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے ہابیل کے رویہ کو بھی پیش کیا ہے جس نے قابیل سے کہا تھا تم اگر چہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ ''مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ''۔

یہاں بھی ایک اشکال ہے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں دفاع کی وہ حیثیت نہیں ہے جو

شریعت عیسوی میں تھی جیسا کہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو تمہارے ایک گال پر مارے اسے تم اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ اس کے برخلاف حضرت ابوھریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے ایک شخص آتا ہے اور میرا مال چھین لینا چاہتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ پھر اس آدمی نے کہا اگر وہ مجھ سے جنگ کرلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم اس سے جنگ کرو۔ اس آدمی نے کہا۔ آپ کا کیا خیال ہے اگر وہ مجھے قتل کر دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم شہید ہو گئے۔ پھر اس آدمی نے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس کو قتل کر دوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: وہ دوزخ میں جائے گا۔ (الجنایات۔مشکوۃ)

مشہور حدیث

مَنۡ قُتِلَ دُوۡنَ مَالِهٖ و عِرۡضِهٖ فَهُوَ شَهِيۡدٌ

ترجمہ: جو اپنے مال اور عزت کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

دفاع کے سلسلہ میں اس طرح کی تعلیم کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہابیل نے کیوں کہا کہ میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔

اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ ہابیل کی بات وعظ اور نصیحت پر محمول کی جائے کہ اس طرح کی بات سن کر قابیل کو کچھ تو احساس ہوگا کہ مجھے اپنے مخلص بھائی پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہئے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ بہ نیت قتل ہاتھ نہ اٹھانے کی بات ہابیل نے کہی تھی۔ مطلق دفاع نہ کرنے کی بات نہیں تھی۔ ایک تیسرا جواب حضرت مجاہدؒ نے دیا ہے کہ ممکن ہے اس وقت کی شریعت میں دفاع جائز نہ رہا ہو۔ ان حقائق کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب کی بات کتنی غلط اور دین کی روح مسخ کرنے والی ہے۔

استعمال قوت کی حد

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> ''تشدد کا استعمال جرائم کی سزا کے طور پر ہو یا اسلام و مسلمانوں کی بقاء وتحفظ اور انسانی حق واختیار کی بحالی کیلئے۔ قتال وتشدد اس حد تک روا ہے جتنا اس کام کیلئے ضروری ہے ورنہ وہ عدوان یا اعتداء کی تعریف میں آجائے گا جس سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔'' (صفحہ ۲۹)

دیکھئے ''بقاوتحفظ اور انسانی حق اختیار کی بحالی'' تک قوت استعمال کرنے اور قتال کو محدود کر دیا گیا جبکہ قتال کی سب سے بڑی غرض فتنہ کو ختم کرنا اور دین اللہ کو کارفرما قوت بنانا ہے۔ یہ ایک طرح سے دیکھا جائے تو

فلسفۂ جہاد کی شہ رگ کو کاٹ دیا گیا ہے اور غلبۂ اسلام کی غرض سے جہاد و قتال کو اعتداء اور عدوان کہا گیا ہے۔ اس سے سختی کے ساتھ منع کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ میں پورے یقین اور وثوق سے کہتا ہوں کہ بغرض ''اعلاء کلمۃ اللہ'' قتال کو نہ کہیں اِعْتِدَاء اور عُدْوَان کہا گیا ہے اور نہ اس سے منع کیا گیا ہے اس کے برخلاف اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے جہاد و قتال کا نہ صرف حکم دیا گیا ہے بلکہ اس کے لئے ترغیب اور تحریض اور تبشیر کتاب و سنت میں ایک ایسی عام بات ہے جو ناخواندہ مسلمان بھی جانتا ہے لیکن عصر حاضر کے دانشور اس کو جھٹلانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اتنی غلط اور خلاف واقعہ بات کہنے کی وجہ سورۃ البقرہ کی آیات ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳ سے سرسری طور پر گزر جانا ہے۔ اس موقع پر تھوڑی وضاحت کر دی جائے تو مناسب رہے گا۔

ایک ضروری وضاحت

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ○ (البقرۃ:۱۹۰)

سرسری طور پر اس آیت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں صرف ان سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور جنگ نہ کرنے والوں سے جنگ کرنے کو اعتداء ''زیادتی'' کہا گیا ہے اور اس سے منع کیا گیا ہے۔

اس آیت کو بعض لوگوں نے منسوخ مانا ہے۔ اس لئے کہ متعدد آیات مثلاً سورۂ بقرہ ۱۹۳، سورۂ انفال ۳۹، سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۹ وغیرہ سے ثابت ہے کہ جہاد کے سلسلے میں آخری حکم جو دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تمام مشرکین سے جہاد کرنا فرض ہے لیکن بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے اور ''لَا تَعْتَدُوْا'' کے معنی وہ نہیں ہیں جو بادی النظر میں سمجھ میں آتے ہیں بلکہ ''لَا تَعْتَدُوْا'' کے الفاظ میں یہ کہا گیا ہے کہ حرم کے اندر جنگ کرنے میں پہل نہ کرو۔ اگر تم پہل کرو گے تو یہ اعتداء ہوگا۔ یا یہ کہا جائے کہ یہاں اہل معاہدہ سے جنگ کرنے کے ذریعے اعتداء نہ کرو، یا یہ کہ دعوت دیئے بغیر جنگ نہ کرو، یا یہ کہ عورتوں اور بچوں کو جنگ میں قتل نہ کرو۔ غرض یہ کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے قتال کو کسی نے بھی اعتداء اور عدوان نہیں کہا ہے۔ اسی بناء پر ''لَا تَعْتَدُوْا'' کو یہاں منسوخ مانا گیا ہے یا اسکی ایسی شکل بتائی گئی ہے جس سے اعلاء کلمۃ اللہ کیلئے حکم قتال سے تعارض نہ ہو۔

غیر قرآنی دعوتی مصلحت

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

''بات صرف اتنی نہیں ہے کہ ہم پر جو تشدد ہوا اور ہو رہا ہے اس کے جواب میں تشدد کا طریقہ اختیار کرنا ہمارے لئے جائز نہ ہوگا یہ بات بھی سامنے رکھنے کی ہے کہ ایسا کرنے سے ہمارے دعوتی کام کو اور شہادت علی الناس کے مشن کو مدد ملے گی یا اسے صدمہ پہنچے گا۔''

اس میں شک نہیں کہ یہ خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ دعوتی مشن کو کسی طرح صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان کی مدد اس خیال سے نہ کی جائے کہ ہمارے مدعوئین پر برا اثر پڑے گا یا کسی مسلم خاتون کی عصمت ریزی پر خاموشی اختیار کر لی جائے تا کہ ہمارے مدعوئین ناراض نہ ہو جائیں۔ یا شعائر اللہ کی بے حرمتی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور چوں نہ کریں تا کہ دعوت کے مواقع باقی رہیں اس کے لئے کتاب وسنت سے دلیل لانی پڑے گی۔ ایسا تو نہیں کہ دعوتی مشن کو صدمہ سے بچانے کا نکتہ اپنے او پر عائد ہونے والے فرائض کو ادا نہ کرنے کے لئے بہانہ ہے جو شیطان نے ہمیں سجھایا ہے اور اپنی بزدلی اور بے غیرتی پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ وسوسہ کوئی نیا وسوسہ نہیں ہے دور اول میں بھی کچھ لوگوں کے اندر پیدا ہو رہا تھا غالباً اسی بناء پر مسلمانوں کو پوری طرح یکسو کر دیا گیا اور یہ صاف صاف بتا دیا گیا کہ اعداء دین تم سے کبھی بھی خوش اور راضی نہیں ہو سکتے اور نہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آ سکتے ہیں۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰)

ترجمہ: یہود اور انصاریٰ تم سے کبھی بھی خوش نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ تم ان کے طریقے کی اتباع کرو۔

لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا۔ (البقرہ:۲۱۷)

ترجمہ: وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔

دشمنانِ اسلام کو راضی اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرنے کی تعلیم اور ہدایت ہمیں کہیں نہیں ملتی بلکہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنے او پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ادا کرو، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو، حالات جو کچھ بھی ہوں ہر حالت میں تقویٰ کی روش اختیار کرو اللہ کے ذکر سے غافل نہ رہو، راہ راست پر کسی کو لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ تم اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دو۔

نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر حسن سلوک کرنے والا اور صبر کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ کی نرم روی اور خوش اخلاقی دعوت کے مواقع کو محفوظ نہ رکھ سکی یہاں تک کہ بالآخر آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ تشریف لائے پھر جنگوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مدعوئین کی کسی حرکت کی

اطلاع ملتے ہی کوئی نہ کوئی دستہ متحرک ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ خاموش بیٹھو ورنہ تمہارے مدعوئیں بدظن ہوجائیں گے اور دعوتی مشن کو صدمہ پہنچ جائے گا۔

دو واقعے

رجب ۲ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ مکہ اور طائف کے علاقے میں مدعوئین کی نقل وحرکت اور ان کے عزائم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ اس دستہ کو قریش کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا اس کو انہوں نے پکڑ لیا ان میں سے ایک کو قتل کر دیا اور بقیہ کو گرفتار کر کے مدینہ لائے۔ یہ واقعہ رجب کے آخر میں یا شعبان کے شروع میں پیش آیا۔ مدعوئین نے پروپگنڈہ شروع کر دیا کہ مسلمان ماہ حرام کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اس موقعہ پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ نازل ہوئی جس میں مدعوئین کے طرز عمل پر نکیر کی گئی کہ تم کس منہ سے مسلمانوں کے خلاف بول رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو اور مسلمانوں سے کہا کہ تم سادہ لوحی سے کام نہ لو اور ان کے اعتراضات سے متاثر نہ ہو یہ تو ہمیشہ اسی کوشش میں رہیں گے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تمہیں راہ راست سے بھٹکا دیں۔ مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اپنے ہاتھوں دعوت کے مواقع کیوں ضائع کر رہے ہو۔

شوال ۲ھ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان انصاریہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا، یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا، اس معاملہ نے طول پکڑا، مسلمانوں نے یہودیوں کے قلعہ کا پندرہ دن تک محاصرہ کئے رکھا۔ پھر پورے قبیلہ کو جلاوطن کر دیا گیا۔ قرآن میں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں۔

مسلمانو! تم دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں کمزور نہ پڑ جاؤ۔ وہ اپنے لئے نرمی کے بجائے تمہارے اندر سختی پائیں۔ تم ان کی طرف نہ جھکو۔ ہوشیار رہو تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کی وجہ سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ تم ان پر رعب ڈالنے کی کوشش میں رہو۔ الغرض مدعوئین کو مسلمانوں کے بارے میں خوش گمان رکھنے کی کوشش میں نہ تو غیرت اور ایمانی تقاضے کو پورا کرنے سے رکنے کی تعلیم دی گئی اور نہ اپنے کو سیدھا سادہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہدایت دی گئی ہے بلکہ کڑک بن کر رہنے کی بات کہی گئی تاکہ ان کی جرأتیں نہ بڑھ جائیں۔

تشدد اور دہشت گردی

اس ہیڈنگ کے تحت ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ

"جمی جمائی، مستحکم حکومتوں کے خلاف جب بھی کوئی کارروائی کی جائے گی لازماً وہ کام کرنے پڑیں گے جن

سے اسلام میں منع کیا گیا اور انہیں ان خارزاروں سے گزرنا پڑے گا جن میں قدم رکھنے سے مسلمانوں کو منع کیا گیا ہے۔ مثلاً محارب اور غیر محارب میں تمیز نہیں کی جا سکے گی، مقابل کی عورت بچے، بوڑھے اور معذور بھی مارے جائیں گے۔ مال اور املاک تلف ہوں گے، درخت وغیرہ کاٹے جائیں گے۔ آبادزمین کی ویرانی بھی ہوسکتی ہے جبکہ اسلام میں ان باتوں سے منع کیا گیا اور ان کو فساد فی الارض کہا گیا ہے۔ اسلام میں جن باتوں سے منع کیا گیا ہے ان کو لازماً اس لئے کرنا پڑے گا کہ حکومتوں کے پاس مسلح پولیس اور فوج ہوتی ہے جس کے خلاف راست کارروائی کرنا ممکن نہیں، ان کے پاس اسلحے ہوتے ہیں اور کارروائی کرنے والوں کے پاس معمولی اسلحے بھی نہیں ہوتے چہ جائے کہ حکومتوں کے برابر اسلحے ہوں۔ ان وجوہ کی بناء پر کارروائی کرنے والے مجبور ہیں کہ وہ خفیہ عمل کا طریقہ کار اختیار کریں اور جب اور جہاں موقع مل جائے اس کو دشمن کو صدمہ پہنچانے کے لئے استعمال کریں۔ اس بناء پر ان آداب کی پابندی نہیں کر سکتے جن کا اسلام پابند بناتا ہے۔

لہٰذا ریاستی تشدد اور دہشت گردی کے جواب میں جب بھی قوت استعمال کی جائے گی وہ لازماً ایسی دہشت گردی اور فساد فی الارض کی شکل اختیار کرے گی جو اسلام میں ممنوع ہے اس لئے گزشتہ بیس برسوں میں دنیا کے مختلف علاقوں میں کچھ مسلمان گروہوں کی طرف سے اپنی حکومتوں کے خلاف یا امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس وغیرہ کے خلاف کی جانے والی کارروائیاں اسلام کی مقرر کردہ حدود سے صریح تجاوز پر مبنی تھیں۔''

سطحی استدلال

ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال سطحیت اور کم نظری پر مبنی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ دعوت وتبلیغ ایک اہم فریضہ ہے مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس زمانے میں اس فریضہ کو ادا کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس زمانہ میں عام طور پر لوگ صحیح باتیں سنتے نہیں اور ان کے دل کو ٹھیس لگتی ہے اور اسلام میں لوگوں کو تکلیف دینا لوگوں کے دلوں کو دکھ پہنچانا ممنوع ہے۔ لوگوں کو راحت پہنچانا، ان کے دلوں میں الفت ومحبت کا رس گھولنا، شفقت ورحمت کا باعث بننا پسندیدہ عمل ہے۔ کئی لوگ دعوت وتبلیغ کے نام سے لوگوں کے اندر بے چینی، الجھن، دکھ، نفرت اور بیزارگی پیدا کر رہے ہیں جو اسلام کے مقاصد اور اسپرٹ کے خلاف ہے اور جب اور جہاں کوئی دعوت وتبلیغ کا کام کرے گا اسے خارزاروں سے گزرنا پڑے گا جن میں قدم رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

یہ استدلال بظاہر کتنا خوشنما ہے! لیکن درحقیقت حقیقت سے بہت دور اور واقعیت کے پرے ہے۔ کیونکہ صحیح بات یہ ہے کہ اکثر وبیشتر احکام ہدایات اور اوامر اور نواہی کی ایک حد ہوتی ہے اگر اس کو اس کی حد سے آگے پھیلا یا جائے گا تو بات غلط ہوجائے گی۔ قید وشرط اور استثناء سے خالی بہت کم احکام ہیں۔ مثلاً ماں باپ کا دل توڑنا غلط ہے، ماں باپ سے محبت کرنا بیوی کی دلجوئی کرنا۔ اپنے رشتہ داروں کا لحاظ کرنا نیکی ہے لیکن ان میں

سے کوئی چیز بھی قید و شرط اور استثنیٰ سے خالی نہیں ہے۔ ان میں سے کسی چیز کو مطلق اور غیر مشروط بنا دیا جائے تو وہ نیکی نہیں بدی بن جائے گی۔ ماں باپ اگر کفر کا حکم دیں تو ظاہر ہے ان کا دل توڑنا نیکی ہوگی۔ ماں باپ اگر خدا و رسول سے دشمنی کی راہ پر چل رہے ہوں تو محبت کے بجائے ان سے دشمنی کرنا پڑے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کا لحاظ ڈاکٹر صاحب نہیں کر سکے جس کی وجہ سے ان کا استدلال بھی بے محل ہو گیا اور جو نتیجہ انہوں نے نکالا وہ بھی غلط ہو گیا۔ قید و شرط اور استثنیٰ کی اطلاع تب ہوتی ہے جبکہ کتاب و سنت کے پورے ذخیرے پر نظر ہو۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحریر کوتاہ نظری کا ثبوت پیش کر رہی ہے۔

مسئلہ کی نوعیت

بخاری شریف کی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔

ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھے، بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

ابوداؤد کی ایک روایت ہے کہ ایک عورت جنگ میں مقتول پائی گئی۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ما کانت هذه لتقاتل۔ یہ جنگ کرنے کے لئے تو نہیں تھی۔

اس سے فقہاء نے مسئلہ نکالا ہے کہ جو بھی جنگ کرے وہ قتل کیا جائے گا خواہ عورت ہو یا بوڑھا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے ایک عورت کو قتل کیا جس نے خلاد بن سوید پر چکی پھینک کر قتل کر دیا تھا۔ یوم خندق کے موقع پر بھی ایک عورت قتل کی گئی تھی۔

حدیث کی کتابوں میں حُرْمَةُ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانْ کا عنوان جہاں ملتا ہے وہیں جَوَازُ قَتْلِ النِّسَاء والصِّبْيَانْ کی ہیڈنگ بھی ملتی ہے۔ یعنی عورتوں اور بچوں کے قتل کی حرمت اور جواز دونوں حالات کے اعتبار سے ثابت ہیں۔ بوڑھے کو قتل کرنا ممنوع ہے لیکن جنگ حنین میں درید بن صمہ بوڑھے کو قتل کیا گیا کیونکہ وہ جنگی معاملات میں رائے دیتا تھا۔

> مسألة ... يجوز تبييتهم وهو كبسهم ليلاوان كان فيهم نساء واطفال ومسلمون وبهذا قال احمد بن جنبل وقال لا نعلم احدا كره بيات العدو وهل تغزو الروم الا البيات۔ (كشاف القناع)
>
> ويجوز نصب المنجنيق عليهم ورميهم بالنار و ارسال الماء عليهم وان كان فيهم نساء و صبيان منهم فان كان فيهم مسلم اسير او تاجر او مستامن كره ان لم تكن ضرورة والا لم يكره على المذهب۔ (مغنى المحتاج)

الزرع والشجر فی دار الحرب ینقسم ثلاثۃ اقسام
احدھا ماتدعوالحاجۃ الی اتلافہ کالذی بقرب حصونھم ویمنع من قتالھم
اویحتاج الی قطعہ لتوسعۃ طریق او تمکن من قتال او ستارۃ منجنیق اوغیرہ۔
اویکونون یفعلون ذالک بنافنقتلہ بھم لینتھوا ھذا جائز بغیر خلاف۔
(مشارق الاشواق)

ہم نے حدیث اور فقہ سے جو یہ چند باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو مارنے سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح مال واسباب، کھیتی اور باغ کو تلف کرنے سے روکا گیا ہے لیکن یہ حکم ممانعت اسی وقت تک کے لئے ہے جبکہ اس کی جنگی ضرورت متقاضی نہ ہو، عورت، بچہ، بوڑھا، کھیت اور باغ وغیرہ دشمن پر قابو پانے اور دشمن کی قوت توڑنے میں حائل اور مانع ہوں تو ان کی کوئی پرواہ نہیں کی جائے گی چنانچہ کفار اگر مسلمانوں کو ڈھال کے طور پر اپنی فوج کے آگے رکھیں تو ان کی وجہ سے حملہ روکا نہیں جائے گا۔ حملہ کیا جائے گا لیکن نیت ان کے مارنے کی نہ رکھی جائے اصل نیت کفار کو مارنے کی کی جائے۔

ان معلومات کو سامنے لانے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ امریکہ وغیرہ کے خلاف کئے جانے والے اقدامات کو جس بنیاد پر غلط اور غیر شرعی عمل بتایا جارہا ہے وہ دراصل کوئی بنیاد ہی نہیں ہے۔ ظلم وجور اور انسانیت سوز حرکتوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کی مذمت کرنا، تغلیط کرنا اور اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کے تحت زبان اور ہاتھ سے کام کرنے والوں کو ملامت کرنا دینی اور ملی جرم ہے جس کو تاریخ کبھی معاف نہیں کرے گی۔ بالخصوص جبکہ اس ملامت کی بنیاد ناقص معلومات پر رکھی گئی ہے۔ اس تناظر میں ہم ڈاکٹر صاحب سے خواہش کریں گے کہ اپنے موقف پر نظر ثانی فرمائیں اور قوم وملت کی صحیح رہنمائی فرمائیں اور اپنے مقام کو پہچانیں۔

آخری بات

تین سوال

مسلمان اس زمانہ میں اپنے اوپر ہونے والے ظلم وزیادتی کے مقابلہ میں شرعی لحاظ سے کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہوئے خصوصی طور پر مندرجہ ذیل تین سوالوں کا جواب بھی تلاش کیجئے۔

پہلا سوال: حضرت ابوالبصیرؓ اور ان کے ساتھیوں کی پالیسی صحیح تھی یا غلط؟

ایک صحابی رسول حضرت ابوالبصیرؓ مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے۔ صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ آئے۔ ان کے پیچھے ہی مکہ سے از ہر بن عبدعوف اور اخنس بن شرفی کا ایک مکتوب رسول اللہ ﷺ کے نام مدینہ دو آدمی لائے کہ حدیبیہ کے معاہدہ کی رو سے ابوالبصیرؓ کو واپس کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے ابوالبصیرؓ کو بلایا اور فرمایا ''ابو البصیر! ہم نے اس قوم سے جو عہد کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے دین میں عہد شکنی نہیں ہے۔ تم مکہ چلے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اور دوسرے کمزور مسلمانوں کے لئے کوئی راہ پیدا کرے گا۔

ابوالبصیرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! کیا آپؐ مجھے مشرکوں کی طرف واپس کر رہے ہیں؟ جو میرا دین برباد کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے پھر فرمایا ''مکہ چلے جاؤ اللہ کوئی راہ نکالے گا'' حضرت ابوالبصیرؓ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ لیکن راستہ میں انہوں نے مقام ذوالحلیفہ میں اپنے دونوں پہرہ داروں میں سے ایک کو دھوکہ دے کر قتل کر دیا، دوسرا پہرہ دار ڈر کر مدینہ چلا گیا اور وہاں حضور ﷺ سے ابوالبصیرؓ کی شکایت کی۔ اس کے بعد ساتھ ہی ابوالبصیرؓ بھی مدینہ پہنچ گئے اور حضور ﷺ سے عرض کیا یا رسولؐ اللہ! آپ کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ اس کے بعد ابوالبصیرؓ مدینہ سے مقام عیص چلے گئے۔ عیص اس راستہ پر ہے جس سے ہو کر وہ شام جاتے تھے جو سمندر کے ساحل پر ذوالمرہ کے کنارے واقع ہے۔ مکہ میں جو مسلمان روک لئے گئے تھے وہ اس واقعہ سے واقف ہو چکے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کہا تھا اس کو جان چکے تھے اس لئے وہ عیص میں ابوالبصیرؓ سے آکر مل گئے۔ اس طرح تقریباً ستر آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے قریشیوں کا قافیہ تنگ کر دیا وہ جس قریشی کو پاتے اسے قتل کئے بغیر نہ چھوڑتے اور جو قافلہ ان کے پاس سے گزرتا اس پر چھاپہ مارتے۔

جس وقت حضرت ابوالبصیرؓ اپنی کارروائی کر رہے تھے، اس وقت مدینۃ الرسول دارالاسلام کا صدر مقام تھا جس کے سربراہ بذات خود رسول خدا ﷺ کی ذات تھی۔ ابوالبصیرؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر جو کچھ کر رہے تھے حضور ﷺ کی اجازت اور حکم سے نہیں کر رہے تھے بلکہ اپنے طور پر کر رہے تھے ورنہ مشرکین ضرور اعتراض کرتے کہ حدیبیہ میں طے شدہ معاہدہ کی یہ خلاف ورزی ہے۔ پھر بھی آپؐ کو سب کچھ معلوم تھا جس پر آپؐ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی جب کہ یہ ناممکن ہے کہ خلاف شرع کوئی کام ہو رہا ہو اور آپ ﷺ خاموش رہیں۔ اسی لئے آپ ﷺ کی خاموشی یعنی اقرار کو شریعت میں ایک مضبوط دلیل تسلیم کیا جاتا ہے، پس حضور ﷺ کی خاموشی حضرت ابوالبصیرؓ کی ساری کارروائیوں کے صحیح ہونے کی دلیل ہے جو بہت ساری قیل وقال کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ کسی ملک میں مسلمانوں کیلئے کوئی حکمت عملی متعین کرنے کیلئے یہ ایک واقعہ کافی ہو سکتا ہے۔

موجودہ زمانے میں ابوالبصیرؓ کا نمونہ

آج ابوالبصیرؓ کے اس واقعہ کو دلیل بنا کر کوئی جتھا کسی جنگل، پہاڑ یا کسی مقام کو اپنا اڈہ بنا کر دشمنان دین و ملت کو نشانہ بنائے تو کیونکر غلط ہوسکتا ہے؟ اور اگر کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ یہ واقعہ دارالاسلام مدینہ کے باہر ہو رہا تھا۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے تعرض نہیں فرمایا تو یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور نبوت ساری دنیا کے لئے تھی۔ دنیا میں جہاں کوئی مسلمان ہوگا آپ کے حکم کے تابع ہوگا۔ حضرت ابوالبصیرؓ آپ کے حدود رسالت و اطاعت کے باہر نہ تھے اور اگر اس توجیہ کو صحیح مان لیا جائے تو ہمارے مدعا کو مزید ثبوت اور قوت حاصل ہوگی اور یہ ثابت ہوگا کہ کہیں بھی چند مسلمان اکٹھا ہوکر دین و ملت کے دشمنوں کے خلاف محاذ آرائی کرسکتے ہیں اور اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسلمانوں کی وسیع پیمانہ پر شرعی حکومت قائم ہو اور وسیع علاقہ پر امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین کا سکہ جاری ہو۔

دوسرا سوال: قبیلہ بنی عقیل کے آدمی کو صحابہ کا پکڑنا صحیح تھا یا غلط؟

عن عمران بن حصین قال کان ثقیف حلیفا لبنی عقیل فاسرت ثقیف رجلین من اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم واسر اصحاب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رجلا من بنی عقیل فاوثقوہ فطرحوہ فی الحرۃ فمر بہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فناداہ یا محمد یا محمد فیما اخذت قال بجریرۃ حلفاء کم ثقیف فترکہ و مضی فناداہ یا محمد یا محمد فرحمہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فرجع قال ماشانک قال انی مسلم فقال لوقلتھا وانت تملک امرک افلحت کل الفلاح قال ففداہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بالرجلین الذین اسرھما ثقیف. (رواہ مسلم)

ترجمہ: عمران بن حصین سے روایت ہے کہ قبیلہ ثقیف حلیف تھا قبیلہ بنو عقیل کا۔ ثقیف کے لوگوں نے دو مسلمانوں کو قید کرلیا تھا۔ صحابہ کرامؓ نے انتقام میں قبیلہ بنی عقیل کے ایک آدمی کو پکڑ لیا اور اس کو باندھ کر گرم پتھر پر ڈال دیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس کے پاس سے گزر ہوا۔ وہ آدمی چلایا۔ یا محمد یا محمد، مجھے کس جرم میں پکڑا گیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہارے حلیف ثقیف کے جرم میں۔ اتنا کہہ کر آپ آگے بڑھ گئے۔ اس نے پھر آواز دی۔ یا محمد یا محمد۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ترس آ گیا اور آپ لوٹ پڑے اور پوچھا تمہارا کیا حال ہے اس نے کہا میں مسلمان ہوگیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس وقت تم آزاد تھے اس وقت اگر تم نے یہ بات کہی ہوتی تو تم پوری طرح کامیاب ہوگئے ہوتے۔ اس کے بعد آپ نے

اس آدمی کو دونوں مسلمانوں کی رہائی کی شرط پر چھوڑا۔

تیسرا سوال: کیا امت کو پہاڑوں، دریاؤں اور مصنوعی سرحدوں کی بنیاد پر تقسیم کیا جا سکتا ہے؟

کیا مسلمانوں کے باہمی تعاون کو مصنوعی سرحدوں میں محدود کیا جا سکتا ہے؟ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بموجب مسلمان جسد واحد کے مانند ہیں کہ جسم کے ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کیا یہ اخوت کا نظریہ انسانوں کی بنائی ہوئی حد بندیوں کا پابند ہے۔ اس سوال کا جواب ہمارے فقہاء نے نفی میں دیا ہے اور کہا ہے کہ جب مسلمانوں کی زمین کے کسی حصہ پر غیر قابض ہو جائیں تو سب مسلمانوں پر درجہ بدرجہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ غیر کے قبضہ اور تسلط کو ختم کریں۔ لیکن ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> ''ہمارا موقف یہ ہے کہ موجودہ حالات میں امریکہ کے خلاف تشدد کا عمومی استعمال مسلمانوں کے لئے نہ تو جائز ہے اور نہ مفید۔ بلکہ اس کے برعکس اس سے خود اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ البتہ جب امریکہ کسی مسلمان ملک پر ناحق حملہ کرے جیسا کہ اس نے عراق پر کیا ہے تو بے شک مسلمانوں کو اپنے ملک کے دفاع میں لڑنے کا اختیار ہے مگر یہ طریقہ متعلقہ لوگ ہی اختیار کر سکتے ہیں۔''

سوال یہ ہے کہ فلسطینی اور عراقی مسلمانوں کی مصیبت کو اگر ساری دنیا کے مسلمان اپنی مصیبت سمجھیں اور ان کے دشمن کو اپنا دشمن سمجھیں اور اپنی استطاعت کے مطابق دفاع میں شریک ہوں تو کیوں جائز نہیں ہوگا؟! بالخصوص جبکہ جن مسلمانوں پر ظلم ڈھایا جا رہا ہے وہ اپنا دفاع کرنے سے عاجز ہو رہے ہیں۔ جو کچھ کریں متعلقہ لوگ ہی کریں۔ اس ذہن نے ایک مسلم ملک کو دوسرے ملک سے بے تعلق کر رکھا ہے۔ ایک ملک میں ایک شہر کے لوگوں کو دوسرے شہر کے لوگوں سے کاٹ دیا ہے اور اسی ذہنیت کے تحت ایک شہر میں بھی مشرق و مغرب اور محلہ اور غیر محلہ کا فرق کیا جاتا ہے۔ مزید براں گروپ، جماعت اور پارٹی کی بنیاد پر بھی برتاؤ میں فرق کیا جاتا ہے اور اخوت اسلامی، تعاون علی البر اور کلمہ کی بنیاد پر اتفاق و اتحاد کی ذہنیت مضمحل ہوتی جا رہی ہے۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضاء میں
کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی صاحب کا مضمون

''زندگی نو'' اگست ۹۷ء کے اشارات میں مدیر زندگی ڈاکٹر فضل الرحمن فریدی صاحب نے نوجوانوں کے ایک گروپ کو مخاطب کر کے چند نہایت غلط باتیں لکھی ہیں۔ اتنی کم ظرفی، گراوٹ اور نادانی کی امید کسی عام مسلمان سے نہیں کی جاسکتی چہ جائے کہ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کا کوئی معزز رکن ہو۔

☆ جماعت کا یہ کردار رہا ہے کہ کسی تعصب کی بناء پر کوئی غلط بات نہ کہی جائے لیکن فریدی صاحب نے کئی دینی اور ملی اقدار کو پامال کیا ہے۔

- جماعت کے بزرگوں کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ کسی بھی گروپ کو اپنے خلاف منہ کھولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ لیکن فریدی صاحب نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا ہے۔
- اُمّتِ مسلمہ کے سواد اعظم کے خیر امت میں شمولیت کا انکار کیا ہے اور اپنے کو اُمّتِ مسلمہ سے علیحدہ کوئی چیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو جماعت کے اصل موقف کے خلاف ہے۔
- جماعت اسلامی ہند اُمّتِ مسلمہ کا ایک عظیم سرمایہ ہے مگر اس عظیم سرمایہ کو کچھ لوگ ملیامیٹ کرنے پر جیسے تلے ہوئے ہیں اور خیر خواہوں کی باتوں کو سُنی ان سُنی کر رہے ہیں اور بقول مولانا صدر الدین اصلاحیؒ کے ناشدنی کا برابر ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ اس روکو روکنے کے لئے فریدی صاحب کے خیالات پر ایک نظر ڈالی جا رہی ہے۔ غور فرمایئے:

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''بعض نوجوان کہتے ہیں کہ جذبۂ سرفروشی دین کی اصل ہے یہ اس کی ابتداء بھی ہے اور انتہاء بھی اور جس کا دل سرفروشی کی تمنا سے خالی ہو وہ منافق ہے بزدل ہے اور مصلحت کوش ہے''

مدیر ''زندگی نو''! افسوس کی بات ہے کہ آپ کے نزدیک سرفروشی کی تمنا اور جذبہ سرفروشگی رکھنے والے

نوجوان قابل نفرت اور لائق ملامت ہیں حالانکہ ''زندگی نو'' کے اسی شمارے میں ایک نوجوان نہیں بلکہ سفید ریش بزرگ نے لکھا ہے (''ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کو آسانی کے ساتھ پرکھا جا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ایمان کا اندازہ کرنا ہو تو اپنی زندگی کا جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ راہ حق میں مصائب و مشکلات کو برداشت کرنے کی کس قدر خواہش اور آرزو موجود ہے اللہ کے راستے میں جدوجہد اور سرفروشی کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جبکہ ہم نظام باطل اور کافرانہ ماحول سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی تڑپ اپنے دلوں میں رکھتے ہوں'') غالباً آپ کے نزدیک جذبۂ سرفروشی قابل نقد و ملامت اس لئے ٹھہرا ہے کہ آپ حضرات فی الحال نظام باطل کو نعمت غیر مترقبہ سمجھ رہے ہیں لیکن آپ ان آیات اور احادیث کے متعلق کیا کہیں گے جن میں جذبۂ سرفروشی پیدا کرنے کے لئے ابھارا گیا ہے، مثلاً:

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللهِ وَاللهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ

(البقرۃ:۲۰۷)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے کوئی وہ ہے جو اس کی رضا تلاش کرنے کے لیے اپنی جان بیچ دیتا ہے اور اللہ بندوں پر بڑا مہربان ہے۔

مزید شرح صدر کے لئے سورۂ بقرہ ۲۱۸، سورۂ آل عمران ۱۷۰، سورۂ توبہ ۱۹، ۲۰، ۸۸، ۸۹ کا صرف ترجمہ ملاحظہ فرمالیں، اسی طرح دو حدیثیں بھی اپنے سامنے رکھیں اور پھر غور فرمائیں کہ آپ کس چیز کو قابل نفرت قرار دے رہے ہیں؟

من لم يغز ولم يجهز غازيا او يخلف غازياً في اهله بخير اصابه الله بقارعة قبل يوم القيامة (ابوداؤد)

ترجمہ: جس نے جنگ نہیں کی اور نہ کسی غازی کو تیار کیا اور نہ کسی غازی کی عدم موجودگی میں اس کے اہل وعیال کی دیکھ بھال کی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو قیامت سے پہلے ایک سخت مصیبت سے دوچار کر دے گا۔

دوسری حدیث ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِهِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ. (رواہ مسلم وابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کو موت آئی اس حال میں کہ اس نے نہ کبھی جہاد کیا اور نہ اس کے اندر کبھی اس کی اُمنگ ہوئی تو وہ کسی قدر نفاق کی حالت میں مرا۔

اس طرح کی صریح آیات اور احادیث کے ہوتے ہوئے نہیں معلوم آپ حضرات کس طرح اور

کس بنیاد پر جذبۂ سرفروشی کے اظہار کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع ہونے والی ایک کتاب میں لکھنے والے نے لکھا ہے کہ

''بات ناتمام رہے گی اگر میں یہ وضاحت نہ کروں کہ یہی وہ تاریک دور ہے جس میں اسلامی غیرت وحمیت کی بھٹیاں سرد ہیں ورنہ اس سے پہلے مسلمانوں پر کوئی ایسا دور نہیں گزرا کسی بھی دور میں مسلمانوں نے جہاد کو نہ ترک کیا اور نہ اس کے سلسلے میں کوتاہی کی یہاں تک کہ علماء وصوفیاء اور اہل صنعت وحرفت بھی ہمیشہ ذوق جہاد سے سرشار رہتے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو زبردست فقیہ وزاہد تھے بیشتر وقت جہاد میں گزارتے۔ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ جو پایہ کے صوفی اور زاہد تھے ان کا بھی یہی حال تھا حضرت شفیق بلخیؒ جو وقت کے امام تصوف تھے خود بھی جہاد میں پیش پیش رہتے۔ تلامذہ کے اندر بھی روح جہاد پھونکتے، بدر عینیؒ شارح بخاری جو زبردست فقیہ و محدث تھے ایک سال جہاد کرتے ایک سال درس دیتے اور ایک سال حج کرتے، قاضی اسد بن فراتؒ مالکیؒ وقت کے امیر البحر تھے، امام شافعیؒ دس دس تیر چلاتے اور کوئی تیر خطا نہ کرتا، ہمارے بزرگ اسلاف ایسے تھے تو پھر ہمیں بھی کیا ان کے ساتھ کوئی نسبت ہے!''

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کے نزدیک سرفروشی کے معنی تصادم اور سردھڑ کی بازی لگانے کے ہیں اور اس کی ابتداء دعوت کے آغاز سے ہو جاتی ہے۔ ادھر زبان سے کلمۂ ایمان کا اعلان ہوا اُدھر تصادم کی ابتداء ہوئی پھر نہ صلح جوئی کی گنجائش ہے اور نہ نرمی اور مدارات کی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ طاغوت اور باطل قوتوں کا ازالہ صرف تصادم کے ذریعہ ممکن ہے موعظِ حسنہ کی گنجائش ہے نہ جدال احسن کام آتا ہے اور نہ ترغیب وتفہیم کا عمل کارگر ہوتا ہے بس ان قوتوں کا ہاتھ توڑنا چاہئے اور ان کی زبان بند کردینی چاہئے اور اگر ابتداء ہی سے اس کی تیاری نہ کی گئی تو دین کی تعلیمات کی خلاف ورزی اور جذبۂ سرفروشی کی نفی ہوگی۔''

سرفروشی کے معنی اس کے علاوہ کچھ اور ہوں تو بتایئے۔ تاریخ اسلامی سے کوئی مثال پیش کیجئے جس میں دعوت کے آغاز ہی سے تصادم کی ابتداء نہ ہوئی ہو اور داعی کو پھولوں کا ہار پہنایا گیا ہو۔

جب حضرت نوح علیہ السلام نے کہا:

اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الشعراء:۱۱۵)

ترجمہ: میں صرف کھلا ڈرانے والا ہوں۔

توقوم نے جواب دیا: قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (الشعراء:۱۱٦)

ترجمہ: انھوں نے کہا اے نوح! اگر آپ باز نہ آئے تو آپ ضرور ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جن کو سنگسار کردیا گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے باپ نے کہا:

لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا (مریم:۴۶)

ترجمہ: اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں ضرور سنگسار کردوں گا اور تم مجھ سے ایک طویل مدت کے لیے دور ہو جاؤ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرعون نے کہا:

ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُبَدِّلَ دِينَكُمْ (الغافر:۲۶)

ترجمہ: چھوڑ دو مجھے میں موسیٰ کو قتل کردوں، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے دین کو بدل دے گا۔

حضرت شعیب علیہ السلام سے ان کی قوم نے کہا:

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنَاكَ (ھود:۹۱)

ترجمہ: اگر تمہاری قوم نہ ہوتی تو ہم تم کو پتھروں سے مار کر ہلاک کردیتے۔

کئی رسولوں سے ان کی قوموں نے کہا کہ:

لَئِنْ لَمْ تَنْتَهُوا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِنَّا عَذَابٌ أَلِيمٌ (یٰسین:۱۸)

ترجمہ: اگر تم باز نہ آؤ گے تو ہم تم کو پتھروں سے مار کر ہلاک کردیں گے اور ہماری طرف سے تم عذاب سے دوچار ہو گے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور خود نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم نے کیا کیا، پہلی بار کوہ صفا سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو پکارا تو ابولہب نے کس ردعمل کا اظہار کیا، پھر اس کے بعد ایذا رسانیوں اور معرکہ آرائیوں کا ایک لمبا سلسلہ ہے جس کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ آپ بتائیے کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ......

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرار بولہبی

نرمی مدارات کی کوئی گنجائش نہیں اس کی دلیل میں متعدد آیات قرآنی پیش کی جاسکتی ہیں۔

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود:۱۱۳)

ترجمہ: ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکو ورنہ تم آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے۔

وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ (المائدۃ:۴۹)

ترجمہ: اور ان سے ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں اللہ کی وحی کردہ بعض باتوں سے بھٹکا دیں۔

اسی کے ساتھ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ واقعہ بھی یاد کیجئے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے ہاتھ میں چاند بھی لاکر رکھ دیں تو بھی میں اپنی دعوت کو نہیں چھوڑ سکتا یا تو اللہ اسے غالب کردے یا میں اسی راہ میں فنا ہو جاؤں۔

اب بتایئے نرمی اور مدارات کے لئے آپ کے پاس کیا دلیل ہے؟

★ طاغوت اور باطل قوتوں کا ازالہ کہیں ہنسی خوشی ہو گیا تو اس کی کوئی مثال پیش کردیجئے۔

★ یہ بات نہیں ہے تو قرآن میں تیاری کرنے کی کیوں تاکید کی گئی؟

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ...الخ (الانفال:٦٠)

ترجمہ: اور جس قدر تم سے ہوسکے کافروں کے لئے ہتھیار اور پلے ہوئے گھوڑے تیار رکھو۔ اس کے ذریعہ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن ڈراؤ۔

مسلمانوں کو خیر امت کہنا

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''یہ عزیز نوجوان یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مسلم قوم اور دعوت اسلامی کے مفادات ہمیشہ ہم آہنگ ہوں اور مسلم قوم کے مفادات اور دین حق کے مفادات کو گڈمڈ کرتے ہیں اقدام امت اور احیاء امت جیسی اصطلاحات کا اعلان کرتے وقت مسلمان کے نام سے پہچانے جانے والے گروہ کو خیر امت قرار دیتے ہیں۔''

اگر یہ بات صحیح نہیں ہے تو آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے نام پر وہ کام کیسے حلال کردیا جس کو بانی تحریک نے شرعی دلائل کی روشنی میں حرام قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ ''ان کیلئے ووٹ دینا بھی حرام ہے کیونکہ ووٹ دینے کے معنی یہی ہیں کہ ہم اپنی رائے سے کسی ایسے شخص کو منتخب کرتے ہیں کہ جس کا کام موجودہ دستور کے تحت وہ قانون سازی کرنا ہے جو عقیدۂ توحید کے منافی ہے۔''

اقدام امت اور احیاء امت کے الفاظ بھی آپ کے لئے بار گراں ہیں تو بتایئے کیا آپ امت کو بے حوصلہ بنانے اور امت کو مردہ کرنے کے لئے کوشاں ہیں یا پھر بتایئے کہ آپ کا ہر مقرر ''كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ'' والی آیت پڑھ کر کیوں بات شروع کرتا ہے؟ کیا یہ آیت آپ لوگوں کی جاگیر ہے کہ آپ پڑھیں تو ٹھیک اور دوسرا پڑھے تو غلط۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی سب سے مہلک غلطی یہ ہے کہ وہ انسانیتِ عامہ کے قبول حق کی استعداد کو نہایت محدود اور ناقص سمجھتے ہیں۔''

قبول حق کی استعداد محدود ہے یا غیر محدود یہ بحث آپ کے ذہن کی اختراع ہے مانا کہ غیر محدود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو ہجرت اور قتال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آتی رہی؟ آپ جس معنی میں غیر محدود لے رہے ہیں، اس کے اعتبار سے ہر دور میں غیر محدود لوگ مشرف با اسلام ہوئے مگر تاریخ اس کے خلاف گواہی دے رہی ہے اَکْثَرُھُمْ کَافِرُوْنَ، اَکْثَرُھُمْ کَاذِبُوْنَ، اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ، اَکْثَرُھُمْ لَا یَشْکُرُوْنَ کے الفاظ قرآن میں بکثرت آئے ہیں اس کے علاوہ مَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُؤْمِنِیْنَ کا جملہ ۸/ بار آیا ہے، آخر یہ کیا ہے، اس سے قبول حق کی استعداد محدود ثابت ہوتی ہے یا غیر محدود۔ غور فرمایئے:

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''اگر انہیں عصری تاریخ سے واقفیت ہوتی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچ سکتے کہ ''سوویت یونین کا حالیہ انقلاب صرف سیاسی اور نفسیاتی پروپگنڈے کے ذریعہ وقوع پذیر ہوا اور عوام کی استعداد قبولیت کا براہ راست نتیجہ تھا ایرانی انقلاب تو عوام کی غیر معمولی قبولیت حق کا مظہر ہے یہ انقلاب ظاہری تبدیلی نہیں بلکہ بنیادی اور حقیقی تبدیلی کا مظہر ہے جس میں ترغیب، تفہیم، تعلیم اور دعوت حق کو نہایت موثر انداز سے استعمال کیا گیا تھا، اس انقلاب نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ مظلوم اور مقہور عوام اگر چاہیں تو جبر اور قہر کے باوجود حق کو قبول اور باطل کو رد کر سکتے ہیں۔''

سوویت یونین کے حالیہ انقلاب سے کونسا انقلاب مراد ہے؟ اگر حالیہ زمانہ میں روس کے ٹوٹنے کی طرف اشارہ ہے تو یہ ایک کھلی حقیقت کو جھٹلانے کی جسارت ہے اس لئے کہ روس کی پسپائی کا سب سے بڑا اور نمایاں سبب افغان مجاہدین کا جذبۂ سرفروشی ہے اور میدان میں شکست کے بعد بالآخر اسے بکھر جانا پڑا۔ تاریخ میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے جو گروہ میدان میں ہار جاتا ہے اسے ہر شعبۂ زندگی میں ہارنا پڑتا ہے اور اگر حالیہ انقلاب سے کمیونسٹ انقلاب مراد ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ زار روس کس کے وعظ اور تفہیم سے تخت شاہی سے اتر گیا اور ملک روس کو کمیونسٹوں کے حوالہ کر دیا۔ مظلوم اور مقہور کے حق کو قبول اور باطل کو رد کرنے کا سوال نہیں ہے سوال یہاں یہ ہے کہ شاہ ایران ترغیب و تعلیم سے ایران کو چھوڑ کر بھاگا یا عوام کے تصادم کی تاب نہ لا سکا؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کو غیر شعوری طور پر آئیڈیل مان کر اور ان کی موجودہ معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو نظر انداز کر کے ایک خیالی دنیا بنا رکھی ہے۔''

اس کا کوئی حوالہ ہوتو پیش فرمائیے۔لیکن اس سے آپ کے ذہنی مرض کا پتہ چلتا ہے کہ اب آپ حقیقت میں قیام حکومت الٰہیہ، قیام نظام اسلامی اور اقامت دین کی خیالی دنیا سے نکل کر سیکولر جمہوریت کی حقیقی دنیا بسانے کی فکر میں لگ جائیں، مگر آپ کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ آپ کی حقیقی دنیا اس وقت تک نہیں بس سکتی جب تک کہ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر لوگوں کو آپ پڑھاتے رہیں گے آپ کی راہ میں نوجوانوں کا کوئی گروہ رکاوٹ نہیں ہے بلکہ اصل رکاوٹ تفہیم القرآن اور مولانا کی دیگر تحریریں ہیں۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''علم سے محروم، پیغام حق سے تہی داماں اس عظیم گروہ کے بارے میں یہ موقف رکھنا کہ اس نے اتمام حجت کے بعد محض سرکشی کی وجہ سے اسلام کو رد کر دیا ہے محض جہالت ہے۔ اور ہٹ دھرمی ہے۔''

آپ کے نزدیک نوجوان جہالت اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں یا آپ جہالت اور ہٹ دھرمی کا شکار ہو گئے۔ واقعہ جو بھی ہو ہم اس سے تعرض کرتے ہیں البتہ ہم دریافت کرتے ہیں کہ کیا آپ کے نزدیک اس عظیم گروہ کو مکمل آزادی دے دینی چاہئے کہ ہاشم پورہ میں نوجوانوں کا قتل عام کرے، عیدگاہ مرادآباد میں نمازیوں کو گولیوں سے بھون ڈالے، سورت میں مسلم خواتین کو ننگی کر کے نچائے اور دن کی روشنی میں بابری مسجد کو منہدم کر دے؟

جس گروہ میں گاندھی اور نہرو جیسے سیاست داں، راجندر پرشاد اور رادھا کرشنن جیسے فلسفی پیدا ہوئے ہیں اس گروہ کو آپ علم سے محروم کہتے ہیں۔ یہ آپ کی سادہ لوحی ہے جو لوگ ساری دنیا کے علوم وفنون کو کھنگال ڈالتے ہیں اور جن میں آج بھی ہر فن کے ماہرین موجود ہیں وہ قرآن اور اسلام ہی سے کیوں ناواقف ہیں؟!

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''ان کی تیسری غلطی یہ ہے کہ باطل افکار اور طاغوتی نظریات اور ان کے علمبرداروں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔''

واقعہ ہے کہ نوجوانوں سے یہ غلطی ہو رہی ہے کہ باطل افکار اور طاغوتی نظریات اور ان کے علمبرداران دونوں سے دوری اور اجتناب کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں حالانکہ آپ بزرگوں کی مثال سامنے تھی کہ باطل نظریات اور افکار سے آپ کا کیا معاملہ ہے خدا جانے لیکن طواغیت اور ملحدین سے آپ کی خوب چھنتی ہے اور ان کے اندر اپنا اچھا امیج بنا رکھا ہے اور اس سلسلہ میں پیش قدمی برابر جاری ہے!!

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

> ''ان کی چوتھی غلطی یہ ہے کہ شہادت حق اور اس کے مراحل متعین کرتے وقت قرآن وسنت کا براہ راست

مطالعہ نہیں کرتے بلکہ اپنی پسند کی شخصیت کی رائے اور تعبیر کو حتمی قرار دیتے ہیں ان کا مطالعۂ قرآن ناقص ہے، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم سطحی اور یک رخا ہے۔''

بالکل بجا فرمایا آپ نے، لیکن بتائیے کہ یہاں صوبائی اور ضلع واری ذمہ داریاں نیز مرکزی سکریٹریٹ میں کون کونسی شخصیات براہ راست کتاب وسنت کا مطالعہ کرسکتی ہیں۔ براہ راست مطالعہ کرنے والے ہوتے تو آج تحریک اسلامی تذبذب کے دلدل میں نہیں پھنسی ہوتی۔ اس کے برخلاف براہ راست مطالعہ کرنے والی نوجوانوں کی پسندیدہ شخصیات مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث ندوی اصلاحیؒ اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کو ٹھکرا کر پالیسی بنائی جارہی ہے اور کہا جارہا ہے کہ ان کی تفسیر حتمی نہیں ہے ہم کو بھی اجتہاد کا حق ہے۔ پالیسی ساز لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو بقول فریدی صاحب قرآن کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔ ''زندگی نو'' میں ۱۲ سال سے کمال بے حیائی اور جسارت کے ساتھ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ جیسی شخصیت کا نام لے کر جھوٹا پروپگنڈہ کیا جاتا ہے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ جس کا بھانڈا موصوف کی وضاحت زندگی نو سے پھوٹ چکا ہے اور یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس نے مرکزی ساری کارروائیوں کو غیر معتبر بنادیا ہے۔

مولانا مودودیؒ کے خلاف مستقل مہم چلائی جارہی ہے نمونہ کے لئے ''زندگی نو'' میں کسی نام کے مفتی صاحب نے مولانا مودودیؒ کے لٹریچر کو دعوت حق کی راہ میں حائل بتایا ہے وہ مضمون اجتماع ارکان بہار میں مرکزی ذمہ داروں کی موجودگی میں پڑھا گیا۔ جماعت کے خاص آرگن میں چھپا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟

فریدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''اگر وہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت کو قرآن کی نظر سے دیکھتے تو ان پر یہ حقیقت عیاں ہوجاتی کہ ان میں سے اکثر کی پوری زندگی محض انذار وتبشیر میں گزر گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی محض دعوت وتبلیغ سے عبارت تھی ان سب کا مفہوم یہ ہے مبارزت نہیں بلکہ دعوت اسلام کی اصل اور بنیادی حقیقت ہے۔''

دعوتِ اسلام کی اصل اور بنیادی حقیقت ہے تو جماعت اسلامی کا بنیادی نصب العین اقامت دین آپ نے کیسے بنالیا ہے؟ پھر دعوت کس چیز کی، سیکولر جمہوریت کی یا توحید خالص کی؟؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ قیام دین کی دعوت کے بجائے آپ کی مہم سیکولر جمہوریت کی بقاء اور قیام کے لئے ہے۔ نظریۂ اقامت دین پر وحید الدین خاں اور شمس پیرزادہ وغیرہ کی تنقیدوں کے نتیجہ میں نظریۂ اقامت دین سے انحراف کرچکے ہیں تو دیانتداری کا تقاضا ہے کہ کھل کر توبہ کا اعلان کیجئے اور مولانا مودودیؒ کی کتابوں کے ذریعہ لاکھوں کا منافع جو حاصل ہورہا ہے اس سے دستبردار ہوجایئے۔

انبیاء کرام علیہم السلام میں اکثر کی پوری زندگی محض انذار وتبشیر میں گزری تو اس آیت کا کیا مطلب ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا (آل عمران:۱۴۶)

پھر دیکھئے۔ کیا موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں مبارزت کا کوئی سراغ آپ کو نہیں ملا۔ فرعون سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کشمکش نہیں کی۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام چپکے سے مصر سے نکل گئے۔ پھر میدان تیہ میں بنی اسرائیل کو کس چیز کے لئے تیار کیا گیا ہے اور کیا حالات سے وہ گزرے؟

واقعہ یہ ہے کہ آپ کی جسارت قابل داد ہے صحیح کہا تھا کسی نے کہ جو لوگ مولانا مودودیؒ کا لٹریچر، تفہیم القرآن اور دستور جماعت اسلامی کو ہاتھ میں رکھتے ہوئے ووٹ دینے کا فیصلہ اور فورم برائے جمہوریت بنا سکتے ہیں اور کھلے طور پر سیکولرزم کے لئے مہم چلا سکتے ہیں اور مولانا صدرالدین اصلاحیؒ کی رائے کو غلط طور پر علی الاعلان بول سکتے ہیں وہ سب کچھ کر سکتے ہیں۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ارشاد ہے کہ: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تم بس ذکر کرتے جاؤ تمہارا مشن ہے کہ انسانوں کو پکارتے رہو اور جو اپنی خوشی سے تمہاری پکار پر لبیک کہے اس کا تزکیہ اور تربیت کرو زور زبردستی تمہارا کام نہیں ہے۔''

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنتَ مُذَكِّرٌ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ (الغاشیۃ:۲۱،۲۲)

ہم عرض کریں گے کہ معاملہ اتنا آسان اور سرسری نہیں ہے بلکہ آپ کو بتانا ہوگا کہ اس آیت میں اور آیات جہاد وقتال میں بظاہر جو ٹکراؤ ہے اس کو کیسے دور کیا جائے گا۔

مثلاً: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ (الانفال:۶۵)

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ایک اور رخ سے سوچئے کہ اگر تصادم، کشمکش کا معاملہ نہ ہوتا تو رسول اور مومنین ''مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ'' کیوں پکار اٹھے اور مومنین ''وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ'' کی دعا کیوں کرتے ہیں اور کس کے مقابلہ میں؟ اگر انبیاء علیہم السلام دعوت اور وعظ کا کام ہی کرتے تو انہیں دعوت دین کے ساتھ دعوت افطار بھی طاغوتوں کے یہاں ملتی اور پوری آؤ بھگت بھی ہوتی۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''ان نوجوانوں کی پانچویں غلطی یہ ہے کہ سرفروشی اور جہاد فی سبیل اللہ کے نہ معنی سے واقف ہیں اور نہ اس کے مراحل سے، وہ سمجھتے ہیں کہ دشمن کو زیر کرنے کیلئے مادی تدابیر بس جہاد کہلاتی ہیں اور اگر آج نہیں تو کل

صف آرائی کرنا پڑے گی یہ موقف جیسا کہ اوپر کی بحث سے واضح ہو گیا ہوگا نہ قرآن وسنت کے صحیح فہم پر مبنی ہے اور نہ اس کی دعوتی اور تحریکی حکمت عملی کا تقاضا ہے۔''

مشہور اور عام بات ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا لفظ ہے سب جگہ میدانی لڑائی مراد ہے۔ دو درجن سے زیادہ جہادی مہم میں اللہ کے رسول ﷺ بذاتِ خود ہتھیار کے ساتھ شریک رہے ہیں اور درجنوں مہموں میں صرف صحابۂ کرامؓ گئے ہیں اور تلوار کے ساتھ گئے ہیں۔ کاغذ اور قلم ان کے ساتھ نہیں تھا۔ نہ میز کرسی اور نہ ٹیلیفون، نہ ریڈیو اور نہ ٹی وی۔ ایسی صورت میں جہاد کے معنی کیا متعین کئے جائیں۔ بتایئے؟ قرآن کہتا ہے۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال:٦٠)

اس میں لفظ قوۃ کے سلسلہ میں قیل وقال کی گنجائش ہے مگر رباط الخیل کے مادی تدبیر ہونے میں کوئی شبہ ہے؟ پھر دشمن کو ڈرانا اور مرعوب کرنا مادی تدبیر اور مادی ذرائع کے بغیر ہوسکتا ہے؟ دشمن کو معلوم ہو جائے کہ آپ کے پاس صرف کوئی ڈگری ہے۔ آپ کئی مضامین میں ماہر ہیں۔ بڑے کاروبار کے مالک ہیں مگر توپ اور بندوق تو کیا لاٹھی ڈنڈا بھی نہیں رکھتے اور نہ اس کے قائل ہیں تو کیا دشمن کو آپ ڈرا سکیں گے اور کیا دشمن آپ کی کوئی پرواہ کرے گا؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''اس کے علاوہ یہ نوجوان یہ بھی نظر انداز کرتے ہیں کہ فقہاء نے اپنی تحقیقات میں شریعت اسلامی کے جو عمومی مقاصد متعین کئے ہیں ان میں انسانی جان، مال اور عزت وآبرو کا تحفظ نہایت اہم مقام رکھتے ہیں۔''

فریدی صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ ان مقاصد کے حصول کے ہی لئے جذبۂ سرفروشی ضروری ہے اور اسلامی جہاد کا مقصد ہی فساد اور بدامنی کو ختم کرنا اور انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت ہے اور اسی کیلئے برائی اور برے لوگوں کی سرکوبی ضروری ہوتی ہے زمانہ کے ابولہب اور ابوجہل اسی طرح وقت کے بنونضیر بنوقریظہ کو جب تک اکھاڑ نہیں پھینکا جائے گا اس وقت تک انسانی جان ومال کی حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ اسی لئے فقہاء نے جہاں ان مقاصد کی نشاندہی کی ہے وہیں جہاد کو فرض قرار دیا ہے۔ آپ کی تقریر بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ ملک کی ساری عدالتوں کو ختم کر دینا چاہئے اور جیلوں کو توڑ دینا چاہئے کہ یہ احترام آدمیت کا تقاضا ہے۔

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ شرعی دلیل کے معنی کیا ہوتے ہیں؟''

آپ کی یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن آپ تو جانتے ہیں نا کہ شرعی دلیل کیا ہے۔ ذرا بتایئے۔ اقامت دین کے نام پر غیر الٰہی نظام کی بقاء اور تحفظ کی مہم چلانے کے لئے کس آیت یا حدیث سے استدلال فرمایا گیا ہے؟ تَحَاکُمُ اِلَی الطَّاغُوْت کے جواز کے لئے کہاں سے شرعی دلیل لائے ہیں۔ عبارۃ النص، دلالۃ النص، اشارۃ النص اور اقتضاء النص کی روشنی میں ''زندگی نو'' کے کس مضمون میں استدلال فرمایا ہے۔ ایک کافر کی قیادت اور غیر اسلامی دستور کی روشنی میں وطن عزیز کی تعمیر کے لئے کوئی فورم بنانے کے لئے کونسی شرعی دلیل ہے؟؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صف آرائی کا حکم عامۃ الناس کے خلاف نہیں بلکہ شر اور طاغوت کے زعماء کے خلاف دیا گیا تھا جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول، عمل اور کردار سے اتمام حجت کر دیا تھا۔''

ٹھیک ہے آپ نے تسلیم تو کیا کہ صف آرائی کا حکم دیا گیا تھا۔ یہ تو بتایئے کہ کون سے نوجوان عامۃ الناس کے خلاف صف آرائی کی بات کرتے ہیں کوئی حوالہ ہو تو پیش کیجئے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتایئے کہ ہندوستان میں ایسے زعماء نہیں ہیں جن کے خلاف صف آرائی کی ضرورت ہو؟ مثلاً بابری مسجد کو منہدم کرنے والوں کو آپ کس خانہ میں رکھتے ہیں۔ ان کے خلاف آپ کیوں نہیں صف آرائی کرتے۔ مسجد کی حفاظت کے لئے صف آرائی نہ کرنے کا آپ کے پاس کیا جواز ہے اور اس جواز کو آپ نے کس فقہی اصول کے ساتھ اخذ کیا ہے؟

فریدی صاحب فرماتے ہیں:

''حریت عقیدہ اسلام کے نزدیک محترم ہے لہٰذا اس کا احترام مطلوب ہو اور محمود بھی، اس کو بدلنے کے لئے صرف وہ کوشش صحیح ہوگی جو رائے عامہ کی ہمواری کے راستہ سے کی جائے۔''

اسلام کے نزدیک صرف عقیدۂ توحید مطلوب اور محمود ہے، اس کے علاوہ مشرکانہ عقائد نا مطلوب اور غیر محمود ہیں۔ چونکہ بزور کسی کے عقیدہ کو نہیں بدلا جاسکتا اس لئے عقیدۂ توحید کے علاوہ دوسرے عقائد کو بادل نخواستہ گوارا اور برداشت کیا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہاں ایک بات اور بھی واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کا پہلا مقصد مشرکانہ عقائد سے لوگوں کو پاک کرنا ہے جس کیلئے موعظِ حسنہ اور جدال احسن سے کام لینے کی تعلیم دی گئی ہے اور دوسرا مقصد مشرکانہ عقائد رکھنے والوں کو زیر کرنا اور مغلوب کرنا ہے اور ان کی جگہ عقیدۂ توحید کے حاملین کو غالب کرنا ہے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں اقامت دین، اظہار دین اور تمکین فی الارض کہتے ہیں۔ کیا اس دوسرے مقصد کا آپ انکار کرسکتے ہیں اگر نہیں انکار کرسکتے تو صرف رائے عامہ کی ہمواری کی بات ہی کو صحیح کیسے قرار دیتے ہیں جبکہ قرآن نے اس کے علاوہ بھی راستہ بتایا ہے؟؟

لَا اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ

(۲۰۱۲ء)

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

فہرستِ مضامین

عرضِ ناشر

یہ مختصر کتابچہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اس میں قرآن مجید کی چند آیات پر حالات کے تناظر میں علمی انداز میں گفتگو کی گئی ہے جس سے کئی قرآنی حقائق واشگاف ہورہے ہیں اور دورِ حاضر کی کئی فکری گمراہیوں کا پردہ چاک ہورہا ہے۔

امید ہے کہ اہلِ نظر اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور مطالعۂ قرآن کرنے والے خاطر خواہ استفادہ کریں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ ہر خاص و عام کے لیے اس کتابچہ کو نافع بنائے۔ آمین!

ناشر

مکتبۃ الاقصیٰ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

سورۃ البقرہ آیت 256 کا ایک فقرہ ہے...... "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ"

جس کا ترجمہ ہے...... ''زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں'' (تفسیر شیخ الہند)

''دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں'' (احسن التفاسیر)

اس فقرہ کا استعمال تحریر وتقریر میں اکثر لوگ کرتے ہیں لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اکثر استعمال آیت کے منشاء ومراد کے خلاف ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ اس فقرہ کے ذریعہ دین کی کئی حقیقتوں کا انکار کر دیا جاتا ہے اور کئی ذمہ داریوں سے اپنا دامن بچا لیا جاتا ہے نتیجہ کے طور پر دین کا اصل چہرہ مسخ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر دین اسلام راہبوں اور بھکشوؤں کا مذہب بن کر رہ جاتا ہے۔

آیت کا صحیح معنی ومفہوم کیا ہے اس سوال کا جواب ہم معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بات اتنی آسان نہیں ہے جیسا کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں۔

"لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" کی تفسیر میں مفسرین کی کئی رائیں ہیں جو ایک دوسرے سے متضاد اور باہم آپس میں ٹکرانے والی ہیں بحوالہ فتح القدیر ہم ان کو یہاں درج کرتے ہیں:

① یہ آیت بہت سے مفسرین کے نزدیک منسوخ ہے اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اہل عرب کو دین اسلام پر ایمان لانے کے لئے مجبور کیا اور ان سے جنگ کی اور اسلام کے سواء کسی دوسری چیز پر راضی نہیں ہوئے۔ منسوخ کرنے والی آیات حسب ذیل ہیں:

يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التحریم:۹)

ترجمہ: اے نبی! کافروں اور منافقوں سے جہاد جاری رکھو اور ان پر سخت ہو جاؤ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً (التوبۃ:۱۲۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہئے۔

سَتُدۡعَوۡنَ إِلَىٰ قَوۡمٍ أُوْلِي بَأۡسٍ شَدِيدٍ تُقَٰتِلُونَهُمۡ أَوۡ يُسۡلِمُونَ. (الفتح:١٦)

ترجمہ: عنقریب تم ایک سخت جنگجو قوم کی طرف بلائے جاؤ گے کہ تم ان سے لڑو گے یا وہ مسلمان ہو جائینگے۔

(٢) آیت منسوخ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص طور پر اہل کتاب سے ہے جب کہ وہ جزیہ ادا کریں گے تو انہیں مجبور نہیں کیا جائے گا مجبور صرف بت پرستوں کو کیا جائے گا ان کے لئے صرف دو ہی راستے ہیں اسلام یا تلوار، امام شعبی، حسن، قتادہ اور ضحاک کی یہی رائے ہے۔

(٣) یہ آیت صرف انصار سے متعلق ہے جیسا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انصار کے کچھ جوان یہودی اور عیسائی ہو گئے تھے جب یہ انصار مسلمان ہو گئے تو انہوں نے اپنی نوجوان اولاد کو زبردستی مسلمان بنانا چاہا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

(٤) آیت کے معنی یہ ہیں کہ تلوار کے ڈر سے جو لوگ ایمان لائیں انہیں مکرہ نہ کہو۔

(٥) یہ آیت اہل کتاب قیدیوں کے بارے میں ہے۔

(٦) ابن کثیرؒ نے کہا کہ کسی کو دائرہ اسلام میں لانے کے لئے مجبور نہ کرو اس لئے کہ مجبوری کی حالت میں اسلام قبول کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

(٧) صاحب کشافؒ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان کا معاملہ اختیار اور پسند پر رکھا ہے اسی قانون کو لَآ اِكۡرَاهَ فِي الدِّيۡنِ میں بیان کیا گیا ہے ورنہ اللہ اگر چاہتا تو سب کو قبولیت اسلام کے لئے مجبور کر سکتا تھا۔

وَلَوۡ شَآءَ رَبُّكَ لَآمَنَ مَن فِي ٱلۡأَرۡضِ كُلُّهُمۡ جَمِيعًا. (یونس:٩٩)

ترجمہ: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ سب کے سب ایمان لے آتے۔

اختلاف کے کئی اسباب ہیں:

(١) قرآن میں 'وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡكَٰفِرُونَ'، 'وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡمُشۡرِكُونَ' اور 'وَلَوۡ كَرِهَ ٱلۡمُجۡرِمُونَ' متعدد مقامات پر آیا ہے جس کا صاف مطلب ہے کافروں، مشرکوں اور مجرموں کی مرضی اور پسند کے خلاف اللہ کا حکم اور فیصلہ جاری اور نافذ کیا جائیگا۔ یعنی دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کے اصول پر انہیں ان کی مرضی کے مطابق آزاد دندناتے ہوئے چھوڑ نہیں دیا جائے گا۔

(٢) جہاد و قتال کا حکم ایک مستقل حکم ہے اور ایک محکم فریضہ ہے جس کو کوئی منسوخ نہیں کر سکتا جو

منسوخ کرے گا وہ دائرۂ اسلام سے خارج قرار پائے گا۔ مثلاً غلام احمد قادیانی وغیرہ۔

اس حکم کی ادائیگی بقدر قلیل فرق کے ساتھ نماز، روزہ، زکوۃ اور حج کے مانند فرض ہے اور یہ حکم قیامت تک باقی رہے گا۔ اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: جہاد تم پر فرض کیا گیا گو وہ تمہیں دشوار معلوم ہو۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ۔ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کیلئے ہو جائے۔

اس آیت میں فتنہ سے مراد شرک ہے اللہ کیلئے دین کے ہو جانے کا اس کے سوا کیا مطلب ہے کہ حکم صرف اللہ کا چلے، حکمرانی صرف اسی کی ہو۔ ایسی صورت میں سرکشوں کو مجبور کرنا بالکل لازمی ہوگا۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں والی بات کیسے صحیح ہو سکتی ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: ان لوگوں سے لڑو جو اللہ اور روز قیامت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ شئے کو حرام قرار نہیں دیتے اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ذلیل و خوار ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ ادا کریں۔

فطرت سے اس صفت کو نکالا نہیں جا سکتا۔ جو دین انسانی زندگی کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے وہ بھلا زور زبردستی استعمال کرنے سے خالی کیسے رہ سکتا ہے۔ زندگی سے تعلق رکھنے والے ادیان اور نظریات ہمیشہ پولیس اور فوج اسی لئے رکھتے ہیں کہ اس کے بغیر وہ ایک دن بھی باقی نہیں رہ سکتے۔ ماضی اور مستقبل سے قطع نظر آج دیکھئے کوئی ملک یا کوئی ایسا نظام ہے جو پولیس اور فوج سے بے نیاز ہو؟ یہ کشمکش کی دنیا ہے جس کے پاس زور نہیں وہ ایک لمحہ کے اندر نیست و نابود ہو جائیگا۔ یہ فرشتوں کی دنیا نہیں ہے جہاں خیر و شر کی کشمکش ناپید ہو۔ اسلام جو شر کے مقابلہ میں خیر کو، باطل کے مقابلہ میں حق کو اور منکر کے مقابلہ میں معروف کو رائج و قائم کرنے کا داعی ہے وہ زور اور قوت استعمال نہ کرنے کے غیر فطری تصور کا حامل کیسے ہو سکتا ہے۔ اسلام دین فطرت ہے وہ فطری قوت کو ختم کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کی تعلیم دیتا ہے۔

اسلام میں قوت جمع کرنے، قوی بننے کی ترغیب و تعلیم دی گئی ہے: وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ (الانفال:٦٠)۔ پھر قوت و طاقت کے ذریعہ معروف کے قیام اور بدی کو ختم کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ عاجزی، بے بسی اور بزدلی سے پناہ مانگنے کی دعاء سکھائی گئی ہے۔ علم کے ساتھ ساتھ زور آور جسم کو قیادت کیلئے مستحسن قرار دیا گیا ہے۔ "بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" ایک حدیث ہے کہ قوی مسلمان ضعیف مسلمان سے بہتر ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے مطابق زیر بحث آیت میں فطری جبر کی نفی کی گئی ہے یعنی شرعی قانون نہیں بتایا گیا ہے بلکہ تکوینی قانون بتایا گیا ہے۔ اس تفسیر سے سارے اختلافات کی جڑ ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ مولانا لکھتے ہیں......

> ''اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے ٹکڑے میں جس جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبر فطری کی نفی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت و قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو کوئی نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی ہے۔''

لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن

"لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْن"۔ یہ سُوْرَۃُ الْکٰفِرُوْنَ کا ایک فقرہ ہے۔

امام فخر الدین رازیؒ کے مطابق یہ فقرہ آپس میں قطع تعلق کے اظہار کے لئے بطور ضرب المثل لوگ بولتے ہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ قرآن تدبر و تفکر کے لئے اُتارا گیا ہے ضرب المثل کے لئے نہیں۔

"جرت عادۃ الناس بان یتمثلوا بھذہ الایۃ و ذلک غیر جائز لان اللّٰہ تعالٰی ماانزل القرأن لیتمثل بہ بل لیتدبر بہ و لیعمل بموجبہ" (تفسیر فخر الدین رازی علیہ الرحمۃ)

اس کے برخلاف ہمارے اس دور میں بسا اوقات رواداری، مصالحت، قومی یکجہتی، بقائے باہم اور سیکولر نظریہ کی تائید میں لوگ اس فقرہ کو پیش کرتے ہیں۔

اس فقرہ کا صحیح مفہوم جاننے کیلئے مجموعی طور سے اس پوری سورہ کے مضمون کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس کیلئے مفسرین کے چند اقتباسات ہم پیش کرتے ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

''یہ جنگ اور برأت کی سورۃ ہے''

یہ سورہ کفار سے علیحدگی اور قطع تعلق کی سورہ ہے۔ اس وجہ سے اس کو سورۂ برأت کی طرح ہجرت اور جنگ کی سورہ سمجھنا چاہئے۔ سورۂ برأت فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی اور یہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ سورۂ برأت کا صرف ابتدائی حصہ اعلان برأت ہے اور یہ پوری کی پوری اعلان برأت ہے۔ سلف نے بھی اس سورہ کی حقیقت یہی سمجھی ہے۔ چنانچہ اس کے مختلف ناموں سے جو منقول ہے، اس حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

اس سورہ کا نام سورہ منابذہ، سورہ اخلاص اور سورہ مقشقشہ ہے۔ لسان العرب میں ہے کہ ''احادیث میں وارد ہے کہ سورہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اور قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ کا نام مقشقشان تھا۔''

مختصراً مذکورہ ناموں کی تشریح سن لینی چاہئے۔ اس سے اس سورہ کی صحیح تاویل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ منابذہ کا

مطلب ہے کسی سے تمام تعلقات کو کاٹ لینا۔ قرآن میں ہے فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ (تو تم بھی ان کے معاہدہ کو ان کے منہ پر پھینک مارو) اخلاص کے معنی ہیں، مومنین کو مشرکین سے علیحدہ کرنا۔

جیسا کہ فرمایا ہے:

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران:۱۴۱)

ترجمہ: اور تا کہ اللہ مومنین کو چھانٹ لے اور کافروں کو مٹا دے۔

یہی چیز انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصود ہے۔ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

اخلاص کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اخلاص باطن، اخلاص ظاہر کا سبب بنتا ہے۔ اخلاص باطن کی جڑ توحید ہے۔ اس وجہ سے توحید ہی مشرکین سے علیحدگی کی اصلی علت ہوگی۔ اس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

مقشقشہ، وہ سورہ جو قرب صحت اور نجاست شرک سے علیحدگی کی خبر دے رہی ہو۔ تقشقشہ کے معنی ہیں ظہور صحت کے چیچک اور زخم وغیرہ کے اچھے ہو جانے کے بعد جب جلد سوکھ جاتی ہے تو اس کی تعبیر کے لئے عربی میں یہی لفظ ہے۔

غور کرو کہ یہ لفظ برأت کی حقیقت کی تعبیر کے لئے کس قدر موزوں ہے۔ ہجرت، برأت اور جنگ بظاہر نہایت گھناؤنی اور مکروہ چیزیں ہیں لیکن انہی پردوں کے اندر سے سعادت و کامرانی کا صحت مند چہرہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نام سورہ کے اصلی مفہوم سے نہایت گہری مناسبت رکھنے والے ہیں۔

قرآنِ مجید نے حضرت محمد ﷺ کو ابتدائے نبوت ہی میں حکم دے دیا تھا کہ جب یہ لوگ تمہاری بات ماننے سے انکار کر دیں تو تم ان سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دینا۔ چنانچہ سورہ شعراء میں ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ○ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ○
(الشعراء:۲۱۴۔۲۱۷)

ترجمہ: اور اپنے قرابت داروں کو ڈراؤ اور جن مومنین نے تمہاری پیروی کی ہے ان پر شفقت کرو۔ پس اگر وہ (کفار) تمہاری بات نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ میں تمہارے اعمال سے بری ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔

سورۂ یونس میں فرمایا:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (یونس:۴۱)

ترجمہ: اگر وہ تمہیں جھٹلا دیں تو ان سے کہہ دو کہ میرے لئے میرا عمل ہے اور تمہارے لئے تمہارا عمل۔ تم میرے عمل سے بری ہو۔ اور میں تمہارے عمل سے بری ہوں۔

یہ آیت بالکل لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ کے ہم معنی ہے۔

سورۂ انبیاء میں فرمایا:

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ وَإِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ

(الانبیاء:۱۰۹)

ترجمہ: اگر وہ اعراض کر لیں تو کہہ دو کہ میں نے تمہیں عام طور پر خبردار کر دیا اور میں نہیں جانتا کہ جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ قریب ہے یا دور ہے۔

پس جب مکہ اور اس کے اطراف کے کفار نے محمد ﷺ کی دعوت سے انکار کر دیا اور نفرت وعداوت کے جوش میں آپ ﷺ کے قتل کر دینے اور آپ ﷺ کو مکہ سے نکال دینے پر کمر بستہ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو برأت اور ہجرت اور جنگ کا حکم دے دیا۔

انبیائے کرام کی دعوت وتبلیغ کے معاملہ میں قانون الٰہی ہمیشہ سے یوں ہی رہا ہے۔ ایک مدت تک ان کو صبر وتحمل اور انتظار فتح ونصرت کا حکم دیا جاتا ہے ممکن ہے سرکش طبیعتیں کچھ بدلیں اور لوگ دعوت کو قبول کر لیں۔ لیکن جب ان کی طرف سے برابر سرکشی ہی کا اظہار ہوتا رہتا ہے اور یہ سرکشی آہستہ آہستہ پیغمبر کے ارادۂ قتل واخراج تک متعدی ہونے لگتی ہے تو خدا کا آخری حکم برأت اور ہجرت اور جنگ کے اعلان اور انتقام کے تازیانہ کے ساتھ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ وقت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پورے ہوتے ہیں۔ ظالم ہلاک ہوتے ہیں اور ان کی جگہ اہل ایمان خدا کی زمین پر قابض ہوتے ہیں۔ یہی بعثت کی اصل غرض ہے۔''

(تفسیر نظام القرآن، صفحہ: ۴۶۵ تا ۴۶۷)

تاریخی پس منظر

''مکہ معظّمہ میں ایک دور ایسا گذرا ہے جب نبی ﷺ کی دعوت اسلام کے خلاف قریش کے مشرک معاشرے میں مخالفت کا طوفان تو برپا ہو چکا تھا لیکن ابھی قریش کے سردار اس بات سے بالکل مایوس نہیں ہوئے تھے کہ حضور ﷺ کو کسی نہ کسی طرح مصالحت پر آمادہ کیا جا سکے گا۔ اس لئے وقتاً فوقتاً وہ آپ کے پاس مصالحت کی مختلف تجویزیں لے لے کر آتے رہتے تھے تاکہ آپ ان میں سے کسی کو مان لیں اور وہ نزاع ختم ہو جائے جو آپ کے اور ان کے درمیان رونما ہو چکی تھی۔ اس سلسلہ میں متعدد روایات احادیث میں منقول ہوئی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت ہے کہ قریش کے لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہم آپ کو اتنا مال

دیئے دیتے ہیں کہ آپ مکہ کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی بن جائیں۔ آپ جس عورت کو پسند کریں اس سے آپ کی شادی کئے دیتے ہیں۔ ہم آپ کے پیچھے چلنے کے لئے تیار ہیں، آپ بس ہماری یہ بات مان لیں کہ ہمارے معبودوں کی برائی کرنے سے باز رہیں۔ اگر یہ آپ کو منظور نہیں تو ہم ایک اور تجویز آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جس میں آپ کی بھی بھلائی ہے اور ہماری بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا وہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا ایک سال آپ ہمارے معبودوں لات اور عزیٰ کی عبادت کریں اور ایک سال ہم آپ کے معبود کی عبادت کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں کہ میرے رب کی طرف سے کیا حکم آتا ہے۔ اس پر وحی نازل ہوئی۔'' (تفہیم القرآن صفحہ: ۵۰۰، جلد: ششم)

مولانا مودودیؒ پھر لکھتے ہیں:

''اس پس منظر کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ مذہبی رواداری کی تلقین کے لئے نازل نہیں ہوئی تھی جیسا کہ آج کل کے بعض لوگ خیال کرتے ہیں بلکہ اس لئے نازل ہوئی تھی کہ کفار کے دین اور ان کی پوجا پاٹ اور ان کے معبودوں سے قطعی برأت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان کر دیا جائے اور انہیں بتا دیا جائے کہ دین کفر اور دین اسلام ایک دوسرے سے بالکل الگ ہیں۔ ان کے باہم مل جانے کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اگرچہ ابتداءً قریش کے کفار کو مخاطب کر کے ان کی تجاویز مصالحت کے جواب میں کہی گئی تھی لیکن یہ انہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اسے قرآن میں درج کر کے تمام مسلمانوں کو قیامت تک کے لئے یہ تعلیم دے دی گئی ہے کہ دین کفر جہاں جس شکل میں بھی ہے ان کو اس سے قول اور عمل میں برأت کا اظہار کرنا چاہئے اور بلا رو رعایت کہہ دینا چاہئے کہ دین کے معاملہ میں وہ کافروں سے کسی قسم کی مداہنت یا مصالحت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے یہ سورہ اس وقت بھی پڑھی جاتی تھی جب وہ لوگ مرکھپ گئے تھے جن کی باتوں کے جواب میں اسے نازل فرمایا گیا تھا اور وہ لوگ بھی مسلمان ہونے کے بعد اسے پڑھتے رہے جو اس کے نزول کے زمانے میں کافر و مشرک تھے اور ان کے گزر جانے کے صدیوں بعد آج بھی مسلمان اس کو پڑھتے ہیں کیونکہ کفر اور کافری سے بیزاری و لاتعلقی ایمان کا دائمی تقاضا ہے۔''

(تفہیم القرآن، جلد: ششم، صفحہ: ۵۰۲)

اب ہم زیر بحث آیت پر گفتگو کریں گے۔ ایک رائے یہ ہے کہ دین سے مراد عمل ہے جیسا اس سے ملتی جلتی قرآن میں دوسری جگہ چند آیات آئی ہیں۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ○ (البقرۃ: ۱۳۹)

ترجمہ: اے نبی! ان سے کہو: کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو؟ حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ ہمارے اعمال ہمارے لئے ہیں، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ اور ہم اللہ ہی کے لئے

اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔

وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ○(القصص:۵۵)

ترجمہ: اور جب انہوں نے بیہودہ بات سنی تو یہ کہہ کر اس سے کنارہ کش ہو گئے کہ ''ہمارے اعمال ہمارے لئے اور تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم کو سلام ہے، ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔''

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَّاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ○

(الشوریٰ:۱۵)

ترجمہ: اس لئے اے محمد! اب تم اسی دین کی طرف دعوت دو، اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اسی پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کرو اور ان سے کہہ دو: ''اللہ نے جو کتاب بھی نازل کی ہے میں اس پر ایمان لایا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔ اللہ ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، ہمارے اعمال ہمارے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ اللہ ایک روز ہم سب کو جمع کرے گا اور اسی کی طرف سب کو جانا ہے''۔

ان تینوں مقامات کے آگے پیچھے، سیاق وسباق کو نظر میں رکھئے اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ ان آیتوں میں نبی ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ آپ اپنے مخالفین کو صاف صاف بتا دیجئے کہ ہم صرف اللہ کی بندگی پر اٹل ہیں اس راہ استقامت سے ہٹنے والے نہیں ہیں اور ہم کو تم سے زیادہ بحث ومباحثہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن آئے گا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے ہم اپنے اعمال کا بہترین بدلہ اور انعام پالیں گے اور تم اپنے اعمال کے انجام سے دوچار ہو گے۔ ہم تم جیسے جاہلین سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں رکھتے۔

کوئی ایک لفظ ایسا نہیں جس سے اشارہ ہوتا ہو کہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ہم آہنگی اور یکسانیت ہونی چاہئے۔ ہم دونوں گروہ اپنی جگہ خوش خوش رہیں کوئی وجہ اختلاف نہ ہے اور نہ ہونی چاہئے طور طریقہ کچھ الگ الگ ہے تو کیا فرق پڑتا ہے سب کی منزل ایک ہے۔

دوسری رائے ہے کہ دین سے مراد دین وشریعت ہے۔ اس آخری آیت سے پہلے آٹھ بار لفظ عبادت سے بنے ہوئے صیغے استعمال ہوئے۔ یہ بتانے کیلئے کہ عبادت، طریقۂ عبادت اور معبود ہر لحاظ سے تم الگ ہو اور ہم الگ ہیں۔ لیکن آخری آیت میں عبادت کے بجائے دین کا لفظ آیا ہے۔ عبادت، طریقۂ عبادت اور معبود کے

اعتبار سے دونوں گروہ ایک دوسرے سے جدا ہیں بات پوری ہوگئی تھی مگر لفظ دین نے مکمل طور پر علیحدگی اور جدائی کا اس طرح اعلان کر دیا کہ زندگی کے کسی حصہ اور جزء میں ملاپ، جوڑ، تعلق اور اتصال حتیٰ کہ مشابہت کی بھی گنجائش نہیں ہے۔عقیدہ،عبادت سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں اسلام اور کفر کی راہیں الگ الگ ہیں۔

یہ قرآن کی بیان کردہ حقیقت ہے اور نہایت تاکیدی طور پر بتایا ہوا اصول ہے جس کو توڑنے اور جس کی مخالفت کرنے کی ہمت کسی مسلمان کو نہیں کرنی چاہئے۔لیکن اس قرآنی اصول کو توڑنے کی جسارت اور ارادہ کچھ لوگ دعوت کے نام پر برملا کرتے ہیں اور مختلف طریقوں سے اصل کفر کے قریب ہونے کی کوشش کرنے کے لئے ان کے تہواروں میں شرکت کرتے ہیں اور تاویل کرتے ہیں کہ اس میں کوئی شرک کی بات نہیں ہے کچھ لوگ ان کے تہواروں کی تقسیم کرتے ہیں کہ ان کے فلاں فلاں تہواروں کا تعلق عقیدہ سے نہیں بلکہ موسم سے ہے اس لئے ان میں شرکت جائز ہے۔قرآن کے اتنے تاکیدی حکم کے مقابلہ میں بغیر کسی قرآنی آیت اور سنت ثابتہ کے جواز کی بات انتہائی خطرناک ہے۔

اس موقع پر ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ اعلان برأت آخری زمانہ میں اتمام حجت کے بعد کیا گیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اتمام حجت سے پہلے کب اور کہاں ان سے جڑے رہنے، ملے رہنے اور ان سے مشابہت اور مماثلت اور یکسانیت قائم کرنے کی ہدایت دی گئی؟؟ اولاً تو اتمام حجت کا نظریہ کہاں سے لیا گیا مکہ کے علاوہ کس شہر، کس ملک اور کس علاقہ میں ۱۳ سال تک اتمام حجت کرنے کے بعد آگے قدم بڑھایا گیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی معاملہ میں آخری ہدایت اور آخری نبوی عمل کو دیکھا جاتا ہے اور اس کو اسوہ بنایا جاتا ہے۔شروع کے مراحل کو نمونہ نہیں بنایا جاتا ہے۔مثال کے طور پر شراب کی حرمت کو لیجئے،شراب کی حرمت کئی مرحلوں سے گزری، پہلے کہا گیا کہ شراب میں نفع کم نقصان زیادہ ہے۔ پھر کہا گیا کہ شراب پی کر نماز نہ پڑھو۔ پھر حکم آیا شراب حرام ہے۔اس کے قریب نہ جاؤ اور اس سے مکمل اجتناب کرو۔شراب کے بارے میں اگر کوئی کہے کہ ایمان لانے کے کئی سال تک مسلمان شراب پیتے رہے اس لئے آج کوئی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ کم از کم تیرہ سال تک شراب پی سکتا ہے۔شروع شروع نماز میں سلام کلام جائز تھا اس لئے کوئی نومسلم کچھ دنوں تک نماز میں سلام وکلام کرسکتا ہے تو کیا اس دلیل کو تسلیم کیا جاسکتا ہے؟!

دعوت کے نام پر ایک اور مصالحت کی صورت نکالی گئی ہے۔دین اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اور اس سے بھی انکار نہیں کہ دین کے بعض حصہ کو لینا اور بعض کو چھوڑ دینا بھی جائز نہیں۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ دین کے بعض حصہ کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا کفر کے برابر ہے۔ "اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ" لیکن حقیقت کو نظر انداز کرتے ہوئے ایک ماڈرن فارمولہ کو اس دور میں اہل

دین نے قبول کرلیا۔ وہ یہ کہ اہل اقتدار پرائیوٹ زندگی سے متعلق مسائل سے تعرض نہیں کریں گے اہل دین کو ان کے پرسنل لاء میں آزادی ہوگی اور اہل دین زندگی کے اجتماعی معاملات میں اور حکومت اور سیاست میں دین کے نام پر دخل نہیں دیں گے۔ یہ فارمولہ اس دور کا کامیاب فارمولہ ثابت ہوا۔ مشرق سے مغرب تک اس کو اہل دین نے قبول کرلیا ہے۔ افسوس کہ اہل عرب بالخصوص اہل مکہ کو یہ تجویز نہیں سوجھی۔ یہ سیکولرزم کا فارمولہ ہے۔

ع افسوس کہ مشرکین کو سیکولرزم کی نہ سوجھی

ورنہ سارا جھگڑا ہی ختم ہوجاتا، اہل دین کے مصنّفین، مؤلفین، سیرت نگار، اور خطباء و مقررین بہترین الفاظ اور شاندار فصیح و بلیغ جملوں میں لکھتے ہیں بولتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل زندگی کا نظام ہے ہمارے نبی ﷺ کی سیرت پوری زندگی کیلئے اسوہ کاملہ ہے پھر بھی ان کو اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہیں آتا ہے۔ اہل دین اور اہل اقتدار دونوں اپنی جگہ خوش و مطمئن ہیں کہ چلو بات بن گئی جھگڑا ختم ہوگیا۔ کچھ ماڈرن لوگ جو عصری زبان و اسلوب اور جدید اپروچ کو اختیار کرتے ہوئے دو قدم آگے بڑھ کر مسجد اور اپنے خصوصی اجتماعات اور جلسوں میں اصلاح عقیدہ، اصلاح معاشرہ اور دعوت و تبلیغ کے فضائل بیان کرنے کے ساتھ میدان عمل میں نکل کر شیطانی اور طاغوتی نظام کے فضائل اور خوبیاں بھی بیان کرتے ہیں الحاد و کفر کی بنیادوں پر بنے ہوئے نظاموں کی وکالت کرتے ہیں ان کے استحکام اور قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں اور اس کے باوجود......

ع نہ ایمان جائے، نہ ایمان بگڑے!!

اس آیت پر صاحب تفہیم القرآن نوٹ لکھتے ہیں:

''یعنی میرا دین الگ ہے اور تمہارا دین الگ۔ میں تمہارے معبودوں کا پرستار نہیں اور تم میرے معبود کے پرستار نہیں ہو۔ میں تمہارے معبودوں کی بندگی نہیں کرسکتا اور تم میرے معبود کی بندگی کے لئے تیار نہیں ہو۔ اس لئے میرا اور تمہارا راستہ کبھی ایک نہیں ہوسکتا۔ یہ کفار کو رواداری کا پیغام نہیں ہے بلکہ جب تک وہ کافر ہیں ان سے ہمیشہ کے لئے برأت، بیزاری اور لاتعلقی کا اعلان ہے اور اس سے مقصود ان کو اس امر سے قطعی اور آخری طور پر مایوس کردینا ہے کہ دین کے معاملہ میں اللہ کا رسول ﷺ اور اس پر ایمان لانے والوں کا گروہ کبھی ان سے کوئی مصالحت کرے گا۔ یہی اعلان برأت اور اظہار بیزاری اس سورۃ کے بعد نازل ہونے والی مکی سورتوں میں پے درپے کیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا ''اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے اور تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کررہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔'' (آیت ۴۱) پھر آگے چل کر اسی سورہ میں فرمایا: اے نبی کہہ دو کہ لوگو!......اگر تم میرے دین کے متعلق (ابھی تک) کسی شبہ میں ہو تو (سن لو کہ) اللہ کے سوا تم جن کی بندگی کرتے ہو میں ان کی بندگی نہیں کرتا بلکہ صرف اس خدا کی بندگی کرتا ہوں جس کے اختیار میں

تمہاری موت ہے (آیت ۱۰۴) سورہ شعراء میں فرمایا اے نبی، اب اگر یہ لوگ تمہاری بات نہیں مانتے تو کہہ دو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے میں بری الذمہ ہوں۔ (آیت ۲۱۶) سورہ نساء میں فرمایا ''ان سے کہو جو قصور ہم نے کیا ہو اس کی باز پرس تم سے نہ ہوگی اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی کوئی جواب طلبی ہم سے نہیں کی جائے گی۔ کہو ہمارا رب (ایک وقت) ہمیں اور تمہیں جمع کرے گا اور ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دے گا (آیت ۲۵، ۲۶) سورہ زمر میں فرمایا، ان سے کہوائے میری قوم کے لوگو! تم اپنی جگہ کام کئے جاؤ، میں اپنا کام کرتا رہوں گا۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسواء کن عذاب آتا ہے اور کسے وہ سزا ملتی ہے جو ٹلنے والی نہیں (آیات ۳۹۔۴۰) پھر یہی سبق مدینہ طیبہ میں تمام مسلمانوں کو دیا گیا کہ ''تم لوگوں کیلئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں ایک اچھا نمونہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے، جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ (الممتحنہ: ۴) قرآن مجید کی ان پے در پے توضیحات سے اس شبہ کی گنجائش تک نہیں رہتی کہ ''لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ'' کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین پر قائم رہو اور مجھے اپنے دین پر چلنے دو۔ بلکہ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسی سورۂ زمر میں فرمائی گئی ہے کہ ''اے نبی، ان سے کہو کہ میں تو اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اسی کی بندگی کروں گا، تم اسے چھوڑ کر جس جس کی بندگی کرنا چاہو کرتے رہو۔'' (آیت: ۱۴)

صاحب تدبر القرآن کا بھی ایک نوٹ ملاحظہ کیجئے:

''لَکُمۡ دِیۡنُکُمۡ وَلِیَ دِیۡنِ'' ...... ''یعنی جب میرے اور تمہارے دین میں کوئی اشتراک ماضی میں نہ ہوا، نہ حاضر میں ہے تو آئندہ کس طرح توقع کرتے ہو کہ ہم کسی ایک نقطہ پر مجتمع ہو سکیں گے۔ اس وجہ سے سمجھوتے کی توقع بالکل لا حاصل ہے۔ میرے لئے میرا دین ہے تمہارے لئے تمہارا دین۔ میں اپنے طریقہ پر کام کرتا ہوں اور تم اپنے طریقہ پر کام کرو اور دیکھو کہ انجام کار میری بات سچی ثابت ہوتی ہے یا تمہاری۔ یہی بات سورہ انعام میں یوں ارشاد ہوئی ہے۔ قُلۡ یٰقَوۡمِ اعۡمَلُوۡا عَلٰی مَکَانَتِکُمۡ اِنِّیۡ عَامِلٌ (الانعام: ۱۳۵) (کہہ دو، اے قوم کے لوگو! ...... تم اپنی جگہ پر کام کرو، میں اپنی جگہ پر کام کرتا ہوں) سورہ ہود آیت ۱۲۹ اور سورۂ زمر آیت ۳۹ میں بھی دوسرے رسولوں سے یہی کلمات نقل ہوئے ہیں اور مقصد اس سے صرف اس بحث وجدال کے دروازے کو بند کرنا ہے جو مخالفین اس مقصد سے کر رہے تھے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے موقف کو بھی تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس اعلان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آخری آگاہی دے دی کہ نہ آپ اپنے دین سے ذرہ برابر ہٹنے کیلئے تیار ہیں اور نہ ہی ان کے دین کیلئے ہی کوئی مقام تسلیم کرنے پر آمادہ ہیں۔

عام طور پر لوگوں نے اس آیت کو رواداری کے مفہوم میں لیا ہے۔

حالانکہ یہ کفار کے رویے سے بیزاری بلکہ انجام کار کے اعتبار سے ان سے ابدی مفارقت اور اعلان جنگ کے

مفہوم میں ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ وہی اعلان ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے سامنے کیا جس کا حوالہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ‌ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ ○ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ (الممتحنہ:۴)

ترجمہ: تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یاد کرو جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمہارے عقیدے کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت اور نفرت آشکار ہوگئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔“

وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا

وَلَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ وَمَا لَکُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ○ (ھود:۱۱۳)

ترجمہ: ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ''اِسْتَقِمْ کَمَا اُمِرْتَ'' یعنی جیسا کہ آپ کو حکم دیا جمے رہئے استقامت کو بقول حضرت حسن بصریؒ دو ''لا'' سے گھیر دیا گیا ہے۔ ایک ''لَا تَطْغَوْا'' حد سے تجاوز نہ کرو اور دوسرے ''لَا تَرْکَنُوْا'' نہ جھکنا۔ اس طرح استقامت کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ غالباً اسی بناء پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا شیبتنی ھود۔ سورۃ ھود نے مجھے بوڑھا بنادیا۔

زیر بحث آیت میں ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی میں مدہوش ہو رہے تھے۔ رات ودن جن سے مسلمانوں کی کشمکش برپا تھی وہ ہر قیمت پر اسلام کو نیچا دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کی کشمکش اور مزاحمت کی غرض یہ تھی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رویہ میں تھوڑی لچک پیدا کریں۔ اپنے موقف سے زیادہ نہیں تھوڑا تو ہٹیں ان سے محبت ومودت، ہمنوائی، ہم مشربی اور قدم سے قدم ملا کر چلنے کا سوال ہی کیا؟ حکم دیا گیا کہ ان ظالموں کی طرف ذرا جھکنا نہیں ورنہ انجام بہت برا ہوگا! اب موقع پر اسلوب کلام اور طرز تخاطب ایسا اختیار کیا گیا ہے جس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جیسے ایک پٹرول سے بھری ٹنکی ہے اور دوسری طرف ایک چنگاری ہے۔ ان دونوں میں نسبت یہ ہے کہ چنگاری قریب گئی کہ پٹرول بھڑک اٹھے گا ذرا دیر نہ لگے گی۔ ٹھیک اسی طرح ان ظالموں کی طرف جھکاؤ ہوتے ہی دوزخ کی آگ لپیٹ میں لے لے گی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جھکاؤ آخر کفر وشرک سے بھی اتنا زیادہ خطرناک کیوں بن جاتا ہے اس کا

جواب یہ ہے کہ کفر و شرک سنگین جرم ہیں لیکن کوئی شخص اپنے ہاتھ میں خدائی چراغ لئے ہوئے ہو اور پھر اندھیروں کے ٹھیکے داروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ان کی طرف جھکاؤ رکھے تو اس کے کیا معنی ہیں! دراصل اس کے ڈانڈے منافقت سے جا ملتے ہیں۔ایک آدمی صرف اللہ کا نام لے اور دوسری طرف نمرود اور فرعون کے گن گائے۔ایک طرف رسول ﷺ کے ناموس اور اسوہ کی بات کرے اور دوسری طرف ابوجہل اور ابولہب سے معانقہ بھی کرے۔ایک طرف غلبۂ دین اور اقامت دین کا بلند بانگ دعوی کرتا پھرے اور دوسری طرف سیکولرزم اور کمیونزم کا جھنڈا لے کر گلیوں میں دوڑے یہ صورتحال ایک معمولی اختیار و قوت والا شخص بھی اپنے دوستوں اور ساتھیوں کی نسبت سے پسند نہیں کرسکتا تو سلطان کائنات کیوں برداشت کرے گا؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس جھکاؤ کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اس جھکاؤ میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں؟؟

اس کا جواب صاحب جلالین کی مختصر تفسیر سے مل جاتا ہے:

"لَاتَرْکَنُوْٓ"، "تمیلوا"، "اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا"۔ بمودة او مداهنة او برضا باعمالهم۔

ترجمہ: یعنی جھکاؤ کے معنی یہ ہیں کہ اہل باطل سے محبت کی جائے یا ان کے ساتھ مداہنت برتی جائے یا ان کی سرگرمیوں اور کرتوتوں پر رضا اور خوشی کا اظہار کیا جائے۔

افسوس ہے کہ آج اس جھکاؤ کو قطعاً سمجھا نہیں جارہا ہے اور اس کے انجام کی پرواہ نہیں کی جارہی ہے۔اس دور میں دنیا کے لوگ نہیں، کاروباری افراد نہیں، سیاست اور ڈپلومیسی کے اشخاص نہیں بلکہ دین کے لوگ علماء اور مشائخ، دینی انجمنوں اور دینی تنظیموں کے قائدین اور مرشدین، دعوت و تبلیغ کے مراکز کے ذمہ دار اصحاب کس طرح اہل باطل کی طرف محبت، مداہنت اور پھر ان کی مدح و ستائش کرتے ہوئے مسلسل جھکاؤ میں مبتلا ہیں۔ان کی پالیسی اور پروگرام کی مستقل بنیاد وقت کے فرعونوں اور طاغوتوں کی جانب میلان اور رکون پر رکھی جاتی ہے۔

علامہ فخر الدین رازیؒ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں:

''محققین کے نزدیک جس ''رکون'' یعنی جھکاؤ سے منع کیا گیا ہے اس میں ظالموں کی سرگرمیوں پر راضی ہونا، ان کے طرز عمل کی تحسین کرنا، انکی مجلس میں اور اس کے باہر اچھا بنا کر پیش کرنا اور ان کے کسی کام میں شریک ہونا۔البتہ کوئی فائدہ حاصل کرنے یا کسی ضرر سے بچنے کے لئے ان سے خلا ملا رکھنا جائز ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ کتنا نازک معاملہ ہے۔ظالموں کے کرتوتوں پر راضی رہنے کی گنجائش نہیں ہے بلکہ منکر پر نکیر کرنا اور اظہار ناپسندیدگی کرنا ایمان کی علامت ہے۔

ان کے طرز عمل کی تحسین یا تزئین کی بھی گنجائش نہیں ہے اس لئے کہ یہ بھی منکر کی تائید میں شامل ہوجائے گا اور ان کے کسی کام میں مشارکت کا بھی سوال نہیں کہ مشارکت فی العمل مشارکت فی الجزاء کا موجب ہوگا۔

اس مسئلہ کی اہمیت ونزاکت کا اندازہ یوں لگایئے کہ کسی موقع پر امام نے نماز میں یہ آیت تلاوت کی تو مصلیوں میں سے ایک بزرگ بے ہوش ہو گئے اور اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو ظالم کی طرف ذرا جھکنے والے کا انجام ہے تو ظالم کا انجام کیا ہوگا۔ یا ان بزرگ کے قول کا منشاء یہ ہے کہ قرآن میں "اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" استعمال ہوا "ظَالِمِیْنَ" نہیں۔ ظالم اور "اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" میں فرق یہ ہے کہ "اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا" میں وہ لوگ شامل ہوں گے جن سے ظلم کا فعل کبھی سرزد ہو گیا اور "ظَالِمِیْنَ" سے مراد وہ ہیں جن کا شیوہ ہی ظلم کرنا ہو۔

امام زہریؒ نے جب بعض خلفاء سے ربط ضبط بڑھایا تو ان کے بعض مخلصین نے انہیں یہ خط لکھا:

''اللہ تعالیٰ ہم کو اور آپ کو فتنوں سے محفوظ رکھے۔ آپ اس وقت اس حال میں ہیں کہ آپ کے واقف کار آدمی کو چاہئے کہ آپ کے لئے اللہ سے دعا کرے کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے کتاب وسنت کے علم کی شکل میں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس نے آپ کو بوجھل کر دیا ہے۔ اللہ نے علماء سے میثاق لیا علم کو لوگوں کے سامنے بیان کرنے اور نہ چھپانے کا، آپ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے طرز عمل سے ظالم کی وحشت کو انسیت سے بدل دیا ہے اور اپنی قربت سے بدی کی راہ کو آسان کر دیا ہے۔ یہ کم سے کم آپ کی خطاء ہے اس نے آپ کو ایک ایسا محور بنا دیا ہے جس کے اطراف باطل کی چکی گھوم رہی ہے۔ آپ کی حیثیت ایک پل اور سیڑھی کی بن چکی ہے جو ان کی گمراہیوں میں مددگار ہو رہی ہے۔ آپ کی وجہ سے علماء مشکوک ہو جا رہے ہیں اور جہلاء نمونہ بنتے جا رہے ہیں جو چیز آپ کا دین برباد کر کے آپ کو انہوں نے دی ہے وہ بہت ہی معمولی ہے۔ پس آپ اس آیت کے مصداق بن چکے ہیں۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ○ (مریم:۵۹)

ترجمہ: ''آپ اپنے دین کا علاج کیجئے۔ آپ کے دین کو روگ لگ چکا ہے اور طویل سفر کے لئے زادہ راہ کی فکر کیجئے اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔ والسلام''

اس موقع پر سورہ بنی اسرائیل کی آیات (۷۳ تا ۷۵) سامنے رکھی جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ جھکاؤ کیا چیز ہے اور اس جھکاؤ کے لئے اہل باطل کتنا زور لگا رہے ہیں۔ فریب، لالچ، دھمکی، پروپیگنڈہ، ظلم وستم، معاشی دباؤ اور معاشرتی قطع تعلقی کی شکل میں جو کچھ بھی کر سکتے ہیں وہ کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ہیں۔ ٹھیک اس کے بالمقابل اللہ تعالیٰ اپنے رسولؐ کی ایسی حفاظت وصیانت فرماتے ہیں کہ اہل باطل کی ہر چال ضائع ہو کر رہ جاتی ہے اور اللہ کے بندے ٹھیک ٹھیک راہ حق پر جمے رہتے ہیں۔

وَاِنْ كَادُوْا لَيَفْتِنُوْنَكَ عَنِ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ لِتَفْتَرِيَ عَلَيْنَا غَيْرَهٗ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوْكَ خَلِيْلًا○ وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا○ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا○ (بنی اسرائیل: ۷۳)

ترجمہ: اے محمد! ان لوگوں نے اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے کہ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس وحی سے پھیر دیں جو ہم نے تمہاری طرف بھیجی ہے تا کہ تم ہمارے نام پر اپنی طرف سے کوئی بات گڑھو اگر تم ایسا کرتے تو وہ ضرور تمہیں اپنا دوست بنا لیتے اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تمہیں مضبوط نہ رکھتے تو تم ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ لیکن اگر تم ایسا کرتے تو ہم تمہیں دنیا میں بھی دوہرے عذاب کا مزہ چکھاتے اور آخرت میں بھی دوہرے عذاب کا، پھر ہمارے مقابلہ میں تم کوئی مددگار نہ پاتے۔

معلوم ہوا کہ اللہ کی نصرت اور حفاظت کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ٹھیک ٹھیک اس لائن پر جما رہے جو اللہ اور اس کے رسول نے کھینچ دی ہے اور دنیا کی ساری کامیابیوں اور ناکامیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صحیح خطوط پر اپنی تگ و دو جاری رکھے۔ دنیا میں کامیاب ہونا یا دنیا والوں کی نظر میں ہماری امیج کا اچھا ہونا، ہماری دعوت کا مقبول ہو جانا کوئی اہم بات نہیں۔ اہم بات صرف یہ ہے کہ ہم کہاں تک اس پوائنٹ اور نکتہ کو پکڑے ہوئے ہیں جو کتاب و سنت نے ہمیں دیا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اپنی معرکۃ الآرا تفسیر ''معارف القرآن'' میں رقمطراز ہیں۔

''دوسری آیت میں انسان کو خرابی اور بربادی سے بچانے کے لئے ایک اور اہم ہدایت نامہ دیا گیا ہے۔ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ یعنی ظالموں کی طرف ادنیٰ میلان بھی نہ رکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے ساتھ تمہیں بھی جہنم کی آگ لگ جائے۔ لا ترکنوا مصدر رکون سے بنا ہے جس کے معنی کسی طرف خفیف سے میلان اور جھکاؤ اور اس پر اعتماد و رضا کے ہیں۔ اس لئے آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ظلم و جور میں خود مبتلا ہونے کو تو دین و دنیا کی تباہی سبھی جانتے ہیں مگر ظالموں کی طرف ادنیٰ سا جھکاؤ اور میلان ان سے راضی ہونا، ان پر اعتماد کرنا بھی انسان کو اسی بربادی کے کنارے لگا دیتا ہے۔ اس جھکاؤ اور میلان سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق صحابہ و تابعین کے چند اقوال منقول ہیں جن میں کوئی تعارض و اختلاف نہیں سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں:

حضرت قتادہؓ نے فرمایا کہ مراد یہ ہے کہ ظالموں سے دوستی نہ کرو ان کا کہنا نہ مانو۔ ابن جریحؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی طرف کسی طرح کا بھی میلان نہ رکھو۔ ابو العالیہؒ نے فرمایا کہ ان کے اعمال و افعال کو

پسند نہ کرو (قرطبی)۔ سدیؒ نے فرمایا کہ ظالموں سے مداہنت نہ کرو۔ یعنی ان کے برے اعمال پر سکون یا رضا کا اظہار نہ کرو۔ عکرمہؒ نے فرمایا کہ ظالموں کی صحبت میں نہ بیٹھو۔ قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ شکل وصورت اور فیشن اور رہن سہن کے طریقوں میں ان کا اتباع کرنا یہ سب اسی ممانعت میں داخل ہے۔

قاضی بیضاویؒ نے فرمایا کہ ظلم وجور کی ممانعت اور حرمت کے لئے اس آیت میں وہ انتہائی شدت ہے جو زیادہ سے زیادہ تصور میں لائی جاسکتی ہے کیونکہ ظالموں کے ساتھ دوستی اور گہرے تعلق ہی کو نہیں بلکہ ان کی طرف ادنیٰ درجہ کا میلان اور جھکاؤ اور ان کے پاس بیٹھنے کو بھی اس میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی شخص اس عالم سے زیادہ مبغوض نہیں جو اپنے دنیاوی مفاد کی خاطر کسی ظالم سے ملنے کے لئے جائے (مظہری) تفسیر قرطبی میں ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اہل کفر اور اہل معصیت اور اہل بدعت کی صحبت سے اجتناب اور پرہیز واجب ہے بجز اس کے کہ کسی مجبوری سے ان سے ملنا پڑے اور حقیقت یہی ہے کہ انسان کی اصلاح وفساد میں سب سے بڑا دخل صحبت اور ماحول کا ہوتا ہے، اسی لئے حضرت حسن بصریؒ نے ان دونوں آیتوں کے دو لفظوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پورے دین کو دو حرف لا کے اندر جمع کر دیا ہے ایک پہلی آیت میں "لَا تَطْغَوْا" اور دوسری آیت میں "لَا تَرْكَنُوْا" پہلے لفظ میں حدود شرعیہ سے نکلنے کی اور دوسرے لفظ میں برے لوگوں کی صحبت کی ممانعت ہے اور یہی سارے دین کا خلاصہ ہے۔"

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى

وَلَن تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ قُلْ اِنَّ هُدَى اللهِ هُوَ الْهُدٰى وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللهِ مِن وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ○ (البقرة:۱۲۰)

ترجمہ: یہود اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو، صاف کہہ دو کہ راستہ بس وہی ہے جو اللہ نے بتایا ہے ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لئے نہیں ہے۔

اس آیت سے تین باتیں خاص طور سے معلوم ہوتی ہیں:

① یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے ہیں۔

② ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے دوسرے تمام مذاہب، عقائد اور نظریات خواہشات نفس پر مبنی ہیں۔

③ لوگوں کی خواہشات کی پیروی اگر مسلمان کریں گے تو ان کا حامی و مددگار کوئی نہ ہوگا اور وہ بے سہارا ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ تینوں باتیں دائمی اُصول کے طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نزول وحی کے زمانہ یا دور اول تک کے لئے خاص تھیں اور آئندہ وقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ یہ تبدیل ہو سکتی ہیں۔

یہ ہدایات جس خاص پس منظر میں دی گئی ہیں، وہ پس منظر بھی گویا آئندہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔انسانی نفسیات ہمیشہ ایک ہی رہی ہیں اور آئندہ رہیں گی جن انسانی نفسیات کے تناظر میں یہ باتیں کہی گئی ہیں وہ نفسیات آج بھی ظاہر ہورہی ہیں۔اس لئے آج بھی مسلمان ان اُصولی ہدایت کا محتاج ہے۔

جیسا کہ پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں میں یہ خبریں آچکی ہیں کہ کئی مسلم ممالک میں اسکولی نصاب سے وہ آیات قرآنی نکالی جارہی ہیں جن میں یہود ونصاریٰ پر کوئی تنقید کی گئی ہے۔اسی طرح جہادی احکام پر مشتمل حصوں کو بھی حذف کیا جارہا ہے۔اس طرح کا عمل مغرب ''یہود ونصاریٰ'' کی ناراضگی سے بچنے اوران کو خوش رکھنے کے لئے کیا جارہا ہے لیکن قرآن کی حقانیت کا یہ ثبوت ہے کہ یہود ونصاریٰ کو خوش کرنے میں مسلم ممالک مسلسل ناکام ہورہے ہیں اور خوش ہونے اور راضی ہونے کے لئے قطعاً وہ تیار نہیں ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک خوش ہونے کا جو معیار ہے اس پر ابھی مسلمان پورے نہیں اتر رہے ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ جو مسلمان مغربی تہذیب میں بالکل ڈوبے ہوئے ہیں۔ان کے دلوں میں بھی توحید کی چنگاریاں دبی پڑی ہیں جو کبھی بھی بھڑک سکتی ہیں۔

مغرب کو راضی کرنے کی یہ کوشش عموماً مادی مفاد کے تحت کی جارہی ہے۔لیکن دعوتی مفاد کے نام پر بھی کی جاتی ہیں اور قرآنی حقائق اور ہدایات کی پرواہ نہیں کی جاتی۔واعظین اور خطیب حضرات اسی طرح کے مصالح کے پیش نظر لفظ جہاد کی جگہ عام طور پر جدوجہد کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔تاکہ سامنے والوں کی نظر عتاب سے بچے رہیں اور جہادی گروپ کی ہمنوائی کے الزام سے محفوظ رہیں۔حالانکہ جہاد ایک قرآنی اور دینی اصطلاح ہے صلوٰۃ، زکوٰۃ اور صیام کی طرح۔ان کی تشریح میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن ان اصطلاحوں سے گریز کرنا بے دینی کی بات ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ جس طرح دعوت ہمارا ایک فریضہ ہے اسی طرح یہ بھی ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کوشش کرتے رہیں کہ دعوتی مشن کو کوئی صدمہ نہ پہنچے اور احتیاط ہمارے لئے لازم رہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کسی مسلمان کی مدد اس خیال سے نہ کی جائے کہ ہمارے مدعوئین پر بُرا اثر پڑے گا یا کسی مسلم خاتون کی عصمت ریزی پر خاموشی اختیار کرلی جائے تاکہ ہمارے مدعوئین ناراض نہ ہوجائیں۔یا شعائر اللہ کی بے حرمتی ہم اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور چوں نہ کریں تاکہ دعوت کے مواقع باقی رہیں اس کے لئے کتاب وسنت سے دلیل لانی پڑے گی ایسا تو نہیں کہ دعوتی مشن کو صدمہ سے بچانے کا نکتہ اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض کو ادا نہ کرنے کے لئے بہانہ ہے جو شیطان نے ہمیں سجھایا ہے اور اپنی بزدلی اور بے غیرتی

پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک شیطانی وسوسہ ہے۔ یہ وسوسہ کوئی نیا وسوسہ نہیں ہے اور دورِ اول میں بھی کچھ لوگوں کے اندر پیدا ہورہا تھا غالباً اسی بناء پر مسلمانوں کو پوری طرح یکسو کردیا گیا اور یہ صاف صاف بتادیا گیا کہ اعداء دین تم سے کبھی خوش اور راضی نہیں ہوسکتے اور نہ اپنی ریشہ دوانیوں سے باز آسکتے ہیں۔

وَلَا یَزَالُوْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ حَتّٰی یَرُدُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (البقرۃ:۲۱۷)

ترجمہ: وہ برابر تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کا بس چلے۔

دشمنانِ اسلام کو راضی اور مطمئن رکھنے کی کوشش کرنے کی تعلیم اور ہدایت ہمیں کہیں نہیں ملتی بلکہ جو تعلیم دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو ادا کردو، حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو، حالات جو کچھ بھی ہوں ہر حالت میں تقویٰ کی روش اختیار کرو، اللہ کے ذکر سے غافل نہ رہو، راہِ راست پر کسی کو لانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے تمہاری ذمہ داری بس یہ ہے کہ تم اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچادو۔

نبی کریم ﷺ سے بڑھ کر حسن سلوک کرنے والا اور صبر کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ لیکن آپ ﷺ کی نرم روی اور خوش اخلاقی دعوت کے مواقع کو محفوظ نہ رکھ سکی یہاں تک کہ بالآخر آپ کو مکہ چھوڑنا پڑا۔ مدینہ تشریف لائے پھر جنگوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ مدعوئین کی کسی حرکت کی اطلاع ملتے ہی کوئی نہ کوئی دستہ متحرک ہوجاتا ہے۔ یہ نہیں سوچا جاتا کہ خاموش بیٹھو ورنہ تمہارے مدعوئین بدظن ہوجائیں گے اور دعوتی مشن کو صدمہ پہنچ جائیگا۔

رجب ۲ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ مکہ اور طائف کے علاقے میں مدعوئین کی نقل وحرکت اور ان کے عزائم کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے روانہ فرمایا تھا۔ اس دستہ کو قریش کا ایک تجارتی قافلہ مل گیا اس کو انہوں نے پکڑلیا ان میں سے ایک کو قتل کردیا اور بقیہ کو گرفتار کر کے مدینہ لائے۔ یہ واقعہ رجب کے آخر میں یا شعبان کے شروع میں پیش آیا۔ مدعوئین نے پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ مسلمان ماہِ حرام کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔ اس موقعہ پر سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ نازل ہوئی جس میں مدعوئین کے طرز عمل پر نکیر کی گئی کہ تم کس منہ سے مسلمانوں کے خلاف بول رہے ہو۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ اور مسلمانوں سے کہا کہ تم سادہ لوحی سے کام نہ لو اور ان کے اعتراضات سے متاثر نہ ہو یہ تو ہمیشہ اسی کوشش میں رہیں گے کہ کسی نہ کسی طریقہ سے تمہیں راہ راست سے بھٹکادیں۔ مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ تم اپنے ہاتھوں دعوت کے مواقع کیوں ضائع کررہے ہو۔

شوال ۲ ہجری کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک یہودی نے ایک مسلمان انصار یہ عورت کی بے حرمتی کی تو ایک مسلمان نے اس یہودی کو مار ڈالا۔ یہودیوں نے اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس معاملہ نے طول پکڑا مسلمانوں نے یہودیوں کے قلعہ کا پندرہ دن تک محاصرہ کئے رکھا۔ پھر پورے قبیلہ کو جلاوطن کر دیا گیا۔

قرآن میں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ اس طرح کی ہیں۔

مسلمانو!

تم دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں کمزور نہ پڑ جاؤ۔ وہ اپنے لئے نرمی کے بجائے تمہارے اندر سختی پائیں تم ان کی طرف نہ جھکو۔ ہوشیار رہو تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس کی وجہ سے تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔ تم ان پر رعب ڈالنے کی کوشش میں رہو۔

الغرض مدعوئین کو مسلمانوں کے بارے میں خوش گمان رکھنے کی کوشش میں نہ تو غیرت اور ایمانی تقاضے کو پورا کرنے سے رکنے کی تعلیم دی گئی اور نہ اپنے کو سیدھا سادہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہدایت دی گئی ہے بلکہ سخت بن کر رہنے کی بات کہی گئی تاکہ ان کی جرأتیں نہ بڑھ جائیں۔

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۝ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۗ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ (البقرۃ:۱۰۹)

ترجمہ: اہل کتاب میں اکثر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں ایمان سے پھیر کر کفر کی طرف پلٹا لے جائیں، اگرچہ حق ان پر ظاہر ہو چکا ہے، اپنے نفس کے حسد کی بناء پر۔ اس کے جواب میں تم عفو و درگذر سے کام لو یہاں تک کہ اللہ خود ہی اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔ مطمئن رہو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اس آیت میں اہل کتاب کی ایک پُرفریب چال اور مکر کو دفع کرنے کے ضمن میں مسلمانوں کو معاف اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا۔ اسی طرح قرآن کے متعدد مقامات پر معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اللہ کے نیک بندوں کی صفت بھی بتائی گئی ہے کہ وہ غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اعراض کرنا، درگزر کرنا، معاف کر دینا اس میں شک نہیں کہ ایک اعلیٰ اور بہترین صفت ہے۔ لیکن اس کی ایک حد ہے اور اس کے کچھ مواقع ہیں۔ لیکن حالات کے دباؤ اور موجودہ صورتحال کے تناظر میں اعراض اور درگزر کرنے کی نسبت دین اسلام کے تئیں اس طرح کی جاتی ہے کہ اصل حقیقت پر پردہ پڑ جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام عیسائیت سے بڑھ کر عفو و درگزر کا حکم دیتا ہے اور اسلام کی تصویر بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ سختی اور نرمی کا جو معتدل اور متوازن نظام اسلام رکھتا ہے اس کی صورت مسخ کر دی جاتی ہے۔

اب دیکھئے قرآن کیا کہتا ہے:

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ (البقرۃ:۱۹۰)

ترجمہ: اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○ (البقرۃ:۱۹۴)

ترجمہ: پس تم پر جو دست درازی کرے تم بھی اسی طرح اس پر دست درازی کرو اور جان لو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً. (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے تم سب مل کر لڑو جیسا کہ وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ (التوبۃ:۳۸)

ترجمہ: اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے اللہ کی راہ میں نکلنے کیلئے کہا گیا تم زمین سے چمٹ کر رہ گئے۔

اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ (التوبۃ:۳۹)

ترجمہ: اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہارے علاوہ کسی دوسری قوم کو لا دے گا۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا.
(النساء: ۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے کس مردوں اور عورتوں اور بچوں کی خاطر نہیں لڑتے جو کمزور پا کر دبا دیئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔

ان آیات میں جنگ کا حکم بھی ہے اور ترغیب بھی۔ نیز جنگ سے جی چرانے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ قرآن میں جنگ میں جان کی بازی لگانے والوں کے لئے مغفرت کی اور جنت کی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کو مردہ کہنے سے منع کیا گیا ان ہی کو حقیقی زندگی حاصل ہے بتایا گیا۔ جہاد و قتال کو فرض بتایا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ بظاہر ناپسندیدہ ہے لیکن حقیقت میں وہ تمہارے لئے باعث

خیر ہے۔ جنگ میں مرنے والوں کے درجات علیا اور اجر وثواب کا ذکر جس انداز میں اور جس کثرت سے کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی نیکی نہیں ہے۔ ان باتوں کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے کہ تشدد کا جواب طاقت سے دینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی ہے؟ یہ بات بالکل ایسی ہے کہ کوئی دانشور بھری مجلس میں پورے زور سے کہے کہ قرآن میں جہاد وقتال کا لفظ نہیں آیا ہے اور جنگ بدر وحنین اور جنگ اُحد اور خندق نام کا کوئی معرکہ کبھی پیش نہیں آیا ہے۔ اسلام سراسر امن وسلامتی کا مذہب ہے مگر جہاد وقتال سے متعلق درجنوں آیات قرآنی، سینکڑوں فقہی اوراق کتب اور ہزاروں صفحات پر مشتمل اسلامی تاریخ کو نظرانداز کرنا کیونکر ممکن ہوسکتا ہے۔

سورہ شوریٰ کی ۳۹ نمبر آیت پر پہلے مولانا مودودیؒ کا نوٹ پڑھئے:

’’یہ بھی اہل ایمان کی بہترین صفات سے ہے وہ ظالموں اور جباروں کیلئے نرم چارہ نہیں ہوتے ان کی نرم خوئی اور عفو ودرگذر کی عادت کمزوری کی بناء پر نہیں ہوتی۔ انہیں بھکشوؤں اور راہبوں کی طرح مسکین بن کر رہنا نہیں سکھایا گیا ہے۔ ان کی شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب غالب ہوں تو مغلوب کے قصور معاف کردیں۔ جب قادر ہوں تو بدلہ لینے سے درگزر کریں اور کسی زیردست یا کمزور آدمی سے کوئی خطا سرزد ہوجائے تو اس سے چشم پوشی کر جائیں لیکن جب کوئی طاقتور اپنی طاقت کے زعم میں ان پر دست درازی کرے تو ڈٹ کر کھڑے ہوجائیں اور اس کے دانت کھٹے کردیں۔ مومن کبھی ظالم سے نہیں دبتا اور منکر کے آگے نہیں جھکتا۔ اس قسم کے لوگوں کے لئے وہ لوہے کا چنا ہوتا ہے جسے چبانے کی کوشش کرنے والا اپنا ہی جبڑا توڑ لے گا۔‘‘

سورۂ شوریٰ آیت ۳۹ کے سیاق وسباق میں ایک تفسیری اشکال

غور طلب بات یہ ہے کہ ایک جگہ ’’هُمْ یَغْفِرُوْنَ ‘‘یعنی وہ معاف کرتے ہیں۔ دوسری جگہ ’’اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ‘‘ یعنی جب ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے تو وہ مقابلہ کرتے ہیں۔ تیسری جگہ ’’فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَی اللّٰهِ‘‘کہا گیا۔ یعنی پس جو معاف کرے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان باتوں میں باہمی ربط اور تعلق کیا ہے؟ بظاہر دو متضاد صفتوں کا حامل مسلمانوں کو بتایا ہے۔

ایک طرف کہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے اندر معاف کرنے کی صفت پائی جاتی ہے۔

دوسری طرف یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ وہ مقابلہ کرتے ہیں اور انتقام لیتے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی؟
اس اشکال کو مختلف مفسرین نے رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔

صاحب روح المعانیؒ کا جواب

صاحب روح المعانیؒ نے کہا:

''کئی لوگوں نے کہا ہے کہ ہر صفت کے ظاہر ہونے کا ایک موقع ہے جس میں وہ قابل تعریف ہوتی ہے پس درگزر کی صفت اس وقت قابل تعریف اور محمود ہے جب معافی اور درگزر ایسے شخص سے کیا جائے جو کمزور ہو اور اسے اپنے جرم کا اعتراف ہو۔ لفظ يَغْفِرُوْنَ سے اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے اور انتقام اور مقابلہ اس وقت محمود ہوتا ہے جب سامنے والا دشمنی اور مخاصمت پر اصرار کر رہا ہو اور لفظ يَنْتَصِرُوْنَ اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اگر اس کے برعکس درگزر اور انتقام کا عمل کیا جائے تو دونوں مذموم ہیں۔ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے علامہ نے عربی کے دو شعر پیش کئے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ جب تم کسی شریف کی عزت کرو گے تو وہ تمہارا گرویدہ ہو جائے گا اور جب کسی کمینہ کے ساتھ اکرام کرو گے تو وہ اپنی کمینگی میں اور بڑھ جائے گا۔ تلوار کی جگہ شبنم اور شبنم کی جگہ تلوار رکھنا مضر ہے۔''

امام رازیؒ کا جواب

امام رازیؒ نے اس شبہ کو یوں دور کیا ہے:

''عفو و درگزر کی دو قسمیں ہیں ایک عفو درگزر وہ ہے جس سے فتنہ دب جائے اور جو مجرم کے لئے سزا ثابت ہو اور وہ اپنے جرم سے باز آ جائے۔ دوسرا عفو و درگزر وہ ہے جس سے مجرم کی جرأت میں اضافہ ہو جائے اور اس کے غیظ و غضب کو شہ ملے۔ عفو و درگزر سے متعلق آیات میں پہلی قسم کے درگزر کی تعریف کی گئی اور اس کو مسلمانوں کی صفت بتائی گئی ہے اور جہاں عفو و درگزر سے جرم پر جرأت بڑھ جانے کا امکان ہو وہاں عفو و درگزر کے بجائے مومنانہ صفت انتقام لینے کو بتایا گیا ہے۔''

مفتی شفیع صاحبؒ کا جواب

اس کی مزید وضاحت کے لئے تفسیر معارف القرآن کے یہ الفاظ پڑھئے:

''حضرت ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا کہ سلف صالحین یہ پسند نہ کرتے تھے کہ مومنین اپنے آپ کو فساق و فجار کے سامنے ذلیل کریں اور ان کی جرأت بڑھ جائے۔ اس لئے جہاں یہ خطرہ ہو کہ معاف کرنے سے فساق و فجار کی جرأت بڑھے گی وہ اور نیک لوگوں کو ستائیں گے وہاں انتقام لے لینا بہتر ہوگا۔ اور معافی کا افضل ہونا اس

صورت میں ہے جبکہ ظلم کرنے والا اپنے فعل پر نادم ہو اور ظلم پر اس کی جرأت بڑھ جانے کا خطرہ نہ ہو۔ قاضی ابوبکر ابن عربی نے احکام القرآن میں اور قرطبی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے کہ عفو و انتقام کے دونوں حکم مختلف حالات کے اعتبار سے ہیں جو ظلم کرنے کے بعد شرمندہ ہو جائے اس سے عفو افضل ہے اور جو اپنی ضد اور ظلم پر اصرار کر رہا ہو اس سے انتقام لینا افضل ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کا جواب

مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب نے آیت ﴿۴۱﴾ کے فقرہ "وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ" پر مندرجہ ذیل نوٹ لکھا ہے:

''یہ ان لوگوں کے شبہ کا جواب ہے جو دینداری کا ایک تقاضہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ آدمی دوسروں کے ہاتھوں پٹتا رہے اور ان سے کوئی انتقام نہ لے اگر کوئی انتقام لے تو یہ چیز دینداری کے خلاف سمجھی جاتی ہے اور اس کو بھی برابر کا مجرم سمجھ لیا جاتا ہے۔

فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں الزام ان لوگوں پر نہیں ہے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کئے جانے کے بعد انتقام لیا بلکہ الزام ان لوگوں پر ہے جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور بلا کسی استحقاق کے خدا کی زمین پر سرکشی اور طغیان کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

دوسرا اشکال

اس موقع پر بعض لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے ایک بیٹے ہابیل کے رویہ کو بھی پیش کرتے ہیں جس نے قابیل سے کہا تھا تم اگرچہ کہ مجھے قتل کرنا چاہتے ہو لیکن میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ۔

یہاں بھی ایک اشکال ہے اشکال کی وجہ یہ ہے کہ شریعت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دفاع کی وہ حیثیت نہیں ہے جو شریعت عیسوی میں تھی۔ جیسا کہ مشہور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے جو تمہارے ایک گال پر مارے اُسے تم اپنا دوسرا گال بھی پیش کر دو۔

اس کے برخلاف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک آدمی آیا اور کہا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کا کیا خیال ہے ایک شخص آتا ہے اور میرا مال چھین لیتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم اس کو اپنا مال نہ دو۔ پھر اس آدمی نے کہا اگر وہ مجھ سے جنگ کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تم اس سے جنگ کرو۔

اس آدمی نے کہا۔آپ کا کیا خیال ہے اگر وہ مجھے قتل کر دے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم شہید ہو گئے۔

پھر اس آدمی نے پوچھا آپ کا کیا خیال ہے اگر میں اس کو قتل کر دوں۔

آپ نے فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔ (الجنایات۔مشکوۃ)

مشہور حدیث

من قتل دون ماله و عرضه فهو شهيد

ترجمہ: جو اپنے مال اور عزت کو بچانے میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

دفاع کے سلسلہ میں اس طرح کی تعلیم کی وجہ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہابیل نے کیوں کہا کہ میں تمہیں قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہ اُٹھاؤں گا۔

اس کا **ایک** جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ ہابیل کی بات وعظ اور نصیحت پر محمول کی جائے کہ اس طرح کی بات سن کر قابیل کو کچھ تو احساس ہوگا کہ مجھے اپنے مخلص بھائی پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیئے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بہ نیت قتل ہاتھ نہ اُٹھانے کی بات ہابیل نے کہی تھی۔مطلق دفاع نہ کرنے کی بات نہیں تھی۔

ایک **تیسرا** جواب حضرت مجاہدؒ نے دیا ہے کہ ممکن ہے اس وقت کی شریعت میں دفاع جائز نہ رہا ہو۔

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ○ (البقرہ:۱۹۵)

ترجمہ: اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور احسان کرو بلاشبہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ (تفہیم القرآن)

اس آیت سے پہلے جنگ کا حکم دیا گیا اس کے بعد اس آیت میں خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جنگ میں جان کے ساتھ ساتھ مال کی بھی ضرورت ہوتی ہے رسد اور اسلحہ کے بغیر کامیاب جنگ نہیں کی جا سکتی اور بسا اوقات لڑنے والے کے پاس مال نہیں ہوتا کہ سامانِ حرب مہیا کرے اور اپنے بال بچوں کے لئے کسب معاش کی فکر سے آزاد ہو کر میدان میں جائے۔ اس لئے جنگ کے حکم کے معاً بعد انفاق کرنے کا حکم آیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ حکمت بھی ہو کہ جو لوگ جسمانی اعتبار سے میدان میں نہیں جا سکتے ان کے لئے جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل کرنے کا موقع نکالا جائے۔ "فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ" کی قید لگائی گئی اس میں جہاں ترغیب کا پہلو ہے کہ ''تمہارا انفاق اللہ کے لئے ہوگا اللہ اس کا بدلہ دے گا تمہارا مال ضائع نہیں ہوگا'' وہیں یہ پہلو بھی ہے کہ ''جو بھی خرچ کرو اللہ کے واسطے ہی خرچ کرو۔''

انفاق کا حکم مثبت طریقہ پر دینے کے بعد اسی بات کو مزید مؤکد کرنے کے لئے منفی انداز میں کہا گیا کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو جیسے کسی کو کہا جائے: ''بازار میں جا کر کاروبار کرو گھر میں بیٹھ کر اپنے پیر پر کلہاڑی نہ مارو۔''

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ - کا ایک ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ دو ترجمے اور ملاحظہ کیجئے:

''اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو''۔ (احسن التفاسیر)

''اپنے آپ کو تباہی میں نہ جھونکو''۔ (تدبر قرآن)

ان تین ترجموں میں سے کسی کو غلط نہیں قرار دیا جا سکتا لیکن سوچنے کے لئے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ''نہ ڈالو'' کی جگہ ''نہ پڑو'' کیسے ترجمہ کیا گیا اور پہلے ترجمہ میں ''اپنے آپ کو'' کا لفظ کس لفظ کا ترجمہ ہے اور تیسرے ترجمہ میں ''نہ جھونکو'' کے الفاظ کیسے آئے؟ درحقیقت اس فقرہ میں زبان و بیان کی ایک خاص نزاکت ہے جس کو نمایاں کرنے کی اردو مترجمین نے کوشش کی ہے۔ بالکل لفظی ترجمہ یہ ہے۔ ''مت ڈالو ہاتھوں اپنے کو طرف ہلاکت کے۔''

ایک امکان یہ بھی ہے کہ ''لَا تُلْقُوْا'' سے منفی انداز میں جو بات کہی گئی ہے اس کا تعلق صرف انفاق سے ہو اور دوسرا امکان کہ انفاق اور قتال دونوں سے ہو۔ ہمارے خیال میں اس کو کسی سے بھی جوڑا جائے مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔ علامہ آلوسیؒ نے اپنی تفسیر روح المعانی میں اس موقع پر جو کچھ لکھا اس کا ماحصل یہ ہے۔

> ''اس کا تعلق جنگ اور انفاق دونوں سے ہے مطلب یہ ہے کہ جنگ اور انفاق کو چھوڑ دینا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دینے کے برابر ہے گویا پہلی ہی بات تاکید کے لئے منفی انداز میں کہی گئی ہے۔ اس مفہوم کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جس کو ایک سے زیادہ راویوں نے ابوعمران سے روایت کیا ہے انہوں نے بیان کیا کہ ''ہم قسطنطنیہ میں تھے رومیوں کا ایک فوجی دستہ سامنے آیا اس وقت مسلمانوں میں سے ایک شخص نکلا اور اس فوجی دستہ میں گھس گیا، لوگ چیخ پڑے ''القی بیدہ الی التھلکۃ''، یعنی اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ اس موقع پر حضرت ابوایوب انصاریؓ کھڑے ہوگئے اور فرمایا۔ لوگو! تم اس آیت کے یہ معنی کر رہے ہو جو صحیح نہیں ہے۔ یہ آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اللہ جل شانہ نے جب اسلام کو عزت بخش دی اور حامیان دین کی کثرت ہوگئی تو ہم میں سے بعض لوگوں نے آپس میں چپکے چپکے کہنا شروع کیا۔ ہمارے اموال ضائع ہوگئے۔ اب اسلام کو اللہ نے عزت دے دی ہے اور دین کے انصار و مددگار بہت ہوگئے ہیں اب ہم اپنی جگہ ٹھہر کر اپنے پچھلے نقصانات کی تلافی کرلیں۔ یہ آیت دراصل ہمارے اس خیال کی تردید میں نازل ہوئی اور اللہ تعالی کی طرف سے بتایا گیا کہ تمہاری سوچ صحیح نہیں ہے جہاد کو چھوڑ دینا اور اپنے مال و دولت میں بڑھوتری کے لئے اپنی جگہ بیٹھے رہنا انتہائی تباہ کن ہوگا اور اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں ہلاکت کے الاوے میں جھونک دینے کے ہم معنی ہوگا''

امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں براء بن عازبؓ کی ایک تفسیر نقل کی ہے:

''وہ یہ کہ ہلاکت میں ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی فائدے کی توقع نہیں ہے وہاں جنگ کر کے اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ البتہ فائدہ میں دشمن کو نقصان پہنچانا بھی شامل ہے۔ یعنی کم از کم دشمن کو نقصان پہنچانے کی توقع جنگ میں شامل ہونے کے لئے ضروری ہے۔ جہاں اور جب دشمن کو کوئی نقصان اور زخم پہنچانے کی امید نہ ہو، وہاں اور اس وقت جنگ سے اپنے آپ کو بچانے کا حکم دیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں جس جنگ سے دشمن کو نقصان پہنچنے کی امید ہو اس جنگ سے روکا نہیں گیا اور اس جنگ کو بے فائدہ نہیں کہا جائیگا۔

کچھ دوسرے لوگوں نے براء بن عازبؓ کی تفسیر پر حرف زنی کی ہے اور اپنی دلیل میں ابوایوب انصاریؓ کی روایت پیش کی ہے۔ ایک اور روایت حضرت شافعیؒ کی ہے کہ ''اللہ کے رسول ﷺ نے ایک موقع پر جنت کا ذکر فرمایا۔ جنت کا حال سن کر ایک انصاری صحابیؓ نے عرض کیا اگر میں ثواب کی نیت کروں اور صبر کروں اور اسی حالت میں قتل کر دیا جاؤں تو کیا ہوگا'' آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم جنت میں جاؤ گے یہ سن کر وہ دشمنوں میں گھس گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے آپ ﷺ کے سامنے شہید کر دیے گئے۔

ایک اور صحابی زرہ پہنے ہوئے تھے انہوں نے اپنی زرہ پھینک دی اور دشمنوں میں گھس گئے اور شہید کر دیے گئے۔ ایک انصاری صحابی جو عین موقع پر موجود نہیں تھے پیچھے رہ گئے تھے آئے انہوں نے دیکھا کہ شہداء کی لاشوں پر چڑیاں منڈلا رہی ہیں یہ دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا جہاں میرے ساتھی قتل کئے گئے ہیں میں وہاں جائے بغیر نہیں رکوں گا چنانچہ وہ وہاں گئے اور وہ بھی شہید کر دیے گئے۔ اس واقعہ کا تذکرہ نبی ﷺ کے سامنے کیا گیا تو آپ ﷺ نے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ تحسین فرمائی۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک قلعہ کا محاصرہ کر رکھا تھا ان میں سے ایک شخص تنہا آگے بڑھا اور لڑنے لگا اور شہید کر دیا گیا۔ یہ دیکھ کر کچھ لوگ بول پڑے ''القی بیدہ الی التهلکة'' اس نے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کی یہ بات سنی اور فرمایا: لوگوں نے جھوٹ کہا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ لوگوں میں سے بعض اپنی جان قربان کر دیتے ہیں اللہ کی رضا جوئی میں۔ (البقرۃ: ۲۰۷)''

علامہ آلوسیؒ اور علامہ فخر الدین رازیؒ کی جو گفتگو ہم نے اوپر نقل کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شہادت کا حصول بذات خود ایسی چیز ہے جس کو مقصود و مطلوب بنایا جانا قرآن کی روشنی میں صحیح قرار پاتا ہے اور اصحاب رسول ﷺ نے قرآن کے اس منشاء کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور اپنی عملی زندگی میں اس کی عملی تصویر بنا کر دکھا دی اور کسی بھی نفع و نقصان کی پرواہ کئے بغیر جام شہادت نوش فرماتے رہے۔

اس مفہوم کو علامہ اقبال نے نہایت ہی مختصر لفظوں میں یوں واضح فرمایا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

شہادت مومن کا مقصود و مطلوب ہے ہی، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اللہ کے یہاں بھی جیسے وہ ایک شئی مقصود و مطلوب ہو۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت ۱۴۰ پر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ جب کبھی کفار کو مسلمانوں پر غلبہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کا پلڑا اونچا کرتے ہیں تو اس میں دیگر بہت ساری حکمتوں اور مصلحتوں کے ساتھ ایک مصلحت یہ ہوتی ہے کہ کچھ مسلمانوں کو شہادت کی عزت اور سعادت سے ہمکنار کر کے انہیں اپنے خاص بندوں میں بنا لینا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو غلبہ و کامرانی یا دشمنوں کو کچھ چوٹ لگانا اور نقصان پہنچانا جہاں مقاصد جہاد میں اللہ کے نزدیک شامل ہے وہیں ایک مقصد بعض بندوں کو درجۂ شہادت پر فائز کر کے ان کا اکرام کرنا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا جب کہ اللہ کی طرف سے ایسے مواقع پیدا کئے جائیں کہ مسلمان کفار کے ہاتھوں مارے جائیں۔

غالباً اسی لئے روایات اور تاریخ میں ایسے واقعات ہم کو نظر آتے ہیں کہ فتح و نصرت کا سوال کیا!؟ دشمن کو معمولی چوٹ لگانے کی امید نہیں ہوتی صرف مرکھپ جانے کے حالات ہوتے ہیں لیکن مسلمان کامل جذبۂ سرفروشی کے ساتھ معرکوں میں گھس جاتے ہیں۔ بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑانے اور کشتیوں کے جلانے اور کھجور کھاتے ہوئے کھجور پھینک دینے کی روایات اسی نقطۂ نظر کی علامت بن کر تاریخ اسلامی کے افق پر درخشاں ہیں۔

غزوہ اُحد کے بعد مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران ۱۴۰-۱۴۱)

ترجمہ: یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر اُلٹ پھیر کرتے رہتے ہیں تا کہ اللہ تمہارا امتحان کرے اور ممیز کردے ایمان والوں کو اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا اور تا کہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کردے اور کافروں کو مٹادے۔

اس آیت میں وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ (یعنی تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے) کے ٹکڑے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کا مرتبہ اتنا عظیم ہے کہ اس سے کچھ مسلمانوں کو نوازنا اللہ کی جانب سے

بطور اکرام ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ ظالموں سے محبت کرنے کی بناء پر مسلمانوں کے خلاف ان کو موقع دیتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو قتل کریں بلکہ اللہ یہ موقع اپنے بندوں کو ایک عظیم نعمت سے سرفراز کرنے کے لئے پیدا کرتا ہے۔ اس موضوع پر مزید روشنی کے لئے سورہ انفال کی مندرجہ ذیل آیت پر غور کیجئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَىِٕذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَاۗءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ○ (الانفال:۱۶-۱۵)

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم کافروں سے دوبدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پیٹھ مت پھیرو اور جو کوئی ان سے پیٹھ پھیرے گا مگر یہ کہ چال چلنا ہو لڑائی کے لئے یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لیتا ہو وہ اللہ کے غضب میں آ جائے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب اسلامی لشکر کی دشمنان دین سے مڈبھیڑ ہونے کی نوبت آ جائے اور دونوں فریق آمنے سامنے ہوں اس وقت کسی مسلمان کے لئے پیٹھ پھیر کر بھاگنا حرام ہے۔ حدیث اور فقہ کی زبان میں اس کو ''فرار من الزحف'' کہا گیا ہے۔ حدیث رسول ﷺ کے مطابق فرار من الزحف گناہِ کبیرہ ہے۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوھریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا: سات مہلک چیزوں سے بچو، عرض کیا گیا اللہ کے رسول ﷺ! وہ کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، معصوم کو قتل کرنا، یتیم کا مال کھانا، سود کھانا، جنگ کے دن پیٹھ پھیر کر بھاگنا، بے گناہ عورتوں پر تہمت لگانا۔

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کیساتھ کوئی عمل نفع نہیں دیگا۔ اللہ کے ساتھ شرک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور فرار من الزحف۔ آیت کے لحاظ سے جنگ میں پیچھے ہٹنا صرف دوصورتوں میں جائز بتایا گیا۔

ایک یہ کہ جنگی چال کے طور پر کوئی پیچھے ہٹ جائے۔

دوسرے یہ کہ پیچھے اس لئے ہٹا جائے کہ مجاہدین کے کسی دستے سے مل کر پھر حملہ کرنا مقصود ہو۔

ان دوصورتوں کے علاوہ کسی صورت میں بھی دشمن کے مقابلہ سے پھر کر بھاگنا بڑا گناہ ہے خواہ دشمن کی تعداد اور قوت وشوکت کتنی ہی زیادہ ہو۔ جیسا کہ غزوۂ بدر میں اسلامی لشکر نے ایک ہزار دشمنوں کے مقابلہ میں تین سَو تیرہ ہونے کے باوجود ڈٹ کر مقابلہ کیا جبکہ ساز وسامان کے اعتبار سے بھی مسلمان کمزور حالت میں تھے۔ بعد میں سورۂ انفال کی آیت نازل ہوئی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۝ (الانفال:٦٦)

ترجمہ: اب اللہ نے تمہاری ذمہ داری ہلکی کردی اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے سو اگر تم میں سو ثابت قدم رہیں گے تو دوسو پر غالب رہیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آسانی فرمادی ہے اور تمہاری کمزوری کے پیش نظر یہ قانون جاری کر دیا کہ اگر مسلمان سو ہوں اور وہ ثابت قدم ہوں تو وہ دوسو پر غالب آسکیں گے۔ یہاں پر ایک لحاظ سے بشارت دی گئی ہے۔ صراحت کے ساتھ بھاگنے کے لئے مذکورہ دونوں صورتوں کے علاوہ کوئی تیسری صورت نہیں بتائی گئی ہے۔ لیکن فقہائے اُمت نے اس سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر دشمن کی تعداد دگنے سے زیادہ ہو تو مقابلہ سے بھاگنا جائز ہوسکتا ہے۔ اس مقام پر یہ پہلو بہت ہی اہم ہے کہ فقہاء نے بھاگنے کے لئے صرف جواز کی بات کہی ہے۔ ان کے نزدیک بھاگنا واجب نہیں ہے۔ یعنی اگر دشمن کی تعداد دوگنی سے زیادہ ہو اور مسلمان نہ بھاگیں تو گناہ گار نہیں ہوں گے۔ کسی چیز کے محض جائز ہونے اور واجب ہونے کے درمیان جو فرق ہے اس کو سمجھنا چاہئے۔ عموماً اس جواز کو لوگ ایسا بیان کرتے ہیں جیسا کہ مقابلہ سے بھاگنا ضروری اور واجب ہو۔ جبکہ قرآن میں متعدد مقامات پر جانبازی اور اللہ کی راہ میں جان لڑانے کے لئے ترغیب دی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ کفار کی کثرت تعداد کو دیکھ کر گھبراؤ نہیں۔ اس لئے کہ اللہ کے حکم سے کوئی چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر غالب آسکتی ہے۔ فتح و کامیابی کا انحصار لشکر کی کمی بیشی پر نہیں ہے بلکہ اللہ کے اذن پر ہے۔ ساتھ ہی میں ان لوگوں کی تعریف اور مدح قرآن میں فرمائی گئی ہے جو بے باکی اور جانبازی کا مظاہرہ کرتے ہیں چنانچہ کہا گیا ہے کہ......

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۝ (آل عمران:١٧٣)

ترجمہ: وہ جن سے لوگوں نے کہا تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

دوگنے سے زیادہ لڑنا اور ان پر حملہ کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ چنانچہ غزوۂ موتہ میں تین ہزار مسلمان دولاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلامی تاریخ بھری پڑی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب دشمن کی تعداد دگنی سے زیادہ ہوتو بھاگنے کیلئے جواز تو ہے لیکن نہ بھاگنے کی افضلیت اپنی جگہ قائم ہے۔ چنانچہ اس جواز سے فائدہ نہ اٹھانے والوں کی ہمیشہ تحسین کی گئی ہے اور بزدلی اور فرار اختیار کرنے والوں کی مذمت گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○ (آل عمران:۱۵۵)

ترجمہ: تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے اللہ نے معاف کر دیا اور اللہ بہت درگذر کرنے والا اور بردبار ہے۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کی ایک روایت میں ایسے مسلمان کی تعریف کی گئی ہے...... جو گھوڑے کی پیٹھ پر گھوڑے کی لگام پکڑے اُڑتا پھرتا ہے اور جدھر شور سنتا ہے اُس طرف دوڑ پڑتا ہے اور اپنی جان کی پرواہ نہیں کرتا۔

الغرض جان کی پرواہ کئے بغیر جو لوگ معرکۂ حق و باطل میں کود پڑتے ہیں ان کی مدح و تحسین کی جاتی ہے۔ بمقابلہ ان کے جو اپنے کو بچا بچا کر رکھنے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔

مصلحت درِ دین عیسیٰ غار و کوہ

مصلحت درِ دین ما جنگ و شکوہ

(مولانا رومیؒ)

اَلْمُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ

انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے آزادی پسند ہے۔ انسان ہر قسم کی غلامی، بے بسی اور دباؤ سے آزاد رہنا چاہتا ہے کسی کی ماتحتی، تابع داری اور محکومیت کو اگر وہ قبول کرتا ہے تو کسی مجبوری کے تحت قبول کرتا ہے۔ افراد کے علاوہ قومیں بھی غلامی کو اپنے لئے لعنت سمجھتی ہیں۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ نہ کسی فرد نے اور نہ کسی قوم نے غلامی اور بے بسی کی زندگی کو اپنے لئے مثال اور آئیڈیل زندگی قرار دیا ہو۔ انسان تو انسان کوئی چرند اور پرند بھی قید و بند اور پنجرے کی زندگی کو پسند نہیں کرتا۔ ذرا موقع ملا تو نو دو گیارہ ہو جاتا ہے۔ چرند پرند اور انسان تو درکنار اپنی جگہ ایک نرم و نازک پودا پتھر کے نیچے دبے ہوئے دانہ سے نکلتا ہے تو وہ بھی کسی نہ کسی طرح پتھر کے دباؤ سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ اس کے جسم کو کتنی بار ٹیڑھا ہونا پڑتا ہے۔ نکل نہیں پاتا تو مرجاتا ہے۔ دبے دبے رہ کر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا۔

غرض ہر ذی حیات خواہ پیڑ پودے نباتات ہوں یا زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑے اور چوپائے ہوں یا فضا میں اڑنے والے پرندے ہوں سب کی فطری شریعت میں دب کر رہنا حرام اور ناپسندیدہ ہے۔

لیکن افسوس صد افسوس کہ اشرف المخلوقات اور وہ بھی مسلمان غلامی، محکومی اور بے بسی کی زندگی گزارنے کے لئے شرعی دلائل پیش کرتا ہے اور اگر کہا جائے کہ تمہارے ایمان کا تقاضا ہے کہ تم ہر طرح کے دباؤ، ہر طرح کی غلامی، محکومی اور تابع داری سے آزاد رہو تمہاری گردن میں صرف اللہ جل شانہ کی غلامی کا پٹہ ہو تو اللہ کی بندگی اور غلامی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے کی غلامی کو قبول کرنے کا نظریہ نہیں چل سکتا۔ اللہ کی بندگی اور غلامی معتبر اس وقت ہوگی جبکہ تم ماسواء اللہ کی بزرگی کا قلادہ اپنی گردن سے نکال پھینکو گے۔ ورنہ اللہ کی بندگی کا دعویٰ تمہارے منہ پر مار دیا جائے گا، تو انسان کہتا ہے کہ نماز روزہ کرنے سے کون روکتا ہے اور وہ بندگیٔ رب اور بندگیٔ ماسواء اللہ

دونوں کو ایک ساتھ نبھانے کے لئے سو دلیل پیش کرتا ہے۔ یہ انسان بالخصوص ایک مسلمان انسان کی گراوٹ تنزلی اور پستی کی انتہاء ہے۔قرآن میں مستضعفین کا بیان یوں کیا گیا:......

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓىِٕكَةُ ظَالِمِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِیْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ قَالُوْۤا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا فَاُولٰٓىِٕكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ○ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِیْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ حِیْلَةً وَّلَا یَهْتَدُوْنَ سَبِیْلًا ○ فَاُولٰٓىِٕكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ○ وَمَنْ یُّهَاجِرْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یَجِدْ فِی الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِیْرًا وَّسَعَةً وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○

(النساء:۹۷-۱۰۰)

ترجمہ: جولوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے اُن کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے۔ فرشتوں نے کہا کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے۔ اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لئے نکلے، پھر راستہ ہی میں اُسے موت آجائے اُس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا۔ اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے۔

آیت کا تعلق پہلے سے یہ بتاتا ہے کہ اس کے پہلے جہاد کا اجر وثواب بتایا گیا اسی کے ساتھ ان کے عذاب کا ذکر ہے جو دیار کفر میں بیٹھے رہے اور جہاد میں شریک نہیں ہوئے۔ اس آیت میں غور کرتے وقت کئی سوال سامنے آتے ہیں۔

① انسان کی جان نکالنے کی نسبت کہیں اللہ کی طرف کی گئی ہے اور یَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا کہیں ملک الموت کی طرف نسبت ہے۔ قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ اور یہاں ملائکہ کی طرف نسبت کی گئی ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ موت کا خالق اللہ تعالیٰ ہے پھر موت

کا عمل ملک الموت کے ذمہ اللہ نے کیا ہے بقیہ سارے فرشتے ملک الموت کے مددگار ہیں۔

(۲) ظلم سے کیا مراد ہے۔ ظلم کا اطلاق کفر وشرک پر بھی ہوتا ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ اور معصیت پر بھی ہوتا ہے۔ اس آیت میں حالت استضعاف میں رہنے کو ظلم کہا گیا۔ ملائکہ کے سوال، فِيْمَ كُنْتُمْ کا کیا مفہوم ہے۔ امام رازیؒ نے تین باتیں اس ضمن میں کہی ہیں۔

(۱) تم اپنے دین کے معاملہ کی نسبت کس حالت میں ہو؟

(۲) اللہ کے نبی دشمنان سے لڑ رہے ہیں اس میں تمہاری کیا پوزیشن ہے؟

(۳) تم جہاد کو چھوڑ کر دیار کفر میں قیام پر کیونکر راضی ہو؟

ملائکہ کے سوال کا جواب تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ کہتے ہمارا یہ موقف ہے اور ہم یہ سوچتے ہیں یا آخر ہم سے یہ سوال کیوں کیا جاتا ہے؟ اس کے بجائے انہوں نے جواب دیا کہ ہم بے بس اور کمزور ہیں۔ اس جواب کے بعد ملائکہ نے جو بات کہی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ ان کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور کہا کہ اللہ کی زمین بہت وسیع تھی۔ تم کہیں بھی چلے جاتے۔

یہاں دو باتیں خاص توجہ کی طالب ہیں۔ حالت استضعاف میں رہنے کو کفر کے برابر بتایا گیا۔ کیونکہ مستضعفین کا انجام جہنم بتایا۔ اس لحاظ سے معاملہ کتنا نازک ہے۔ البتہ سارا انحصار احساس کی نزاکت پر ہے۔ ایک صحابی جندب بن ضمرہؓ نے جب یہ آیت سنی تو اپنے بیٹوں سے کہا۔ میں اب ایک رات بھی مکہ میں نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ بیٹوں نے انہیں چار پائی پر اُٹھا کر مدینہ کا رُخ کیا۔ آخر وہ راستہ میں ہی وفات پا گئے۔ حالانکہ قرآن نے ان مستضعفین کو عذاب جہنم کی وعید سے مستثنٰی قرار دیا تھا جو حالت استضعاف سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے اور جنہیں استطاعت نہیں ہے۔

آیت کی تفسیر میں عام طور پر مفسرین نے نزول قرآن کے حالات کے پس منظر میں ساری بحث کی ہے جو بجائے خود صحیح ہے غلط نہیں۔ لیکن ہم کو یہ بات ذہن میں تازہ رکھنی چاہئے کہ قرآن کے الفاظ کا عموم ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ آیت کے اطلاق میں نزول قرآن کے حالات کے ساتھ قیامت تک کے حالات آ سکتے ہیں۔ مکہ و مدینہ کے حالات میں آیت محصور نہیں ہے۔ اس نقطہ کو عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور پھر ساری گفتگو دارالکفر اور دارالاسلام کی بحث میں آ کر پھنس جاتی ہے۔ دارالکفر اور دارالاسلام کی تعریف میں موشگافیاں پھر ان دونوں داروں کی نشاندہی میں مختلف رایوں کا جنگل سامنے آ جاتا ہے۔ نتیجہ میں قرآن کی روح غائب ہو جاتی ہے۔

حالانکہ قرآن کا منشاء یہ بتانا ہے کہ مسلمان کے شایان شان یہ نہیں کہ کفار و مشرکین کی محکومی میں زندگی

گزارے۔ بالخصوص جبکہ مسلمانوں کا ایک مرکز بن چکا ہو۔یعنی کوئی مرکز کوئی جائے پناہ نہ ہوتو بھی غیر اللہ کے نظام اطاعت میں محکوم بن کر رہنا قابل مواخذہ جرم ہے اور جرم مزید سوا ہوجاتا ہے جب کوئی ایسا مقام موجود ہو جہاں اطاعت الٰہی کا نظام قائم ہے۔ یہ بات کوئی بہت علمی اور باریک بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ صاف اور سیدھی بات ہے کہ دو اطاعتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔ دنیا کے کسی سسٹم میں چاہے اس کی گنجائش نکل سکتی ہو لیکن اسلام میں تو اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ ہزار سجدے اللہ کیلئے کئے جائیں اور ایک سجدہ بھی غیر اللہ کیلئے کردیا جائے تو وہ ہزار سجدے کالعدم اور بیکار ہوجاتے ہیں زندگی بھر اللہ اور رسول کی اطاعت کوئی کرے اور تھوڑی دیر کے لئے شیطانی گروپ کی خیر خواہی میں چلا جائے تو ساری اطاعتیں بے کار ہوجاتی ہیں کہ اللہ شرک اور ساجھے داری کو قطعاً پسند نہیں کرتا۔ بعض اُمور میں بھی شریعت میں اسلام کے دشمنوں کی اطاعت کو ایمان کے خلاف اور ارتداد قرار دیا گیا ہے۔ (سورۂ محمد کی آیت ۲۸ کے مطابق)

حالت استضعاف کی ایک تصویر نزول قرآن کا زمانہ پیش کرتا ہے۔ایک دوسری تصویر حضرت موسیٰ علیہ السلام، بنی اسرائیل اور فرعون کا دور پیش کرتا ہے فرعون بنی اسرائیل کے ساتھ جو سلوک کررہا تھا اس کو استضعاف کے لفظ سے بیان کیا گیا: اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِى الۡاَرۡضِ وَجَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا يَّسۡتَضۡعِفُ طَآئِفَةً مِّنۡهُمۡ (القصص:۴) استضعاف اور محکومی کی حالت میں کسی مسلمان گروہ کا ہونا اللہ کے نزدیک اتنا برا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے مقصد میں جہاں انسانوں کو شرک کی گندگی سے بچانا تھا وہیں فرعون کے تسلط محکومی سے نکالنا بھی تھا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اللہ کی اطاعت کے ساتھ کسی فرعون، کسی نمرود، کسی ابوجہل غرض اللہ کے کسی باغی کی اطاعت کا جوڑ اور پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔ البتہ یہاں یہ سوال ہے کہ فرعون کی غلامی سے نکالنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے بطور خاص انتظام کیا اور حضرتِ موسیٰ علیہ السلام کو ید بیضا اور عصاء کا معجزہ دے کر بھیجا۔ ممکن ہے کہ اس کے پیچھے فرعون کا حد سے گزر جانا اور بنی اسرائیل کی انتہائی مظلومیت اور بے کسی اور بے بسی رہی ہو۔ اور بنی اسرائیل پر رحم وکرم سے زیادہ فرعون کو سبق سکھانا رہا ہو۔ واللہ اعلم

اب آیت زیر بحث کی طرف قدرے تفصیل کے ساتھ ہم آتے ہیں اور مختلف مفسرین سے استفادہ کرتے ہیں۔ اپنے نفس پر ظلم کرنے اور محکومی کی حالت میں رہنے کا کیا مطلب ہے اور اس کی قرآنی نقطۂ نظر سے کیا حیثیت ہے؟ مولانا مودودیؒ کہتے ہیں:

> ’’مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے۔ درآنحالیکہ ایک دارالاسلام مہیا ہوچکا تھا جس کی طرف ہجرت کرکے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کیلئے

ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلام پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش اور اپنے خاندان، اپنی جائیداد اور اپنے دنیوی مفاد کی محبت تھی جسے انہوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔''

یعنی جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون شرعی پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضروری تھا؟ کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین کی طرف منتقل ہو گئے جہاں قانونِ الٰہی کی پیروی ممکن ہوتی؟

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اس کے لئے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے۔

ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس سرزمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبوراً قیام رکھتا ہو ان دو صورتوں کے سوا ہر صورت میں دارالکفر کا قیام ایک مستقل معصیت ہے اور اس معصیت کے لئے یہ عذر کوئی بہت وزنی عذر نہیں ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا دارالاسلام پاتے ہی نہیں ہیں جہاں ہم ہجرت کر کے جا سکیں۔ اگر کوئی دارالاسلام موجود نہیں ہے تو کیا خدا کی زمین میں کوئی پہاڑ یا کوئی جنگل بھی ایسا نہیں ہے جہاں آدمی درختوں کے پتے کھا کر اور بکریوں کا دودھ پی کر گزر کر سکتا ہو اور احکام کفر کی اطاعت سے بچا رہے؟!

بعض لوگوں کو ایک حدیث سے غلط فہمی ہوئی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "لاھجرۃ بعد الفتح یعنی فتح کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔ حالانکہ دراصل یہ حدیث کوئی دائمی حکم نہیں ہے بلکہ صرف اُس وقت کے حالات میں اہل عرب سے ایسا فرمایا گیا تھا جب تک عرب کا بیشتر حصہ دارالکفر اور دارالحرب تھا اور صرف مدینہ اور اطراف مدینہ میں اسلامی احکام جاری ہو رہے تھے مسلمانوں کیلئے تاکیدی حکم تھا کہ ہر طرف سے ہٹ کر دارالاسلام میں آ جائیں۔ مگر جب فتح مکہ کے بعد عرب میں کفر کا زور ٹوٹ گیا اور قریب قریب پورا ملک اسلام کے زیر نگیں آ گیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب ہجرت کی حاجت باقی نہیں رہی ہے۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہ تھی کہ تمام دنیا کے مسلمانوں کیلئے تمام حالات میں قیامت تک کیلئے ہجرت کی فرضیت منسوخ ہو گئی ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی وضاحت ملاحظہ فرمائیے:

''اب ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جواب تک دارالحرب میں پڑے ہوئے تھے ہجرت پر اُبھارا ہے اور یہ گویا ان کے لئے آخری تنبیہ ہے۔ اس کی تمہید اس طرح اُٹھائی ہے کہ جو لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود

بلا کسی شدید مجبوری و عذر شرعی کے اب تک دار الکفر میں پڑے ہوئے ہیں۔ اسی حالت میں ان کی موت آئی تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ یہ تم کس حال میں پڑے رہے؟ یہ جواب دیں گے کہ ہم تو بے بس و مجبور تھے۔ فرشتے جواب دیں گے کیا خدا کی زمین میں تمہارے لئے کہیں سمائی نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے۔ پھر فرمایا کہ ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔''

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا جو حقیقتاً بے بس اور معذور ہیں۔ فرمایا، خدا کے ہاں معذور صرف وہ مرد، عورتیں اور بچے قرار پائیں گے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکنے کی قدرت رکھتے ہیں اور نہ ان کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہے یہ لوگ اُمید ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے گا۔

اس کے بعد ہجرت کی راہ میں کمر ہمت باندھ کر اُٹھ کھڑے ہونے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کیلئے اُٹھ کھڑا ہوگا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا۔ آخر میں یہ اطمینان بھی دلا دیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کیلئے یہ ضروری نہیں کہ آدمی دار الہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے آدمی گھر سے نکل کھڑا ہو جو گھر سے نکل کھڑا ہوا گر فوراً ہی اس کی موت ہوگئی یا وہ قتل کر دیا گیا تو اس سے اس کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اللہ کے اوپر اس کا اجر لازم ہوگیا۔

ان آیات سے ہجرت کے متعلق مندرجہ ذیل اُمور سامنے آتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر نقل مکانی ہجرت نہیں ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لئے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔

دوسرا یہ کہ دار الاسلام موجود ہو، اس کی طرف ہجرت کی راہ کھلی ہو، کوئی سخت مجبوری بھی نہ ہو تو ایسے مقام سے ہجرت کر کے دار الاسلام میں منتقل ہو جانا واجب ہے ورنہ ایسے شخص کا ایمان معتبر نہیں۔

تیسرا یہ کہ ہجرت کے معاملے میں ہر عذر، عذر نہیں ہے معتبر عذر یہ ہے کہ آدمی اتنا بے بس ہو کہ اس سے خود کوئی تدبیر بن آ رہی ہو نہ اس کے لئے کوئی راہ کھل رہی ہو۔ ایسی مجبوری میں بھی اس پر اپنے ایمان کی حفاظت بہر حال لازم ہے۔ اگرچہ اس کو اصحاب کہف کی طرح کسی غار ہی میں پناہ لینی پڑ جائے۔

چوتھا یہ کہ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے دنیا میں بھی مہاجر کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص بدرقہ فراہم ہوتا ہے۔ خدا کی زمین اس کیلئے راہیں کھولتی ہے اور غیب سے اس کے لئے اسباب و سامان فراہم ہوتے ہیں۔

پانچویں یہ کہ اس راہ میں پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیت خالص اور ارادہ راسخ ہوتو گھر سے نکلتے ہی مہاجر کو موت آجائے تو ہجرت کا اجر اس کے لئے لازم ہو گیا۔

علامہ شبیر عثمانیؒ لکھتے ہیں:

''بعضے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ دل سے سچے مسلمان ہیں مگر کافروں کی حکومت میں ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے ۔نہ حکم جہاد کی تعمیل کر سکتے ہیں سوان پر فرض ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کریں اس رکوع میں اس کا ذکر ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جولوگ اپنے او پرظلم کرتے ہیں یعنی کافروں کے ساتھ مل کر رہ رہے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے فرشتے ان سے مرنے کے وقت پوچھتے ہیں کہ تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمان تھے مگر بوجہ ضعف و کمزوری کے دین کی باتیں نہ کر سکتے تھے۔فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین تو بہت وسیع تھی تم یہ تو کر سکتے تھے کہ وہاں سے ہجرت کر جاتے سوایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

ایک دوسری آیت پر غور کیجئے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ أَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ○ (النساء:۷۵)

ترجمہ: اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں اوران بے بس مردوں،عورتوں اور بچوں کیلئے جنگ نہیں کرتے جو دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور ہمارے لئے اپنے پاس سے ہمدرد پیدا کر اور ہمارے لئے اپنے پاس سے مددگار کھڑے کر۔

اس آیت پر مولانا امین احسن اصلاحیؒ لکھتے ہیں

''مَا لَكُمْ'' ''تمہیں کیا ہو گیا ہے'' کا اسلوب کسی کام پر اُبھارنے اور شوق دلانے کیلئے ہے۔ **مستضعف** سے مراد مظلوم، مجبور اور بے بس کے ہیں۔ **مستضعفین کا عطف** ''فی سبیل اللہ'' پر اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ جولوگ دین کی وجہ سے ستائے جارہے ہیں ان کی آزادی کے لئے جنگ (قتال فی سبیل اللہ) میں سب سے اول درجہ رکھتی ہے۔ہم بقرہ کی تفسیر میں واضح کر چکے ہیں کہ اسلامی جہاد کا اصل مقصد دنیا سے فتنہ (Persecution) کو مٹانا ہے۔''قریۃ'' کو یہاں صرف مکہ کیلئے خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ان آیات کے نزول کے زمانے میں مکہ کے علاوہ اور بھی بستیاں تھیں جن میں بہت سے مرد،عورتیں اور بچے مسلمان ہو چکے تھے اور وہ اپنے کافر سرپرستوں یا اپنے قبیلے کے کافر زبردستوں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے

ہوئے تھے۔ "مِنْ لَّدُنْكَ" کا موقع استعمال اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ بظاہر حالات تو بالکل خلاف ہیں، کسی طرف سے اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ اپنی قدرت اور اپنی عنایت سے کوئی راہ کھول دے تو کچھ بعید نہیں۔"

جہاد کیلئے ایک اہم محرک

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم وستم سے نجات دلانے کے لئے کیوں نہیں اُٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پارہے ہیں جن کا حال یہ ہے کہ رات دن نہایت بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے پروردگار ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال اور غیب سے ہمارے ہمدرد پیدا کر اور غیب سے ہمارے مددگار کھڑے کر۔

آیت ۷۵ کے اشارات

"اس آیت سے کئی باتیں ظاہر ہو رہی ہیں۔

ایک یہ کہ ظالم کفار نے کمزور مسلمانوں پر خود ان کے وطن کی زمین اس طرح تنگ کر دی تھی کہ وہ وطن ان کو کاٹے کھا رہا تھا اور باوجودیکہ وطن کی محبت ایک فطری چیز ہے لیکن وہ اس سے اس قدر بیزار تھے کہ اس کو ظالم باشندوں کی بستی کہتے ہیں۔ اس کی طرف کسی قسم کا انتساب اپنے لئے گوارا کرنے پر تیار نہیں ہیں۔

دوسری یہ کہ کوئی وطن اسی وقت تک اہل ایمان کیلئے وطن کی حیثیت رکھتا ہے جب تک اس کے اندر ان کے دین و ایمان کیلئے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن نہیں بلکہ وہ خونخوار درندوں کا بھٹ، سانپوں اور اژدہوں کا مسکن اور شیطانوں کا مرکز ہے۔

تیسری یہ کہ اس زمانے میں حالات اس قدر مایوس کن تھے کہ مظلوم مسلمانوں کو ظاہر میں نجات کی کوئی راہ بھی سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ سارا بھروسہ بس اللہ کی مدد پر تھا کہ وہی غیب سے ان کے لئے کوئی راہ کھولے تو کھولے اس کے باوجود یہ مسلمان اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے۔ اللہ اکبر! کیا شان تھی ان کی استقامت کی۔ پہاڑ بھی اس استقامت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

چوتھی یہ کہ اگر کہیں مسلمان اس طرح کی مظلومیت کی حالت میں گھر جائیں تو ان تمام مسلمانوں پر جو ان کی مدد کرنے کی پوزیشن میں ہوں جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان کی مدد کے لئے نہ اٹھیں تو یہ صریح نفاق ہے۔"

(تدبر قرآن)

اس آیت پر مختلف زاویوں سے اوپر کی سطروں میں ایک بحث آپ نے پڑھ لی۔ جو مسلمان استطاعت

والے ہیں ان کا فرض بتایا گیا اور انہیں ترغیب دی گئی کہ اپنے بے بس اور محکوم بھائیوں کو کفار کے ظلم و جبر سے نکالنے کیلئے لڑتے کیوں نہیں جبکہ تمہارے ایمان کا یہ عین تقاضا ہے۔ دوسری طرف بے بس اور مظلوم ومحکوم مسلمانوں کی سوچ اور فکر کیا ہونی چاہئے۔ اس کا بھی نمونہ پیش کر دیا گیا کہ ان کو کسی درجہ میں اطمینان وچین سے نہیں رہنا چاہئے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی بے چینی اور بے اطمینانی کی وجہ کیا صرف یہ تھی کہ کفار و مشرکین مار پیٹ رہے تھے اور طرح طرح کی اذیتیں دے رہے تھے۔ بالفرض اہل مکہ اگر مسلمانوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچاتے ان کی راحت کے سارے اسباب مہیا کرتے تو کیا وہ اطمینان کے ساتھ زندگی گزارتے؟ اور ان کے سامنے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب اس کے سواء کچھ نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ راحت وآرام کا نہیں تھا۔ اصل مسئلہ ایمانی تقاضوں کے پورا کرنے کا تھا۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو سارے مسائل حل ہوجاتے۔ وہاں مکہ میں جو مسائل پیدا ہوئے تھے ان کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ ایمان اور ایمان کے تقاضوں کے چھوٹے سے چھوٹے جزء کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ قریش کتنے فراخ دل تھے۔ بار بار انہوں نے کتنی تجویزیں پیش کیں لیکن مسلمان کچھ لینے اور کچھ دینے کیلئے تیار نہیں ہوئے۔ ان کو اعتراض یہ نہیں تھا کہ مسلمان ایک خدا کی عبادت اور خدا کے رسول کی اطاعت کیوں کرتے ہیں اعتراض اصل یہ تھا کہ ایک خدا کی عبادت کے ساتھ دوسرے خداؤں کی عبادت نہیں کرتے۔

اگر خود نہیں کرتے نہ کریں، دوسروں کو ایسا کرنے سے روکتے کیوں ہیں؟ اسی طرح رسول خدا کی اطاعت کے ساتھ دوسرے لیڈروں کی بھی اطاعت کیوں نہیں کرتے اور اگر خود نہیں کرتے نہ کریں دوسروں کو دوسرے لیڈروں کی اطاعت نہ کرنے کی دعوت کیوں دیتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں دعوتِ اسلامی کے دو جزء ہیں اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا اور اللہ ورسول کے علاوہ کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرنا۔ خدا کی طرف سے آئی شریعت کی اتباع کرنا اور شریعت کے علاوہ ساری چیزوں کو چھوڑ دینا۔ ان میں سے کسی چیز کو مسلمان چھوڑنے کیلئے تیار نہیں تھے۔ اس طرح کفار ومشرکین کی ماتحت زندگی میں مسلمان کیلئے اذیت، تکلیف، پریشانی اور ایمان لازم وملزوم ہیں۔ اذیتوں سے نجات نہیں مل سکتی ہے نجات کی راہ صرف یہ ہے کہ ماتحتی اور محکومی کی زندگی سے نجات حاصل کی جائے یا پھر ایمان کے ایک جزء کو چھوڑ کر سیکولر بن کر سامان راحت ہی نہیں گورنر اور صدر جمہوریہ کے مناصب حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان کے تقاضے

ایمان کے تقاضے کیا ہیں؟ اس بات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ یہ بات ذہن سے نکال دینی

چاہئے کہ ایمان کے تقاضے بس اتنے ہیں کہ ایک شخص اپنی پرائیوٹ زندگی میں چند مراسم عبودیت ادا کر لے اور بقیہ زندگی چاہے جیسے گزارے۔ کاروبار، تجارت، معیشت اور سیاست کے میدان میں اسے اختیار ہے کہ من مانے طریقے اپناتا پھرے۔ حالانکہ ایمان قبول کرنے کے بعد زندگی کا ہر لمحہ اور زندگی کی ہر حرکت و عمل اسلام کے بنائے ہوئے دائرہ میں ہونا ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ (الاحزاب:٣٦)

ترجمہ: کسی مومن مرد اور عورت کیلئے اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے فیصلہ کے بعد اپنے امر کا کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

اہل ایمان سے مطالبہ ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوں۔ اپنی زندگی کا کوئی حصہ بھی کسی دوسرے کو نہ دیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً (البقرۃ:٢٠٨)

ترجمہ: اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

زندگی کے کسی حصہ کو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے کے تابع کرنے کا نام شرک ہے۔ اس مقام پر سوچئے کسی کے تابع بن کر زندگی گزارنے اور حالت استضعاف اور غلامی میں رہ کر کوئی کیسے پکا اور سچا مومن رہ سکتا ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان رکھتے ہوئے غیر الٰہی نظام کے تحت رہ کر ایمان کے تقاضوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟؟ افسوس ہے کہ اس حقیقت کو آج سمجھا نہیں جا رہا ہے اور ذہن مسلسل غلامی کی زندگی گزارتے ہوئے ایسا بدل گیا ہے کہ اصل اسلامی زندگی کا تصور محال بن گیا ہے اور اللہ کی اطاعت کے ساتھ غیر اللہ کی اطاعت اور قرآن کی اتباع کے ساتھ غیر قرآن کی اتباع اور پیروی میں کوئی تضاد، تناقض اور ٹکراؤ محسوس نہیں ہوتا اور دینداری میں کوئی فرق نہیں آتا۔

بعض لوگ اس کے مقابلہ میں حبشہ کی مثال پیش کرتے ہیں جو کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ قرآنی آیات نص قطعی ہیں۔ اصولی حیثیت سے نص قطعی کے مقابلہ میں سیرت اور تاریخ کا کوئی واقعہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ شاہ نجاشی مسلمان ہو گئے تھے اس اعتبار سے حبشہ میں غیر مسلم اقتدار نہیں تھا دین و شریعت کا جو حصہ اس وقت تک نازل ہو چکا تھا اس کی پابندی بحیثیت مسلمان کرتے رہے ہوں گے۔ تیسرے وہ ایک اضطراری اور عارضی عمل تھا۔ حالات کے سدھرتے اور موقع ملتے ہی وہاں سے مسلمان واپس آ گئے۔

ایک قرآنی حقیقت جس سے آج اِنکار ہے

ایک مشہور دینی ماہنامہ کے شمارہ اپریل 2008ء میں ڈاکٹر عبدالمنعم ابوالفتوح کی کسی تحریر کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔ مترجم مسعودالرحمن خان ندوی ہیں۔ اس میں سید قطبؒ کے بارے میں ایک نہایت ہی غلط بات کہی گئی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ظالم کفار سے جنگ کرنا تو اپنی جگہ صحیح ہے تو کیا ان کفار سے بھی جنگ جائز ہے جو مسلمانوں سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے، ایذ انہیں پہنچاتے، لڑائی نہیں کرتے اور نہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالتے ہیں۔

اس مسئلہ میں سید قطبؒ کی رائے یہ ہے کہ ان سے بھی جنگ جائز ہے اس رائے کو صاحب تحریر نے عجیب وغریب کہا ہے نیز یہ کہا ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو سید قطبؒ سے پہلے کسی اور عالم اور فقیہ نے نہیں کہی ہے۔ نہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سید قطبؒ کی بات عجیب وغریب نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر عبدالمنعم کی بات عجیب وغریب ہے اور سید قطبؒ کی بات ہی ہر معتبر عالم اور فقیہ نے کہی ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ سید قطبؒ کی تائید میں واقعات کا تسلسل ہے۔ نہیں معلوم یہ بات کیسے کہہ دی جبکہ سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۹۳ "وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" میں فتنہ کے ختم ہونے تک جنگ کا عام حکم دیا گیا ہے اور سورہ توبہ آیت نمبر ۲۹ "قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ...وَلَا يَدِيْنُوْنَ... حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ" میں اہل کتاب سے جنگ کرنے کا حکم ادائے جزیہ تک دیا گیا ہے۔ اس طرح کی کھلی اور صاف آیات کی موجودگی میں سید قطبؒ کی رائے کو عجیب وغریب کیسے کہا جاسکتا ہے؟ زمانہ حال کے ایک عالم دکتور علی بن نفیع العلیانی کی تحریر کے چند جملے پڑھئے:

> "مستشرقین کے تلامذہ اور ان کی راہ اختیار کرنے والے لوگوں نے ایک گھناؤنی بدعت ایجاد کی ہے جو قرآن و سنت اور اجماع امت کے سراسر خلاف ہے وہ یہ کہ اسلام میں جہاد کی گنجائش صرف دفاع کیلئے ہے اور یہ کہ

کفار کو اسلام کے آگے جھکانے اور اللہ کے حکم کو غیروں پر غالب اور نافذ کرنے کیلئے جہاد کرنا جائز نہیں ہے۔ سوائے اس صورت میں کہ کفار مسلمانوں پر ظلم کرنے میں پہل کریں۔ یہ نظریہ ایک ایسا بدعتی نظریہ ہے کہ جس کو پہلے کے معتمد علماء میں سے کسی نے بھی نہیں کہا ہے۔'' (بحوالہ اہمیۃ الجہاد ص:۳۱۸)

اس کے بعد قدیم زمانہ یعنی چوتھی پانچویں صدی کے ایک فقیہ صاحب قدوری کا ایک جملہ پڑھئے: ''قتال الکفار واجب ان لم یبدؤنا''، یعنی کفار سے جنگ واجب ہے اگرچہ وہ ہم سے جنگ نہ کریں۔''

صاحب قدوری نے مزید لکھا ہے:

''جب مسلمان دارالحرب میں داخل ہوں اور کسی شہر یا قلعے کا محاصرہ کرلیں تو وہاں کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں گے اگر وہ دعوت قبول کرلیں تو مسلمان ان سے جنگ سے رک جائیں گے۔ اگر وہ دعوت قبول نہ کریں تو جزیہ ادا کرنے کی دعوت دیں گے، اگر وہ جزیہ دینے کے لئے تیار ہوجائیں تو ان کے لئے وہ سب کچھ ہے جو مسلمانوں کے لئے ہے اور ان پر وہ سب کچھ ہے جو مسلمانوں پر ہے۔''

دعوت کی بات پر قدوری کے حاشیہ میں ہے کہ یہ اس لئے کہ نبی ﷺ نے کسی قوم سے جنگ نہیں کی یہاں تک کہ ان کو اسلام کی دعوت دی۔ جنگ سے رکنے پر حاشیہ میں ہے کہ اگر وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں تو مقصد حاصل ہوگیا۔ چنانچہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کہہ دیں۔ جزیہ کی ادائیگی پر حاشیہ میں نوٹ ہے کہ نبی ﷺ نے امراء لشکر کو ایسا ہی حکم فرمایا اس لئے بھی کہ قرآن میں حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَۃَ کہا گیا ہے یعنی ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں یعنی جزیہ دینے کیلئے تیار ہوجائیں تو جنگ سے رک جاؤ۔

جدید اور قدیم ان دونوں رایوں کے ہوتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمنعم یا مسعود الرحمن خان کا یہ کہنا کہ یہ بات سید قطبؒ سے پہلے کسی عالم اور فقیہ نے نہیں کہی اور نہ تاریخ میں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے۔ کہاں تک صحیح ہے؟ اور عجیب وغریب سید قطبؒ کی بات ہے یا ڈاکٹر عبدالمنعم کی؟

سید قطبؒ کی رائے کی معقولیت سمجھنے کے لئے جزیہ پر مزید سطریں ملاحظہ فرمائیے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے:

''میں نے اس عبارت میں ایک تاریخی حقیقت کو بیان کیا ہے جس کی پشت پر نبی ﷺ کا اسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدینؓ کا عمل موجود ہے۔ حدیث اور تاریخ کی کتابوں سے مجھے اس امر کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ سلاطین روم وعجم کے خلاف فوج کشی سے پہلے ان ممالک میں صحابہ کرامؓ کو تبلیغی مہمات پر روانہ کیا گیا ہو اور پھر اس دعوت وتبلیغ کے نتائج کا انتظار کیا گیا ہو۔ نبی کریم ﷺ نے صرف سلاطین کو خطوط بھیجنے پر اکتفاء فرمایا اس کے ساتھ آپ ﷺ نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ براہ راست باشندگان روم وایران ومصر کو خطاب

کریں اور ان کے جواب کا انتظار فرمائیں، خلفائے راشدینؓ کے عہد میں بھی صورت حال یہی رہی ہے۔ روم کی طرف پہلے غزوۂ موتہ پھر غزوۂ تبوک اور آخر میں جیش اسامہ کی مہم اس کی بین دلیل ہے۔ ایران کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کی جنگ اور مصر پر حضرت عمرؓ کی چڑھائی بھی اسی کا ثبوت ہے۔

اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو اس کی وجہ بھی بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان ممالک کے عوام کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف ان حکمرانوں سے کیوں خطاب کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان ممالک میں شخصی حکومتیں قائم تھیں اور مستبد فرمانروا اقتدار پر قابض تھے۔ ان کا برسر اقتدار رہنا ہی اشاعت اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ ان کی موجودگی میں نہ تو اس امر کا امکان تھا کہ دعوت عام باشندگان ملک میں پھیلائی جاسکے اور نہ عوام کو اتنی آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل حاصل تھی کہ اگر وہ اس دعوت کو حق پائیں تو اسے قبول کر کے اس پر عمل پیرا ہوسکیں۔ ان حالات میں حکمرانوں سے نمٹے بغیر نہ اسلام کی اشاعت کما حقہ سرانجام پاسکتی تھی اور نہ اس کے نتائج وثمرات رونما ہوسکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سلاطین کے نام اپنے مکتوبات مبارکہ میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تم یہ دعوت قبول نہ کروگے یا ہماری اطاعت تسلیم نہ کروگے تو اپنی رعایا کی گمراہی کا وبال بھی تمہارے سر ہوگا۔

نبی ﷺ اور صحابہؓ کے اس عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی ملک میں ایسی حکومت قائم ہو جس کے ہوتے عوام کیلئے یہ عملاً ناممکن ہو کہ وہ دعوت اسلام سن کر قبول کرسکیں تو ایسی حکومت کو رستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اس حکومت کو ہٹانا دراصل عوام الناس کو عقیدہ وعمل کی آزادی بخشنے کا ہم معنی ہے۔ اس کا مقصود یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ ملک کے سیاسی نظام سے ان تمام موانع کا خاتمہ کردیا جائے جو حق کے ادراک اور اس کے اتباع میں مزاحم ہوتے ہیں۔''

(رسائل ومسائل، حصہ ۴، صفحہ: ۱۷۱)

صاحب تفہیم القرآن نے آیت ۱۹۳ میں جو نوٹ لکھا ہے وہ ملاحظہ فرمایئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس مقام پر فتنے سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لئے ہو اور لڑائی کا مقصد یہ ہے کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین صرف اللہ کیلئے ہو۔ پھر جب ہم لفظ دین کی تحقیق کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان میں دین کے معنی اطاعت کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظام زندگی ہے جو کسی کو بالاتر مان کر اس کے احکام وقوانین کی پیروی میں اختیار کیا جائے۔ پس دین کی اسی تشریح سے یہ بات خود واضح ہوجاتی ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی وفرمانروائی قائم ہو اور جس میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے فتنے کی حالت ہے اور اسلامی جنگ کا مطمع نظر یہ ہے کہ اس فتنہ کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانون الٰہی کے مطیع بن کر رہیں۔''

(حاشیہ ۲۴، تفہیم القرآن جلد اول)

اس آیت کی تشریح پیش خدمت ہے:

''یعنی لڑائی کی غایت یہ نہیں ہے کہ وہ ایمان لے آئیں اور دین حق کے پیرو بن جائیں بلکہ اس کی غایت یہ ہے کہ ان کی خود مختاری و بالادستی ختم ہو جائے۔ وہ زمین میں حاکم اور صاحب امر بن کر نہ رہیں بلکہ زمین کے نظام زندگی کی باگیں اور فرمانروائی و امامت کے اختیارات...... دین کے ہاتھوں میں ہوں اور ان کے ماتحت تابع و مطیع بن کر رہیں...... اور بھی صاف بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو اختیار نہیں کرتے اور اپنی...... نکالی ہوئی غلط راہوں پر چلتے ہیں وہ بس اتنی ہی آزادی کے مستحق ہیں کہ خود غلطی کرنا چاہتے ہیں کریں لیکن انہیں اس کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر کسی جگہ بھی اقتدار و فرمانروائی کی باگیں ان کے ہاتھوں میں ہوں اور وہ انسانوں کی اجتماعی زندگی کا نظام اپنی گمراہیوں کے مطابق قائم کریں اور چلائیں۔ یہ چیز جہاں کہیں ان کو حاصل ہوگی فساد رونما ہوگا اور اہل ایمان کا فرض بن گیا کہ ان کو اس سے بے دخل کرنے اور انہیں نظام صالح کا مطیع بنانے کی کوشش کریں۔'' (حاشیہ ۲۸، تفہیم القرآن، جلد دوم)

نظریۂ جہاد

ایک تنقیدی جائزہ

مولانا عبدالعلیم اصلاحیؒ

نظریۂ جہاد: ایک تنقیدی جائزہ

عناوین — صفحہ نمبر

”جہاد کیا ہے؟“ کا تنقیدی مطالعہ

مولانا یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب ”الجہاد“ کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

”اپنی نوعیت کی ایک بالکل نئی کتاب ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد کے موضوع کا ایسا حقیقت پسندانہ گہرا مطالعہ سامنے نہیں آیا تھا۔ کتاب کی اہم خصوصیت عصر حاضر کے تناظر میں جہاد سے متعلق قائم ہونے والے سوالات پر مفصل بحث ہے۔“

ہم چاہتے ہیں اس جدید مطالعہ کو آگے بڑھایا جائے۔ اسی غرض سے بعض مشمولات پر ہم کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ دین میں جہاد کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ دسیوں مقامات سے زیادہ پر جہاد وقتال کا تذکرہ قرآن میں مختلف انداز سے آیا ہے۔ کہیں جنت کا وعدہ اور بلندیٔ درجات کے حوالے سے، کہیں فتح ونصرت کے وعدے سے اور کہیں اس انداز سے کہ ایمان اور نفاق کی کسوٹی جہاد ہے۔ دوسورتوں ”سورۃ الانفال“ اور ”سورۃ التوبہ“ کے سارے مضامین جہاد کے اطراف گھومتے ہیں اور احادیث میں بسا اوقات سب سے افضل اور اعلیٰ درجہ کی نیکی جہاد قرار دیا جاتا ہے اور دنیا میں مسلمانوں کی عزت اور ذلت کو جہاد کو کرنے اور ترک جہاد پر منحصر بتایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ”لغدوۃ فی سبیل اللّٰہ او روحۃ خیر من الدنیا و مافیہا“۔ (متفق علیہ)

یعنی صبح یا شام کو اللہ کی راہ میں ایک بار نکلنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ جہاد کا یہ درجہ بھی بتایا گیا کہ گھر بیٹھ کر ستر سال نمازیں پڑھنے سے افضل یہ ہے کہ آدمی جہاد میں نکلے۔ اور صحیح بخاری کی حدیث میں آیا ہے کہ جو پاؤں سفر جہاد میں غبار آلود ہوگا اس کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ جہاد کی فضیلت میں اللہ کے رسول ﷺ نے یہاں تک فرمایا کہ ”جو شخص اس حال میں مرا کہ نہ کبھی اس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ جہاد کی آرزو اور تمنا

اس کے دل میں پیدا ہوئی تو وہ نفاق کے ایک حصہ پر مرا''۔ ''من مات ولم یغز ولم یحدث به نفسه مات علی شعبة من نفاق'' (رواہ مسلم)۔ جہاد کی اس اہمیت کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ شاذ ونادر ہی کوئی تصنیف جذبۂ جہاد پیدا کرنے کے لئے اور شوقِ شہادت پروان چڑھانے کے واسطے منظر عام پر آتی ہو۔ جو بھی اس موضوع پر لکھا یا بولا جاتا ہے وہ صفائی دینے کے لئے اور معذرت خواہانہ ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اصل جہاد نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں جیسا کہ مشہور ہے بعض ملکوں کے تعلیمی اداروں میں جہاد پر مشتمل آیات اور احادیث کو نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب کس زمرہ میں آئے گی اور کس مقصد کے لئے لکھی گئی ہے اور اس سلسلہ میں بقول مصنف نہایت محنت ومشقت اور عرق ریزی سے جو کام لیا گیا ہے وہ کس غرض سے کیا گیا ہے؟ اس کا فیصلہ ناظرین کے ذمہ ہے۔ لیکن ہم حسن ظن رکھتے ہوئے بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ کتاب اسلامی جہاد پر ایک کاری ضرب ہے تصور جہاد کو اس دور میں بالکل ختم کر دینے کی ایک ناکام کاوش ہے۔ جہاد جو دین اسلام میں ایک بڑی عبادت ہے اور اسلام کا ایک اہم اور مقدس حصہ ہے اس کو بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی ایک کڑی ہے۔ کبھی یہ کہہ کر کہ اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد اب کوئی ملک دار الحرب نہیں رہا اور کبھی یہ بول کر کہ جہاد مذہبی جبر کے خاتمہ کے لئے مشروع ہوا تھا اور اب مذہبی جبر کا دنیا سے خاتمہ ہو گیا ہے اور کبھی یہ نظریہ پیش کر کے کہ ہر کسی کو اپنے نظریہ کے مطابق آزاد حکومت کرنے کا حق ہے اس سے چھیڑ چھاڑ کرنا عدل کے خلاف ہے اس طرح کی بوگس نری عقلی اور منطقی دلیلوں کا سہارا لے کر کتاب وسنت کے ٹھوس شواہد کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ رہا غلامی اور جزیہ کا مسئلہ تو یہ ایک پرانی بات ہے جس پر بحث لاحاصل ہے جہاد کے نام سے اس وقت جو سرگرمیاں دنیا میں چل رہی ہیں ان سب کو کنڈم کیا گیا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا گیا ہے کہ اس زمانہ میں جہاد کی کیا شکل ہو سکتی ہے؟ پھر پوری کتاب میں جہاد کی تعریف کیا ہے؟ اور جہاد کس کو کہتے ہیں؟ اس سوال کا جواب بھی کہیں نہیں دیا گیا ہے۔ اور عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ لکھنے اور بولنے والے نہیں بتاتے کہ اصل جہاد کیا ہے بلکہ بات یہاں سے شروع کی جاتی ہے کہ کیا کیا چیزیں جہاد میں داخل ہیں اور پھر جہاد کی اتنی لمبی فہرست سامنے آجاتی ہے کہ اصل جہاد پسِ پردہ چلا جاتا ہے۔ ہمارے کہنے کا منشاء یہ نہیں ہے کہ وہ لمبی چوڑی فہرست غلط ہو جاتی ہے۔ بلکہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ دانستہ یا دانستہ اصل جہاد کو چھپایا جاتا ہے اور میدان جہاد میں عملاً جو لوگ مصروف ہوتے ہیں ان کو کنڈم کیا جاتا ہے یا پھر ان کے حامیوں سے اپنے آپ کو باہر بتانا مقصود ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ہم نہ بنیاد پرست ہیں اور نہ جہادی ہیں۔

جہاد کی کئی قسمیں بتائی جاتی ہیں اور بہت ساری چیزوں کو جہاد میں شامل کیا جاتا ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اصل جہاد وہ ہے جس کا بیان قرآن میں "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ"، "وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ"، "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا" وغیرہ لفظوں میں ہوا ہے۔

اور حدیث میں "لغدوة او روحة فی سبیل اللّٰہ" اور "من لم یغز" اور فقہ میں ''جہاد بالسیف'' کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اسی جہاد کو اعدائے اسلام نے ہمیشہ اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا ہے۔

مختلف ریاضتوں کے ذریعہ نفس سے جہاد یا جہاد بالقلم وغیرہ پر اغیار نے کبھی یلغار نہیں کی ہے اور نہ انہوں نے اس قسم کے جہادوں سے کسی خطرے کا اظہار کیا ہے۔ الغرض اصل جہاد کفار و مشرکین سے ''قتال'' ہے۔ چنانچہ کتاب وسنت میں لفظ ''قتال'' اور لفظ ''غزوہ'' سے قطعی طور پر یہی مراد ہے۔

نیز قرآن میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے لفظوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ بھی یہی چیز ہے۔ اسی بناء پر فقہائے اسلام نے جہاد کی جو تعریف کی ہے اس سے مسلمانوں کا کفار سے لڑنا ہی جہاد معلوم ہوتا ہے۔

ایک عربی مصنف لکھتے ہیں کہ جہاد کی شرعاً تعریف اصل مذاہب میں سے اکثر کے نزدیک مسلمان کی کافر سے جنگ کے اطراف گھومتی ہے جبکہ کافر کے سامنے اسلام کی دعوت پھر جزیہ کی دعوت پیش کی جا چکی ہو اور اس نے انکار کر دیا ہو چنانچہ فقہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"فعرف فی کتب الحنفی بأنه بذل الوسع والطاقة بالقتال فی سبیل اللّٰہ عزوجل بالنفس واللسان او غیر ذلک او المبالغة فی ذلک"

ترجمہ: حنفی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ جہاد وسعت اور طاقت فی سبیل اللہ قتال میں صرف کرنا ہے بذریعہ جان، مال اور زبان وغیرہ۔

نیز

"عرف بأنه الدعاء الی الدین الحق وقتال من لم یقبله"

ترجمہ: جہاد دین حق کی طرف دعوت دینا اور اس سے جنگ ہے جس نے اس کو قبول نہیں کیا۔

(حاشیہ ردالمحتار، صفحہ: ۱۲۱)

"وفی کتب المالکیة عرف بانه قتال مسلم کافرا غیر ذی عهد لإعلاء کلمة اللّٰہ تعالی". (الشرح الصغیر علی اقرب المسلک جلد۲، صفحہ: ۷۶۲)

ترجمہ: فقہ مالکیہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ یعنی جہاد اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے مسلمان کا

ایسے کافر سے جنگ کرنا ہے جس سے کوئی عہد نہ ہو۔

"وفی کتب الحنابلة وشرعا قتال الکفار" (مطالب اولی)

ترجمہ: یعنی حنبلی کتابوں میں کہا گیا ہے جہاد شرعا کفار سے جنگ کرنا ہے۔

اسی طرح شوافع کے نزدیک ہے جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا ہے:

"وشرعا بذل الجهد فی قتال الکفار" (فتح الباری، جلد۶، صفحہ:۳)

ترجمہ: یعنی شرعاً جہاد کفار سے جنگ کرنے میں کوشش صرف کرنا ہے۔

اوپر آپ نے دیکھا کہ مذاہب اربعہ کی کتابوں میں جہاد کی تعریف تقریباً ایک ہی کی گئی ہے اس کے بعد ایک تعریف ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی پڑھئے:

"والجهاد بذل الوسع وهو القدرة فی حصول محبوب الحق ودفع مایکرهه الحق". (مجموع الفتاوی، جلد:۱۰)

ترجمہ: یعنی جہاد وسعت اور طاقت کا صرف کرنا ہے حق تعالی کی محبوب شئی کو حاصل کرنے کے لئے اور اس کو دفع کرنے کے لئے جس کو حق ناپسند کرتا ہے۔

ابن تیمیہؒ نے جہاد کی جو تعریف کی ہے اسے زیادہ جامع کہا جاسکتا ہے لیکن فقہ اربعہ کی کتابوں میں کی ہوئی تعریف کتاب وسنت سے قریب ہے اور قرآن وحدیث سے راست ماخوذ ہے۔

کتاب الجہاد پر مقدمہ مولانا عتیق الرحمن سنبھلی صاحب نے لکھا ہے۔ مولانا کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کا ذہن بھی جہاد کے مسئلہ میں صاف نہیں ہے مثلاً مولانا کے یہ جملے پڑھئے:

''جو چیز خصوصیت اس کتاب کی ہے وہ اس فی سبیل اللہ ''جنگ'' کا مطالعہ اپنے اس زمانہ کے تناظر میں ہے، جس میں وہ نئے نئے مسائل حل طلب ہو گئے ہیں جن کا کوئی تصور اس وقت نہ تھا جب اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا دارالحرب (یا دارالکفر) اور دارالاسلام کے دو خانوں میں تقسیم تھی۔ اب ہر ملک کی رکنیت اقوام متحدہ کے بعد کوئی ملک نہیں رہ جاتا جسے دارالحرب کہا جاسکے۔ سارے ملک اب ایک عالمی برادری ہیں (جن میں بلاشبہ وہ بھی ہیں جن پر صادق کہ ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی!'') مگر عالمی برادری کے نظام نے خواہی نہ خواہی سب کو اس نظام کے اصولوں کا پابند بنالیا ہے۔''

اس عبارت سے صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے نزدیک اب اس زمانہ میں اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے ظاہر ہے جب کوئی ملک دارالحرب نہیں ہے تو جہاد کا بھی سوال ختم ہے اور جہاد وقتال سے متعلق قرآنی آیات واحادیث بے محل ہو کر رہ جائیں گی اور بات وہی ہوئی جو قادیانیوں اور

بہائیوں نے کہی تھی کہ انگریز بہادر کی قلمرو میں جہاد منسوخ ہے۔

یہ ایک ناسمجھی ہی نہیں بلکہ ایک بڑی گمراہی ہے جس میں اچھے خاصے لوگ مبتلا ہیں جس کے نتیجہ میں وہ سارا نقشہ جو آج کے دور میں اسلام کے تئیں لوگ بناتے ہیں قرآن وسنت سے دور ہو جاتا ہے اور کتاب وسنت کے نصوص کی جو تشریح اور تعبیر کرتے ہیں وہ غلط ہو جاتی ہے۔

اس گمراہی کی دو وجہ ہے ایک تو یہ ہے کہ ہمارے علماء اس دور میں زیر کفر وشرک رہنے کے لئے وجہ جواز کے دلائل کتاب وسنت میں ڈھونڈتے ہیں اور سب سے بڑا عالم وہ مانا جاتا ہے جو کتاب وسنت سے بھی ایسے مسائل ڈھونڈ نکالے جن سے کمیونزم، سوشلزم اور سیکولرزم کے زیر اقتدار سکون سے رہنے کے لئے جواز نکل سکے۔ ظاہر ہے قرآن وسنت میں اس کے دلائل نہیں مل سکتے ہیں کیونکہ اللہ اور رسول کو شیطان اور اولیاء شیطان کا غلام بن کر سکون سے رہنا پسند نہیں ہے۔ نمرود، فرعون، ابوجہل اور ابولہب سے لڑنا پسند ہے ان سے دوستی اور محبت کا سوال نہیں چہ جائیکہ ان کی غلامی کو قبول کرے، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوہ اور ان کی تعلیمات غیر اللہ کی اطاعت اور غلامی کو قبول کرنا ایک لمحہ کے لئے روا نہیں رکھتے ہیں اس لئے شیطان نے سکھایا کہ اسلام کے نظریۂ جہاد اور اس کے متعلقات کو ایک نئی شکل دی جائے اور ان کی اصل توجیہ کے علاوہ نئی توجیہ پیش کی جائے تاکہ مسلمان غیروں کی غلامی کو ناپسند نہ کریں۔

دارالاسلام اور دارالحرب کا تصور اس دور میں کالعدم بتانا اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس گمراہی کی دوسری وجہ یہ خیال ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات حالات کے تناظر میں وضع کی گئی ہیں یہ بات سراسر غلط ہے، صحیح بات یہ ہے کہ کچھ قرآنی حقائق کے اظہار کے لئے یہ اصطلاحات وضع کی گئی ہیں جیسا کہ آگے ہم بتائیں گے۔

اس مقام پر سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اصطلاح کیا چیز ہوتی ہے۔

اردو لغت میں ہے اصطلاح 'مونث'' کسی علمی یا فنی گروہ کا کسی لفظ کے عام معنوں کے علاوہ کوئی مفہوم مقرر کر لینا۔ عربی لغت میں بھی اصطلاح کے یہی معنی بتائے گئے ہیں۔ المنجد میں ہے: الاصطلاح۔ جمع۔ اصطلاحات۔

''العرف الخاص ای اتفاق طائفة مخصوصة من القوم علی وضع الشئ اوالکلمة''۔

یعنی اصطلاح کہتے ہیں خاص عرف کو یعنی کسی قوم یا جماعت کا کسی لفظ اور کلمہ کے معنی پر اتفاق کر لینا جو

اصل معنی کے علاوہ ہو۔ مثال کے طور پر کلمہ کے لفظ کو لیجئے، ہماری عام زبان میں اس لفظ کو بول کر جو سمجھا جاتا ہے علم نحو میں اس کے برخلاف سمجھا جاتا ہے چنانچہ "لا الٰہ الا اللہ" کو عام طور سے کلمہ کہا جاتا ہے لیکن نحویوں کے نزدیک کلمہ نہیں بلکہ کلام ہے۔ نحویوں کے نزدیک کلمہ کی تعریف کچھ اور ہے اور صرفیوں کے نزدیک کچھ اور۔

لفظ "صلاۃ" کے لغوی معنی دعا کے ہیں، لیکن شرعی اصطلاح میں کچھ مخصوص افعال کے مجموعہ کو صلاۃ کہتے ہیں۔ اس بات کا لحاظ نہ کر کے بعض ہندوستانی دانشوروں نے کہا کہ لفظ صلاۃ کا اطلاق جس طرح مسلمانوں کی عبادت پر ہوتا ہے اسی طرح گرجا میں کرسچین اور مندر میں ہندو کی عبادت پر بھی صلاۃ کا اطلاق ہوتا ہے۔ نہیں معلوم اس طرح کا دھوکہ بے خبری میں کھایا اور کھلایا جا رہا ہے یا دانستہ طور پر۔ بہر حال ایسا ہی معاملہ دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاحات کے ساتھ کیا جا رہا ہے قطع نظر اس کے کہ یہ اصطلاحات منصوص ہیں یا غیر منصوص۔

بہر صورت اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دونوں اصطلاحیں فقہاء اسلام نے بکثرت استعمال کی ہیں۔ اس لیے محض لفظی اشتراک کی بنا پر کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان اصطلاحوں کو اپنا معنی پہنائے۔ ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ کوئی اصطلاح بنائے اور اس کے ساتھ کوئی مخصوص معنی وابستہ کرے۔ لیکن فقہاء کی اصطلاحوں کے ساتھ تو وہی معانی اور مفہوم وابستہ ہوں گے جن کے معنی اور مفہوم کے لیے انھوں نے یہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ اس حقیقت کو دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کر کے کئی لوگ دارالاسلام اور دارالحرب کے وزن پر دارالمسلمین، دارالتبلیغ اور دارالدعوۃ کے الفاظ بول کر فقہاء کی اصطلاحات کے اطلاق کی نفی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو یا تو انتہائی بے خبری اور لاعلمی کا نتیجہ ہے یا کھلا ہوا فریب ہے۔ یہ اس لئے بھی کہ دارالاسلام ہو کہ دارالحرب، دعوت وتبلیغ کا کام تو ہر جگہ کرنا فرض ہے۔ دارالتبلیغ اور دارالدعوۃ کہہ کر دارالاسلام اور دارالحرب کی نفی نہیں کی جا سکتی۔

فقہاء اسلام نے یہ اصطلاحات قرآن وسنت سے ثابت شدہ بعض حقائق کی تعبیر کرنے کے لئے استعمال کی ہیں۔ وہ حقائق جب تک ثابت اور قائم رہیں گے اس وقت تک ان اصطلاحات کا اطلاق باقی رہے گا اور اگر بالفرض کوئی شخص ان اصطلاحات کو کسی وجہ سے چھوڑنا چاہتا ہے تو چھوڑ دے۔ لیکن قرآن وسنت سے ثابت شدہ ان حقائق کو تو چھوڑا نہیں جا سکتا جو ان اصطلاحوں کے پس منظر میں ہیں۔ دوسری بات اس ضمن میں یہ ہے کہ ان اصطلاحوں کو چھوڑا تو جا سکتا ہے کہ یہ قرآن اور سنت کی اصطلاح نہیں ہیں۔ لیکن ان کو وہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے جو واضعین اصطلاحات کے مفہوم اور معنی کے خلاف ہوں۔ بنا بریں یہ اصطلاحات اب بھی قابل اطلاق ہیں۔ ناقابل اطلاق ہونے کا کوئی سوال نہیں ہے نیز ان کی تعریف آج کے حالات میں بھی وہی رہے گی جو پہلے تھی۔ موجودہ حالات اگرچہ زمانہ ماضی کے حالات کے علاوہ ہیں مگر حالات بدلے ہیں حقائق نہیں بدلے ہیں، حالات

چاہے کچھ ہو جائیں مگر سچائی اپنی جگہ سچائی رہے گی اور جھوٹ اپنی جگہ جھوٹ ہی رہے گا۔ ایمان، اسلام، کفر، شرک اور نفاق کی وہی تعریف رہے گی جو ڈیڑھ ہزار سال پہلے تھی۔ حالات کی تبدیلی سے ان کی تعریف میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ اسی طرح وہ قرآنی مفہوم اور حقائق بھی بدلنے والے نہیں ہیں جن کی تعبیر ان اصطلاحوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ مفہوم اور حقائق کیا ہیں جن کو بتانے کے لئے یہ اصطلاحیں وضع کی گئی تھیں۔ اس ضمن میں فقہاء کی تصریحات پیش کرنے سے پہلے ہم قرآن وسنت کی روشنی میں اس سوال کا جواب معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے دوسرے دوسوالوں کا جواب ہمیں معلوم کرنا ہوگا۔ اس جواب سے وہ مفہوم اور حقائق معلوم ہو جائیں گے جن کی تعبیر کے لئے دارالاسلام اور دارالحرب کی اصطلاح وضع کی گئی۔

پہلا سوال یہ ہے کہ قرآن میں کفار سے جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ کیا حکم ہے فرض ہے یا محض جائز؟

دوسرا سوال ہے کہ جنگ اور قتال کی وجہ کیا ہے؟

"كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ" (البقرہ: آیت ۲۱۶)۔ "وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ...وَاقْتُلُوْهُمْ" (البقرہ: ۱۹۰-۱۹۱)۔ سورۃ التوبۃ کی آیات (۲۹، ۳۶، ۳۸، ۱۲۱) وغیرہ آیات سے استدلال کرتے ہوئے فقہاء امت نے مشرکین کے ساتھ جہاد بمعنی قتال کو فرض کہا ہے۔ آیاتِ قرآنی کے ساتھ احادیث سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔

مثلاً یہ حدیث "امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللّٰہ وان محمدا رسول اللّٰہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دمائھم واموالھم إلا بحق الاسلام وحسابھم علی اللّٰہ" (متفق علیہ)

فقہاء کی ایک قابل لحاظ تعداد نے جہاد کو فرض عین بتایا ہے اور بڑی اکثریت نے فرض کفایہ کہا ہے۔ لیکن فرض کفایہ کہنے والوں کے نزدیک بھی کئی صورتوں میں فرض عین ہو جاتا ہے اس حکم کی تاریخ اور حیثیت دونوں جاننے کے لئے ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے یہ چند الفاظ کافی ہیں۔

"ثم فرض علیھم قتال المشرکین کافۃ و کان محرما ثم مامورا بہ لمن بدأ بالقتال ثم مامورا بہ لجمیع المشرکین۔"

پھر ان پر تمام مشرکین سے جنگ کرنا فرض کر دیا گیا اور پہلے جنگ حرام تھی، پھر اس کی اجازت دی گئی پھر اُس سے لڑنے کا حکم دیا گیا جو لڑائی کا آغاز کرے۔ پھر تمام مشرکین سے لڑائی کا حکم دیا گیا۔

(زادالمعاد، صفحہ: ۶۵، جلد: ۲)

اوپر ہم نے اشارۃً کئی آیات قرآنی کا حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک آیت پر خاص طور پر غور کیجئے۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ○ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے، ان سے لڑو یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت میں ان اہل کتاب سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے اندر تین باتیں پائی جاتی ہیں:

(۱) اللہ پر اور آخرت پر صحیح معنی میں ایمان نہ ہو۔

(۲) تحلیل وتحریم کا حق صرف اللہ کے لئے تسلیم نہ کرتے ہوں اور اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی قانون سازی کا اختیار دیتے ہوں۔

(۳) دین حق یعنی اسلام کو اپنا دین یعنی طریق زندگی نہ بتاتے ہوں۔

ان صفات پر جب تک وہ قائم ہیں اس وقت تک قتال کرنا فرض ہے، اِلاَّ یہ کہ وہ جزیہ دینے کے لئے اور چھوٹے اور ماتحت بن کر رہنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے جن ممالک کے لوگوں کے اندر یہ صفات پائی جائیں گی۔ ان ملکوں سے قتال کرنا فرض ہے۔ اس طرح صرف ایک آیت سے حکم قتال کی وجہ اور علت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ حکم صرف اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام مشرکین کے لئے ہے۔ اہل کتاب کے اندر کسی بھی معنی میں ایمان نام کی چیز تو ہوتی ہے اس کے بعد بھی ان پر حکم لاگو ہوتا ہے تو جن مشرکین کا ایمان سے کوئی تعلق ہی نہ ہو ان پر تو یہ حکم بدرجہ اولیٰ لاگو ہونا چاہئے۔ البتہ اس مقام پر یہ واضح رہنا چاہئے کہ مشرکین عرب سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا وہ اس عام حکم سے مستثنیٰ ہیں ان کے لئے صرف دو ہی آپشن ہیں یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جنگ کے لئے اور قتل ہونے کے لئے تیار رہیں جیسا کہ اسلامی تاریخ سے یہ واضح طور پر معلوم ہوتا ہے یہ ملک حجاز کی خصوصیت ہے۔ اس پس منظر میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مشرکین عرب سے جنگ کرنے کا سبب اور علت محض کفر ہے یعنی اگر وہ حجاز میں بے ضرر بن کر رہنا چاہیں اور جزیہ بھی دینے کے لئے تیار ہوں تو بھی انہیں وہاں نہیں رہنے دیا جائے گا۔ چنانچہ دور اول میں اس پر عمل ہو چکا ہے۔

عرب کے علاوہ زمین کے دوسرے علاقوں میں مشرکین اسلام کی ماتحتی میں رہنا چاہیں اور جزیہ ادا کریں تو

انہیں ایک حد تک آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ المغنی لا بن قدامہ کی تصریح کے مطابق حنبلی اور شافعی مذہب میں جزیہ صرف اہل کتاب اور مجوسی سے لیا جائے گا بقیہ سارے بت پرستوں کے لئے محض دو ہی راستے ہیں۔ ایمان یا جنگ۔ امام احمد بن حنبلؒ سے ایک روایت ہے کہ عرب کے بت پرستوں کے سواء تمام کفار سے جزیہ قبول کیا جاسکتا ہے اور یہی مذہب حنفیہ کا بھی ہے۔ ان تمام رایوں اور مذاہب کا ماخذ "حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ" والی آیت ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمین کے کسی خطہ میں کفر کی بالا دستی کسی طرح برداشت نہیں کی جائے گی اور حجاز میں کفر کا وجود بھی نا قابل برداشت ہے۔ حجاز میں کفر کے وجود کو ختم کرنا اور بقیہ ساری دنیا میں کفر اور اہل کفر کی بالا دستی کو ختم کرنا حکم جہاد و قتال کا مقصود ہے۔

یہ قرآنی حقائق ہیں ان کی روشنی میں ملکوں کی تقسیم کی جائے تو ایک ملک وہ ہوگا کہ جو ایسے لوگوں کے زیر اقتدار ہو۔

(۱) جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور

(۲) قانون سازی کا حق اصلاً اللہ کو دیتے ہوں اور

(۳) اسلام کو اپنا دین یعنی اپنا نظام زندگی مانتے ہوں۔

اور دوسرا ملک وہ ہوگا جس کے حکمراں ان تینوں صفات سے یا ان میں سے دو سے یا ایک صفت سے عاری ہوں۔ روئے زمین کے تمام ملکوں کو ان دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ ملکوں کی یہی دو قسمیں ہوسکتی ہیں تیسری قسم نہیں ہوسکتی۔ جس طرح تمام انسانوں کی دو ہی تقسیم ہوسکتی ہے، ایک خدا کے فرمانبردار و مسلم بندے۔ دوسرے خدا کے نافرمان کافر لوگ۔ اس کے علاوہ تیسری قسم نہیں ہے اور جس طرح تمام مسلم کی کوئی تقسیم نہیں کی جاسکتی اسی طرح پہلے قسم کے ملک کی بھی کوئی دوسری قسم نہیں ہوسکتی۔ اور جس طرح نافرمانوں کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں کافر، مشرک اور منافق وغیرہ اسی طرح دوسری قسم کے ملک کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں دارالحرب، دارالامان، دارالمسالمہ وغیرہ، اور جس طرح کافر، مشرک اور منافق مختلف ناموں کے باوجود باعتبار حقیقت ایک ہیں اسی طرح دارالحرب و دارالکفر، دارالامن اور دارالمسالمہ وغیرہ بھی اپنی حقیقت کے لحاظ سے ایک ہیں۔

ہماری اس گفتگو کی روشنی میں اس ملک کی تعریف اور نشاندہی بآسانی کی جاسکتی ہے جس سے جنگ نہیں کی جاسکتی اور جس سے جہاد کرنا فرض ہے۔ پہلے کی تعبیر فقہاء نے دارالاسلام سے اور دوسرے کی تعبیر دارالحرب یا دارالکفر کی اصطلاح سے کی ہے۔ اوپر کی گفتگو سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ جہاد کی وجہ اور سبب کفر ہے یا

غلبۂ کفر، یعنی ملک حجاز میں حکم جہاد کا سبب محض کفر کا پایا جانا ہے اور زمین کے دوسرے خطوں میں غلبۂ کفر ہے، حجاز میں جہاد کا مقصد کفر کو ختم کرنا ہے اور دوسری جگہوں میں جہاد کی غرض غلبۂ کفر کو ختم کرنا ہے اس طرح فقہاء کا دارالحرب اور دارالکفر کو بطور مترادف استعمال کرنا بھی سمجھ میں آتا ہے۔

ہمارے موضوع سے متعلق ایک عرب عالم ڈاکٹر علی بن نفیع العلیانی نے ایک مقام پر اچھی گفتگو کی ہے ان کی گفتگو کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔ مستشرقین اور ان کے تلامذہ جن مسائل میں علم کے بغیر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہیں ان میں ایک مسئلہ دارالحرب و دارالکفر کا بھی ہے، جن ملکوں کی مسلمانوں سے عملاً جنگ جاری ہے انہیں کو یہ لوگ دارالحرب والکفر کہتے ہیں اور جن کافر ملکوں سے جنگ نہیں ہے اور مسلمانوں سے ان کا کوئی معاہدہ بھی نہ ہو ان کو دارالحرب والکفر نہیں مانتے، ان کی رائے کے مطابق امریکہ اور روس دارالحرب نہیں ہیں کہ ان ملکوں میں مسلمان امن سے رہتے ہیں۔ اسرائیل سے کوئی معاہدہ ہوجائے تو پھر دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں رہ جائے گا جس سے جنگ مسلمانوں کے لئے ضروری قرار پائے! حالانکہ علماء اسلام نے دارالکفر اس ملک کو قرار دیا ہے جس میں کفریہ احکام کو غلبہ حاصل ہو اور دارالاسلام ان کے نزدیک وہ ملک ہے جس میں احکام اسلامی کو غلبہ ہو جس میں چاہے مسلمان نہ ہوں صرف ذمی لوگ ہوں اور مسلمانوں کا کوئی حاکم احکام اسلامی جاری کرنے کے لئے مقرر ہو۔ چنانچہ قاضی ابویعلیؒ کہتے ہیں کہ جس ملک میں اسلام کے بجائے احکام کفر کو غلبہ حاصل ہو وہ دارالکفر ہے اور کشاف القناع میں ہے کہ اس شخص پر ہجرت واجب ہے جو دارالحرب میں اپنے دین کا اظہار نہ کرسکے اور دارالحرب وہ ہے جس میں کفر کا حکم غالب ہو۔ دارالکفر والحرب سے مسلمان کبھی کسی معاہدہ کی وجہ سے یا اپنی کمزوری کی بنا پر جنگ سے توقف کرتے ہیں لیکن اس توقف کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ کفار کے ملک کو دارالحرب والکفر نہیں کہیں گے کیونکہ ملک فارس اور روم اس وقت بھی دارالکفر اور دارالحرب تھے جبکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ملکوں کو اپنی فوج نہیں بھیجی تھی اور جبکہ ان کی طرف سے مسلمان کے حق میں کوئی ظلم اور زیادتی نہیں ہو رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ ملک جو اسلام کے علاوہ کسی دوسرے قانون کا تابع ہو وہ دارالحرب اور دارالکفر ہے اگرچہ مسلمانوں سے ان کا کوئی معاہدہ ہوجائے، جیسے مکہ صلح حدیبیہ کے بعد تھا۔

شیخ حسن ایوب کہتے ہیں:

> ''ذمیوں کا ملک بھی دارالاسلام کہلاتا ہے کیونکہ اس کا حاکم مسلمان ہوتا ہے جو ان پر دین اسلام کے عام احکام نافذ کرتا ہے اور وہ اسلام کے زیر نگیں ہے برخلاف اس ملک کے جس سے مسلمانوں کی صلح ہوگئی ہو وہ بہرصورت دارالحرب ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ کے بعد مکہ تھا کہ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ مخالف تھا۔ اس مقام پر خیبر کے واقعہ کو دیکھئے۔ خیبر کو فتح کرنے کے بعد ایک مسلمان گورنر آپ نے مقرر کردیا۔ جو احکام

اسلامی جاری کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ملک پر مسلمانوں کا مقرر کیا ہوا والی اسلامی احکام کے مطابق کام کرتا ہے تو وہ ملک دارالاسلام کہا جائے گا چاہے اس کے باشندے غیر مسلم ہوں۔ (بحوالہ اہمیۃ الجہاد)

علامہ ابن حزمؒ نے اپنی کتاب ''**المحلی**'' میں لکھا ہے اہل ذمہ اپنے شہروں میں رہتے ہوں اور ان کے علاوہ دوسرے نہ ہوں۔ ایسی صورت میں کوئی مسلمان ان کے ساتھ بحیثیت امیر یا تاجر وہاں جا کر رہے تو نہ اس کو کافر کہیں گے اور نہ گنہگار۔ بلکہ وہ پکا مسلمان ہوگا۔ اور اس ملک کو دارالاسلام کہیں گے نہ کہ دارالشرک، اس لئے کہ دار کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے جو وہاں غالب ہو حاکم ہو اور مالک ہو۔ چنانچہ کوئی کافر دارالاسلام کے کسی حصہ پر غالب ہو جائے اور مسلمانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے لیکن وہی مالک ہو اور وہی اس کا نظم چلانے کا تنہا ذمہ دار ہو اور علی الاعلان اسلام کے سواء کسی دوسرے دین کا اقرار کرتا ہو تو جو کوئی اس کا تعاون کرے گا اور اس کے ساتھ رہے گا اسے انہیں میں شمار کیا جائے گا اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو۔

تاریخ کا یہ واقعہ بھی ہے کہ بنی عبید قداح نے جب شام اور مصر میں حکومت قائم کی۔ جمعہ اور جماعت قائم کی، قاضی اور مفتی مقرر کیا اور عام شرائع اسلام کو رواج دیا لیکن اسی کے ساتھ شریعت کی کئی باتوں کی مخالفت کی، اور ان کی طرف سے شرکیہ افعال کا مظاہرہ ہوا اور اس طرح ان کا نفاق کھل گیا تو اہل علم کا ان کے کافر ہونے اور ان کے علاقہ کے دارالحرب پر اتفاق ہو گیا یہاں تک کہ بعض معروف اور معتبر لوگوں نے کہا کہ اگر میرے دس تیر ہوں تو ایک تیر صلیبی فرنگیوں پر چلاؤں گا اور نو تیر بنی عبید پر۔ سلطان محمود زنگیؒ نے جب ان پر فوج کشی کر کے مصر کو ان سے چھین لیا تو مسلمان بہت خوش ہوئے۔

علّامہ ابن جوزیؒ نے اس پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور دیگر کئی علماء نے کتابیں لکھیں اور ان کے کفر کو بتایا۔ باوجود اس کے کہ اسلام کے کئی ظاہری احکام پر وہ عمل پیرا تھے۔ یہ واقعہ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ نے ''**الدرر السنیۃ**'' میں تحریر کیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بنی عبید کی حکومت کو دارالحرب قرار دیا باوجود اس کے کہ وہاں مسلمانوں کی بڑی تعداد امن کے ساتھ رہ رہی تھی۔ جیسا کہ اس زمانہ میں کافر حکومتوں میں مسلمان امن وچین سے رہتے ہیں اور حکومتوں کے کافرانہ نظم ونسق ان سے تعرض نہیں کرتے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی عبید کے ملک کو دارالحرب کہا گیا اور آج کفار کے شہروں کو دارالحرب کیوں نہیں کہا جاتا؟! دراصل بات یہ ہے کہ مستشرقین اور استعمار پسندوں نے دارالکفر والحرب کا مفہوم بدلنے کی کوشش کی ہے اور کفار کے محکوم اور مغلوب مسلمانوں کے احساس اور شعور کو سلا دینا چاہا ہے تا کہ وہ یہ باور کریں کہ وہ جن ملکوں میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں وہ دارالاسلام ہیں نہ کہ دارالکفر۔ کیونکہ جب ان کے اندر یہ شعور جاگ اٹھے کہ وہ جن ممالک میں

رہتے ہیں وہ دارالکفر ہیں تو لازماً گھٹن محسوس کریں گے اور ان ملکوں کو دارالاسلام بنانے کے لئے کوشاں ہوں گے مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں کی یہ کوشش بھی رہی ہے کہ مسلمانوں میں یہ خیال جاں گزیں کریں کہ دیار کفار میں جب تک انہیں امن میسر ہے اس وقت تک وہ دارالاسلام ہیں۔ چنانچہ ایک ہندی عالم مولوی کرامت علی نے انگریزی دور حکومت میں لکھا کہ

> ''ہندوستان دارالاسلام ہے اور دارالاسلام میں جہاد جائز نہیں اور اگر کوئی انگریز حکومت کی مخالفت کرے گا تو وہ باغی قرار پائے گا اور ایسے باغیوں کی سرکوبی کرنا اور حکومت کی تائید کرنا مسلمانوں کا فرض ہوگا۔''

مولانا کرامت علی مستشرقین سے متاثر تھے۔

ایک اور عربی عالم استاذ عبداللہ احمد القادری کے چند جملے یہاں پیش کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں۔ موصوف نے قرآن کی چند آیات پیش کرکے کہا کہ ان آیات سے صاف طور سے ایک ایسا پیمانہ سامنے آتا ہے جس کے مطابق ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دارالاسلام کیا ہے اور دارالکفر کیا ہے۔ ان آیات کی روشنی میں یہ ایک عام قاعدہ کلیہ معلوم ہوتا ہے کہ دارالاسلام وہ سرزمین ہے جس میں اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ اللہ کی توحید اور اس کی اطاعت کا غلبہ ہو، معروف کا حکم دیا جاتا ہو اور منکر سے روکا جاتا ہو۔ اور دارالکفر وہ سرزمین ہے جس میں ظلم کا دور دورہ ہو اور سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ غیروں کو شریک کرنا اور قانون سازی اور تحلیل و تحریم کا حق غیروں کو دینا ہے۔
(حقیقۃ الجہاد فی سبیل اللہ)

فقہاء کی تصریحات

زیر بحث مسئلہ میں عام طور پر جو الجھن پیدا ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ فقہی عبارتوں کو صحیح طور سے نہ سمجھنا ہے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے **''تحذیر الاخوان عن الربو''** میں اس جانب اپنے ان جملوں میں اشارہ فرمایا۔

> ''تعجب کرتا ہوں فقہاء وقت سے کہ اس شرط پر کس طرح غلطی کرتے ہیں پورا مطلب نہیں سمجھتے کہ کیا ہے؟!
> علامہ کا ایک اور جملہ ہے کہ ''تنوع عبارات فقہاء دیکھ کر اور اصل مطلب کو نہ سمجھ کر شبہ ہوتا ہے اور بعد فہم مطلب اہل مذہب کے امر واضح ہے۔''

ہمارے خیال میں مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ اصل مسئلہ کیا ہے وہ کیا سوالات ہیں جن کے جواب مطلوب ہیں۔ فقہاء اسلام نے مختلف سوالات کو سامنے رکھ کر مختلف باتیں لکھی ہیں۔ بسا اوقات لوگ ایک سوال کا جواب دوسرے سوال کے جواب میں پیش کرتے ہیں جن کے نتیجہ میں خلط مبحث

ہوجاتا ہے اور بات میں الجھاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا مسئلہ پر غور کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھئے کہ چار سوالات ہیں جن کے جواب آپ کو معلوم کرنے ہیں۔

① دارالاسلام کس کو کہتے ہیں؟

② دارالحرب یا دارالکفر کس کو کہتے ہیں؟

③ کوئی دارالحرب کب دارالاسلام بن جائے گا؟

④ کوئی دارالاسلام کب دارالحرب بن جائے گا؟

اب ہم بالترتیب ان سوالوں کا جواب فقہاء کی تصریحات کی صورت میں دیں گے۔

● سوال نمبر ۱: کا جواب:

"ان المراد بدار الاسلام بلادیجری فیھا حکم امام المسلمین وتکون تحت قھرہ"۔ ("کافی" فی فقہ اھل المدینۃ)

ترجمہ: بیشک دارالاسلام سے مراد ایسے شہر ہیں جن میں امام المسلمین کا حکم چلتا ہو اور وہ امام المسلمین کے زیر اقتدار ہو۔

"لان الموضع الذی لایامن فیہ المسلمون من جملۃ دارالحرب فان دار الاسلام اسم للموضع الذی یکون تحت یدالمسلمین وعلامۃ ذالک ان یامن فیہ المسلمون۔" (شرح السیر الکبیر، جلد۳، صفحہ:۸۱)

ترجمہ: کیونکہ وہ جگہ جس میں مسلمان محفوظ نہ ہوں من جملہ دارالحرب ہے، اس لئے کہ دارالاسلام اس مقام کا نام ہے جو مسلمانوں کے زیر نگیں ہو اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہاں مسلمان محفوظ ہوں۔

علامہ السرخسیؒ المبسوط میں فرماتے ہیں کہ:

"ان الامام اذا فتح بلدۃ وصیرھا دار الاسلام باجراء احکام الاسلام فیھا فانہ یجوز لہ ان یقسم الغنائم فیھا"۔

ترجمہ: بیشک امام جب کسی شہر کو فتح کرے اور اس کو احکام اسلام جاری کرکے دارالاسلام بنالے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ وہاں مال غنیمت تقسیم کرے۔

یہ قدیم فقہاء کی تعریفات ہیں ابھی حال میں فقہی انسائیکلو پیڈیا "**الموسوعۃ الفقھیۃ**" جو کویت میں تیار کی گئی ہے اس میں دارالاسلام کی تعریف "**المبسوط**"، "**کشاف القناع**"، "**الانصاف**" اور "**المدونہ**" کے حوالہ کے ساتھ صرف ایک جملہ میں یوں کی گئی ہے:

"دار الاسلام هی کل بقعة تکون فیها احکام اسلام ظاهرة"

ترجمہ: دارالاسلام وہ خطہ ارض ہے جس میں اسلامی احکام غالب ہوں۔

بیسویں صدی کے علماء میں سے بھی چند کی تصریحات ملاحظہ فرمائیے:

مصر کے مشہور عالم ابوزہرہ فرماتے ہیں:

''دارالاسلام ہر وہ حکومت ہے جو سلطان المسلمین کے ذریعہ چلائی جائے اور پورا اختیار اور قوت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، یہی وہ ادارہ ہے جس کی حفاظت مسلمانوں پر واجب ہے اور جس کے لئے جہاد کرنا فرض کفایہ ہے۔'' (بحوالہ العلاقات الدولیة فی الاسلام)

عبدالقادر عودہؒ کہتے ہیں:

''وہ سب شہر دارالاسلام ہیں جن میں اسلام کے احکام غالب ہوں یا ان کے مسلمان باشندے اسلامی احکام غالب کرنے کی استطاعت رکھتے ہوں، پس دارالاسلام میں ہر وہ شہر داخل ہے جس کے تمام باشندے یا اکثریت مسلمان ہوں اور وہ شہر بھی جس پر مسلمان قابض اور حکمراں ہوں چاہے اس کے اکثر باشندے غیر مسلم ہوں۔'' (بحوالہ سابق)

● **سوال نمبر: ② کا جواب:**

مذہب حنبلی کی ایک اہم کتاب "الانصاف" میں دارالحـــرب کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے

"دار الحرب ما یغلب فیها حکم الکفر"، **دارالحرب وہ ہے جس میں کفر کا حکم غالب ہو۔**

المعتمد فی اصول الدین لابی یعلی **میں ہے:**

"کل دار کانت الغلبة فیها لاحکام الکفر دون احکام الاسلام فهی دار الکفر"۔

ترجمہ: ہر وہ دار جس میں احکام اسلام کے بجائے احکام کفر کو غلبہ حاصل ہو وہ دارالکفر ہے۔

"**کشاف القناع**" **میں ہے**

"وتجب الهجرة علی من یعجز عن اظهار دینه بدار الحرب وهی ما یغلب فیها حکم الکفر"۔

ترجمہ: اور اس شخص پر ہجرت واجب ہے جو دارالحرب میں اپنا دین ظاہر کرنے سے عاجز ہو کفر کے احکام غالب ہوں۔

"دار الحرب هی کل بقعة تکون احکام الکفر فیها ظاهرة" **دارالحرب ہر وہ خطۂ زمین ہے**

جس میں کفر کے احکام غالب ہوں۔

علامہ رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی دارالحرب کی تعریف ایک جملہ میں یوں فرمائی ہے:

''دارالحرب وہ ہے کہ حاکم متصرف اس کا کافر ہوجیسا تمام کفار کے ممالک میں ہوتا ہے۔''

● **تیسرے سوال کا جواب کہ کوئی دارالحرب کب دارالاسلام بن جائے گا؟ بدائع الصَّنائع میں ہے:**

''لا خلاف بین اصحابنا فی ان دارالکفر تصیر دارالاسلام بظھور احکام الاسلام فیھا۔'' (عالمگیری، جلد: ۳، صفحہ: ۱۴۶)

ترجمہ: ہمارے اصحاب کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ دارالکفر دارالاسلام بن جائے گا، احکام اسلام کے اس میں غالب ہونے سے۔

''اعلم ان دارالحرب تصیر دارالاسلام بشرط واحد وھو اظھار حکم الاسلام فیھا۔''

ترجمہ: یعنی جان لو کہ دارالحرب محض ایک شرط سے دارالاسلام بن جائے گا اور وہ ہے اسلامی حکم ''قانون'' کا غلبہ اور نفاذ۔

السیر الکبیر، جلد: ۴، صفحہ ۳۰۲ پر ہے:

''لان الدار انما تصیر دار الاسلام باجراء حکم المسلمین فیھا''

ترجمہ: کیونکہ دار، دارالاسلام صرف مسلمانوں کے قانون کے اجراء سے بن جاتا ہے۔

● **چوتھے سوال کا جواب کہ کوئی دارالاسلام کب دارالحرب بن جائے گا؟**

اس سوال کا جواب امام محمدؒ اور امام یوسفؒ یہ دیتے ہیں کہ جس طرح دارالحرب محض احکام اسلام کے اجراء اور اظہار سے دارالاسلام بن جاتا ہے اسی طرح کوئی دارالاسلام بھی محض احکام کفر کے اجراء اور اظہار سے دارالحرب ہو جائے گا، لیکن امام ابوحنیفہؒ کہتے ہیں کہ دارالاسلام کے دارالحرب بننے کے لئے تین شرطیں ہیں:

① احکام کفر کا غلبہ۔

② دارالکفر سے ملا ہوا ہونا۔

③ یہ کہ اس میں کوئی مسلمان اور ذمی سابق امان کے ساتھ مامون نہ ہو۔

اس مقام پر یہ نکتہ خاص طور سے اپنے سامنے رکھئے کہ پہلے دوسرے اور تیسرے سوال میں کوئی اختلاف نہیں ہے صرف چوتھے سوال کے جواب میں اختلاف ہے اور وہ اختلاف بھی بنیادی اختلاف نہیں ہے بلکہ بات

یہ ہے کہ احکام کفر کا غلبہ ہی ہر ایک کے نزدیک اصل ہے مگر یہ سوال کہ کس غلبہ کا اعتبار کیا جائے اور کب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب کفر کا غلبہ مستقل ہوگیا ہے، اس میں اختلاف ہے، گویا امام صاحب نے غلبہ کے استحکام کے لئے دو مزید شرطیں لگائی ہیں۔ اس طرح پورا مسئلہ بالکل واضح ہے اور تقریباً متفق علیہ ہے۔

پہلے سوال کے جواب میں ہم نے جو گفتگو کی ہے اس میں اس سوال کا جواب آ گیا ہے پھر بھی مزید وضاحت کی جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی ملک جو دارالاسلام نہیں ہے یعنی جہاں اللہ کا حکم چلانے کے بجائے کفر کا حکم چلایا جا رہا ہو، اقتدارِ اعلیٰ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا تسلیم کیا جاتا ہو، قرآن وسنت کو قانون کا ماخذ نہ بنایا جا رہا ہو۔ اس کو سورۃ التوبۃ آیت ﴿۲۹﴾ کے بموجب اسلام کے ماتحت بنانے کی کوشش کرنا مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ فقہی زبان میں یہ کہا جائے گا کہ اس کو دارالاسلام بنانا فرض ہے اور اس کے واسطے حسب استطاعت جو کچھ کیا جاسکتا ہے اس میں جہاد بالسیف بھی داخل ہے۔ مسلمانوں کی ذمہ داری اس وقت مزید بڑھ جاتی ہے جبکہ کسی دارالاسلام کو کفار نے دارالحرب بنالیا ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہاں مسلمان اکثریت میں ہیں یا اقلیت میں۔ کسی ملک کو دارالاسلام بنانے کے لئے ساری جدوجہد حتیٰ کہ جہاد بالسیف ہمیشہ اقلیت میں رہتے ہوئے کی گئی ہے۔ تاریخ سے پوچھئے یہ کام کب اکثریت میں ہوکر کئے گئے ہیں اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی کیا ہے؟ جہاد کے واجب ہونے کا سبب تو موجود ہے جیسے نماز ظہر کے واجب ہونے کا سبب زوال شمس واقع ہوگا تو نماز ظہر واجب ہوگی چاہے نماز پڑھنے والے نماز سے غافل ہوں۔ **الموسوعة الفقهية** کی یہ عبارت مزید باعث تشفی ہوگی:

"اذا استولی الکفار علی بقعة من دار الاسلام صار الجهاد فرض عین علی جمیع افراد الناحیة التی استولی علیها الکفار رجالا و نساء اوصغاراً او کباراً اصحاء و مرضی فاذالم یستطع اهل الناحیة دفع العدو عن دار الاسلام صار الجهاد فرض عین علی من یلیهم من اهل النواحی الاخری من دار الاسلام وهکذا حتی یکون الجهاد فرض عین علی جمیع المسلمین ولا یجوز تمکین غیر المسلمین من دار الاسلام ویاثم جمیع المسلمین اذا ترکوا غیرهم یستولی علی شئی من دار الاسلام"(جلد۲۰)

ترجمہ: جب کفار دارالاسلام کے کسی علاقہ پر قابض ہوجائیں تو اس علاقہ کے تمام افراد پر جہاد فرض عین ہوجائے گا۔ خواہ مرد ہوں یا عورت، بچے ہوں یا بوڑھے، صحت مند ہوں یا بیمار۔ جب اس علاقہ کے لوگ

دشمن کو دارالاسلام سے دفع نہ کرسکیں تو ان سے متصل رہنے والوں پر فرض ہوگا اور اسی طرح ہوگا یہاں تک کہ تمام مسلمانوں پر فرض عین ہوجائے گا۔ اور دارالاسلام پر غیر مسلمین کو قبضہ دے دینا جائز نہیں ہوتا اور دارالاسلام کے کسی جز پر غیر مسلمین کو قابض چھوڑ دیں گے تو تمام مسلمان گنہگار ہوں گے۔

اوپر ہم نے دارالاسلام اور دارالحرب کے تعلق سے قرآن اور فقہاء اسلام کی تعریف اور تصریحات کی روشنی میں جو گفتگو کی ہے اس سے یہ بات صاف طور سے سمجھ میں آجانی چاہئے کہ یہ اصطلاحات حالات کے تناظر میں نہیں استعمال کی گئی ہیں بلکہ قرآنی حقائق کی تعبیر کے لئے استعمال کی گئی ہیں۔ لہٰذا حالات کے بدلنے کے باوجود قرآنی حقیقتیں اپنی جگہ باقی رہیں گی اور اقوام متحدہ کی تشکیل سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے اور مولانا عتیق صاحب کی بات بالکل لچر ہے۔

ایک آیت پر گفتگو

یحییٰ نعمانی صاحب نے ایک آیت پر جو گفتگو فرمائی ہے اس سے وہ بات نکلتی ہے جس کو ہمارا گمان یہی ہے کہ مولانا بھی پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ. (الانفال:۳۹)

مولانا نعمانی صاحب فتنہ کے معنی مذہبی جبر بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

''مفسرین نے فتنہ کے معنی شرک بتایا ہے وہ لازمی معنی ہے۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ مذہبی جبر ختم ہوجانے تک جنگ کا حکم ہے، مذہبی جبر ختم ہوجائے تو خواہ شرک باقی رہے تو بھی جنگ نہیں ہے پھر موصوف نے لکھا ''آج کے زمانے میں الحمدللہ دنیا میں شاید ہی ایسا مذہبی جبر کہیں موجود ہوگا جس کو اس طرح کا اصطلاحی فتنہ کہہ سکیں جیسے فتنہ کا سامنا مسلمانوں کو مکہ میں تھا۔'' (الجہاد، صفحہ ۲۶)

ان دونوں باتوں کو ملایا جائے تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ اب جہاد کا دور ختم ہوگیا۔ اس لئے کہ جہاد کا حکم مذہبی جبر کے خاتمہ کے لئے تھا۔ اس زمانہ میں مذہبی جبر نہیں تو جہاد کا کیا سوال۔ اس موقع پر دو سوال پیدا ہوتے ہیں کہ جہاد سے متعلق پچاسوں آیات قرآنی بالخصوص ''كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ'' کا کیا ہوگا؟ کیا ان کو منسوخ مانیں گے؟ اور پچاسوں احادیث جن میں جہاد کا کسی نہ کسی طرح ذکر ہے ان کا کیا ہوگا؟

بالخصوص ''الجهاد ماضٍ الى يوم القيامة'' کا کیا ہوگا؟ ان دونوں سوالوں پر اگر آپ صحیح معنی میں غور کریں گے تو آپ لازماً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس دور میں مذہبی جبر کے ختم ہونے کی وجہ سے حکم جہاد ختم ہونے کی بات نہایت غلط اور گمراہ کن ہے۔

فطری طور پر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لیکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ہزار ہا سال تک جس مذہبی جبر کی تاریخ قرآن میں ملتی ہے وہ انیسویں اور بیسویں صدی میں کیونکر ختم ہو گی؟

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

یہ شرار بولہبی کی ستیزہ کاری بیسوی صدی میں یکلخت کیسے ختم ہوگئی۔ کیا انسان کی فطرت بدل گئی ہے؟ ہرگز نہیں! انسانی فطرت اپنی جگہ قائم ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کی تاریخ پر قرآن شاہد عدل ہے اس پر کوئی کلام نہیں کیا جا سکتا۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کون سی صدی ہے جو مذہبی جبر سے خالی ہے اس کی نشاندہی کی جائے۔

تیرہویں صدی عیسویں میں اسپین میں جو سانحہ پیش آیا کہ مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کر دیا گیا۔ نہ صرف یہ کہ ان کی حکومت ختم ہوگئی بلکہ ان کے وجود سے اسپین بالکل خالی ہو گیا۔ اس واقعہ کو کس خانہ میں ڈالیں گے اور اس کو کیا نام دیں گے؟ پھر کمیونسٹ روس میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اس کو مذہبی جبر نہیں کہیں گے؟ پھر حالیہ دور میں بوسنیا، چیچنیا، برما وغیرہ میں کس جبر کا مظاہرہ ہوا ہے؟ ہندوستان میں ہماری آنکھوں کے سامنے ۱۹۴۷ء کے بعد فرقہ وارانہ ہزاروں فسادات ہوئے اور بے شمار مسلمانوں کی جانیں تلف ہوئی ہیں کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے؟ فرقہ وارانہ فسادات کے بعد دہشت گردی کے نام پر جو زیادتیاں ہو رہی ہیں اور بے قصور نوجوانوں کی زندگیاں برباد کی جا رہی ہیں اس کے لئے کوئی نئی اصطلاح بنانی پڑے گی۔ اس سب کے پیچھے اسلام اور مسلمان دشمنی کے علاوہ کونسی ذہنیت کارفرما ہے؟

قرآن نے اول دن کہہ دیا تھا "وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ" یہ ایک غیر مبدل حقیقت ہے جس کی وضاحت لفظوں میں یہ ہے کہ جب تک تم اپنے دین پر قائم رہو گے۔ اعداء اسلام خوش اور راضی نہیں ہو سکتے۔ ہاں جس قدر تم دین سے دور رہو گے کفار و مشرکین اسی قدر تم سے خوش رہیں گے اور تمہارے ساتھ رعایت کریں گے اور نرمی کا برتاؤ کریں گے۔ اس قرآنی نص اور تاریخ کی روشنی میں یہ خیال کہ دور جدید میں مذہبی جبر ختم ہو گیا ہے اس لئے جہاد کی ضرورت باقی نہیں خام خیالی ہے پھر یہ بھی بے بنیاد بات ہے کہ جہاد محض جبر و ظلم کو ختم کرنے کے لئے مشروع قرار دیا گیا ہے۔

پھر آیت کی طرف لوٹئے، فتنہ کے جو معنی آپ بتا رہے ہیں وہ قطعی نہیں ہے، فتنہ بمعنی شرک ہے، اس کو یہ کہہ کر بے وزن نہیں کیا جا سکتا ہے کہ فتنہ کا لازمہ شرک ہے اس لئے فتنہ کی تفسیر شرک سے کی گئی ہے۔ اس لئے کہ

یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اصل میں شرک کی نفی کرنا چاہتا ہے لیکن شرک کا لازمہ فتنہ ہے اس لئے شرک کے بجائے فتنہ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تاکہ قتال کے لئے مزید ترغیب پیدا کی جا سکے۔

ذہن کو آگے بڑھایئے قتال کا خاتمہ صرف فتنہ کے خاتمہ پر منحصر نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا کہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے ایک بات ہوئی۔

دوسری بات یہ کہ دین اللہ کے لئے ہو جائے۔ غور کیجئے، کیا شرک کی موجودگی یا شرک کے غلبہ کی صورت میں دین اللہ کے لئے ہو سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اللہ اور طاغوت دونوں کی اطاعت بیک وقت کی جائے؟

اس طرح آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فتنہ کی جو بھی تفسیر آپ کریں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بات یہی سامنے آئے گی کہ جنگ اس وقت تک جاری رکھنے کا حکم ہے جب تک شرک ختم ہو کر دین اللہ کے لئے نہ ہو جائے۔ حجاز میں شرک کی موجودگی اور حجاز کے علاوہ دنیا کے دوسرے حصوں میں غلبہ شرک وجہ قتال ہے۔

مذہبی جبر میں جو کمی معلوم ہو رہی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر مسلمان اس دور کے ایک نئے شرک پر راضی ہو گئے ہیں، یعنی مسلمانوں نے پرائیویٹ زندگی میں اللہ و رسول کی اور اجتماعی زندگی میں اولیاء شیطان کی اطاعت کرنے کا عہد کر کے اپنے آپ کو محفوظ بنا لیا ہے، اس نئے شرک کا خوبصورت نام سیکولرزم ہے جہاں کہیں مسلمان اس نئے شرک سیکولرزم کو تسلیم نہیں کرتے وہاں ایسے جبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے جس کے سامنے فرعون اور نمرود کا جبر ہیچ ہے۔

نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ

> ''الغرض اسلام میں قتال کو جو 'جہاد فی سبیل اللہ' کا مقام اور درجہ دیا گیا، اور اس پر اس قدر اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا تو وہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ یہ مسلمانوں کے قومی دفاع کا ضروری ذریعہ ہے اور یہ ایک باغیرت و خود دار قوم کے قومی، سیاسی اور اخلاقی وجود کے لئے ضروری ہے۔
>
> بلکہ مسلمانوں کی جنگ کے جہاد بننے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی اصل غرض و غایت قومی دفاع و تحفظ اور جان و مال کی حفاظت کے بجائے اللہ کی رضا و خدا پرستی اور اس کے دین کی حفاظت، انسانوں کی ہدایت و خیر خواہی اور ان کو شر و فساد اور ظلم و گمراہی سے بچانے کی سچی محبت ہو، اسی لئے آں حضرت ﷺ نے صاف طور سے اعلان کر دیا کہ قومی جذبے سے لڑنے والے قطعاً مجاہد نہیں ہیں۔'' (صفحہ ۳۲)

بلاشبہ مسلمان امت عام معنی میں دوسری قوموں کی طرح ایک قوم نہیں ہے لیکن قوم ہونے سے بالکل انکار بھی نہیں کیا جا سکتا، چاہے تھوڑا بدلے ہوئے لفظوں میں ملت و امت کہنا چاہئے۔ ہر قوم و ملت کی ایک بڑی ضرورت دفاع اور حفاظت جان و مال ہوتی ہے اس ضرورت کو پورا کرنا بھی جہاد ہے بشرطیکہ اللہ کی خوشنودی کے

لئے یہ کام کیا جائے، کام تو ایک ہی کرنا ہے خواہ آدمی کی نیت کچھ ہو۔ ایک ہی کام ایک آدمی کے لئے جہاد ہے اور وہ اجر وثواب کا مستحق ہوگا اور اگر نیت غلط ہو تو وہی کام دوسرے آدمی کے لئے جہاد نہیں ہے۔ بہر صورت دفاع اور رضائے الٰہی خدا پرستی میں تضاد نہیں۔ دفاع میں جو کام کیا جاتا ہے وہ باعث ثواب بھی ہوسکتا ہے اور باعث عذاب بھی۔ قومی اور ملی دفاع کو حقیر بتانا مناسب نہیں ہے۔

''من لم یهتم بامر المسلمین فلیس منهم'' (رواہ الحاکم فی مستدرکہ)

بسا اوقات ایک شخص اپنی نیت میں کمی کی وجہ سے ثواب سے محروم ہوسکتا ہے مگر اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچتا ہے اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وان اللّٰہ یؤید هذاالدین بالرجل الفاجر'' اس بناء پر کسی کے فتور نیت کی وجہ سے قومی دفاع کو جہاد کی فہرست سے خارج قرار دینا صحیح نہیں ہے، دفاع کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کرنا اچھا کام نہیں ہے بلکہ تلقین کرنی چاہئے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرو جیسے نماز ہے اس کا انکار کرنے یا اس سے روکنے کے بجائے صحیح نیت کے ساتھ لوگ نماز پڑھیں اس پر زور دینا مناسب ہوگا۔

نعمانی صاحب لکھتے ہیں کہ

''جہاد وقتال فی سبیل اللہ کی پہلی شرط یہی ہے کہ اس کام کے لئے انسانوں کا جو گروہ کھڑا ہو اس کی غالب جماعت کی ایسی تربیت کی جاچکی ہو، اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے کے مطابق اس کے دلوں کا ایسا تزکیہ کیا جاچکا ہو کہ اس کے پیش نظر نہ اپنی اور اپنی قوم کی حکمرانی اور سیادت قائم کرنا ہو اور نہ کسی دوسری قوم کو زیر کرنا'' (الجہاد)

اس عبارت میں واضح نہیں ہے کہ پہلی شرط کس بات کے لئے ہے تربیت، تزکیہ کی صفت پیدا کرنا چاہئے اور ہر مسلمان کو تمام صفات مومنانہ سے کماحقہ متصف ہونا ایک ضروری امر ہے، لیکن قرآن وسنت میں کہیں حکم نہیں دیا گیا کہ جو لوگ مومنانہ کردار کے حامل نہیں ہیں ان کو میدان جہاد سے دور رکھا جائے اور کہیں یہ نہیں بتایا گیا کہ شرکت جہاد کے لئے فلاں فلاں فضائل حسنہ شرط ہیں اور تاریخ وسیرت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاد میں ایسے لوگ بھی شریک ہوا کرتے تھے جن پر ایمان لانے کے بعد چند ماہ بھی تربیت اور تزکیہ کا عمل نہیں کیا گیا حتیٰ کہ منافقین کو بھی شرکت جہاد سے روکا نہیں گیا۔ ایک دوسرے زاویہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل ایسی ہے کہ فرض صوم کی بات آئے تو کہا جائے کہ پہلی شرط یہ ہے کہ آدمی نماز کا پابند ہو۔ زکوٰۃ کا مسئلہ سامنے آئے تو کوئی کہے کہ زکوٰۃ کی کیا بات کرتے ہو پہلے صوم وصلوٰۃ کا پابند بنایئے۔

فقہی اور قانونی لحاظ سے دیکھئے، دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد روزہ اور زکوٰۃ کے وجوب کے لئے یہ

شرط نہیں ہے کہ آدمی با کردار ہو اور نمازی ہو، وجوبِ صلوٰۃ کے لئے طہارت کو شرط بنایا لیکن طہارت شرط ہے ادائے صلوٰۃ کے لئے۔ طہارت نہیں ہے تو صلوۃ کا وجوب ختم نہیں ہوگا۔ اسی طرح وجوب جہاد کے لئے ایمان کے علاوہ کوئی شرط نہیں ہے دارالاسلام کے کسی حصہ پر غیر قابض ہو جائیں تو ہر مسلمان پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے چاہیئے عالم ہو کہ جاہل۔ نمازی ہو کہ غیر نمازی۔

مولانا نعمانی نے ''اقدامی جہاد'' کرنے کی ذیلی سرخی لگا کہ صفحہ ۳۷ تا ۴۶۔ دس صفحہ، جو کچھ لکھا ہے وہ اقرار و انکار کے درمیان کی بات ہے، نہ صاف اقرار کر سکتے ہیں اور نہ صاف انکار کرتے ہیں، لیکن مجموعی طور سے اقدامی جہاد کے انکار کا موڈ ظاہر ہے مثلاً حجت تمام کرنے کی محنت کا مسئلہ ہے کہ جس کا یقین تقریباً ناممکن ہے، مثلاً بیس سال حجت تمام کرنے کی محنت کچھ لوگوں پر کی گئی جب تک ایک نئی نسل تیار ہوتی ہے جن پر حجت تمام کرنے کی ضرورت پیش آجائے گی۔

سب سے بڑی بات اس سلسلہ میں یہ ہے کہ یہ حجت تمام کرنے کی شرط کہاں سے اخذ کی ہے؟! اس سے انکار نہیں ہے، افہام و تفہیم کی جان توڑ کوشش پوری دلسوزی کے ساتھ کرنی چاہئے لیکن اس کو شرط بنانا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ سیرت اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ کے علاوہ کوئی ایسا علاقہ نہیں ہے جہاں تیرہ سال تک محنت کر کے حجت تمام کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حکم جہاد کے بعد اتمام حجت کے لئے کہیں برسوں انتظار نہیں کیا گیا، عرب کے سواء دوسرے ملکوں میں ایسا نہیں ہوا کہ مہینوں اور برسوں دعوت و تبلیغ کی محنت کی گئی ہو پھر جہاد کیا گیا ہو بلکہ ایک ساتھ دعوت اسلام، دعوتِ جزیہ اور دعوت میدان دی گئی۔

نعمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

> ''اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ کسی غیر مسلم حکومت کے خلاف اقدامی جہاد کا جواز اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک ایسی امت موجود ہو جو صحیح اسلام کی عملی نمائندگی میں اس درجہ کو پہنچ چکی ہو جو ''منصب شہادت'' کا کم سے کم معیار قرار دیا جا سکتا ہے۔'' (صفحہ ۴۶)

سوال یہ ہے کہ ''اقدامی جہاد'' کے جواز کو منصب شہادت کے درجہ پر پہنچنے کو موقوف قرار دینا آپ نے کہاں سے نکالا ہے؟! منصب شہادت پر تو نبی ﷺ اور مسلمانوں کو مکہ ہی میں بیٹھا دیا گیا تو شہادت حق کے فریضہ کی ادائیگی پہلی وحی کے بعد ہی شروع ہوگئی تھی اگر مسلمان اس وقت منصب شہادت تک نہیں پہنچے ہیں تو حکم جہاد ہی کیوں، حرمت شراب، حرمت ربا اور ادائیگی صوم، جمعہ اور حج کو موقوف کر دینا چاہئے۔ اور آپ کے بموجب یہ سب احکام منصب شہادت پر مسلمان فائز ہوئے تو نازل ہوئے۔ کسی حکم کے لاگو یعنی واجب ہونے کا

سبب پیدا ہو گیا تو وہ حکم واجب ہو گیا۔ چاہے جن پر واجب ہوا ہے ان کے اندر اس کی ادائیگی کے شرائط موجود ہوں یا نہ ہوں، مثلاً زوال شمس ہو گیا تو جمعہ واجب ہو گیا چاہے لوگوں کے اندر طہارت نہ پائی جاتی ہو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زوال شمس یعنی جمعہ کے وجوب کے بعد کسی نے عدم طہارت کی بناء پر جمعہ نہ ادا کیا تو وہ ترک واجب کا مجرم ہوگا۔ زیر بحث مسئلہ میں اصل دیکھنا یہ ہے کہ وجوب جہاد کا سبب کیا ہے؟ اگر سبب وجوب ہے تو اس کے وجوب کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔

صفحہ ۵۹، ۶۰ پر صلح کی جو حیثیت دینی بتائی گئی ہے اس پر ہم زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتے، کیونکہ مولانا موصوف نے خود یہ تسلیم کیا ہے کہ فقہاء کے نزدیک صلح عارضی چیز ہے، چنانچہ ان فقہاء کے نزدیک قتال واجب اور صلح جائز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قتال ہر حالت میں کرنا ہے لیکن صلح حسب موقع و مصلحت کی جا سکتی ہے، مولانا موصوف نے نہ معلوم کہاں سے کہا کہ ''ورنہ اسلام کے قانون بین الاقوامی میں اصل صلح ہی ہے۔'' حالانکہ بعض بزرگوں کے نزدیک صلح کا حکم منسوخ ہے۔ یعنی صلح کا دین میں کوئی مقام ہی نہیں ہے۔

مولانا نعمانی صاحب کی اس عبارت پر غور کیجئے:

> ''یہاں ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ "وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ" جو جنگ کا مقصد بتلایا گیا ہے، یعنی یہ کہ جنگ کرو۔ ''تاکہ دین اللہ کے لئے خالص ہو جائے''، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کے لئے جنگ کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لے کر صلح کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ اسلامی جہاد کے تصور کی بنیاد یہ خیال ہے کہ سوائے مسلمانوں کے کسی اور قوم کو اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ حکم اصلاً صرف جزیرۃ العرب کے لئے ہے کہ اس میں اسلام کے علاوہ کسی اور کی حکومت کو باقی رکھنا مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں چھوڑا گیا تھا۔ قرآن نے یہ بات بالکل صاف کی تھی کہ مکہ کی حیثیت ایک ''ابراہیمی و اسماعیلی وقف'' کی ہے اور بنی اسماعیل کا یہ پورا ہی علاقہ ابراہیمی دعوت کے مرکز بننے کے لئے خاص کر لیا گیا تھا۔ لہٰذا اس جزیرہ کے اندر سلسلۂ قتال کا آخری مقصد اور اس کی غرض و غایت یہ بتائی گئی کہ جزیرۃ العرب تمام تر اللہ کے دین کے تحت آ جائے۔
>
> اسی آیت کی گویا وضاحت تھی رسول اللہ کی یہ خاص وصیت کہ ''مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے'' (صحیح بخاری ۳۰۵۳ و صحیح مسلم ۱۷۶۷)۔ اور یہی آیت آپ ﷺ کے اس فرمان کی بھی بنیاد تھی کہ "لا يبقين دينان في جزيرة العرب" جزیرۃ العرب میں اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کی گنجائش نہ رہے۔ (موطا: ۱۳۸۸)

اس پوری تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے قرآن کا حکم ہے کہ اگر کوئی قوم شریفانہ صلح کے لئے آمادگی کا اظہار کرے تو اس کو ضرور قبول کیا جائے۔ لہٰذا اگر کوئی غیر مسلم ریاست مسلمانوں کے ساتھ صلح پر آمادہ ہوسکے اور اپنے علاقہ میں پرامن طور پر اسلام پر عمل کرنے اور اپنی سرزمین پر اللہ کے بندوں کو اللہ کی عبادت اور بندگی کرنے دیتی ہے اور اللہ کے بندوں کو اس کے دین و شریعت کی طرف دعوت دینے اور اس کی راہ پر چلانے کی اس جدوجہد میں (جس جدوجہد کے لئے ہی امت اسلامیہ کو اصلاً وجود بخشا گیا تھا) طاقت کے زور سے حائل نہیں ہوتی، یعنی ظلم اور ''فتنہ'' کی صورت نہیں پائی جاتی، تو ایسی صورت میں مسلمانوں کے لئے دعوت ونصیحت کے راستے کے امکانات کو استعمال کرنے سے پہلے قتال و جنگ کرنا جائز نہیں ہوگا بلکہ ان کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اس راستے پر خوب محنت کرلیں یہاں تک کہ اللہ کی حجت تمام ہوجائے، اور اللہ اپنی سنت کے مطابق کوئی فیصلہ فرمادے جو حجت تمام ہونے کی صورت میں وہ یقیناً فرمایا کرتا ہے۔'' (صفحہ ۶۲ تا ۶۳)

یہ پوری عبارت یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی ہے کہ یہ خیال کہ سوائے مسلمانوں کے کسی اور قوم کو اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے غلط ہے، لیکن اس کو ثابت نہ کرسکے کیونکہ پہلے تو حجاز کی حد تک اس کو صحیح تسلیم کیا اس کے بعد آخر میں یہ کہا کہ دعوت ونصیحت سے پہلے قتال و جنگ کرنا جائز نہیں ہے، یعنی نصیحت اور دعوت کے بعد جائز ہے اس طرح جو چیز مولانا ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کے برخلاف یہ ثابت ہورہا ہے کہ یہ خیال صحیح ہے کہ مسلمانوں کے سوائے کسی اور قوم کو اپنی خودمختار حکومت قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔

''جہاد کی کچھ اہم شرطیں'' اس ذیلی عنوان کے تحت مولانا نے جو کچھ لکھا ہے وہ محل نظر ہے اس سلسلہ میں واضح رہنا چاہئے کہ امیر کی اطاعت تو ضروری ہے لیکن وجوب جہاد کے لئے امیر کا ہونا شرط نہیں ہے البتہ وجوب جہاد کی ادائیگی کے لئے امیر کا ہونا شرط ہے اور یہ مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا امیر بنائیں گے اگر امیر نہ بنائیں گے اور واجب ادا نہ ہوگا تو وہ گناہگار ہوں گے۔ مثلاً حاکم شہر اور جمعہ کی امامت کرنے والا کوئی نہ ہو تو ایسا نہیں ہے کہ جمعہ کا وجوب ساقط ہوجائے گا اور جمعہ نہ ادا کرنے پر مسلمانوں سے باز پرس نہ ہوگی۔

دوسری بات یہ بھی واضح رہنی چاہئے کہ ملک کے ہر حکمران کو امیر کا مقام حاصل نہیں ہوسکتا ہے کہ اس کی اطاعت لازم قرار دی جائے، حکمران کلمہ گو نہ ہو تو اس کی اطاعت کو شرعاً واجب نہیں کہا جاسکتا بلکہ اس کی اطاعت کہاں تک جائز ہوگی اس پر غور کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مسلمان حکمران جو پابند شرع ہونے کے بجائے فسق وفجور میں سراسر ڈوبا ہوا ہے اور دین وشریعت سے ہٹ کر کفر وشرک پر مبنی دستور اور قانون کی اساس پر حکمرانی چلا رہا ہے اس کی اجازت کے بغیر جہاد کی بات کرنا غلط ہے ایسا اگر آپ کہتے ہیں تو اس کی کیا شرعی بنیاد ہے؟

کیا چین کے غیر مسلم حکمران یا حسنی مبارک جیسے مسلم حکمرانوں کی اجازت اور منظوری کسی شرعی واجب کے ادا کرنے کے لئے ضروری ہوگی؟ جبکہ ایسی حکومت میں برضا ورغبت زندگی گزارنا ہی محتاج دلیل اور منافئ ایمان ہے "فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ" کی روشنی میں غور فرمایئے اور ایک تیسری بات بھی ذہن میں رکھئے کہ جتنی بھی شرطیں ہیں ان میں سے اکثر اقدامی جہاد کے سلسلہ میں ہیں دفاعی جہاد کے لئے کوئی شرط نہیں ہے، نہ امیر سے اجازت کی ضرورت ہے، نہ بیٹے کو باپ سے، نہ بیوی کو شوہر سے اور نہ خاص پہلے سے تیاری کی ضرورت ہے، اپنی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت میں جو کوشش آدمی کرتا ہے وہ دفاعی جہاد کے زمرہ میں آتا ہے تو اگر اپنی ناموس بچانے کے لئے کوئی مسلمان مار اور مرسکتا ہے تو ناموسِ رسول ﷺ کی صیانت میں کیوں نہیں مار اور مرسکتا ہے اس کے لئے کس کے حکم اور کس کی اجازت کی ضرورت ہوسکتی ہے؟!

''عہد اور معاہدہ'' یقیناً عہد اور معاہدہ کی پاسداری اسلام میں بہت ضروری ہے اور ایک مسلمان کو ایفاء عہد اور رعایت معاہدہ کرنا ضروری ہے، لیکن اس دور میں ملکوں کے دستور اور قانون کو کس قرآن، کس حدیث اور کس عقل سے معاہدہ آپ قرار دے سکتے ہیں؟

ان کا لحاظ بس اس اعتبار سے ایک اہم چیز ہے کہ کسی حد تک امن واَمان باقی رہے، مثلاً سڑک پر بائیں سے چلنے کا قانون ہے بائیں سے چلنا چاہئے تا کہ ایکسیڈنٹ سے بچا جائے۔ یہ نہیں ہے کہ اس کو دین وایمان بنا کر کسی بھی حالت میں اس پر عمل کو ضروری قرار دیا جائے حتی کہ اسلام کے اہم سے اہم تقاضہ کو اس کے لئے نظر انداز کردینے کو دین اور دین کا تقاضہ بتایا جائے اور اس قانون پر عمل کرنے کو اتنا ضروری قرار دیا جائے کہ اس کے لئے ماں بیٹی کی عزت قربان کردی جائے۔ کسی ملک کا دستور ہو اس کو کوئی مسلمان قرآن اور فرمان رسول ﷺ کا درجہ کس دلیل کی بنیاد پر دے سکتا ہے؟ ایک مسلمان کے نزدیک ملکی دستور اور قانون کا نمبر قرآن وسنت کے بعد آتا ہے۔

غور فرمایئے، معاہدہ دو ہم پلہ فریق میں ہوتا ہے، دونوں فریق کے نمائندے باہم بات چیت کرکے کچھ نکات پر اتفاق کرتے ہیں اور اس کے بعد متفق علیہ نکات پر دستخط کرتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں دو ہی قسم کی حکومتیں ہیں ایک شاہی اور دوسری جمہوری۔ بتایئے کس شاہی حکومت نے اپنی رعایا کو اپنا ہم پلہ سمجھ کر ان سے بات چیت کی ہے اور پھر دونوں فریق نے باہم اتفاق کرکے ملک کا دستور بنایا ہے؟ اور کس جمہوریت نے اپنی اقلیت کو اپنا ہم پلہ اور برابر سمجھ کر ان کے ساتھ معاملہ کیا ہے؟ اور اقلیت میں

کچھ لوگوں کو مشورہ میں شریک کیا بحیثیت نمائندہ؟

اگر لیا ہے تو ایسے نمائندوں کو لیا ہے جو اقلیتوں کے حقیقی نمائندہ نہیں ہوتے ...... بلکہ غالب پارٹی کے دراصل نمائندہ ہوتے ہیں، ایسی صورت میں ملکوں کے دساتیر کو سب کچھ کہہ سکتے ہیں لیکن حکومت اور پبلک کے درمیان معاہدہ نہیں کہہ سکتے ہیں اور پھر ایسا معاہدہ جس کے ایفا کے لئے دین و ایمان کو قربان کر دینے کو کہا جائے نہایت غلط ہے۔

غرض ملکی دستور اور قانون کی رعایت اور لحاظ کی ایک اہمیت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی ایک حد ہے مگر اللہ اور رسول سے جو معاہدہ ہوتا ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے اس کی پابندی میں جان و مال سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

(۲۰۱۳ء)

جہاد کی کچھ اہم شرطوں کی حقیقت

ماہنامہ افکار ملی کی اشاعت جنوری ۲۰۱۶ء میں یحییٰ نعمانی صاحب کا مضمون ''جہاد کی کچھ اہم شرطیں'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ موصوف کی ایک کتاب ''جہاد'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، غالباً یہ مضمون اسی کتاب کا ایک حصہ ہے وہ ہم نے دیکھی ہے۔ کتاب لکھنے کی غرض بتائی گئی ہے جہاد کی صحیح تصویر پیش کرنا، لیکن باتیں ایسی کی گئی ہیں کہ جہاد کا تصور ہی ختم ہوجائے کہ ''نہ رہے بانس نہ بجے بانسری''۔ جہاد کے تصور کو ختم کرنے کی بات قادیانیوں اور بہائیوں نے انگریز بہادر کی خوشنودی کے لئے کی تھی۔ اب نہیں معلوم کس کی خوشنودی کے لئے یحییٰ نعمانی صاحب اور ان کی کتاب پر مقدمہ اور پیش لفظ لکھنے والوں نے کی ہے؟

کتاب میں جہاد وقتال کی علت قتال کو بتایا گیا ہے یعنی جہاد صرف ان سے کیا جائے گا جو مسلمانوں سے جنگ کریں اور بقیہ لوگوں سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی۔ یہ بات ایسی ہے جس سے جہاد کا آدھا تصور ختم ہوجاتا ہے۔ حالانکہ قرآنی آیات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاد وقتال کی علت کفر اور غلبۂ کفر ہے۔ حجاز میں کفر ہے یعنی حجاز میں کفر برداشت نہیں کیا جائے گا بقیہ ساری جگہوں میں کفر کے وجود کو برداشت کیا جائے گا غلبۂ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کو سامنے رکھیے اور مندرجہ ذیل آیات اور حدیث پڑھئے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے۔

اس آیت پر غور کیجئے۔ جنگ کرتے رہنے کا حکم ہے اس وقت تک کہ فتنہ ختم ہوجائے اور دین پورا اللہ کے لئے ہوجائے۔ پہلی بات ''فتنہ ختم ہوجائے'' کا مطلب یہ ہے کہ شرک ختم ہوجائے۔ فتنہ سے مراد شرک ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس دور میں فتنہ کے معنی مذہبی جبر بتاتے ہیں اور انہی میں ہمارے یحییٰ نعمانی صاحب بھی ہیں۔ اور

ساتھ ہی یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اس دور میں مذہبی جبر موجود ہی نہیں ہے۔ اس لئے جنگ کا کیا سوال؟"

یہ بات حقیقتاً صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دور میں بھی جہاں بھی مذہب پر حقیقی اور وسیع معنی میں عمل کیا جاتا ہے۔ وہاں جبر دیکھنے میں آتا ہے۔ بالفرض ان لوگوں کی بات صحیح بھی ہو تو بھی ان کا مقصد اور مدعا ثابت نہیں ہوتا اس لئے کہ آیت میں دو جزء ہیں۔ ایک تو یہ کہ جنگ کا مقصد فتنہ کو ختم کرنا بتایا گیا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ بتایا گیا کہ دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہو جائے۔ سوچئے دین کے اللہ کے لئے ہو جانے کا مطلب کیا ہے؟ سوا اس کے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں اللہ کی اطاعت کی جائے اور اللہ کا بھیجا ہوا دین اور شریعت نافذ ہو جائے اور کسی شعبۂ حیات میں غیر اللہ کی اطاعت نہ کی جائے یعنی دین وشریعت اپنے کلیات اور جزئیات کے ساتھ نافذ ہوں۔ جب تک ایسا نہ ہو اس وقت تک جنگ کرتے رہنے کا حکم ہے۔ اب پلٹ کر کے پھر دیکھئے اس سے جنگ کرنے کی علت اور وجہ کیا معلوم ہوتی ہے اس بات کے ہوتے ہوئے یہ کہنا کہاں تک صحیح ہے کہ جنگ صرف ان سے کی جائے گی جو ہم سے جنگ کریں۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کی علت غیر اللہ کی اطاعت کا ہونا ہے۔

دوسرے لفظوں میں نظام کفر تسلیم کرنا اور اس کو اپنی زندگی میں جاری وساری کرنا یہ جنگ کی علامت ہے۔ ایسی شکل میں عقیدۂ کفر اور شرک کی موجودگی کو جنگ کی علت بتانے کے سوا کسی دوسری چیز کو جنگ کی علت کیسے بتایا جا سکتا ہے؟ جنگ ہر شخص اس سے کرتا ہے جو اس سے جنگ کرے۔ جنگ کے جواب میں جنگ تو ایک عام بات ہے۔ اس میں اسلامی جنگ وقتال کی کیا خصوصیت رہ جاتی ہے؟ اسلامی جنگ اور قتال کی خصوصیت تو یہ ہے کہ عقیدۂ کفر اور اس پر عمل کو ختم کرنے کے لئے جنگ کا حکم دیا گیا ہے، ایسی حالت میں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو لوگ عقیدۂ کفر رکھتے ہیں اور کفر پر مبنی پورا اپنا نظام زندگی چلاتے ہیں، اللہ کی اطاعت کے بجائے غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت کرتے ہیں ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور ان سے جنگ نہ کی جائے؟ کیا اس آیت کی رو سے ان کی گنجائش نکلتی ہے؟ سنجیدگی سے غور کیجئے۔ جبکہ اس آیت میں اور اس کے علاوہ دوسری آیات میں بھی ایسے لوگوں کو ان کی کافرانہ حالت پر چھوڑنے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

(۲)۔ اس کے بعد سورۃ التوبہ کی ایک دوسری آیت پر غور کیجئے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

اس آیت پر غور کیجئے اور دیکھئے جن لوگوں سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے ان کے بارے میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اللہ اور رسول نے جو حرام قرار دیا ہے وہ حرام نہیں مانتے۔ تیسری بات یہ کہ دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔ کیا اس سے یہ سمجھا نہیں جا سکتا کہ ان سے جنگ کی علت یہی تین چیزیں ہیں۔ پھر آیت کے آخری ٹکڑے سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان کو اپنی حالت پر چھوڑا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ چھوٹے بن کر رہیں اور جزیہ ادا کریں۔

معلوم ہوا کہ اہل شرک اور کفر کو، ان کی کفریات اور شرکیات کو برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن ان کے غلبہ کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جائے گا اور ان کے غلبہ کے باقی رہنے تک ان سے جنگ کی جائے گی یہاں تک کہ چھوٹے بن کر اور ماتحت ہو کر زندگی گزاریں۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے یہ کہنا اور سمجھنا کیسے درست ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اپنی جگہ پر امن وسکون کے ساتھ رہتے ہیں اور چاہے وہ اسلام کے عقیدہ کو نہ مانیں اور دین حق کو نہ اپنائیں، ان کے اقتدار کو گوارہ کیا جائے گا اور ان سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی جائے گی اور اسلام کو ان کے غلبہ واقتدار سے کوئی بحث نہیں ہوگی۔ آیت کی جو منشا ہم نے بتایا ہے اس کی تائید اس طور سے بھی ہوتی ہے کہ رسول برحق کو دین حق کے ساتھ اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ سارے ادیان پر اللہ ان کو غالب کردے یعنی دین اور شریعت کے آنے کا جہاں یہ مقصد ہے کہ اللہ کی اطاعت کا نظام قائم کیا جائے وہیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ تمام ادیان باطلہ مغلوب کر دیئے جائیں۔

③- امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الا الہ الا اللّٰہ۔

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کریں۔

اوپر کی آیات اور حدیث کی تائید فقہ کا یہ جملہ کرتا ہے:

④- قتال الکفار واجب وان لم یبدؤنا۔

ترجمہ: کفار سے جنگ واجب ہے اگرچہ وہ ہم سے ابتداء نہ کریں (چاہے وہ ہم سے نہ لڑیں)۔

یہ حدیث ایک اشکال کو ختم کرتی ہے۔ وہ اشکال یہ ہے کہ قرآنی آیات پر بحث کرتے ہوئے ہم نے بتایا کہ کفر کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور کفر اور شرک کو ختم کرنے کے لئے قتال مشروع ہے اور پھر دوسری آیت

پر گفتگو کرتے ہوئے ہم نے بتایا کہ اہل کفر اور شرک ماتحت بن کر کے رہیں۔ تو ان دونوں باتوں میں بظاہر ٹکراؤ اور تضاد معلوم ہوتا ہے۔ اس اشکال کو یہ حدیث ختم کرتی ہے۔ اس طور سے کہ حدیث جزیرۃ العرب سے متعلق ہے اور سورۃ التوبہ کی آیت اہل کتاب اور دنیا کے بقیہ اہل شرک سے متعلق ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں اہل کتاب کو جزیرۃ العرب سے نکالنے کا صاف حکم دیا گیا ہے، چنانچہ اس پر آج تک عمل ہو رہا ہے اور ان کو آج بھی جزیرۃ العرب کی شہریت نہیں دی جاتی۔

جہاد وقتال کی علت جنگ کو بتانے کے علاوہ یحییٰ نعمانی صاحب نے جہاد کے لئے شرط امام کی بتائی ہے کیونکہ اس دور میں مسلمانوں کا کوئی امیر نہیں ہے اس لئے جہاد کا کیا سوال؟ دوسرے اسلام میں معاہدہ کی بڑی اہمیت ہے بالخصوص حکومتوں سے جو معاہدہ ہوتا ہے ان کو پورا کرنا اسلام میں اہمیت رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ یہ نظریہ جوڑ دیا گیا کہ ہر حکومت کا شہری معاہد ہوتا ہے اس لئے اس کے ساتھ کچھ بھی کیا جائے وہ شہری حکومت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اسی مضمون میں یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

> ''لیکن اب جدید دنیا میں یہ شہریت ایک بڑا وسیع معاہدہ بن گیا ہے۔ ریاست کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں اور فرد کے تعہدات بھی۔ اس بناء پر یہ بالکل طے ہے کہ جو مسلمان کسی غیر مسلم ملک کا شہری ہو اس کو اپنے اس ملک سے مسلمانوں کے ساتھ کیسے ہی دشمنانہ رویہ کی شکایت ہو وہ جب تک اس ملک کی شہریت کو لئے رہتا ہے اس وقت تک اس کے لئے اس ملک کے خلاف یا اس کے کسی عام شہری کے خلاف کسی قسم کی جنگ وقتال کی کارروائی کرنا جائز نہیں''۔

اس موقع پر ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ڈیڑھ دو سو سال علماء ہند نے انگریزوں کے خلاف جو جنگ لڑی اس کے لئے ان کے پاس اس جنگ کے جواز کے لئے کیا دلائل تھے؟ اور یہ جنگ ایسی تھی جس میں زبان وقلم اور ہاتھ پیر سب استعمال کئے گئے حتیٰ کہ انگریزوں کے اندر اور باہر جو بھی دشمن تھے ان سے ساز باز بھی کی گئی۔ علماء کا اتنا لمبا یہ کردار یحییٰ نعمانی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ یہ کوئی شرعی دلیل نہیں ہے پھر بھی علماء کے اس طویل کردار کی اہمیت اور وزن سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ عوام کالانعام نے نہیں بلکہ حقیقی ہزاروں علماء نے جنگ آزادی میں اپنی جانیں نچھاور کی ہیں۔

اب ہم جہاد کے لئے امام کی شرط کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔

یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

''سلف کا فقہی ذخیرہ آپ پڑھ جایئے آپ کو اس کا کوئی تصور نہیں ملے گا کہ کسی جگہ کے لوگ اپنے حکمرانوں کی اجازت کے خلاف اپنے طور پر جہاد چھیڑیں۔ فقہ کی مشہور کتاب ''المغنی'' میں ایک مختصر سے جملہ میں اس بات کو سمیٹ دیا گیا ہے "وامر الجهاد موكول إلى الامام" (المغنی: ۸/ ۳۴۵) یعنی جہاد کا معاملہ حکمراں کی رائے پر منحصر ہے۔''

لیکن یحییٰ نعمانی صاحب نہیں معلوم کس خیال میں تھے کہ لکھ دیا علماء کہتے ہیں: "فان عدم الامام لم یوخر الجهاد لان مصلحته تفوت بتاخیره" (المغنی ۸/ ۳۵۳) اگر کسی جگہ حکومت ہی نہ ہو تو مسلمان جہاد کو موخر نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ دیر کرنے سے جہاد کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔''

یحییٰ نعمانی صاحب نے ایک ہی کتاب سے فقہ کی دو عبارتیں نقل کی ہیں جس میں سے ایک سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جہاد امیر کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اور دوسری عبارت سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام کی عدم موجودگی میں بھی جہاد ہوسکتا ہے، جہاد رکے گا نہیں۔ ان دونوں عبارتوں میں کیسے تطبیق دی جائے گی فی الحال ہم اس بات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ یہ کام ہم یحییٰ نعمانی صاحب کے حوالے کرتے ہیں۔ البتہ امام کی عدم موجودگی میں بھی جہاد ہوسکتا ہے۔ دوسری عبارت سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

امام کی شرط

امام یعنی اسلامی حکومت کا اعلیٰ ذمہ دار، یقیناً امام کا ہونا جہاد کے لئے شرط ہے جس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی حکومت نہیں اور نہ مسلمانوں کا کوئی امام اور امیر ہے۔ جہاد کیسے کیا جا رہا ہے؟ لیکن نعمانی صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ یہ شرط کیسی ہے امام کا ہونا جہاد کے وجوب اور فرضیت کے لئے شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کے لئے ہے جیسے وضو اداء صلوٰۃ کے لئے شرط ہے فرضیت صلوٰۃ کے لئے شرط نہیں ہے اس کا مطلب ہے کہ کسی کو وضو نہیں ہے تو اس سے نماز ساقط نہیں ہوگی اور وضو کے نہ ہونے کا بہانہ کر کے اداء صلوۃ سے بچ نہیں جائے گا اسی طرح امام کا نہ ہونا ترک جہاد کے لئے وجہ جواز نہ بنے گا وضو یعنی شرط کا مہیا کرنا اس کے لئے بندوبست کرنا ان لوگوں کا کام ہے جن پر نماز فرض ہوئی ہے۔

اسی طرح جہاد اپنی جگہ فرض اور واجب ہے اس کے لئے امام کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہے البتہ جن لوگوں پر جہاد فرض ہے ان کی یہ دہری ذمہ داری ہے کہ وہ امام بنائیں اور جہاد کریں۔ جیسے نمازی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ وضو کے لئے ضروری انتظام کرے پھر وضو کرے اور نماز ادا کرے۔ واضح ہوا کہ امام کے نہ ہونے کی بنا پر جہاد کی نفی نہیں کی جاسکتی ہے چنانچہ اس دور میں جو لوگ جہاد کر رہے ہیں وہ اپنا امیر بنائے ہوئے ہیں اور شرط پوری کر رہے ہیں اس لئے ان کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت کے بغیر جہاد کیسے کر رہے ہیں جیسے کوئی وضو

کے بجائے تیمم کر کے نماز پڑھ رہا ہے تو اس کو نہیں کہا جا سکتا کہ بغیر وضو کے یہ نماز کیسے پڑھ رہا ہے؟

جہاد ہی نہیں بعض دوسرے امور میں بھی امام کا ہونا شرط ہے۔ مثلاً اداء نماز جمعہ اور شرعی عدالتوں کا قیام، نکاح وطلاق وغیرہ کے نزاعات کو چکانے کے لئے شرعی طور پر قاضی کا فیصلہ ضروری ہے اور قاضی کا تقرر امیر اور امام کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اب جبکہ اس دور میں امام اور امیر نہیں ہے۔ یہ مسئلہ کیسے حل ہو؟ تو اس مقصد کے حل کیلئے آپ کو معلوم ہوگا کہ بہار، اڑیسہ، کرناٹک اور آندھرا میں امارت کا قیام عمل میں آیا۔ اور ان سب جگہوں پر ایک ایک امیر ہیں جو قاضیوں کا تقرر کرتے ہیں اور وہ قاضی فیصلہ کرتے ہیں پھر ان کے فیصلوں کو شرعی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان معاملات میں کہا جائے کہ اسلامی حکومت نہیں یہ کہاں کے امام وامیر؟ اور کہاں کے قاضی؟ اور کہاں کا شرعی فیصلہ؟ تو بات کہاں جا کر رکے گی۔ غور فرمائیے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قضاء کیلئے امام بنایا جا سکتا ہے تو جہاد کی ادائیگی کے لئے امام کیوں نہیں بنایا جا سکتا ہے؟ جس طرح شرعی معاملات میں اسلامی طور پر قضاء ضروری اور فرض ہے اسی طرح جہاد بھی ایک محکم فریضہ ہے اس کو کرنا فرض ہے، شرعی معاملات میں قضاء شرعی اور جہاد دونوں فرض ہیں۔ فرضیت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے یحییٰ نعمانی صاحب کو چاہیے تھا کہ امام کے نہ ہونے کی بنا پر جہاد کی نفی کے بجائے یہ بتاتے کہ آج کے حالات میں فلاں فلاں وجوہ سے جہاد فرض نہیں ہوتا! لیکن یہ کام مشکل تھا اس لئے کہ قرآن، حدیث اور فقہ میں جو تفصیلات جہاد کے تعلق سے پھیلی ہوئی ہیں ان کی موجودگی میں جہاد کی نفی کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے۔

معاہدہ کا مسئلہ

یحییٰ نعمانی صاحب نے بلاوجہ معاہدہ کی اہمیت پر کتاب وسنت سے کئی دلائل پیش کئے ہیں۔ معاہدہ کی اہمیت سے کس کو انکار ہے لیکن سوال یہ ہے کہ معاہدہ کب اور کہاں ہوا ہے؟ کسی ایک ملک کو متعین کر کے معاہدہ کی تعیین فرمائیں۔ پھر یہ کہ معاہدہ میں شرعی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ نہیں؟ مثلاً یہ بات طے ہے کہ کوئی ایسا معاہدہ جو دین کے بنیادی اصولوں کو پامال کرتا ہو اس معاہدے میں کوئی مسلمان شریک نہیں ہو سکتا اور وہ معاہدہ منعقد ہی نہیں ہوگا۔ ایسا معاہدہ جس میں کافر کی اطاعت کرنا لازمی ہو وہ مسلمان کر ہی نہیں سکتا۔

اب آپ فرمائیے کہ آپ کے ذہن میں کون کون سے ایسے ملک ہیں جس میں یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس میں کسی شکل میں کافر اور منافق کی اطاعت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جس کو آپ معاہدہ کہتے ہیں وہ آج ساری دنیا کی حکومت اور عوام کے درمیان جو دستور اور قانون کے نام سے معاہدہ ہے ان سب میں الا ماشاء اللہ کافر کی اطاعت سے بچا نہیں جا سکتا۔ اس لئے جہاں جہاں بھی ایسا دستور اور قانون ہے وہاں نام نہاد معاہدے میں

کوئی مسلمان شریک نہیں ہوسکتا اور اگر کوئی شریک ہوتا ہے تو اس کی مسلمانیت پر سوال اٹھے گا اس لئے کہ صریح طور پر کتاب وسنت میں کافر اور منافق کی اطاعت سے روکا گیا ہے اور اس کو کھلا شرک بتایا گیا ہے۔

"وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا"۔ اسی طرح مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے سوا کسی چیز کی اتباع نہ کرے اور ما انزل اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے۔ اس کو خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ کہا گیا ہے۔ اب یحییٰ نعمانی صاحب بتائیں کہ دنیا کا کون سا دستور اور قانون ہے جس میں مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے ماسوا ساری چیزوں کی اتباع سے بچنے کی گنجائش رکھی گئی ہے! دور نہ جایئے اپنے ملک کو سامنے رکھئے اور سوچئے۔ اسی طرح کون سا دستور اور قانون ہے اور کس ملک کا ہے جس میں معاہدہ کی مدت متعین کی گئی ہو مثلاً اپنے ملک کے معاہدہ کو سامنے رکھئے کہ یہ معاہدہ کتنے مہینے کتنے سال اور کتنی صدی کیلئے ہوا ہے جب کہ نبی ﷺ نے کوئی معاہدہ دس سال سے زیادہ کے لئے نہیں فرمایا اور اسلامی تاریخ میں کتنے معاہدے بلا تعیین مدت ہوئے ہیں تلاش کیجئے۔

دنیا کے جتنے معاہدوں کو آپ گنا سکتے ہیں گنایئے اور بتایئے کہ فلاں فلاں معاہدہ بلا تعیین مدت ہوئے ہیں۔ معاہدے فرد اور فرد کے درمیان ہوتے ہیں یا فرد اور حکومت کے درمیان ہوتے ہیں یا حکومت اور حکومت کے درمیان ہوتے ہیں؟؟ آپ جس کو معاہدہ کہتے ہیں ساری دنیا کے افراد اور قوموں کے درمیان کب معاہدے ہوئے؟ کن کے درمیان ہوئے؟ اس طرح سوچا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہوجائے گی کہ معاہدہ والی بات یحییٰ نعمانی صاحب کی بے بنیاد ایک مفروضہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس دور میں حکومتیں دنیا بھر کی دھاندلیوں، سازشوں اور بداخلاقیوں، بے اصولیوں اور مکاریوں، زور زبردستی کی بنیاد پر بنتی ہیں اور چلتی ہیں۔ ایک عام انسان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ ان کے شکنجوں میں کسا رہے اور چوں نہ کرے۔

پھر دیکھئے اس دور کے جس دستور اور قانون کو آپ معاہدہ مانتے ہیں اس میں معاہدہ ٹوٹنے کا بھی کوئی ذکر کوئی دفعہ ہے؟ حکومتوں کا قانون اور دستور حکومتوں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ کہیں اس کا ذکر نہیں ہوتا کہ ایسا ایسا ہوجائے تو معاہدہ ختم ہوجائے گا۔ ہوتا یہ ہے کہ حکومتیں دستور اور قانون کے نام پر جو چاہتی ہیں کرتی ہیں اور ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ شہریوں کی عزت وناموس پامال کئے جاتے ہیں۔ ان کے شہری حقوق غصب کئے جاتے ہیں۔ ان کے مذہبی حقوق پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں۔ ان کے عقائد اور نظریات کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں۔ ان کے قومی، مذہبی مقامات کی اینٹ سے اینٹ بجائی جاتی ہے اور آپ ہیں کہ ان کے دستور اور قانون کو مقدس معاہدہ مانتے ہیں! جناب کی بات زیادہ سے زیادہ ایک ظن ہے اور ایک ظنی بات درجنوں حتمی اور قطعی نصوص کے ذریعہ ثابت شدہ فریضہ کو کیسے کالعدم کرسکتی ہے؟ (۲۰۱۶ء)

محکم فریضۂ شرعی کا انکار عصر حاضر کے نام پر

ماہنامہ "افکارملی" ماہ ستمبر ۲۰۱۶ء نظر نواز ہوا۔ بقول یحییٰ نعمانی صاحب کے امت مسلمہ کے قائدین اور بڑے نامور مقبول علماء کی طرف سے طالبان، القاعدہ اور داعش کے کاموں پر شدید تنقید کی گئی جن کی وجہ سے امت کا عام دیندار طبقہ ان تنظیموں کی کارروائیوں سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن کیا اس کی وجہ سے شریعت کے ایک محکم فریضہ کو جس پر قرآن وسنت کے بیسیوں نصوص کی گواہی موجود ہے کالعدم، معطل یا منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ یحییٰ نعمانی صاحب اوران کے ہمنوا عتیق الرحمن سنبھلی اور خالد سیف اللہ رحمانی نے جہاد کو اقوام متحدہ کی تشکیل کے بعد کالعدم اور منسوخ کیا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کسی کو اس سے بحث نہیں ہے کہ طالبان اور القاعدہ، داعش کے تعلق سے آپ لوگوں کے خیالات ونظریات کیا ہیں؟

اعتراض ہم کو تصور جہاد پر آپ لوگوں نے جو تیشہ چلایا ہے اس پر ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ اس مسئلہ پر آیئے اور بتایئے کہ اگر نسخ جہاد کی جرأت قادیانیوں نے کی تو وہ غلط، بددیانتی اور گمراہی تھی تو آپ لوگوں کا اقدام تصورِ جہاد پر خط نسخ کھینچنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟ موجودہ دور کی جہادی تنظیموں کے وجود، ان کی سرگرمیوں سے برأت کا اظہار جس طرح آپ کررہے ہیں۔ بالکل اسی طرح ہم آپ کے تصور جہاد کے خاتمہ کی کوششوں سے براءت کا اظہار کرتے ہیں۔ یحییٰ نعمانی صاحب نے اس مسئلہ سے دامن بچا کر کچھ ضمنی باتوں کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ ان ضمنی باتوں میں بھی بہت کچھ قیل وقال کرنے کی گنجائش ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ یحییٰ نعمانی صاحب اوران کے ہمنواؤں نے تصور جہاد کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے کہ نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیہم کترا رہے ہیں۔ انہیں چاہئے کہ اس سوال کا جواب پہلے عنایت کریں پھر ضمنی باتیں اٹھائیں۔ مثلاً میں نے ان کے مضمون جنوری ۲۰۱۶ء پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا تھا کہ یحییٰ نعمانی صاحب جہاد کی علت قتال کو بتاتے ہیں جب کہ جہاد کی علت حجاز میں کفر اور حجاز کے باہر غلبہ کفر ہے اور اس کی کچھ دلیلیں بھی دی تھیں۔ لیکن موصوف

نے اپنی وضاحت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جبکہ اس کی تصدیق یا تردید انہیں کرنی چاہیے تھی۔ اس کے بجائے ضمنی باتوں پر بحث چھیڑ کر تضییعِ اوقات کر رہے ہیں۔

عصر حاضر اور جہاد کے عنوان کا تقاضا تھا کہ یہ بتایا جاتا کہ عصر حاضر میں تصور جہاد کی کہاں تک گنجائش ہے اور اس کا صحیح طریقہ کیا ہوسکتا ہے اور پھر بتایا جاتا کہ موجودہ جہادی تنظیموں کی کون کون سے غلطیاں ہیں؟؟

بہر صورت یحییٰ نعمانی صاحب نے موجودہ مضمون میں جن باتوں میں الجھانا چاہا ہے ان میں سے چند پر ہم کچھ گفتگو کریں گے۔ یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

> ''ہاں یہ بات صحیح اور ہر ایک کے لئے واضح ہے کہ اس دور میں جہادی کوششوں سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کے بجائے نہایت پیچیدہ اور مشکل ہو گئے ہیں''۔

مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کا جہاں تک معاملہ ہے تقریباً کم وبیش ڈیڑھ سو سال سے مسلمانوں کے مسائل حل ہونے کی بات اور تدبیریں ہو رہی ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ سوال شدت سے اٹھا کہ مسلمانوں کے لئے کیا راہ ہے؟ ایک طرف دیوبند کی تحریک شروع ہوئی اس تصور کے ساتھ کہ مسلمانوں کی نجات اور فلاح کی راہ یہ ہے کہ پورے ملک میں دینی مدارس کا جال بچھا دیا جائے۔ چنانچہ مدارس کا جال تحریک دیوبند کی بدولت پورے ملک میں بچھا دیا گیا اور دن بہ دن اس میں وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے لیکن کیا مسلمانوں کے مسائل حل ہو گئے اور دشواریاں ختم ہو گئیں؟ اس سوال کے جواب میں شروع ہی سے ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ مدارس سے نہ مسائل حل ہوئے ہیں اور نہ حل ہوں گے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر اس کا خیال ہے کہ مسائل پیدا ہونے اور مسلمانوں کی دشواریوں میں اضافہ اور مسلمانوں کی تنزلی، پسماندگی کی اصل وجہ یہ مدارس ہیں کہ مدارس نے زمانہ کی ایجادات اور ترقیوں سے نہ صرف یہ کہ روکا ہے بلکہ ان کو خلاف ایمان مسلمانوں کو باور کرایا ہے۔ یہ ذہن ایسا نہیں ہے کہ چند لوگوں کا ہو بلکہ ہر طبقہ میں یہ ذہن پایا جاتا ہے۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ دیکھ کر مدارس کو یکلخت بند کر دیا جائے اور اہل مدارس کو قصوروار ٹھہرایا جائے! اس موقع پر اس حالت کا تصور ذہن میں لایئے جبکہ مدارس نہ ہوتے تو مسلمانوں کا کیا ہوتا؟ ان کے دین وایمان کی کیا حالت ہوتی؟

دوسری طرف ۱۸۵۷ء کے بعد یہ ذہن پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اس میں مضمر ہے کہ مسلمان نئی تہذیب اور نظریات سے ہم آہنگی پیدا کریں اور نئی تعلیم کو اپنائیں۔ نئی تعلیم انگریزی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی میڈیم اسکول شروع کئے جائیں۔ چنانچہ سرسید مرحوم نے اس کا آغاز کیا اور اس کام میں ملت کے دولت مند، زمین دار، جاگیر دار، ترقی یافتہ اور دانشور لوگوں نے بڑھ چڑھ کر

حصہ لیا اور یہ سلسلہ بہت زور وشور سے آگے بڑھا پورے ملک میں بے شمار انگلش میڈیم اسکول قائم ہوئے اور سر سید مرحوم کے اسکول کے سلسلہ کی کڑی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہے۔ جو عرصہ دراز سے کام کر رہی ہے اور اس میں شک نہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نفع رسانی اور منفعت بخش ہونے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور ان گنت مجلّے اور کتابیں علی گڑھ کی تحریک پر شائع ہو چکے ہیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا پوری دنیا میں مسلمانوں کے ایک کامیاب ادارے کی حیثیت سے ایک اونچا مقام ہے لیکن کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے پورے مسائل حل ہو گئے اور مسلمانوں کی پسماندگی، جہالت، زبوں حالی اور غربت ختم ہو گئی؟

اس نقطۂ نظر سے اب جائزہ لیا جائے تو اس کا جواب نفی میں آئے گا۔ اس لئے کہ اس تحریک کے عام لوگوں کی نظر میں کامیاب ہونے کے باوجود سچر کمیٹی کے سروے کے مطابق مسلمان آج بھی سب سے زیادہ غریب، پسماندہ اور ناخواندہ قوم ہے۔ یہاں تک کہ دلتوں سے بھی پسماندہ ہیں۔ کیا اس صورتحال کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال سے اس تحریک نے مسلمانوں کو کچھ نہیں دیا۔ اس اعتبار سے یہ تحریک غلط تھی اور غلط ہے اور اس تحریک کے آغاز کرنے والے قوم کے مجرم ہیں اور یہ تحریک بے فیض تھی اس لئے کہ مسلمانوں کے مسائل اور مسلمانوں کی دشواریاں کم نہیں ہوئیں بلکہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔

اسی کے ساتھ یہ دیکھیے کہ مسلمانوں کے مصائب اور ان کے حل کرنے کی غرض سے تحریک پاکستان چلی یہاں تک کہ ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان ایک مسلم مملکت کے نام سے وجود میں آیا اور اس تحریک کی وجہ سے مسلمانوں کو بے شمار مصائب، تباہیوں، بربادیوں اور جانی اور مالی بڑی آفتوں سے گزرنا پڑا اور تقریباً پون صدی قیام پر گزر چکی ہے لیکن کیا مسلمانوں کے مسائل حل نہیں تو کم ہوئے ہیں؟ اور مسلمانوں کی جانی اور مالی بربادیوں میں کمی ہوئی ہے یا زیادتی؟

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا سوال ہے، ۱۹۴۷ء کی آزادی کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۰ء تک کوئی جہادی تحریک نہیں تھی لیکن ہزاروں خونریز فسادات ہوئے اور تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد مسلمانوں کی بربادیوں کی کہانی سننے اور دیکھنے میں آتی رہی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ بہرصورت تباہیاں اور بربادیاں مسائل اور دشواریاں ہمیشہ کی چیزیں ہیں۔ کسی ایک تنظیم، پارٹی اور تحریک کو اصل وجہ قرار دینا مشکل ہے، اور جہاں تک صحیح اور غلط ہونے کا سوال ہے اس کا معیار مسائل کے حل ہونے یا حل نہ ہونے کو نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ صحیح اور غلط ہونے کا معیار وہ میزان اور کسوٹی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن میں بتائی ہے۔ مثلاً تحریک دیوبند اور تحریک علی گڑھ کون صحیح راہ پر تھی اور کون غلط۔ اس کو قرآن کی بتائی ہوئی میزان پر پرکھنا ہوگا۔ لہٰذا یحییٰ نعمانی

صاحب کا دنیوی نفع اور نقصان کی بنیاد پر صحیح اور غلط کا فیصلہ کرنا اصولی حیثیت سے غلط اور نامناسب ہے۔ جہاں تک فائدے اور نقصان کا تعلق ہے ہر چیز میں کچھ فائدہ اور کچھ نقصان ہوتا ہے، اسی طرح ہر تحریک کے کچھ فائدے اور نقصان ہوتے ہیں لیکن اس فائدے اور نقصان کی بنیاد پر غلط اور صحیح کا فیصلہ کرنا ایک مسلمان کا کام نہیں ہے۔ چہ جائیکہ کوئی صاحب علم وتقویٰ شخص یہ کام کرے۔

بنیادی غلطی

یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں:

''جہاد کے جواز کے لئے حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کی توقع شرط ہے''۔

یہ شرط یحییٰ نعمانی صاحب کی اپنی خودساختہ شرط ہے اور ان کے اپنے گمراہ ذہن کی اُپج ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس کی کوئی دلیل نہ قرآن وسنت سے نہ فقہ سے پیش کی ہے۔

سورۃ الانفال، آیت نمبر ۶۰ سے ۶۵ تک دیکھ لیجئے، جہاد کے سلسلہ میں ابھارنے کا ذکر ہے اور جہاد کی تیاری کرنے کا حکم ہے لیکن حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج نکلنے کی شرط کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ اشارۃً جو مفہوم نکلتا ہے وہ یہی ہے کہ نتائج کی پرواہ نہ کرو، اللہ تمہارے لئے کافی ہے۔ اسی طرح سے سورۃ الصّف میں یہ کہا گیا:

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ. (الصّف:۴)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں بنیان مرصوص ہوکر کے لڑتے ہیں۔

البتہ خوشخبری جنت کی اور اچھے نتائج کی دی گئی ہے۔ قرآن میں حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کی شرط جہاد کے جواز کے لئے نہیں ملے گی۔ اور کہیں یہ نہیں ملے گا کہ اچھے نتائج کی توقع ہو تو جہاد کرو۔ اور توقع نہ ہو تو ہاتھ روکے رکھو بلکہ ہر جگہ یہی کہا گیا ہے کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے جنگ و جہاد کرو۔ اور دنیا اور آخرت میں کامیابی کے لئے حالات کی پرواہ کئے بغیر اللہ کے راستے میں جان و مال کے ذریعہ جہاد کرو۔

آیات جہاد ایک ایک کو دیکھ لیجئے کہیں بھی حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کو شرط نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ یہ کہا گیا کہ اچھے نتائج پیدا ہونے سے پہلے جو جہاد کرے گا اس کے برابر کوئی نہ ہوگا۔ ''لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ'' (الحدید:۱۰)

مطلب یہ ہے کہ جتنے زیادہ حالات ناسازگار ہوں گے، اتنا ہی مجاہدین کا درجہ بڑا ہوگا اور جہاد درحقیقت ناسازگار حالات میں یعنی جبکہ کفر کا رواج ہو اور کافروں کا اقتدار ہو انہی حالات میں جہاد جائز نہیں واجب ہوتا

ہے جواز کا کیا سوال؟ اور قرآن نے کہا کہ:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. (البقرۃ:۲۱۶)

ترجمہ: تمہیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے اور وہ تمھیں ناگوار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ تمہاری سمجھ سے حالات کی سازگاری اور ناسازگاری جہاد کے جواز یا وجوب کے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اللہ کا حکم ہر چیز پر بالا ہے۔ غرض حالات کی سازگاری اور اچھے نتائج کو شرط بنانا ایک بڑی گمراہی ہے۔ کم سے کم قرآن اور حدیث سے اس شرط کا ثبوت ملنا ناممکن ہے۔ فقہ میں جبکہ تمام فرائض و واجبات کی شرائط اور آداب مرتب شکل میں موجود ہیں وہاں بھی یہ شرط مفقود نظر آتی ہے۔

حالات کی ناسازگاری اس دور کی کوئی خصوصیت نہیں ہے تمام انبیاء علیہم السلام اور خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی میں دعوت و جہاد کے لئے حالات ناسازگار رہے۔ حالات کی ناسازگاری میں ہی بندے کا اصل امتحان ہوتا ہے اور اس کے لئے بلندی درجات کا موقع ہوتا ہے۔

یحییٰ نعمانی صاحب نے گویا یہ قسم کھا رکھی ہے کہ صحیح یا غلط جہاد سے بچنے کیلئے شرائط پیش کرتے رہیں گے۔ اس سے پہلے انہوں نے بڑے طنطنے کے ساتھ جہاد کیلئے امام کی شرط پیش کی تھی۔ لیکن جب ان کو بتایا گیا کہ امام کی شرط فرضیت جہاد کے لئے نہیں ہے تو انہوں نے ایک نئی شرط اپنی طرف سے ایجاد کر کے پیش کی ہے۔

یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

''جہادی اقدام سب سے زیادہ موقع محل اور حالات و استطاعت کا پابند ہے۔ قرآن نے صاف کہا تھا کہ جب تک اچھے نتائج کی قابل لحاظ امید نہ ہو اس وقت تک مظالم پر صبر کر کے ہاتھ روکے رکھنا اور اقامت صلوۃ ہی وقت کا جہاد ہے۔''

كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ.

مگر ہم نادان اپنے وقت کے جہاد کے بجائے دوسرے وقت کے عمل کو جہاد سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہی وہ غلطی ہے جس نے ان لوگوں کے جہاد کو الٹے نتائج پیدا کرنے والا بنا دیا ہے۔ کوئی یہ کہہ کر آنکھیں نہ موند لے کہ اوپر کی آیت میں مذکور یہ حکم تو مکی عہد کا ہے اس لیے کہ مکی عہد بھی کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی ''محکم شریعت'' ہے۔''

یحییٰ نعمانی صاحب کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ مکی دور مسلمانوں کی کمزوری اور مغلوبیت کا دور تھا اور اس کمزوری اور مغلوبیت کے دور میں ''کُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' کے مطابق عمل کریں اور جہاد کی بات نہ کریں اور مزید کہا کہ مکی شریعت کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی محکم شریعت ہے ان جملوں پر غور کیا جائے تو ایک بہت بڑے فتنہ کی بات سامنے آئے گی۔

غالباً محکم شریعت کا لفظ لکھتے وقت یحییٰ نعمانی صاحب کو اس کی نزاکت کا خیال نہیں رہا۔ یعنی کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی محکم شریعت وہ شریعت ہے جو مکہ کی ہے۔ اس طرح بات یوں بنتی ہے کہ چونکہ ہم کمزوری اور مغلوبیت کے دور میں ہیں اس لئے کمزوری اور مغلوبیت کے دور یعنی مکی عہد کی شریعت کو اپنانا چاہئے اور مکی شریعت محکم ہے۔ محکم شریعت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ محکم شریعت وہ ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ اب دیکھئے جہاد ہی نہیں اکثر و بیشتر احکام مدنی دور میں آئے ہیں۔ یعنی مکہ کی ''محکم شریعت'' میں وہ احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح جب آپ آگے بڑھیں گے تو اکثر و بیشتر احکام کو چھوڑنا پڑے گا۔ مثلاً آپ کو تیمم کے حکم کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ اس لئے کہ مکی شریعت میں تیمم کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح کمزوری اور مغلوبیت کے دور یعنی مکی دور میں شراب حرام نہیں تھی۔ مکی دور میں جمعہ کی نماز نہیں تھی۔ مکی دور کے بیشتر حصے میں صرف دو رکعت کی نماز تھی اور پانچ وقت کی نماز ہجرت سے ڈیڑھ سال پہلے فرض ہوئی پھر دیکھئے مکی دور کی شریعت میں قبلہ بیت المقدس تھا کعبۃ اللہ کا ذکر مکی شریعت میں نہیں تھا۔ پھر مکی شریعت میں نماز میں سلام کلام جائز تھا یہاں تک کہ سلام کلام کے جواز کا تذکرہ مدنی دور میں بھی آتا ہے۔ اسی طرح بیشتر سماجی، معاشرتی، عائلی، تجارتی، بیع و شراء، سیاسی اور بین الاقوامی جیسے مسائل سے متعلق احکام مکی شریعت میں نہیں آئے تھے۔ اسی طرح روزہ، زکوۃ، حج سے متعلق احکام مکی شریعت میں نہیں آئے تھے۔ یحییٰ صاحب کہہ سکتے ہیں کہ نہیں نہیں ہم صرف جہاد کی بات کرتے ہیں تو ان کی بات کیوں کر تسلیم کی جائے گی؟!

یحییٰ صاحب کے بقول......

''جبکہ کمزوری اور مغلوبیت کے دور کی شریعت مکی دور کی شریعت ہے اور وہ محکم شریعت ہے۔''

کسی کو کیا اختیار ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ صحیح بات یہ ہے کہ احکام شریعت میں مکی اور مدنی دور کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی بلکہ امور اور مسائل میں اصل یہ ہے کہ جو حکم آخر میں آتا ہے اس کو لیا جاتا ہے اور اس کا اعتبار ہوتا ہے۔ مثلاً حرمت خمر کا حکم ایک تو مکہ میں نہیں آیا تھا اور دوسرے مدینہ میں حکم آیا تو بتدریج آیا کوئی نومسلم یہ نہیں کہہ سکتا کہ مکہ کے لوگ ایمان لانے کے بعد تیرہ سال تک شراب پیتے رہے۔ میں بھی ایمان قبول

کرنے کے تیرہ سال بعد تک شراب پیتا رہوں گا۔اسی طرح ایمان لانے کے بعد کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شراب کی حرمت بتدریج آئی ہے، میں شراب پینا بتدریج چھوڑوں گا۔ اس لئے کہ وقت اور زمانہ کی قید کے بغیر جب حرمت کا حکم آ گیا تو اس حرمت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔اسی طرح کسی ملک کے مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ جہاد کا حکم آغاز وحی کے پندرہ سال بعد آیا ہے اس لئے ہماری مملکت پر پندرہ سال گزر جائیں گے تو ہم جہاد کی طرف متوجہ ہوں گے۔

غرض یہ کہ اعتبار حکم آنے کا ہے، جب حکم آ گیا تو وہ حکم لاگو ہو جائے گا۔ ہر حکم کے لاگو ہونے کی شرائط اور آداب الگ الگ ہیں۔یحییٰ نعمانی صاحب لکھتے ہیں ''قرآن نے حکم دیا تھا کہ جنگی پوزیشن کا خیال رکھا جائے گا''۔

پھر آگے موصوف نے سورۃ الانفال کی ۶۵ اور ۶۶ آیات درج کی ہیں اور اس کے بعد بتایا ہے کہ آج مسلمان اور غیروں میں تعداد کے علاوہ ٹیکنالوجی کی شکل میں جو طاقت سامنے آئی ہے اس کی وجہ سے فرق بہت زیادہ ہو گیا ہے، نیز ظاہر ہے ایمانی قوت کا جہاں تک حال ہے آج کے فسق وفجور اور بے ایمانی ونفاق کے دور میں عہد صحابہ سے اچھے حال کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

آگے یحییٰ نعمانی صاحب کہتے ہیں:

> ''اس زمانہ میں مسلمانوں کا اور جن کے خلاف یہ مجاہدین جنگ کر رہے ہیں فرق بلا مبالغہ ایک اور سینکڑوں کا ہے۔اس کو نظر انداز کرنا قرآنی ہدایت کی خلاف ورزی ہے جو چاہے اچھے جذبے ہی سے ہو''

اوپر نعمانی صاحب کے آخری دو جملے ہم نے نقل کئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمانی صاحب نے سورہ انفال کی ۶۵ اور ۶۶ آیتوں کو بالکل سمجھا ہی نہیں۔ نیز یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر رازی جیسی عربی تفاسیر تک ان کی رسائی نہیں ہوئی ہے اور اردو کی تفسیروں پر بھی ان کی نظر بالکل نہیں ہے اس سلسلہ میں ہم آگے اردو کی دو تفسیروں کا حوالہ پیش کریں گے۔

سورۃ الانفال کی ان دو آیتوں میں کیا کہا گیا ہے یہ ایک سوال ہے؟ اس کو عام طور سے لوگ ایک اطلاع وخبر یا زیادہ سے زیادہ ایک پیشین گوئی سمجھتے ہیں۔تفسیر رازی وغیرہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ کلام کا انداز اور صیغہ ضرور خبر کا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے امر ہے اور بعض دوسری جگہوں پر بھی صیغہ خبر کا ہے لیکن معنی امر کا مقصود ہے۔ مثلاً سورۃ الصّف میں ''تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ'' اگرچہ صیغہ خبر کا ہے لیکن معنی کے لحاظ سے امر ہے۔

اس لئے آگے امر کے جواب میں مضارع مجزوم ''يَغْفِرْ لَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ'' آیا ہے۔

بہر صورت اگر یحییٰ نعمانی صاحب کی بات مانی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ بیشتر اسلامی غزوات میں قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ غزوۂ بدر میں جنگی پوزیشن کا خیال نہیں کیا گیا اور "فَاِنۡ يَّكُنۡ مِّنۡكُمۡ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغۡلِبُوۡا مِائَتَيۡنِ" (سورۃ الانفال:٦٦) کا لحاظ نہیں کیا گیا اور اپنے سے تین گنا طاقت سے مسلمان ٹکرا گئے۔ اسی طرح غزوۂ احد میں چار گنا طاقت سے مسلمان ٹکرائے۔ پھر غزوۂ موتہ میں تقریباً ستر گنا سے بھڑ گئے جو یحییٰ نعمانی صاحب کے نظریہ کے مطابق نعوذ باللہ قرآنی ہدایت کی خلاف ورزی ہے۔ اسی طرح بہت سے غزوات میں دوگنا قوت سے بڑھ کر متصادم ہوئے۔ تعجب ہے کہ نعمانی صاحب کو غزوات کی کیفیت نے بھی یہ لکھنے سے نہیں روکا اور لکھ دیا کہ فرق کو نظر انداز کرنا قرآنی ہدایات کی خلاف ورزی ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ سورۂ انفال کی آیات میں جو حکم دیا گیا وہ یہ ہے کہ دس گنا طاقت سے لڑنا تم پر فرض ہے۔ پھر بعد والی آیت میں یہ کہا گیا کہ وہ پہلا حکم اٹھالیا گیا دوگنا طاقت سے لڑنا فرض ہے۔ یعنی ٹکرانے کی آخری حد بتائی گئی ہے جس کے مقابلے سے بھاگنا حرام ہے۔ رہا یہ کہ تین گنا، چار گنا، دس گنا اور ستر گنا اور سو گنا سے بھڑ جانے کا کیا حکم ہے، اس کی کوئی حد نہیں بتائی گئی ہے۔ صرف ترغیب دلائی گئی اور ابھارا گیا ہے، ہم اپنی اس بات کے لئے اردو کی تفسیروں کے دو حوالے پیش کرتے ہیں:

> ''بناء علیہ'' خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مومنین کو اپنے سے دس گنا دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہئے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھائیں۔''
>
> ''۲۰ اور ۱۰۰ دو عدد شاید اس لئے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ اس لئے سریہ کم از کم سَو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں بیان نسبت کے وقت اعداد کا تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی۔
>
> بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ گذشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری "اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ" یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا۔ اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے۔''
>
> حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنا کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرتؐ کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ غزوۂ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد للہ بھری پڑی ہے۔'' (تفسیر عثمانی)

حضرت شاہ عبد القادرؒ لکھتے ہیں:

''لیکن اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے وقت میں ہزار مسلمان اسّی ہزار سے لڑے ہیں۔'' (موضح القرآن)

یحییٰ نعمانی صاحب اپنی باتوں کی دلیل میں غزوۂ خندق کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اس سلسلہ میں خود رسول ﷺ کا اسوہ موجودہ دور کے جہادی نظریات کے عین خلاف ہے۔ اس طرز عمل کا ایک موقع غزوۂ خندق کا ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ کے پاس خبر آئی ہے کہ مدینہ پر مشرکین کا حملہ ہونے والا ہے ان کے لشکر کی تعداد دس ہزار ہے۔ ادھر جانثار مخلص صحابہ کی تعداد تین ہزار سے متجاوز ہے۔ طاقت کے اس فرق کی وجہ سے آپ ﷺ نے جنگ سے پہلوتہی فرمائی اور مقابلہ کے بجائے خندق کھود کر محصور ہو کر بیٹھ رہنے کو ترجیح دی۔''

پھر آگے لکھتے ہیں:

''آپ ﷺ اس پر بھی تیار تھے کہ اس خطرے کو ٹالنے کے لئے مشرکین کے بعض گروہوں کو مدینہ کی آدھی پیداوار ہر سال دینے کا معاہدہ کر لیا جائے۔''

❁ پہلی بات تو یہ ہے کہ (باب غزوۃ الخندق بخاری) کے حوالہ سے یحییٰ نعمانی صاحب نے جس بات کو خاص طور سے پیش کیا ہے مدینہ کی آدھی پیداوار ہر سال بعض گروہوں کو دے کر معاہدہ کر لیا جائے اولاً تو بخاری میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ طاقت کے اس فرق کی وجہ سے آپ نے جنگ سے پہلوتہی فرمائی اور مقابلہ کے بجائے خندق کھود کر محصور ہو کر بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ اس جملہ میں دو باتیں کہی گئی ہیں اور دونوں غلط ہیں۔ جنگ سے پہلوتہی اس کو کیسے کہا جا سکتا ہے؟ خندق کا کھودنا جنگ سے پہلوتہی ہے یا جنگ کی نئی تکنیک ہے۔ دوسری بات محصور ہو کر بیٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ بیٹھے رہنے کی بات سے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ گویا مسلمان مایوس ہو کر یا سہم کر بیٹھ گئے تھے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ خندق کے پاس مسلمان مسلسل تعینات رہے۔ ایسے نازک حالات میں کسی گروہ کے متعلق عقلاً یہ نہیں سمجھا جا سکتا کہ وہ بیٹھے رہیں گے چہ جائیکہ مسلمان۔ مسلمان خاموش بیٹھے نہیں رہے اس کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ کئی صحابہ اور خود نبی ﷺ کی کئی نمازیں قضا ہو گئیں۔ یعنی مسلمان ایک لمحہ کے لئے بھی خندق پر غافل نہیں رہے۔ مستعدی اس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی کہ نماز کے وقت کی بھی انہوں نے پرواہ نہیں کی۔

❁ دوسرا ثبوت یہ ہے کہ ایک مشہور پہلوان کسی طرح سے خندق پار کر کے آ گیا جس سے حضرت علیؓ کی زبردست لڑائی ہوئی، آخر میں حضرت علیؓ نے اس کا کام تمام کیا۔

❁ تیسرا ثبوت یہ ہے کہ برابر دونوں طرف سے تیر اندازی ہوتی رہی جس میں چھ مسلمان شہید ہو گئے اور مشرکین کے تقریباً دس لوگ مارے گئے جس میں بعض تلوار سے بھی قتل کئے گئے۔

یہ تین باتیں اس بات پر دلیل ہیں کہ جنگ سے پہلوتہی کرنے کی بات اور مسلمانوں کے محصور ہو کر بیٹھے رہنے کی بات سراسر غلط ہے۔ رہی یہ بات کہ حضور ﷺ مشرکین کے بعض گروہوں کو آدھی پیداوار مدینہ کی ہر سال دے کر معاہدہ کرنے کے لئے تیار تھے ''ہر سال'' کے الفاظ یحییٰ نعمانی صاحب کے ہیں۔ فتح الباری اور سیرت کی دیگر کتابوں میں ''ہر سال'' کا لفظ نہیں ہے اور بخاری شریف میں اس بات کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جب حالات بہت نازک ہو گئے اور تقریباً ایک ماہ گزر گیا تو نبی ﷺ نے یہ جنگی حکمت عملی اپنائی کہ دشمن کے اندر پھوٹ ڈال دی جائے۔ ظاہر ہے اس سلسلہ میں کئی تجاویز آئی ہوں گی جس میں ایک بات یہ تھی کہ بنو غطفان کے قبیلہ کو لالچ دے کر پہلے یہاں سے ہٹایا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ مشرکین کے حملہ کی خبر کے ساتھ ہی مسلمانوں کی طرف سے مدینہ کی پیداوار مشرکین کو دے کر جنگ ٹال دیئے جانے کی کوشش کی گئی ہو اور اس موقع پر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اس بات کا تذکرہ انصار کے لوگوں سے کیا صرف اس لئے کہ انصار کا آپ ﷺ عندیہ معلوم کرنا چاہتے تھے اس سے پہلے بھی اہم اور نازک موقع پر خصوصی طور پر انصار کا آپ ﷺ نے عندیہ معلوم کیا، کسی اقدام سے پہلے۔ چنانچہ جب آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ اور حضرت سعد بن عبادہؓ سے اس تجویز کے بارے میں مشورہ کیا تو ان دونوں نے بیک زبان عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر آپ محض ہماری خاطر ایسا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ جب ہم لوگ اور یہ لوگ دونوں شرک و بت پرستی پر تھے تب تو یہ لوگ ایک دانے کی بھی طمع نہیں کر سکتے تھے تو بھلا اب جبکہ اللہ نے ہمیں ہدایت اسلام سے سرفراز فرمایا ہے اور آپ کے ذریعہ عزت بخشی ہے ہم انہیں اپنا مال دیں گے؟ واللہ ہم تو انہیں صرف اپنی تلواریں دیں گے۔ آپ ﷺ نے ان دونوں کی رائے کو درست قرار دیا۔

دشمن کے گروہوں میں پھوٹ ڈالنے کی حکمت عملی حضرت نعیم بن مسعودؓ کے ذریعہ کامیاب ہوئی، جنہوں نے بنو قریظہ اور قریش و غطفان کی صفوں میں پھوٹ ڈال دی جس سے ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔

چنانچہ مشرکین کی صفوں میں پھوٹ پڑ جانے اور بد دلی و پست ہمتی سرایت کر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر نصرت کی ہوائیں بھیج دیں اور فرشتے بھیج دیئے حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلامی تاریخ کی ایک فیصلہ کن جنگ تھی۔ ''احزاب'' میں جتنی بڑی طاقت کفار کو فراہم ہو گئی تھی اس سے بڑی طاقت فراہم کرنا عربوں کے بس کی بات نہ تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے احزاب کی واپسی کے بعد فرمایا:

الآن نغزوهم ولا يغزونا نحن نسير اليهم۔ (صحیح بخاری: ۵۹۰/۲)

ترجمہ: اب ہم ان پر چڑھائی کریں گے وہ ہم پر چڑھائی نہ کریں گے اب ہمارا لشکر ان کی طرف جائے گا۔

(۲۰۱۶ء)

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور تصورِ جہاد

جناب مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے مولانا یحییٰ نعمانی صاحب کی کتاب ''جہاد کیا ہے'' پر پیش لفظ تحریر فرمایا ہے جس میں جہاد کے تعلق سے ایسی بات لکھ دی ہے جس کو اصطلاحی لفظوں میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ جہاد اس دور میں یا تو منسوخ ہے یا پھر معطل۔ اس کے علاوہ بھی کئی باتیں غیر متوقع طریقہ پر خلاف حقیقت آ گئی ہیں۔ جس کے مقابلے میں حق اور حقیقت کو واضح کرنا ہم ایک دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ ذیل میں ان کی عبارت نقل کی جاتی ہے اس کے بعد ہم اپنا تبصرہ درج کریں گے۔

''فتح مکہ کی مہم کی اصل غرض:

> حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں ''جہاد'' ایک منفرد لفظ ہے جو فوج کشی کے لئے استعمال کیا گیا ہے، تاکہ مسلمان اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ یہ زر، زمین اور جاہ واقتدار کے حصول کی جنگ نہیں ہے، جو عام طور پر کی جاتی ہے، بلکہ یہ عدل وانصاف قائم کرنے اور ظلم وفساد کو دفع کرنے کے لئے کی جانے والی ایک منظم کوشش ہے، جس میں قتل وقتال کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔ خواہ مسلمان کو عدل فراہم کرنے کے لئے ایسی کارروائی کرنی پڑے، یا غیر مسلموں کو انصاف دلانے کے لئے۔ چنانچہ عہد نبویؐ میں جو سب سے بڑی مہم جوئی کی گئی وہ ہے فتح مکہ۔ یہ مہم اصل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانے کے لئے تھی۔ جس کے مقابلہ میں مکہ کے مشرکین اور بنو بکر کے لوگوں نے عہد شکنی اور زیادتی سے کام لیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے اہل مکہ سے ان کی دیت طلب فرمائی، لیکن جب وہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے اور معاہدہ کے ختم کر دینے کا اعلان کیا، تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر فوج کشی فرمائی، یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جہاد صرف مسلمانوں کو انصاف دلانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت کو انصاف دلانے کے لئے ہے۔''

جہاد بالسیف یا لفظِ قتال کو فوجی طاقت استعمال کرنے کا ہم معنی قرار دینا تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن مطلق لفظ ''جہاد'' کو فوج کشی کے ہم معنی قرار دینا کوئی اچھی تعبیر نہیں ہے۔ مولانا کی اوپر دی ہوئی عبارت میں فتح مکہ کی مہم کو اصل میں قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانے کے لئے کہنا ایک اہم اور واضح حقیقت سے رخ موڑنا اور اس کو نظر انداز کردینے کے مترادف ہے۔ فتح مکہ کی مہم اصل میں کیا تھی؟ وہ کس غرض کے لئے تھی؟ وہ غرض اس کام سے ظاہر ہے جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کیا، یعنی پہلا کام جو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے کیا وہ ہے بیت اللہ کی تطہیر۔

کعبہ کے اردگرد اور اس کے اندر ۳۶۰ بت تھے۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ان بتوں کو ایک لکڑی سے گرانا شروع کردیا، آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ان کو گراتے جاتے اور فرماتے: ''جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا'' حق آیا اور باطل مٹ گیا اور بے شک باطل مٹنے والا ہی تھا۔ باہر کے بتوں کو گرانے کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کعبہ کے اندر تشریف لے گئے اور اندر کے بتوں کو بھی آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نکال پھینکا اس کے بعد آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں پر نفل نماز ادا کی۔ یہ سب کام کرتے کرتے نماز ظہر کا وقت آ گیا تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ وہ کعبہ کی چھت پر اذان دیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی اس کے بعد نماز ظہر ادا کی گئی۔

اس موقع پر وہاں موجود لوگوں کے سامنے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے جو ایک مختصر خطبہ دیا اس سے بھی صاف طور سے سمجھا جاسکتا ہے کہ فتح مکہ کی مہم کی اصل غرض کیا تھی۔ اس مہم کے ایک ہزار ایک فائدے گنائے جاسکتے ہیں مگر اصل غرض مرکز توحید کو شرک کی آلائش سے پاک کرنا تھا۔

مہم کی اصل غرض قبیلۂ بنی خزاعہ کے مشرکین کو انصاف دلانا ہوتا تو ان کو انصاف دلانے کے بعد مکہ کو جیسا کہ وہ تھا اسی حالت پر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم چھوڑ کر چلے جاتے۔ کعبہ کی بتوں سے تطہیر اور مکہ سے مشرکین کو بالکل بے دخل کرنا اور مکہ پر پورا کنٹرول اور پھر اس کے ذریعہ پورے عرب کو اسلام کے زیر نگیں بنانا یہ کیونکر کیا جاتا۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل غرض اور مقصد کچھ اور تھا، اصل غرض مشرکین کو انصاف دلانا نہیں تھی۔

اپنے حلیف بنی خزاعہ کو فائدہ پہنچانا ایک ضمنی کام تھا۔ اس موقع پر یہ بھی ذہن میں تازہ رکھنا چاہئے کہ مکہ پر چڑھائی کرنے سے پہلے معاہدہ کی تجدید کے لئے ابوسفیان اہل مکہ کے نمائندے کی حیثیت سے مدینہ آئے تھے اور تجدید معاہدہ کے لئے پوری کوشش کی تھی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مل کر نئے سرے سے معاہدہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی کہ حالات سابقہ بدستور باقی رہیں۔ حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ کے مطابق اپنے طور پر یکطرفہ معاہدہ کی بحالی کا اعلان کردیا مگر رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاہدہ کو قبول نہ کیا

اور ابوسفیان کے اعلان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرا دیا۔ یہاں یہ ایک سوال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیوں کیا جبکہ ابوسفیان کی بات ماننے کی صورت میں بنوخزاعہ کو انصاف مل جاتا۔

مولانا لکھتے ہیں:

''دین میں مذہبی آزادی دینا: انصاف کا تعلق انسان کی جان سے بھی ہے، مال سے بھی اور عقیدہ وضمیر کی آزادی سے بھی، اسلام نے جیسے ہر شخص کے لئے جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا حق تسلیم کیا ہے، اسی طرح مذہبی آزادی بھی سبھوں کو عطا کی ہے، قرآن مجید نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اہل مکہ کو کہلایا: "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" (الکافرون:۶) اور جیسا کہ قرآن نے اعلان کیا ہے: "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ" (البقرۃ:۲۵۶) اسی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مشرکین اور اہل کتاب قبائل سے معاہدۂ امن کئے ہیں، ان مشرکین سے جہاد کا حکم دیا گیا جو "صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ" کا ارتکاب کر رہے تھے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر قرآن بھی شاہد ہے، حدیث بھی اور سیرت کے واقعات بھی۔''

اوپر ہم نے ابھی مولانا کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں مولانا نے دو آیات قرآنی پیش فرمائی ہیں جو بالکل بے محل ہیں۔ پہلی آیت "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" اسلام کی دی ہوئی آزادی کے ثبوت میں پیش فرمائی ہے جبکہ اس آیت میں مشرکین سے اعلان براءت اور اظہار بیزاری کیا گیا ہے۔ رواداری، قومی یکجہتی، سیکولرزم اور وحدت ادیان کی بات نہیں کی گئی ہے۔ سورۃ الکافرون ہجرت کے کچھ قبل نازل ہوئی ہے۔ کفار کی تمام مصالحتی تجاویز کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ٹھکرا دیا اور اس کے بعد براءت اور وارننگ کے طور پر کہا گیا "لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ" یہ بیزاری اور بے تعلقی کا اظہار حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دوسرے انبیاء کرام کی سنت رہی ہے اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ تم اپنی جگہ خوش رہو، ہم اپنی جگہ خوش رہیں۔ اس کے ہم معنی سورۂ یونس کی آیت:۴۱ ہے:

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (یونس:۴۱)

ترجمہ: اور اگر یہ تجھے جھٹلاتے ہیں تو کہہ دے کہ میرا عمل میرے لئے ہے تمہارا عمل تمہارے لئے، جو کچھ میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری سے تم بری ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں۔

دوسری آیت "لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ" ہے۔ اس کا منشا اور مطلب کیا ہے؟ گہرائی میں جا کر سوچنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ شریعت میں "اِكْرَاهَ" تو صاف طور سے نظر آتا ہے۔ بچہ دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو مارنے کا حکم ہے، کوئی شخص مسلسل ترک صلاۃ کرتا ہے تو اسلامی قانون میں اس کی سزا کم از کم قید کی

ہے جب تک کہ وہ نماز کی ادائیگی کے لئے تیار نہ ہو، شرابی کی سزا ۸۰ کوڑے لگانا ہے۔ مرتد کی سزا قتل ہے۔ اس کے علاوہ تمام حدود وتعزیرات آخر کیا ہیں؟ فتح مکہ کے بعد متعدد افراد کو قتل کیا گیا پھر شریعت میں قتال کو فرض قرار دیا گیا۔ یہاں یہ کہنا کہ "لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" کی وجہ سے کئی قوموں سے معاہدہ کیا گیا کوئی معقول بات نہیں ہے۔ معاہدہ کرنا کوئی فرض نہیں ہے۔ معاہدہ کی بنیاد دین وملت کی مصلحتیں ہیں۔ مصلحت کا تقاضا ہوتو معاہدہ ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ الغرض ان آیتوں سے مذہبی آزادی کے ثبوت میں استدلال کرنا محل نظر ہے۔ پھر بھی جہاد "صَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ" کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ بحوالہ آیت قتال۔

مولانا لکھتے ہیں:

"غرض کہ اسلام کی نظر میں اصل امن وصلح ہے۔ قتال اس وقت ہے جب وہ امن وامان کو قائم رکھنے اور ظلم وفساد کو روکنے کے لئے مجبوری بن جائے محض کفر کی بناء پر دنیا میں نہ صرف جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ عذاب الٰہی بھی کسی کافر گروہ پر اسی وقت نازل ہوا جب وہ کفر کے علاوہ اللہ کے راستہ سے روکنے کے بھی مرتکب ہوئے مگر افسوس کہ موجودہ دور میں جہاد کے لفظ کو دہشت گردی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے اور اسے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔" (جہاد کیا ہے؟)

اسلام میں صلح کا مقام

مولانا کے جو الفاظ ابھی ہم نے نقل کئے ہیں ان میں مولانا نے ایک نہایت غلط بات کہی ہے کہ صلح اور قتال میں صلح اصل ہے اور قتال عارضی ہے حالانکہ قتال کے بارے میں آیا ہے "کتب علیکم القتال" جیسا کہ "كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" آیا ہے۔ گویا قتال ویسے ہی فرض ہے جیسے کہ صیام فرض ہے اور فقہ میں بھی قتال کو واجب بتایا گیا ہے اور قتال کے وجوب کو کسی شرط اور قید کے ساتھ مشروط اور مقید نہیں کیا گیا ہے اور صلح کو مشروط کیا گیا ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے: "وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا" صلح کے اس امر کو کسی نے بھی وجوب کے لئے نہیں مانا ہے بلکہ صلح کرنے کا حکم دین وملت کی مصلحت پر موقوف ہے چنانچہ فقہ میں ہے:

"وإذا رأى الامام أن يصالح أهل الحرب أو فريقاً منهم وكان في ذلك مصلحة للمسلمين فلا بأس به". (هدایه، جلد۲، کتاب السیر)

ترجمہ: اور جب امام مناسب سمجھے کہ اہل حرب یا ان میں سے کسی گروہ سے مصالحت کرے اور اس میں مسلمانوں کے لئے مصلحت ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اس میں "لَا بَأْسَ بِهِ" کے الفاظ سے زیادہ سے زیادہ اباحت اور جواز ثابت ہوتا ہے استحباب بھی ثابت نہیں ہوتا چہ جائیکہ وجوب۔

جہاد کے واجب ہونے کی صورت میں صلح کیونکر جائز ہے؟ صلح کو جائز ہی نہیں ہونا چاہیے تھا اس لئے صلح کے جائز ہونے کے لئے فقہاء کو یہ دلیل دینی پڑی کہ

"لأن الموادعة جهاد معنى إذا كان خير اللمسلمين" کیونکہ صلح حقیقت میں جہاد ہے جبکہ اس میں مسلمانوں کے لئے بھلائی ہو۔

منع صلح اصل ہے اس کو سمجھنے کے لئے فقہ کی ایک اور عبارت پر غور کرنا اچھا ہوگا۔

"اختلف العلماء هل يجوز الصلح على أكثر من عشر سنين حجة المانعين إن منع الصلح هو الأصل بدليل أية القتال وقد ورد التحديد بالعشر فحصلت الإباحة بهذا القدر فبقي الباقي على الاصل". (حاشیہ ہدایہ جلد۲، کتاب السیر)

اس عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ متعینہ مدت زیادہ سے زیادہ دس سال کے لئے صلح کرنا ثابت ہے، لیکن کیا دس سال سے زیادہ مدت کے لئے صلح کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے تو جو لوگ کہتے ہیں کہ دس سال سے زیادہ کے لئے صلح نہیں ہوسکتی وہ کہتے ہیں کہ عدم صلح اصل ہے، آیت قتال کی دلیل پر مگر دس سال کی مدت کے لئے صلح کا جائز ہونا ثابت ہے اور اس سے زیادہ نہیں ہے تو بقیہ اپنی اصل پر باقی رہے گا یعنی دس سے زیادہ والی بات اپنی اصل پر باقی رہے گی یعنی صلح جائز نہ ہوگی۔

قرآن کی ایک آیت دیکھیے:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ. (سورۂ محمد:۳۵)

ترجمہ: توتم کمزور نہ پڑو اور صلح کی دعوت نہ دو تم ہی غالب رہو گے اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال کو ضائع نہیں کرے گا۔

اس آیت میں صریح طور پر صلح کی دعوت دینے سے منع کیا گیا ہے لیکن مخالفین اگر دعوت صلح دیں تو اس دعوت کو قبول کرنے کی محض اجازت ہے۔

بہرصورت اس موضوع کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالنے سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ صلح کی دین میں اجازت ہے صلح کو کسی طرح اصل نہیں قرار دیا جاسکتا کہ سورۂ محمد کی آیت میں "تَدْعُوْ" کو "فَلَا تَهِنُوْا" پر عطف کیا گیا۔ لفظ "لَا" کو دوبارہ نہیں لایا گیا ہے اس اسلوب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "وَهْنٌ" کمزوری اور دعوت صلح دونوں کا منبع ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے منافقانہ ذہنیت۔ اس آیت میں یہی کہا جارہا ہے کہ تم بزدل بن کر صلح

اور سمجھوتہ کے داعی نہ بنو، بلکہ عزم و ایمان کے ساتھ جہاد کے لئے اٹھو، اللہ تمہارے ساتھ ہے تم غالب رہو گے تمہارے دشمن ذلیل وخوار ہوں گے۔

محض کفر کی بنا پر حکم جہاد

اوپر درج کی ہوئی مولانا کی عبارت میں دوسری غلط اور خلاف واقعہ بات یہ کہی گئی ہے کہ محض کفر کی بنا پر جہاد کا حکم نہیں دیا گیا۔ لیکن یہ بات صریح حدیث کے خلاف ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

أُمِرتُ ان أُقاتل الناس حتی یشھدوا أن لا إله إلا اللّٰه وأن محمدا رسول اللّٰه۔

اس حدیث سے صراحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی محض شہادت نہ دینے کی بنا پر دیا گیا تھا۔ اس میں ایچ پیچ نہیں ہے، نہ اس حدیث کے بارے میں کسی محدث یا کسی شارح حدیث نے کسی شک وشبہ کا اظہار کیا ہے البتہ اس حدیث کو اس زمانہ میں بعض لوگ آیت "یُعْطُوا الْجِزْیَةَ" کے معارض بتا رہے ہیں۔ یعنی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کرنے کی علت لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت نہ دینا یعنی کفر ہے۔ جنگ اسی وقت ختم ہوگی جب لوگ کلمہ پڑھ لیں اور اس کے برخلاف آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ اس وقت ختم ہو جائے گی جب لوگ جزیہ دینے کے لئے تیار ہو جائیں چاہے ان کا کفر باقی رہے۔ اس تعارض کو دور کرنے کے لئے بعض شارحین نے کئی تاویلیں کی ہیں مگر تعارض یوں ختم ہو جاتا ہے کہ جزیہ کی گنجائش اہل کتاب اور عجم کے مشرکین کے لئے ہے اس مسئلہ میں فقہاء میں کچھ اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ مشرکین عرب کے لئے جزیہ کی گنجائش نہیں ہے۔ (روح المعانی ۱۴/۵۹)

چنانچہ فتح مکہ کے وقت مشرکین مکہ کو جزیہ کا چانس نہیں دیا گیا۔ یہ بات صرف حدیث ہی سے نہیں قرآن سے بھی ثابت ہے۔ اس کے لئے سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۱۶ دیکھیے، چنانچہ صاحب تدبر قرآن نے اس پر سرخی جمائی ہے "مشرکین کیلئے دو ہی راہیں یعنی اسلام یا تلوار"۔ بعض حدیثوں میں جزیرۃ العرب سے یہود و نصاریٰ کو نکال دینے کی بات کی گئی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے۔

اوپر پیش کی ہوئی حدیث میں جس قتال کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف جزیرۃ العرب کے مشرکین سے ہے۔ اگر یہ بات ذہن میں رہے کہ عرب کی زمین پر کفر کا وجود برداشت نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لئے صرف اسلام یا تلوار ہے اور غیر عرب کے لئے اسلام، جزیہ اور تلوار کا چانس ہے تو کئی مسائل میں الجھنیں ختم ہو جائیں گی اور اگر یہ چیز ذہن میں صاف نہ ہو تو ذہنی الجھاؤ باقی رہے گا اور حدیث اور قرآن میں ٹکراؤ نظر آئے گا۔

توضع الجزیة علی اھل الکتاب والمجوس وعبدة الاوثان من العجم ولا

توضع علی عبدۃ الاوثان من العرب (قدوری، کذافی الھدایہ)

واضح رہے کہ عجم کے بت پرستوں سے بھی امام شافعیؒ کے نزدیک جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

مولانا رحمانی صاحب لکھتے ہیں:

''مگر افسوس ہے کہ اس دور میں جہاد کے لفظ کو دہشت گردی کے ہم معنی سمجھ لیا گیا ہے، اسے اسلام کو بدنام اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ کچھ غلط فہمی اس لئے بھی پیدا ہوتی ہے کہ فقہاء نے اپنے اجتہاد سے جو احکام بیان کئے ہیں، وہ زیادہ تر اس عہد کے حالات پر مبنی ہیں، جس دور میں ہماری فقہی کتابیں مرتب کی گئیں، اس دور میں کوئی ایسا عالمی ادارہ نہیں تھا جو تمام ملکوں کو کسی معاہدہ کا حصہ بناتا اور سبھوں سے اس بات کی ضمانت لیتا کہ وہ ایک دوسرے کی سرحدوں میں مداخلت نہیں کریں گے اور ہر ملک دوسرے ملک کے اقتدار اعلیٰ کا احترام کرے گا، اس لئے اس وقت ہر ملک ایک طرح سے جنگ کی حالت میں ہوتا تھا اور اس کے پڑوسی کبھی بھی اس پر یلغار کر سکتے تھے، انسانی حقوق اور جنگی قیدیوں سے متعلق نہ کوئی قانون تھا اور نہ کوئی معاہدہ، ان ہی حالات کے پس منظر میں فقہاء نے فتاویٰ دیئے جو یقیناً اس وقت کے لئے مناسب تھے۔ آج کی دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے، اگر چیکہ بڑی طاقتیں بہت سی دفعہ عالمی قوانین کا پاس ولحاظ نہیں رکھتیں، لیکن بہر حال ان کی ایک اہمیت محسوس کی جاتی ہے، یہاں تک کہ اکثر اوقات دنیا کی بڑی طاقتوں کو بھی اقوام متحدہ سے اپنے اقدامات کی حمایت حاصل کرنی پڑتی ہے، اس لئے آج قریب قریب تمام ہی غیر مسلم ممالک اور ان کے شہری عالم اسلام کے لئے معاہدین کا درجہ رکھتے ہیں نہ کہ حربیوں کا، اور حربی اور معاہد کے احکام ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہیں، یہاں تک کہ اگر غیر مسلموں کے کسی گروہ کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو اور اس ملک میں اندرونی طور پر مسلمانوں کے ساتھ زیادتی کی جائے تب بھی قرآن مجید کہتا ہے کہ ہمیں اپنے معاہدہ پر قائم رہنا چاہیے۔'' (التوبہ: ۴)

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے، سوچئے فقہاء نے جو احکام بیان کئے ہیں ان میں کتنے فیصلے احکام منصوص ہیں اور کتنے فیصد اجتہادی ہیں اور جو احکام ہیں کیا یہ صحیح ہے کہ اس عہد کے زیادہ تر حالات پر مبنی ہیں جس عہد میں فقہی کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ یہ دعویٰ ایسا دعویٰ ہے جو مولانا خالد صاحب رحمانی کو زیب نہیں دیتا، یہ فقہاء پر ایک الزام ہے۔ یہ دعویٰ پورے فقہی ذخیرہ کو بے اعتبار بنادینے والا ہے، پوری عمارت کو ڈھادینے والا ہے۔ فتاویٰ پر حالات کا اثر پڑتا ہے لیکن یہ کہنا کہ زیادہ تر حالات پر مبنی ہوتے ہیں بالکل غلط ہے۔ اسلامی قانون زیادہ تر کتاب وسنت اور آثار صحابہ سے ماخوذ اصولوں پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی فقہ اکیڈمی ہر کام سے پہلے فقہ کو ماضی کے وقتی اور زمانی اثرات سے بچانے کے لئے قرآن وسنت پر مبنی فقہی چیزوں کو الگ اور ممتاز کرنے کی کوشش کرے۔

یہ کہنا کہ جس دور میں فقہی کتابیں مرتب کی گئیں اس دور میں انسانی حقوق اور جنگی قیدیوں کے تعلق سے کوئی قانون اور معاہدہ نہیں تھا اور نراج کا دور تھا، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے کہ چوتھی اور پانچویں صدی میں آمدورفت کے نہ کوئی ذرائع تھے اور نہ ہی ٹرانسپورٹ کا کوئی سسٹم تھا۔ حالانکہ انسان ایک متمدن حیوان ہے انسانی تمدن ہمیشہ پایا گیا ہے۔ انسانی تمدن کی بنیادی چیزیں ہر دور میں پائی گئیں ہیں البتہ نوعیت اور معیار میں فرق رہا ہے۔ آج کوئی کام ہوائی جہاز اور موٹر سے لیا جاتا ہے وہی کام پہلے اونٹ، گھوڑا اور بیل سے لیا جاتا تھا۔ آج جو کام کاغذ سے لیا جاتا ہے کبھی پتھر، ہڈی اور لکڑی سے لیا جاتا تھا اسی طرح زندگی کے تمام شعبے میں کام ہوتا تھا۔ انسان کے اندر دوستی اور دشمنی، صلح وجنگ پہلے دن سے ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح صلح صفائی کا رواج ہمیشہ سے رہا ہے اور ہر کام ہوتا رہا ہے۔ یہ نہیں تھا کہ کسی دور میں انسانی اقوام جنگل کے جانوروں کے مانند تھے۔ انسان اور جانور کی فطرت ہمیشہ الگ رہی ہے ہاں معیار بدلتا رہتا ہے اور ترقی ہوتی رہتی ہے۔ فقہی کتابوں کے دور کو سراسر نراجی دور بتانا مبالغہ آمیز جھوٹ کہا جاسکتا ہے۔ فقہاء کے فتاویٰ کو ایک خاص زمانہ کیلئے مناسب بتانا کم وبیش ویسے ہی ہے جیسے روشن خیال لوگ کہتے ہیں کہ زمانہ بہت ترقی کر گیا، اسلام اس زمانہ میں چلنے والا نہیں ہے۔

"آج دنیا عالمی سطح پر ایک معاہدہ کی ڈوری میں بندھی ہوئی ہے۔"

یہ واقعہ کی نہ درست ترجمانی ہے نہ حقیقت کی صحیح تعبیر ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ آج دنیا کے ہر ملک کو وقت کی جابر، ظالم اور استبدادی فرعونی طاقتوں نے ظلم کی ڈوری میں باندھ رکھا ہے بلکہ زیادہ صحیح ہے کہ اپنے آہنی پنجوں میں جکڑ رکھا ہے اور کمزور ممالک اور اقوام ان کا مشق ستم بنی ہوئی ہیں جب چاہا اور جس کو چاہا لڑا دیا اور جب چاہا صلح کرادی۔ بڑی پانچ طاقتوں کا راج نہ کوئی قاعدہ ہے اور نہ قانون۔ پوری دنیا ان کے مفاد کے تحت اٹھتی بیٹھتی ہے۔

غیر مسلم اقوام کو معاہدہ کے درجہ میں رکھ دیا ہے اور اس کے لئے کوئی وقت اور مدت کی تعیین بھی نہیں فرمائی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک محکم فریضہ کو یا تو منسوخ کر دیا، یا کم از کم معطل کر دیا۔ دوسرے لفظوں میں ایک معتبر فقیہ نے اس کام کی توثیق اور تجدید کی ہے جو انگریز بہادر کے دور میں قادیانیوں اور بہائیوں نے کیا تھا، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ کام برٹش حکومت کے لئے کیا گیا تھا اور آج یہ کام امریکہ اور اس کے حلیفوں کے حق میں بظاہر کیا گیا ہے، نیتوں کا حال اللہ جانتا ہے۔ ورنہ بتایا جائے کہ معاہدہ کس نے کیا اور کب کیا؟ کون دو فریق تھے؟ مسلمانوں کا نمائندہ اور ذمہ دار کون تھا اور غیر مسلم دنیا کا نمائندہ کون تھا؟ معاہدہ افراد نہیں کرتے معاہدہ نمائندہ اور ذمہ دار کرتا ہے حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ کا کہیں کوئی وجود نہیں ہے کم از کم ستر سال سے مسلمانوں کا کوئی

نمائندہ نہیں ہے۔ مسلمان کئی ملکوں میں محکومیت اور مغلوبیت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور پچاس سے زیادہ ممالک میں حکمراں کی حیثیت سے تھے لیکن وہ دوسری بڑی طاقتوں کے غلام تھے۔ انہوں نے کبھی اسلام اور مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کیا وہ نام کے حکمران تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک غلط بات کو ثابت کرنے کیلئے معاہدہ کا ڈھونگ رچایا گیا ہے اور ایک مفروضہ بنایا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی تشکیل کو ستر سال ہو رہے ہیں، دین کا ایک فریضہ ستر سال سے منسوخ یا معطل ہے۔ نہیں معلوم اقوام متحدہ کی کتنی عمر ہے۔ اگر اقوام متحدہ کی عمر آئندہ پانچ سو سال ہے تو آئندہ پانچ سو سال تک جہاد معطل رہے گا جبکہ فرضیت "کُتِبَ عَلَيۡكُمۡ" کے لفظ سے ثابت ہے۔

جہاد کی عظمت شان

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

الجهاد ماض مذ بعثني الله إلى أن يقاتل اٰخر أمتي الدجال، لا يبطله جور جائر ولا عدل عادل۔ (رواہ ابوداؤد، واحمد)

ترجمہ: جہاد جاری رہے گا میری بعثت سے لے کر یہاں تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے جنگ کرے گا، اس جہاد کو کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل منسوخ نہیں کر سکتا۔

راس الامر الاسلام وعموده الصلاة وذروة سنامه الجهاد

(رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ)

ترجمہ: سب سے بڑی چیز اسلام ہے اور اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔

لن يبرح هذا الدين قائما يقاتل عليه عصابة من المسلمين حتى تقوم الساعة (رواہ مسلم)

ترجمہ: یہ دین برابر قائم و باقی رہے گا، اس پر مسلمانوں میں سے ایک گروہ قیامت تک جنگ کرتا رہے گا۔

لا تزال طائفة من امتي يقاتلون على الحق ظاهرين على من ناواهم حتى يقاتل اٰخرهم المسيح الدجال (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: میری امت میں سے ایک جماعت حق پر برابر لڑتی رہے گی اس حال میں کہ وہ اپنے دشمنوں پر غلبہ پائے گی حتی کہ میری امت کا آخری شخص دجال سے جہاد کرے گا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے:

ومن مات ولم يغز ولم يحدث به نفسه مات على شعبة من نفاق۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: اور جو شخص مرا اس حال میں کہ غزوہ نہیں کیا اور نہ دل میں اس کو سوچا وہ نفاق پر مرا۔

عن ابن عمرؓ سمعت رسول اللہ ﷺ يقول إذا تبايعتم بالعينة وأخذتم أذناب البقر ورضيتم بالزرع وتركتم الجهاد سلط اللہ عليكم ذلالا ينزعه حتى ترجعوا إلى دينكم۔ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا میں نے نبی ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم جنس کے بازار میں آنے سے پہلے خرید وفروخت شروع کردو گے۔ اور گایوں کی دم پکڑ لوگے اور زراعت پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ دو گے تو اللہ تم پر ایک ایسی ذلت مسلط کر دے گا جس کو وہ نہیں ہٹائے گا اس وقت تک جب تک کہ تم دین کی طرف لوٹ نہ آؤ۔

قال ابن الهمام: ولا شک أن اجماع الامة أن الجهاد ماض إلى يوم القيمة لم ينسخ فلا يتصور نسخه بعد النبی ﷺ۔

ترجمہ: علامہ ابن ہمام نے فرمایا: بے شک امت کا اجماع ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا منسوخ نہ ہوگا، نبی ﷺ کے بعد اس کے منسوخ ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ونص الفقهاء أنه يجب على الامام أن يقوم بالغزوة كل عام۔

ترجمہ: اور فقہاء نے صراحت کی ہے کہ امام پر واجب ہے کہ ہر سال جنگ کرے۔

نص قطعی سے ثابت شدہ فریضہ پر چٹکی بجاتے ہوئے خط نسخ پھیرنا کتنی خطرناک بات ہے ہم کچھ زیادہ اس بارے میں نہیں کہنا چاہتے۔ اس سلسلہ کی آخری بات یہ ہے کہ بفرض محال معاہدہ ہو گیا تو کیا ستر برسوں میں معاہدہ کو توڑنے والی کوئی چیز نہیں ہوئی؟ صلح حدیبیہ کا معاہدہ متعینہ مدت دس سال کے لئے ہوا تھا۔ بغیر تعیین مدت کے آپ نے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ حدیبیہ کا معاہدہ کیسے ختم ہوا؟ دیکھئے ابھی دو سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ مشرکین کے ایک حلیف بنی بکر نے آپ ﷺ کے حلیف بنی خزاعہ کے کچھ آدمیوں کو مار دیا تھا، مارے جانے والے لوگ دس سے زیادہ نہیں تھے اس پر آپ نے معاہدہ ختم کر دیا اور باوجود مشرکین کے تجدید معاہدہ کی مساعی کے آپؐ نے معاہدہ کو باقی رکھنے کے بجائے مکہ پر دس ہزار لشکر کے ساتھ چڑھائی کر دی۔

اب دیکھئے آج جس معاہدہ کا ذکر چل رہا ہے اس پر ستر سال گزر چکے، اس طویل مدت میں کیا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو معاہدہ توڑ دے؟

صرف برصغیر ہند و پاک میں اس مدت میں لاکھوں مسلمانوں کی جانیں گئی ہیں۔ تقسیم کے وقت پنجاب اور نوا کھالی میں کیا کچھ ہوا اس کا اس وقت اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان میں لوگوں کے کہنے کے مطابق کم از کم دس ہزار فسادات پھر سقوط حیدر آباد کے موقع پر بڑی تعداد میں جانیں تلف ہوئیں۔ بابری

مسجد کی شہادت کے موقع پر بھی بڑے پیمانے پر پورے ملک میں جانی نقصان ہوا۔ ابھی چند سال پہلے گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ ان سب واقعات کے تناظر میں معاہدہ پر کیا حکم لگایا جائے گا؟

پاکستان جیسا کچھ بھی رہا ہے پھر بھی ایک مسلم ملک تھا۔ لیکن بے انتہا خون خرابہ کے بعد دو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا۔ کشمیر کا مسئلہ کیا ہے؟ کیا حق ہے اور کیا ناحق؟ اس سے ہم بحث نہیں کرتے، لیکن خون مسلم کی ارزانی برابر دیکھی جارہی ہے۔ افغانستان میں بارہ سال سے ناٹو نے جو طوفان بدتمیزی روا رکھا ہوا ہے اور جان ومال کی جو بربادی ہم اور آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے اس کا کوئی اندازہ ہے؟ کیا اس میں اقوام متحدہ شریک نہیں ہے؟

برصغیر کے علاوہ بوسنیا، چیچنیا، یوگوسلاویہ، کوسوو، اریٹریا، نائیجریا میں جو کچھ ہوا اس موقع پر معاہدہ کہاں گیا تھا؟ اور اقوام متحدہ کی وہ ڈوری کہاں گئی تھی جس ڈوری میں تمام دنیا کے ممالک بندھے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں عراق، لیبیا جو نام ہی کے صحیح مسلمان ملک تھے ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی اور جو جانیں گئیں اور جارہی ہیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ برما میں مسلمانوں پر جو گزری اس کا قصہ کوئی بہت پرانا نہیں ہے۔ اسی طرح افریقہ کے بعض ممالک میں مسلمانوں کی جو بربادی ہوئی ہے اس کو بھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ مصر جو عرب ممالک میں ایک نمایاں اہمیت کا حامل ملک ہے اس میں نہتے لوگوں پر بمباری کی گئی اور ہزاروں کا قتل عام کیا گیا۔ شام میں اب تک ڈیڑھ لاکھ مسلمان ختم ہو چکے ہیں۔ اس طرح ایک محتاط اندازہ کے مطابق کم از کم بیس لاکھ مسلمان پوری دنیا میں ختم کئے گئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ کس نے ختم کیا؟ کون قصوروار ہے؟ اور کون بے قصور ہے؟ مسلمان تو مرے ہیں۔ اندازہ لگایا جائے کہ کیا اس تناسب سے دوسری اقوام کی جانیں بھی گئی ہیں؟ سوال یہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں اقوام متحدہ کہاں تھی؟ اور جس معاہدہ کا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے ذکر کیا، کیا وہ ٹوٹا نہیں؟!

مسلمانوں کے ایک حلیف بنوخزاعہ پر بنی بکر نے زیادتی کی تو اللہ کے نبی ﷺ نے معاہدہ توڑ دیا۔ مگر مولانا رحمانی آج کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر زیادتی کی جائے تو قرآن کہتا ہے کہ معاہدہ کو باقی رکھنا چاہیے۔ قرآن نے یہ کہاں کہا ہے مولانا نے حوالہ دیا ہوتا تو اچھا تھا۔

(۲۰۱۸ء)

مولانا عنایت اللہ سبحانی کا نظریۂ جہاد

بیسویں اور اکیسوی صدی میں جہاد کا جتنا چرچا ہوا ہے اتنا چرچا تاریخ میں شاید کبھی نہیں ہوا تھا۔ افغانستان سے لے کر عراق اور شام تک غلط یا صحیح عملاً جہاد کا مظاہرہ ہوا ہے۔ بقیہ ساری دنیا میں تقریری اور تحریری تذکرہ ہوا ہے۔ جہاں زبانی اور تحریری جہاد کی تائید میں بولا اور لکھا گیا، وہیں جہاد کو کنڈم کرنے اور بے وزن کرنے کے سلسلہ میں بڑی کوششیں کی گئی ہیں، تاکہ مسلمانوں کے ذہن ودماغ سے جذبۂ جہاد اور شوق شہادت جو شعوری یا غیر شعوری طور سے موجود ہے ان کو نکالا جائے۔

اسی سلسلہ کی ایک تحریر مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب کی ہمارے سامنے ہے۔ تحریر دیکھنے کے بعد ہر کوئی اعتراف کرے گا کہ مولانا نے کافی محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے اور سب سے الگ نکتے اور پوائنٹ نکالے ہیں۔ لیکن اتنی لمبی تحریر کا آغاز جادۂ حق سے ہٹا ہوا ہے، اس لئے تقریباً چار سو صفحے کی کتاب (جہاد اور روح جہاد) بے مقصد اور لاحاصل ہو کر رہ گئی ہے۔ مثلاً ایک انوکھا نکتہ نکالتے ہوئے موصوف تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہاں بات ذہن میں رہے کہ اسلام کا جہاد کسی مذہب یا کسی دھرم کے خلاف نہیں ہوتا۔''
>
> ''یہ مسلح جہاد جاہلیت کے خلاف نہیں تھا بلکہ ظلم اور استبداد کے خلاف تھا۔''
>
> ''یہ ان ظالموں سے ان کے نبیوں نے ان کے ظلم وجارحیت کی بناء پر جنگ کی۔ ان کے کفر وشرک یا ان کے نظام جاہلیت کی بناء پر نہیں کی۔''

یہ نکتہ جتنا انوکھا ہے اتنا ہی بے وزن اور بودا ہے۔ یہ بات کہہ کر مولانا سبحانی نے جہاد کی پوری روح نکال دی ہے۔ انوکھا اس لئے ہے کہ یہ بات اسلام کی پوری تاریخ میں کسی مفسر، محدث اور فقیہ نے نہیں کی ہے۔ اگر کسی نے کہی ہوتی تو سبحانی صاحب اس کا حوالہ ضرور دیتے لیکن اس کی تائید میں کسی آیت، کسی حدیث اور سیرت کا کوئی واقعہ موصوف نے نہیں پیش کیا، چنانچہ تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل کتاب میں اس کی دلیل میں کوئی چیز ہمیں

نہیں ملی۔ اس طرح یہ پوری کتاب:

خشت اول چوں نہد معمار کج
تاثریا می رود دیوار کج

اس شعر کے مصداق نظر آتی ہے۔

کتاب کی طوالت کی وجہ بھی یہی ہے کہ جیسے جیسے کتاب کی دیوار بڑھتی گئی ویسے ویسے اس میں کجی اور ٹیڑھ سامنے آتی گئی اور پھر لازماً اس ٹیڑھ کو مولانا سیدھی کرنے کی فکر کرنے لگے۔

ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی یہ سوال کر سکتا ہے کہ مکہ فتح ہونے اور مشرکین قریش کے ظلم واستبداد اور طاقت ختم ہونے کے بعد کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بتوں کو توڑنے کی کیا ضرورت تھی؟

مقصد تو اسی وقت حاصل ہو گیا تھا جب اہل مکہ نے سپر ڈال دی تھی۔ آخر انتہائی ذلت آمیز طریقہ پر بتوں کو مسمار کیوں کیا گیا۔ سیرت میں آتا ہے:

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اٹھے اور آگے پیچھے اور گرد وپیش موجود انصار و مہاجرین کے جلو میں مسجد حرام کے اندر تشریف لائے۔ آگے بڑھ کر حجر اسود کو چوما اور اس کے بعد بیت اللہ کا طواف کیا۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ایک کمان تھی اور بیت اللہ کے گرد اور اس کی چھت پر تین سو ساٹھ بت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی کمان سے ان بتوں کو ٹھوکر مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

ترجمہ: حق آ گیا اور باطل چلا گیا یقیناً باطل جانے والی چیز ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ (السبا: ۴۹)

ترجمہ: حق آ گیا اور باطل کی چلت پھرت ختم ہو گئی۔

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹھوکر سے بُت چہروں کے بل گرتے جاتے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طواف اپنی اونٹنی پر بیٹھ کر فرمایا تھا اور حالت احرام میں نہ ہونے کی وجہ سے صرف طواف ہی پر اکتفاء کیا۔ تکمیل طواف کے بعد حضرت عثمان بن طلحہ کو بلا کر ان سے کعبہ کی کنجی لی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے خانہ کعبہ کھولا گیا۔ اندر داخل ہوئے تو تصویریں نظر آئیں جن میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تصویریں بھی تھیں، اور ان کے ہاتھ میں فال گیری کے تیر تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: اللہ ان مشرکین کو ہلاک کرے۔ خدا کی قسم ان دونوں پیغمبروں نے کبھی بھی فال کے تیر استعمال نہیں کئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے خانہ کعبہ کے اندر لکڑی کی بنی ہوئی ایک کبوتری بھی دیکھی اسے اپنے دست مبارک سے توڑ دیا اور تصویریں آپ ﷺ کے حکم سے مٹادی گئیں۔'' (الرحیق المختوم، صفحہ نمبر:۶۳۲)

اور سبحانی صاحب لکھتے ہیں:

''اللہ کے رسول ﷺ کو ہجرت مدینہ سے پہلے قیام مکہ کے دوران میں جہاد کرنے کا حکم ہوا، یہ جہاد مشرکین مکہ سے کرنا تھا اور قرآن پاک کے ذریعہ کرنا تھا۔ فرمایا:

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ○ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ○ (الفرقان:۵۲،۵۱)

ترجمہ: اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اٹھا کھڑا کرتے۔ پس اے نبیؐ! کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔

یہاں آیت میں جہاد کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس سے مراد ہے کفار و مشرکین کو قرآن پاک پر ایمان لانے کی دعوت دینا، اس کے نور سے ان کے دل و دماغ کو منور کرنا، اس کے موتیوں سے ان کی زندگیوں کو آراستہ کرنے کی کوشش کرنا، وہ جاہلیت اور کفر و شرک کی جن برائیوں اور جن گمراہیوں میں مبتلا ہیں، ان سے انہیں نکالنے کی انتھک جدوجہد کرنا۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ○ (العنکبوت:۶)

ترجمہ: دین کی راہ میں جو بھی جدوجہد کرے گا، وہ خود اپنے لئے کرے گا، اللہ تعالیٰ تمام انسانوں سے بے نیاز ہے۔'' (جہاد اور روح جہاد، صفحہ ۳۸)

یہاں سوال یہ ہے کہ سبحانی صاحب نے اپنی اس تحریر میں جس جہاد کا ذکر اہل مکہ کے ساتھ قرآن کے ذریعہ کیا ہے وہ کس کے خلاف تھا؟ کسی مذہب کے خلاف نہیں تھا؟ کفر و شرک کے خلاف نہیں تھا؟؟ سبحانی صاحب نے اپنے دعوے پر یہاں کوئی دلیل نہیں پیش کی ہے۔ سلف صالحین میں سے کسی کا قول بھی نہیں پیش کیا ہے۔ البتہ چند آیتیں ضرور نقل کی ہیں جو کسی طرح ان کی تائید میں نہیں ہیں اور نہ ہی انہوں نے بطور دلیل ان کو پیش کیا ہے۔ البتہ جو بھی ان آیتوں کو پڑھے گا وہ ضرور سوال کرے گا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کی زندگیوں میں اپنے مخاطبین کے ساتھ جس کشمکش اور تصادم کا تذکرہ ملتا ہے اور جو جدوجہد، جانفشانی انہوں نے کی وہ کیا ان کے کفر اور شرک کے خلاف نہیں تھی؟؟

کیا کسی بھی نبی نے اپنے مخاطبین اور مدعوئین کے مذہب اور دھرم کی تائید میں ایک لفظ بھی زبان سے نکالا

ہے اور کہا ہے کہ لوگو! ہم کو تمہارے مذہب اور دھرم سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ مثلاً دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام نے کیا دعوت دی۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ○ اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَاتَّقُوۡہُ وَاَطِیۡعُوۡنِ ○ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ وَیُؤَخِّرۡکُمۡ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ اِذَا جَآءَ لَا یُؤَخَّرُ لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○ (نوح:۲-۴)

ترجمہ: اس نے کہا: اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لئے ایک صاف صاف خبردار کردینے والا (پیغمبر) ہوں (تم کو آگاہ کرتا ہوں) کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، اللہ تمہارے گناہوں سے درگزر فرمائے گا اور تمہیں ایک وقت مقرر تک باقی رکھے گا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت جب آجاتا ہے تو پھر ٹالا نہیں جاتا، کاش تمہیں اس کا علم ہو۔

تو اس کے جواب میں قوم نے باہم ایک دوسرے سے کہا......

وَقَالُوۡا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَکُمۡ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ○ وَّلَا یَغُوۡثَ وَیَعُوۡقَ وَنَسۡرًا ○ وَقَدۡ اَضَلُّوۡا کَثِیۡرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا ضَلٰلًا (نوح:۲۳-۲۴)

ترجمہ: انہوں نے کہا: ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو، اور نہ چھوڑو ود اور سواع کو اور نہ یغوث اور یعوق اور نسر کو انہوں نے بہت لوگوں کو گمراہ کیا ہے، اور تو بھی ان ظالموں کو گمراہی کے سوا کسی چیز میں ترقی نہ دے۔

اس سے تھوڑا آگے آتا ہے:

وَقَالَ نُوۡحٌ رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ دَیَّارًا ○ اِنَّکَ اِنۡ تَذَرۡهُمۡ یُضِلُّوۡا عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوۡۤا اِلَّا فَاجِرًا کَفَّارًا ○ (نوح:۲۶-۲۷)

ترجمہ: اور نوح نے کہا: ''میرے رب! ان کافروں میں سے کوئی زمین پر بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان کی نسل سے جو بھی پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہی ہوگا۔

حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے نبی کا تذکرہ ہے، ان کے درمیان اور مخاطبین کے درمیان جو مکالمہ بھی گزرا ہے کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ نبی اور مخاطبین کے درمیان جو نزاع تھی اس کی وجہ کفر و شرک اور توحید الٰہ کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں تھی۔ اسی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کو دیکھیے کیا اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح سے بھی اس کی گنجائش رہتی ہے کہ کہا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد اور ان کا جہاد کسی مذہب اور دھرم کے خلاف نہیں تھا۔

سورۃ الممتحنہ کی ذیل کی آیت پڑھیئے:

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِیۡۤ اِبۡرٰهِیۡمَ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرۡنَا بِكُمۡ وَبَدَا بَیۡنَنَا وَبَیۡنَكُمُ الۡعَدَاوَةُ وَالۡبَغۡضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ وَحۡدَهٗۤ. (الممتحنہ:۴)

ترجمہ: تم لوگوں کے لئے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ایک نمونہ ہے، اُنہوں نے اپنی قوم سے صاف کہہ دیا، ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم خدا کو چھوڑ کر پوجتے ہو قطعی بیزار ہیں، ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لئے عداوت ہوگئی اور بیر پڑ گیا جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

یہ آیت ایک صراحت ہے جس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جدوجہد خالصتاً توحید کی تائید میں اور کفر و شرک کے خلاف ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ ایک دوسری صراحت دیکھئے:

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حَتّٰى یُعۡطُوا الۡجِزۡیَةَ عَنۡ یَّدٍ وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ ۝ (التوبۃ:۲۹)

ترجمہ: جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روز آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

کیا اس طرح کی قرآنی آیات کے ہوتے ہوئے بھی یہ کہنے کی کوئی گنجائش ہے کہ جہاد کسی مذہب اور دھرم کے خلاف نہیں تھا اور شرک اور کفر کے خلاف نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کو یا یہ کہا جائے کہ اہل جہاد کو شرک اور کفر گوارا ہے اور شرک اور کفر کوئی نا قابل برداشت چیز نہیں ہے اور نہ قابل نفرت اور نہ کوئی ایسی چیز ہے جس کو وجہ دشمنی اور وجہ عداوت بنایا جائے، جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ کی بات سے ظاہر ہوتا ہے اس لحاظ سے سوچا جائے تو سبحانی صاحب کی بات نہایت ہی سنگین بات بن جاتی ہے اس لئے کہ تمام انبیاء علیہم السلام نے کفر اور شرک کو قابل نفرت چیز قرار دیا ہے اور کفر اور شرک سے بغض و عداوت کو جزو ایمان قرار دیا ہے اور قرآن نے کفر کے بطن سے نکلی ہوئی چیزوں کو گندگی اور اہل کفر کو ایسا نجس کہا ہے کہ مسجد حرام کے قریب بھی انہیں آنے کی اجازت نہیں دی۔ اور مسجد حرام ہی نہیں اللہ کے رسول ﷺ نے پورے جزیرۃ العرب سے انہیں نکالنے کا حکم فرمایا۔

تعجب ہے کہ کتاب وسنت کا علم رکھنے والا شخص ایسے شرک اور کفر کو لائق، گوارا اور قابل برداشت چیز کہہ رہا ہے۔ پھر دیکھئے پوری تاریخ میں کیا کوئی ظالم اور مستبد ایسا گزرا ہے جس کا کوئی مذہب اور دھرم نہیں رہا ہو نیز کوئی ظالم اور جابر ایسا پیدا ہوا ہے جس نے دعوت توحید کو گوارا کیا ہو اور اس کے خلاف نہ اٹھ کھڑا ہوا ہو؟ ہزاروں انبیاء علیہم السلام نے اپنی جدوجہد اور اپنا جہاد کیا ہمیشہ لامذہبوں کے خلاف کیا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جہاد ظلم اور استبداد کے خلاف ہوا ہے اور ہونا چاہئے جیسا کہ سورۂ حج آیت نمبر ۳۹۔۴۰ سے معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ کہنا کہ صرف ظلم کے خلاف جہاد ہے کسی دوسری برائی کے خلاف نہیں ہے اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرۃ: ۱۹۳)

ترجمہ: تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہوجائے پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (الانفال: ۳۹)

ترجمہ: (اے لوگو! جو ایمان لائے ہو) ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے، پھر اگر وہ فتنہ سے رک جائیں تو ان کے اعمال کا دیکھنے والا اللہ ہے۔

ان دو آیتوں پر غور کیجئے، اس سے معلوم ہوگا کہ جہاد دو چیزوں کے خلاف ہے۔ ایک فتنہ اور دوسرے دین کا اللہ کے لئے نہ ہونا، یعنی جہاد فتنہ کو ختم کرنے کیلئے ہوتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ دین اللہ کیلئے ہوجائے۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں جس کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے۔ فتنہ سے مراد مفسرین نے شرک لیا ہے اور اس طرح پوری بات یہ ہوئی کہ قتال کی غرض دین کو قائم کرنے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کی ہے جس کو قرآن کے الفاظ میں اظہار دین کہا گیا ہے۔ سبحانی صاحب نے ایک مقام پر کہا کہ ''اس آیت میں دین کا لفظ اصطلاحی معنی میں نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ اپنے لغوی معنی ''اطاعت'' میں استعمال ہوا ہے۔''

ہم کہتے ہیں کہ اس سے آیت کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ یہ دین اللہ کے لئے ہوجانے کا مطلب یہ ہوگا کہ ساری اطاعتیں اللہ کے لئے ہوجائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی وقت ہوگا جب سارا کفر اور شرک ختم ہوجائے یا شرک اور کفر کا غلبہ ختم ہوجائے۔ اسی صورت میں قرآن کی منشاء (یعنی اللہ کے لئے دین ہوجانے کی) پوری ہوگی۔

دراصل یہاں چار سوال ہیں جن کے صحیح جواب آنے کے بعد ہی حقیقت پوری طرح سمجھ میں آئے گی۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جہاد کس کی تائید میں ہوتا ہے یا یہ کہا جائے کہ جہاد کی کیا غرض ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جہاد کس چیز کے خلاف ہوتا ہے؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ جہاد کس سے کیا جائے؟

چوتھا سوال یہ ہے کہ جہاد کس سے نہ کیا جائے؟

- پہلے سوال کا جواب اوپر ہماری ذکر کردہ سورہ بقرہ اور انفال کی آیات میں آ گیا ہے کہ جہاد کی غرض ساری اطاعتوں کو ایک اللہ کیلئے کر دینا ہے اور اطاعت کے جتنے دعویدار ہیں ان کو ختم کر دینا یا ان کو مغلوب کر دینا بتایا گیا ہے۔ اس کے بغیر ساری اطاعتیں اللہ کے لئے نہیں ہو سکتیں۔
- دوسرے سوال کا جواب بھی کسی قدر اس میں آ گیا ہے کہ غیر اللہ کی اطاعتوں کے خلاف جہاد ہوتا ہے یا یہ کہا جائے کہ جہاد فتنہ اور شرک و کفر کے خلاف ہوتا ہے۔
- تیسرے سوال کے جواب میں ہم سورہ توبہ کی چار آیتیں پیش کرتے ہیں۔

① وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ. (التوبۃ:۱۲)

ترجمہ: اور اگر عہد کرنے کے بعد یہ پھر اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین پر حملے کرنے شروع کر دیں تو کفر کے علمبرداروں سے جنگ کرو کیونکہ ان کی قسموں کا اعتبار نہیں شاید کہ (پھر تلوار ہی کے زور سے) وہ باز آئیں گے۔

② يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ (التوبۃ:۷۳)

ترجمہ: اے نبی ﷺ، کفار اور منافقین دونوں کا پوری قوت سے مقابلہ کرو اور ان کے ساتھ سختی سے پیش آؤ آخر کار ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بدترین جائے قرار ہے۔

③ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَاۗفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَاۗفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبۃ:۳۶)

ترجمہ: اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ متقیوں ہی کے ساتھ ہے۔

④ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ○(التوبۃ:۱۲۳)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جنگ کرو اُن منکرین حق سے جو تمہارے پاس ہیں اور چاہئے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

چاروں آیتوں پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جہاد تیسرے سوال کے جواب میں پورے طور سے واضح ہے کہ جہاد ائمۃ الکفر اور کفار و منافقین سے ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے سوال کا جواب بھی اس میں آتا ہے کہ جہاد کس چیز کے خلاف ہوتا ہے۔

اس کے برخلاف سبحانی صاحب نے پہلے سوال کا جواب دلیل کے ساتھ کہیں نہیں دیا ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں صرف اتنا کہا کہ جہاد ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ لیکن اس کی دلیل میں بھی کوئی آیت پیش نہیں کی۔ ہم نے اوپر جو گفتگو کی ہے اس میں چاروں سوالوں کے جواب بڑی حد تک آ گئے ہیں۔ سبحانی صاحب اور ان کے ہمنواؤں سے خواہش کریں گے کہ کفار و مشرکین اور منافقین کے علاوہ کسی سے جہاد کرنے کی کوئی ایک آیت پیش کریں۔

اسی طرح کفر و شرک اور منافقت اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والی برائیوں کے علاوہ کسی دوسری برائی کے خلاف جہاد کرنے کا کوئی اشارہ موجود ہے تو پیش کریں۔

الغرض کفر و شرک اور منافقت اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والی برائیوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد اور جہاد کرنے کے شواہد قرآن کے ساتھ ساتھ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی بھرے پڑے ہیں۔

بہرصورت یہ معمہ اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے کہ سبحانی صاحب جیسا پڑھا لکھا آدمی یہ کیسے کہتا ہے کہ جہاد کفر و شرک کے خلاف نہیں ہوتا۔ غالباً سبحانی صاحب ان لوگوں سے متاثر ہیں جو مغرب کے اس تصور آزادی کے قائل ہیں جس آزادی کی حد یہ ہے کہ آدمی ننگے اور برہنہ رہنے کو اپنا بنیادی حق سمجھتا ہے۔ نیز مرد اور عورت بغیر نکاح اور شادی کے ایک ساتھ رہنے کا حق رکھتے ہیں یہی نہیں بلکہ دو مرد بحیثیت میاں بیوی کے ایک ساتھ رہ سکتے ہیں کسی کو کیا حق ہے کہ وہ ان کو اس سے روکے۔

یہ لوگ قرآن کی ایک آیت سے بھی استدلال کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے ذیل میں ہم پیش کرتے ہیں۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا (الکہف:۲۹)

ترجمہ: صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے، اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کردے، ہم نے (انکار کرنے والے) ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔

یہ آیت آزادی کا پروانہ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ ایک دھمکی ہے۔

(بحوالہ تفسیر جلالین اور تفسیر رازی۔)

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر یہ آزادی کا پروانہ ہے تو دنیا ہی میں انہیں کیوں آزادی کا فائدہ دیا جا رہا ہے اور آخرت میں کیوں ان کے لئے اتنا سخت عذاب دیا جا رہا ہے، یہ تو بڑا ظلم ہے۔ مغرب کے اس گروپ کے سوا قدیم مفسرین میں سے کسی نے اسے آزادی کا پروانہ نہیں قرار دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کے نزدیک شرک اور کفر کے خلاف جہاد کیا جائے تو یہ فطری آزادی کے منافی چیز ہوگی۔ اس لئے کہتے ہیں کہ جہاد کفر اور شرک کے خلاف نہیں ہے۔ اسی طرح کی چھوٹ اور آزادی کفار و مشرکین کے لئے یہ لوگ یہ بھی دیتے ہیں کہ دنیا میں کفار و مشرکین کے لئے کوئی سزا اور عذاب نہیں ہے۔ سبحانی صاحب کی اس بات کو ان کی دلیل کے ساتھ پڑھئے۔ سبحانی صاحب لکھتے ہیں۔

''حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالی نے جب اس زمین کی طرف بھیجا، تو وہ جانتا تھا کہ ان کی اولاد میں دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔ اگر کچھ لوگ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے اطاعت گزار اور فرماں بردار ہوں گے، تو بہت سے لوگ کفر و شرک کے علم بردار اور اس کے نافرمان ہوں گے۔ چنانچہ اسی وقت ان دونوں گروہوں کا انجام واضح کر دیا تھا۔ فرمایا:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ۝ (البقرۃ:۳۸-۳۹)

ترجمہ: ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے، تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے، ان کے لئے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

یہاں کفر اور تکذیب آیات، یعنی اللہ تعالی کی ناشکری کرنے اور اس کی آیتوں کو جھٹلانے کی اس دنیا میں کوئی سزا نہیں بتائی گئی ہے۔ کفر و شرک اور تکذیب آیات کی بنا پر نہ اس دنیا میں اللہ کا عذاب آتا ہے، نہ کسی مسلم سلطنت کیلئے یہ بات جائز ہے کہ کفر و شرک اور تکذیب آیات کو بنیاد بنا کر کسی قوم سے جنگ کرے۔ کفر و شرک اور

اللہ کی آیتوں کو جھٹلانے کی سزا بس جہنم ہے جو آخرت میں سامنے آئے گی۔'' (جہاد اور روح جہاد، ص: ۷۷)

سبحانی صاحب کے الفاظ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ آیت میں صرف اتنا دیکھ کر منکرین کے لئے جہنم ہے۔ دنیا میں ان کے لئے کوئی سزا اور عذاب نہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ لیکن قرآن کی دسیوں آیات میں یہ ذکر ہے کہ دنیا میں بھی کفر اور شرک کی سزا اور عذاب ہے۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ (التوبۃ:۱۴)

ترجمہ: ان سے لڑو، اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دلوائے گا اور انہیں ذلیل وخوار کرے گا اور ان کے مقابلہ میں تمہاری مدد کرے گا اور بہت سے مومنوں کے دل ٹھنڈے کرے گا۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبۃ:۵۵)

ترجمہ: اِن کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکہ نہ کھاؤ، اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ اِنہی چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی میں بھی مبتلائے عذاب کرے اور یہ جان بھی دیں تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ۝ (التوبۃ:۲۶)

ترجمہ: پھر اللہ نے اپنی سکینت اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اور مومنین پر نازل فرمائی اور وہ لشکر اتارے جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور منکرین حق کو سزا دی کہ یہی بدلہ ہے اُن لوگوں کے لیے جو حق کا انکار کریں۔''

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ۝ (التوبۃ:۷۴)

ترجمہ: اب اگر یہ اپنی اس روش سے باز آئیں تو انہی کے لیے بہتر ہے اور اگر یہ باز نہ آئیں تو اللہ ان کو نہایت دردناک سزا دے گا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور زمین میں کوئی نہیں جو ان کا حمایتی اور مددگار ہو۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ (البقرۃ:۱۱۴)

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کے معبدوں (مساجد) میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں ان کے لئے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوٓا أَوْ يُصَلَّبُوٓا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْأٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدۃ:۳۳)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں، یہ ذلت و رسوائی تو ان کے لئے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لئے اس سے بڑی سزا ہے۔

فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ إِيمَانُهَآ إِلَّا قَوْمَ يُونُسَ لَمَّآ اٰمَنُوا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَمَتَّعْنٰهُمْ إِلٰى حِينٍ ○ (یونس:۹۸)

ترجمہ: پھر کیا ایسی کوئی مثال ہے کہ ایک بستی عذاب دیکھ کر ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ثابت ہوا ہو؟ یونسؑ کی قوم کے سوا (اس کی کوئی نظیر نہیں) وہ قوم جب ایمان لے آئی تھی تو البتہ ہم نے اس پر سے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا عذاب ٹال دیا تھا اور اس کو ایک مدت تک زندگی سے بہرہ مند ہونے کا موقع دے دیا تھا۔

لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَشَقُّ وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللهِ مِنْ وَّاقٍ ○ (الرعد:۳۴)

ترجمہ: ایسے لوگوں کے لئے دنیا کی زندگی ہی میں عذاب ہے، اور آخرت کا عذاب اس سے بھی زیادہ سخت ہے کوئی ایسا نہیں جو انہیں اللہ سے بچانے والا ہو۔

وَإِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ إِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ أَوْ مُعَذِّبُوهَا عَذَابًا شَدِيدًا كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُورًا (الاسراء:۵۸)

ترجمہ: اور کوئی بستی ایسی نہیں جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں یا سخت عذاب نہ دیں یہ نوشتۂ الٰہی میں لکھا ہوا ہے۔

ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (الحج:۹-۱۰)

ترجمہ: گردن اکڑائے ہوئے تاکہ لوگوں کو راہ خدا سے بھٹکا دیں ایسے شخص کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور قیامت کے روز اس کو ہم آگ کے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔ یہ ہے تیرا وہ مستقبل جو تیرے اپنے ہاتھوں نے تیرے لئے تیار کیا ہے ورنہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ○ (الاحزاب:۵۷)

ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت فرمائی ہے اور ان کے لئے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے۔

رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ (الدخان:۱۲)

ترجمہ: پروردگار ہم پر سے یہ عذاب ٹال دے ہم ایمان لاتے ہیں۔

وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الزخرف:۴۸)

ترجمہ: اور ہم نے ان کو عذاب میں دھر لیا کہ وہ اپنی روش سے باز آئیں۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (الزخرف:۵۰)

ترجمہ: مگر جوں ہی ہم ان پر سے عذاب ہٹا دیتے وہ اپنی بات سے پھر جاتے تھے۔

وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ○ (الحشر:۳)

ترجمہ: اگر اللہ نے ان کے حق میں جلاوطنی نہ لکھ دی ہوتی تو دنیا ہی میں وہ انہیں عذاب دے ڈالتا، اور آخرت میں تو ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے ہی۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ (القصص:۵۸)

ترجمہ: اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔

سبحانی صاحب نے جب کہا کہ کفر اور شرک کے خلاف جہاد نہیں ہے، صرف ظلم واستبداد کے خلاف جہاد ہوتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ ءسبا کو جو خط لکھا اس کی کیا توجیہ کی جائے گی؟ اَنۡ لَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ ۔ میرے خلاف سرکشی نہ کرو مسلمان بن کر میرے پاس آجاؤ۔ "مُسۡلِمِیۡنَ" کے دو معنی لئے جاتے ہیں ایک تو یہ کہ اسلام قبول کر کے آؤ، دوسرے یہ کہ تابعدار بن کر آؤ۔

سبحانی صاحب نے اسی لئے لکھا کہ مسلمین شرعی معنی میں نہیں ہے لغوی معنی میں ہے۔ "مُسۡلِمِیۡنَ" کے چاہے جو معنی بھی لئے جائیں سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے اس لئے کہ کسی ملک کے حکمران کو یہ کہاں حق پہنچتا ہے کہ کسی ملک کے حکمران کو کہے کہ تم میرے تابع ہوجاؤ ورنہ میں تمہیں بزور اپنا تابع بنالوں گا اور تم کچھ نہیں کرسکو گے۔ بہرصورت حضرت سلیمان علیہ السلام نے مُسۡلِمِیۡنَ کا لفظ کس معنی میں استعمال کیا ہے خدا ہی جانتا ہے لیکن ملکۂ سبا نے تو شرعی معنی میں ہی سمجھا اور اسلام قبول کر کے آگئیں۔ بعض مفسرین نے شرعی معنی کو ترجیح دی ہے جلالین کے حاشیہ پر یہ عبارت لکھی ہے۔

"مسلمين" اى منقادين لدين الله وفى هذا الخطاب اشعار بانه رسول من عندالله يدعوهم إلى دين الله وليس مطلق سلطان وإلا لقال واتونى طائعين۔

سبحانی صاحب کے خلاف ایک دوسرا سوال اٹھتا ہے کہ موصوف نے یہ بھی لکھا ہے۔ "صلح پر آمادہ سے جہاد نہیں کیا جاتا" دیکھئے ملکۂ سبا صلح کا صرف ارادہ نہیں رکھتی تھی بلکہ عملاً کارروائی کردی۔ صرف اپنا ایک وفد ہی نہیں بھیجا بلکہ تحفے تحائف بھی بھیجے، تاکہ سامنے والے کا دل نرم ہوجائے اور صلح کی ترغیب ہوجائے۔ لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام نے نرم ہونے کے بجائے غصہ کا اظہار کیا اور دھمکی دے ڈالی۔

فَلَمَّا جَآءَ سُلَيۡمٰنَ قَالَ اَتُمِدُّوۡنَنِ بِمَالٍ فَمَاۤ اٰتٰٮنِۦَ اللّٰهُ خَيۡرٌ مِّمَّاۤ اٰتٰٮكُمۡ‌ۚ بَلۡ اَنۡتُمۡ بِهَدِيَّتِكُمۡ تَفۡرَحُوۡنَ‏ اِرۡجِعۡ اِلَيۡهِمۡ فَلَنَاۡتِيَنَّهُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَهُمۡ بِهَا وَلَـنُخۡرِجَنَّهُمۡ مِّنۡهَاۤ اَذِلَّةً وَّهُمۡ صٰغِرُوۡنَ‏○ (النمل: ۳۶-۳۷)

ترجمہ: جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے کہا: کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ اللہ نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے، تمہارا ہدیہ تم ہی کو مبارک رہے (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والے کی طرف ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کرسکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہوکر رہ جائیں گے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے رویہ کی ایک توجیہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ صاحب بھی کرتے ہیں اس کو پڑھئے:

''حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ میرا مطالبہ آپ کی ملکہ اور آپ کی حکومت سے اطاعت کا ہے۔ میں صرف دوستی کا خواہش مند نہیں ہوں کہ ان تحفوں سے خوش ہو جاؤں کہ ہمارے درمیان دوستی اور رسم وراہ قائم ہوگئی۔ مال ومتاع میرے پاس بہت ہے اور وہ بہر شکل آپ لوگوں کے مال سے بہتر ہے، آپ لوگ تو اس طرح کی چیزوں سے خوش ہوتے ہیں اس لئے کہ آپ لوگوں کی نظر میں ساری قدر انہی چیزوں کی ہے لیکن میرے پیش نظر اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ میرے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ میں تحفوں سے خوش ہو کر شرک وکفر کے اقتدار کو خدا کی زمین پر جائز تسلیم کرلوں۔'' (تدبر قرآن، صفحہ:۲۰۶)

سبحانی صاحب نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے رویہ کو جائز بتانے کے لئے ملکۂ سبا کو ایک ڈکٹیٹر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہدہد کے قول ''اِمْرَاَۃً تَمْلِکُھُمْ'' کو کھینچ تان کر لوگوں کو غلام بنانے کی بات کی ہے حالانکہ ہدہد کے کلام میں صرف دو باتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہاں ایک عورت بادشاہی کرتی ہے، دوسری یہ کہ وہاں کے لوگ سورج کی پرستش کرتے ہیں، ملکۂ سبا کے ظلم واستبداد کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ ظلم واستبداد کی بناء پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ اقدام کیا اس کی تائید کہاں ہوتی ہے؟ جبکہ حضرت ہدہد کے علاوہ کوئی ذریعہ علم نہیں تھا۔

ایک طرف امین احسن اصلاحی صاحب کی توجیہ ہے اور دوسری طرف سبحانی صاحب کی توجیہ ہے دونوں میں کتنی جان ہے غور کیجئے۔

سبحانی صاحب لکھتے ہیں:

''یہ ایک حقیقت ہے جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا کہ دنیا کی سب سے بڑی برائی ظلم واستبداد ہے۔ ظلم واستبداد کے علاوہ جتنی برائیاں ہیں وہ سب اسی کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظلم واستبداد کو کسی بھی صورت میں پسند نہیں کرتا۔ چاہے یہ ظلم واستبداد اہل اسلام پر ہو یا غیر مسلموں پر۔'' (جہاد اور روح جہاد صفحہ:۸۶)

سبحانی صاحب نے جس کو ایک حقیقت بتایا ہے اور جس سے کوئی شریف انسان اختلاف نہیں کرسکتا وہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے اور کوئی بھی قرآن کا طالب علم پہلی نظر میں ضرور اختلاف کرے گا۔

اس لئے کہ قرآن کی نظر میں سب سے بڑی برائی شرک ہے اور جتنی بھی برائیاں ہیں وہ سب شرک اور کفر کی شاخیں اور نسلیں ہیں۔

قرآن کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء:۴۸)

ترجمہ: اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا، اس کے ماسوا دوسرے جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لئے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔

یہ آیت صاف بتارہی ہے کہ سب سے بڑی برائی شرک ہے اس لئے اس کو نا قابل معافی جرم قرار دیا گیا ہے۔ اسی بناء پر ''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ'' بھی فرمایا گیا ہے۔ ظلم کی چاہے آپ کتنی بھی تقسیم کریں اور اس کی اقسام بتائیں وہ برائی کے اعتبار سے شرک سے بڑا نہیں ہوسکتا۔ جس طرح سب سے بڑی نیکی ایمان ہے اور ساری نیکیاں اور اچھائیاں اس کے تحت آتی ہیں اسی طرح ساری برائیاں شرک کے تحت آتی ہیں۔ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے صاحب ایمان کے لئے اختلاف کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

(۲۰۱۸ء)

متفرق مضامین

ووٹ کے بارے میں شرعی نقطۂ نظر

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کا ووٹ کے شرعی اور اسلامی نقطۂ نظر سے متعلق منصف ۱۷/اپریل ۲۰۱۴ء میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا جائزہ ہم یہاں لیں گے۔ مولانا رحمانی نے لکھا ہے کہ ووٹ کے بارے میں اسلامی اور شرعی نقطۂ نظر کو جاننے کی ضرورت ہے اور اسلام کے اصولی احکام کی روشنی کا بھی نام لیا۔ لیکن اسلام کے اصولی احکام کیا ہیں اس کا اتہ پتہ نہیں بتایا اس سلسلہ میں ہم دو چیزوں کا ذکر کر سکتے ہیں۔

① - حدیث صحیح سے ثابت اور مشہور ہے کہ عہدہ اور منصب طلب کرنے والے کو عہدہ اور منصب دینا صحیح نہیں ہے امام بخاری نے ''کتاب الاحکام'' میں باب باندھا ہے۔ ''مایکرہ من الحرص علی الامارۃ'' اور ابوموسیٰ کی روایت لاتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ''انا لانولی ھذا من سألہ ولا من حرص علیہ'' جو شخص خود اس چیز کا طالب ہو یا اس کی حرص رکھتا ہو اس کو ہم یہ کام سپرد نہ کریں گے۔ مقصود اس سے یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب اور حرص نہ کریں گے تو کشمکش اور مقابلہ بھی نہ ہوگا اور امت کے لئے نہایت آسان ہو جائے گا کہ اہل و اصلح کو منتخب کریں۔

اس حدیث میں گویا ایک اصول بتا دیا گیا۔ اس اصول کی روشنی میں موجودہ صورتحال پر غور کیجئے کیا ایسا نہیں ہے کہ الیکشن میں اٹھنے والا کینڈیڈیٹ منصب کا طلب گار ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لئے ہر حربہ استعمال کرتا ہے لاکھوں روپئے خرچ کرتا ہے ہر دھونس دھاندلی ، غنڈہ گردی ، جھوٹ سچ سے کام لے کر بہر صورت اسمبلی اور پارلیمنٹ کی سیٹ جیتنا چاہتا ہے اس پر حدیث کی روشنی میں کیا حکم لگایا جائے؟ کیا کوئی امیدوار اس لائق ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور جو اس کی مدد کرے گا کیا وہ ارشاد رسول ﷺ کی خلاف ورزی کا مرتکب نہ ہوگا؟ اب بتایئے کہ منصب کے طلب گار کو ووٹ دینا گناہ نہیں ہے؟ اور منصب کی طلب اس کے

استحقاق کو ختم نہیں کر دیتی ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقانیت پر یقین رکھنے والا کوئی مسلمان ووٹ دے کر اس کے مستحق ہونے کی گواہی کیسے دے گا؟ جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو غیر مستحق اور نالائق بتا رہے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرے گا تو وہ گناہ کا کام کرے گا۔ اس گناہ کے کام کو واجب کہنا کتنا بڑا گناہ ہے مولانا رحمانی صاحب کو اس کا احساس ہونا چاہیے۔

۲۔ **دوسرا اصول:** نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم منصب خلافت وحکومت پر فائز ہوئے۔ کیا چاروں خلفاء کے انتخاب کے موقع پر کوئی امیدوار سامنے آئے؟ کیا کسی نے منصب خلافت کی جدوجہد فرمائی؟

ان دونوں اصولوں کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ جمہوری طریقۂ انتخاب کا سسٹم پوری طرح غیر اسلامی ہے لہٰذا قرآن وحدیث اور دینی اصولوں کی روشنی میں قابل رد ہے اور قابلِ اجتناب ہے جو شخص بھی چاہے کتنا فقیہ اور عالم کیوں نہ ہو، اگر اس کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ لامحالہ بے بنیاد تاویلات کرے گا۔ کیونکہ غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے دلیل بھی غلط لانی پڑے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا رحمانی صاحب نے دلیل کے طور پر جو باتیں پیش کی ہیں وہ سب بے محل اور غلط بنیاد پر ہیں۔ رحمانی صاحب کی غلط بات اور غلط دلیل بیان کرنے سے پہلے ہم مسلمان اور حکومت کے تعلق سے کچھ ضروری باتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

علاّمہ محمد سلیمان قاسمی فریضۂ خلافت کے عنوان پر ''طلبہ اور نوجوانوں کی ذمہ داریاں'' بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آپ کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کے علوم وفنون کا مطالعہ کرنے اور ان میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تاریخ میں جو اسلامی تحریکیں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے دیگر انبیاء علیہم السلام کی نگرانی میں اٹھتی رہی ہیں۔ ان کا غور وفکر کے ساتھ گہرا اور تفصیلی مطالعہ کریں اور ان تحریکوں سے اپنے دور میں اسلامی تحریک برپا کرنے کیلئے ذہنی وفکری اور اخلاقی وروحانی غذا حاصل کریں، یاد رہے کہ یہ دعوتی داستانیں اگرچہ بائبل میں اور تاریخی لٹریچر میں بھی بکھری ہوئی اور منتشر حالت میں ملتی ہیں لیکن ان کا مستند ذریعہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔
>
> ★ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو اسلامی تحریک برپا کی تھی وہ بڑی تفصیل کے ساتھ محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی رہنمائی میں یہ تحریک پیدا ہوئی۔ پروان چڑھی مختلف مراحل سے گزری اور کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور ہر موقع پر بروقت رہنمائی سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فائدہ اٹھایا۔ قرآن کے علاوہ سیرت کا عظیم ذخیرہ موجود اور محفوظ ہے۔ غرض حضور کی برپا کی ہوئی اسلامی تحریک کے تفصیلی مطالعہ کے بغیر اور اسے اپنا رہنما بنائے بغیر آپ یا کوئی شخص بھی اسلامی تحریک برپا نہیں کرسکتا۔

★ خلفائے راشدینؓ، تابعینؒ، تبع تابعینؒ، فقہاء کرامؒ، محدثین عظامؒ، مجددینؒ اور مجاہدینؒ اور دیگر بزرگان دین جو تحریکیں انفرادی یا اجتماعی طور پر چلاتے رہے ہیں ان سب کا مطالعہ آپ کے لئے ضروری ہے۔

★ آج کے دور میں جو اسلامی تحریکیں دنیا میں اور خود آپ کے برصغیر میں برپا ہیں ان کے لٹریچر سے آپ کو بھرپور استفادہ کرنا چاہئے۔

غرض کہ آپ کی عظیم اور اہم ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں نظام خلافت قائم کرنے کے لئے اپنی ذہنی، جسمانی اور ہر طرح کی توانائیاں صرف کریں اور اسی عظیم مقصد کو اپنا نصب العین قرار دیں۔

حاکمیت:

ہر حکومت کسی نہ کسی نظریۂ حاکمیت پر قائم ہوتی ہے۔ اسلام کا نظریۂ حاکمیت یہ ہے کہ کوئی انسان (شخص، طبقہ، گروہ پارٹی یا پوری جنتا کوئی بھی) حاکم نہیں ہوسکتا حاکم صرف وہی ہوسکتا ہے اور وہی ہے جو زمین کا اور زمین پر بسنے والے انسانوں کا بلکہ پوری کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ. (یوسف:۴۰)

ترجمہ: حکم سوائے اللہ کے اور کسی کا نہیں، اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو یہ صحیح دین ہے۔

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ (آل عمران:۱۵۴)

ترجمہ: وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (المائدۃ:۴۴)

ترجمہ: جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

غرض کہ حاکمیت (SOVEREIGNTY) اللہ کیلئے مخصوص ہے۔ اسی طرح قانون ساز (LAWGIVER) بھی اصلاً صرف اللہ ہے۔ عام انسان تو عام ہیں، نبی خود بھی اللہ ہی کے حکم اور قانون کا پیرو ہوتا ہے۔

إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ (یونس:۱۵)

ترجمہ: میں تو صرف اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔

خلافت:

اسلامی حکومت کو خلافت اسی لئے کہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے مطابق بادشاہی اور حاکمیت (SOVEREIGNTY) صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے، انسان کو اللہ کا خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت سے اس کے احکام وقوانین کے مطابق نظم حکومت قائم کرنے کا حق اور اختیار ہے۔ بلکہ اللہ کے وفادار اور فرماں بردار بندوں کا یہ فرض بھی

ہے کہ وہ اللہ کی زمین پر اس کے احکام وقوانین نافذ کریں، اور وہ نظام قائم کریں جو وہ ہمیشہ اپنے نبیوں کے ذریعہ بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور معیاری شکل میں خاتم النّبیین ﷺ نے قائم کیا، جو قیامت تک کے لئے نمونہ اور اُسوہ ہے۔

خلافت راشدہ:

وہ حکومت جو حاکمیت الٰہ اور نیابت انسانی کی بنیاد پر قائم ہو، جس کا دستور قرآن وسنت ہو۔ جہاں احکام شریعت کا اجراء اور حدود شریعت کا نفاذ ہو، اصول دین کی تبلیغ کی جاتی ہو، شورائیت کا پاس ولحاظ رکھا جاتا ہو۔ غرض کہ مذہب وسیاست ومعاشرت ومعیشت اور زندگی کے تمام معاملات میں احکام الٰہی اور اسوۂ رسول ﷺ کو نمونہ بنایا جاتا ہو، اسے خلافت راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہتے ہیں۔

خلفائے راشدین:

خلفاء خلیفہ کی جمع ہے اور راشدین راشد کی جمع ہے۔ راشد، ہدایت پر چلنے والے کو کہتے ہیں یعنی وہ حکمران جو خود بھی ہدایت پر تھے اور دوسروں کو بھی ہدایت پر قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ جنھوں نے بالکل قرآن و سنت کے مطابق حکومت کی۔

فریضہء خلافت:

اسلامی حکومت قائم کرنا ایسا فریضہ ہے جس پر تمام امت کے فقہاء اور علماء کا اتفاق ہے لیکن ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ شرعی طور پر واجب ہے۔

کیوں کہ:

(۱) — رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اس حال میں مرگیا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں تھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(۲) — خلافت قائم کرنا مسلمانوں پر واجب ہے اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خلیفہ کا تقرر ضروری سمجھا اور اس کو اس قدر اہمیت دی کہ رسول ﷺ کے جسد مبارک کو دفن کرنے سے پہلے یہ فریضہ انجام دیا۔

(۳) — اسلامی نظام قائم کرنا واجب اور ضروری ہونے کی تیسری دلیل یہ ہے کہ حدود اور قصاص اور دیگر اسلامی قوانین کا نفاذ اور اجراء، حکومت کے بغیر نہیں ہوسکتا حالانکہ حدود وقصاص وغیرہ اسلامی قوانین کا نفاذ واجب ہے اور واجب جس چیز پر موقوف ہو وہ بھی واجب اور ضروری ہوتی ہے۔

فقہاء کا ایک گروہ کہتا ہے کہ نظام خلافت کا قیام عقلاً واجب ہے۔ کیوں کہ ہر سوسائٹی اور سماج کو ایک ایسی

طاقت کی ضرورت ہوتی ہے جواس کے قانون کو جاری کرے، اس کے جھگڑے چکائے اور امن وامان قائم کرے۔'' (مختصر تاریخ خلافت راشدہ ص: ۱۰ تا ۱۴)

مولانا قاسمی صاحبؒ کی تحریر کا جو یہ اقتباس ہم نے اوپر درج کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت قائم کرنا ایک فریضہ ہے اور واجب ہے۔ یہ فریضہ کیسے ادا ہوگا اس کا سیدھا جواب ہے کہ غیر اسلامی حکومت کو ہٹایا جائے گا پھر اس کی جگہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا فریضہ انجام دیا جائے گا ظاہر ہے ایک مسلمان جس کے ذمہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا فریضہ عائد ہوتا ہے وہ کسی غیر اسلامی حکومت کے قیام، یا اس کے استحکام یا اس کے چلانے میں کیسے شریک ہوگا؟! اور وہ مجبور ہے تو کم از کم خاموش بیٹھا رہے گا۔ جمہوری حکومت کی جگہ اسلامی حکومت کا قیام اس کے پیش نظر رہنا چاہئے نہ کہ جمہوری حکومت کے استحکام اور چلانے میں حصہ لیا جائے۔ ہم مولانا رحمانی صاحب سے خواہش کریں گے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنا موقف واضح کریں اور بتائیں کہ اسلامی حکومت کے قیام کے وجوب کو کس بنیاد پر نظر انداز کر رہے ہیں؟ ہم سمجھتے ہیں وہ بھی اوپر بیان کردہ بات سے انکار نہیں کرسکیں گے چنانچہ اسی طرح کی اصولی باتوں کی بنا پر مولانا نے ایک جگہ یہ تسلیم فرمایا ہے کہ اصولی طور پر پارلیمنٹ کا ممبر بننا اور موجودہ حکومت کے کلیدی مناصب کو قبول کرنا جائز نہیں ہے۔

مولانا رحمانی لکھتے ہیں:

''غیر اسلامی حکومت میں کلیدی عہدے: ''ایک اہم سوال یہ ہے کہ غیر اسلامی مملکت کے کلیدی عہدوں، صدارت، وزارت، تحفظ ودفاع، عدلیہ اور رکنیت پارلیمنٹ پر فائز ہونا جائز ہوگا یا نہیں؟ جب کہ ایسی ملازمتوں میں سیکولر اور غیر مذہبی ریاست ہونے کے لحاظ سے اسلامی قانون اور منصوص احکام کے خلاف فیصلوں میں شریک ہونا اور اس کی تنفیذ کا ذریعہ بننا پڑے گا۔

اصولی طور پر ظاہر ہے کہ یہ بات جائز نہ ہوگی۔ اس لئے کہ کسی شخص کی محض ملازمت سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ وہ کسی گنہگارانہ اور خلاف شرعی فیصلہ کا اور اس کے نفاذ اور ترویج کا ذریعہ بنے اور عملاً حاکمیت الٰہی کا انکار کرے''۔ (جدید فقہی مسائل، صفحہ: ۳۷۹)

اوپر ہماری بیان کردہ باتوں سے کسی قدر یہ بات آپ کے سامنے آ گئی کہ واجب اسلامی حکومت قائم کرنا ہے اور اس واجب کو ادا کرنے کے لئے غیر اسلامی حکومت کو ہٹانا واجب ہے۔ فقہی اصول ہے کہ جس کام پر کسی واجب کی ادائیگی موقوف ہوتی ہے۔ وہ بھی واجب ہوتا ہے۔ مثلاً وضو کرنا واجب ہے تو اس کے لئے پانی کی تلاش واجب ہوگی۔ کوئی بے نمازی یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوسکتا کہ میں نے نماز نہیں پڑھی کہ وضو نہیں تھا۔ وضو نہیں کیا کہ پانی نہیں تھا۔ بلکہ اس سے پوچھا جائے گا کہ پانی کے حصول کے لئے تم نے کیا کوششیں کیں۔

حصول یابی کے لئے اس نے کوشش کی تو ٹھیک ہے ورنہ وہ گرفت میں آئے گا۔

پس جس کو یہ شعور ہوگا کہ میری ذمہ داری اسلامی حکومت قائم کرنا ہے اور پھر اس کے لئے میری ذمہ داری بنتی ہے کہ میں غیر اسلامی حکومت کو ہٹاؤں وہ ووٹ کیسے دے گا اور ووٹ دے کر غیر اسلامی حکومت کے قیام و بقاء میں شریک کیسے ہوگا؟؟ یہ ٹھیک ہے ووٹ نہ دینے سے غیر اسلامی حکومت ہٹے گی نہیں۔لیکن وہ کم از کم ایک غلط کام سے بچ جائے گا اور گناہ گار نہیں ہوگا، یہاں یہ سمجھنا بالکل آسان ہے کہ ووٹ دینے کا مطلب دہرے گناہ کا مرتکب ہونا ہے۔ایک شریعت کے متفقہ فریضہ یعنی قیام حکومت اسلامی سے انکار، انحراف اور روگردانی دوسرے حکومت غیر اسلامیہ کے قیام واستحکام کا ذریعہ بننا۔

رحمانی صاحب نے ووٹ دینے کو شرعاً واجب بتایا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد اور کوشش کرنا مسلمان کا فریضہ بتاتی ہے اور مولانا غیر اسلامی حکومت کو قائم کرنے کو واجب بتا رہے ہیں کتنی سنگین بات ہے!

بات کی سنگینی کو ختم کرنے کے لئے دو کام کرنا ہوگا۔اور وہ دونوں باتیں رحمانی صاحب یا اور کوئی مسلمان نہیں کرسکتا۔ایک تو یہ کہنا کہ اسلامی حکومت قائم کرنا جس کا قیام وبقا اور استحکام مسلمان پر واجب ہے وہ فرض اور واجب نہیں ہے اور دوسرا غیر اسلامی نظام کے قائم کرنے اور اس کو چلانے کو واجب ثابت کرنا۔

ایک اور غلط بات:

مولانا رحمانی صاحب کی تحریر کو دیکھئے۔مولانا نے اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے اٹھنے والوں کو حضرت یوسف علیہ السلام سے تشبیہ دی ہے۔حضرت یوسف علیہ السلام پیغمبر تھے اور ان کا علم اور ان کی دیانت داری کہاں اور الیکشن میں اٹھنے والے کہاں؟!

مولانا نے خود ایک موقع پر ان کو کرپٹ، رشوت خور، ظلم وجور کے ذریعہ سرکار اور عوام کی املاک پر قبضہ کرنے والے، غنڈہ گردی کرنے والے، اخلاق کی دھجیاں بکھیرنے والے اور مظلوموں کی لاشوں پر چڑھ کر اپنا قد اونچا کرنے والے قرار دیا ہے۔

مولانا کے الفاظ پڑھیے:

> ”الیکشن گیا اور الیکشن کی ہماہمی گئی، وطن عزیز کے باشندوں نے اہل سیاست کے کیا کچھ کارنامے نہیں دیکھے؟ یہ بھی دیکھا کہ قوم کی نمائندگی کے لئے وہ لوگ امیدوار بن رہے ہیں، جن پر سنگین جرائم کی دفعات عائد ہیں، یہ بھی دیکھا کہ کرپٹ اور رشوت خور، ظلم وجبر کے ذریعہ سرکار اور عوام کی املاک پر قبضہ کرنے والے اور غنڈہ گردی کے ذریعہ اپنی دھونس جمانے والے، قومی اور مقامی پارٹیوں کی طرف سے کھڑے کئے گئے ہیں

کیوں کہ ان کے ذریعہ پارٹی کو فنڈ حاصل ہوتا ہے، تنہائیوں میں نہیں بلکہ اسٹیج پر اخلاق کی دھجیاں بکھیری گئیں۔ ایک دوسرے کے نجی واقعات کو نمک مرچ لگا کر پیش کیا گیا، غرض کہ عمومی طور پر سیاسی قائدین نے اس بات کو واضح کر دیا کہ سیاست میں اخلاقی اقدار کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ بڑا لیڈر وہ نہیں ہے، جو قوم کا خادم ہو ملک سے محبت رکھتا ہو بلکہ بڑا لیڈر وہ ہے جو لفاظ ہو، پیسے بہا کر ووٹ خرید سکتا ہو، مظلوموں کی لاش پر چڑھ کر اپنا قد بلند کر سکتا ہو، یہ سب وہ مفاسد ہیں جو صرف ابھی گزرنے والے الیکشن ہی کا حصہ نہیں ہیں۔ بلکہ یہ الیکشن کے لوازم میں شامل ہو گئے ہیں، ہر الیکشن میں یہ منظر سامنے آتا ہے، اور روز بروز اس میں ترقی ہوتی چلی جاتی ہے۔'' (منصف ۱۷/۱۱اپریل ۲۰۱۴ء)

پھر دیکھئے مولانا رحمانی صاحب کہتے ہیں:

''الیکشن میں امیدوار بن کر اٹھنے والا دو باتوں کا دعویٰ کرتا ہے اول اپنی امانت و دیانتداری کا اور دوسرے اپنی اہلیت اور صلاحیت کا۔''

ہم کہتے ہیں یہ بات صحیح نہیں ہے اولاً امیدوار اپنی دیانت داری اور صلاحیت منوانے کا مدعی نہیں بلکہ وہ مدعی کسی دوسری چیز کا ہوتا ہے۔ بالفرض مولانا کی بات مان لی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہر مدعی کی قابلیت اور دیانت داری کی تصدیق وتوثیق کرنا ہر مسلمان کے لئے کیوں ضروری ہے؟ بے شمار لوگ کورٹ اور مارکٹ میں ہزاروں کا دعویٰ کرتے ہیں کیا ہر ایک کی تصدیق وتوثیق کرنا ضروری اور شرعاً واجب ہے؟ کوئی بھی بوالہول بازار میں پکارے کہ میں شہر میں سب سے بڑھ کر علم والا ہوں یا سب سے بڑا امانت و دیانت والا ہوں تو آپ کہیں کہ اس کی تصدیق واجب ہے ہاں ہوسکتا ہے کہ مدعی اپنی جگہ صحیح ہو لیکن کس بنیاد پر اس کی توثیق واجب ٹھہرتی ہے؟ آپ کہتے ہیں یہ گواہی ہے اور گواہی دینا ضروری ہے اور دین میں گواہی کی یہ اہمیت اور فضیلت ہے ٹھیک ہے۔ دین میں گواہی ضروری ہے اور گواہی چھپانا گناہ ہے۔ لیکن گواہی اس چیز کی دی جاتی ہے جس کو آدمی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو جو کام اس کے سامنے ہوا ہو ورنہ نہیں۔

بغیر علم اور جانکاری گواہی دینا جرم ہے بسا اوقات ایک ایک حلقہ میں دس دس بیس بیس امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ کس بنیاد پر آپ گواہی دیں گے کہ فلاں امیدوار سب سے زیادہ دیانت دار ہے اور سب سے بڑا صاحب علم وصلاحیت ہے کیا آپ نے ہر ایک کے علم و دیانت کا امتحان لیا ہے؟ کیا آپ نے ہر ایک کے معاملات اور برتاؤ کو بذات خود پرکھا ہے جبکہ اکثر امیدوار دولت ایمان ویقین سے عاری ہوتے ہیں اور کلمہ شہادت کی ہوا بھی انہیں نہیں لگی ہوتی اور ظاہری اعتبار سے انبیاء اور صلحاء سے کوئی مشابہت بھی نہیں رکھتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں امیدوار کی صلاحیت اور دیانت کی ووٹ دے کر گواہی دو، نہ ایمان کی نہ صحت عقیدہ کی اور نہ

اتباع سنت نبوی ﷺ کی شرط لگاتے ہیں مطلق واجب ٹھہراتے ہیں!! جب کام کو شرعاً واجب کہا جارہا ہے تو شرعی شرائط اور قیود کے ساتھ کہنا چاہئے۔

آپ کو کہنا چاہئے کہ بشرطیکہ مدعی کلمہ گو ہو، بشرطیکہ پابند شریعت ہو بشرطیکہ متشرع ہو بشرطیکہ تم نے بذات خود دس پانچ معاملات میں اس کی دیانت داری کا مشاہدہ کیا ہو وغیرہ وغیرہ۔ بغیر علم کے، بغیر معلومات کے اور بغیر مشاہدہ کے گواہی دینا اپنے کو خطرہ میں ڈالنا ہے اور شریعت میں ممنوع ہے۔

صورت واقعہ کا صحیح ادراک

مولانا رحمانی صاحب نے کہا کہ الیکشن میں کوئی امیدوار بنتا ہے تو وہ گویا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں علم میں دیانت داری میں سب سے اچھا ہوں۔ صورت واقعہ کی یہ ناقص ترجمانی ہے اور اصل حقیقت سے دانستہ یا نادانستہ چشم پوشی کی گئی ہے۔

اس مقام پر سب سے پہلے جاننے کی ضرورت ہے کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کی کیا حیثیت ہے جس کے لئے الیکشن ہوتے ہیں۔ ''ارسطو نے پہلی بار حکومت کی تین حصوں میں تقسیم کی تھی جو قانون سازی، عاملانہ اور عدالتی تقسیم تھی اس عنوان کی بڑی تفصیل ہے اس سلسلہ میں ہم ''ڈاکٹر عبدالقیوم'' کی کتاب ''علم سیاسیات'' سے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں تاکہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کیا ہے معلوم ہو جائے۔

مقننہ

حکومت کے تین اعضاء مقنّنہ، عاملہ اور عدلیہ میں مقنّنہ کو ممتاز مقام اور موقف حاصل ہے۔ تمام جمہوری نظاموں میں مقننہ اقتدار اور حکومت کے اختیارات ورائے عامہ کا سرچشمہ سمجھی جاتی ہے۔ مختلف ممالک میں یہ مختلف ناموں سے جانی جاتی ہے، جیسے ہندوستان میں برطانیہ میں ''پارلیمنٹ'' امریکہ میں ''کانگریس'' روس میں ڈائیٹ''، ایران میں ''مجلس''، سعودی عرب میں ''مجلس شوریٰ'' اسرائیل میں ''کینسٹ'' اور پاکستان میں ''وفاقی اسمبلی'' وغیرہ۔ سعودی عرب کی مقننہ کے سوائے مذکورہ بالا تمام مقننہ عوامی منتخبہ ہیں۔ سعودی عرب کی مقنّنہ کو حاصل فرائض واختیارات اور مقام وموقف میں بھی فرق ہوتا ہے۔ چنانچہ برطانیہ کی پارلیمنٹ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ''وہ سب کچھ کرسکتی ہے سوائے تبدیلئ جنس کے''، یعنی برطانوی پارلیمنٹ اعلیٰ ترین وبرتر اختیار کی حامل ہے۔ کوئی بھی دوسرا ادارہ اس کے اختیارات کو کم نہیں کرسکتا۔ لیکن دوسری طرف امریکہ اور ہندوستان میں عدالتی نظر ثانی کا عدلیہ کا برتر اختیار مقنّنہ کے اختیار کو کچھ حد تک کم کردیتا ہے۔ اسی طرح سوئز رلینڈ کی مقنّنہ کے اختیار پر راست جمہوریت کے طریقہ ریفرنڈم، پیش قدمی اور تحریک واپس طلبی کا اثر

پڑتا ہے جس کی وجہ سے اس کے اختیارات محدود ہوجاتے ہیں۔

پروفیسر سی۔ایف اسٹرانگ مقنّنہ کے متعلق کہتا ہے کہ ’’یہ حکومت کا وہ محکمہ ہے جس کا تعلق قانون سازی سے ہے۔منطقی طور پر، قانون سازی عمل آوری سے پیشتر ہوتی ہے۔اس لئے پہلی نظر میں ہی مقنّنہ کی اہمیت عاملہ اور عدلیہ سے زیادہ ہے۔‘‘ اس طرح مقنّنہ بنیادی طور پر قانون ساز ادارہ ہے جس کی ابتداء ۱۲۹۵ء میں برطانوی حکمراں ایڈورڈ اول نے سماج کے مختلف طبقات پر مشتمل ایک ’’ماڈل پارلیمنٹ‘‘ کو طلب کرتے ہوئے کی تھی۔

ساری دنیا میں مقنّنہ کا پہلا اور بنیادی فریضہ قانون سازی ہے چوں کہ قانون سازی خود ایک مستقل عمل ہے۔ وقتاً فوقتاً پرانے قوانین پر نظر ثانی وترمیم کرنا اور نئے قوانین کو بنانا پڑتا ہے۔مقنّنہ ایک بحث ومباحثہ کا ادارہ ہے جہاں عوامی نمائندے عوامی مسائل پر گفت وشنید وغور وخوض اور مباحث کرتے ہیں۔قدیم دور سے ہی عوامی اسمبلیاں عوامی مسائل پر غور وخوض کا مرکز رہی ہیں۔اس کے بعد جدید دور میں قانون سازی مقنّنہ کا اہم اختیار بن گیا۔چنانچہ آج تمام ممالک میں مقنّنہ نئے قوانین کو مرتب کرتی ہے قدیم قوانین میں ترمیم کرتی ہے۔اور روزمرہ کی قانونی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔پارلیمانی جمہوریت میں عاملہ مقنّنہ کا ایک حصہ ہوتی ہے، اس لئے وہ قانون سازی میں مقنّنہ کی مدد ورہنمائی کرتی ہے۔جب کہ صدارتی جمہوریت میں مقنّنہ عاملہ سے علاحدہ رہ کر قانون سازی کا کام انجام دیتی ہے۔یہاں پر قانون سازی کے لئے عاملہ کو مقنّنہ پر مکمل انحصار کرنا پڑتا ہے۔

دوایوانی مقنّنہ میں قانون سازی کا عمل کسی قدر پیچیدہ ہوجاتا ہے چوں کہ ایک ایوان کی منظوری کے بعد مسودہ قانون دوسرے ایوان کو بھیجا جاتا ہے اور وہاں از سرنو اس پر دوبارہ غور ہوتا ہے۔دونوں ایوانوں میں عدم اتفاق کی صورت میں قانون سازی کا عمل یا تو تعطل سے دوچار ہوجاتا ہے یا پھر بعض ممالک (آسٹریلیا اور ہندوستان) میں دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کو طلب کرتے ہوئے اس تعطل کو دور کرلیا جاتا ہے۔‘‘

(علم سیاسیات، ڈاکٹر عبدالقیوم صفحہ: ۲۴۳۔۲۴۴)

اس سے قبل ہم نے علّامہ سید سلیمان کی جو عبارت نقل کی ہے اس کو دوبارہ پڑھئے اور دیکھئے۔مولانا قاسمی نے آیات قرآنی کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ حاکمیت اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے قانون دینا صرف اللہ کا کام ہے مولانا رحمانی بحیثیت فقیہ ہم سے بہتر جانتے ہیں کہ اللہ نے اپنے رسول ﷺ کے ذریعہ جو شریعت بھیجی ہے وہ اللہ کا دیا ہوا قانون ہے۔کسی بھی معاملہ میں شرعاً سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا اللہ کی کتاب میں کیا حکم ہے؟ پھر سنت سے معلوم کیا جائے گا کیا ہدایت ہے؟ اگر کتاب وسنت میں کوئی حکم نہیں معلوم تو پھر اجماع اور قیاس کے ذریعہ حکم دریافت کیا جائے گا۔شریعت میں یہ چار چیزیں قانون معلوم کرنے کا ذریعہ

ہیں ان چاروں کتاب وسنت اجماع اور قیاس کو اصول فقہ یا اصول قانون کہتے ہیں۔ان ذرائع سے ہٹ کر جو قانون سازی کی جائے گی وہ بلاشبہ شرک اور الحاد ہوگا۔

ہم رحمانی صاحب سے پوچھتے ہیں اسمبلی اور پارلیمنٹ میں مذکورہ چار اصول فقہ کی روشنی میں قانون سازی ہوتی ہے یا اس کی گنجائش ہے؟ ظاہر ہے اسمبلی اور پارلیمنٹ میں اصول فقہ کے ان چاروں اصولوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا ہے۔

اس مقام پر اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ووٹ دینے کو جو صاحب بھی جائز یا واجب کہتے ہیں ان کو ثابت کرنا پڑے گا کہ حاکمیت اور قانون سازی کا حق اللہ کے علاوہ کسی شخص، طبقہ، گروہ، پارٹی یا پوری قوم کو کیسے دیا جاسکتا ہے؟ یا پھر ان کو یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ قانون ساز ادارے نہیں ہیں۔ان دو باتوں کو ثابت کئے بغیر ووٹ دینے کو جائز یا واجب نہیں کہا جاسکتا ہے۔

● ووٹ اگر امانت ہے تو بتایئے۔اس امانت کا کون حقدار ہے جن کو یہ امانت سونپی جائے؟

جن کو آپ ووٹ دیتے ہیں وہ تو اللہ کے لئے حاکمیت اور قانون سازی کو مخصوص نہیں مانتے۔وہ حاکمیت کا حق جمہور عوام کے لئے مانتے ہیں اور اللہ ورسول کی تعلیمات ومرضیات کے بجائے عوام کی اھواء، پسند ناپسند کو معیار قانون بتاتے ہیں اس طرح ووٹ دینا ایک خیانت ہے۔اور ووٹ دینے والا ان وعیدوں کا مستحق ٹھہرتا ہے جو خائنوں کو سنائی گئی ہیں، اگر ووٹ دینا شہادت اور گواہی ہے تو یہ ووٹ دینا شہادتِ زور ہے جھوٹی گواہی ہے کہ جو قانون سازی کے لائق اور مستحق نہیں ہیں ان کے آپ لائق اور مستحق ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور آپ شہادتِ زور دینے والوں کے لئے جو وعیدیں آئی ہیں ان کا اپنے آپ کو مستحق بنا رہے ہیں، دوسری طرف آپ کتمان شہادت کے مرتکب ہیں اس لئے کہ آپ کو گواہی تو یہ دینی چاہئے کہ قانون دینا اللہ اور رسول ﷺ کا کام ہے یا پھر ان کا کام جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اللہ ورسول کی دی ہوئی شریعت کا پورا علم رکھتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کا جو ایمان وعلم سے محروم ہیں۔الیکشن میں جو لوگ امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں وہ کیسے ہوتے ہیں، ان کے علم وعمل کا نقشہ مولانا رحمانی صاحب کے لفظوں میں آپ نے ابھی دیکھا ہے ان کو ووٹ دے کر امانت کا حق ادا کریں گے یا بدترین خیانت اور کتمان حق کا مظاہرہ کریں گے؟ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچئے اور فیصلہ کیجئے۔

● کہا جاتا ہے ووٹ دینا ایک لحاظ سے سفارش ہے۔اگر یہ سفارش ہے تو بدترین سفارش ہے غیر مستحق اور نااہل لوگوں کے لئے سفارش کرنا پوری قوم کے حق میں غداری اور بدخواہی ہے۔

● ووٹ دینے کو کہا جاتا ہے کہ ایک اعتبار سے وکالت بھی ہے گویا ووٹ دینے والا امیدوار کو وکیل بناتا ہے امیدوار وکیل ہوا اور ووٹ دینے والا موکل، اس ضمن میں موجودہ حال میں واضح رہنا چاہیے کہ وکیل پانچ سال تک موج کرتا ہے بے شمار رعایتوں اور سہولتوں سے بہرہ مند ہوتا ہے لیکن موکل صاحب کے ہاتھ اس کے سوا کچھ نہیں آتا کہ وہ وکیل صاحب کے پیچھے پیچھے دوڑیں، گڑگڑائیں، عاجزی منت کریں اور اپنا اعمال نامہ خراب کریں۔ اس لئے کہ وکیل صاحب ایم ایل اے اور ایم پی بن کر جتنے گھپلے اور اسکینڈل کریں گے ان سب کا وبال موکل صاحب یعنی ووٹ دینے والے صاحب پر بھی آئے گا۔ پانچ دس ہوسکتا ہے نیکیاں ہوں مگر آج کی صورت حال میں بلاتردد کہا جاسکتا ہے کہ سو بدیاں نامۂ اعمال میں فرشتہ لکھے گا یہ وہ نازک پہلو ہے جو اگر آدمی کے سامنے ہو تو ووٹ دینے سے پہلے ہزار دفعہ سوچے گا کہ میں ووٹ دوں یا نہ دوں لیکن اس زمانہ میں ووٹ دینا ایک کھیل اور تماشہ بن گیا ہے اور کچھ لوگوں کے لئے کاروبار بھی ہے الغرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے ووٹ دینا ایک مسلمان کے لئے خطرۂ ایمان نظر آئے گا۔

مولانا رحمانی صاحب نے بغیر کسی شرط اور قید کے ووٹ دینے کو شرعاً واجب قرار دیا ہے اس کے لئے کوئی شرط نہیں لگائی نہ ایمان کی نہ عمل کی، نہ مرد کی اور نہ عورت کی۔ اس لئے کوئی پوچھ سکتا تھا کہ اسلام میں عورت کو حکومتی کوئی منصب دینا جائز نہیں ہے عورت کو ووٹ کیسے دیا جائے؟ ابھی چند سال پہلے کی بات ہے پاکستان میں جنرل ایوب کے مقابلہ میں فاطمہ جناح الیکشن میں کھڑی ہوئی تھیں اس وقت پورے برصغیر کے علمی حلقہ میں طوفان برپا ہوگیا کہ اسلام کا نام لیتے ہوئے فلاں جماعت نے فاطمہ جناح کی کیسے تائید کردی اخبار و رسائل میں علماء کرام کے مضامین، فتاوے کی بھرمار ہوگئی۔ فاطمہ جناح تو ماشاء اللہ مسلمان تھیں۔ اور یہاں تو عموماً غیر مسلم امیدوار ہوتی ہیں یہ کیا معاملہ ہے؟ اور علماء کا کیا مسئلہ ہے؟ اس خدشہ کے پیش نظر مولانا رحمانی صاحب نے عورت کے مسئلہ کو چھیڑا اور بہر صورت کسی نہ کسی طرح عورت کو بھی ووٹ دینے کا جواز نکال ہی دیا۔ اور لائن صاف کردی۔ بلا ادنی جھجک عورت کو ووٹ دیا جاسکتا ہے ثابت کردیا۔

جواز کا دوازہ کھولنے کے لئے ہمارے یہاں دو کنجیاں ہیں ایک مجبوری کی کنجی، جس کو کہیں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس کے ذریعہ بڑے سے بڑے ناجائز کو جائز اور بڑے سے بڑے حرام کو حلال کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ زندگی کا کوئی میدان ہو اور کوئی مسئلہ ہو مجبوری کی شکل پیدا ہو ہی جاتی ہے کوئی مشکل مرحلہ تو آ ہی جاتا ہے۔

دوسری کنجی اھون البلیتین کی ہے چھوٹی اور بڑی کی منطق سامنے لادی جاتی ہے۔ ظاہر ہے چھوٹی مصیبت

ہی کی بات پسند کی جائے گی۔

۶۰-۶۵ سال سے چھوٹی برائی بڑی برائی کا اصول لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہماری ساری ملی حکمت عملی کی گاڑی اسی پٹری پر چل رہی ہے سوال یہ ہے کہ یہ صورتحال کب تک رہے گی۔ یہ مرحلہ کب آئے گا کہ ہم کہیں نہ چھوٹی برائی کو قبول کریں گے نہ بڑی برائی۔ ہم ڈٹ کر ہر برائی کا مقابلہ کریں گے۔کیا اسوۂ رسول ﷺ اور اسوۂ انبیاء یہی ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹی برائی کو قبول کر لیا جائے؟! کسی رخصت کو اصل قرار دے لینا اور عزیمت کو بالکل چھوڑ دینا انبیاء کرام، صلحاء امت کے طرز عمل سے میل نہیں کھاتا۔اور نہ قرآنی اسپرٹ کے موافق ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہندوستان میں ملت اسلامیہ ۶۰ سال کے تجربہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ازسرنو اپنی حکمت عملی بنائے ورنہ نہ ہندوستان میں اسلام کو وقار ملے گا اور نہ مسلمانوں کو عزت۔

ووٹ دینے کو شہادت، سفارش، اور وکالت قرار دینے کی بات حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب سے چلی ہے اس کا ماخذ ''معارف القرآن'' جلد ۳ ہے، آیات ۸ تا ۱۰، المائدہ کی تفسیر اس موضوع گفتار پر فرمائی ہے۔

ہندوستان میں فقہ اکیڈمی سے وابستہ لوگوں نے محمد مفتی شفیع صاحب کی بات کو جزوی طور پر لیا اور کہا کہ ووٹ دینا واجب ہے اسلئے کہ وہ شہادت اور گواہی ہے سفارش ہے وکالت ہے اور اس پہلو کو یکسر نظرانداز کر دیا کہ اگر ووٹ دینا جھوٹی گواہی، غلط سفارش اور وکالت بن جائے تو اس کا وبال اور گناہ کتنا عظیم ہوگا۔مفتی صاحبؒ نے اپنی وضاحت میں ووٹ دینے کے لئے دو شرطیں رکھیں ہیں کہ پہلی شرط یہ ہے کہ جس کو ووٹ دیا جائے وہ متدین ہو گویا غیر متدین امیدوار کو ووٹ دینا گناہ عظیم قرار پائے گا اور جائز نہ ہوگا چہ جائے کہ واجب ہو۔

ہندوستانی فقہ اکیڈمی بالخصوص مولانا خالد رحمانی صاحب سے ہم دریافت کریں گے کہ پارلیمنٹ کی سیٹ کے لئے ہزاروں امیدواروں میں سے کتنے ہیں جن کو متدین کہا جاسکتا ہے اور مفتی صاحب نے تدین کی شرط لگائی آپ نے کیوں نہیں لگائی؟ دوسری شرط دیانت داری ہے جبکہ دیانت داری کی دھجیاں بکھیرنا امیدواری کا پرچہ داخل کرنے کے ساتھ شروع ہوجاتا ہے پھر اپنے کو اہل ثابت کرنے کے لئے مہم چلائی جاتی ہے تو کیا حال ہوتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔اگر کوئی کہے کہ ہزاروں امیدواروں میں کوئی ایک بھی دیانت کا ثبوت نہیں دیتا تو اس بات کو جھٹلانا مشکل ہوگا۔

مفتی صاحب کی ان دونوں شرطوں کو ہندوستانی فقیہوں نے نظرانداز کر دیا اس موقع پر ممکن ہے یہ کہا جائے پاکستان میں امیدوار کلمہ گو ہوتے ہیں اس لئے مفتی صاحب نے متدین ہونے کی شرط لگائی اور اگر امیدوار کلمہ گو نہ ہو تو اس کے لئے متدین ہونے کا سوال نہیں ہے ہم کہیں گے کہ اس بنا پر مفتی صاحب کی باتوں کو ہندوستان کے حالات پر منطبق کرنے کا کیا جواز ہے؟ کوئی جواز نہیں ہے۔ (۲۰۱۴ء)

جماعتِ اسلامی کی ویلفیئر پارٹی آف انڈیا

تحریک اسلامی جسے برصغیر ہندو پاک میں جماعت اسلامی کے نام سے لوگ جانتے ہیں۔اس کی تشکیل تقسیم ہند سے پہلے ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔اس جماعت کا شروع سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ ایک اصولی اور نظریاتی تحریک ہے شروع میں اس کا مقصد ''حکومت الٰہیہ کا قیام'' بیان کیا جاتا تھا۔

پھر کچھ دنوں بعد اس اصطلاح کو ''اقامت دین'' کی اصطلاح سے بدل دیا گیا۔اس لئے کہ حکومت الٰہیہ کوئی اسلامی اصطلاح نہیں تھی اور غالباً جہاں تک مجھے معلوم ہے اور میں نے سنا ہے وہ یہ کہ یہ تبدیلی مولانا اختر احسن اصلاحی کی تجویز پر ہوئی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ اقامت دین ایک اسلامی اور قرآنی اصطلاح ہے اور جامع اصطلاح ہے شروع شروع میں اس کی اصولی اور نظریاتی حیثیت بہت ہی واضح تھی۔

جماعت اسلامی کی تشکیل کے وقت اور خاص طور سے تقسیم ہند کے بعد جو حالات تھے اور جو تحریکیں چل رہی تھیں اس میں نظریاتی اعتبار سے دو قسم کی تحریکیں تھیں۔ایک کی بنیاد وطن پرستی پر تھی جس کی ترجمان کانگریس کو کہا جاسکتا تھا اور دوسری کی بنیاد قوم پرستی پر تھی۔جس کی ترجمانی مسلم لیگ یا ہندوتو تنظیمیں کر رہی تھیں۔ جماعت اسلامی ان دونوں کے بیچ بیچ کی سوچ پر قائم ہوئی اور اسی پر چلتی رہی تقسیم ہند کے بعد حالات جس تیزی سے بدلے اور فرقہ وارانہ فسادات اور مسلمانوں کی مظلومیت کے جو واقعات سامنے آئے۔اس سے تحریک اسلامی کے بہت سے سوچنے والوں کی سوچ میں یہ تبدیلی آئی کہ ہم اصولی اور نظریاتی تحریک کے علمبردار ہونے کے باوجود مسلمانوں کی بدحالی کو برداشت نہیں کر سکتے اور برداشت کرنا صحیح بھی نہیں ہے۔

جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کی حمایت کی اور انھیں سنبھالنے کی کوشش کی اس طرح سے بہت سی تاریخی روایات اور قرآنی ہدایات کی روشنی میں یہ سوچ بڑھی اور اس پر جماعت کے اخبارات و آرگن جیسے ''دعوت'' اور ''زندگی نو'' وغیرہ میں مضامین اور خطوط وغیرہ شائع ہوئے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے ایسا تاثر

پیدا ہو رہا ہے کہ وہ قوم پرستی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ اسی قوم پرستی کی سوچ اور ذہنیت کے پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کی پاسداری اور حفاظت کیسے ہو سکتی ہے؟ اسی راستے سے گزرتے ہوئے اور سوچتے ہوئے بعض گوشوں سے یہ سوال اٹھا کہ ہم کو الیکشنی سیاست سے دور نہیں رہنا چاہئے۔

پھر ۱۹۶۰ء کے بعد اکسٹھ باسٹھ سے اس طرح کی سوچ متعدد گوشوں سے سامنے آنے لگی یہاں تک کہ مجلس شوریٰ اور جماعت کے دوسرے تنظیمی فورموں میں بھی اس موضوع پر اظہار خیال ہونے لگا اور یہ بات سامنے آنے لگی کہ الیکشن میں حصہ لینا چاہئے اور رفتہ رفتہ یہ سوچ بڑھنے اور پھیلنے لگی سال دو سال پہلے تک جو لوگ ''زندگی نو'' کے پرچے دیکھتے رہے ہیں۔ انھیں پتہ ہوگا کہ اس میں کھل کر الیکشن کی حمایت کے خطوط اور مضامین آتے رہے ہیں اور دوسری طرف الیکشن کے خلاف مہم بھی چلتی رہی۔

بہر صورت جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس بحث کا آغاز جس نظریہ کے تحت ہوا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے حقوق کیسے حاصل اور محفوظ کئے جا سکتے ہیں اور مسلمانوں کا سلامتی کے ساتھ رہنا اور بسنا ہندوستان میں کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟؟ اس سوال کے پس منظر میں گویا یوں کہا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی کی اصولی اور نظریاتی جو حیثیت تھی اس سے ہٹ کر یہ فکر پیدا ہوئی اور یہ فکر الیکشن کے سلسلہ میں اس طرح آگے بڑھی کہ پوری جماعت میں گویا دو گروپ ہو گئے۔ آپ کہیں گے جماعت میں دو گروپ کبھی نہیں رہے۔ لیکن مجلس شوریٰ کی روداد اور ''زندگی نو'' کے مضامین اس پر گواہ ہیں کہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے دو گروپ ہو گئے۔

ایک الیکشن کا مخالف دوسرا الیکشن کا حمایتی۔ اس ضمن میں آپ کھلے طور سے شمالی ہند اور جنوبی ہند کا امتیاز دیکھ سکتے ہیں۔ شمالی ہند کے لوگ الیکشن کے خلاف تھے اور جنوبی ہند کے لوگ عام طور سے حمایتی۔ اس مسئلہ کی مخالفت میں مدھیہ پردیش بہت نمایاں تھا۔ مدھیہ پردیش کے پورے ارکان اس بارے میں بہت سخت تھے۔ اپنے خیالات کو وہ برملا پیش کرتے تھے۔ اسی پس منظر میں اسی دو فکر یا دو گروپ کے پروان چڑھنے کی وجہ سے بھوپال میں ساتویں دھائی میں ایک اجتماع ہوا تھا۔ اسی موضوع پر بہت سے لوگوں نے اپنے مقالے پیش کئے خاص طور پر مولانا صدرالدین اصلاحی صاحبؒ نے مخالفت میں سید یوسف صاحب نے الیکشن کی حمایت میں اپنے مقالے پیش کئے۔ بڑی بحثیں ہوئیں۔ لیکن الیکشن کے حامیوں کی بات نہ چل سکی۔ اور مخالفین کا پلڑا ہی بھاری رہا۔ اسی طرح سے جماعت اسلامی کے ارکان پر الیکشن میں حصہ لینے اور ووٹ دینے کی جو پابندی تھی وہ باقی رہی۔ اس کے کچھ دنوں کے بعد شمس پیرزادہ صاحب زیر حلقہ مہاراشٹرا اور حیدرآباد کے عبدالحفیظ خان صاحب نے جماعت سے استعفیٰ دے دیا، یہ لوگ الیکشن کے سخت حامی تھے۔ مگر الیکشن کے حامی گروپ نے

اپنی کوشش مسلسل جاری رکھی اوراپنے اپنے حلقے کے ارکان کی تعداد بڑھانے کی کوشش کی ۔ اور الیکشن کے جومخالفین تھے وہ کم ہونے لگے یاان کوکم کیا جانے لگا۔ان پر دباؤ ڈالا جانے لگا اورمختلف بہانوں سے ان کا اخراج بھی کیا جانے لگا۔اوربعض لوگ خوداس سلسلہ میں احتجاجاً نکل گئے۔

غرض یہ کہ کشمکش جاری رہی اور یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ شوریٰ پر تقریباً مکمل طور پر الیکشن کے حامیوں کا غلبہ ہوگیا۔نتیجتاً ۱۹۸۵ء میں الیکشن کے لئے ووٹ دینے کی پابندی کوارکان پر سے ہٹا دیا گیا۔یعنی پچیس سال تک جاری رہنے والے فکری تصادم ،فکری ٹکراؤ اورفکری بحث کے بعد الیکشن میں ووٹ دینے کی اجازت جماعت کی طرف سے ارکان کو دی گئی ۔لیکن اس اقدام کی بھر پور مخالفت کی گئی۔اس سلسلہ کی ایک نمایاں مثال امیر حلقہ بہار ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ صاحب ہیں جنہوں نے جماعت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ان کے استعفیٰ کی فوٹو کاپی ''نذرضیاء الہدیٰ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا کہنا تھا کہ میرا وقت قریب ہے اور میں اللہ کے پاس اس حال میں جانانہیں چاہتا کہ میں ایک ایسی پارٹی اور جماعت کا رکن رہوں جو باطل سے سمجھوتہ کر رہی ہے اور باطل کی حمایت کر رہی ہے۔

یہ اختلاف بڑھتا رہا لیکن اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ الیکشن اور ووٹ کی حمایت میں جماعت کے کسی بھی معتبر عالم دین نے دوحرف بھی نہیں لکھے۔الیکشن کی حمایت میں جتنے لوگوں نے بھی لکھا وہ عام طور پر ایسے لوگ ہی رہے جومستند عالم نہیں تھے۔یعنی الیکشن کی حمایت میں سامنے آئے تو ایسے لوگ جن کو معروف معنی میں عالم دین نہیں کہا جاسکتا ہے مثلاً ممبئی کے ریاض خاں صاحب نے ایک مضمون لکھا اورسابق امیر جماعت ڈاکٹر عبدالحق انصاری صاحب نے ایک کتابچہ لکھا۔جماعت اسلامی کے معروف عالم دین مولانا جلال الدین عمری صاحب امیر جماعت اسلامی ہند اگر چہ الیکشن کے حمایتی کے طور پر سامنے آئے ہیں لیکن ابھی تک انہوں نے بھی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔''زندگی نو'' اور''سہ روزہ دعوت'' اس پر گواہ ہیں حتیٰ کہ کوئی پمفلٹ بھی مکتبہ اسلامی دہلی سے شائع نہیں ہوا جو کسی معتبر عالم دین نے لکھا ہو۔جبکہ مولانا مودودیؒ کے علاوہ مولانا صدرالدین اصلاحیؒ،مولانا ابواللیث اصلاحیؒ،مولانا سید حامد علی صاحبؒ،مولانا سید عروج احمد قادریؒ کی تحریریں موجود تھیں۔الیکشنی سیاست سے اختلاف کرنے والوں کا موقف اصولی اعتبار سے اس لئے مضبوط تھا کہ جماعت اسلامی کے دستور میں توحید کے تقاضے کے سلسلہ میں ایک عبارت شامل ہے کہ ''اللہ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدر اعلیٰ نہ سمجھے کسی کو باختیار خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے۔''

اس طرح ان کا کہنا تھا کہ اس تشریح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ووٹ دینا اور الیکشنی سیاست میں حصہ لینے کا مطلب ہے شرک۔ اس لئے کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ قانون ساز ادارے ہیں قانون ساز ادارے میں خود شامل ہونا، اس کا ممبر بننا یا کسی کو ممبر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ گویا قانون سازی جو اللہ کا حق ہے وہ حق دوسرے انسانوں کو دیا جارہا ہے۔ یہ کھلا ہوا شرک ہے۔ اس کے علاوہ مخالفین الیکشن کے سامنے بانیٔ جماعت مولانا مودودیؒ کی بے شمار تحریریں موجود ہیں جو اس بات پر گواہ ہیں کہ انھوں نے باطل اور طاغوت سے اجتناب پر کافی زور دیا ہے اور الیکشنی نظام کی بھرپور مخالفت کی ہے اور جماعت کی بنیاد اسی اصول پر رکھی تھی۔

مولانا مودودیؒ نے رسائل ومسائل میں ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ

''دوم یہ کہ ووٹ اور الیکشن کے معاملہ میں ہماری پوزیشن کو صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے۔ پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ ہونے والے اسی طرح کے انتخابات کی اہمیت جو کچھ ہو اور ان کا جیسا کچھ بھی اثر ہماری قوم یا ہمارے ملک پر پڑتا ہو بہر حال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بناء پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارہ کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔ موجودہ کافرانہ نظام سے ہماری لڑائی ہی اس بنیاد پر ہے کہ یہ نظام حاکمیت جمہور پر قائم ہوا ہے اور جمہور جس پارلیمنٹ یا اسمبلی کو منتخب کریں یہ اس کو قانون بنانے کا غیر مشروط حق دیتا ہے۔ جس کے لئے کوئی بالاتر سند اس کو تسلیم نہیں ہے بخلاف اس کے کہ ہمارے عقیدۂ توحید کا بنیادی تقاضہ یہ ہے کہ حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ خدا کی ہو اور آخری سند خدا کی کتاب کو مانا جائے اور قانون سازی جو کچھ بھی ہو کتاب الٰہی کے تحت ہو نہ کہ اس سے بے نیاز۔ یہ ایک اصولی معاملہ ہے جس کا تعلق عین ہمارے ایمان اور ہمارے اساسی عقیدے سے ہے اگر ہندوستان کے علماء اور عامۃ المسلمین اس حقیقت سے ذہول برت رہے ہیں اور وقتی مصلحتیں ان کیلئے مقتضیات ایمانی سے اہم تر بن گئی ہیں تو اس کی جواب دہی وہ خود اپنے خدا کے سامنے کریں گے۔ لیکن ہم کسی فائدے کے لالچ اور کسی نقصان کے اندیشے سے اس اصولی مسئلہ میں موجودہ نظام کے ساتھ کسی قسم کی مصالحت نہیں کر سکتے آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ توحید کا یہ عقیدہ رکھتے ہوئے آخر کس طرح انتخابات میں حصہ لے سکتے ہیں؟ کیا ہمارے لئے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو ہم کتاب اللہ کی سند سے آزاد ہو کر قانون سازی کرنے کو شرک قرار دیں اور دوسری طرف خود اپنے ووٹوں سے ان لوگوں کو منتخب کرنے کی کوشش کریں جو خدا کے اختیارات غصب کرنے کے لئے اسمبلیوں میں جانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم اپنے عقیدے میں صادق ہیں تو ہمارے لئے اس معاملے میں صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنا سارا زور اس اصول کے منوانے میں صرف کر دیں کہ حاکمیت صرف خدا کی ہے اور قانون سازی کتابِ الٰہی کی سند پر مبنی ہونی چاہیے۔ جب تک یہ اصول نہ مان لیا جائے ہم کسی انتخاب کسی رائے دہی کو حلال نہیں سمجھتے۔'' (رسائل ومسائل جلد اول)

اس طرح کی تحریریں الیکشن کے مخالفین کے پاس موجود تھیں لیکن اس کے باوجود حامیان الیکشن کا حلقہ جماعت میں بڑھتا رہا اور سیاسی حربے استعمال کر کے ایسے لوگ تعداد میں بڑھائے گئے۔ اور بالآخر شوریٰ کے فیصلہ کے بعد جماعت نے اپنے ارکان پر ووٹ دینے کی جو پابندی لگائی تھی وہ ختم کر دی اور گویا جماعتی سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے ووٹ دینا اور الیکشنی سیاست میں حصہ لینا ضروری ہے۔

جماعت کی شوریٰ کے فیصلے کے باوجود یہ بحث ختم نہیں ہوئی تھی اور الیکشن کے مخالفین کی رائیں پریس میں آتی رہیں۔ اس دوران یہ اندازہ ہوتا رہا کہ الیکشن کے حامیوں کا ذہن بھی اس معاملہ میں صاف نہیں تھا۔ اور ان کی سمجھ میں بھی یہ نہیں آرہا تھا کہ صرف ووٹ دینے سے مسلمانوں کے حقوق کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں؟ گویا پچیس سال صرف اس بات کی پختگی میں لگے کہ ووٹ دینا چاہئے۔ اور اس فیصلے کے بعد سے پچیس برس کا عرصہ گزرا ہے یعنی ۱۹۸۵ء سے ۲۰۱۱ء تک گویا یہ دوسری منزل آئی ہے اور اس میں فیصلہ ہوا ہے کہ الیکشن میں حصہ لینا چاہیے یعنی دوسرے مرحلے کے پچیس سالوں میں الیکشن کے حامیوں کو آگے کی راہ سجھانے کے لئے مختلف نعرے دیئے گئے کہ فسطائی طاقتوں کو ووٹ نہ دیا جائے یا یہ کہ اچھے (نیک) لوگوں کو ووٹ دیا جائے۔ لیکن ان باتوں میں کوئی وزن محسوس نہیں کیا گیا کیونکہ ہر خاص و عام یہ سوال کرتا رہا کہ نیک لوگ کون ہیں؟ آپ اس کی نشاندہی کیجئے اس کا جواب جماعت کے پاس کچھ نہیں تھا کیونکہ الیکشنی نظام میں جو تبدیلیاں ہوتی رہیں اور ہو رہی ہیں وہ ایسی ہیں کہ آگے کا راستہ کسی کو سجھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ موجودہ الیکشن میں کسی نیک آدمی اور ایماندار آدمی کا شریک ہونا اور کامیاب ہونا تقریباً محال ہے۔ اس لئے کہ لاکھوں نہیں کروڑوں روپے خرچ کرنے کے باوجود دھاندلی اور غنڈہ گردی جب تک نہ کی جائے، اس وقت تک کسی کا جیتنا ناممکن ہے نہ صرف یہ بلکہ مختلف عصبیتوں کو ابھارنا پڑتا ہے مختلف غیر قانونی اور غیر اخلاقی افعال و اعمال کر کے جیت کو ممکن بنانا پڑتا ہے اس طرح جماعت اسلامی کو اپنے ارکان کو ووٹ دینے کی اجازت کے بعد بھی اس کے سامنے کوئی راہ نہیں تھی اور نہ کوئی نتیجہ نکل رہا تھا۔ اور ووٹ دینے کا جو فیصلہ کیا گیا تھا وہ بے فیض معلوم ہونے لگا۔ اور دوسری طرف لوگوں کے اعتراضات اور تنقیدوں کی بوچھاڑ کا سامنا تھا کہ آپ غیر اسلامی کام کر رہے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے وغیرہ۔

اس صورتحال کو ۲۵ ر سال تک برداشت کرنے کے بعد جماعت نے ایک اور غلط فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا اور یہ سمجھا کہ اب کسی کو اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کا موقع باقی نہیں رہے گا اور وہ فیصلہ ۱۸ را پریل ۲۰۱۱ء کو ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کے قیام کے طور پر سامنے آیا۔ جماعت کسی مرحلہ پر ایک غیر دینی اصول پر دین اسلام سے ہٹ کر خالص کافرانہ و مشرکانہ نظریات کی بنیاد پر ایک غیر اسلامی سیکولر پارٹی تشکیل دے گی ایسا ۵۰ ر سال پہلے کوئی

سوچ بھی نہیں سکتا تھا نہ موافق نہ مخالف۔لیکن سارے اصولوں اور پالیسیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے جماعت نے ایک پارٹی بنادی۔

پہلے سوال یا اعتراض یا تنقید اس بات پر ہوئی تھی کہ اسلامی نقطہ ٔنظر سے صحیح ہے یا غلط ہے اس اعتراض کے جواب میں حامیان الیکشن صفائی دیتے تھے کہ اس کی بھی گنجائش ہے یہ بھی جائز ہے اور سیرت وتاریخ کے واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنی بات کی صفائی میں پیش کرتے تھے کہ ایسا ہوسکتا ہے لیکن اب صورتحال مختلف ہے۔اس کے اندر اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی سوال نہیں ہے کیونکہ اب کھلم کھلا یہ کہا جارہا ہے اور صفائی دی جارہی ہے کہ اس پارٹی کے اصولوں میں مسلمانیت باقی نہیں ہے اس پارٹی کا ممبر ایک خدا کو ماننے والا بھی ہوسکتا ہے اور تین خداؤں کو ماننے والا بھی ہوسکتا ہے اور سینکڑوں بتوں کو پوجنے والا بھی ہوسکتا ہے، اس میں مسلمانیت اور اسلام کا کوئی دخل نہیں ہے کوئی شائبہ نہیں ہے۔ پہلے یہ ثابت کیا جاتا تھا کہ ہم جو کررہے ہیں وہ اسلامی کام ہے اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔اور اب جو صورتحال ہے وہ یہ کہ نہیں صاحب! اس میں اسلامیت اور مسلمانیت کا کوئی سوال نہیں ہے یہ بالکل غیر دینی اور سیکولر پارٹی ہے اس میں ہر قوم، ہر مذہب اور ہر نظریہ کے لوگ آسکتے ہیں۔

اب صورتحال یہ ہوگئی کہ ویلفیئر پارٹی آف انڈیا کا قیام گویا عملاً اس بات کا اظہار ہے کہ اس زمانے میں خاص طور سے سیاسی میدان میں دین اور اسلام کی بنیاد پر کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ جو لوگ ہمیشہ دو باتیں خاص طور سے کہتے رہے۔

ایک یہ کہ اسلام ایک ہمہ گیر مذہب ہے زندگی کے سارے ہی مسائل، سارے ہی گوشوں پر حاوی ہے۔

دوسری بات یہ کہتے رہے کہ تمام مسائل کا حل اسلام میں موجود ہے۔

لیکن یہ ویلفیر پارٹی آف انڈیا کا قیام گویا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دونوں نظریوں سے پھر گئے ہیں۔ ہمارے عقیدے کے جو جزء تھے وہ ہمارے اپنے نہیں رہے جس طرح سے عام بے دین لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دین ومذہب کی بنیاد پر قوموں کے مسائل خاص طور سے سیاسی زندگی کے مسائل حل نہیں ہوسکتے اسی بات کی قائل آج جماعت اسلامی ہند بھی ہوگئی ہے۔

جماعت کے موجودہ فیصلہ کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ''خیانت'' کی گئی ہے۔وہ اس طور پر کہ جس ادارے کی بنیاد خالص اسلامی نظریات اور حاکمیت الہ پر ہوئی تھی اور جس کا بنیادی نظریہ تھا کہ دنیا کے سارے مسائل کا حل اسلام میں ہے اس ادارے کے تحت اس ادارے میں بیٹھ کر اس ادارے کا نام لیتے ہوئے غیر دینی سیکولر بنیادوں

پر ایمان لانا اور سیکولر بنیادوں پر کسی تنظیم کو قائم کرنا ایک طرح کی خیانت ہی ہے۔

دوسری حیثیت سے دیکھیے تو ایک معنی میں یہ ارتداد ہے۔ جماعت جو کہتی رہی کہ اسلام ایک جامع اور ہمہ گیر دین ہے یہ کوئی جزوی یا فروعی بات نہیں ہے یہ ہمارے عقیدے کا جزء ہے۔ سارے انسانوں کی نجات سارے مسائل کا حل ہمارے دین میں موجود ہے۔ یہ دو باتیں اگر کوئی نہیں مانتا تو مسلمان نہیں ہوسکتا۔ ان دو باتوں کو چھوڑنے کا مطلب ہے کہ ہم ارتداد کی طرف جا رہے ہیں اور ارتداد کے کھڈ میں پڑ گئے ہیں۔ یہاں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ملت کو جس کھڈ میں گرنے سے بچانے کے لئے جماعت اسلامی کی تشکیل ہوئی تھی اسی کھڈ میں جماعت اسلامی ہند اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ اور بڑی مقدار میں وسائل وذرائع سمیت جا گری ہے۔

علی وجہ البصیرت میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ یہ ایک طرح کا ارتداد ہے جس میں جماعت مبتلا ہو رہی ہے۔ یہ بات میں اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس پارٹی کی تائید میں اور اس کی تشکیل میں کوئی دینی قباحت نہیں ہے اور کوئی دینی حرج نہیں ہے۔ بعض لوگوں کی گفتگو میں نے سنی ہے جس میں کتاب وسنت اور دینی مسلمات کی اساس پر کوئی بات نہیں کہی گئی۔ جو کچھ کہا گیا ہے اور کہا جا رہا ہے اس کی تائید میں صرف حالات کا تذکرہ ہے ایک طرف تقسیم ہند کے بعد کے فسادات اور دوسری طرف بم دھماکوں کے بعد کے پیدا شدہ حالات جس میں بلاقصور مسلمانوں کو گرفتار کیا جا رہا ہے اور ستایا جا رہا ہے اور مسلمانوں پر مصائب آنے لگے ہیں۔ ان حالات کو جواز بنا کر اپنے اقدام اور فیصلہ کو اور پارٹی کے قیام کو جائز بتایا جا رہا ہے، ان باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم کہہ رہے ہیں کیا حالات سے فتوی پوچھا جائے ؟ کیا حالات کے مطابق اپنے دینی اصولوں سے دستبردار ہوا جاسکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ حالات کا اثر پڑتا ہے فتوے میں بھی پڑتا ہے مسائل میں بھی پڑتا ہے لیکن عقیدے جیسی بنیادی چیزوں میں حالات کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ انبیاءؑ کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ انہیں آروں سے چیر دیا گیا۔ اللہ کے نیک بندوں کو غاروں میں پناہ لینی پڑی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں کودنا پڑا یہ سب کیوں ہوا؟ اس لئے کہ جو بنیادی عقیدے ہیں اس میں حالات کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ حالات کا اس پر اثر نہیں پڑتا۔ فروعی معاملات میں، تدبیرات میں پڑ سکتا ہے لیکن جو بنیادی عقیدہ ہے اس میں حالات سے کوئی فتوی مانگنا اور شرعی دلیل کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہ کرنا یہ صحیح نہیں ہے۔

اب تک نئی پارٹی کی تائید میں جتنی بھی تحریریں آئی ہیں اس میں کہیں بھی نہ کسی آیت کا، نہ کسی حدیث کا، اور نہ کسی مسلمہ شرعی اصول کا کوئی حوالہ ہے۔ اس طرح ارتداد کی راہ پر پوری قوم اور پوری تحریک کو ڈال دیا گیا ہے۔

اس کے بعد دینی معاملات میں حساس لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے مجلس شوریٰ کی قرار داد کی بنیاد پر بعض سرکلرس جاری ہوئے ہیں اس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جماعت نے ایک نئی سیاسی پارٹی کو بنایا ہے لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ ہمارا کوئی بھی رکن اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ یہ کہنا بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے تعلق سے کہے کہ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے، باپ بیٹے کا تعلق تو ایسا ہے کہ باپ لاکھ کہے کہ اس سے میرا تعلق نہیں ہے لیکن وہ تعلق ختم تو نہیں ہو سکتا۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند کا اور نئی پارٹی کا تعلق ختم ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ جماعت کے ذمہ دار ہی نئی پارٹی کے ذمہ دار بھی ہیں۔

آپ اس معاملہ پر ایک دوسرے پہلو سے بھی نظر ڈالئے کہ صرف اتنا نہیں ہے کہ ایک گناہ کیا گیا اور ایک گمراہی کی راہ اختیار کی گئی بلکہ یہ گناہ بے لذت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔ آپ اس ملک میں دیکھ سکتے ہیں کہ کم و بیش پچھتّر کروڑ ووٹر ہیں۔ ان ووٹروں میں پچاس ساٹھ سال میں جماعت نے کتنے ممبروں کو اپنی تحریک سے متاثر کیا ہے گنتی کی جائے تو اس کی تعداد صرف ہزاروں میں ہوگی۔ ساٹھ سال میں جب صورتحال یہ ہے تو غور کیجئے کہ اس رفتار سے ایک بڑی اکثریت کو متاثر کرنے کا عمل کتنی مدت کا متقاضی ہوگا۔

موجودہ شکل میں جب کہ آپ سیکولر بنیادوں پر ایک پارٹی بنا چکے ہیں اور لوگوں کو پکار رہے ہیں تو اس کے معنی کیا ہیں؟ یہی نا کہ انسانیت کی نجات لادینی بنیاد پر ہے۔ انسانیت کی فلاح سیکولرزم میں ہے۔ اسلام کا نام لینا تک آپ کو گوارا نہیں ہے۔ اسلام اور مسلمانیت کی کوئی علامت تک اس میں نہیں پائی جاتی تو پھر آخر اسلام کا اور اس پارٹی کا کیا تعلق ہے؟ اور کیا نسبت ہے؟ ایک لادینی اور غیر اسلامی پارٹی کے لئے مہم چلانا اور اسلام کے نام پر جو وسائل آپ جمع کر رہے ہیں جو تعاون آپ کو حاصل ہو رہا ہے اسے ایک غیر اسلامی پارٹی کے لئے خرچ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ یہ سراسر گمراہی کے ساتھ ناسمجھی ہے اور خسارہ ہے میری نظر میں اس طرح کی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی پارٹی نے اپنے سابقہ نظریات سے ہٹ کر کوئی نئی پارٹی بنائی ہو اور دونوں کے نظریات ایک دوسرے کی ضد ہوں اور دونوں پارٹیوں کو بیک وقت چلا رہی ہو۔

کمیونسٹوں نے بھی کبھی حالات کے دباؤ میں ایسا نہیں کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پر کوئی پارٹی بنائی ہو۔ بعض دوسری پارٹیوں نے اپنی کوئی نئی پارٹی بنائی تو ہے لیکن انھوں نے اپنے نظریات کو نہیں چھوڑا اور نہ کسی دوسرے نظریات کی بنیاد پر کوئی پارٹی بنائی بلکہ اگر کوئی پارٹی بنائی بھی تو صرف اس لئے کہ ان کے سابقہ نظریات کو فروغ حاصل ہو اور ان کے نظریات کے مطابق کام میں تعاون حاصل ہو جیسے ہندتو نظریات کی حامل RSS

نے بی جے پی کے نام سے ایک پارٹی بنائی۔ ماضی میں اس کے دوسرے بھی نام رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے نظریات کو نہیں چھوڑا۔ مجھے معلوم نہیں کہ عرب ممالک میں جو اسلامی تحریکات تھیں انھوں نے حالات کے دباؤ کے تحت جو الگ پارٹیاں بنائی ہیں تو انھوں نے کیا کیا؟ لیکن میں بہر حال اس کی امید تو نہیں لگا سکتا کہ انہوں نے غیر اسلامی بنیادوں پر کوئی پارٹی یا کوئی فورم بنائے ہوں۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی مثال ہوگی کہ ایک اسلامی نظریہ رکھنے والی جماعت غیر اسلامی نظریہ پر دوسری پارٹی بنائے اور یہ دعویٰ کرے کہ ہم اپنے اصل یعنی قرآن کے راستے پر ہیں اس کو چھوڑا نہیں ہے۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے۔

یہ نئی پارٹی کا بنانا ایک طرف تو بڑی خیانت اور ارتداد ہے تو دوسری طرف ایک بہت بڑا المیہ ہے وہ یہ کہ اس پارٹی کے قیام کے ذریعہ گویا جماعت اسلامی نے یہ اعلان کر دیا کہ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں دین وایمان اور کتاب وسنت کی بات کرنا یا تو غلط ہے یا کم از کم موجودہ زمانے میں یہ چلنے والی بات نہیں ہے۔

اس بات کا بھی اعتراف واعلان ہے کہ تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی دوسری جماعتوں نے جو حکمت عملی اپنائی تھی وہی صحیح اور درست تھی جماعت اسلامی نے ''ہر مسئلہ کا حل صرف اسلام میں ہے'' کا جو نعرہ لگایا تھا وہ غلط تھا یہ اس بات کا اظہار واعلان بھی ہے کہ ''جمعیت علماء'' اور مسلم لیگ نے ساٹھ سال پہلے جس مقام سے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ جماعت اسلامی ہند آج اسی مقام سے اپنا سفر شروع کرنے جارہی ہے۔ یہ المیہ اس لئے بھی ہے کہ برس ہابرس کے بعد ۱۹۴۱ء میں جس اسلامی تحریک کا آغاز ہوا تھا وہ گویا عملاً آج ختم ہوگئی ہے اور اس کے بعد ایک عرصہ تک کوئی فرد اور جماعت یہ ہمت نہیں کر سکے گا کہ اسلام کو ایک ہمہ گیر نظام کی حیثیت سے پیش کرنے کی جرأت کرے اس لئے کہ جماعت اسلامی کا حشر بطور مثال اس کے سامنے ہوگا کہ جماعت اسلامی کس طرح ناکام ہوئی اور کس طرح راہ سے ہٹ گئی۔

بہرصورت بہت سارے پہلو ہیں جس پر نئی پارٹی کے بارے میں ہم غور کر سکتے ہیں یقیناً یہ ایک ناکام تدبیر ہے اور ایک خسارہ کا راستہ ہے جس کو جماعت اسلامی نے اختیار کیا ہے اس میں اسلام اور مسلمانوں کا سراسر خسارہ اور نقصان ہے۔ اس میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ملک کے بیشتر حصوں میں دسیوں بیسیوں ارکان جماعت اور باشعور پڑھے لکھے لوگوں سے میں نے بات کی ہے اور ملاقات کی ہے۔

ممبئی میں، مدھیہ پردیش میں، دہلی میں، اعظم گڑھ جامعۃ الفلاح اور سرائے میر مدرسۃ الاصلاح میں بھی میں نے بات کی ہے یہاں جماعت کا ایک طبقہ کہتا ہے کہ ہم سے اس کا تعلق نہیں ہے ان کا صرف اتنا کہہ دینا

کافی نہیں ہے۔ ایسے حضرات جو اس نئی پارٹی کے سلسلہ میں موافقت نہیں رکھتے اور اس کو غلط سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے بچ نہیں سکتے۔

جماعت میں رہتے ہوئے، جماعت کی تائید کرتے ہوئے، جماعت کی رکنیت کو قبول کرتے ہوئے اور خاموشی اختیار کرکے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ وہ آج نہیں تو کل اس کی موافقت کریں گے۔ ہم نوائی کریں گے۔ جیسا کہ آج اس معاملہ کی موافقت میں ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جارہا ہے جو آج سے بیس برس پہلے ووٹ کے مخالف کیمپ میں پائے جاتے تھے آج وہ نئی پارٹی کے حق میں رائے عامہ ہموار کرتے نظر آرہے ہیں اور ہمنوائی کرتے جارہے ہیں لہٰذا آج جماعت کی نئی پارٹی سے اپنے کو الگ رکھنے والوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ وہ اپنی اس انفرادی برأت کے ذریعہ اللہ کے یہاں بچ نہیں سکتے ان کی بھی خدا کے یہاں سخت گرفت ہوگی۔

اللہ ہمیں ارتداد اور افراط وتفریط سے بچائے اور اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کرنے والا بنائے۔ آمین۔

(۲۰۱۱ء)

کرے غیر گر، بت کی پوجا تو کافر

قاسم رسول الیاس صاحب نے ماہ نامہ ''زندگی نو'' مارچ ۲۰۰۸ء میں الیکشن کے موضوع پر جو خامہ فرسائی فرمائی ہے وہ اس مفروضہ پر ہے کہ گویا عامۃ المسلمین الیکشن میں حصہ نہیں لے رہے ہیں جس کی بنا پر وہ مختلف قسم کے نقصانات اٹھا رہے ہیں اور دن بدن پسماندگی کے گڑھے میں گرتے جارہے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پوری مسلمان قوم الیکشن میں پورے جوش وخروش کے ساتھ ووٹ دیتی ہے بلکہ بسا اوقات ووٹنگ میں مسلمانوں کا فیصد دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ووٹ دیتے ہیں بلکہ جہاں کامیابی کا امکان نظر آتا ہے وہاں امیدواروں کی حیثیت سے کھڑے بھی ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بحث ومباحثہ کس کو مطمئن کرنے کے لئے کیا جارہا ہے؟ اور اس کا کیا مقصد ہے؟

پورے ملک میں جماعتِ اسلامی کے دس بیس ہزار لوگ الیکشن سے ماضی میں کنارہ کش رہے ہیں اگر وہ دس بیس ہزار لوگ ووٹ ڈالنے لگیں تو کیا انقلاب پیدا ہوجائے گا؟ اس اعتبار سے یہ بحث ایک لایعنی بحث ہے اس کے لایعنی ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے نہ لینے کا موضوع تقریباً چالیس سال جماعت کے اندر زیر بحث رہا ہے اور بیس سال پہلے ووٹ دینے کا فیصلہ بھی ہوچکا ہے۔ اب باقی کیا رہا جس پر بحث کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بحث کا نکتہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے کا جو فیصلہ جماعت نے کیا ہے کیا وہ شرعی حیثیت سے درست ہے یا نہیں؟ اس ضمن میں یہ عرض ہے کہ مولانا مودودیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ، مولانا سید حامد علیؒ، مولانا صدرالدین اصلاحیؒ اور سید عروج احمد قادریؒ وغیرہ نے جو لکھ دیا ہے وہ کافی ہے۔ اس کا ردا الیکشن کے حامیوں میں سے کوئی ندوی، اصلاحی، قادری اور عمری نے ابھی تک نہیں کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا رد نہیں کیا جاسکتا۔

چونکہ الیکشن کے خلاف جماعتی علماء کی تحریروں کا کتاب وسنت کی روشنی میں کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا اس

لئے قاسم رسول الیاس صاحب نے شریعت کی روشنی میں کوئی بات نہیں کہی۔ چنانچہ پوری تحریر میں کوئی آیت قرآنی انہوں نے پیش کی اور نہ کوئی حدیث۔ گویا بحث کے اصل موضوع سے انہوں نے اپنا دامن بچا لیا اور جو کچھ حوالہ دیا ہے وہ رودادِ شوریٰ کا ہے۔ ظاہر ہے شوریٰ کا فیصلہ کوئی شرعی دلیل نہیں بن سکتا۔ شوریٰ اپنے فیصلے کثرتِ رائے کی بنیاد پر کرتی ہے اور کثرتِ رائے کو کبھی بھی کوئی شرعی بنیاد نہیں مانا گیا ہے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ○ (الانعام:۱۱۶)

ترجمہ: اور اے محمدؐ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے ہیں اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ الیاس صاحب بھی الیکشن کے خلاف تھے لیکن بعد میں الیکشنی گروپ کے وکیل بن گئے۔ کم از کم موصوف اپنے اندر انقلابِ حال کی روداد اور اپنے فکری سفر کی داستان ہی بیان فرما دیتے تو بھی مسئلہ پر کچھ روشنی پڑتی۔

جماعت اسلامی کے نصب العین اقامتِ دین میں فرد کی تربیت، معاشرے کی تعمیر کے ساتھ ریاست کی تشکیل بھی شامل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''جہاں تک ریاست کی تشکیل کا تعلق ہے موجودہ مرحلے سے ہم واقف ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم کہاں کھڑے ہیں آخری منزل کا بھی ہمیں شعور و ادراک ہے یعنی یہ کہ ہمیں جانا کہاں ہے تاہم درمیانی اہداف واضح نہیں ہیں۔ ریاست کی تشکیل کا معاملہ کن کن مراحل سے ہو کر گزرے گا۔ ایک مرحلے کے بعد دوسرا مرحلہ کیسے آئے گا؟ اور کب آئے گا؟ اسے workout کرنے کی ضرورت ہے۔''

جناب کو اول و آخر معلوم ہے لیکن درمیانی اہداف موصوف پر واضح نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے اگر بالکل واضح نہیں ہیں تو کم سے کم اتنا واضح تو رہنا چاہیے تھا کہ جو کچھ کریں گے کتاب وسنت کے دائرے میں رہ کر کریں گے اور کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے جس سے اول و آخر کی معلومات بھی مشتبہ ہو جائیں۔ ایک لمحہ کے لئے بھی کفر و شرک اور کفر و شرک کے بطن سے پیدا شدہ نظریات کی تائید ہماری جانب سے نہ ہوگی۔ غیر اسلام کی دعوت کے لئے مہم نہیں چلائیں گے۔ کسی کافر، ملحد اور لادینیت پر ایمان رکھنے والے شخص کو قانون سازی کا اختیار نہ دیں گے۔ کمیونزم جس کی تردید میں تحریکی لٹریچر بھرا پڑا ہے اس کا جھنڈا گاڑنے میں معاون و مددگار نہیں بنیں گے۔ اللہ اور رسول پر ایمان نے اتنی فراست اور اسلامی تعلیمات اور نظریات کے لئے اتنی حمیت اور غیرت پیدا کر دی

ہوتی کہ کسی مصلحت اور مفاد دنیا کے لئے کوئی باطل نعرہ زبان پر نہ آتا جیسے کسی موقع پر دعوۂ ایمان کرنے والوں سے قرآن نے کہا تھا:

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (البقرۃ:۹۳)

ترجمہ: کہو اگر تم مومن ہو تو عجیب ایمان ہے جو ایسی بُری حرکات کا تمہیں حکم دیتا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ اقامتِ دین کا نہ اول معلوم نہ آخر، یا گر معلوم ہے تو اسے پس پشت ڈال دیا گیا اور محض سیاسی نعرہ کے طور پر اقامتِ دین کے الفاظ بولے جا رہے ہیں۔ ورنہ اقامتِ سیکولرزم اور اقامتِ کمیونزم کرتے ہوئے اور سیکولرزم اور کمیونزم کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھائے ہوئے نعرہ اقامتِ دین آپ لگا رہے ہیں آخر اس کا کیا مطلب ہے؟ یہی کام کانگریسی مسلمان کر رہے تھے تو چالیس سال پہلے اس کو ایمان کے منافی کہا جا رہا تھا اور جب خود وہی کام کرنے لگے تو وہ اقامت دین کا ایک مرحلہ بن گیا!

(۲۰۰۸ء)

اتحادِ اُمّت کی راہ میں رکاوٹیں

اتحادِ امت یا اتحاد بین المسلمین ایک ایسی مطلوب ومحمود چیز ہے جس کی محمودیت ،اہمیت اورعنداللہ اورعندالرسول اس کی مقبولیت کوثابت کرنے کے لئے آیات اوراحادیث سے دلائل پیش کرنے کی ایک مسلمان کے نزدیک بالکل ضرورت نہیں ہے ، ہر مسلمان خواہ خواندہ ہو یا ناخواندہ اس کی ضرورت اوراہمیت کوتسلیم کرتا ہے۔ بحث طلب اورغوروفکر کا متقاضی مسئلہ صرف یہ ہے کہ اتحاد کیسے ہوتا ہے اس کے وسائل کیا ہوسکتے ہیں اوروہ کیسے مہیا کئے جاسکتے ہیں رکاوٹ وموانع کیا ہیں اوروہ کیسے راہ سے ہٹائے جاسکتے ہیں؟؟

اس سلسلہ میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فی الحال اتحاد کی قوت کی کیا ضرورت ہے؟ کون سی مصیبت ہے جس کو دفع کرنے کے لئے مسلمانوں کومتحد ومجتمع ہونا ضروری ہے؟ اوروہ کون سے نقصانات اوراذیتیں ہیں کہ اگر مسلمان بکھرے رہے اورانتشار کی کیفیت ان پر طاری رہی تو نا قابل تلافی نقصان سے ان کا دوچار ہوجانا بالکل یقینی ہے؟ دوسرے لفظوں میں کس قوت سے مقابلہ کرنا ہے جس سے تنہا تنہا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا؟ جب تک مقابل کی قوت کا تعین نہ ہو اور جب تک خطرہ اورنقصان کی تصویر سامنے نہ پیش کردی جائے اس وقت تک چاہے نظری اورعقلی طور پر اتحاد کی اہمیت تسلیم کرلی جائے لیکن اتحاد کو ہم مسلمانوں کی صفوں میں عملاً نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ نامعلوم اورموہوم خطروں کے حوالہ سے اتحاد کی ضرورت کوخواہ کتنے ہی زوردار طریقہ سے بیان کیا جائے اورخواہ اس کی کتنی ہی تکرار کی جائے مقصد حاصل نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ لکھنے اور بولنے میں کوئی کمی نہیں اکثر وبیشتر خطابات بالخصوص بڑی شخصیتوں کے اورخاص خاص موقعوں پر یہ موضوع ضرور چھیڑا جاتا ہے اور جمعہ کے خطبوں میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے لیکن حاصل کچھ نہیں ہورہا ہے اس لئے کہ جو اصل چیز اتحاد پیدا کرنے والی ہے اس کو کوئی بھی سامنے نہیں لارہا ہے، مثلاً ہندوستان میں اصل خطرہ کیا ہے جو اتحاد کا متقاضی ہے اورجس کو اتحاد کے بغیر ٹالا نہیں جاسکتا؟ مسلمانوں کی کوئی تنظیم کوئی جمعیت اورکوئی شخصیت اس سوال کا جواب نہیں دیتی اگر

اس سوال کا جواب متعین طور سے سامنے آجائے تو اتحاد واتفاق کے لئے نہ زیادہ بولنے کی ضرورت ہوگی نہ زیادہ لکھنے کی۔ سامنے کی مثال ہے کہ عالمی طور پر ایک خطرہ داعش کا کھل کر سامنے آ گیا تو کس طرح غیر مسلم اقوام بھی اور مسلمان ممالک بھی متحد ومتفق ہو گئے۔ سب کو تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح سے اور کیونکر دنیا ایک پلیٹ فارم پر نظر آ رہی ہے اس کا راز یہی ہے کہ دنیا کو معلوم ہو گیا کہ یہ خطرہ ایسا ہے جس کو بغیر اتحاد اور اتفاق کے ٹالا نہیں جا سکتا ہے۔ اسی طرح چاہے عالمی سطح پر اتحاد ہم چاہتے ہیں یا ملکی پیمانے پر ہر دونوں صورتوں میں اس قوت یا اس خطرے کی نشاندہی کرنی چاہیے جس کا مقابلہ کرنے کے لئے ہم اتحاد بین المسلمین چاہتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اتحادِ امت ایک چیز ہے اور قومی یکجہتی اور پر امن بقائے باہم کی فضا پیدا کرنا ایک دوسری چیز ہے۔ اس ضمن میں ہمارا ذہن صاف ہونا چاہیے دونوں کا خلطِ مبحث نہیں ہونا چاہیے اور دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں اتحادِ امت کی جن بنیادوں پر تعمیر ہوتی ہے وہ الگ ہیں اور قومی یکجہتی کی تعمیر جن بنیادوں پر ہو سکتی ہے وہ الگ ہیں اتحاد امت کی تعمیر توحید، رسالت اور عقیدۂ آخرت پر ہوتی ہے اور قومی یکجہتی اور پر امن بقائے باہم کی تعمیر کا بہرصورت توحید اور آخرت سے کوئی تعلق نہیں۔

اتحادِ امت کی راہ میں تیسری چیز جو رکاوٹ ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ گئی ہے کہ صرف مسلمانوں کے اتحاد سے یعنی صرف مسلمانوں کے چاہنے سے ہندوستان میں کچھ ہونے والا نہیں ہے جب تک کہ اکثریت کے لوگوں کو ساتھ نہ لیا جائے۔ یہاں سے کچھ ایسی چیزوں کا دخل شروع ہو جاتا ہے جو اسلامی لحاظ سے نامناسب یا غلط ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں کسی معاملے میں اکثریت کے لوگوں کی شرکت ضروری قرار پائے گی وہاں اکثریت کے نظریات، خیالات، طور طریقہ اور رسم ورواج کا لحاظ کرنا ضروری ہو جائے گا۔ اس لئے کہ ایسا نہ کیا جائے تو اکثریت کے لوگ ساتھ رہ نہیں سکتے۔ اس کی ایک چھوٹی سی مثال یہ ہے کہ جب مسلم پرسنل لا کی نسبت سے دین بچاؤ مہم کا آغاز کرنا ہوا تو اسی کے ساتھ دستور بچاؤ کی بات شامل کر دی گئی جس کی پشت پر یہ خیال ہے کہ جب تک اکثریت کو شامل نہ کیا جائے گا اس وقت تک خالص مسلمانوں کے مہم چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن دستور بچاؤ کی بات کو جہاں اس مہم میں شامل کیا گیا وہیں اس مہم کی آدھی جان نکل گئی اور چاہے اس کے لئے منطقی اور سیاسی کتنی ہی دلیلیں دی جائیں مسلمان عام طور سے اس مہم کو عملاً دینی مہم نہیں سمجھ سکتے اور جہاں تک اکثریت کا معاملہ ہے چند لیڈروں کے سوا ان میں سے اس مہم سے قریب بہت کم ہی لوگ آئیں گے۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ الیکشنی سیاست امت میں اتحاد کبھی پیدا ہونے ہی نہیں دے گی عام طور سے سمجھا جاتا ہے

کہ امت میں تفرقہ اور اختلاف کا باعث مسلکی اور فقہی اختلافات ہیں اس سے بالکل انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے بڑھ کر انتشار اور اختلاف کا سبب الیکشنی سیاست ہے اور مسلمان جب تک اس میں شامل رہیں گے ان کے اندر اتحاد نہیں پیدا ہوسکتا۔ سرسٹھ سال گزر چکے بحیثیت امت الیکشنی سیاست کے ذریعہ مسلمانوں کو کچھ نہیں ملا سوائے انتشار اور اختلاف کے۔

یہ الگ بات ہے کہ کچھ فائدہ ہوا ہو یا کچھ افراد کو فائدہ ہوا ہو لیکن سڑسٹھ سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ امت کا کوئی بڑا مسئلہ اس سیاست کے ذریعہ حل نہیں ہوا۔ ویسے نقصاندہ چیزوں میں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اس موقع پر کوئی بھی شخص یہ سنتے ہی سوال کرتا ہے کہ تو مسلمان کیا کریں؟ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنانے یا ترک کرنے کے لئے کتنا تجربہ چاہیے سرسٹھ سال ایک پوری نسل کے ختم ہونے کی مدت ہے اور یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ الیکشنی سیاست کے ذریعہ نمائندگی کا جو مسئلہ ہے وہ دن بہ دن کم ہوتا جا رہا ہے۔ یعنی پارلیمنٹ میں مسلم نمائندے کم ہوتے جا رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی ممبر پارلیمنٹ مسلمانوں کے نمائندگی کرتا ہو۔ ہر ممبر اپنی پارٹی کا نمائندہ ہوتا ہے اور پارٹی کی پالیسی کے مطابق ہی وہ پارلیمنٹ میں بولتا ہے۔

پھر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ مسلمان ممبران پارلیمنٹ کبھی اس حیثیت میں نہیں رہے ہیں اور نہ رہیں گے کہ وہ کوئی چیز اپنے بل بوتے پر پاس کرا سکیں۔ محض زیادہ سے زیادہ کوئی مسلم ممبر کسی مسئلہ پر آواز اٹھا سکتا ہے رہا اس کو منوانے اور اس کے اثر انداز ہونے کا تو سوال ہی نہیں۔ رہی یہ بات کہ مسلمان کیا کریں تو تقریباً پون صدی ہو رہی ہے، الیکشن سے اور الیکشنی سیاست سے ہٹ کر ایک لمحہ کے لئے بھی سوچا نہیں گیا کہ اس کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ کسی مسلمان کے پارلیمنٹ میں جانے کا فائدہ کسی مسئلہ میں صرف آواز اٹھانا ہے۔ ہم کہتے ہیں مسلمانوں میں اگر اتحاد و اتفاق ہو اور یہ معلوم ہو کہ فلاں مسلمان لیڈر کی ایک آواز پر دس ہزار لوگ بیک وقت متحرک ہوسکتے ہیں، اور اس کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر سکتے ہیں تو ایسے مسلمان لیڈر کی آواز کسی بھی MLA اور MP سے بڑھ کر سنی جائے گی اور اس کی آواز کو بڑی سے بڑی قوت بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ لیکن الیکشنی سیاست کا یہ نقصان ہے کہ مسلمانوں میں ایسی شخصیت نہیں پیدا ہو پا رہی ہے جو مسلمانوں کی آواز بن سکے مختصر یہ کہ مسلمان جب تک الیکشنی سیاست سے وابستہ رہیں گے اتحاد و اتفاق کی نعمت سے محروم رہیں گے۔

(۲۰۱۴ء)

غلبۂ دین
منہج نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہر ذی حیات کی فطرت ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس کے جانداروں سے کشمکش کرتا ہے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کو اپنے تئیں کسی کا خوف نہ ہو۔ یہ کشمکش مختلف وجوہ سے ہوتی ہے جنگل کے حیوانات ہوں یا سمندر میں جینے والی مچھلیاں اور دیگر آبی جانور ہوں سب کے سب اپنی زندگی کے لئے مجبور ہیں کہ وہ کشمکش کریں۔

اسی طرح اقوام عالم پر نظر ڈالی جائے تو بھی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر قوم دوسروں سے کشمکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ صرف اپنی زندگی کو باقی رکھنے ہی کے لئے نہیں بلکہ دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے۔ لیکن مسلمان مسلسل غلامی میں رہنے کی وجہ سے ایسے پست ہو گئے ہیں کہ غلبہ کے لئے سوچنے اور کوشش کرنے کے لئے دلیل مانگتے ہیں جس کو علامہ اقبال نے یوں بیان کیا ہے:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

جہاں کسی نے غلبۂ دین کی بات کہی فوراً لوگ بالخصوص مذہبی خیال کے مسلمان اس کو سیاست اور بے دینی کی بات کہہ کر کان بند کر لیتے ہیں اور اس کو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے حالانکہ حدیث میں آیا ہے "الاسلام یعلو ولا یعلٰی"۔

مزید اللہ نے فرمایا:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (ال عمران:۱۳۹)

ترجمہ: دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ○ (التوبۃ:۳۳)

ترجمہ: وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پوری جنس دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی نا گوار ہو۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ غلبۂ دین کوشش کر کے حاصل کرنے کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ اللہ کا انعام ہوتا ہے۔ بہر صورت مسلمان ملت اپنے ذہنی انحطاط اور زوال کے آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ اس لئے ہم اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں جو غلبۂ دین کو اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں اور غلبۂ دین کے ضمن میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا منہج سمجھنا چاہتے ہیں۔

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے اس کے حدود اربع کو معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اس دور جدید میں حدود اربع کے بجائے حدودِ ستہ یا یہ کہا جائے کہ جہات ستہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ مثلاً کسی فلیٹ کے بیع وشرا کا معاملہ ہو تو جہاں یہ ضروری ہے کہ اس کے حدود اربع کی تعیین کی جائے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے نیچے اور اوپر کی تعیین بھی کی جائے۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ غلبۂ دین کے لئے کوشش میں نبی آخر الزماںؐ کے منہج کے جہات ستہ کی تعیین کریں۔

جہتِ اول: استقامت

کتاب وسنت اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا کہ "یٰۤاَیُّهَا الۡمُدَّثِّرُ" کی آیات کے نزول سے دعوت کا کام شروع ہوا تو وہ چاہے سراً ہو یا علانیۃً برابر جاری رہا۔ فترتِ وحی کا ثبوت تو ملتا ہے لیکن تسلسل دعوت کے ٹوٹنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور دعوت کا یہ کام پوری استقامت کے ساتھ جاری رہا۔

اس لئے کہ رب نے فرما دیا:

فَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَمَنۡ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطۡغَوۡا اِنَّهٗ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ○

(هود:۱۱۲)

ترجمہ: پس اے محمدؐ، تم، اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کرو جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا رب نگاہ رکھتا ہے۔

فَلِذٰلِكَ فَادۡعُ وَاسۡتَقِمۡ كَمَاۤ اُمِرۡتَ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ (الشوریٰ:۱۵)

ترجمہ: پس آپ لوگوں کو اسی طرف بلاتے رہیں اور جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے اس پر مضبوطی سے جم جائیں اور ان کی خواہشوں پر نہ چلیں۔

ان دونوں آیتوں میں صراحت کے ساتھ حکم دیا گیا کہ۔'' جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے اس پر ثابت قدم رہئے''۔ اور سرِ مو برابر بھی حکم کے خلاف نہ جایئے۔ پہلی آیت میں **لَا تَطْغَوْا** کی گویا دوسری آیت میں **وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ** سے تفسیر کر دی گئی اور ساتھ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ دیکھ رہا ہے تمہاری سرگرمیوں کو یعنی حکم کے خلاف کوئی بھی عمل ہوگا تو اللہ کی گرفت میں آ جاؤ گے۔

بظاہر اصل مخاطب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کیا گیا ہے، لیکن دونوں آیتوں میں پہلے صیغہ واحد استعمال کیا گیا اور آخر میں جمع مخاطب کا صیغہ استعمال ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ اصل میں مسلمانوں کو ہدایت دی جا رہی ہے اور پہلی آیت کے معاً بعد مزید تاکید کے لئے فرمایا:

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (ھود: ۱۱۳)

ترجمہ: اِن ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔

اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا ''**اِسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ**'' یعنی جیسا کہ آپ کو حکم دیا جمے رہیے ''استقامت'' کو بقول حضرت حسن دو ''لا'' سے گھیر دیا گیا ہے۔ ایک ''**لَا تَطْغَوْا**'' حد سے تجاوز نہ کرو اور دوسرے ''**لَا تَرْكَنُوْٓا**'' نہ جھکنا۔ اس طرح استقامت کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ غالباً اسی بنا پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''شیبتنی ھود'' سورہ ہود نے مجھے بوڑھا بنا دیا۔

زیر بحث آیت میں ظالموں سے مراد وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام اور اہل اسلام کی دشمنی میں مدہوش ہو رہے تھے۔ رات و دن جن سے مسلمانوں کی کشمکش برپا تھی وہ ہر قیمت پر اسلام کو نیچا دکھانے پر تلے ہوئے تھے۔ ان کی کشمکش اور مزاحمت کی غرض یہ تھی کہ اللہ کے رسول اپنے رویہ میں تھوڑی لچک پیدا کریں۔ اپنے موقف سے زیادہ نہیں تھوڑا تو ہٹیں ان سے محبت و مودت، ہمنوائی، ہم مشربی اور قدم سے قدم ملا کر چلنے کا سوال ہی کیا؟

حکم دیا گیا کہ ان ظالموں کی طرف ذرا جھکنا نہیں ورنہ انجام بہت برا ہوگا۔ اب موقع پر اسلوب کلام اور طرز تخاطب ایسا اختیار کیا گیا ہے جس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ جیسے ایک پٹرول سے بھری ٹنکی ہے اور دوسری طرف ایک چنگاری ہے۔ ان دونوں میں نسبت یہ ہے کہ چنگاری قریب گئی کہ پٹرول بھڑک اٹھے گا۔ ذرا دیر نہ لگے گی ٹھیک اسی طرح ان ظالموں کی طرف جھکاؤ ہوتے ہی دوزخ کی آگ لپیٹ میں لے لے گی۔
(لا اکراہ فی الدین: ص: ۱۹)

اس استقامت کا منظر سیرت میں دیکھا جا سکتا ہے جبکہ ترغیب وترہیب کے تمام حربے بے سود ثابت ہو چکے اور جادۂ حق سے ہٹانے کے لئے مشرکین مکہ نے سخت سے سخت مصیبتوں میں آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو ڈال کر دیکھ لیا کہ آپ ﷺ اپنی دعوت میں کوئی ادنی ترمیم کرنے پر راضی نہیں ہیں تو آپ ﷺ کے پاس جا کر درخواست کی کہ ''آپ کیا چاہتے ہیں کیا مال و دولت؟ اگر اس چیز کی خواہش ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار پیش کرنے کو ہم تیار ہیں کسی معزز گھرانے میں شادی؟ اگر اس کا ارمان ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے بھی تیار ہے کہ آپ کی یہ خواہش بھی پوری کی جائیگی۔

کیا قوم کی افسری وسرداری؟ اگر آپ اس کا شوق رکھتے ہیں تو ہم یہ جگہ بھی آپ کے لئے خالی کئے دیتے ہیں۔لیکن خدارا آپ اپنی اس دعوت کو بند کیجئے اور باپ دادا کے دین کو بدلنے کی کوشش نہ کیجئے۔ جب مشرکین کی اس طرح کی پیش کش اور ترغیب کو بھی آپ نے بالکل لائق التفات نہیں سمجھا تو حضرت ابوطالب کے ذریعہ سفارش کرائی چنانچہ حضرت ابوطالب نے جب دعوت سے باز رہنے کو کہا تو آپؐ نے فرمایا:

''چچا! خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی رکھ دیں اور کہیں کہ میں یہ کام چھوڑ دوں تو یہ ناممکن ہے یا تو یہ کام پورا ہوگا یا میری جان بھی اسی راہ میں کام آئے گی۔''

اگر ہم ان تمام حالات کا بغور جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہر موقع پر باطل پینترے بدلتا رہا۔کبھی استہزاء، کبھی تشدد، کبھی معاشی لالچ اور کبھی مصالحت کی کوشش مگر اس کے جواب میں آپ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ استقامت کے ساتھ اپنے کام پر ڈٹے رہے اور اپنے موقف پر قائم رہے۔

اس لئے کہ اگرچہ کہ دنیا میں کامیابی کے لئے ہر موقع پر حالات اور کوائف زمانہ کی دین اور عقل ہر لحاظ سے رعایت کرنا ایک ضروری چیز ہے لیکن دین میں اصل کامیابی آخرت کی ہے اس لئے دنیا کی کامیابیوں کو اکثر وبیشتر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ اس بات کو اہمیت نہیں دیتے یا اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتے وہ بسا اوقات دنیا کی کامیابی کے لئے راہِ استقامت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ایک عقل کہہ سکتی ہے کہ مشرکین کی جانب سے پیشکشوں کو بالکل ٹھکرا دینا کوئی دانش مندی نہیں تھی۔ان کی بنیاد پر بڑے بڑے کام کئے جا سکتے تھے اور اس موقع کو گنوانا حکمت کے خلاف تھا مگر اللہ تعالیٰ کو وہ کام پسند ہے جو شرک کی ہر آمیزش سے پاک ہو اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے عین مطابق ہو مثلاً کہا جا سکتا ہے بہت ساری نمازیں پڑھنے کے مقابلہ میں وہ دو رکعت مقصود ہے جو سنت کے مطابق ہے۔

جہتِ ثانیہ: دعوت الی اللہ

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○ (النحل: ۱۲۵)

ترجمہ: اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ، اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو تمہارا رب ہی زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور کون راہ راست پر ہے۔

اس آیت میں دعوت الی اللہ کا تین طریقہ بیان کیا گیا ہے، حکمت یعنی قرآن کے ذریعہ موعظہ حسنہ یعنی دل کو چھو لینے والی نصیحت کے ذریعہ اور جدال یعنی ایسی باتوں کے ذریعہ جن سے مخاطب کو لاجواب کر دیا جائے۔ بعض تفسیروں میں اس آیت کو حکم جہاد آنے سے پہلے کی بتایا گیا ہے۔ یہ وضاحت دو وجہ سے کی گئی ہے پہلی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ دعوت کو قبول نہیں کریں گے ان کو آخرت کی وعید سنائی گئی ہے۔ دنیوی انجام کا ذکر نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ مذکورہ تینوں طریقوں کے علاوہ دعوت کا ایک چوتھا طریقہ بھی ہے اور وہ ہے جہاد و قتال۔ جس کا ذکر اس آیت میں نہیں ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے آپ کو ذرا گہرائی میں جانا پڑے گا۔ آیت میں "سَبِيْلِ رَبِّ" کا لفظ آیا ہے جس سے مراد دین اسلام ہے۔

دینِ اسلام کیا ہے؟ اس سوال کا جواب کئی پہلوؤں سے دیا گیا ہے اور دیا جا سکتا ہے۔ ایک پہلو سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ اسلام نام ہے اللہ کی عبادت کرنے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے کا لیکن یہ جواب صحیح نہیں ہے کیوں کہ اگر اس جواب کو صحیح مان لیا جائے تو شرک کی گنجائش باقی رہتی ہے اس لئے کہ کوئی شخص اللہ کی عبادت کرتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کی بھی عبادت کرتا ہے تو اس کو غلط نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ اللہ کی عبادت تو کر رہا ہے اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کی کوئی آدمی اطاعت کرتا ہے اور ساتھ ہی گاندھی، نہرو، اوباما اور نواز شریف جیسے لوگوں کی بھی اطاعت کرتا ہے تو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ اس نے اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت چھوڑی نہیں ہے اور نہ اس کا انکار کیا ہے۔

اسلام کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ اسلام نام ہے اللہ کی عبادت کرنے اور غیر اللہ کی عبادت سے انکار کرنے کا اسی طرح اللہ اور رسول ﷺ کی اطاعت کرنے اور ان دونوں ہستیوں کے علاوہ ساری ذاتوں اور ہستیوں کی اطاعت چھوڑ دینے کا۔

اس طرح دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی دعوت اور دعوتی منہج کے چار اجزائے

ترکیبی ہیں۔ان میں سے ایک بھی چھوڑ دیا جائے تو نہ وہ دعوت الی اللہ ہوگی اور نہ وہ انبیائی منہج دعوت ہوگا۔

جہتِ ثالثہ: قتال، ہجرت

ان چاروں اجزاء پر دل سے یقین رکھنا اوران پر عمل پیرا ہونے کے ساتھ ساتھ بندگان خدا کواس "سَبِيْلِ رَبِّ" کی طرف دعوت دینا بھی مسلمان کے فرائض میں داخل ہے۔اس طرح آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ حکمت، موعظۂ حسنہ اور جدال کی طرح قتال بھی منہج نبی آخر الزماں ﷺ میں شامل ہے۔

غور کیجئے کہ دعوت الی اللہ کے چاروں اجزائے ترکیبی کوملحوظ رکھتے ہوئے دعوت دی جائے گی تو کشمکش اور تصادم ناگزیر ہے اور غلبۂ دین کی منزل تک پہنچنے کے لئے کوشش کرنا ایک اہم فریضہ ہوگا اور غلبۂ دین کا تصور زبردستی کی کوئی لائی چیز نہیں ہے بلکہ دعوت الی اللہ کا منطقی نتیجہ ہے۔اس لئے اللہ کے سوا سارے معبودوں کی عبادت کا خاتمہ اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علاوہ ساری ہستیوں، لیڈروں اور اولیاء کی اطاعت پر تیشہ چلانا غلبۂ دین کے بغیر ناممکن ہے اور ایسا نہیں ہوا ہے اور نہ یہ ہوسکتا ہے کہ سارے معبودانِ باطل اور ساری حکمراں ہستیاں برضا ورغبت اپنی جگہ چھوڑ دیں اس کے لئے کشمکش اور تصادم اور جہاد وقتال لازم ہے اس طرح دعوت و جہاد لازم وملزوم ہیں۔ چنانچہ جس طرح دعوت ایک فریضہ ہے اسی طرح جہاد وقتال کو بھی ایک فریضہ بتایا گیا ہے چنانچہ کتب علیکم القتال کہہ کر جنگ فرض کی گئی۔

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (الانفال:۳۹)

ترجمہ:ان کافروں سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین پورا کا پورا اللہ کے لیے ہوجائے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللّٰہ ...... (رواہ مسلم)

ترجمہ: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں جنگ کروں لوگوں سے یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کی گواہی دینے لگیں۔

اس آیت کے ضمن میں سید قطب شہیدؒ کے چند جملے ملاحظہ فرمایئے۔

"ھذا منھج الدعوۃ ودستور ھا مادام الامر فی دائرۃ الدعوۃ باللسان والجدل، فاما اذا وقع الاعتداء علی اھل الدعوۃ فان الموقف یتغیر۔" (فی ظلال القرآن)

ترجمہ: یہی دعوت کا طریقۂ کار اور اس کا دستور ہوگا جب تک کہ دعوت اسلامی کا دائرہ صرف لسانی دعوت اور بحث ومباحثہ تک محدود ہوگا لیکن اگر دست درازی اہل دعوت پر واقع ہوجائے (یعنی اگر مخالف دست درازی پر اتر آئے) تو پالیسی بدل جائیگی۔

اس موقع پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اسلام کے چاروں اجزائے ترکیبی سمیت جب دعوت دی جائے گی

تو وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج کے مطابق اور اس میں سے ایک جزء بھی چھوڑا جائے تو اس کو دعوت الی اللہ کہنا مشکل ہے۔ اس مسئلہ پر قرآن کی ایک اور آیت سے بھی روشنی پڑتی ہے۔

يَاۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (المائدۃ:۶۷)

ترجمہ: اے رسول! تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے، اسے لوگوں تک پہونچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے بچائے گا یقین رکھو اللہ کافروں کو راہ نہ دکھائے گا۔

اس آیت سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ کل دین کی تبلیغ اور دعوت دینا ہی دعوت الی اللہ ہے اگر دین کی کچھ باتوں کی دعوت دینا جیسا کہ عام طور سے ہو رہا ہے اچھا کام تو کہا جا سکتا ہے، لائقِ تحسین بھی ہو سکتا ہے لیکن اس پر مطلق دعوت الی اللہ کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔

آیت میں "مَاۤ اُنْزِلَ" کی تبلیغ کا حکم ہے۔ لفظ "مَا" میں عربیت کے لحاظ سے عموم پایا جاتا ہے اس لحاظ سے "مَاۤ اُنْزِلَ" پورے دین و شریعت کی مختصر تعبیر ہے۔ آیت کے الفاظ میں اس بات کی صراحت ہے کہ اگر "مَاۤ اُنْزِلَ" کی تبلیغ نہ کی جائے تو کارِ رسالت ناتمام رہے گا اس مقام پر دعوت کے ضمن میں ایک اور آیت پر ایک نظر ڈالنا مناسب ہوگا:

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ
(حم سجدہ:۳۳)

ترجمہ: اس شخص سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

اس آیت میں صرف ایک بات کی طرف ہم توجہ دلانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ دعوت اور عمل صالح کے ذکر کے ساتھ جو "اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ" کہنے کی بات آئی ہے وہ کیوں آئی ہے؟

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کے اسلامی ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت اسلامی اسٹیج سے دی جائے اور داعی گروہ کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے دی جائے۔

مشرک اور کافر اور سیکولر اسٹیج سے جو اسلام کی کچھ اچھی باتیں کی جائیں گی اس پر دعوت الی اللہ کا اطلاق نہیں ہوگا اور اس کو دعوت کے کاموں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

جہتِ رابعہ: صلح اور معاہدہ کو جواز کے دائرے میں رکھنا

جہاد وقتال کی فرضیت اور اہمیت کے مقام کو اس تناظر میں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ صلح کو جواز کے درجہ میں رکھا گیا ہے قرآن وسنت میں صلح اور معاہدے کو فرض اور واجب کہیں نہیں کہا گیا ہے۔ چنانچہ نبی ﷺ اور صحابہ کرام ؓ نے جو صلح اور معاہدہ کیا وہ سب مؤقت ہیں یعنی ایک خاص مدت کے لئے تھے۔ مستقل ناجنگ معاہدہ اور صلح کا کوئی ثبوت تاریخ اور سیرت میں نہیں ملتا اور نہ اصولاً اس کی گنجائش ہے اس لئے کہ اللہ کا دین غالب ہونے کے لئے آیا ہے، مستقل صلح اور معاہدہ سے اس نظریہ کی نفی ہوجاتی ہے۔ اس لئے منہج نبی ﷺ میں جنگ تو ثابت ہے لیکن ہمیشہ کے لئے صلح منہج نبی ﷺ کے خلاف ہے۔

اس موقع پر ایک بات اور قابل توجہ ہے وہ یہ کہ عام طور سے کہا جاتا ہے کہ ہم مکی دور میں ہیں اور اس بہانے مختلف عنوان سے صلح اور معاہدے کا ذکر ہوتا ہے اور صلح اور معاہدہ کے نام پر کئی ناروا چیزوں کو جواز کے دائرے میں داخل کیا جاتا ہے لیکن مکی دور میں اجتماعی طور سے مشرکین سے کسی صلح اور معاہدہ کا کوئی اتہ پتہ نہیں ہے۔ معاہدے مدنی دور میں ہوئے جبکہ مسلمانوں کی ایک حیثیت بن گئی تھی اور طاقت اور قوت کے اعتبار سے فریق مخالف کے مقابلے میں کھڑے ہوسکتے تھے۔ اس لئے کہ کمزور کا معاہدہ کرنا بے معنی چیز ہوتی ہے کمزور کو ہر صورت میں خواہ معاہدہ ہو یا نہ ہو طاقتور کے تابع ہوکر رہنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی موقع پر نبی ﷺ نے کسی سے بحیثیت امت مسلمہ کے سربراہ صلح کی درخواست نہیں کی۔ البتہ جب دوسروں کی جانب سے صلح کی خواہش کی گئی تو حسب موقع آپ نے قبول کیا اور رد بھی کر دیا۔

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ○ (سورۂ محمد: ۳۵)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو اور صلح کی درخواست نہ کرو تم ہی غالب رہنے والے ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے اور تمہارے اعمال کو وہ ہرگز ضائع نہ کرے گا۔

جہتِ خامسہ: فریق مخالف کی اطاعت ومحبت محرمات میں سے ہے

فریق مخالف یعنی کفار ومشرکین سے قلبی محبت ومودت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ (الممتحنۃ: ۱)

ترجمہ: اے لوگو جو ایمان لائے ہو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ.

(المجادلۃ:۲۲)

ترجمہ: تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے۔

اسی طرح ان کی اطاعت کی بھی از روئے قرآن کوئی گنجائش نہیں صراحت کے ساتھ کفار و منافقین کی اطاعت کی ممانعت ہے۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰىہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (الکہف:۲۸)

ترجمہ: کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اتَّقِ اللّٰہَ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا حَکِیْمًا

(الاحزاب:۱)

ترجمہ: اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کفار و منافقین کی اطاعت نہ کرو، حقیقت میں علیم اور حکیم تو اللہ ہی ہے۔

محبت اور اطاعت دور کی بات ہے، ان کی طرف ادنی سے جھکاؤ کو بھی عذابِ الٰہی کا باعث قرار دیا گیا جیسا کہ آیت گزری "لَا تَرْکَنُوْٓا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا"۔

ان مسلم حقائق اور قرآنی تصریحات کی روشنی میں یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ان کی ماتحتی کو قبول کر کے یا برضا و رغبت ان کے زیر سایہ رہ کر جو کام بھی دعوتِ حق اور غلبۂ دین کے نام سے کیا جائے گا اس کا مقام اللہ کے پاس کیا ہو گا۔

جہتِ سادسہ: بر و قسط:

نیکی اور بھلائی اور عدل و انصاف کرنا نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتا ہے چنانچہ کھلے ہوئے دشمنوں کے ساتھ عدل، نیکی اور انصاف کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ○ (المائدۃ:۸)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ کی خاطر حق پر قائم ہو جاؤ، راستی اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن

جاؤ، کسی قوم کی عداوت تمہیں خلاف عدل پر آمادہ نہ کردے، عدل کیا کرو جو پرہیز گاری کے زیادہ قریب ہے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

لَا یَنۡهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُقَاتِلُوۡكُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَلَمۡ یُخۡرِجُوۡكُمۡ مِّنۡ دِیَارِكُمۡ اَنۡ تَبَرُّوۡهُمۡ وَتُقۡسِطُوۡۤا اِلَیۡهِمۡ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ (الممتحنۃ:۸)

ترجمہ: جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک واحسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا، بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

(۲۰۱۲ء)

دعوت اور مسائل

دعوت وتبلیغ کے الفاظ مترادف ہیں۔ دعوت الی اللہ ایک مستقل فریضہ ہے جس کا حکم قرآن میں صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے۔ دعوت الی اللہ کے مفہوم میں جہاں اللہ کی عبادت واطاعت کی طرف بلانا ضروری ہے وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت سے روکا جائے۔ گویا مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے دعوت دینے کا حکم ہے۔ اس طرح اللہ کے بھیجے ہوئے دین اور شریعت کی پابندی کی تلقین کرنا، ترغیب دینا اور ابھارنا دعوت کے اجزاء ہیں۔ یہی بات تبلیغ میں بھی آتی ہے چنانچہ فرمایا گیا:

يَآأَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ　(المائدۃ:٦٧)

ترجمہ: اے پیغمبر! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔

اس آیت میں "مَا" کے عموم سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پورے دین اور پوری شریعت پر جیسے عمل کا حکم ہے ویسے ہی پورے دین اور شریعت کی تبلیغ بھی کرنی ہے اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو تبلیغ کا حق ادا نہیں ہوگا۔ اس آیت سے ایک دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی بقاء اور تحفظ کی ذمہ داری اللہ نے لے لی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ تبلیغ کا حق جب بھی ادا کیا جائے گا اللہ تبلیغ کرنے والوں کے تحفظ اور بقا کا مسئلہ حل کردے گا۔ بقا اور تحفظ کے مسئلے کیلئے مسلمانوں کو زیادہ فکرمند نہیں ہونا ہے ان کا کام تبلیغ کا حق ادا کرنا ہے۔

اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تبلیغ جب کی جائیگی تو شاید بقا اور تحفظ کا سوال بھی اٹھے گا اور مسلمانوں کے سر پر خطرے کی گھنٹی بجے گی۔ غالباً حکم تبلیغ کے ساتھ اس مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے خود اٹھایا ہے۔ دعوت وتبلیغ کا نام بہت لیا جاتا ہے اور اس کا چرچا بہت ہوتا ہے۔ لیکن دعوت وتبلیغ اپنی اصلی شکل میں کم نظر آتی ہے۔ جہاں تک

دعوت کے مثبت پہلو کا تعلق ہے اسکا حق تو کسی قدر ادا کیا جاتا ہے لیکن اس کے منفی پہلو سے کم تعرض کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ تو کہا جاتا ہے کہ تنہا اللہ کی عبادت کرو اور اطاعت کرو لیکن غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت سے روکنے کا عمل ناقص رہتا ہے اسی طرح یہ بات تو بڑی تفصیل کے ساتھ آتی ہے کہ "مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ" اتباع کرو لیکن "خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ" کی اتباع قطعاً نہ کرو اس کی ہمت کم کی جاتی ہے اسی طرح اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اللہ کے مخلص بندوں کی اتباع کرو کی تلقین تو خوب کی جاتی ہے لیکن شیطان کے ایجنٹوں اور شاگردوں کی اتباع سے کنارہ کشی اور طاغوت سے اجتناب کے حکم کے موضوع پر کم بولا اور کم لکھا جاتا ہے۔

دعوت اور تبلیغ سے متعلق ان پہلوؤں پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ دعوت و تبلیغ سے متعلق ایک پہلو پر اور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے موجودہ حالات میں مسائل کا ذکر بہت ہوتا ہے اور ان کے حل کی بہت باتیں ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں بہت تجاویز آتی رہتی ہیں اس میں ایک تجویز دین پسند طبقہ یہ پیش کرتا ہے کہ ہمارے تمام مسائل کا حل دعوت و تبلیغ ہے اس مسئلہ پر بھی ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دعوت و تبلیغ جیسا کہ ہم نے کہا ایک اہم فریضہ ہے جس کے ہم سب مسلمان پابند ہیں اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کیلئے اس حکم کی بجا آوری ضروری ہے۔ لیکن کیا اس حکم پر عمل اس لئے کیا جائے کہ اس سے ہمارے مسائل حل ہوں گے اور مسائل سے اس کے ذریعہ ہم چھٹکارا پا جائیں گے کیا یہ سوچنا اخلاص نیت کے مخالف نہیں ہے؟

کسی حکم کی تعمیل کرنا اس لئے ہونا چاہئے کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے اس کو انجام دینے سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی خوشنودی حاصل ہوگی جنت میں جگہ حاصل ہوگی اس کے علاوہ کوئی اور محرک ہو، کسی اور نیت سے عمل کرنا، کیا یہ صحیح ہے؟ مثلاً نماز کوئی اس لئے پڑھے کہ اس سے میری صحت اچھی ہوگی اور اس میں ایک پہلو ورزش کا شامل ہے تو کیا ایسا کرنا صحیح ہوگا؟ اسی طرح دعوت کو اس حیثیت سے پیش کرنا اور اس نقطۂ نظر سے اس کو عملی جامہ پہنانا کہ اس سے ہمارے مسائل حل ہوں گے۔ کیا صحیح ہوگا؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے جو بھی احکام ہیں ان میں نہیں معلوم کتنے فوائد اور منافع ہوتے ہیں لیکن بندے کو صرف دو پہلو پر نظر رکھنی چاہئے ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کا یہ حکم ہے۔ اور دوسرے یہ کہ اس سے اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی۔

دوسرے محرکات کے تحت اور دوسری نیتوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو بجالانا، اندیشہ ہے کہ وہ اعمال مقبول نہیں ہوں گے۔ اس پہلو سے ہم جب غور کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا جو کام بھی ہو رہا ہے اس میں اس اعتبار سے بھی نقص ہے، دعوت و تبلیغ کا کام بلاشبہ ہونا چاہئے وہ ایک فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر ہماری نجات اور کامیابی کا انحصار ہے چاہے ہمارے مسائل حل نہ ہوں اور ہم خطرات کے گھیرے میں

آ جائیں اور ہم اور ہماری جان و مال کو نقصان پہنچے بہرصورت یہ کام مسلمان کو کرنا ہے چنانچہ جب ہم دعوت وتبلیغ کی پوری تاریخ کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ دعوت وتبلیغ سے کبھی مسائل حل نہیں ہوئے ہیں بلکہ بہت سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں دعوت وتبلیغ کے کام سے۔

حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوتی سرگرمیوں کو دیکھئے کیا ان سے مسائل حل ہوئے یا ان سے مسائل میں اضافہ ہوا۔ انبیاء علیہم السلام نے جب جب دعوت وتبلیغ کا کام شروع کیا مسائل میں گھر گئے اور ان کی پوری قوم ان کے خلاف ہوگئی۔ ہر طرح سے لوگوں نے ان کو ایذاء پہنچانے اور دبانے، خاموش کرنے اور اپنے کام سے باز آجانے کیلئے دنیا بھر کی مشکلات اور مسائل میں انھیں پھنسایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اگر دعوت وتبلیغ سے رک جاتے اور خاموش بیٹھ جاتے تو قوم ان کو آگ میں نہیں ڈالتی اور ملک بدر نہیں کرتی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اگر دعوت وتبلیغ کا کام نہ کرتے تو فرعون اور اس کی قوم ان کے پیچھے نہ پڑتی۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوہِ صفا پر چڑھ کر بآواز بلند توحید اور آخرت کی بات نہ کرتے تو ابوجہل نہ بپھرتا اور کفار ومشرکین کے منشاء ومطالبہ کے تحت تبلیغ اور دعوت کی راہ میں جانفشانی کرتے تو پورے مکہ کے کھڑے کئے ہوئے مسائل سے محفوظ رہتے۔

الغرض تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ دعوت وتبلیغ سے کبھی مسئلے حل نہیں ہوئے ہیں۔ مشکلات کم نہیں ہوئی ہیں بلکہ مشکلات میں اضافہ ہی ہوا ہے اس کے باوجود اللہ کے نیک بندے دعوت وتبلیغ کا کام کرتے رہے اور ان گنت مسائل سے دوچار ہوتے رہے۔

(۲۰۱۳ء)

موجودہ حالات میں
اُمّتِ مسلمہ کی ذمہ داری

عالم اسلام کا حال

ہندوستان میں امت مسلمہ سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے عالم اسلام کے حالات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔آج پوری دنیا میں جو مسئلہ سب سے زیادہ نمایاں اور قابل توجہ بنا ہوا ہے وہ مسلمان پناہ گزینوں کا ہے۔لاکھوں کی تعداد میں مختلف مما لک سے مسلمان اپنی آبادیوں سے نکل کر بھاگ رہے ہیں۔شام،عراق، لیبیا،یمن اور برما سے لوگ نکل رہے ہیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔کئی مما لک نے ان کے لئے اپنے دروازے بند رکھے ہیں۔کئی لوگ سمندر میں غرق ہوگئے ہیں۔یورپ کے مما لک نے ان کے لئے اپنے دروازے کھولے ہیں لیکن ان کی طرف سے پناہ دینا مسلمانوں کے ایمان اور اسلام کے لئے اندیشہ ہے کہ خطرہ بنے گا۔اس لئے ان کا پناہ دینا جہاں خطرہ اس لئے ہے کہ ان بے بس اور مجبور لوگوں کے لئے سہارا بننا اچھا کام ہے وہیں ان کی یہ غرض بھی پوشیدہ ہے کہ اس طرح سے کئی مسلمان عیسائیت کو قبول کرلیں گے۔اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں کی جان اور جسم کی حفاظت کیلئے کچھ شکل پیدا ہوئی ہے لیکن ان کے ایمان اور اسلام کیلئے خطرات اور اندیشے بڑھ گئے ہیں۔جس کی ذمہ داری سے مسلمان بچ نہیں سکتے۔اسلئے کہ انگلیوں پر گنے جانے کے لائق مسلم مما لک ہیں اور انہوں نے بھی مسلمانوں کیلئے اپنے دروازے بند رکھے ہیں۔دوسری طرف خود مسلمانوں ہی کے بعض لوگ وجہ اور سبب ہیں ان کے اپنے گھروں سے نکلنے کیلئے اور جائے پناہ کی تلاش کرنے کیلئے۔یہ مقام عبرت ہے کہ مسلمان ہی ایک دوسرے کو اجاڑ رہے ہیں اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کررہے ہیں!ایسی صورتحال میں ہندوستانی مسلمانوں کا حال تشویشناک ہورہا ہے تو کیا تعجب کی بات ہے؟

ہندوستانی مسلمانوں کا حال

ہندوستانی مسلمانوں کی حالت جو آج دگرگوں ہوگئی ہے وہ یکا یک نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے خلاف تقریباً سوسال سے ایک تحریک چلائی جارہی ہے اور یہ ثابت کیا جارہا ہے کہ ان کو ہندوستان میں رہنے کا حق نہیں ہے اگران کو ہندوستان میں رہنا ہے تو وہ ہندو بن کر رہیں۔ تقسیم ہند نے اس نظریہ کو مزید تقویت پہنچائی کہ مسلمانوں نے اپنا ایک ملک بنالیا ہے تو پھر ہندوستان میں ان کا کیا رہ گیا؟ چنانچہ یہ نعرہ بھی سنا گیا کہ......

''مسلمانوں کے دو اِستھان۔ پاکستان یا قبرستان''

اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے ہندوستان میں سو پچاس نہیں، سو دو سو نہیں ہزاروں فرقہ وارانہ فسادات کئے گئے اور کرائے گئے۔ جن میں مسلمانوں کی ہزاروں جانیں ضائع ہوئیں اور بے شمار جائیدادیں اور املاک کی تباہی ہوئی۔ اس طرح کی کوششیں شاید ایک عرصہ سے کچھ کم ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ فسادات کروانے والوں کو مایوسی ہوئی ہے اور اس سے ان کی توقع پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ اس نظریہ کو مودی حکومت آنے کے بعد بہت قوت اور حوصلہ ملا ہے۔ چنانچہ گھر واپسی کے پروگرام کا بڑے وسیع پیمانے پر چرچا کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی ذبیحہ بالخصوص گائے کے ذبیحہ پر پابندی لگانا بھی ہے عدالت کا رجحان بھی بدلتا ہوا نظر آرہا ہے حتی کہ ممبئی ہائی کورٹ نے عیدالاضحیٰ پر محض تین دن کے لئے ذبیحہ پر سے امتناع ہٹانے کی درخواست کو مسترد کردیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اذان دینے پر جزوی پابندی لگا کر مسلمانوں کو گویا عادی بنایا جارہا ہے۔ بظاہر یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اور چھوٹی چھوٹی باتیں نظر آتی ہیں، لیکن ان کے پیچھے ایک مستحکم نظریہ اور منصوبہ ہے۔ اس لئے اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے وجدان کہتا ہے کہ دیر سویر مستقبل میں ایک وقت آئے گا جب مسلمانوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لئے ویسی ہی مہم زور پکڑ جائے گی جیسے اسپین سے سینکڑوں سال حکومت کرنے کے بعد بھی مسلمانوں کا صفایا کردیا گیا تھا۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ سابق میں اس کی مثال اسپین میں گزر چکی ہے۔ اور مشرق وسطیٰ میں حالیہ دنوں میں لاکھوں مسلمانوں کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور ہوجانا ایک ممکن واقعہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد کا ہونا ایسا ہونے کیلئے کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے۔ ذہن میں لائیے کہ اگر اکثریت، پولیس اور قانون تینوں ہم خیال ہوجائیں تو چھوٹے چھوٹے دیہاتوں کا سوال ہی کیا ہے! بڑے بڑے شہروں کی آبادیوں کو چند گھنٹوں کے الٹی میٹم پر ان کے گھروں سے نکالا جاسکتا ہے۔ اس طرح آپ دیکھیں تو پچھلی تاریخ اور موجودہ دنیا کی صورتحال اور عقل یہ تینوں چیزیں اس اندیشہ اور خطرہ کو یقینی بتاتے ہیں۔ مساجد اور مدارس کا قدیم سلسلہ، مسلم تنظیموں، جماعتوں

اور خانقاہوں کا شاندار نظام کوئی رکاوٹ نہیں بن سکیں گے۔سب کے سب زمین بوس ہوجائیں گے اورقوی اندیشہ ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ہندوستان میں وہی دھمکی دی جائے گی جو گزری ہوئی تاریخ میں اہل ایمان کو دی گئی تھی، یعنی یا تو ہندو بن جاؤ یا ملک سے نکل جاؤ۔اگر تم نہیں نکلو گے تو ہم نکال دیں گے۔قرآن کہتا ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ یٰشُعَیْبُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْیَتِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِیْنَ○ قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا وَمَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ○ وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَیْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ○

(الاعراف:۸۸-۹۰)

ترجمہ: اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے، اس سے کہا کہ اے شعیبؑ، ہم تجھے اور اُن لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا شعیبؑ نے جواب دیا: کیا زبردستی ہمیں پھیرا جائے گا خواہ ہم راضی نہ ہوں؟ ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں الا یہ کہ ہمارا رب ہی ایسا چاہے ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے، اُسی پر ہم نے اعتماد کرلیا اے رب! ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔اس کی قوم کے سرداروں نے، جو اس کی بات ماننے سے انکار کر چکے تھے، آپس میں کہا: اگر تم نے شعیب کی پیروی قبول کرلی تو برباد ہوجاؤ گے۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَاۤ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِیْ مِلَّتِنَا فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ (ابراھیم:۱۴،۱۳)

ترجمہ: آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ یا تو تمہیں ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا ورنہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے تب اُن کے رب نے اُن پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کردیں گے، اور

اُن کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے یہ انعام ہے اُس کا جو میرے حضور جواب دہی کا خوف رکھتا ہو اور میری وعید سے ڈرتا ہو۔

اوپر ہم نے دو مقام کی آیات نقل کی ہیں جن پر غور کرنے سے مندرجہ ذیل چند باتیں معلوم ہوتی ہیں پہلی بات یہ کہ اہل ایمان سے ایمان چھوڑنے کا مطالبہ کفار ومشرکین کی طرف سے کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے، بلکہ ایسا مطالبہ بارہا ہوا ہے۔ البتہ ہندوستان میں اس مطالبہ کا آغاز ہورہا ہے جو اندیشہ ہے کہ آئندہ چند برسوں میں شدت پکڑے گا۔

دوسری بات یہ معلوم ہورہی ہے کہ اصل وجہ ایمان اور اسلام سے وابستگی ہے جیسا کہ سابق میں ایمان اور اسلام اس مطالبہ کی وجہ بنے تھے۔ اگرچیکہ آج ہم مسلمانوں کا ایمان اور اسلام سے تعلق بہت بہتر نہیں ہے۔لیکن جو کچھ بھی ہے وہی اہل باطل کو گوارا نہیں ہے اور ہمارے اس کمزور رشتے کو بھی وہ ختم کردینا چاہتے ہیں۔ یہ بعض لوگوں کی ناسمجھی ہے کہ وہ اس کی وجہ غلط فہمی کو بتارہے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ اہل وطن کے ذہنوں سے اسلام کے بارے میں جو غلط فہمی ہے اس کو نکال دیں۔ اور وہ اس خوش فہمی کا شکار ہیں کہ جب غلط فہمی دور ہوگی تو حالات معمول پر آجائیں گے اور اس کے لئے وہ غلط اور غیر معقول طریقے اپناتے ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کے تہواروں کے موقع پر آنا جانا، تحفے دینا، عید ملاپ کے پروگراموں میں بلانا، افطار پارٹیوں میں انہیں دعوت دینا، اپنے جلسوں اور دینی پروگراموں میں ان کو بلا کر اسٹیج پر بٹھانا اور اعزاز اور تکریم کا ان کے ساتھ برتاؤ کرنا۔ جبکہ بدعتی اور کافر کی تکریم اور تمجید کے لئے دین میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

صریح لفظوں میں اس سے منع کیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس تسلسل کو لوگ نہیں دیکھتے کہ ہر دور میں اہل شرک اور اہل کفر نے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے؟ اور ایمان اور اسلام کے خلاف کہاں تک گئے؟ انبیاء علیہم السلام کفار ومشرکین کی غلط فہمیوں کو دور نہیں کرسکے جبکہ ان کے اخلاق واطوار ہمارے تصور سے زیادہ اعلیٰ اور افضل تھے تو ہم اور آپ ان کی غلط فہمیوں کو کہاں اور کیسے دور کرسکتے ہیں! اس لئے قرآن نے آگاہ کردیا ہے تم ان کو راضی اور خوش کرنے کی کوشش مت کرو۔ وہ تم سے راضی نہیں ہوسکتے۔ چنانچہ قرآن نے کہا:

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲۰)

ترجمہ: یہودی اور عیسائی تم سے ہرگز راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کے طریقے پر نہ چلنے لگو۔

یہ تو یہود ونصاریٰ اہل کتاب کے بارے میں بتایا گیا ہے مشرکین تو ان سے بھی زیادہ اشد ہیں۔ ان کو کہاں کچھ کیا جاسکتا ہے؟ اور ان کی غلط فہمیاں کہاں دور کی جاسکتی ہیں؟ اتنی صراحت کے ساتھ جو آگاہی دی گئی ہے،

نہیں معلوم اس آگاہی سے دین پسند لوگ کیسے گریز کر رہے ہیں! اور اپنی دینی محفلوں میں ایسے لوگوں کو بلاتے ہیں جو کفر کے شعائر کے ساتھ آتے ہیں! ان خوشامد پسند لوگوں کی حد ہوگئی ہے کہ پولیس کے عہدیداروں کو بعض وقت عیدین کے مجمع میں نماز گاہ میں بلاتے ہیں!

دوسرے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں جو صورتحال ہے اس کے پیچھے تاریخی عوامل ہیں۔ ان کا اشارہ تقسیم ہند کی طرف ہوتا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ کسی صورتحال کے لئے جہاں بہت سے عوامل ہوں وہاں کچھ تاریخی عوامل بھی ہو سکتے ہیں لیکن ان بعض عوامل کو اصل نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اور سوچا جائے تو ان تاریخی عوامل کی بنیاد بھی اصل میں کسی نہ کسی قدر اور کسی نہ کسی شکل میں حق و باطل پر ہی ہوتی ہے، اس لئے تاریخی عوامل کو تسلیم کرتے ہوئے بھی حقیقی عامل کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اوپر کی آیات سے تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل کفر کی اس دھمکی سے اہل اسلام پسپا نہیں ہوئے بلکہ ایمان پر ڈٹے رہے اور اللہ کی طرف رجوع ہوئے اور اپنے موقف سے ذرا بھی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ انہوں نے کسی بھی شکل میں مصالحت نہیں کی۔ اور نہ کسی بھی شکل میں کمزوری اور پسپائی کا مظاہرہ کیا اور نہ تملق اور چاپلوسی ظاہر کی کہ سامنے والے ہم سے خوش ہو جائیں۔

چوتھی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اہل ایمان اور اہل کفر کے درمیان کشمکش کا یہ مرحلہ نہایت ہی اہم اور فیصلہ کن ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ جتنا سخت اہل ایمان کے لئے ہے اس سے کہیں زیادہ تشویشناک اہل کفر کے لئے ہے۔ اہل کفر کے لئے تباہ اور نیست و نابود ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کے لئے باقی رہ جانے اور اسی سرزمین پر سکونت پذیر ہونے کی خوشخبری ہے۔ بشرطیکہ اہل ایمان ثابت قدم رہیں۔

یہی شرط "ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ" میں بتائی گئی ہے۔ یہ پہلو مسلمانانِ ہند کے لئے بہت خوش کن ہے۔ اگر چہ حالات کا تجزیہ فی الحال یہ نہیں بتاتا، مگر حالات کو بدلنا کوئی ناممکن اور مشکل نہیں ہے۔ اللہ کی قدرت میں سب کچھ ممکن ہے۔ قرآن گویا صراحت سے کہتا ہے کہ اس مرحلہ کے بعد اہل کفر اور اہل شرک کے لئے یہ سلامت رہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

اس پہلو کو ہندوستان میں ہندو اکثریت کے سامنے بھی موقع سے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر تم ہم کو بے دخل کرو گے تو اس کے بعد اس کی کوئی گیارنٹی نہیں ہے کہ تم سلامتی کے ساتھ رہو گے۔ تم پر بھی آفت آ سکتی ہے۔ اس لئے کہ تم سے زیادہ طاقت اور قوت رکھنے والے اور تم سے بہتر پوزیشن میں رہنے والے بھی اس زمین پر نیست و نابود ہوئے ہیں۔ اور کب کیا ہوگا؟ اور کس کے لئے کب خوشحالی اور سکون میسر ہوگا؟ اور کس کے حق میں تباہی اور بربادی آئے گی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا۔

حال ہی میں اگر افغانستان سے ناکام ہوکر امریکہ جیسی سوپر پاور طاقت بھاگ سکتی ہے تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ کوئی چیز ناممکن نہیں ہے تم اپنی حد میں رہو اور اپنی حد سے تجاوز نہ کرو یاد رکھو تم پر ایک دفعہ لگ چکی ہے کہ تم اللہ کی مسجد کو منہدم کر کے قرآن کی وعید کے مستحق قرار پا چکے ہو، قرآن نے صاف صاف کہہ دیا جو اللہ کی مسجد کی تخریب کے مجرم ہوں ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے اور آخرت میں شدید عذاب ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (البقرۃ:۱۱۴)

ترجمہ: اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو؟ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں ان کے لیے تو دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

حق و باطل کی اس کشمکش کی پوری تاریخ میں یہ تو ملتا ہے کہ اہل حق قتل کر دیئے گئے۔ آرے سے چیر دیئے گئے اور ایمان بچانے کے لئے غار میں چھپ گئے۔ وطن سے نکل گئے۔ گھر بار اور اپنے اعزہ اور اقربا کو چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ چلے گئے لیکن تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ اہل حق نے ایمان کو چھوڑ دیا ہو، یا ان کے اندر ایمان کے معاملے میں تھوڑی لچک، نرمی، مداہنت اور لو اور دو کی بنیاد پر کوئی مصالحت والی کیفیت پیدا ہو گئی ہو۔ گویا بے بسی اور لاچاری کی حالت میں اہل ایمان نے اپنے دشمنوں کا مقابلہ عزیمت اور استقامت سے کیا ہے۔ چنانچہ ہماری اوپر پیش کردہ آیات پر غور کیا جائے اور آیات سے پوچھا جائے کہ مشرکین کے چیلنج کے بعد اہل ایمان نے کیا طریقہ اختیار کیا؟ کیا انہوں نے کوئی مصالحت کی راہ ڈھونڈی، کوئی تاویل کر کے ان کے کھینچے ہوئے دائرہ میں قدم رکھ دیا اور بچ گئے۔ یا دنیا میں خطرات سے بچنے کے لئے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جو اہل دنیا کرتے ہیں؟

تو قرآن کا جواب یہی ہوگا کہ اہل ایمان نے استقامت کی راہ اپنائی اور بقیہ سب کچھ اللہ کے حوالے کر دیا۔ دیکھئے اس کے علاوہ ہماری پیش کردہ آیات کے علاوہ بھی کسی دوسرے مقام پر قرآن میں استقامت کے سوا کوئی تدبیر نظر نہیں آتی اور نہ بتائی گئی ہے۔ استقامت نام ہے اپنے موقف پر ڈٹے رہنے اور اذیتیں اور خطرات کو برداشت کرنے کا۔ اس استقامت کا ثبوت جب اہل ایمان دیتے ہیں تو اللہ کی طرف سے حق کے لئے راہ کھول دینے کا فیصلہ ہوتا ہے خواہ اہل حق ختم ہو جائیں اور اہل حق نہ رہیں لیکن اہل باطل ختم کر دیئے جاتے ہیں

اور حق کیلئے آئندہ مستقل راہ کھل جاتی ہے اور قرآن میں اہل حق کی راہ کب کب اور کہاں کہاں کھلی اس کی تفصیل تو ہمیں نہیں ملتی لیکن اس کا دوسرا پہلو قرآن کے بیان سے صاف جھلکتا ہے۔ یعنی اہل باطل کی شوکت اور سطوت کی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہ جاتے کہ حق کے مقابلہ میں دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں۔

اس کی دو شہادتیں ہمارے سامنے ہیں ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون اور اس کی قوم کا ہے کہ آخری مرحلہ کے بعد اللہ نے ان کو نیست و نابود کر دیا اور پھر کبھی تاریخ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کے مقابلے میں کھڑے نظر نہیں آئے۔

دوسری مثال ہمارے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے کہ جب اہل ایمان نے استقامت کا مکمل طریقہ سے عملی ثبوت فراہم کر دیا تو اللہ نے ان کے لئے راہ کھول دی اور اس راہ کا آغاز ہجرت سے ہوا اور انجام فتح مکہ پر ہوا اس راہ کے کھلنے میں اہل حق کا کوئی بظاہر عمل دخل نہیں ہوتا جو کچھ ہوا اللہ کی طرف سے معجزاتی طور پر ہوا۔ دیکھئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے وقت کیسے بچ نکلے جبکہ حالات کی روشنی میں اس کا امکان کسی طرح سے نہ سمجھ میں آتا ہے، نہ نظر آتا ہے۔ اسی طرح تین روز غار ثور میں محفوظ رہنا اور دشمنوں سے بچ جانا یہ بھی یقیناً ایک معجزہ ہی ہے۔

پھر غار ثور سے نکلنے کے بعد سراقہ بن جعشم کی گرفت سے محفوظ رہنا بھی ایک معجزہ ہے معلوم ہوا کہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے اہل حق کا کام صرف راہ حق پر استقامت کا مظاہرہ کرنا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سو سالہ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے اہل باطل کا مقابلہ استقامت اور عزیمت کے بجائے رخصت، مصالحت اور مداہنت سے کیا ہے۔ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے سے زیادہ انھیں قومی یکجہتی، سیکولرزم، گنگا جمنی تہذیب کی حفاظت کی فکر رہی ہے۔ میرا اشارہ ان مسلمانوں کی طرف نہیں ہے جو بعض علاقوں میں اپنے گھروں میں مورتیاں رکھتے ہیں۔

اسی طرح عباس نقوی جیسے لوگوں کی بات بھی میں نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں علماء، مفتیوں، دانشوروں اور اچھے مسلمانوں کی بات کر رہا ہوں۔ کفر و شرک کے نئے ناموں کمیونزم، سوشلزم کی طرح ایک نام سیکولرزم بھی ہے جس کی جو بھی تعریف کریں وہ اسلام نہیں ہو سکتا۔ اسلام نہیں تو کفر و شرک کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ مگر اس کو سب نے قبول ہی نہیں کیا بلکہ اس کی حفاظت کے سو جتن بھی کئے ہیں۔ اور اسی کو اپنی پناہ گاہ مانا ہے۔ اس کے لئے کئی لوگوں نے اپنے بھائی بندوں اور کلمہ گو افراد کے خلاف لڑائی کے لئے آمادگی کا اظہار کیا ہے، اور لڑائی لڑی ہے۔ سیکولرزم یعنی کفر کے شعار، جھنڈے اپنے اداروں اور دفتروں کے سامنے لہرانے کے لئے دس دلیلیں پیش کی ہیں اور اسی میں

اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

دیکھیے حال ہی میں گائے کی قربانی پر امتناع کو علماء نے حق بجانب قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ''اسلام میں کسی کی دل آزاری منع ہے'' گویا وہ "لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ، وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ" کو بھول گئے، اور اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو غیر اللہ کی رضا اور حکم پر حرام ٹھہرالیا۔ گویا ہم اللہ اور اس کی شریعت کے تابع نہیں ہیں، کفار و مشرکین کے حکم اور مرضی کے تابع ہیں۔ گائے کی قربانی سے رکنا علماء کی پسپائی ہے۔ اور رکنے کے لئے دلیل دینے کا مطلب ہے کہ حکومت اور اکثریت کی مرضی کے تابع ہیں اور یہ کہ ہر پسپائی کے لئے ان کے پاس دلیل پہلے سے موجود رہے گی۔ کہا جا رہا ہے ''قربانی دوسرے جانور کی بھی ہوسکتی ہے'' اصل میں سوال قربانی ہوجانے یا نہ ہونے کا نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ قربانی کس کی مرضی کے تابع ہو رہی ہے اور آپ کس کی مرضی کے تابع ہو کر فتویٰ دے رہے ہیں۔ گائے کی قربانی سے رکنے کے عمل میں کس کی مرضی کا لحاظ کیا ہے؟ اللہ کی یا غیر اللہ کی؟ شریعت کی یا غیر شریعت کی؟

قربانی اور ذبیحہ گائے کا مسئلہ کشمیر میں اٹھا تھا وہاں سے جو خبریں آئیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کے لوگوں نے اپنے موقف پر جمے رہنے اور مزاحمت کرنے میں ہندوستانی مسلمانوں کے مقابلہ میں زیادہ ہمت اور پامردی کا مظاہرہ کیا ہے حتی کہ خواتین بھی جیل گئی ہیں حوصلہ سے کام کیا ہے۔

اس کے قبل بابری مسجد کے سلسلہ میں مسلمانان ہند بالخصوص ان کے بڑے لوگ بغیر کسی مزاحمت کرے یا کسی آزمائشی دور سے گزرے اپنے موقف سے ہٹ گئے۔ انہوں نے اپنے موقف کا اس طرح اعلان کیا تھا کہ مسجد در و دیوار کا نام نہیں ہے مسجد جگہ کا نام ہے ایک بار مسجد جہاں بن گئی وہ قیامت تک مسجد رہے گی اور وہ زمین سے آسمان تک مسجد رہے گی اس کی اس حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا تمام مسلمان بھی مل کر اس کی حیثیت میں تبدیلی نہیں لا سکتے مگر اندیشوں کے پیش نظر اعلان کر دیا کہ عدالت کا جو بھی فیصلہ ہوگا ہم تسلیم کرلیں گے، یہاں تک کہ جو لوگ عدالت میں جانا گناہ سمجھتے تھے وہ اسی اعلان میں پیش پیش تھے۔

سوال یہ ہے کہ ایک شرعی معاملہ میں آخری فیصلہ کرنے کا حق عدالت کو کس نے دیا جس مسئلہ میں جملہ مسلمانوں کو کچھ کرنے کا مجاز نہیں مانا گیا تھا اس میں طاغوتی عدالت کو ہم نے حکم کیسے مان لیا۔ جس ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے وہ جو چاہے کرے گا لیکن اس معاملہ میں عدالت کو حکم مان کر گناہ میں کیوں شریک ہوں۔ مسجد منہدم کردی گئی اس کی جگہ بت خانہ بنا دیا گیا، مسلمانوں نے کیوں شرکت کی بت خانہ بنانے میں۔ عدالت چاہے جو فیصلہ کرے یہ آئندہ کی بات ہے لیکن مسلمان عدالت کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کے اعلان کے ساتھ ہی

بت خانہ بنانے میں شریک ہوگئے اور مسجد سے دستبرداری مکمل ہوگئی اور مسجد منہدم کرنے والوں کے ساتھ جرم میں شرکت ثابت ہوگئی۔خدا کے نزدیک یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم بے بس تھے کہ دل اور زبان تو تمہارے ہی اختیار میں تھے دل سے مان لیا اور زبان سے کیسے اعلان کیا۔

ابھی چند دن پہلے سوریہ نمسکار اور یوگا کا مسئلہ سامنے آیا اور مسلم پرسنل لا بورڈ نے اس بارے میں کھلا اعلان کیا کہ اس میں شرکت کرنا شرک ہے۔کوئی مسلمان چاہے جو کچھ ہوجائے اس میں شریک نہیں ہوسکتا اور اس کو تسلیم کر لینا گویا اپنی آئندہ نسل کو دریائے شرک میں ڈبو دینا ہے اپنے اس موقف کا اعلان کی حد تک ایک اچھا مظاہرہ تھا لیکن اعلان کے آگے کوئی اقدام نہیں کیا گیا حالانکہ جہاں کفر وشرک یا ایمان واسلام کا سوال آجائے وہاں بغیر کسی تحفظ ذہنی کے کھل کر آگے آنا چاہیے اور کسی مصالحت اور مداہنت کی کیفیت پیدا نہیں ہونے دینا چاہیے۔لیکن پہلے مرحلہ میں ہوا یہ کہ ایک کمزور سی کمیٹی بنا کر مولانا ولی رحمانی صاحب کے ذمہ مسئلہ کو حوالے کر دیا گیا اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے اہم لوگ اور اہم عناصر نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور خاموش سے ہوگئے ادھر ولی رحمانی صاحب نے ادھر ادھر دو ایک جلسے کئے اور اس کے بعد بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نروس ہو کر کے گوشۂ عافیت میں بیٹھ گئے ہیں۔دو ایک جلسے جو کئے گئے وہ بھی بے جان تھے آئندہ کے کسی اقدام اور پروگرام کا کوئی ذکر نہیں آیا اور کسی طرح کے جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔زیادہ سے زیادہ جو بات کہی گئی وہ یہ ہے کہ آئندہ ہم بڑا جلسہ کریں گے۔کسی جلوس، ریالی، اور اپنی بات کو زوردار بنانے کے لئے جو پروگرام کئے جاتے ہیں ان میں سے کسی کا ذکر تک نہیں آیا اور کہیں اشارے سے بھی یہ نہیں کہا گیا کہ ہم اپنی بات کو منوانے اور زوردار بنانے کے لئے لاٹھی ڈنڈا کھائیں گے۔جیلوں کو بھر دیں گے اور اپنے موقف سے ذرا بھی نہ ہٹیں گے اور یہ بھی نہیں کہا گیا کہ ہم گھر گھر جائیں گے اور مسلمانوں سے کہیں گے کہ ایسی تمام ملازمتوں کو ترک کردو جہاں سوریہ نمسکار اور یوگا کرنے پر مجبور کیا جارہا ہو اور سرپرست اور والدین سے گزارش کریں گے کہ اپنے بچوں کو ایسے اسکول کالج اور اداروں سے نکال لو جہاں پر سوریہ نمسکار اور یوگا سے بچنا ممکن نہیں ہے۔

یہ تو بہت دور کی بات ہے کہ کہا جاتا کہ جہاں جہاں سوریہ نمسکار اور یوگا ہورہا ہے وہاں وہاں ہم اداروں اور اسکولوں کے خلاف مظاہرے کریں گے اس طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان پہلے ہی مرحلہ اور پہلے ہی قدم پر اپنے موقف سے قدم ہی نہیں نظروں کو بھی پھیر لیا ہے اور شرک کی ساری قباحت ان کے اذہان سے نکل چکی ہے اور تو اور تشویش کی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے آرگن ماہنامہ ''زندگی نو'' میں بعض لوگوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ ''پہلے اور آج کے زمانے میں بہت فرق واقع ہوگیا ہے۔

بھارت کے تکثیری سماج کے اندر یہ بات سننے میں تو بہت بھلی لگتی ہے کہ دعوت راست انداز میں دینی چاہیےلیکن بھارت کے حالات دعوت کے اس طریقۂ کار کا نہیں بلکہ کسی اور طریقۂ کار کا تقاضہ کرتے ہیں‘‘۔

مزید ارشاد ہوتا ہے کہ ’’ہم ابتدائی مرحلہ میں اگر مخاطبین کے عقائد اور دیوی دیوتاؤں کو تنقید کا نشانہ بنائیں گے بلکہ نظریاتی بت شکنی کریں گے تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کے پیغام سے اور زیادہ متنفر اور بیزار ہو جائیں گے بلکہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اس سے مزید فسادات رونما ہوں گے‘‘۔

اس طرح سے عملی بت شکنی کا مظاہرہ کرنے کی حوصلہ افزائی کرنا تو دور کی بات ہے نظریاتی طور پر بت شکنی کرنے کی بات کرنی بھی اندیشوں کی نذر ہوتے ہوئے نظــــر آرہی ہے۔

یہ ایک نمونہ ہے اس بات کا کہ خطرات اور اندیشے اور راہ کی مشکلات کس طرح لوگوں کو نظریہ اور عقیدہ کے دائرہ میں بھی اپنا قبلہ بدلنے کے لئے آمادہ کرتی ہیں۔

(۲۰۱۵ء)

شریعت میں تبدیلی کا سنگین مسئلہ

مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی یا ترمیم موجودہ حکومت کرنے جارہی ہے یعنی شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تبدیلی کرنے کی موجودہ حکومت نے ٹھان لی ہے۔ حالات کا رخ بتا تا ہے کہ صورتحال بڑی سنگین ہونے والی ہے۔ یہ ایک دینی مصیبت ہے جس کے ذریعہ مسلمانانِ ہند آزمائے جارہے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد بے شمار دنیاوی مصیبتیں مسلمانوں پر آچکی ہیں جن میں جانی اور مالی نقصان ہوا ہے، سینکڑوں اور ہزاروں فسادات ہوئے جن میں ہزاروں اور لاکھوں جانیں گئیں اور بلا حد وحساب مال اور جائیداد ضائع ہوئے لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی جانب سے دینی مصائب کا سلسلہ شروع ہورہا ہے؛ اس ضمن میں ہم دو چیزوں کو شامل کر سکتے ہیں۔

ایک ہے ذبیحہ، اور دوسرے ہے مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کا مسئلہ۔ ذبیحہ کا معاملہ کوئی چھوٹا معاملہ نہیں ہے۔ ذبیحہ پر پابندی اور پھر اس کو مسلمانوں کا تسلیم کر لینا یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلمان حرام وحلال کرنے کا اختیار اور حق اللہ کے علاوہ دوسروں کے لئے تسلیم کر رہا ہے۔ ہم کھا سکتے ہیں وہی چیز جس کی اجازت طاغوت وقت دے۔ ہم عبادت کے طور پر قربانی اسی جانور کی کر سکتے ہیں جس کی منظوری حکومت نے دی ہو اور جس جانور کے ذبیحہ کو وقت کا قانون محترم ٹھہرائے اس کو ہم نہ کھا سکتے ہیں اور نہ قربانی کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے دین میں کمی ہے۔ بعض اذہان میں یہ بات ہے کہ گائے کا گوشت کھانا اور گائے کی قربانی کرنا اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضروری نہیں قرار دیا ہے۔ ہم دوسری چیزیں کھا سکتے ہیں اور دوسرے جانوروں کی قربانی کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں کس کی مرضی چل رہی ہے؟ اور کس کے حکم اور خواہشات کا لحاظ کیا جارہا ہے؟ قرآن میں کہا گیا۔

وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ وَاحْذَرْھُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (المائدۃ:۴۹)

ترجمہ: اور یہ کہ ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اُتارا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ

کرو اور ان سے ہوشیار رہو کہ مبادا وہ تمہیں اس چیز کی کسی بات سے پھسلا دیں جو اللہ نے تمہاری طرف اُتاری ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (المائدۃ:۷۷)

ترجمہ: کہہ دو اے اہل کتاب! اپنے دین میں بے جا غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی اھواء کی پیروی نہ کرو جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو راہ راست سے بھٹک گئے۔

سوال یہ ہے کہ ذبیحہ گاؤ پر پابندی کو قبول کر لینا کیا یہ کفار و مشرکین کی اھواء اور خواہشات کی اتباع نہیں ہے؟ ہمارے ملکی قانون کی بنیاد اللہ کے باغیوں اور نافرمانوں کی اھواء اور خواہشات کے علاوہ کس چیز پر ہے؟ اور حرام و حلال کا معیار اللہ کی ہدایت اور حکم کے علاوہ جس چیز کو بھی قرار دیا جائے گا وہ اھواء پرستی اور خواہش نفس کی پیروی کے علاوہ کیا ہوگا!؟ اللہ اور رسول ﷺ کی بنائی ہوئی شریعت سے کیا یہ انحراف نہیں ہے؟ مسلمانوں نے ذبیحہ گاؤ پر پابندی کو بغیر کسی ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار کئے قبول کر لیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کی پابندیوں کو قبول کر لینا عقیدۂ توحید کے سراسر منافی ہے اور یہ قبولیت دیکھا جائے تو سراسر دباؤ کی بنیاد پر ہے۔ کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر نہیں ہے۔ ہاں اضطرار کا نام اس موقع پر لیا جا سکتا ہے لیکن اضطرار اور مجبوری کا سہارا ہم کہاں تک لیں گے؟

دوسری مصیبت شریعت محمدی ﷺ میں تبدیلی اور ترمیم کی شکل میں آ رہی ہے۔ کہنے کے لئے تو ہر مسلمان چاہے وہ کسی طبقے کا ہو کہتا ہے کہ شریعت محمدی ﷺ ہماری جان سے زیادہ عزیز ہے اور ہم ہر نقصان برداشت کر لیں گے لیکن اپنی شریعت میں کسی تبدیلی کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ لیکن حکومت وقت کے خلاف کہاں تک جا سکتے ہیں؟ اس سوال پر غور کیا جائے۔

پچھلے کئی مسائل میں مسلمانوں کا جو رویہ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان سوائے چند اجتماعات اور جلسوں کے ذریعہ اپنی ناگواری کا اظہار کرنے کے سواء کچھ نہیں کرے گا۔ قانون اور جمہوری اصولوں کے خلاف کچھ کرنا تو دور کی بات ہے دستور، قانون اور جمہوریت کے دائرہ میں اپنی ناگواری، غصہ اور نفرت کا اظہار کرنے کی جو گنجائش ہے وہ بھی نہیں کرے گا۔ اس لئے کہ مسلمانوں کے بعض سوچنے سمجھنے والے لوگ، علماء و مشائخ نظری اعتبار سے حکومت وقت کے خلاف کچھ کرنا جائز نہیں سمجھتے۔ اس ضمن میں تقسیم سے پہلے برٹش دور حکومت کے علماء اور آج کے علماء میں زمین و آسمان کا فرق ہے آج ضرورت اور حاجت اور نفع و نقصان کی بنیاد پر فیصلہ

کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے اور جانفشانی، ایثار و قربانی، اور برداشت کرنے کا حوصلہ بتدریج کم ہوتا جا رہا ہے آرام طلبی، سہولت پسندی اور حیلوں اور بہانوں کے ذریعہ شرعی اعتبار سے ناگوار اور مکروہات کو برداشت کرنے کا رجحان عام ہوتا جا رہا ہے اور کسی چیز کو جائز اور ناجائز قرار دینے کے سلسلے میں عوام الناس کا مفاد، ان کی سہولت اور راحت کو پیش نظر رکھنا سب سے بڑا اصول بن گیا ہے۔

بہر صورت حالات بتاتے ہیں کہ مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی بھر پور کوشش کی جائے گی اور مسلمانوں کے لئے آخر میں سپر ڈال دینے، جھک جانے، سر تسلیم خم کر دینے اور آہ کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ جائے گا۔ حالات کے تجزیہ میں یہ بات سامنے آ رہی ہے۔

اللہ کرے اس کے خلاف ہو اور مسلمان پوری پامردی کا اس آزمائش میں مظاہرہ کریں اور مسلم پرسنل لاء پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

یہ سوال کہ حکومت مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کرنے کے درپہ کیوں ہے؟

اس سوال کے جواب میں تین باتیں کہی جا سکتی ہیں...

پہلی بات یہ کہ موجودہ حکومت آر ایس ایس کی تھیوری کو لے کر چل رہی ہے اور آر ایس ایس کی تھیوری میں یہ بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ ہندوستان ہندوؤں کے لئے ہے۔ اس لئے ہندوستان کو ہندو راشٹر بنایا جانا چاہئے اور اس ملک میں سیکولرزم کے بجائے ہندوازم کا راج ہونا چاہئے اس لئے دوسرے نظریات اور مذاہب کو ہندوازم کے تابع ہو کر کے رہنا پڑے گا۔ خاص طور سے ان کے نزدیک اسلام ایک بڑا کھٹکنے والا کانٹا ہے۔

دوسری قوموں کے رسوم و رواج اور ہندوؤں کے طور طریقوں میں زیادہ فرق نہیں ہے اور دوسرا کسی مذہب کا ماننے والا ہندو طور طریقے اور رنگ روپ میں شامل ہو کر ہندو نہیں تو ہندو نما بن کر کے رہ سکتا ہے اور اس کے مذہب میں ہندوازم کے خلاف کوئی ٹھوس بات نظری حیثیت سے نہیں پائی جاتی۔ لیکن اسلام میں شرک اور بت پرستی ایسی ممنوع چیز ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان بھی اس کے قریب نہیں جا سکتا۔ قریب جانا تو دور کی بات ہے اس سے مشابہت اختیار کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہے ایسی صورت میں بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ آر ایس ایس اور ہندومت پر ایقان رکھنے والے اسلام اور مسلمانوں کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟

چنانچہ پچھلے تقریباً ستر سال سے اس رخ پر کام ہو رہا ہے اور بڑی پابندی اور مستعدی کے ساتھ آر ایس ایس کے نظریے پر منظم طریقے پر محنت کی جا رہی ہے۔ بہت انتظار کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہوئی ہے اس لئے ان کو اس سلسلہ میں بڑی جلدی ہے وقت گزرتا جا رہا ہے اور ان کا احساس بڑھتا

جارہا ہے کہ ہماری معیاد کا آدھا وقت نکل گیا اور ہم اپنا کچھ کام نہیں کر سکے۔ اس لئے مسلمانوں کو اپنی خوش فہمی اور سیکولرزم پر بھروسہ چھوڑ دینا چاہئے اور یہ مان کر چلنا چاہئے کہ بی جے پی حکومت مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کرنے کی راہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھے گی۔ اِلاَّ یہ کہ قدرت کی جانب سے ایسے حالات پیدا کر دیئے جائیں کہ ان کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے۔

دوسری بات اس سوال کے جواب میں کہ حکومت کو جلدی کیا پڑی ہے؟ یہ کہی جاسکتی ہے کہ بی جے پی حکومت کو رام مندر بنانی ہے اس لئے کہ اگر وہ رام مندر بنا لیتے ہیں تو ملک کی اکثریت کے سامنے یہ بات کھلے طور پر آجائے گی کہ بی جے پی نے الیکشن میں جو وعدے کئے تھے وہ بڑی حد تک پورے کر دیئے، بہت سارے وعدے پورے کرنے کے لئے بہت کچھ اس کو کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ رام مندر کی تعمیر کا آغاز کرنے سے پہلے ٹرائیل کے طور پر مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے اور خاص طور سے طلاق ثلاثہ کی بات نمایاں کی جارہی ہے کہ مسلمانوں میں حکومت سے ٹکر لینے اور حکومت کی راہ میں آڑے آنے کا کتنا دم خم ہے اس کا اندازہ لگا لیا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اس معاملہ میں بی جے پی کامیاب ہو جاتی ہے تو گویا اس کے سامنے راہ کھل جائے گی کہ اب ہمارے کاموں میں کہیں سے رکاوٹ پیدا ہونے والی نہیں ہے۔

تیسری بات جو کہی جاسکتی ہے یا کہی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ بی جے پی کے سامنے ایک بہت بڑی مہم اتر پردیش کا الیکشن ہے کہ اتر پردیش کے الیکشن میں وہ کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر اس کے مقابلے میں کوئی آواز اٹھانے کی ہمت نہیں کرے گا اس لئے کہ اتر پردیش سب سے بڑی ریاست ہے اور لوگوں کے تجزیے اور خیال کے مطابق ہندوستان پر حکومت کرنے والے دراصل اتر پردیش کے لوگ ہی ہوتے ہیں اس لئے کہ پارلیمنٹ میں انہی کی اکثریت ہوتی ہے۔ بی جے پی حکومت مسلم پرسنل لاء کا نام لے کر اور اس پر ایک بڑا حملہ کر کے ہندو مسلم دونوں کو برانگیختہ کر دینا چاہتی ہے اور ان کے درمیان ایک نمایاں خلیج بنا دینا چاہتی ہے اس طور سے کہ مسلمان جس قدر بی جے پی سے نفرت کریں گے اور بی جے پی کے خلاف آواز اٹھائیں گے اسی قدر ہندوؤں میں بھی اشتعال پیدا ہوگا اور ان کے اندر بی جے پی کی تائید اور حمایت کے لئے جوش پیدا ہوگا اور حالات ایسے بن جائیں گے کہ بی جے پی کی مخالفت ہندو دھرم اور ہندو قوم کی مخالفت کے ہم معنی ہو جائے گی۔

اس موقع پر یہ بات بھی واضح رہنی چاہئے کہ جو لوگ بی جے پی حکومت کے اقدام کو محض ایک الیکشنی حربہ سمجھتے ہیں اور یہ بات کہہ کر اس صورتحال کو کم اہمیت دیتے ہیں اور وقتی سمجھتے ہیں ان کی یہ سوچ ایک بڑی بھول ہے بہرصورت بی جے پی کے ذہن اور منصوبے میں جو بات بھی ہو مسلمانوں کے حال اور مستقبل کے لئے بڑی ہی

بھیانک صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔

اصل وجہ اور موجودہ صورتحال کا پس منظر کیا ہے اور اس کے اسباب وعلل کیا ہیں؟

اس کے تعلق سے ہم نے اوپر جو کچھ کہا ہے وہ مادی نقطۂ نظر سے کہا ہے اور جن عوامل کو ظاہری اعتبار سے لوگ حالات کے بننے بگڑنے میں مؤثر مانتے ہیں۔لیکن حالات میں جو زیر وزبر پیدا ہوتا ہے اس کے پیچھے کچھ مخفی اور روحانی عوامل بھی ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن وہ کام کرتے ہیں۔عام طور پر ان عوامل کی طرف ذہن نہیں جاتا اور ظاہر بین نگاہیں ان کو کچھ اہمیت نہیں دیتیں لیکن ظاہری اور مادی عوامل کے مقابلے میں وہ زیادہ مؤثر علت اور سبب ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قوموں کے اور تہذیبوں کے عروج وزوال پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ ہر قوم اور ہر تہذیب زوال پذیر ہونا اسی وقت شروع ہوتی ہے جب کہ وہ بام عروج پر پہنچی ہوتی ہے۔ اس کے عروج وزوال کے درمیان خط کھینچنا دنیا کے دانشوروں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ایک کمزور قوم اور تہذیب ایک وقت میں کچھ نہیں ہوتی اور پھر دیکھتے دیکھتے ستاروں سے آگے پہنچی ہوئی نظر آتی ہے اور ایک قوم اور تہذیب بام عروج پر پہنچ جاتی ہے حالات اس کے موافق ہوتے ہیں وسائل اور ذرائع کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں ہوتی اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر انحطاط اور زوال کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے وہ وقت آجاتا ہے کہ گرتی ہوئی دیوار کے مانند اس کو سنبھالنا اور اپنی حالت پر قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے اور لاکھ تدبیریں کی جائیں سب بے سود ہو جاتی ہیں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور تاریخ میں ایسا بار بار ہوتا ہے اس کے اسباب کیا ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حالات کے پیچھے مخفی اور روحانی عوامل اپنا کام کرتے ہیں جن کو ظاہری نگاہیں نہیں دیکھتیں۔انہی عوامل کی طرف ایک ہلکا اشارہ سورۂ روم کی آیت ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ میں کیا گیا ہے یعنی زمین میں جو بگاڑ،فساد،خلفشار،بدامنی،بے چینی پھیلی ہوئی ہے اس کی اصل وجہ اور سبب کوئی نمرود،کوئی فرعون،کوئی ابوجہل اور کوئی ابولہب نہیں ہے بلکہ اصل وجہ لوگوں کے کرتوت اور اعمال ہیں۔اسی طرح ہمیں سمجھنا چاہئے کہ آج ہم جس آزمائش میں پڑے ہیں اس کی اصل وجہ اور سبب کوئی پارٹی،کوئی شخصیت نہیں ہے بلکہ اصل وجہ ہمارے کرتوت ہیں۔ بدکردار پارٹیوں اور ظالم شخصیتوں کی شکل میں ہمارے اعمال اور افعال ہمارے سامنے ہیں۔بعض بزرگوں کے سلسلہ میں آتا ہے کہ جب وہ کسی دینی مصیبت میں پھنستے تو یہ سوچتے کہ مجھ سے کیا گناہ ہوا ہے جس کی وجہ سے مجھ پہ مصیبت ہے مثلاً کوئی نماز قضاء ہوگئی تو سوچتے مجھ سے کیا خطا ہوئی کہ یہ مصیبت آئی ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ بتاتی ہے کہ جیسے جیسے ان کی بداعمالیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ویسے ویسے ان پر تنگیاں

اور شرعی احکام پر عمل کرنے میں دشواریاں پیدا ہوتی گئیں۔ آج ہمیں سمجھنا چاہئے شریعت پر عمل کی راہ میں جو دشواری سامنے آرہی ہے اس کیلئے صرف آر ایس ایس اور بی جے پی ذمہ دار نہیں ہے ہم خود بھی ذمہ دار ہیں۔ ہمیں دنیاوی تدبیریں کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا چاہئے اور شریعت پر عمل کرنے میں کوتاہی کرنے سے بچنا چاہئے۔

ہماری کوتاہی اور بدعملی کی کوئی انتہا نہیں ہے دیکھئے۔۔۔جس مسلم پرسنل لاء کو خطرہ میں دیکھ کر آج تشویش میں مبتلا ہیں وہ پوری شریعت کا دس فیصد حصہ ہے اور بلا مبالغہ 90 فیصد حصہ شریعت کا ہم بھول چکے ہیں۔ 70 سال کے عرصہ میں 90 فیصد شریعت چھوٹ جانے پر ہمارے اندر کسی طرح کی بے چینی کا کہیں سے اظہار ہوا ہے؟ گویا شریعت محمدیہ ﷺ کے ایک بڑے حصہ کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا کوئی بڑا نقصان ہماری نظر میں نہیں ہے۔

دوسرے موضوعات پر تنظیمیں انجمنیں، اکیڈیمیاں بنتی رہی ہیں لیکن اس موضوع پر کہ پوری شریعت پر مسلمان عمل پیرا ہوں، مکمل شریعت کا نفاذ ہو، جس کو نظام اسلامی، نظام مصطفی، حکومت الٰہیہ اور اقامت دین جیسے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کوئی انجمن، کوئی تنظیم، کوئی اکیڈیمی وجود میں نہیں آئی بلکہ پوری دنیا میں جو رجحان پیدا ہو رہا ہے وہ یہ کہ فقہ الاقلیات مدون کی جائے اور اس پر عمل ہو رہا ہے۔ فقہ الاقلیات کا تخیل پیدا ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کیلئے محکوم اور مغلوب بن کر رہیں گے اور ہمارے ساتھ ساتھ اللہ کا دین بھی مغلوب رہے گا بلکہ دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ جہاں کہیں سے پوری شریعت کے نفاذ کا خیال پیدا ہوتا ہے اس کو اس طرح سے دبا دیا جاتا ہے گویا وہ ایک بڑی بدعت کا آغاز ہو رہا ہے۔ انحطاط جب کہیں بھی شروع ہوتا ہے تو وہ رکتا نہیں۔ مسلم پرسنل لاء کے محفوظ رہنے پر ہمارا صبر کرنا یہ انحطاط کا ہی ایک دور تھا۔ زمانے کے حالات اور خود ہمارے حالات جس رخ پر جا رہے ہیں ہمارا انحطاط اور آگے بڑھے گا اور ہم نیچے جائیں گے اور دس فیصد شریعت کا حصہ بھی ہمیں چھوڑنا پڑے گا۔

ہمارا دینی فریضہ

اس مرحلہ میں ہمارے لئے لازم ہے اور ہمارا دینی فریضہ ہے کہ ہم مزید نیچے جانے سے رک جائیں اور بچی کھچی شریعت جس کو مسلم پرسنل لاء کہا جاتا ہے اس کو باقی رکھنے کیلئے ہر طرح کی قربانی دینے کیلئے تیار ہو جائیں اور مصائب اور مشکلات سے خوفزدہ نہ ہوں ساتھ ہی ہم آئندہ تحفظ شریعت ہی نہیں نفاذ شریعت کی بات کریں۔ آگے بڑھنے کا شعور ہمارے اندر پیدا نہیں ہوگا تو ہم پیچھے جائیں گے اور نیچے جائیں گے اور موجودہ حالات اور

موجودہ سطح پر دینی حیثیت سے باقی رہنا ممکن نہیں ہوگا۔ کسی گروہ کسی قوم کا ایک سطح پر باقی رہنا عام قدرت کے قانون کے خلاف ہے یا تو کوئی قوم، گروہ آگے بڑھے گا یا پھر پیچھے ہٹے گا یہ بات ہر میدان میں دیکھی جاتی ہے چاہے وہ دنیوی حالت اور کیفیت ہو یا دینی حالت اور کیفیت ہو۔ بہر طور مسلم پرسنل لاء پر موجودہ خطرے کے بادل منڈلا رہے ہیں، ہمیں اللہ کی طرف سے متنبہ کرنے کے لئے ایک ٹھوکر لگائی جارہی ہے۔

ہمیں غفلت کی نیند سے بیدار ہونا چاہئے اور آنکھ کھول کر حالات کو دیکھتے ہوئے اور اللہ کی طرف سے ایک نئی تنبیہ سمجھتے ہوئے مسلم پرسنل لاء پر ہونے والے حملہ کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ اور اپنے اندر آگے بڑھنے کا حوصلہ اور اُمنگ پیدا کرنا چاہئے اور موجودہ زمانے کے لحاظ سے جو تدابیر کی جانی چاہئیں، ان کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونا چاہئے اور یہ سمجھنا کہ جو دینی مصیبت ہم پر آرہی ہے اس کے ذمہ دار اصل میں ہم ہیں اور ہمارے اعمال ہیں۔

(۲۰۱۷ء)

پوری دنیا کے حکمرانوں کے نام ایک پیغام

”چھٹکارا لڑائی سے نہیں عاجزی سے“

وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی○ (طٰہٰ: ۴۸-۴۷)

میں ہر اعتبار سے اللہ کا ایک ناچیز بندہ ہوں۔ آپ کو بھی اس بات کا شعور ہونا چاہئے کہ آپ اپنی حیثیت اور حقیقت کو پہچانیں۔ آج آپ جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے آپ کورونا سے لڑائی کی بات کرتے ہیں، کورونا سے لڑائی کی بات کرنے کا مطلب ہے ’’رب کورونا‘‘ سے لڑائی کرنا۔ ایک طرف ’’رب کورونا‘‘ وہ ہے جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا۔ وہ ذرّہ ذرّہ کو غذا مہیا کرتا ہے۔ ہوا چلاتا ہے، سورج کو روزانہ مشرق سے نکالتا ہے اور مغرب میں غروب کر دیتا ہے، جس سے دن غائب ہو جاتا ہے اور پوری دنیا پر تاریکی چھا جاتی ہے۔ مردہ زمین سے غلہ کا پودا اگاتا ہے جس سے سارے جانداروں کی غذا مہیا ہوتی ہے۔ آسمان سے بادل کے ذریعہ پانی کی بوندیں نازل کرتا ہے جس سے مردہ زمین زندہ ہو جاتی ہے۔ بتایئے ان میں سے کون سا کام ہے جو آپ کر سکتے ہیں۔

اس تناظر میں بتایئے آپ کی حیثیت کیا ہے؟؟؟؟

کیا آپ سورج کے طلوع ہونے کا وقت جو اس رب نے مقرر کیا ہے اس سے ایک منٹ پہلے نکال سکتے ہیں؟

یا غروب ہونے کا جو وقت اس نے مقرر کیا ہے اس میں ایک منٹ کی تاخیر کا سبب بن سکتے ہیں؟
اسی طرح جو سسٹم اس نے غلہ پیدا کرنے کا بنایا ہے اس میں کوئی تبدیلی اور ردوبدل کر سکتے ہیں؟
آسمان سے پانی کی بوند کا جو وقت متعین کیا ہے اس میں تقدیم وتاخیر کر سکتے ہیں؟
اور یہ حقیقت ہے کہ یہی وہ رب ہے جس کے حکم کے بغیر کسی متنفس اور رینگنے والے جاندار کو زندگی کی نعمت نہیں مل سکتی۔ جس کے "کُنۡ" کہے بغیر کوئی چھوٹی بڑی چیز عالم وجود میں نہیں آسکتی۔

مختصر یہ کہ آپ اور آپ کے سائنسدانوں نے کوئی چیز دراصل پیدا نہیں کی بلکہ اللہ کی پیدا کردہ چیزوں سے اللہ کی دی ہوئی عقل سے استفادہ کی شکلیں بنائی ہیں۔ بڑے سے بڑا کوئی انسان یعنی کوئی سائنسدان مچھر کی ایک ٹانگ اور مکھی کا ایک پَر بھی نہیں بنا سکتا۔ ہر چھوٹی بڑی چیز اس رب نے بنائی ہے اور اس کے اندر قویٰ اور خاصیت بھی اس رب نے پیدا کی ہے۔ جس نے ''کورونا'' پیدا کیا ہے اور کورونا کے جراثیم پیدا کئے ہیں۔ جن جراثیم کو آپ دیکھ نہیں پا سکتے ہیں اور پا سکتے ہیں تو تھوڑا موڑا اس رب کے دیئے ہوئے آلات کے ذریعہ ہی۔ جس حقیر کورونا کے مقابلے آپ ساری ایجادات کے باوجود پسپا ہو چکے ہیں۔ آپ اپنی مادی قوتوں اور طاقتوں کے باوجود بے بسی اور لاچاری کا نمونہ بن چکے ہیں اس کے باوجود آپ اس رب سے لڑائی کی بات کرتے ہیں یہ کتنی بڑی حماقت ہے!

آپ کو اس بات کا شعور ہونا چاہئے کہ آپ سارے لاؤ لشکر کے باوجود ''رب کورونا'' سے لڑ نہیں سکتے۔ آپ کو اب یہ جان لینا چاہئے کہ آپ کی طاقت ''رب کورونا'' کی قدرت کے مقابلے پر کاہ سے بھی حقیر ہے۔ رب تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ انسانوں کو ان کی تمام قدرت کے نظام کے باوجود گاہے بہ گاہے بے بسی ولاچاری کا مشاہدہ کرواتا رہتا ہے تا کہ دل ودماغ آلائشوں سے محفوظ رہیں اور نظر صرف اس ایک رب کائنات کی طرف ہو جائے۔ اب کی بار یہ احساس اس نے کورونا کے ذریعہ دلانا چاہا ہے۔

اس لئے رب کورونا کے مقابلے میں لڑنے کی بات چھوڑیئے اور عاجز بندہ کی شکل میں اس کے سامنے آیئے۔ اس سے رجوع کیجئے عاجزی کیجئے، گڑگڑایئے اور اپنی غلطیوں، ناشکریوں کی معافی مانگئے اور یہ سمجھئے کہ کورونا جیسی آفت نے آج سارے عالم کو جو اپنے گھیرے میں کر لیا ہے وہ ہمارے کرتوتوں اور غلطیوں کے سبب سے ہوا ہے۔ ہمارے کفر وعصیاں اور ظلم وجور بغاوت اور سرکشی کے سبب ہوا ہے۔ رب کی عظمت، ہیبت، جلال اور قدرت کی معرفت سے دور ہونے کے سبب ہوا ہے۔ اپنی روش سے باز آیئے توبہ کیجئے کہ ہم پچھلی غلطیوں جیسی غلطیاں نہیں کریں گے اور ساری عوام اور اپنے محکوموں کی برائیوں کو اپنے سر لیجیے اور تسلیم کیجئے کہ

ہر سرکشی اور خطا کے پیچھے ہمارا کچھ نہ کچھ ضرور حصہ ہے اور جس وباء نے سارے عالم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اس کی وجہ دراصل ہم ہیں۔

اس لئے ہم توبہ کرتے ہیں اور توبہ اس شکل میں کرتے ہیں کہ ہم اپنے عہدوں سے مستعفی ہوتے ہیں۔ یعنی اس طرح مودی سے لے کر صدر امریکہ ٹرمپ اور شاہ سلمان اور سبھی حکمران، حکمرانوں کی صف سے نکل کر محکوموں کی صف میں شامل ہو جائیں۔ اور زمین و آسمان کی بادشاہی و حکمرانی کا جو حقیقی حقدار ہے اپنی حکمرانی اور اپنے آپ کو اُسی کے حوالے کر دیں۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ (آل عمران:۱۸۹)

یہ وہ شکل ہے جو سارے جہاں کے پروردگار کی جانب سے شاید انسانوں کی توبہ کی قبولیت کا درجہ حاصل کر سکے۔ یاد رکھئے کہ توبہ کا دروازہ ہر شخص کے لئے صرف تب تک کھلا ہے جب تک اس کی سانس باقی ہے لیکن اگر کسی نے رب تعالیٰ کے مقابلے پر خسارے کی جنگ کا فیصلہ کر لیا ہے تو اسے بھی جان لینا چاہئے کہ موت تو بہر حال اُس کو بھی آنی ہی ہے۔

وَمَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلَاغُ

(۲۰۲۰ء)

فلسطینیوں کے جذبۂ سرفروشی کا منبع

غزہ کا علاقہ ایک بہت ہی چھوٹا علاقہ ہے۔ ہندوستان کے بڑے شہروں کلکتہ، بمبئی، دہلی، بنگلور اور حیدرآباد میں سے کسی ایک شہر کے برابر بھی نہیں ہے۔ ایک چیری یا کہا جائے کہ ایک پٹی ہے جس کی لمبائی چالیس کلومیٹر اور چوڑائی دس کلومیٹر ہے۔ جس کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف ایک مستحکم دیوار ہے۔ سمندر اور دیوار کے درمیان بیس لاکھ انسان جن میں مرد، عورت، بچے، بوڑھے اور جوان ہیں جو زندگی گزار رہے ہیں۔

اس بات کا ہمارے لیے تصور بھی مشکل ہے کہ وہ کیسے زندہ ہیں!؟

جبکہ سات سال سے پورے طور سے ان کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اپنے گھیرے سے نکلنے کی بھی انہیں مجال نہیں ہے۔ اور دنیا کی سپر پاور اور اس کے حلیف طرح طرح سے وسائلِ زندگی ان تک پہنچنے سے روک رہے ہیں۔ پانی، بجلی اور ایندھن ضرورت کے مطابق ان کو نہیں مل رہا ہے۔ باہر کی امداد کا ان تک پہنچنا دشوار ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کے بسر ہونے کا ہم کیا تصور کر سکتے ہیں؟ اور ان کے مشکلات و مصائب کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے؟ ایسے حالات میں اوپر سے ان پر بمباری بھی ہو رہی ہے۔ اور اب تک یعنی ماہِ اگست کے ابتدائی دنوں تک کی خبروں میں آیا ہے کہ تقریباً دو ہزار لوگ شہید ہو چکے ہیں۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ ان شہداء کی تجہیز و تکفین کی کیا شکل ہوتی ہوگی؟

اسی کے ساتھ ساتھ ہزاروں زخمی ہیں۔ ان کے علاج و معالجہ کا معاملہ کیسے حل کیا جا رہا ہوگا؟

ان کی آہ و بکا کو کون سننے والا ہوگا؟ ان کی تڑپ اور بلبلاہٹ کو کون دیکھنے والا ہوگا؟

اور ان کی پکار کو کون سننے والا ہوگا؟

خصوصاً معمول کے حالات میں ضرورت کو پوری کرنے کے لیے دواخانے اور ہسپتال پہلے سے ہی نہیں تھے۔ اب ان حالات میں باہر سے کسی مؤثر مدد کے ان تک پہنچنے کا امکان تک نہیں ہے اور پہلے سے اپنے بچاؤ اور دفاع کا سامان بھی موجود نہیں ہے۔ ایسی مجبوری کی صورتحال میں عام ذہن اور عام عقل یہی کہتی ہے کہ باشندگان غزہ کو گر پڑ کر اور ہاتھ جوڑ کر اسرائیل سے صلح کی درخواست کرنی چاہئے اور اس درخواست کو منظور کرانے کیلئے ہر طرح کی منت سماجت اور گڑگڑاہٹ پر تیار ہو جانا چاہئے۔ اور اپنے اوپر آئی ہوئی آفت اور مصیبت سے کسی طرح چھٹکارا حاصل کر لینا چاہئے۔ اور اپنے ہمدردوں سے سفارش کروانی چاہئے اور اس درخواست کے منظور ہونے کیلئے رات و دن دعا کرنی چاہیے۔ اور بیت المقدس، مسجد نبوی اور خانہ کعبہ کے مصلیوں اور پھر دنیا کے سب اللہ والوں اور بزرگوں سے اپیل کرنی چاہیے کہ وہ دعا کریں کہ اسرائیل کے پاس ہماری درخواست شرف قبولیت کا درجہ حاصل کر لے۔

یہ تقاضہ ہے ایک عقل عام کا، اور تقاضہ ہے مصیبت اور بے بسی کے چنگل سے نجات پانے کی خواہش کا، لیکن فلسطینیوں کا جو طرز عمل ہے اس کو دیکھ کر ساری دنیا کے دانشمند حیران ہیں کہ یہ کیسے لوگ ہیں!؟ عرب وزرائے خارجہ صلح کیلئے کچھ تجاویز پیش کرتے ہیں تو ان کو اسرائیل نہیں فلسطینی مسترد کر رہے ہیں، ٹھکرا رہے ہیں۔ اور ان تجاویز کو قابل غور بھی نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد کو قابل التفات نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اور نہ دنیا کی کسی قوم، کسی برادری، کسی انجمن، کسی تنظیم سے اپیل کر رہے ہیں کہ ہمیں اسرائیل کے عذاب سے بچاؤ! یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بے عقلی، بے دانشی، کم فہمی اور حالات کی نزاکت اور تقاضوں سے بے شعوری ان کے اندر کیوں پیدا ہوئی ہے اور وہ خود اپنی جانوں کے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ کیا ان کے اندر سمجھدار اور دور اندیش لوگ نہیں ہیں؟ کیا تاریخ سے سبق حاصل کرنے والے اور صلح وصفائی اور رواداری کی اہمیت اور منفعت کو سمجھنے والے ان کے یہاں ناپید ہو گئے ہیں؟ روز کی بمباری میں سینکڑوں لاشوں اور زخمیوں کا منظر دیکھتے ہوئے بھی انہیں عقل کیوں نہیں آ رہی ہے؟ جبکہ یہ منظر یک لخت ختم ہو سکتا ہے بشرطیکہ اسرائیل سے صلح کی وہ پیش کش کر دیں۔

ہم نے بہت غور کیا کہ فلسطینیوں کی اس سوچ، فکر اور ذہنیت کا ماخذ اور منبع کیا ہے؟ اور وہ کیوں اتنی استقامت، پامردی اور جماؤ کا مظاہرہ کر رہے ہیں؟ تو ہمیں اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں ملا کہ ان کے اندر ایمان اور یقین کی جو جوت اور روشنی ہے اس میں وہ اپنی منزل دیکھ رہے ہیں اور جو لوگ ایمان ویقین کی اس

کیفیت سے محروم ہیں، ان کے لئے مشکل ہے کہ فلسطینیوں کے ذہنی مقام کو دیکھ اور سمجھ سکیں۔

جہاں تک فلسطینی مسلمانوں کی سوچ اور فکر کے ماخذ ومنبع کا سوال ہے تو اس کا سراغ قرآن کی بعض آیتوں پر غور وفکر سے ہمیں مل سکتا ہے:

مثلاً قرآن کہتا ہے:

①-فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْٓا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ ○ (سورۂ محمد: ۳۵)

ترجمہ: پس تم بودے نہ بنو سمجھوتے اور صلح کی دعوت نہ دو۔ اور تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہارے اعمال ضائع نہ کرے گا۔

یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ دشمنوں سے سخت کشمکش جاری تھی ایک طرف مشرکین مکہ اور یہودی اپنی پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کو کچل دینا چاہتے تھے۔ اور ان کو روکنے والی کوئی طاقت موجود نہیں تھی مسلمانوں کے مقابلے میں ان کی قوت وطاقت، اسلحہ وساز وسامان بے انتہا زیادہ تھا۔ کوئی سوچ نہیں سکتا تھا کہ مسلمان ان کے مقابلہ میں ٹک سکیں گے۔ فاتح اور غالب ہونے کا سوال ہی کیا تھا؟ دوسری طرف منافقین خیر خواہ اور ناصح وہمدرد بن کر مسلمانوں کو وقت کی نزاکت سمجھاتے تھے کہ ان سے ٹکرانا عقلمندی نہیں ہے۔ ہماری اور دشمنوں کی قوت میں زمین آسمان کا فرق ہے اگر ہم ان سے ٹکرائیں تو مٹ جائیں گے ہماری دعوت ختم ہو جائے گی۔ عقلمندی اور دانشمندی یہی ہے کہ ہم ان کے مقابلہ میں آنے کے بجائے دب کر رہیں اور جنگ وجہاد کی نوبت نہ آئے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے مومنین کو ہدایت دی کہ دیکھو تم کمزور پڑ کر اور بودے بن کر صلح کے پیامی نہ بنو۔ اللہ تمہارے ساتھ ہے تم ہی غالب رہو گے اس لئے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے اللہ تمہارے اعمال یعنی کارروائیوں کو رائیگاں نہ کرے گا دنیا اور آخرت، دونوں جہاں میں ان کو بارآور اور نتیجہ خیز بنائے گا دنیا کی ناکامیوں کو خاطر میں نہ لاؤ۔ دنیا چند روزہ ہے آخرت کی کامیابی ہی اصل چیز ہے جس کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اپنی ناکامی کو سامنے دیکھ کر کفار ومشرکین کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا اللہ پر ایمان وتوکل کے خلاف ہے اور دنیا میں مسلمان ناکام بھی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں ہے آخرت میں باطل کے سامنے جمے رہنے کا جو اجر وثواب ملنے والا ہے وہ بڑی چیز ہے اس کے مقابلہ میں دنیا کے خسارے کی کوئی پرواہ نہیں ہونی چاہیے۔

یہی وہ چیز ہے جس کی بنا پر خطرات کے ہجوم کو دیکھ کر ایمان میں مزید جوش پیدا ہوتا ہے چنانچہ مومنوں کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

②-اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۝ (آل عمران:۱۷۳)

ترجمہ: اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

②- وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ (آل عمران:۱۴۷-۱۴۶)

ترجمہ: ''اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے ان کی دعا بس یہ تھی ''اے ہمارے رب ہماری غلطیوں، کوتاہیوں کو درگزر فرما۔ ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا اسے معاف فرما۔ ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔''

مذکورہ بالا آیات کے ذریعہ اس سوچ وفکر کا صاف طور سے سراغ ملتا ہے کہ ایک مسلمان کے نزدیک اصل چیز کیا ہے اور اصلاً وہ کیا چیز ہے جس کے لئے وہ لڑتا ہے؟

فلسطینی مسلمان جس استقامت، پامردی اور دلیری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اس میں تمام مسلمانوں کے لئے جہاں ایک نمونہ ہے کہ دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں کس طرح آج بھی ڈٹے رہا جا سکتا ہے اور صبر و استقامت کی اپنی پرانی تاریخ آج بھی دہرائی جا سکتی ہے۔ وہیں دنیا کی ساری اقوام کے لئے ایک آگاہی ہے کہ مسلمانوں کو تر نوالہ نہ سمجھیں۔ جب ان کے اندر ایمان، یقین اور بیداری پیدا ہو جائے گی تو وہ کسی بھی دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جائیں گے۔ اور وہ کسی روکے سے رکیں گے نہیں۔

(۲۰۱۴ء)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اقدس پر فدا ہونا مبارک ہو!

گزشتہ جمعہ کے واقعات اوراس کے بعد کی مجموعی صورتحال اور پروپیگنڈوں کے متعلق چند باتیں اوراپنے احساسات آپ تمام کے سامنے اس امید کے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں کہ

ع شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ہم ہندوستانی مسلمانوں کو تقسیم ہند کے بعد سے ہی وقفہ وقفہ سے بے شمار مسائل درپیش رہے ہیں اور جو مسئلہ بھی سامنے آیا ہے وہ آج تک حل نہیں ہوسکا ہے چاہے وہ بابری مسجد کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا دیگر شعائر کا، فسادات میں جان ومال عزت وآبرو کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا شریعت کے تحفظ کا مسئلہ، پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ ہو یا شہریت کے تحفظ کا مسئلہ، گاؤ ذبیحہ کا مسئلہ ہو یا اذاں وحجاب پر پابندی کا مسئلہ، گیان واپی مسجد اور متھرا کی شاہی عیدگاہ سمیت تین ہزار سے زائد مساجد کے تحفظ کا مسئلہ ہو یا فرضی مقدمات میں مسلم نوجوانوں کی گرفتاریوں اور حراستی اور غیر حراستی انکاؤنٹرس کا مسئلہ۔ ان مسائل کے بعد آج جو سب سے بڑا مسئلہ ہمیں درپیش ہے وہ ہے ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دفاع کا مسئلہ۔

گزشتہ سترہ دن سے ہر صاحب ایمان شخص اپنی اپنی جگہ نہایت بے چین ومضطرب ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی ہوئی ہے اور نہ صرف شَاتِمِیْنِ قرار واقعی سزا سے بچے ہوئے ہیں بلکہ مختلف ریاستوں میں ایف آئی آر درج کرانے کے باوجود بھی حکومت کی جانب سے ان مجرمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے۔

لہٰذا احتجاج تو ایمانی، فطری اور قانونی تقاضہ تھا یہی وجہ ہے کہ اس زخم تازہ کے ساتھ ستر سالوں میں روا

رکھے جانے والے ہر ظلم و ناانصافی کے تمام زخم ہرے ہو گئے اور مسلمانوں کے غم و غصہ کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ اس غم و غصہ کا اظہار بالکل فطری اور واجبی ہے اور جمہوریت پر یقین رکھنے والوں کی زبانی یہ احتجاج بالکل جمہوری حق ہے۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اس احتجاج کو ہماری مذہبی اور سیاسی قیادت جرم سمجھ رہی ہے اور وہ یہ سوال اٹھا رہی ہے کہ دینی، ملی و سیاسی قیادت کی جانب سے کسی بھی احتجاج سے باز رہنے اور سڑکوں پر نہ آنے کی پرزور اپیلوں اور بیانات کے باوجود بھی عام مسلمانوں کا سڑکوں پر نکلنا اور احتجاج کرنا کس کی شہ پر ہوا ہے اور مسلم نوجوانوں کو کس نے اکسایا ہے؟

یہ سوالات بالکل فضول اور بیجا ہیں کیونکہ ہر مسلمان نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو شرط ایمان، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفاداری کو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستگی کو خوش بختی کی علامت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ناموس کی خاطر جان لینے اور دینے کو سعادت سمجھتا ہے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیس کروڑ امتی اس ملک میں رہتے ہیں اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جناب میں گستاخی ہوتی ہے تو یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے یہی وہ احساس تھا جس نے ایک عام مسلمان کو بھی اپنے ایمان کا عملی مظاہرہ کرنے پر اکسایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کروایا۔ یہ دراصل احتجاج سے زیادہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی محبت، عقیدت اور وفاداری کا اظہار تھا۔

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس ملک کی حکومت انتظامیہ اور پولس مسلمانوں کے کسی بھی احتجاج اور مظاہرے کو پرامن رہنے نہیں دیتی۔ اس طرح وہ ان سے احتجاج کے حق کو چھیننا چاہتی ہے اور ان کی آواز کو دبانا چاہتی ہے گزشتہ نماز جمعہ کے بعد بھی یہی ہوا ہے۔ ملک کی تقریباً ہر ریاست میں مسلمان نماز جمعہ کے بعد اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے لئے مسجدوں سے باہر نکلے لیکن ان کو کھل کر اپنے جذبات کا اظہار بھی نہیں کرنے دیا گیا۔ پولس نے ہر جگہ بزور تشدد ان کا راستہ روکا، بھگوا وادیوں کے ذریعہ ان پر پتھراؤ کروایا، لاٹھی چارج کیا گیا، آنسو گیس کے گولے پھینکے گئے، رانچی میں تو پوائنٹ بلینک رینج سے ان پر گولیاں چلائی گئیں۔ اگر کچھ جی دار نوجوان اپنے دفاع میں اور اشرار کو اپنے سے دور رکھنے کے لیے ہاتھ میں پتھر اٹھاتے ہیں تو یہ ان کا جرم قرار پاتا ہے۔ دکھ اس بات کا ہے کہ اپنوں کے نزدیک بھی وہ مجرم قرار پاتے ہیں! پھر حکومتیں ان کے گھروں پر بلڈوزرز چلاتی ہیں اور اپنے ان کے دلوں پر!

جمعہ کے واقعات کے بعد بعض مسلم قائدین کی جانب سے جو بیانیے سامنے آرہے ہیں وہ نا صرف قابلِ

افسوس بلکہ انتہائی شرمناک ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ اس نازک وقت میں اپنے بچوں کو مجرم ٹھہرانے کے بجائے ان کے ساتھ کھڑے ہوتے، ان کے پشتیبان بنتے، ان کے زخموں پر مرہم رکھتے، ان کے درد کا درماں بنتے، ان کے دلوں کو ڈھارس دیتے، ان کے حوصلوں کو برقرار رکھتے، ان کے عزائم کو سراہتے اور ان کے لیے اپنے آپ کو ڈھال بنا لیتے۔ مگر افسوس کہ قیادت آج اس موقع پر بھی اپنی مردہ ضمیری اور بے حسی کا ثبوت دے رہی ہے۔ الزام تراشیاں کر کے اور بہانے بنا کر مسلم نوجوانوں کی مدد سے اپنا ہاتھ اٹھا رہی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ پولیس ظلم پر سوال کیے جاتے کہ نہتے بچوں پر پوائنٹ بلینک رینج سے گولیاں چلانے کا کیا جواز ہے۔ بغیر ایف آئی آر کے گرفتاریاں کرنے کا کیا جواز ہے۔ بغیر جرم ثابت ہوئے گھروں پر بلڈوزر چلانے کا کیا قانون ہے؟؟ نوجوانوں پر انگلی اٹھانے سے پہلے قیادت کو اپنے گریبان میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔ آپ اپنا محاسبہ کیجئے آپ نے اپنی حکمت و مصلحت، فراست اور صبر وتحمل کے ذریعہ ان ستر سالوں میں کیا حاصل کیا ہے؟ کوئی ایک چیز بھی حاصل کیا ہو تو بتلائیے!؟ بلکہ جو کچھ ہاتھ میں تھا اسے بھی گنوا بیٹھے ہیں۔ البتہ نوجوانوں نے ہر موقع پر اپنے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

اور آج الحمد للہ ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کی خاطر، اپنے نبی ﷺ سے محبت کے جرم میں اپنے سینوں پر گولیاں اور اپنے جسموں پر لاٹھی، ڈنڈے اور پتھر کھا رہے ہیں اور قید و بند کی تکلیفوں سے گزر رہے ہیں۔ بڑے خوش نصیب ہیں یہ نوجوان! ان کی خوش بختی کے کیا کہنے! اگر اس سب کے بدلے انھیں ساقیٔ کوثر ﷺ کے ہاتھوں جام کوثر نصیب ہو جائے تو یہ گھاٹے کا سودا ہرگز نہیں ہے۔ واقعی بڑے خوش نصیب ہیں شہید مدثر و شہید ساحل رحمہما اللہ جنھیں رب تعالیٰ نے کروڑوں کے درمیان سے اپنے حبیب ﷺ کی ناموس کے حوالے سے چن لیا۔ اس سے بڑی سعادت اور کیا ہو سکتی ہے! اس سے بڑی کامیابی بھلا اور کیا ہو سکتی ہے! ایک نوجوان صحابی کو جب دشمن کا نیزہ لگا تو وہ۔ ''فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ''۔ (رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا) کہہ کر شہید ہو گئے۔ ہم بھی اپنے شہداء کے متعلق یہی یقین رکھتے ہیں کہ ''رب کعبہ کی قسم یہ کامیاب ہو گئے۔'' زندگیاں سینت سینت کر رکھنا اور بچانا نہیں بلکہ زندگیاں نچھاور کر دینا اللہ کے نزدیک بڑی کامیابی ہے۔

''وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ''

غازی علم الدین شہیدؒ نے جب گستاخِ رسول ﷺ کا سر کاٹا اور پھانسی کے پھندے کی طرف چلے تو علامہ اقبال جن کی شاعری کی روح عشق رسول ﷺ تھی۔ نے کہا تھا کہ......

''ایک بڑھئی کا بیٹا بازی لے گیا اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے''

یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے یہ بڑے نصیب کی بات ہے!

حضرت خبیبؓ کو دردناک اذیتیں دینے کے بعد جب انھیں سولی پر چڑھایا جانے لگا تو کفار نے بطور استہزاء کہا کہ خبیب! کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ کاش! میرے بدلے میں محمد ہوتے!؟ انھوں نے فوراً تڑپ کر کہا کہ مجھے تو یہ بھی گوارا نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک کانٹا بھی چبھ جائے اور بدلے میں میں آزاد ہو جاؤں!

ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاطر سر کاٹنے اور کٹانے والوں سے تاریخ اسلامی کے سنہرے اوراق بھرے پڑے ہیں۔خوشی اس بات کی ہے کہ آج اس گئے گزرے دور میں بھی حضرت خبیبؓ کے نقش قدم پر چلنے والے، اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ محبت رکھنے والے نوجوان موجود ہیں جو اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تکلیف پر تڑپ اٹھتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کی شمع جلائے کہ جس کے بغیر ایمان ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ہر قسم کی قربانی اور دفاع کے لیے تیار رہے اور کسی بھی قسم کے ڈر اور خوف کو اپنے او پر طاری نہ ہونے دے۔ یہ عاشقان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے آزمائش کی گھڑی ہے۔یہی ایمان کو ثابت کرنے کا وقت ہے۔یہی اپنے آپ کو خوش بختوں کی فہرست میں شامل کرانے کا وقت ہے۔یہی چھٹائی کا وقت ہے جب مؤمنین کا ایمان اور منافقین کا نفاق ظاہر کیا جاتا ہے ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝ (العنکبوت:۱۱)

ترجمہ: ''اور اللہ ضرور جان کر رہے گا کہ کون لوگ ایمان والے ہیں اور کون منافق ہیں۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا (آل عمران:۱۶۶۔۱۶۷)

ترجمہ: ''اور دونوں جماعتوں کے مقابلہ کے دن جو مصیبت تمہیں پہنچی وہ اللہ کے اذن سے ہی پہنچی اور یہ اس لئے ہوا تا کہ وہ مومنوں کو دیکھ لے اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لے جو منافق ہیں۔''

آگے ارشاد ہے:

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (آل عمران:۱۶۸)

ترجمہ: ''یہ لوگ تو خود بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو مارے

نہ جاتے۔ان سے کہو اگر تم سچے ہو تو اپنے اوپر سے موت کو ٹال کر دکھاؤ۔''

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○

(آل عمران: ۱۴۰)

ترجمہ: ''اور (یہ دن تم پر اس لئے لایا گیا) کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سچے اہل ایمان کون ہیں اور چاہتا تھا کہ تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے۔اللہ کو ظالم لوگ پسند نہیں ہیں۔''

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ○ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ○

(العنکبوت: ۲-۳)

ترجمہ: ''کیا لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ یہ کہنے پر چھوڑ دیئے جائیں گے، کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا۔حالانکہ جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کی ہم آزمائش کر چکے ہیں تو اللہ ان لوگوں کو ضرور جان کر رہے گا جو سچے ہیں اور ان لوگوں کو بھی جو جھوٹے ہیں۔''

ہمارے ذہنوں میں ہمیشہ یہ بات مستحضر رہے کہ مسلمانوں کو ہر دور میں اپنے دین وایمان کی راہ میں آزمائشیں پیش آئی ہیں اور تا قیامت آتی رہیں گی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہر دور کے مسلمانوں نے پوری پامردی کے ساتھ ان آزمائشوں کا سامنا کیا ہے اور الحمدللہ کامیاب رہے ہیں۔بلاشبہ جس گھر کے بھی بچے شہید ہوئے ہیں ،زخمی ہیں،گرفتار ہو کر اذیتیں سہہ رہے ہیں اور جن کے گھروں پر بلڈوزر چلائے جا رہے ہیں ان گھروں پر تو قیامت ٹوٹ پڑی ہوگی، ان کے عزیز واقارب کے دکھ اور غم کا تو ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے !لیکن ہم دکھ کی اس گھڑی میں ان کے ساتھ شامل ہو کر ان کے دکھ کو ہلکا کر سکتے ہیں۔زخمیوں کے بہترین علاج کا سامان کر سکتے ہیں۔گرفتار نوجوانوں کی رہائی کے اسباب فراہم کر سکتے ہیں۔ہم میں سے جس کے بس میں جو ہے وہ اپنی ذمہ داری سمجھ کر کرے ورنہ روزِ محشر پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سامنا نہیں کر سکیں گے اور اللہ کی گرفت سے بچنا بھی محال ہو جائے گا۔

بہر حال مسلمانانِ ہند اس حقیقت کا ادراک جتنی جلد کر سکیں ان کے حق میں اتنا ہی بہتر ہے کہ اگر ہندوستان میں مسلمان بن کر رہنا ہے تو اپنی جان و مال کی قربانی پیش کرنی ہوگی، اس درد سے گزرنا ہوگا ورنہ اس ملک میں ہم مسلمان بن کر نہیں رہ سکیں گے۔

(۲۰۲۲ء)